یا اللہ جل جلالہ

یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

علمِ تصوف وطریقت پر مشتمل کتاب مستطاب

مفتاح السلوک

گنجینۂ ادبیات، آداب المریدین گواہرات

جلد یازدہم

ازرشحات فیض قلم

قدوۃ العارفین العالم النبیل فقید المثیل

الشیخ الاستاذ المفتی

سید احمد علی شاہ حنفی ترمذی سیفی

دامت برکاتہم القدسیہ

ناشر

جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ

فقیر کالونی اورنگی ٹاؤن نمبر ۱۰ کراچی غربی

نام کتاب: مفتاح السلوک

تصنیف و تالیف: پیر طریقت رہبر شریعت آفتاب ہدایت حضرت علامہ سید احمد علی شاہ سیفی نقشبندی دامت برکاتہم القدسیہ

طباعت اول: اپریل ۲۰۲۳ء بمطابق جمادی الاول ۱۴۴۵ھ

طباعت ثانی:

کمپوزر: صوفی سید فرحان الحسن سیفی

ناشر: جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی، فقیر کالونی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

☆جس مکتوب نمبرپر انگلی لگائیں گےوہ کھول جائے گا☆

1	11	21	31
2	12	22	32
3	13	23	33
4	14	24	34
5	15	25	35
6	16	26	36
7	17	27	37
8	18	28	38
9	19	29	39
10	20	30	40

مکتوب نمبر ا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

[ان حالات کے بیان میں جو اسم مبارک **الظاھر** سے مناسبت رکھتے ہیں اور توحید کی قسمِ خاص کے ظہور اور ان عروجات کے بیان میں جو محدد (عرشِ عظیم) سے اوپر واقع ہوئے اور بہشت کے درجات کے انکشاف اور بعض اہل اللہ کے مراتب کے ظہور کے بیان میں اپنے پیر و مرشد کو لکھا۔ جو بزرگ، کامل، کامل کرنے والے، درجات ولایت تک پہنچانے والے، اس طریقے کی ہدایت کرنے والے جس میں انتہاء ابتدا ٔ میں درج ہے۔ پسندیدہ دین کی تائید کرنے والے ہمارے شیخ و امام الشیخ محمد الباقی نقشبندی احراری قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اور اللہ تعالیٰ ان کی آرزو کے اقصیٰ مقام تک پہنچائے۔]

تشریح

مکتوب کو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اسم الظاھر سے شروع کیا، اسم الظاھر ایک الف ایک لام ایک ظا ایک ھا اور ایک را نہیں ہے۔(یعنی اگر ایک انسان یہ سوچے کہ یہ الفاظ اسم الظاھر ہیں یا یہ کہ کوئی شخص ان حروف سے اللہ تو مراد لے لے مگر یہ کہے کہ یہ باطن ہے تو ایسے نہیں ہے) بلکہ یہ وہ حروف ہیں جن سے ہم اللہ مراد لیتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی تعلیم یہ نہیں کہ ہم صرف ظاہری الفاظ تک محدود ہو جائیں۔ کیونکہ اسم اللہ عقائد کی رو سے یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی ذات اور اسماء و صفات کے ساتھ قدیم ہے حادث نہیں۔ یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اسماء و صفات قدیمی اور ازلی ہیں کسی نے ان کو وضع نہیں کیا بلکہ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ حروف الف، با، تا، ثا وغیرہ ہمارے سمجھنے

کے لئے ہیں۔ اور وہ نام جس سے ہم اللہ مراد لیتے ہیں یعنی اسم الظاھر۔ جب اسم الظاھر کی کیفیت کسی صوفی پر طاری ہو۔ یعنی اللہ کے اسم کا زیادہ ذکر و فکر کریں، علماء و مشائخ کی محافل میں زیادہ بیٹھیں تو اس سے سالک کے قلب میں جو تاثیر پیدا ہو اس تاثیر کو اسم الظاھر کی کیفیت یا تاثیر کہا جاتا ہے۔ یا جب انسان کے وجود پر صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسماء کا پَرتَو پڑتا ہے تو انسان میں شوق و ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی پوشیدہ چیزیں جب انسان پر ظاہر ہو جاتی ہیں تو اس کو اسم الظاھر کی کیفیت کہا جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ان اسماء یعنی اللہ، رحمٰن، رحیم، کریم، ستار وغیرہ میں سے جس اسم سے بھی کسی صوفی پر کیفیت ظاہر ہو تو اس کیفیت کو اسم الظاھر کی کیفیت اور اثر کہا جاتا ہے۔

یوں نہیں ہے کہ ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو صرف ایک الف، لام اور ھا سے پہچانیں۔ جیسا کہ بعض صوفیاء کرام اللہ کے لفظ کو لکھ کر سارا دن اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں، کوئی دل پر لکھتا ہے تو کوئی شیشہ میں بند کر کے اس کا تصور کرتا رہتا ہے۔ یہ طریقہ اکابر صوفیاء کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ اور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی تعلیمات کے مطابق سالک اسم ذات کو بے چون و چگون اپنے دل پر بغیر زبان ہلائے ورد کرے اور اس کی کیفیت اور اس کی تجلیات کا خیال کرے کہ کس طرح بندے کے دل پر وارد ہوتی ہیں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسماء و صفات اور ذات کا جدا معاملہ ہے۔ جو صوفی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا زیادہ ذکر و اذکار کرے اس کے بارے میں حضرت مغربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

زدریا موج گوں ناگوں برآمد

زبے چونی بہ رنگ چون برآمد

ترجمہ: اس دریائے بے پایاں سے قسم قسم کی امواج پیدا ہوتی ہیں ان امواج کی وجہ سے وہ اسماء بے چون وبے چگون چون کے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

جب یہ انوارات وارد ہوتے ہیں تو سالک یہ سمجھتا ہے کہ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے۔ جبکہ وہ انوارات اللہ سبحانہ و تعالیٰ نہیں ہوتے بلکہ یہ اسم الظاھر کی ابتدائی کیفیت ہے۔

گہے در کسوت لیلیٰ فروشد
گہے بر صورت مجنون برآمد

ترجمہ: یہ انوارات کبھی لیلیٰ کے کپڑوں میں نمودار ہوتے ہیں اور کبھی مجنون کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں یہ واحد حقیقی نہیں بلکہ صرف اسم کا ظہور ہے یعنی یہ اسم کی تجلیات ہیں جن کو وہ اپنے آپ میں دیکھتا ہے اور وہ اس کو نظر آتی ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ وریٰ الوریٰ ثم وریٰ الوریٰ ہے ہماری عقل، فکر اور وہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے صرف سالک یہ خیال کرتا ہے کہ جو چیز میں چاہتا تھا شاید یہ وہ ہے۔

چو یار آمد ز خلوت خانہ بیرون
ہمان نقش درون بیرون برآمد

ترجمہ: میں نے اتنا ذکر کیا اور آدھی رات کو اتنا دروازہ کھٹکھٹایا کہ وہ (اللہ سبحانہ و تعالیٰ) خلوت خانہ سے باہر آگیا (بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ جسم سے پاک ہے مگر صوفی ان انوارات کو دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ شاید اللہ سبحانہ و تعالیٰ خلوت خانے سے باہر آگیا ہے)۔

انسان کو جس چیز کا فکر یا وہم وخیال ہوتا ہے تو وہ نقش وصورت اس کی آنکھوں میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے کہ شاید یہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے یا اس طرح ہے (نعوذ باللہ من ذلک) اللہ سبحانہ و

تعالیٰ نہ تو تصور میں آسکتا ہے اور نہ ہی خیال میں۔ مگر اس وقت صوفی پر عشق کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ جو چیز بھی اس کے خیال میں آتی ہے وہ اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سمجھتا ہے جس طرح منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے تھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ درخت میں ہے یا یہ کہ میں وہی خدا ہوں۔

ازاں دریا درین امواج ہر دم

ہزاران گوہر و مکنون بر آمد

ترجمہ: یہ دریا اور اس کی موجیں ہر وقت رہتی ہیں اور ایک ایک لمحہ بعد مختلف قسم کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ جب یہ دریا موج میں آکر ٹھاٹھیں مارے تو دریا کے کنارے پر مختلف قسم کے موتی ظاہر ہوتے ہیں۔ جب سالک میں دریا کی طرح موج یعنی عشق اور شوق زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ باطنی کیفیات جو انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں وہ نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ تجلیات اور کیفیات جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسماء کی ہیں وہ ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور یہی اسم الظاھر کی کیفیات و اثرات ہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جب قیامت برپا ہو گی تو قرآن عظیم الشان کا ہر حرف ہزار تجلی کرے گا"۔

اب اگر قرآن عظیم الشان کے حروف کو شمار کیا جائے اور پھر اسے ایک ہزار کے ساتھ ضرب دی جائے تو کروڑوں تجلیات بنتی ہیں کہ انسان کی عقل اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ پھر اس دنیا میں صرف اسم الظاھر کی تجلیات کا ظاہر ہونا شریعت کی پابندی، ذکر و اذکار کی کثرت، شوق و ذوق اور تکالیف کو برداشت کرنے سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ آج شیخ سے بیعت کی اور کل ہی اس بات کا

تقاضا شروع کر دیا کہ حضور مجھ پر تو اسم الظاھر کی تجلیات ظاہر ہونا شروع نہیں ہوئیں مختصراً یہ کہ ان کیفیات کو حاصل کرنے کے لئے بہت محنتیں کرنا پڑتی ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

اس مکتوب میں اللہ تعالیٰ کا اسم الظاھر کی تجلی میں جلوہ گر ہونا بیان فرمایا گیا ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسم ظاہر اور تجلی کا مفہوم واضح کیا جائے تاکہ قارئین کرام کو نفس مکتوب سمجھنے میں آسانی رہے۔ و باللہ التوفیق

اسم الظاہر کا مفہوم

اسم "الظاھر" اللہ تعالیٰ کے اسمائے توقیفیہ صفاتیہ میں سے ہے، قرآن مجید میں ہے:

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (الحدید ۳)

اسم ظاہر کے متعدد مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔

بیہقیٔ وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی مجددی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رقمطراز ہیں:

وَالظَّاهِرُ فوق کل شیء لیس فوقه فی الظهور شیء۔[1]

ترجمہ: الظاھر (ہر شے سے فوق ہے) یعنی ظہور میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی شے نہیں اور اللہ تعالیٰ کائنات میں سب سے زیادہ ظاہر ہے۔

---

[1] (التفسیر المظھری، ج ۹، ص ۱۸۷)

حدیث مبارکہ

اسم الظاھر کے اس معنی پر ایک حدیث مبارکہ سے استدلال کیا گیا ہے جس میں آقائے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ایک دعا تعلیم فرمائی تھی جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

أنت الأول فليس قبلک شيء . وأنت الآخر فليس بعدک شيء وأنت الظاهر فليس فوقک شيء وأنت الباطن فليس دونک شيء۔[1]

ترجمہ: اے اللہ تو اول ہے تجھ سے پہلے کوئی شئ نہیں۔ تو آخر ہے تیرے بعد کوئی شئ نہیں تو ظاہر ہے تجھ سے اوپر کوئی شئ نہیں تو باطن ہے تجھ سے زیادہ قریب کوئی شئ نہیں۔

حضرت علامہ اسمٰعیل حقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رقمطراز ہیں:

وَالظَّاهِرُ وجود الكثرة دلائله الواضحة۔[2]

ترجمہ: یعنی اللہ تعالیٰ اپنے وجود کے اعتبار سے ظاہر ہے کیونکہ اس کے وجود پر کثرت کے ساتھ واضح دلائل موجود ہیں۔

حضرت علامہ سید محمد آلوسی (بغدادی مجددی) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

(والظاهر) بانه محيط بالاشياء۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ظاہر ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء پر محیط وغالب ہے۔

---

[1] (سنن ابن ماجه، ج۲، ص ۱۲۵۹)

[2] (روح البيان، ج۹، ص ۳۴۶)

وَالظَّاهِرُ أي بوجوده لأن كل الموجودات بظهوره تعالى ظاهر۔[1]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ظاہر ہے یعنی اپنے وجود کے اعتبار سے کیونکہ تمام موجودات اللہ تعالیٰ کے ظہور سے ہی ظاہر ہیں۔

حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رقمطراز ہیں:

(والظاهر) فی مظاهر الاکوان بصفاته وافعاله۔[2]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ظاہر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کائنات کی اشیاء میں اپنی صفات اور اپنے افعال کے ساتھ ظاہر ہے۔(یعنی تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال کا مظہر ہے)

تجلی کا مفہوم

تجلی الشئی: "تکشف وبان وظهر"۔[3]

یعنی تجلی کسی شے کے منکشف اور ظاہر ہونے کا نام ہے۔

تجلی کے معنی ہیں چمکنا، ظاہر ہونا، منکشف ہونا، صوفیاء کے نزدیک تجلی کا تصور یہ ہے کہ ذات حق تعالیٰ نور ہے یہ نور گویا جب صورتوں پر جلوہ گر ہو کر چمکتا ہے تو وہ اسی تجلی کو ظہور، سریان اور مظہر سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت سید شریف علی بن محمد جرجانی نقشبندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اصطلاحات صوفیاء کے بیان میں تحریر فرماتے ہیں:

التجلی ماینکشف للقلوب من انوار الغیوب۔[4]

---

[1] (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، ج۱۴، ص۱۶۷)

[2] (تفسیر ابن عربی، ج۲، ص۵۹۸)

[3] (معجم الفاظ القرآن)

[4] (کتاب التعریفات، ص۱۱۷)

یعنی غیبی انوار کے دلوں پر منکشف ہونے کا نام تجلی ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی مجددی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

التجلی: ظهور الشئی فی المرتبۃ الثانیۃ کظهور زید فی المرأۃ۔[1]

"کسی شئ کے دوسرے مرتبے میں ظہور کو تجلی کہتے ہیں" جیسے زید کی صورت کا آئینہ میں ظاہر ہونا۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ العزیز تجلی کا مفہوم یوں واضح فرماتے ہیں:

تجلی عبارت از ظہور شئ است در مرتبہ ثانی یا ثالث یا رابع الیٰ ماشاء اللہ۔[2]

یعنی کسی شئ کے دوسرے یا تیسرے یا چوتھے مرتبے میں (جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے) ظاہر ہونے کو تجلی کہتے ہیں۔

بینہ نمبر ۱

تصریحات بالا سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ آیت مبارکہ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ (الأعراف ۱۴۳) میں تجلی سے عین ذات کی تجلی و رؤیت مراد نہیں۔

توحید شہودی اور توحید وجودی

توحید شہودی ایک ذات کو دیکھنا ہے یعنی سالک کا مشہود صرف ایک ہی ذات ہو اور توحید وجودی ایک ذات کو موجود جاننا اور اس کے غیر کو معدوم خیال کرنا ہے اور معدوم خیال کرنے کے باوجود کائنات کے آئینوں اور مظاہر کو ایک جاننا۔ پس توحید وجودی علم الیقین کے قبیل سے ہے اور توحید

---

[1] (تفسیر مظھری، ج۳، ص ۴۰۶)

[2] (دفتر اول مکتوب، ص ۲۲۱)

شہودی عین الیقین کی قسم سے ہے۔ توحید شہودی اس راہ کے ضروری امور میں سے ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے فنا متحقق نہیں ہوتی اور عین الیقین کی دولت بھی اس کے بغیر میسر نہیں آتی کیونکہ ایک ذات کے غلبے کے باعث صرف اسے ہی دیکھنا اس کے ماسوا کو نہ دیکھنے کو مستلزم ہے بخلاف توحید وجودی کے کہ وہ اس طرح نہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کیونکہ علم الیقین توحید وجودی کی معرفت کے بغیر بھی حاصل ہے۔ نیز علم الیقین اس ذات کے ماسوا کی نفی کو مستلزم نہیں۔ نہایت درجہ یہ ہے کہ اس کے ماسوا کے علم کی نفی کو مستلزم ہے، جبکہ اس ایک کے علم کا غلبہ اور زور ہے۔ [1]

بینہ نمبر ۲

مشائخ کی اصطلاح میں سیر لطائف کے دوران جب سالک پر محبت الٰہیہ میں نور حق کا اس قدر غلبہ ہو جائے کہ اشیاء کائنات غلبۂ شہود حق کی معیت میں عین حق نظر آنے لگیں تو اس مرتبے کو توحید وجودی کہتے ہیں۔ اور اگر اشیائے کائنات سالک کی نظر سے گم ہو جائیں اور اشیاء کے پردوں کے پرے جمال حق کا مشاہدہ ہو جائے تو اس کو توحید شہودی کہتے ہیں۔ توحید وجودی لطیفۂ روح سے ظاہر ہوتی ہے یا یوں کہہ لیں کہ توحید وجودی کا احساس لطیفۂ قلب کی سیر میں ہوتا ہے جب کہ توحید شہودی کا ادراک فنائیت لطائف میں ہوتا ہے۔

توحید وجودی کی اقسام

واضح رہے کہ اس مکتوب گرامی میں حضرت امام ربانی قدس سرہ العزیز نے توحید وجودی کی ایک خاص قسم بیان فرمائی ہے جو آپ پر ظاہر ہوئی ورنہ توحید وجودی کی تعبیرات اور اس کی اقسام صوفیائے وجودیہ کے نزدیک مختلف ہیں جیسا کہ ان کی کتابوں سے ظاہر ہے۔

---

[1] (دفتر اول مکتوب ۴۳)

قارئین کی معلومات کے لئے پانچ قسمیں درج کی جاتی ہیں:

پہلی قسم: سالک اپنے آپ کو عین حق دیکھتا ہے۔

دوسری قسم: سالک اپنے آپ کو ظلِ حق دیکھتا ہے۔

تیسری قسم: سالک اپنے آپ کو اور عالم کو حق تعالیٰ کا مظہر اور آئینہ دیکھتا ہے۔

چوتھی قسم: عالم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احاطہ کو احاطۂ ذاتی جانتا ہے۔

پانچویں قسم: عالم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معیت کو معیت ذاتی جانتا ہے۔

بینہ نمبر۳:

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کائنات کے ساتھ احاطہ اور معیت ذاتی نہیں، علمی ہے۔ صوفیائے وجودیہ کی مذکورہ بالا تعبیرات کو ان کا عقیدہ نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ غلبۂ حال اور سکر وقت پر محمول جاننا چاہیئے کیونکہ **اناالحق** اور **سبحانی مااعظم شانی** اگر (معاذ اللہ) ان کا عقیدہ ہوتا تو وہ نمازوں سمیت تمام احکام شرعیہ کی پابندی کس لیے اور کیوں کرتے رہے؟

جب کہ وہ تقویٰ اور اتباع شریعت کی اعلیٰ منزلوں پر بھی فائز تھے، جیسا کہ حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر روز و شب میں فرائض کے علاوہ ایک ہزار رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے۔[1]

---

[1] (نفحات الانس مترجم، ص ۳۴۱)

تمام اشیاء میں تجلی اسم ظاہر کے ظہور کا مفہوم

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

"اثنائے راہ سلوک میں حق تعالیٰ اسم ظاہر کی تجلی سے اس قدر جلوہ گر ہوا کہ تمام اشیاء میں خاص تجلی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ظاہر ہوا"۔

اس مضمون کو سمجھنے کے لیے درج ذیل حقائق پیش نظر رکھنے چاہئیں:

طریقِ سلوک میں جب سالک کا مراقبات اسماء وصفات سے گزر ہوتا ہے تو سالک کے لیے چار اسماء یا چار صفات کی سیر بنیادی ارکان کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ ہیں: الاول والاٰخر والظاهر والباطن۔

ان مراقبات میں آیت مبارکہ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (الحدید ۳) کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور ان اسماء وصفات پر غور و تدبر سے سالک پر ان کے اسرار و انوار منکشف ہوتے ہیں۔ خاص کر اسم الظاهر والباطن سالک کے روحانی عروج کے لیے دو پر یا دو بازو ہیں جن کے ذریعے عالم قدس کی طرف پرواز ہوتی ہے۔

صوفیاء کے نزدیک اسم الظاهر کی تجلیات کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب و محیط ہے اور ہر شئ سے اس کے جلوے ظاہر ہو رہے ہیں اور اسم الباطن کی تجلیات سے یہ راز کھُلتا ہے کہ وہ ہر شئ کی ذات سے بھی اس شئ کے زیادہ قریب ہے، ان دونوں اسماء کی سیر سے سالک کو یقین ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ظاہر اتنا ہے کہ ہر چیز کا وجود اس کی ذات پر دلالت کرتا ہے اور ذرے سے لے کر آفتاب تک سب کچھ اس کے وجود کی شہادت دیتا ہے اور باطن اتنا ہے کہ قرب کے باوجود ہر شئ اس کی حقیقت کے ادراک سے عاجز و قاصر ہے۔

برگِ درختان سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفتِ کردگار

سیر اسماء وصفات

صوفیاء کرام کے مطابق سیر اسماء وصفات کا مفہوم اس آیت سے ماخوذ ہے:

وَلِلّٰہِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَی فَادْعُوہُ بِهَا (الاعراف ۱۸۰)

اسماءِ حسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات تو لامتناہی ہیں لیکن ان سب کا مرجع ننانوے اصول متناہیہ کی طرف ہے انہیں اسمائے حسنیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

امہات اسماء

اسماء حسنیٰ کا مرجع آٹھ اصولوں کی جانب ہے جنہیں امہات اسماء کہتے ہیں اور وہ یہ ہیں حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور تکوین نیتجتاً ان تمام اسماء کا مرجع ایک اصل کی جانب ہے اور وہ اسم اللہ ہے جو جامع ہے جمیع اسماء الہٰیہ کا اور شامل ہے جمیع صفات الہٰیہ کو۔

احصائے اسماء

سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

إن للہ تسعة وتسعين اسما. مائة إلا واحدا. من أحصاها دخل الجنة۔

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں جس نے ان کا احصاء کر لیا وہ جنت میں داخل ہوا۔

یہاں احصائے اسماء سے مراد اسمائے حق تعالیٰ سے متحقق اور متخلق ہونا ہے صرف اسماء کا وظیفہ کرنا اور ان کا تلفظ یا تکرار یا شمار مراد نہیں۔

دائرۂ اسماء

دوائر محبت میں پہلا دائرہ اسماء کا ہے۔ سالک مبتدی جب مسمیٰ تک نہیں پہنچ سکتا تو اسم سے ہی اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہے۔ اس دائرے میں سالک کو معرفت ذات بواسطۂ اسماء کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دائرۂ صفات

دوسرا دائرہ صفات کا ہے۔ اس دائرے میں سالک صفات کے پرتو سے فیض یاب ہوتا ہے اور کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صنعت کے نمونے اس کی صفات کے مظہر نظر آتے ہیں۔ اس دائرے میں معرفتِ ذات بواسطۂ صفات کی تربیت دی جاتی ہے۔

دائرۂ ذات

تیسرا دائرہ ذات کا ہے۔ اس دائرے کی وسعت لامحدود ہے۔ اس میں نہ اسماء پیش نظر ہوتے ہیں نہ صفات بلکہ اس میں معرفت ذات بلاواسطہ اسماء وصفات کا سبق دیا جاتا ہے۔

سیر دوائر

مراقبہ اسم الظاہر

مراقبہ اسم الظاہر میں منشاء فیض وہ ذات حق تعالیٰ ہے جس کے اسماء مبارکہ میں سے ایک اسم مبارک ''الظاھر'' ہے۔ اس کا مورد فیض لطیفۂ نفس (مع لطائف خمسہ) ہے۔ اس مراقبے میں سیر

اسماء و صفات کی تجلیات میں ہوتی ہے۔ بغیر ملاحظہٗ ذات تعالت و تقدست کے پس سالک کی سیر تجلیات صفات میں مظاہر اسم الظاھر کی سیر ہے اور سالک کی سیر اسماء صفاتیہ میں مظاہر تجلیات اسم الباطن کی سیر ہے۔

سیر و سلوک

سیر و سلوک کا مقصد تصفیہٗ باطن اور تزکیہٗ نفس کے ذریعے حجابات کو دور کرنا ہوتا ہے۔(خواہ یہ حجابات وجوبی ہوں یا امکانی) تاکہ مطلوب کے ساتھ بے کیف وصل عریانی (بے پردہ وصال) حاصل ہو سکے۔

سیر

سالک کے ایک حال سے دوسرے حال، ایک تجلی سے دوسری تجلی، ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ سیر دو قسم پر ہے سیر آفاقی اور سیر انفسی۔

جیسا کہ آیت قرآنی ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ (فصلت ۵۳)

ابھی ہم اُنہیں دکھائیں گے اپنی آیتیں دنیا بھر میں اور خود اُن کے آپے میں۔

آفاق سے مراد کائنات ہے اور انفس سے مراد اپنی ذات ہے۔ آفاق اور انفس کے درمیان اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے محل و منظر ہیں جن سے حق تعالیٰ کا پتہ چلتا ہے۔

سیر آفاقی میں تجلیات اسماء وصفات کا ظہور ہوتا ہے اور سیر انفسی میں تجلیات ذات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیر آفاقی میں اسم ظاھر کے معارف و تجلیات سالک کی تعبیر وادراک میں سما سکتے

ہیں لیکن سیر انفسی میں اسم باطن کے معارف و تجلیات سالک کے احاطۂ ادراک سے وراء ہوتے ہیں کیونکہ ذات کے معارف و تجلیات، بے رنگی اور بے کیفی کے سبب سالک کے فہم سے بلند ہوتے ہیں۔

اسی لئے عارفین نے اسم ظاہر کے معارف کے متعلق فرمایا:

من عرف اللہ طال لسانہ۔

یعنی جس نے اللہ کو پہچان لیا اس کی زبان دراز ہو گئی۔

اور اسم باطن کے معارف کے بارے میں فرمایا:

من عرف اللہ کل لسانہ۔[1]

جس نے اللہ کی معرفت حاصل کی اس زبان گنگ ہو گئی۔

سلوک

خدا تک پہنچنے کا وہ راستہ جو بطریق مجاہدہ یا بذریعہ سیر کشفی عیانی طے کیا جائے (نہ کہ بطریق) سلوک کہلاتا ہے۔

سالک

اس راستے پر استقامت کے ساتھ چلنے والے اور ساعت بہ ساعت ترقی کرنے والے کو سالک کہتے ہیں، **ھو الذی مشی علی المقامات بحالہ لا بعلمہ۔** یعنی جو اپنے حال کے مطابق مقامات طے کرتا چلا جائے (نہ کہ محض علم و قال کے بل بوتے پر)۔

---

[1] (کتاب التعریفات، ص ۱۱۵)

عارف

اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے مقدرات کو بطریق حال و مشاہدہ (نہ کہ بطریق مجرد علم) پہچاننے والے کو عارف کہتے ہیں۔

بینات

صوفیائے وجودیہ کے نزدیک تمام اشیائے کائنات کی صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں اور وہ تمام مخلوقات کو حق تعالیٰ کے ظہورات قرار دیتے ہیں اور اسی بنیاد پر وہ اشیائے کائنات کو عین وجود حق تسلیم کرتے ہیں اور امکان و وجوب کو جمع کرتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت ابن عربی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

وصور العالم لا یمکن زوال الحق عنها اصلاً۔

یعنی عالم کی صورتوں سے حق تعالیٰ کا جدا ہونا ممکن نہیں۔

لیکن صوفیاء شہودیہ اشیائے کائنات میں وجود حق کی بجائے شہود حق کے قائل ہیں اور حق تعالیٰ کی ذات کو کائنات سے وراء الوراء جانتے ہیں اور امکان و وجوب کو ایک دوسرے کی ضد مانتے ہیں اور فرمان رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہے:

رأيت ربي في أحسن صورة۔[1]

اور آیت کریمہ:

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (البقرة ۱۱۵)

---

[1] (سنن الترمذی، ج۵، ص ۳۶۷)

اس سے اللہ تعالیٰ کا شہود مراد لیتے ہیں اور ذات حق کو صورتوں اور جہتوں سے منزہ مانتے ہیں۔ البتہ وہ شکلوں و صورتوں کو مظاہر ظلالِ صفات قرار دیتے ہوئے اس شہو کو مجازاً تجلی صوری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اس قسم کی تجلی کو سیر آفاقی کا حصہ قرار دیتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

تجلیاتیکہ در صور حسی و مثالی وآنچہ درپردۂ انوار است ہمہ داخل سیر آفاقی است۔

یعنی وہ تمام تجلیات جو حسی اور مثالی صورتوں اور مختلف انوار کے پردوں میں سالک کو نظر آتی ہیں وہ سب سیر آفاقی میں داخل ہیں۔

سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ سیفیہ میں اسماء وصفات کے اذکار و تکرار کی بجائے تکرار اسم ذات و اذکار نفی اثبات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس نسبت کا منتہاء و مقصود فقط ذات حق ہے نہ کہ صرف اسماء و صفات۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ کے اکابر تجلیات ظلیہ صفاتیہ سے قرار نہیں پکڑتے بلکہ تجلیات اصلیہ ذاتیہ سے صبر و سکون پاتے ہیں اور ان کی نسبت خاصہ بھی تجلی ذاتی ہے نہ صرف تجلی برقی۔ فافھم۔

واضح رہے کہ اسم الظاھر و الباطن کے انوار و معارف کا ظہور "یا ظاھر یا باطن" کے وظیفہ و تکرار پر موقوف نہیں بلکہ ان کا تعلق مراقبہ و عرفانِ توحید اور منازل سلوک طے کرنے کے ساتھ ہے۔

صوفیائے نقشبندیہ نے سالک کی ترقی کے لئے ابتداء میں تکرار اسم ذات مقرر فرمایا ہے اور متوسط و منتہی کے لیے تکرار نفی اثبات مناسب جانا ہے اور منتہی کے لیے ابتداء میں نماز کے باہر

تلاوت قرآن پاک اور انتہاء میں نماز کے اندر تلاوت قرآن پاک کا مشورہ دیا ہے اور یہی طریقہ ان کے نزدیک وصول الی اللہ کے لئے انسب واسبق ہے۔

سالک کو ابتدائی مرحلے میں تکرار اسمِ ذات کا ذکر اس لئے دیا جاتا ہے کہ ذکر اسمِ ذات جذب و محبت کا ذریعہ ہے اور عالم وجوب کی طرف میلان و پرواز کا مؤثر سبب ہے۔ فرمان رسالت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ کے مطابق: مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ۔

(یعنی جو کسی شئ سے محبت رکھتا ہے اس کا ذکر بھی کثرت سے کرتا رہتا ہے) ذکر محبوب، علامات محبت میں سے ہے اور جذبۂ محبت ہی سالک کو کثرت ذکر پر مجبور کرتا ہے کیونکہ مسمیٰ کی محبت اسم کی محبت پر دلالت کرتی ہے۔

سالک کو تکرار اسمِ ذات کی برکت سے مراتب وجوب کا شہود نصیب ہوتا ہے اور یہ فیض شہود اس کو کشف کی راہ سے مسلسل محسوس ہوتا رہتا ہے، اگر سالک صاحب کشف نہ بھی ہو تو وجدان اور ذوق باطنی کے ذریعے اس کو حجابات اُٹھنے کا احساس اور لذت قرب کی یافت ہوتی رہتی ہے۔

متوسط کے لئے تکرار نفی اثبات اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ وہ ظلال کی ولایت سے اصل تک پہنچے۔ منتہی کے لیے تلاوت قرآن پاک اس لیے ضروری قرار دی جاتی ہے تاکہ ظلال اور نفس کی گرفتاری سے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف پائے اور اسرار ربانی کو سمجھ سکے، و باللهِ التوفیق۔

(البینات شرح مکتوبات)

[عرضداشت: کمترین بندگان احمد حضور کی خدمت میں عرض اور حسب حکم مبارک گستاخی کرتا ہے اور اپنے احوال پریشان بیان کرتا ہے کہ دورانِ راہ وذات اسم الظاھر میں اس قدر متجلی ہوئی کہ خاص خاص تجلی میں علیحدہ علیحدہ ظہور فرمایا۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس جو کہ دین کی تجدید کرنے والے ہیں اور سب علماء اس پر متفق ہیں کہ وہ فاروقی نسب، عالم، مجاہد اور صوفی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے لئے کم ترین بندگان کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ وہ اپنے فاروقی نسب، علم، جہاد اور تقویٰ کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ کم ترین بندگان احمد کو اس راستہ تصوف میں اسم الظاھر کی تجلیات منکشف ہوئی ہیں اور وہ تجلیات مختلف قسم کی ہیں۔

ہمیں چاہیئے کہ ہم بھی اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوں کہ اول تو ہم الف و با کو بھی نہیں سمجھتے، ذکر نہیں کرتے، رات کی عبادت کے لئے نہیں اٹھتے مگر جب ہم باتیں کرنا شروع کرتے ہیں تو وہ بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں مثال کے طور پر جب کسی امیر آدمی نے کسی کے گھر جانا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں کل آپ کے گھر تشریف لاؤں گا یعنی وہ شخص خود اپنے آپ کو عزت دیتا ہے مگر مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس باوجود اتنی بڑی شان کے اپنے لئے کم ترین بندگان کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔

[خصوصاً عورتوں کے لباس میں بلکہ ان کے الگ الگ اجزأ میں ظہور فرمایا اور اس وقت میں اس گروہ مستورات کا اس قدر مطیع و منقاد ہوا کہ کیا عرض کروں۔ اور میں اس انقیاد و اطاعت میں بے اختیار تھا۔ وہ ظہور جو عورتوں کے لباس میں ہوا وہ کسی اور جگہ نہیں تھا۔ خصوصی لطائف اور حسن و جمال کے عجیب و غریب نظارے جو اس لباس میں ظاہر ہوئے کسی اور مظہر میں ظاہر نہ ہوئے۔ میں ان کے آگے اپنے آپ کو پانی کی طرح پگھلا ہوا محسوس کرتا تھا، اسی طرح کھانے اور پینے کی ہر چیز میں علیحدہ علیحدہ ظہور ہوا۔ وہ لطافت اور حسن جو لذیذ اور پر تکلف کھانے میں تھی اس کے ماسوا میں نہ تھی۔ اور میٹھے پانی اور غیر میٹھے پانی میں بھی ایسا ہی فرق تھا، بلکہ ہر لذیذ اور شیریں چیز میں اپنے اپنے

درجات کے مطابق خصوصی کمال کا ظہور تھا۔اس تجلی کی خصوصیات کو تحریر میں نہیں لا سکتا۔اور اگر حاضر خدمت ہوتا تو شاید عرض کرتا، لیکن ان تجلیات کے دوران رفیق اعلیٰ (محبوب حقیقی) کی آرزو رکھتا تھا۔ اور ان تجلیات کی طرف اپنی وسعت کے مطابق توجہ نہیں کرتا تھا، لیکن غلبۂ حال کی وجہ سے کوئی چارہ نہیں پاتا تھا۔ اس اثناء میں معلوم ہوا کہ یہ تجلی خدا تعالیٰ کی نسبت تنزیہی سے کوئی مخالفت نہیں رکھتی اور یہ کہ باطن اسی طرح اس نسبت تنزیہی کا گرفتار ہے ظاہر کی طرف بالکل متوجہ نہیں۔ اور میرے ظاہر کو بھی جو اس نسبت سے خالی اور معطل تھا۔اس تجلی سے مشرف فرمایا میں نے بالیقین ایسا پایا کہ باطن بالکل کج نظری میں مبتلا نہیں ہے۔بلکہ تمام معلومات اور ظہورات سے اعراض کیے ہوئے ہے اور ظاہر جو کثرت اور دوئی کی طرف متوجہ تھا وہ بھی ان تجلیات سے بہرہ ور ہوا ہے۔ کچھ وقت کے بعد یہ تجلیات اخفا اور پوشیدگی میں چلی گئیں۔ اور وہی حیرت و نادانی کی حالت قائم اور موجود رہی۔]

تشریح

اب اگر یہ بات کوئی غیر مقلد پڑھے تو وہ کہے گا کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس تو عورتوں اور خواہشات نفسانی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

کیونکہ عورتوں میں دو خوبیاں ہوتی ہیں:

(۱) قابلیت افادہ: عورت اپنے خاوند کے نطفہ کو اپنی رحم میں رکھتی ہے اور اس کو ضائع نہیں کرتی۔

(۲) قابلیت استفادہ: وہ اپنی اولاد کی پرورش کرتی ہے اور ان سے فائدہ حاصل کرتی ہے۔

ان دو حالتوں کی وجہ سے عورتوں میں لطافت، نرم دلی، اور رحم دلی زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ زیادہ تجلیات عورتوں کے کپڑوں اور اندام میں نظر آتی تھیں۔ اس لئے کہ وہ کیفیت افادہ واستفادہ ان کو نظر آتی تھی یہ نہیں تھا کہ شیطانی وساوس سے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کا شوق بڑھ گیا تھا۔

اس کے علاوہ جب حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کھاتے یا پیتے تو لذیذ چیزوں میں آپ پر اسم الظاھر کی تجلیات کا ظہور ہوتا تھا۔ یعنی کھانے، پینے اور مستورات کے کپڑوں میں بڑی لذت محسوس کرتے تھے اور ان چیزوں میں اپنے آپ کو پانی کی طرح پگھلا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ان سب اشیاء میں لطافت بھی محسوس کرتے تھے مگر رفیق اعلیٰ (محبوب حقیقی) کی آرزو بھی رکھتے تھے یعنی یہ تجلیات جو ان پر ظاہر ہوتی تھیں وہ ان کی نفی کرتے اور ان پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے محبوب حقیقی کی تلاش میں رہتے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ میری حالت یاس وناامیدی، نادانی اور جہل کی سی ہو گئی کہ جو نظارے میں نے کیے وہ سب کچھ کیا تھا اور مجھ سے کیوں مخفی ہو گیا۔ یونہی جب کسی سالک کی ترقی ہوتی ہے تو وہ چیزیں جو اس پر منکشف ہو چکی ہوتی ہیں وہ اس سے پوشیدہ ہو جاتی ہیں۔ مگر آج کل صوفیاء کرام اس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ اگر ان پر کوئی کیفیت آکر پھر معدوم ہو جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ہماری روحانیت تو ختم ہو گئی پھر وہ خدا سے دوری اختیار کر لیتے ہیں اور حال یہ ہے کہ دوری کی کیفیت جو صوفی پر آتی ہے اور ہر جگہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ کیفیت اچھی ہے مگر یہ کیفیت (جہالت کی وجہ سے) صوفی کے لئے بربادی کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ یہیں سے غرور و تکبر پیدا ہوتا ہے۔

ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ قدس اللہ تعالیٰ سرہُ الاقدس کے متعلقین میں سے اگر کوئی آپ کے سامنے وضو کرتا تو وضو سے دھلنے والے گناہ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دیکھ لیتے۔ چنانچہ یہ سوچ کر کہ مجھے ان لوگوں کے پوشیدہ گناہوں سے واقف نہیں ہونا چاہیئے۔ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور دعا فرمائی کہ اے اللہ سبحانہ وتعالیٰ مجھ سے یہ کیفیت دور فرما تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہوئے وہ کیفیت ختم فرما دی۔ جبکہ آج کے دور میں صوفیانہ لباس میں ملبوس لوگوں کی یہ خواہش وتمنا ہوتی ہے کہ وہ کشف و کہانت سے لوگوں کو ان کے دلوں کی باتیں بتائیں۔ اس مقصد کے لئے وہ مختلف قسم کے وظائف اور چلے کاٹتے ہیں اور پھر بزرگی کا لبادہ اوڑھ کر سادہ لوح لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور دینی علم سے دوری کی وجہ سے لوگ بھی ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ جبکہ فرقۂ ناجیہ اہل سنت والجماعت کے عقائد کا مسئلہ ہے کہ کاہن اور اس کی تصدیق کرنے والا دونوں کافر ہیں۔

جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

قال النبی ﷺ من أتی کاھناً فصدقه بما یقول فقد کفر بما أنزل علی محمد ﷺ۔[1]

ترجمہ: حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کسی کاہن کے پاس آئے اور اس کی کہی ہوئی بات کو سچ جانے تو اس نے اس کتاب کا انکار کیا جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے (حضرت) محمد ﷺ پر نازل فرمائی۔

---

[1] (شَرحُ العَقَائدِ النَّسَفِیَّة، ج ۱، ص ۹۸)

دوسری حدیث مبارکہ میں یوں ہے:

عن حفصة قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من أتى عرافا فسأله عن شيء لم تقبل صلاة أربعين ليلة"۔[1]

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کاہن کے پاس آئے اور اس سے (غیب کی) کسی بات کا سوال کرے اور اس کو سچا جانے تو اس کی چالیس رات (دن) کی نمازیں قبول نہ کی جائیں گی۔

مگر آج کل ہر جگہ نجومی لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اور بورڈوں پر لکھا ہوتا ہے کہ آئیں ہم آپ کو آپ کے ماضی اور مستقبل کی باتیں بتاتے ہیں۔ عقائد کی رو سے یہ لوگ کافر ہیں اور جو لوگ نجوم کا عمل کرائیں وہ کاہن ہی کی طرح ہیں یعنی کافر ہیں۔

کیونکہ شرح العقائد النسفی میں ہے کہ:

والكاهن هو الذي يخبر عن الكوائن في مستقبل الزمان ويدعي معرفة الأسرار ومطالعة علم الغيب، كان في العرب كهنة يدعون معروفة الأمور، فمنهم من كان يزعم أن له رئيساً من الجن وتابعة تلقى إليه الأخبار، ومنهم من كان يدعي أنه يستدرک الأمور بفهم أعطيه۔ والمنجم إذا ادعى العلم بالحوادث الآتية فهو مثل الكاهن، وبالجملة العلم بالغيب أمر تفرد به الله تعالى، لا سبيل إليه للعباد إلا بإعلام منه تعالى وإلهام بطريق المعجزة أو الكرامة أو إرشاد إلى استدلال بالأمارات فيما يمكن ذلک فيه، ولهذا ذكر في الفتاوى أن قول القائل عند رؤية هالة القمر: يكون المطر، مدعياً علم الغيب لا بعلامة كفر۔[2]

---

[1] (رواه الصحيح المسلم والمشکوٰۃ باب الكهانة، ص ۳۹۳)

[2] (شرح العقائد النسفية، ج ۱، صی ۹۸)

ترجمہ: اور کاہن وہ شخص ہے جو مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں خبر دے اور اسرار کی معرفت اور غیب سے آگاہ ہونے کا مدعی ہو۔ بتحقیق عرب میں کچھ کاہن تھے جو امور غیبیہ کی معرفت کے مدعی تھے اور ان میں سے بعض یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے پاس دکھائی دینے والے اور ساتھ رہنے والے جن ہیں جو ان کو خبریں پہنچاتے ہیں اور بعض یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ اپنی خداداد ذہانت کے ذریعہ امور غیبیہ کا ادراک کر لیتے ہیں اور نجومی جب آئندہ کے واقعات جاننے کا دعویٰ کرے تو وہ کاہن کی مثل ہے بہر حال غیب کا علم ایسی چیز ہے جس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ منفرد ہے بندوں کے لئے اس کی طرف کوئی راستہ نہیں مگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے بتانے سے یا معجزہ یا کرامت کے طور پر الہام کرنے سے یا ان چیزوں میں علامات سے استدلال کی طرف راہنمائی کرے تو ایسا ممکن ہے اسی وجہ سے فتاویٰ میں مذکور ہے کہ چاند کا ہالہ دیکھنے کے وقت کہنے والے کا علم غیب کے دعویٰ کے ساتھ یہ کہنا کہ بارش ہو گی کفر ہے اور اگر بارش کی علامت دیکھ کر بارش کی پیشن گوئی کرے تو کافر نہیں ہو گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ نہ صرف نجومیوں کا وہ عمل غلط ہے بلکہ برصغیر پاک و ہند کی بعض خانقاہوں پر "حساب" کرنے یا "کتاب" نکالنے کا جو طریقہ مروج ہے وہ بھی سراسر خلاف شریعت ہے کیونکہ اس میں بھی غیب کی ہی باتیں بتائی جاتی ہیں اور سادہ لوح و پریشان حال لوگوں سے پیسے بٹورے جاتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر کسی صوفی پر ایسی کیفیت طاری ہو بھی تو وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ مجھ سے یہ کیفیت ختم فرما، تاکہ وہ کیفیت اس کے ایمان کے زوال کا سبب نہ بنے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

اسم الظاھر کی تجلی کا ظہور عورتوں کے لباس میں

مقدمہ کے طور پر یہ امر ذہن نشین رہے کہ صوفیائے شہودیہ کے نزدیک ممکنات کی حقیقت عدم محض ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کائنات بنانے کا ارادہ فرمایا تو عدمات محضہ پر اپنی صفات کے ظلال کا انعکاس فرمایا جس سے کائنات وجود میں آگئی، لہٰذا ہر ہر فرد ممکنات میں اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کے ظلال کا پرتو موجود ہے لیکن ہماری مادی نگاہیں اس کے ادراک و احاطہ سے قاصر ہیں۔ البتہ اولیائے عارفین کی باطنی نگاہیں اس کا ادراک کر لیتی ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتی ہیں۔

جیسا کہ حدیث شاہد ہے:

اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله۔[1]

ظلال

ظلال صفات سے مراد تعلقاتِ صفات یا تمثال صفات ہیں تعلقات صفات کی مثال جیسے علم کا تعلق معلومات کے ساتھ اور قدرت کا تعلق مقدورات کے ساتھ ہے۔

تمثال صفات کی مثال جیسے آئینے میں زید کی صورت، تمثال زید ہے۔ بعض اوقات ظلالِ صفات کو مجازی طور پر صفات کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

[1] (سنن الترمذي، ج۵، ص۲۹۸)

وجوہات تخصیص

متن کی عبارت کے مطابق حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے سیر توحیدی وجودی کے دوران اشیائے کائنات میں اللہ تعالیٰ کے اسم الظاہر کی تجلیات کا مشاہدہ فرمایا۔ لیکن خاص طور پر عورتوں کے وجود میں یہ تجلی زیادہ مشہور ہوئی۔

تخصیص نساء کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں:

پہلی وجہ

انسان میں دو طرح کی قوتیں موجود ہیں۔ قوت فاعلہ اور قوت منفعلہ۔ قوت فاعلہ اثرانداز ہونے کی قوت کا نام ہے اور قوت منفعلہ اثر قبول کرنے کی قوت کا نام ہے۔ عورتوں میں اولاد کی تربیت و رضاعت کی استعداد سے قوت فاعلہ کا اظہار ہوتا ہے اور نطفہ قبول کرنے کی استعداد سے قوت منفعلہ ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا عورتوں کی فطرت میں فاعلیت اور انفعالیت کی تاثیر کے غلبہ اور استعداد کی لطافت سے ہی وجہ تخصیص مفہوم ہوتی ہے۔

دوسری وجہ

ظلال صفات کے انعکاس کی جو مختلف الانواع تاثیرات کائنات پر وارد ہوتی ہیں اشیائے کائنات ان تاثیرات کو بقدر ظرف و صلاحیت قبول کرتی ہیں۔ چونکہ عورتوں کے وجود میں اخذ و قبول کی صلاحیت اور افادہ و استفادہ کی استعداد زیادہ موجود ہے لہٰذا اسم الظاہر کی تجلیات کا عورتوں کے وجود میں زیادہ ظاہر ہونا ایک لازمی اور فطری امر ہے۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمایا ہے:

فشهود الحق فی النساء اعظم الشهود و اکمله۔

یعنی عورت کی ذات میں حق تعالیٰ کا شہود، اعظم اور اکمل شہود ہے۔

تیسری وجہ

عورتوں کے لباس میں اسم الظاہر کی تجلی کا یہ شہود ہمہ وقتی اور دائمی نہ تھا بلکہ یہ ظہور و شہود ایک خاص حالت اور خاص وقت میں ہوا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کبھی کوہ طور میں اور کبھی درخت میں تجلی صوری کا مشاہدہ فرمایا۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ مستقل طور پر کوہ طور یا درخت میں مسلسل یہ تجلی دیکھتے رہے بلکہ ان پر بھی ایک خاص حالت اور خاص وقت میں آن واحد کے لیے یہ تجلی مشہود ہوئی۔

بینات

اس گروہ کا مطیع ہونے اور **پگھل جانے سے مراد معاذاللہ مادی یا جنسی محبت نہیں**۔ بلکہ غیر اختیاری اور فطری محبت مراد ہے اور یہ بھی کسی خاص عورت سے نہیں بلکہ جنس عورت سے ہے اور پھر یہ بھی ایک خاص حال کا بیان ہے ذاتی طلب نہیں۔ جیسا کہ اہل حال پر ظاہر ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (الأعراف ١٨٩)

اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا کہ اس سے چین (آرام) پائے۔

دوسری آیت میں ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (الروم ٢١)

اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے کہ اُن سے آرام پاؤ اور تمہارے آپس میں محبّت اور رحمت رکھی بے شک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں کے لیے۔

آیات بالا سے ثابت ہوا کہ مطلق عورت کے وجود سے رغبت اور محبت انسان کی فطرت میں رکھ دینا مشیت ایزدی کا ازلی تقاضا تھا۔ لہٰذا انسان عورت کی ذات سے محبت پر مجبور بھی ہے اور مامور بھی۔

قدرت نے عورت کی ذات میں اسم الظاھر کی تجلی کا ایسا نور ودیعت فرمادیا ہے کہ مرد اس کی دید سے اپنے اندر باطنی طور پر ایک انجانی سی مانوسیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام حضرت حوا کو اپنے قریب دیکھ کر طبیعتاً اور فطرتاً ان کی طرف راغب و مائل ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کسی دوسری شئ سے حضرت حوا کو پیدا کرنے پر قادر تھا لیکن حوا کو آپ کے جسم کے ایک حصے سے بنا کر عورت کی محبت کو مرد کے لئے ذاتی محبت بنادیا نیز اس جبی تعلق کو نکاح کے ساتھ مشروط فرما کر نسبت محمدیہ علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ کو دونوں کے درمیان حد فاصل بنا دیا، تاکہ دونوں کی روحانی اور جسمانی طہارت کا سلسلہ برقرار رہے۔

درج ذیل حدیث نبویہ علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ اس مضمون کی مؤید ہے۔

حضرت سرور عالم ﷺ نے فرمایا:

حبب الی من دنیا کم ثلٰثٌ الطیب و النساء و جعل قرۃ عینی فی الصلوٰۃ۔[1]

---

[1] (احیاء العلوم، ج ۴، ص ۳۱۴)

یعنی مجھے تمہاری دنیا سے تین چیزوں کی محبت دی گئی ہے اور وہ خوشبو ہے، عورت ہے اور نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھ دی گئی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے لیے اسماء وصفات کے مظاہر کے مشاہدے کے دوران دنیا کی پسندیدہ اشیاء میں خوشبو اور نماز کے علاوہ عورت کے وجود میں بھی تجلی اسم الظاھر مشہود ہوئی۔

بینہ نمبر ۴

تجلیات اسماء وصفات لاتعداد ہیں اور حضور سرورِ عالم ﷺ کے مراتب مشاہدات بھی بے شمار ہیں۔

شہود ممکنات کے مرتبے میں آپ اسم الظاھر کی تجلیات مشاہدہ فرماتے اور شہود ذات کے مرتبے میں اسم الباطن کی بے کیف تجلیات سے فیض یاب ہوتے۔ عورت کا وجود شہود ممکنات کا مرتبہ ہے، خوشبو اور نماز شہودِ ذات کا مرتبہ ہے، کیونکہ خوشبو روائح طیبہ سے ہے اور اس کا تعلق نفس الٰہی اور ریحُ الرحمٰن ک ساتھ ہے۔

جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

لَاَجِدُ نَفَسَ الرَّحمَانِ مِنْ هَاهُنَا۔[1]

اور نماز رؤیت الٰہی، مشاہدۂ ذات اور معراج المؤمنین کا مقام ہے۔

---

[1] (ذکرہ السیوطی فی الجامع الکبیر و اشار الی الیمن یہ روایت ان الفاظ سے بھی ملتی ھے کہ انی لا جد نفس الرحمٰن من قبل الیمن (تفسیر کبیر، ج ۲۲، ص ۶، فتوحات مکیہ، ج ۱، ص ۲۱۷))

جیسا کہ حدیث احسان میں ہے:

أن تعبد الله کأنک تراہ۔[1]

یہی وجہ ہے کہ شہود ممکنات کے مرتبے میں آپ نے عورت کو اور شہود ذات کے مرتبے میں خوشبو اور نماز کو محبوب قرار دیا جب آپ شہود ممکنات (مشاہدۂ تجلیات اسم الظاھر) سے فارغ ہوتے تو لِيْ مَعَ اللهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِيْ فِيْهِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ کے مرتبہ شہود ذات (مشاہدۂ تجلیات اسم الباطن) میں مصروف ہو جاتے لیکن چونکہ آپ جامع شہود تجلیات تھے لہٰذا ایک ہی وقت میں تجلیات متعددہ سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ آپ کا ظاہر تجلیات اسم الظاھر اور باطن تجلیات اسم الباطن سے شادکام رہتا۔

اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل
خواص اس برزخِ کُبریٰ میں حرف مشدد کا

بینات

حدیث مذکور میں حُبِّبَ (بلفظ مجہول) فرمایا گیا ہے یعنی یہ تین اشیاء میرے لیے محبوب بنائی گئیں ثابت ہوا کہ فی الحقیقیت حضور ﷺ کی محبت تو صرف ذاتِ حق سے ہے باقی محبتیں مصلحتاً آپ پر مسلط کی گئیں۔

نیز فرمایا مِنْ دُنْیَاکُمْ تمہاری دنیا سے "معلوم ہوا کہ خود حضور ﷺ حقیقت کے اعتبار سے اس دنیا سے نہیں بلکہ آپ اللہ تعالیٰ کے نور سے ہیں اور یہ دنیا آپ ﷺ کے نور سے مخلوق ہوئی۔

---

[1] (صحیح البخاری، ج ۱، ص ۱۲، مسلم، ج ۱، ص ۲۹)

جیسا کہ حدیث میں ہے:

اَنَامِنْ نُّوْرِاللّٰہِ وَالْخَلْقُ کُلُّھُمْ مِنْ نُّوْرِیْ۔[1]

اسی طرح حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا:

ہر چند بدقت نظر صحیفۂ ممکنات عالم را مطالعہ نمودہ می آید وجودِ آں سرور آنجا مشہود نمی گردد۔

یعنی جس قدر بھی باریک نظری کے ساتھ ممکنات عالم کے صحیفے کا مطالعہ کیا جاتا ہے حضور ﷺ کا وجود مبارک عالم ممکنات میں دکھائی نہیں دیتا۔

کھانے پینے کی پر تکلف اور لذیذ اشیاء میں دوسری عام اشیائے خوردونوش سے زیادہ تجلی اور لطافت کا معلوم ہونا اور میٹھے پانی سے لے کر پھیکے اور کڑوے پانی تک میں بھی فرق محسوس کرنا اس وجہ سے ہے کہ اشیائے ممکنات عدم سے ظہور میں آئی ہیں اور عدم سراسر ظلمت، کدورت اور کڑواہٹ سے متہم ہے۔ اس لیے جب عدم نے ظلال صفات کے پرتو سے وجود کا لباس پہنا تو ان تجلیات ظلال صفات سے اشیاء ممکنات میں حسن و خوبی اور لذت و حلاوت کی خصوصیات پیدا ہوئیں لیکن چونکہ لذیذ کھانے اور میٹھے پانی میں انعکاس زیادہ تھا اور غیر لذیذ کڑوی اشیاء میں انعکاس کم تھا اس لیے اشیاء میں یہ جداگانہ خصوصیات ظلالِ صفات کے انعکاس کی کمی یا زیادتی اور ان کے درجات اور استعدادات کے اختلاف کی بناء پر مشہود ہوئیں۔ و اللہ اعلم بحقیقۃ الحال

[1] (شرح قصیدہ خرپوتی)

رفیق اعلیٰ

چونکہ سالکین حضرات اپنی اپنی استعداد میں تفاوت رکھتے ہیں۔ بعض ناقص استعداد والے اس قسم کی تجلیات کے سامنے مغرور یا مفرور ہو کر طلب اور عروج سے باز رہ جاتے ہیں اور اسی مقام پر قناعت کر لیتے ہیں اور بعض کامل استعداد والے مشاہدۂ تجلیات کے وقت ثابت قدم رہتے ہیں چونکہ امام ربانی کی استعداد کامل تر اور ہمت بلند تر تھی اس لیے ان تجلیات ظلال صفات کے سامنے آپ کے حواس بھی قائم رہے اور رفیق اعلیٰ (ذات حق) کی طلب بھی بدستور موجود رہی۔

بینہ نمبر ۵

"رفیق اعلیٰ" اللہ تعالیٰ کا ایک اسم مبارک ہے بعض کے نزدیک انبیاء کی جماعت مراد ہے جو اعلیٰ علیین میں رہتی ہے اور بعض نے رفیق اعلیٰ سے بہشت مراد لی ہے۔

نزع کے وقت محبوب خدا ﷺ کی زبان اقدس پر یہ کلمات تھے:

اللھم الرفیق الأعلی۔[1]

یعنی اے اللہ مجھے رفیق اعلیٰ سے ملا دے۔

تنزیہہ و تشبیہ

اسمِ ظاھر کی تجلی کے شہود کے وقت حضرت امام ربانی کا ظاہر چونکہ کثرت اور دوئی کی طرف متوجہ تھا اس لیے وہ اسم الظاھر کی تجلیات سے مشرف ہوا لیکن باطن اسم الظاھر کی تجلیات سے ہر گز متاثر نہ ہوا کہ اس پر تنزیہی نسبت کا غلبہ تھا۔ اس فرمان کی بنیاد اس بات پر ہے کہ عارف ظاہر اور باطن کی ہر دو کیفیتوں سے مشرف ہوتا ہے اس کا ظاہر تجلیات صفاتیہ ظلیہ میں مشغول ہوتا ہے اور

---

[1] (صحیح البخاری، ج۴، ص ۱۶۲۰)

اس کا باطن تجلیات ذاتیہ اصلیہ میں غوطہ زن رہتا ہے، وہ تشبیہی نسبت کے باوجود تنزیہی نسبت سے بھی کامل حصہ رکھتا ہے۔ چونکہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ پر تنزیہی نسبت کا غلبہ تھا لہٰذا آپ عارضی طور پر وارد ہونے والی تشبیہی نسبت سے ہرگز متاثر نہ ہوئے، جیسا کہ ایک مقام پر آپ فرماتے ہیں:

"طریقۂ من طریقۂ سبحانی است کہ از رہِ تنزیہہ رفتہ ام"۔

یعنی میرا طریقہ، سبحانی طریقہ ہے کیونکہ میں تنزیہہ کی راہ سے خدا تک پہنچا ہوں۔

واضح ہو کہ نسبت تشبیہی توحید وجودی میں عیاں ہوتی ہے اور نسبت تنزیہی توحید شہودی میں حاصل ہوتی ہے گویا آپ فرماتے ہیں باوجودیکہ میرا ظاہر توحیدِ تشبیہی سے بہرہ یاب تھا لیکن باطن توحید تنزیہی سے بدستور مشرف رہا اور کچھ مدت کے بعد اسم الظاھر کی تجلیات اس طرح پوشیدہ ہو گئیں گویا کہ کبھی تھی ہی نہیں اور توحید تشبیہی کے عارضی احوال و معارف مکمل طور پر زائل ہو گئے۔

تشبیہ

حقیقت مطلقہ (ذات حق) کو مظاہر کونیہ کی صورتوں میں ملاحظہ کرنے کو تشبیہہ کہتے ہیں۔ تشبیہ کے معنی ہیں مشابہت دینا، علم کلام کی اصطلاح میں خالق کو مخلوق کی صفات سے متصف کرنے کا نام تشبیہ ہے۔

تنزیہہ

حقیقت مطلقہ (ذات حق) کو نقائص امکانیہ سے بری جاننا اور خالق کو مخلوق کی صفات سے متصف ہونے سے پاک ماننا تنزیہہ ہے (تنزیہہ کا معنی ہے پاک کرنا)۔

سُبۡحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ

حضرت ابن عربی قدس سرہٗ حق تعالیٰ کی ذات میں تشبیہ و تنزیہہ دونوں کو جمع کرتے ہیں جب کہ حضرت امام ربانی کا اصرار ہے کہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوات والتسلیمات کی شریعتوں میں توحید تنزیہی کا سبق دیا گیا ہے نہ کہ توحید تشبیہی کا۔ لہٰذا کشفی علوم و معارف کو وحی کے علوم و معارف پر ترجیح دینا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ توحید تنزیہی ہی اصل قرآنی توحید ہے کیونکہ تکمیل و بقاء کے مرتبے میں توحید تشبیہی کے احوال و معارف یکسر گم ہو جاتے ہیں۔

بینہ نمبر ۶

صوفیائے وجودیہ درج ذیل آیات سے توحید وجودی کا استنباط کرتے ہیں:

هُوَ الْأَوَّلُ وَ الْآخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ (الحدید ۳)

وَ مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الأنفال ۱۷)

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (الفتح ۱۰)

وَ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق ۱۶)

وَ هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید ۴)

اور اس کے علاوہ دیگر آیات و احادیث سے بھی تاویلات بعیدہ کے ساتھ توحید تشبیہی ثابت کرتے ہیں اور اس کو صوفیائے عارفین کا مشاہدہ بھی قرار دیتے ہیں اور تنزیہہ در تشبیہ اور تشبیہ در تنزیہہ کے قائل ہیں اور ذات حق کو جامع الاضداد بلکہ عین والاضداد قرار دیتے ہوئے جامع تنزیہہ و تشبیہ ثابت کرتے ہیں حالانکہ صوفیائے محققین اور علمائے متکلمین اہل سنت نے مذکورہ بالا نصوص سے توحید تشبیہی پر مشتمل معانی ہرگز مراد نہیں لیے جیسا کہ علمائے اہل سنت کی کتب عقائد و تفاسیر سے ظاہر ہے، واللہ و رسولہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

(البینات شرح مکتوبات)

[اور وہ تجلیات اس طرح معدوم ہو گئیں گویا وہ کبھی مذکور بھی نہیں ہوئی تھیں اس کے بعد ایک خاص فناء رونما ہوئی اور غالب گمان ہے کہ وہ یقین علمی جو تعین کے عود کرنے کے بعد پیدا ہوا وہ اس فنا میں گم ہو گیا اور نفسانیت و انانیت کے گمان کا کچھ اثر باقی نہ رہا۔ اس وقت اسلام کے نشانات ظاہر ہونا اور شرک خفی کے نشانات مٹنا شروع ہوئے۔ اسی طرح اپنے اعمال کی کوتاہی اور نیتوں اور خیالات کو لائق ملامت جاننے کا احساس شدت سے ظاہر ہوا۔ بالجملہ کچھ نشانات عبودیت اور نیستی کے پھر ظاہر و رونما ہوئے۔ خدائے سبحانہ و تعالیٰ آپ کی توجہ کی برکت سے بندگی کی حقیقت تک پہنچائے۔]

تشریح

فنا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی نفسانی خواہشات کو بھول جائے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اوامر کو تسلیم کرے اور ان پر عمل کرے۔ اس فنا کو علمی فنا کہا جاتا ہے یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے عشق میں اتنا فنا ہو جائے کہ اس کو کھانا، پینا، شہوت اور خواہشات نفس سب کچھ بھول جائے۔ یہ اسم الظاھر کی وہ ابتدائی کیفیت ہے جو حضرت منصور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر طاری ہوئی تھی کیونکہ وہ ان مذکورہ بالا سب باتوں سے بے خبر تھے۔ اسی طرح مجنوں بھی لیلیٰ کے عشق میں ان مذکورہ بالا باتوں سے بے خبر تھا۔ کیونکہ اسم الظاھر کی وہ تجلیات لیلیٰ میں ظاہر ہوتی تھیں۔

اس کے برعکس اگر کسی صوفی پر یہ کیفیت طاری نہ ہو اور وہ قصداً کہے کہ میں خدا ہوں (نعوذ باللہ من ذٰلک) تو یہ کفر ہے اور یہ عمل گمراہی، بدبختی اور تصنع (بناوٹ) ہے اور تصنع حرام اور کفر ہے کیونکہ حالت صحو میں اس طرح کہنا کفر جبکہ حالت سکر میں اس طرح کہنا کفر نہیں بلکہ عفو ہے۔ منصور حلاج قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس ہوش میں نہیں تھے اس لئے انھوں نے جو الفاظ استعمال کئے

ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ مجھ سے یہ چیز غائب ہو گئی الحمدللہ اب مجھ پر پر فنا رونما ہو گئی اور فنا یہ تھی کہ ان کا جسم ان کے نفس سے بالکل فارغ ہو گیا اس کی طرف ان کا کچھ خیال نہ رہا۔ یہ فنا علمی ہے۔

شرک خفی

ریا کرنا شرک خفی ہے، جو شخص ریاکاری کے لئے نماز پڑھے یا ریاکاری کے لئے قرآن عظیم الشان کی تلاوت کرے یا جہر کے ساتھ ذکر کرے تاکہ لوگ کہیں کہ یہ ذاکر ہے یہ سب شرک خفی ہیں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ مجھ سے ان سب چیزوں کے نشانات مٹنا شروع ہو گئے۔

ایک طرف حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی تعریف و توصیف فرماتے ہیں اور اپنی برائی کو بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے عمل کو کبھی بھی نیک نہیں سمجھا۔ دوسری طرف اگر کسی صوفی کو کشف ہونا شروع ہو جائے تو وہ کبھی بھی اس طرح نہیں کہتا کہ میں برا ہوں بلکہ اس کا نفس خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے (نعوذباللہ من ذٰلک) اور اگر خدا ہونے کا دعویٰ نہ بھی کرے تو مہدی ہونے کا دعویٰ کر لیتا ہے یا پھر اپنے آپ کو قیوم زمان یا قطب الاقطاب یا ابدال کہتا پھرتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ میں اپنے اعمال پر نادم تھا کہ میں نے یہ کیسا ناقص عمل کیا کیونکہ جس طرح عبادت کرنا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی شان کے ساتھ لائق ہے وہ میں نہیں کر سکتا یہ وہ ابتدائی کیفیت ہے جو سالک پر آتی ہے۔ جبکہ آج کے دور میں لوگ اپنے اعمال و کیفیات پر غرور کرتے ہیں فرائض کے تارک ہوتے ہیں اور نفلی امور کا اہتمام کرتے ہیں وہ

بھی اعلانیہ تاکہ لوگ ان کو شاباش دیں۔ جبکہ احادیث نبویہ ﷺ میں نفلی امور کو پوشیدہ طور پر ادا کرنے کی تعلیمات دی گئی ہیں تاکہ ریا اور غرور و تکبر پیدا نہ ہو۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے ان سب کیفیات کا شہود میں مشاہدہ کیا ہے پھر بھی نہ تو آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کسی قسم کا غرور و تکبر کیا اور نہ ہی ریا میں مبتلا ہوئے کیونکہ ایسا کرنا شرک خفی ہے۔

[عرش پر بہت سے عروجات واقع ہوئے۔]

تشریح

اب حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس قلب کی کیفیات بیان فرما رہے ہیں کہ قلب اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک برزخ ہے اگر قلب ذاکر ہو جائے تو پھر عرش اللہ بن جاتا ہے اور اگر قلب فاسد ہو تو انسان حیوان بن جاتا ہے کیونکہ حیوان کی عقل نہیں ہوتی۔ انسان کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عقل دی ہے حیوان اپنے شعور سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور انسان جس کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عقل اور روح بھی عطا کی ہے اگر یہ انسان حیوان کی بہ نسبت دوگنا ذکر نہ کرے تو یہ حیوان سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ حیوان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ذکر تو کرتے ہیں اور انسان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہتا ہے۔ آج کل اس طرح کے انسان بھی موجود ہیں جو ساری زندگی میں ایک دفعہ بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتے۔ یعنی نہ نماز پڑھی اور نہ ہی قرآن عظیم الشان کی تلاوت کی۔ تو ایسا شخص حیوان سے بھی بدتر ہے کیونکہ ایسا شخص اپنی کوتاہ نظری سے نہ تو حقیقت کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی دل کے کانوں سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے احکام کو سن سکتا ہے ایسا شخص أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (الأعراف ۱۷۹) کا مصداق ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں اس طرح کی نافرمانی کرنے والے کاموں سے نجات عطا فرمائے، آمین۔

حضرت مجد دالف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ جب قلب ذاکر ہو جائے تو اس کا عروج عرش سے اوپر ہوتا ہے اور عرش سے نیچے باقی اشیاء ممکنات ہیں یعنی عرش ممکنات سے خارج ہے تو صفات فعلیہ، اسماء، صفات ذاتیہ اور ذاتِ بحت میں اس کی سیر واقع ہوتی ہے۔ اور وہ ان سے فیض اخذ کرتا ہے اس وجہ سے حضرت مجد د الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے کہ میری سیر اب عرش سے اوپر شروع ہو گئی ہے۔ یعنی قلب ذاکر ہو گیا ہے۔ جس کا قلب ذاکر نہ ہو وہ شخص اگر ہزار دفعہ بھی حضور نبی کریم ﷺ ، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دے تو وہ ان سے فیض نہیں لے سکتا اس کے بر عکس اگر کسی کا قلب ذاکر ہو جائے تو ان سب بزرگوں سے فیض لے سکتا ہے۔

[مرتبہ اول: مسافت طے کرنے کے بعد جب عرش پر پہنچا تو یہ ایسا عروج تھا جہاں دار خلد (جنت) نیچے محسوس ہوتی تھی اس دوران دل میں آیا کہ اس جگہ بعض لوگوں کے مقامات دیکھوں۔ جب اس طرف متوجہ ہوا تو ان کے مقامات نظر پڑے اور ان اشخاص کو بھی ان کے تفاوت درجات کے مطابق ان مقامات میں پایا۔]

تشریح

حضرت مجد د الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ یہ ایک عروج تھا کہ میں نے نیچے جنت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام، صحابہ کرام، اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دوسرے لوگوں کے مقامات دیکھے۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک منبر کی سیڑھیاں ہوتی ہیں ویسے ہی جنت کے درجات ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت مجد د الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس جنت و دوزخ کو اسم الظاھر کے اثرات سے مشاہدہ کر رہے ہیں حالانکہ ابھی حضرت

مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اسمِ باطن تک نہیں پہنچے تھے۔ صرف اسم الظاھر اور اسماء کی تجلیات سے آپ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی یہ کیفیات ہیں تو پھر ہم لوگ کیوں کثرت سے ذکر نہ کریں تاکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمارے دلوں پر بھی وہ تجلیات وارد فرمائے، آمین

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

واضح ہو کہ تعین دو قسم پر ہے۔۔۔۔ تعین جسدی اور تعین علمی۔

جب سالک روحانی عروج کے دوران اپنی ذات اور جسم کی قید سے باہر آجاتا ہے اور اپنے آپ کو نہیں دیکھتا اور اپنے تعین جسدی کو فراموش کر دیتا ہے تو اس وقت وہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو اس کو اپنے سابق وجود (تعین جسدی) کا علم و شعور ہوتا ہے یا اپنے سابق تعین سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور اپنے تعین جسدی و علمی سے گزر کر دائرۂ لا تعین میں داخل ہو جاتا ہے جیسے روزہ دار شخص دن بھر شدید پیاس محسوس کرتا رہتا ہے لیکن جب افطار کے وقت پانی پی لیتا ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا تو دن بھر کی پیاس بدستور یاد رکھتا ہے یا بالکل بھول جاتا ہے۔

پہلی حالت میں اگرچہ پیاس کا تعین جسدی معدوم ہے لیکن اس کا تعین علمی باقی ہے دوسری حالت میں پیاس کا تعین علمی بھی باقی نہ رہا۔

پیاس کا یاد رہنا یہ تعین علمی ہے اور بھول جانا تعین علمی کی فنا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ عروج کے مرحلے میں وہ تعین علمی (اپنی انا کا شعور) جو تعین ذاتی (جسدی) کے عود کے بعد پیدا ہوا تھا وہ اس فنائے خاص میں گم ہو گیا، یعنی سالک کو کبھی عروج ہوتا ہے اور کبھی نزول ہوتا ہے۔ عروج کی حالت میں تعین علمی فراموش ہو جاتا ہے اور نزول کی حالت میں وہ تعین پھر

عود کر آتا ہے اور یہ عروج و نزول کی کیفیات کبھی تھوڑی دیر کے لیے طاری ہوتی ہیں اور کبھی لمبے عرصے کے لیے باقی رہتی ہیں۔

یہاں آپ فنا کے ایک خاص مرتبے کا بیان فرما رہے ہیں جہاں آپ پر اپنے نفس کی انا کا کوئی اثر باقی نہ رہا اور شرک خفی (تکبر، ریا، خواہشات نفس وغیرھا) کے دور ہونے کی علامات ظاہر ہوئیں اور حقیقی اسلام کے آثار رونما ہوئے اور اپنے اعمال کو ناقص اور نیتوں کو تہمت زدہ جاننا ظہور میں آیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بندے کو عجز و نیاز اور نیستی و بندگی کے اصل نشانات کا سراغ ملتا ہے اور مقام وجودیت وظلیت سے گزر کر مقام عبدیت پر فائز ہوتا ہے۔ **وذلک هو الفوز العظیم۔**

عروج فوق العرش

صوفیائے طریقت کے نزدیک ارواح لطیفہ اور لطائف نفیسہ کا ذکر اسم ذات و نفی اثبات و فنائے لطائف کے بعد عرش و فوق العرش سے عالم وجوب تک روحانی سیر و عروج فرمانا ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جو تواتر و توارث کا درجہ رکھتی ہے اور اس امر پر کثرت سے دلائل شرعیہ، سمعیہ اور ذوقیہ موجود ہیں۔

آیت کریمہ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ (المعارج ۴) سے بھی یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔

عروج

مخلوق سے انقطاع اور مشاہدۂ ذات و صفات میں استغراق کا نام عروج ہے۔ اولیائے کرام کا یہ عروج علمی اور روحی ہوتا ہے۔

عرش

اللہ تعالیٰ کی تجلیات ذاتیہ وصفاتیہ کا مرکز ہے۔

الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى (طٰہٰ ۵)

عرش سات آسمانوں اور جنت سے اوپر محیط کائنات ہے عالم امر اور عالم خلق کے درمیان حد فاصل ہے۔ دونوں کے ساتھ مناسبت کے باوجود دونوں کے آثار و احکام جداگانہ ہیں۔

عالم خلق

مَاوَجَدَعَنِ السَّبَبِ وَيُطْلَقُ بِإِزَاءِ عَالَمِ الشَّهَادَةِ۔

جہاں (سب کچھ) سبب کے ذریعے وجود میں آئے، اس پر عالمِ شہادت کا اطلاق آتا ہے، یعنی مادہ و مقدار سے پیدا ہونے والی مخلوق کو عالم خلق کہتے ہیں (جیسے عناصر اربعہ و ارضیات وغیرھا) عالم خلق کو عالم اسباب، عالم اجسام اور عالم ناسوت کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ان سب کے مجموعے کو عالم مادیات بھی کہتے ہیں۔

غرضیکہ عالمِ خلق، کائنات مادی پر مشتمل ہے جس میں ترتیب و تدریج ہے اور جس کی تخلیق میں زمانہ صرف ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ (الحدید ۴)

یعنی آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی، دن سے مراد ہزار سالہ دن ہے۔

وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (الحج ۴۷)

یا پچاس ہزار سالہ دن ہے۔

فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (المعارج ۴)

یا اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق اس سے بھی بڑا دن مراد ہے۔ (واللہ اعلم)

عالم امر

مَاوَجَدَعَنِ الْحَقِّ بِغَيْرِسَبَبٍ وَيُطْلَقُ بِإِزَاءِالْمَلَكُوْت۔[1]

جہاں (سب کچھ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر کسی سبب کے وجود میں آئے اور اس پر عالم ملکوت کا اطلاق آتا ہے۔

عالم امر کا ظہور لفظ کُنْ فرمانے سے ہوا:

إِنَّمَاأَمْرُهُ إِذَاأَرَادَشَيْئًاأَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (یسٓ ۸۲)

یعنی مادہ و مقدار اور ترکیب عناصر سے خالی اور فقط امر کن سے پیدا ہونے والی مخلوق پر عالم امر کا اطلاق آتا ہے (جیسے انسانی روحیں، ملائکہ اور لطائف مجردہ وغیرھا) عالم امر کو عالم غیب، عالم ارواح، عالم لاہوت اور عالم جبروت سے بھی یاد کیا جاتا ہے، ان سب کے مجموعے کو عالم مجردات بھی کہتے ہیں۔

آیت کریمہ: أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الأعراف ۵۴) میں اسی عالم خلق و امر کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

لطائف عشرہ

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں انسان کی ساخت دس اجزاء سے ہوئی ہے ان میں سے پانچ عالم خلق کے اجزاء ہیں اور پانچ عالم امر کے اجزاء ہیں، انہی اجزائے عشرہ کو لطائف عشرہ کہا جاتا ہے۔

---

[1] (كتاب التعريفات)

انسان لطائف عشرہ سے مرکب ہے، ان میں سے پانچ لطائف عالم خلق سے ہیں جو عرش کے نیچے کی مخلوقات سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ عناصر اربعہ (ہوا، پانی، آگ، مٹی) اور لطیفۂ نفس ہیں۔

دوسرے پانچ لطائف عالم امر سے ہیں جو عرش سے اوپر کی مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں ان کا وطن اصلی فوق العرش (عالم ارواح) ہے لیکن ان کے تعینات انسان کے جسم میں جدا جدا مقام رکھتے ہیں اور وہ قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ ہیں۔

جسم انسانی میں یہی وہ مواضع ہیں جن پر انوار و اسرار اور فیوض و برکات الٰہیہ کا نزول ہوتا رہتا ہے گویا یہ لطائف اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کے مختلف راستے ہیں اور ہر راستہ ایک اولوا العزم رسول کے زیر قدم ہے انسانی جسم میں آکر ان کی نورانیت زائل ہو گئی ہے، اس لیے سالکین ذکر کرنے کے ذریعے دوبارہ ان کو نورانی بنا لیتے ہیں۔

لطیفہ

انسان کے جسم میں محلِ نور کو لطیفہ کہتے ہیں اور اس کو نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں یہ وہ جوہر ہے جو مادہ سے خالی ہوتا ہے:

وَهِيَ الْجَوْهَرُ الْمُجَرَّدُ عَنِ الْمَادَةِ۔[1]

ان لطائف کا اصل مقام عرش کے اوپر ہے لیکن جسم انسانی کے ساتھ ان کا ایک لطیف تعلق قائم ہے، جس کی تطہیر سے سالکین کو عالم امر میں روحانی سیر و عروج نصیب ہوتا ہے۔

---

[1] (کتاب التعریفات)

لطائف کے نام قرآن سے

صوفیائے کرام نے لطائف کے اصطلاحی نام قرآن حکیم سے لیے ہیں، مثلاً قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ اور نفس کا ذکر درج ذیل آیات میں ہے:

إِنَّ فِي ذَلِکَ لَذِکْرَى لِمَنْ کَانَ لَهُ قَلْبٌ (ق ۳۷)

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (الإسراء ۸۵)

فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى (طٰہٰ ۷)

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً (الاعراف ۵۵)

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا (الشمس ۷)

بینہ نمبر ۷

صوفیائے محققین کے نزدیک لطائف کے انوار میں جو اختلاف ہے وہ مکشوفات کے اعتبار سے اختلاف ہے، لہٰذا الطائف کے انوار کو رنگوں کے ساتھ مخصوص و مقید جاننا لازمی نہیں کیونکہ مقصود، دائمی ملکۂ ذکر ہے نہ کہ رنگ و نور، البتہ اگر لطائف کے رنگ کبھی ظاہر بھی ہوں تو مضائقہ نہیں۔

مقامات لطائف عالم امر

لطیفۂ قلب

لطیفۂ قلب کا مقام انسان کے جسم میں بائیں پستان کے نیچے دو انگشت کے فاصلے پر مائل بہ پہلو ہے، اس کی فناء، قلب پر اللہ تعالیٰ کی تجلیٔ فعل کا ظہور ہے۔ اس کی علامت، ذکر کے وقت ماسویٰ اللہ کا نسیان اور ذات حق کے ساتھ محویت ہے (اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے ہو) اسکی تاثیر رفع غفلت اور دفع شہوت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اس کا نور زرد ہے۔

لطیفہ روح

اس کا مقام انسان کے سینے میں دائیں پستان کے نیچے دو انگشت کے فاصلے پر مائل بہ پہلو ہے۔
اس کی فناءروح پر اللہ تعالیٰ کی تجلیٔ صفات کا ظہور ہے۔اس کی علامت ذکر کے وقت کیفیات ذکر (قلبی وروحی) میں اضافہ و غلبہ ہے۔ اس کی تاثیر غصہ وغضب کی کیفیت میں اعتدال اور طبیعت میں اصلاح وسکون کی کیفیت کا ظہور ہے اس کا نور سرخ ہے۔

لطیفہ ٔسر

اس کا مقام انسان کے سینے میں بائیں پستان کے برابر دو انگشت کے فاصلے پر مائل بہ وسط سینہ ہے
اس کی فنا لطیفہ سر پر اللہ تعالیٰ کی صفات کے شیونات و اعتبارات کا ظہور ہے۔

اس کی علامت ہر دو سابقہ لطیفوں کی طرح اس میں ذکر کا جاری ہونا اور کیفیات میں ترقی رونما ہونا ہے۔(یادرہے کہ یہ مشاہدہ اور دیدار کا مقام ہے)اس کی تاثیر طمع اور حرص کے خاتمے نیز دینی امور کے معاملے میں بلا تکلف مال خرچ کرنے اور فکر آخرت کے جزبات کی بیداری سے ظاہر ہوتی ہے۔اس کا نور سفید ہے۔

لطیفہ ٔخفی

اس کا مقام انسان کے سینے میں دائیں پستان کے برابر دو انگشت کے فاصلے پر مائل بہ وسط سینہ ہے۔اس کی فناء صفات سلبیہ تنزیہیہ کا ظہور ہے۔اس کی علامت میں اس میں ذکر کا جاری ہونا وار عجیب و غریب احوال کا ظہور ہے۔اس کی تاثیر حسد و بخل اور کینہ و غیبت جیسے امراض سے مکمل نجات حاصل ہو جانے سے ظاہر ہوتی ہے ہ،اس کا نور سیاہ ہے۔

لطیفۂ اخفیٰ

اس کا مقام انسان کے سینے میں وسط سینہ ہے۔ اس کی فنا مرتبۂ تنزیہہ اور مرتبۂ احدیت مجردہ کے درمیان ایک برزخی مرتبے کے ظہور و شہود سے وابستہ ہے اور یہ ولایت محمدیہ ﷺ کا مقام ہے۔ اس کی علامت اس میں بلا تکلف ذکر کا جاری ہونا اور قرب ذات کا احساس و شہود ہے اس کی تاثیر تکبر، فخر و غرور اور خود پسندی جیسے مہلک روحانی امراض سے رہائی پانے اور مکمل حضور و اطمینان کے حصول سے ظہور پزیر ہوتی ہے، اس کا نور سبز ہے۔

بینہ نمبر ۸

واضح ہو کہ لطائف عالم امر کو کمالات ولایت کے ساتھ مناسبت ہے اور لطائف عالم خلق کو کمالات نبوت کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے۔ عالم امر کے پانچوں لطیفوں میں سے ہر ایک لطیفہ کو عالم خلق کے کسی نہ کسی لطیفہ کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے، مثلاً لطیفۂ قلب کو لطیفۂ نفس کے ساتھ لطیفۂ روح کو لطیفۂ آب کے ساتھ، لطیفۂ سر کو لطیفۂ باد کے ساتھ، لطیفۂ خفی کو لطیفۂ نار کے ساتھ، لطیفۂ اخفیٰ کو لطیفۂ خاک کے ساتھ۔[1]

نیز یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ عالم خلق کے لطائف عالم امر کے لطائف کی اصل ہیں، یعنی لطیفۂ نفس کا معاملہ، لطیفۂ قلب کے معاملے کی اصل ہے اور لطیفۂ باد (ہوا) کا معاملہ لطیفۂ روح کے معاملے کی اصل ہے۔ لطیفۂ نار (آگ) کا معاملہ لطیفۂ خفی کے معاملے کی اصل ہے۔ لطیفۂ خاک (مٹی) کا معاملہ لطیفۂ اخفیٰ کے معاملے کی اصل ہے۔[2]

---

[1] (ملخصاً مکتوبات معصومیہ دفتر اول، مکتوب ۲۱۳)

[2] (مکتوبات معصومیہ دفتر سوم مکتوب ۴)

مقامات لطائف عالم خلق

لطیفہ نفس

یہ عالم خلق کا پہلا لطیفہ ہے سلسلہ نقشبندیہ میں اس کا مقام وسط پیشانی یا ام الدماغ ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مقام زیر ناف ہے۔ اگرچہ بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن ارباب عرفان کے نزدیک ابتداء اور انتہاء کا فرق ہے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یوں تطبیق فرمائی ہے کہ اس کا سر اُم الدماغ یا وسط پیشانی ہے اور اس کا قدم متصل زیر ناف ہے۔(اہل کشف کے نزدیک ہر دو مقام نفس کے لحاظ سے برابر ہیں) اس کا نور سبز اور نیلگوں ہے، اس کی تاثیر نفسانیت اور سرکشی کے مٹ جانے، عجز و انکساری کا مادہ پیدا ہونے اور ذکر میں ذوق و شوق بڑھ جانے سے ظاہر ہوتی ہے۔

لطیفہ قالبی

یہ عالم خلق کا بظاہر دوسرا لطیفہ ہے لیکن در حقیقت چاروں لطائف (ہوا، پانی، آگ اور مٹی) پر مشتمل ہے۔ اس کا مقام سارا قالب (جسم) ہے (بعض کے نزدیک متصل ناف ہے) اس کی علامت ہر ہر جزو بدن اور بال بال سے ذکر کا جاری ہو جانا ہے۔ اس کی تاثیر رذائل بشریہ اور علائق دنیویہ سے مکمل رہائی پالینے سے ظاہر ہوتی ہے اس کا نور آتش نما ہے۔

مقامات لطائف کا ثبوت

مقامات لطائف کے تعین و ثبوت کے لیے صوفیائے فن طریقت کی تصریحات و تعلیمات ہی دلیل کے لیے کافی ہیں کیونکہ وہ احکام روحانیہ باطنیہ کے مجتہد ہوتے ہیں۔

جس طرح فقہائے مجتہدین احکام ظنیہ، ظاہرہ کا استنباط کرتے ہیں اسی طرح صوفیائے مجتہدین بھی احکام ظنیہ باطنیہ کا استخراج کرتے ہیں اور جس طرح قیاس ورائے کی صحت کا معیار کتاب و سنت کی مطابقت ہے اسی طرح کشف و الہام کی صحت کا معیار بھی کتاب و سنت کی موافقت ہے اور یہ امر بھی مستحضر رہے کہ کشف و الہام اور فراست و بصیرت کا نور صوفیاء و فقہاء کی برابر رہنمائی کرتا رہتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ (الزمر ٢٢)

تو کیا وہ جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔

فتح الباری میں ہے:

انما الالہام نور یختص اللہ بہ من یشاء من عبادہ۔[1]

یعنی الہام ایک نور ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کے ساتھ مخصوص فرمالیتا ہے۔

بینہ نمبر ۹

فقہاء کا اجتہاد مرتبہ میں مقدم ہوتا ہے کیونکہ صوفیاء کرام فقہاء عظام کے مقلد ہوتے ہیں۔ اس کی سلیل بھی صوفیاء کا تعامل ہے لہٰذا مسائل شریعہ، فقہیہ میں علماء و فقہاء کے اقوال کو معتبر سمجھا جائے گا اور مسائل روحانیہ ذوقیہ و احکام باطنیہ میں صوفیاء کے اقوال و احوال کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ کے مطابق ہر فن کے لیے مخصوص افراد ہوتے ہیں۔

---

[1] (فتح الباري-ابن حجر، ج ١٢، ص ٣٨٩)

حدیث ابو محذورہ

صوفیائے کرام نے لطائف کے جن مقامات کی تخصیص و تعیین فرمائی ہے اس کی تائید میں مندرجہ ذیل حدیث مبارکہ ملاحظہ ہو:

ثم وضع یدہ علی ناصیۃ أبي محذورۃ. ثم أمرها علی وجهه ثم علی ثدیه ثم علی کبدہ ثم بلغت ید رسول الله صلی الله علیه و سلم سرۃ أبي محذورۃ. ثم قال رسول الله صلی الله علیه و سلم (بارک الله لک و بارک علیک)۔[1]

ترجمہ: پھر سرور عالم ﷺ نے ابو محذورہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر اپنا ہاتھ مبارک ان کے چہرے پر پھیرتے ہوئے سینے پر لے گئے پھر ان کے جگر پر لے گئے۔ پھر آپ ﷺ کا ہاتھ مبارک ان کی ناف تک پہنچا۔ پھر آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تجھے برکت دے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے۔

بینہ نمبر ۱۰

حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر سے لے کر ناف تک ہاتھ پھیرا اور برکت کے لیے دعا مانگی۔ ارادی طور پر جسم کے اتنے حصے پر ہاتھ پھیرنا کسی طرح بھی حکمت سے خالی نہ تھا جیسا کہ اہل بصیرت پر ظاہر ہے جب کہ جسم کا یہی حصہ لطائف کے مقامات کا حصہ ہے۔ بہر حال حدیث سے ان مقامات کا اہم اور متعین و متبرک ہونا ثابت ہو گیا۔(فَھُوَ الْمُرَادُ)

---

[1] (سنن ابن ماجه، ج ۱، ص ۲۳۴: باب الترجیع فی الأذان)

لطیفہ جاری ہونے کا مطلب

کسی بھی لطیفہ میں ذکر جاری ہونے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ مُضغہٗ گوشت یا لطیفہ کا مقام جنبش و حرکت کرتا ہے، بلکہ ”حرکت از دل بہ سمع خیال برسد“ یعنی دل سے ذکر کی حرکت خیال کے کانوں تک پہنچتی ہے اور خیال کے کان دل کا ذکر (لفظ اللہ کی تکرار) سُنتے ہیں۔

بعض مشائخ مبتدی کے لیے مُضغہٗ گوشت کی ظاہری طور پر حرکت و جنبش کو ضروری سمجھتے ہیں اور اسی طریق پر مریدین کو ذکر القاء کرتے ہیں لیکن حقیقت الامر یہی ہے کہ ذکر قلبی وغیرہ میں مقام لطیفہ کی حرکت ضروری نہیں۔ حضور قلبی (یعنی غفلت کا نہ رہنا) اور اخلاص کے ساتھ اور حضور مع اللہ ہی لطیفہ جاری ہونے کی ضروری علامت ہے۔وَھُوَ الْمَقْصُوْدُ

ہمارے مشائخ نے فرمایا:

حَقِیْقَةُالذِّکْرِ رَفْعُ الْغَفْلَةِ۔

یعنی ذکر کی حقیقت غفلت کا نہ رہنا ہے۔

فنا اور بقا کا مفہوم

اَلْفَنَاءُ عَدَمُ رُؤْیَةِ الْعَبْدِ لِفِعْلِهٖ بِقِیَامِ اللّٰهِ عَلٰی ذَالِکَ وَ الْبَقَاءُ رُؤْیَةُ الْعَبْدِ قِیَامُ اللّٰهِ عَلٰی کُلِّ شَیِئٍ۔[1]

ترجمہ: فنا یہ ہے کہ بندہ ذات حق کے قیام اور غلبہ کے سبب اپنے فعل کو نہ دیکھے اور بقا یہ ہے کہ بندہ ہر چیز پر ذات حق کا قیام اور غلبہ مشاہدہ کرے۔

[1] (کتاب التعریفات، ص ۱۱۶)

بینہ نمبر ۱۱

کثرت اذکار و نوافل اور اتباع سنت و شریعت کے التزام کے بعد محض عنایت خداوندی سے سالک کو ماسویٰ اللہ کا ایسا نسیان ہو جاتا ہے اور اس پر ذات حق تعالیٰ کا یہاں تک غلبہ ہو جاتا ہے کہ سالک استغراق فی الربوبیت کی لذت سے آشنا ہو کر اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دیتا ہے۔

یہی مفہوم مایزال عبدي یتقرب إلي بالنوافل (صحیح البخاری، ج۵، ص ۲۳۸۴) والی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں:

اوصاف مذمومہ کا سقوط فنا کہلاتا ہے جیسا کہ اوصاف محمودہ کا وجود بقاء کہلاتا ہے۔(فافهم)

حیات انبیاء و اولیاء اللہ

جب بندگان خاص کے لطائف ایمان و اعمال صالحہ کی برکت سے اپنے اصل کی طرف عروج کرتے ہوئے عالم وجوب میں رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور انہیں محض عنایت ایزدی کے ساتھ فنا و بقا سے مشرف کیا جاتا ہے اور ان کو اسماء و صفات اور ذات کی تجلیات سے وجود موہوب حقانی عطا ہوتا ہے تو بمطابق آیۃ کریمہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً (النحل ۹۷) انہیں پاکیزہ زندگی عطا کی جاتی ہے اور وہ زندہ جاوید ہو جاتے ہیں، ان کے لطائف حیات دائمی سے سرفراز ہو جاتے ہیں اور ان کے اجسام بربنائے لطافت، ارواح کے مرتبوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور وہ تا قیامت اپنی قبور مقدسہ میں زندہ و سلامت رہتے ہیں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ مجدی تحریر فرماتے ہیں کہ یہ حکم شہداء کے ساتھ خاص نہیں کیونکہ انبیاء اور صدیقین ان سے زیادہ بلند مرتبوں والے ہیں۔

جیسا کہ حدیث پاک میں ارشاد فرمایا گیا:

إن الله حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء فنبي الله حي يرزق۔[1]

یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پر نبیوں کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے نبی زندہ ہوتے ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں۔

حدیث مذکور کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے اجسام گلنے سڑنے اور ضائع ہونے سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور انہیں قبروں میں کھانے پینے والی زندگی عطا ہوتی ہے۔

شب معراج مسجد اقصیٰ میں انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا اجتماع اور سرور عالم ﷺ کی اقتداء میں نماز ادا فرمانا اس امر پر واضح دلیل ہے کہ وہ اپنی قبروں میں جسمانی طور پر زندہ ہیں، نمازیں ادا فرماتے ہیں، رزق کھاتے ہیں اور عرش و فرش پر جہاں چاہیں تصرف فرماتے اور آتے جاتے ہیں جیسا کہ سرور دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ یُصَلُّوْنَ فِیْ قُبُوْرِهِمْ۔[2]

یعنی انبیاء علیہم السلام زندہ ہوتے ہیں اور اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔

نیز حدیث پاک میں ہے:

مررت على موسى۔۔۔۔۔ وهو قائم يصلي في قبره۔[3]

یعنی میں نے شب معراج موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھتے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ نماز جسمانی طور پر ہی ادا ہو سکتی ہے اور یہ جسم کی صفت ہے، لہٰذا قبروں میں انبیاء کی حیات، جسمانی ہی

---

[1] (سنن ابن ماجہ، ج ۱، ص ۵۲۴)

[2] (مسند ابو یعلی، ج ۳، ص ۲۱۶، مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۲۱۴)

[3] (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۸۴۵)

مانی جائے گی۔ اسی طرح بعض روایات میں آیا ہے کہ علماء، حفاظ اور مؤذنین کے اجسام بھی قبروں میں سالم رہتے ہیں۔

بینہ نمبر ۱۲

واضح ہو کہ انبیائے کرام کے بارے میں تو یہ عقیدہ نص حدیث سے ثابت ہے کیونکہ اولیائے کرام، انبیائے عظام کے تابع اور نائب ہوتے ہیں۔ اصولی طور پر متبوع اور مناب کے تمام کمالات، تابع اور نائب کو بطور اتباع و نیابت حاصل ہو جاتے ہیں (کما لا یخفیٰ علیٰ ارباب العلم)۔

نیز امت کے تمام اصحاب سلوک و معرفت کا مزارات پر جانا، سلام کہنا اور ان سے سلام کا جواب سننا، مراقبات کے ذریعے اہل قبور سے فیوض و برکات حاصل کرنا، قبریں کھلنے پر ان کے جسموں کو سلامت دیکھنا سلف صالحین سے لے کر آج تک روزمرہ کے معمولات، مشاہدات و تجربات اور تاریخی واقعات سے تسلسل اور تواتر کے ساتھ عقلاً و نقلاً ثابت ہے۔

اور اس پر اکابرین امت کا تعامل بجائے خود بمطابق حدیث دلیل شافی و سند کافی ہے:

مارآہ المؤمنون حسنا فھو عنداللہ حسن۔[1]

جنت عرش کے نیچے ہے

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جب مجھے پہلی بار فوق العرش عروج روحانی نصیب ہوا تو میں نے جنت کو عرش کے نیچے دیکھا۔ آپ کا یہ کشف و شہود فرمان نبوی ﷺ کے عین مطابق ہے۔

---

[1] (المعجم الکبیر، ج ۹، ص ۱۱۳)

حدیث میں ارشاد ہے:

سقفھاعرش الرحمن۔[1]

یعنی عرش جنت کی چھت ہے۔

اسی طرح حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے:

الجنۃفوق السموات وتحت العرش۔[2]

یعنی جنت آسمانوں کے اوپر عرش کے نیچے ہے اور اسی پر اکثریت کا اتفاق منقول ہے۔

بینہ نمبر ۱۳

واضح رہے کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز کے مکشوفات اور مشاہدات علوم شرعیہ کے عین مطابق ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نسبت مجددیہ میں اتباع شریعت اور التزام سنت کا لحاظ غالب ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم امر کے پانچوں لطائف کا وطنِ اصلی عرش کے اوپر ہے، لہٰذا حکمائے یونان کا یہ قول کہ ''عرش سے اوپر کچھ نہیں'' باطلِ محض ہے۔

عرش پر مقامات انبیاء و اولیاء کا مشاہدہ

سلوک میں اہل اللہ کے دو طرح کے مقامات ہوتے ہیں پہلا مقام عروج ہے اور دوسرا نزول ہے۔مقام عروج یہ ہے کہ انسان بشری صفات سے الگ ہو کر ملکی اور قدسی صفات کا لبادہ پہن لے اور وہ عالم ملکوت وغیرھا میں سیر کرے اس کو سیر الیٰ اللہ وفی اللہ کہتے ہیں۔

---

[1] (تفسیر الخازن، ج ا، ص ۴۲۰)

[2] (تفسیر الخازن، ج ا، ص ۴۲۰)

مقام نزول یہ ہے کہ انسان صفات بشریہ سے الگ ہونے کے بعد دوبارہ صفات بشریہ کا لبادہ اوڑھ کر دوسرے لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے واپس لوٹ آئے اس کو سیر عن اللہ باللہ کہا جاتا ہے۔

بینہ نمبر ۱۴

صوفیاء کے نزدیک اجسام لطیفہ اور ارواح نفیسہ کا اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی روحانی قوت سے آسمانوں اور عرش و فرش کی طرف سیر و پرواز کرنا اور عالم مثال وغیرھا کی مخلوق سے ملاقات کرنا بمطابق ارشاد باری تعالیٰ: لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الإنشقاق ١٩) ضرور تم منزل بہ منزل چڑھو گے۔

اور بمطابق حدیث معراج ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جو محتاج دلیل و وضاحت نہیں تاہم چند شواہد بطور تائید ہدیہ قارئین ہیں تاکہ نفس مسئلہ سمجھنے میں آسانی رہے، واللہ الموفق۔

چند شواہد

مذہبی شواہد

واقعۂ معراج کے ضمن میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رقمطراز ہیں:

ثم لقی ارواح الانبیاء فاثنوا علی ربھم۔[1]

ترجمہ: پھر حضور ﷺ نے معراج کی رات انبیاء کی ارواح سے ملاقات فرمائی اور ان ارواح نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی۔

[1] (تفسیر ابن کثیر، ج۳، ص ۳۱)

سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

لقیت إبراهیم لیلة أسري بي فقال یا محمد أقرئ أمتک مني السلام و أخبرهم أن الجنة طیبة التربة عذبة الماء و أنها قیعان و أن عراسها سبحان الله و الحمد لله و لا إله إلا الله و الله أکبر۔[1]

ترجمہ: معراج کی رات میری ملاقات ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ انہوں نے فرمایا اپنی امت کو میرا سلام پہنچائیں اور انہیں بتائیں کہ جنت کی مٹی پاک ہے اور پانی میٹھا ہے، صاف اور ہموار میدان ہے اس میں باغ لگانے والے یہ کلمات ہیں: سبحان الله و الحمد لله و لا إله إلا الله و الله أکبر۔

نیز ارشاد فرمایا:

مررت علی موسی فقال ما فرض الله لک علی أمتک؟ قلت فرض خمسین صلاة۔[2]

ترجمہ: یعنی پس موسیٰ علیہ السلام پر میرا گزر ہوا انہوں نے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا (روزانہ) پچاس نمازیں فرض کی گئی ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرور دوعالم ﷺ نے فرمایا:

رأیت جعفرا یطیر في الجنة مع الملائکة۔[3]

یعنی میں نے جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جنت میں فرشتوں کے ساتھ اُڑتے دیکھا۔

ایک اور حدیث میں ہے:

قال رسول الله ﷺ مررت لیلة اسری بی رجل مغیب فی نور العرش۔[4]

---

[1] (سنن الترمذی، ج۵، ص ۵۱۰)

[2] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۵۱)

[3] (سنن الترمذی، ج۵، ص ۶۵۴)

[4] (زرقانی، ج۶، ص ۱۰۶)

ترجمہ: حضور ﷺ نے فرمایا کہ معراج کی رات میرا ایسے شخص پر گزر ہوا جو عرش کے نور میں پوشیدہ تھا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

إنما نسمة المؤمن طائر۔ [1]

یعنی مؤمن کی روح پرندہ ہے جہاں چاہتی ہے چلی جاتی ہے۔

آخر میں حضرت شیخ ابوالحسن رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول پر اکتفا کیا جاتا ہے:

قال الشیخ ابو الحسن الرفاعی صعدت فی الفوقانیات الیٰ سبعمائة الف عرش فقیل لی ارجع لا وصول لک الی العرش الذی عرج بہ محمد ﷺ۔ [2]

ترجمہ: حضرت ابوالحسن رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا کہ میں روحانی طور پر عالم بالا کی طرف عروج کرتا رہا یہاں تک کہ سات لاکھ عرش سے گزر گیا پھر مجھے کہا گیا واپس لوٹ جا جس عرش پر سرورِ عالم ﷺ کو معراج ہوئی تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

دنیائے اثیر کے شواہد

عصرِ حاضر میں سائنس دانوں کے نزدیک دنیائے اثیر (کاسمک یا آسٹرل ورلڈ) ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے اس کو عالمِ مثال کہہ لیجیئے۔

دراصل عالمِ اثیر کائنات کا دماغ ہے جس میں ازل سے ابد تک تمام تصاویر، اصوات و اقوال، افعال و اعمال محفوظ ہیں۔

---

[1] (سنن النسائي، ج۴، ص۱۰۸)

[2] (النبراس، ص۲۹۵)

غالباً قرآن کریم میں اسی جانب اشارہ ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ (۵۲) وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌ (القمر ۵۳)

ترجمہ: اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ ان کے نامۂ اعمال میں درج ہے اور ہر چھوٹی اور بڑی بات اس میں لکھی ہوئی ہے۔

دنیائے اثیر کے محققین کا خیال ہے کہ عالم اثیر کے متعلق حساس دماغ جب چاہیں انکشافات حاصل کر سکتے ہیں، ارواح سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں ان سے باتیں کر سکتے ہیں۔

ایک پادری لیڈ بیٹر نے اپنی کتاب INVISIBLE HELPER میں ایک عورت مسز پالیٹر کا ذکر کیا ہے جو خود کو بے ہوش کر کے ارواح کو بلاتی تھی اور بچھڑے ہوئے عزیز و اقارب سے ملاقات کرتی اور کرواتی تھی۔

بابا گورونانک کے متعلق عام لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ بیک وقت لاہور اور کعبہ میں موجود ہوتے تھے۔ بلکہ آج کل تو عام لوگ بھی جسم لطیف میں گھومنے پھرنے کے دعویدار ہیں۔

۱۹۰۷ء میں انگلستان کے ایک اخبار میں سوال اٹھا تھا کہ کیا کسی شخص نے جسم لطیف میں سفر یا پرواز کی ہے، دو عورتوں نے اعترافی جواب دیا کہ ہمیں یہ طاقت حاصل ہے، ان کے نام تھے: مسز بی اے بلیر اور اے ویلم۔

یہ سوال و جواب پاکستان ٹائمز کی اشاعت ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں بھی شائع ہوئے تھے۔[1]

[1] (رمز ایمان)

بینہ نمبر ۱۵

قابل غور امر یہ ہے کہ اگر مادیت زدہ افراد سائنسی ارتقاء کے بل بوتے پر اور مختلف مشقوں اور ریاضتوں کے ذریعے اس قسم کے کمالات لطیفہ کا مظاہرہ کر سکتے ہیں تو اہل روحانیت ایمانی سائنس کی روشنی مین مختلف عبادتوں اور مجاہدوں کے ذریعے کمالات عجیبہ اور کرامات نفیسہ کا ان سے بڑھ کر مظاہرہ کیوں نہیں کر سکتے؟ جب کہ انہیں تائید ربانی بھی حاصل ہوتی ہے، تو پھر انبیاء کرام علیہم الصلوٰت والتسلیمات اور اولیائے عظام علیہم الرحمۃ سے بطور معجزہ و کرامت اس قسم کے کمالات ظاہر ہونے کا انکار کیسے ہو سکتا ہے؟

بحمدہٖ تعالیٰ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ النورانی کے ارشادات عالیہ نصاً و قیاساً، حکمتاً و اجتہاداً، روایتاً و درایتاً، عقلاً و نقلاً مبنی بر حق و صواب ثابت ہوئے اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ سمجھنے اور ماننے کی توفیق عطاء فرمائے، آمین

(البینات شرح مکتوبات، ص ۱۴۳)

[مرتبہ دوم: پھر ایک اور عروج واقع ہوا جس میں مشائخ عظام، آئمہ اہل بیت، خلفاء راشدین کے مقامات اور حضرت رسالت پناہ ﷺ کا مقام خاص، اس طرح اپنے اپنے درجات کے مطابق تمام باقی انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام اور فرشتوں کے بلند ترین گروہ کے مقامات عرش سے اوپر مشہود ہوئے۔

اور عرش سے اوپر اس مقدار میں عروج واقع ہوا کہ مرکز خاک سے عرش تک یا اس سے کچھ نیچے۔ اور حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے مقام تک منتہی ہوا۔ اور اس مقام سے اوپر کچھ مشائخ تھے بلکہ اسی مقام میں یا ذرا اوپر جیسے شیخ معروف کرخی، شیخ علاؤ الدولۃ اور شیخ ابو سعید

خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ اور باقی کچھ مشائخ کے مقامات نیچے اور بعض وہی مقامات رکھتے تھے۔ نیچے تو شیخ علاؤالدولہ اور شیخ نجم الدین کبریٰ جیسے مشائخ تھے اور ان سے اوپر آئمہ اہل بیت تھے اور ان سے اوپر خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ اور باقی انبیاء علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مقامات ہمارے حضور نبی کریم ﷺ کے مقام سے الگ ایک طرف تھے اسی طرح بلند ترین گروہ ملائکہ کے مقامات بھی علیحدہ ایک طرف کو تھے علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ لیکن حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام کو سب سے فوقیت اور سرداری حاصل تھی و اللہ سبحانہ اعلم بحقائق الامور کلھا (اللہ تعالیٰ ہی تمام امور کے حقائق کو بہتر جانتا ہے)۔

اور میں جب بھی چاہتا ہوں عروج واقع ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات چاہنے کے بغیر بھی واقع ہو جاتا ہے۔ اور بعض دوسری چیزیں بھی دکھائی جاتی ہیں اور بعض عروجوں پر اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اور بہت سی باتیں بھول جاتی ہیں اور میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ بعض حالات لکھوں اور کوشش کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں عرضداشت کے وقت یاد آئیں لیکن یاد نہیں آتے۔ اس لئے کہ یہ بات حقیر محسوس ہوتی ہے یہ تو استغفار کا موقع ہے کچھ لکھنے کا نہیں۔ اس عریضہ کی تحریر کے دوران بعض باتیں یاد تھیں آخر حافظے نے وفا نہ کی اور کچھ نہ لکھ سکا زیادہ گستاخی کی جرأت نہیں۔

ملا قاسم علی کا حال بہتر ہے۔ استہلاک و استغراق کا غلبہ ہے اور تمام مقامات جذبہ سے اوپر قدم رکھ چکا ہے۔ پہلے صفات کو اصل دیکھتا تھا اب باوجود صفات کے اپنے سے جدا دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو خالی محض پاتا ہے۔ بلکہ وہ نور جس سے صفات قائم ہیں اسے اپنے سے جدا دیکھتا ہے اور خود کو اس نور سے الگ ایک طرف پاتا ہے۔ دوسرے دوستوں کے حالات بھی روز بروز بہتر ہو رہے ہیں دوسری عرضداشت میں انشاء اللہ تعالیٰ تفصیل سے عرض کیا جائے گا۔]

مکتوب نمبر ۲

[ترقیوں کے حصول اور عنایات خداوندی جل سلطانہٗ پر فخر کرنے کے بیان میں۔ یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہ الاقدس کو لکھا:

عرضداشت: کمترین بندگان احمد بلند بارگاہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔ ماہ رمضان مبارک کے متصل استخارہ کا حکم مولانا شاہ محمد نے پہنچایا۔ ماہ رمضان تک اتنی فرصت نہ مل سکی کہ اپنے آپ کو آستانہ بوسی کے شرف سے مشرف کر سکتا لاچار اس مدت کے گزر جانے سے اپنے آپ کو تسلی دی۔ آپ کی بلند توجہات کی برکت سے مسلسل اور متواتر جو عنایاتِ خداوندی اس ناچیز پر فائض اور وارد ہو رہی ہیں۔ ان کے متعلق کیا عرض کرے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس صاحب کشف و شہود تھے پھر بھی حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو دہلی آنے سے پہلے استخارہ کرنے کا حکم فرمایا۔ آگرہ اور دہلی کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا اور اس وقت آج کل کی طرح سہولیات بھی موجود نہیں تھیں بلکہ لوگ پیدل گھوڑوں، اونٹوں، خچروں اور گدھوں پر سفر کرتے تھے اور اس سفر میں کافی دن لگ جاتے تھے اس لئے وہ سفر سے پہلے استخارہ کرتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے کیونکہ رمضان کا مبارک مہینہ تھا جس میں افطاری، سحری اور سفر وغیرہ جیسی مشکلات ہوتی ہیں اس وجہ سے

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں خط ارسال فرمایا۔

علماء کرام اور صوفیاء کرام جب بھی کسی کام یا سفر کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے پہلے وہ استخارہ ضرور کرتے ہیں۔ کیونکہ استخارہ کرنے سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کام میں برکت ڈال دیتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ انسان استخارے کے ساتھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کا یہ طریقہ ضرور اپنانا چاہیئے تاکہ یہ سنت زندہ ہو جائے اور جب کوئی شخص ہم سے بیعت کرنے کی غرض سے آتا ہے تو ہم بیعت سے پہلے اسے استخارہ کرنے کو کہتے ہیں تاکہ مشائخ کرام کی تعلیمات پر عمل ہو جائے۔ لیکن بعض لوگ استخارہ کرنے سے بچتے ہیں اور بغیر استخارہ بیعت کرنے پر اصرار کرتے ہیں جبکہ ہمارے نزدیک بغیر استخارہ کے بیعت کرنا سُنت کے خلاف ہے۔

کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

عن جابر رضي الله عنه قال: كان النبي صلى الله عليه و سلم يعلمنا الاستخارة في الأمور كلها كالسورة من القرآن (إذا هم أحدكم بالأمر فليركع ركعتين ثم يقول اللهم إني أستخيرك-----------[1]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ہمیں تمام معاملات میں قرآن کی سورۃ کی طرح استخارے کی تعلیم دیتے تھے (اور فرماتے تھے) کہ جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو چاہیئے کہ دو رکعت نماز پڑھو اور اس کے بعد یہ دعا کرو کہ اے اللہ! میں بھلائی مانگتا ہوں--------------

---

[1] (صحيح البخاري، ج۵، ص ۲۳۴۵)

[من آں خاکم کہ ابر نوبہاری کند از لطف بر من قطرہ باری

اگر بر روید از تن صد زبانم چو سبزہ شکر لطفش کے توانم

ترجمہ: میں وہ خاک ہوں کہ موسم بہار کا بادل اپنے لطف و کرم سے مجھ پر برس رہا ہے۔ سبزے کی طرح میرے جسم پر اگر سو زبانیں بھی اُگ آئیں تو پھر بھی میں اس کی مہربانیوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔]

تشریح

یعنی اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی تعریف کرتے ہیں کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی توجہات اس طرح مستفید کر رہی ہیں جیسے بارش، فصلوں اور خشک زمین کو زندگی عطا کر دیتی ہے۔

[اگرچہ اس قسم کے حالات کا اظہار گستاخی کا وہم ڈالتا ہے اور اس سے فخر و مباحات کا احساس ہوتا ہے۔

ولے چوں شاہ مرا برداشت از خاک

سزد گر بگزرانم سر ز افلاک

ترجمہ: لیکن جب شاہ مجھے خاک سے اوپر اٹھائے تو لائق ہے کہ میں اپنا سر افلاک سے بھی اوپر لے جاؤں۔ عالم صحو وبقا کی ابتدا اواخر ماہ ربیع الآخر سے شروع ہوتی ہے اور اس وقت تک بقاء خاص سے ہر لحہ مشرف کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ محی الدین قدس سرہٗ کی تجلی ذاتی کی ابتدا ہو چکی ہے مجھے صحو میں لاتے ہیں اور پھر سُکر کی طرف لے جاتے ہیں اور اس عروج و نزول میں علوم غریبہ اور معارف عجیبہ فائض کر رہے ہیں۔]

تشریح

اس جگہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس صحو و سکر اور فنا و بقا کی کیفیات بیان کر رہے ہیں۔

صحو: صحو اس کو کہا جاتا ہے کہ جب کوئی صوفی کچھ چیزوں کا مشاہدہ کرے اور پھر اپنی اس کیفیت کو شریعت غراۤ محمدی ﷺ کے مطابق پالے۔ اور اگر خدانخواستہ اس کی یہ کیفیت شریعت غراۤ محمدی ﷺ سے مخالف ہو تو وہ اپنی اس کیفیت کو پوشیدہ رکھے۔ اور اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے استغفار کرے کہ یا اللہ! میں اس کی حقیقت کو نہیں جانتا چونکہ میری یہ کیفیت شریعت غراۤ محمدی ﷺ کے خلاف ہے اس لئے یا اللہ! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اس کیفیت کے ذریعے نہ آزما۔ کیونکہ میں عاجز اور ضعیف ہوں اور میں آپ کی اس آزمائش کی طاقت نہیں رکھتا۔

بعض اوقات سالک حالت سکر میں ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے عشق و محبت میں اتنا مست ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ پر کنٹرول نہیں کر سکتا اور اس کی زبان سے شریعت کے خلاف الفاظ نکل جاتے ہیں۔ یا کوئی شخص بے ہوشی اور دیوانگی میں اس طرح کے الفاظ استعمال کر لیتا ہے تو اس طرح کے شخص پر کفر کا حکم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسا شخص حالت سکر میں ہونے کی وجہ سے معذور اور مرفوع القلم ہے جیسے منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انا الحق اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سبحانی ما اعظم شانی کے الفاظ استعمال کیے۔ ہم اُن کے یہ الفاظ حالت سُکر پر حمل کرتے ہیں اور اگر خدانخواستہ یہی الفاظ کوئی سالک حالت صحو اور عقل میں استعمال کرے تو اس سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

صحو کی دو اقسام ہیں

(۱) عارف کی صحو　　　　(۲) جاہل کی صحو

(۱) عارف کی صحو

عارف کی صحو یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ عارف کے لئے مغیبات کو منکشف کرتا ہے جو غیب شریعت غرّ اَ محمدی ﷺ کے مخالف ہو تو عارف اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میرے کشف و شہود میں قصور ہے۔ اس کے برعکس اگر اس عارف کی یہ صحو شریعت غرّ اَ محمدی ﷺ کے مطابق ہو تو اس صحو پر عارف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

(۲) جاہل کی صحو

جاہل نہ تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو نہ قرآن عظیم الشان کو نہ حضور نبی کریم ﷺ کو اور نہ ہی مؤمن بہٖ اشیاء کو تفصیلاً پہچانتا ہے کیونکہ اس کا ایمان تقلیدی ہوتا ہے اور وہ صرف مؤمن بہٖ اشیاء پر ایمان رکھتا ہے اس لئے یہ صحو عام مسلمانوں کی بھی ہو سکتی ہے۔

سُکر کی بھی دو اقسام ہیں

ایک سُکر یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا کی محبت میں یا نشہ آور چیزوں کے استعمال کرنے کی وجہ سے دیوانہ ہو جائے اس طرح کا شخص اپنے ذہن اور خیالات میں سوچتا رہتا ہے کہ کاش میں بادشاہِ وقت ہوتا۔ یا میرے پاس زیادہ مال و دولت ہوتی اس قسم کا سُکر عام مسلمانوں اور دیوانوں کا ہوتا ہے۔ اور یہ سُکر کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ جاہل لوگ اس طرح کے شخص کے پاس جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اسے بزرگ

جان کر اس سے کہتے ہیں کہ ہمارے لئے دعا کریں۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ تو دنیا اور مال و دولت کا دیوانہ ہے۔ یہ آپ کے لئے کیا دعا کرے گا۔

دوسرا سُکر یہ ہے کہ کسی صوفی پر تجلیات ذاتیہ یا تجلیات فعلیہ کا اثرات مرتب ہوں چنانچہ جب اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تجلی ذاتی یا تجلی فعلی ہوتی ہے تو اس تجلی کا اثر اس صوفی پر نمودار ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس پر خوشی یا خوفِ خدا کی حالت اتنی غالب آجاتی ہے کہ اس پر بیہوشی طاری ہو جاتی ہے یہ سُکر ترقیات باطنی اور مطلوب حقیقی تک پہنچانے والا سُکر ہے۔

فنا

آپ نے عقائد کی کتابوں نور الظلم اور ابو المنتہی میں پڑھا ہو گا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عالم کو بغیر کسی مٹیریل کے عدمات سے پیدا فرمایا ہے۔ آسمان، زمین، عرش، لوح، کرسی اور انسان یعنی ہر وہ چیز جو اس کائنات میں موجود ہے وہ عدمات میں سے ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کُنۡ فرمایا اور یہ سب کچھ پیدا ہو گیا اور جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ چاہے گا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے علاوہ سب کچھ فنا ہو جائے گا نہ تو اس کا مٹیریل رہے گا اور نہ ہی اس کا اثر باقی رہے گا۔

جیسا کہ قرآن عظیم الشان میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ

كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ (٢٦) وَيَبۡقَىٰ وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلَالِ وَالۡإِكۡرَامِ (الرحمٰن ٢٧)

ترجمہ: زمین پر جتنے ہیں سب کو فنا ہے۔ اور باقی ہے تمہارے رب کی ذات عظمت اور بزرگی والا۔

سالک اس کوشش میں رہتا ہے کہ میں دنیا میں اس اصل حقیقت کو پالوں کہ میں کیا چیز ہوں یعنی میں عدم اور نیست و نابود ہوں میں اس طرح عدمات سے ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے بغیر

مٹیریل، بغیر جوہر اور بغیر عرض کے کُنْ سے پیدا فرمایا۔ اور جب میں فانی ہو جاؤں گا تو میرے کچھ اثرات باقی نہیں رہیں گے پس جو شخص اپنی اصل حقیقت کو عدمات کے تصور میں نہیں بلکہ حقیقت میں پہچان لے تو وہ شخص فانی ہو گیا یعنی نفس، شیطان اور جتنی بھی نفسانی خواہشات ہیں ان سب کو بھول جانے کا نام فنا ہے۔

بقا: کہ جب انسان کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو بغیر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے باقی انسان مٹی ہو جاتے ہیں کیونکہ حضور نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ:

ان اللہ حرم علی الارض ان تأکل اجساد الأنبیاء (رواہ ابو داؤد)

ترجمہ: بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے جسموں کو زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ ان (کے جسموں) کو کھائے۔

اسی طرح حضور نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی مکمل تابعداری کی وجہ سے کامل و مکمل اولیاء اللہ کے جسم مبارک کو بھی مٹی نہیں کھاتی۔ اس کی مزید وضاحت مکتوب نمبر ۷ کے ضمن میں صفحہ نمبر ۱۰۱ پر آرہی ہے۔

روایت ہے کہ ۵۹ ہجری میں جب سعودی عرب میں نہر کھودنے کے لئے چند شہداء اُحد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی قبروں کو کھودا گیا تو ان سب کے جسم مبارک تر و تازہ تھے ان میں سے بعض شہداء نے اپنے اپنے زخموں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے جب ہاتھوں کو وہاں سے اٹھایا جاتا تو تازہ خون بہنے لگتا اور جب ہاتھوں کو دوبارہ زخموں پر رکھا جاتا تو خون بند ہو جاتا۔

علماء کرام، اولیاء اللہ اور شہداء قدم قدم پر حضور نبی کریم ﷺ کی تابعداری کرنے کی وجہ سے بقاء کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اور جب مؤمن مسلمان فنا پر مشرف ہو جاتا ہے اور اس کی آخری حد بقا ہو جاتی ہے تو اس طرح کے شخص کے بارے میں حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ

المؤمنون حیٌ فی الدارین۔[1]

ترجمہ: مؤمنین دونوں جہانوں میں زندہ ہوتے ہیں۔

یعنی وہ مؤمن جس نے قدم قدم پر حضور نبی کریم ﷺ کی تابعداری کی ہو۔ انسان سے سہو تو ہوتی ہے مگر انسان کوشش کرے کہ فرائض، واجبات اور حضور نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل ہو پھر یہ شخص بقاء پر فائز رہ سکتا ہے بصورت دیگر نا ممکن ہے۔

[اور ہر مرتبہ میں خاص احسان و شہود سے جو اس مقامِ بقا کے مناسب ہے مشرف کر رہے ہیں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فنا پر فائز ہونے کے بعد بقا کی بات کر رہے ہیں کہ جب میرا عروج و نزول ہوا تو میں بقا کے مقام پر مشرف ہو گیا۔

[ماہِ رمضان مبارک کی چھ تاریخ کو ایک ایسی بقا اور احسان سے مشرف فرمایا گیا ہے جس کے متعلق بندہ کیا عرض کرے۔]

[1] (کنز الدقائق، ج ۱، ص ۴)

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو رمضان المبارک کی چھ تاریخ کو بقا حاصل ہوئی چھ کے ہندسے میں بھی بڑی حکمت پنہاں ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن عظیم الشان میں فرمایا کہ:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ (ھود ۷)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں بنایا۔

اسی طرح حضور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کفار کے ساتھ جو صلح حدیبیہ ہوئی وہ بھی ہجرت کا چھٹا سال تھا۔ اور یوں ہی فتح مکہ کی شروعات بھی ہجرت کے چھٹے سال ہو چکی تھیں۔ اسی طرح جب انسان غذا کھاتا ہے تو اس کو ہضم ہونے اور خون میں تبدیل ہونے میں بھی چھ گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ اور زمین میں اگر کوئی کوئی بیج بویا جاتا ہے تو وہ بھی چھ دن بعد اُگنے کے قابل ہوتا ہے۔

ایسے ہی تصوف میں اگر کوئی سالک عروج کا خواہش مند ہو تو اسے چھ دن، چھ ماہ یا چھ سال تک ذکر اذکار اور محنت کرنی چاہیئے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم کا بھی انتظار کرے۔

صوفیاء متقدمین میں سے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک عبادت وپرستش کی۔ دس سال کے بعد مجھے علم ہوا کہ میں دس سال جس کی عبادت کرتا رہا وہ تو میری روح تھی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ تھا۔

چنانچہ اس ساری بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سالک انسان کو سلوک میں ثابت قدمی سے اپنا کام سرانجام دینا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ ادھر بیعت کی اور ادھر کیفیات وترقیات کا مطالبہ شروع کر دیا۔

اور وہ جو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اپنی روح کی پرستش کا معاملہ ہے اس پر غیر اللہ کی عبادت کرنے سے کفر ثابت نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس کی سُکر کی حالت تھی۔ قصداً نہیں تھا۔

[معلوم ہوتا ہے کہ نہایت استعداد اسی مقام تک تھی۔ اور وہ وصل جو اس مقام کے مناسب تھا اس سے بھی مشرف فرمایا گیا۔ جذبہ کی جہت اب تمام ہو چکی ہے اور سیر فی اللہ جو اس مقام جذبہ کے مناسب ہے اس کے آغاز کا وقوع ہو چکا ہے۔]

تشریح

ایک سیر الی اللہ ہوتی ہے اور ایک سیر فی اللہ جب ایک بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو اس پر نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج فرض ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی سیر الی اللہ بھی شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی اپنے نفس سے خدا تک سیر شروع ہو جاتی ہے اس کی یہ سیر ممکنات یعنی دنیا، آسمانوں، جنت میں ہوتی ہے۔ یہ سارے مشاہدات سیر الی اللہ میں ہوتے ہیں جب انسان کائنات کی سیر مکمل کر لیتا ہے۔ تو پھر اس کی سیر ممکنات سے باہر شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ کی سیر، ان کو سیر فی اللہ کہا جاتا ہے اور اس کے عروجات صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ میں ہوتے ہیں یعنی ممکنات اور دنیا اس کی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اگرچہ وہ جنت کا شوق اور دوزخ سے پناہ کی خواہش کرتا ہے لیکن اس طرح نہیں جیسے بعض جاہل صوفیاء کہتے ہیں کہ ہمیں جنت کی کچھ ضرورت نہیں۔ کیا ان کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ جنت انعام کی جگہ ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے بھی جنت کی خواہش کی ہے اور اس کے لئے دعا بھی فرمائی ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کا عاشق ہو تو وہ یہ نہ کہے کہ مجھے جنت کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں جنت اور اس کی نعمتیں نصیب فرمائے۔ اور دوزخ کے عذاب سے نجات عطا فرمائے۔ آمین

[جس قدر فنا اکمل ہو گی اس پر بقا بھی ویسی ہی مرتب ہو گی۔]

تشریح

یعنی صوفی کی جتنی فنا اکمل ہوتی ہے۔اس کی بقا بھی اتنی ہی مکمل ہوتی ہے۔

[اور جس قدر بقا اکمل ہو گی حالت صحو بھی زیادہ حاصل ہو گی۔اور جس قدر حالت صحو زیادہ ہو گی اسی قدر علوم کا اضافہ بھی شریعت غرا محمدی ﷺ کے مطابق زیادہ ہو گا۔کیونکہ کامل صحو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا حصہ ہے۔اور وہ علوم جو اُن سے صادر ہوتے ہیں وہ سراسر شریعت اور عقائد ہیں جو ذات وصفات کے بیان میں ہیں۔اور ان علوم کے ظاہر کی مخالفت بقیہ سُکر سے واقع ہوتی ہے اس وقت جو معارف اس کمینہ پر فائض و وارد ہوتے ہیں اکثر معارفِ شرعیہ پر مشتمل ہیں۔اور ان میں انہی کا بیان ہے اور علم استدلالی کشفی اور بدیہی اور مجمل مفصل ہو جاتا ہے۔

؎ گر بگوئم شرح این بیحد شود

ترجمہ: اگر ان کی شرح کی جائے تو بے حد ہو جائے۔

میں ڈرتا ہوں کہ مبادا معاملہ گستاخی تک پہنچ جائے۔

مصرع

بندہ باید کہ حد خود داند

ترجمہ: بندے کو چاہیئے کہ اپنی حد کے اندر رہے۔]

تشریح

جو صوفی حقیقی طور پر فنا اور بقا پر مشرف ہو جاتا ہے۔تو اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی طرح کیفیت عنایت فرما دیتا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے

سارے کشف و شہود کو شریعت غرا محمدی ﷺ اور عقائد کے مطابق دیکھتے تھے اور ان سب کیفیات کو شریعت غرا محمدی ﷺ کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں گستاخی نہ ہو جائے۔

اللھم اغفر لکاتبہٖ و لمن سعیٰ فیہ و لوالدیھم و لاساتذیھم و لاھل بیتھم اجمعین

آمین یارب العٰلمین

بحرمت سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مکتوب نمبر ۳

[بعض دوستوں کے مقام مخصوص میں بند ہو جانے اور بعض کے ترقی کر کے تجلی ذاتی کے مقامات تک پہنچنے کے بیان میں اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:]

تشریح

بعض سالکینِ راہ دوران سلوک کسی مقام میں رُک جاتے ہیں اور بعض اس مقام سے جلدی گزر جاتے ہیں۔ اس کی جہاں اور کئی وجوہات ہیں وہیں ایک وجہ سالک کی باطنی استعداد بھی ہے۔ جس طرح ہر انسان کی عقل اور دماغی صلاحیتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں، ویسے ہی ہر سالک کی باطنی صلاحیت اور استعداد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور اسی بناء پر سالکین کی باطنی ترقی ہوتی ہے۔ کوئی تو اپنی قوی استعداد کی وجہ سے مقامات کو جلدی طے کرتے ہیں اور ان کے اسباق جلد پختہ ہوتے ہیں اور بعض استعداد کی کمی کی وجہ سے مقاماتِ تصوف کو دیر سے طے کرتے ہیں۔ لہٰذا مشائخ کو بھی سالکوں کے ساتھ ان کی استعداد کے مطابق معاملہ کرنا چاہیئے۔ پچھلے مکتوب میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک لطیفہ روح میں دس سال تک رُکے رہے۔ اس لئے سالک کو چاہیئے کہ وہ خود بھی ذکر و فکر میں مشغول رہے اور پیر و مرشد بھی اُس کے ساتھ اُس لطیفہ پر محنت کرے، تاوقتیکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس صوفی پر اپنا فضل کرے اور اُسے فنا وبقا سے مشرف کرے۔ تب اُس سالک کے باطنی سبق (ذِکر) کو تبدیل کیا جائے۔ اور اگر سالک کے لطائف کو فنا وبقا سے پہلے ہی تبدیل کیا جائے گا تو یہ اُس کی باطنی استعداد کو خراب کرنے کے ساتھ ساتھ اُس مرید کے ساتھ خیانت بھی ہوگی۔

[**عرضداشت:** جو دوست یہاں ہیں، نیز وہ دوست جو وہاں ہیں، ایک مقام میں محبوس وبند ہو چکے ہیں۔ ان کے ان مقامات سے نکلنے کا راستہ مشکل ہو چکا ہے۔]

تشریح

کچھ سالکین، سلوک کے ایک مقام میں جاکر رُک گئے۔ ان میں سے کچھ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ الاقدس کے پاس تھے اور کچھ اُن کے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے پاس تھے، حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اُن سالکین کو اُس مقام سے نہ نکال سکنے کا اعتراف فرماتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ان دوستوں کو ان کے مقامات سے نکال کر آگے لے جانا میرے لئے مشکل ہے۔

غور فرمائیں کہ وہ ایک ہزار سال کے مجدد ہو کر بھی اپنی نفی کر رہے ہیں جبکہ دُنیا میں ہمیں اس طرح کی کوئی مثال شاید نہ مل سکے۔ کیونکہ ایسی بات کرنا مشائخ اپنی توہین سمجھیں گے۔ حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا ہے کہ "(کسی معاملہ میں علم نہ ہونے کی صورت میں) اپنے علم کی نفی کرنا بھی آدھا علم ہے"۔

اس لئے ہمیں چاہیئے کہ اگر کسی مُرید کی ترقی ہم سے نہ ہو سکتی ہو اور اُسے کسی مقام سے نہ نکال سکتے ہوں تو حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے حق اور سچ بات کھول کر بیان کر دیں اور سالکین طریقت کو جہالت کے اندھیروں میں نہ رکھیں۔

[وہ قوت وقدرت جو اس مقام کے مناسب ہے، بندہ اپنے اندر نہیں پاتا۔ حق سبحانہ وتعالیٰ آپ کی توجہات عالیہ کی برکت سے ترقی عطا کرے۔ اس کمینہ کے خویشوں میں سے ایک شخص اس مقام

سے گزر چکا ہے، اور تجلیات ذاتی کی ابتداء تک پہنچ گیا ہے۔ اس کا حال بہت اچھا ہے، اس حقیر کے قدم پر قدم رکھ رہا ہے، دوسروں کے متعلق بھی پُر امید ہے۔

وہاں کے کچھ دوست مُقربین کے راستہ سے مناسبت نہیں رکھتے۔ ان کے موافقِ حال طریقہ ابرار ہے تاہم جس قدر ان کو دولتِ یقین حاصل ہو چکی ہے وہی غنیمت ہے، اسی طریقہ پر ان کو حکم فرمانا چاہیئے۔ ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ترجمہ: ہر ایک کو اس کے مناسب حال کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔]

تشریح

متوجہ ہوں کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو مشورہ دے رہے ہیں، لیکن اُن کے شیخ اس بات پر ناراضگی کا اظہار نہیں کرتے جبکہ آج کل اگر کوئی مرید اپنے شیخ کو مشورہ دے تو وہ اُسے بُرا بھلا کہہ کر اپنی مریدی سے ہی نکال دیں گے اور کہیں گے کہ یہ بے ادب اور گستاخ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں عرض کر رہے ہیں کہ ان دوستوں کا جتنا بھی یقین ہے اتنا ہی کافی ہے۔ اگرچہ یہ دوست محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نہیں ہیں بلکہ دوسرے مشرب سے تعلق رکھتے ہیں، پھر بھی ان دوستوں کے ساتھ ابرار جیسا سلوک کرنا چاہیئے۔

[ان کے نام ظاہر کرنے کی گستاخی نہیں کی۔ آپ سے وہ مخفی نہیں ہوں گے۔ زیادہ گستاخی کی جرأت نہ کی۔ اس عرضداشت کی تحریر کے دن میر سید شاہ حسین نے اپنی مشغولی باطن میں یوں

دیکھا گویا بڑے دروازہ تک پہنچ گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دروازہ حیرت ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اس دروازہ کے اندر نگاہ ڈالتا ہوں تو اندر آپ کو اور تجھے (حضرت مجدد قدس سرہٗ کو) دیکھتا ہوں۔ ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ اندر قدم رکھوں لیکن پاؤں میری موافقت نہیں کرتے۔]

مقدمہ مکتوب نمبر ۴

چونکہ اس مکتوب شریف میں مغلق اور مشکل الفاظ و اصطلاحات ہیں اس لئے مکتوب کی شرح سے پہلے ہم مقدمہ کے طور پر چند ضروری باتیں بیان کیئے دیتے ہیں تا کہ آنے والے صفحات کی عبارات کو سمجھا جاسکے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات ذاتیہ (کلام، سمع، بصر اور علم وغیرہ) کو پہچاننا اور ان کے متعلق شرعی، علمی اور کشفی معلومات کا حاصل کرنا ضروری ہے، تا کہ معلوم ہو جائے کہ ان کا کیا مقام ہے اور ان کے متعلق ہمارے اسلاف یعنی علمائے احناف (اہل سنت و جماعت) کا عقیدہ کیا ہے۔ جب تک ہمیں یہ معلومات نہیں ہوں گی اس وقت تک مکتوبات شریف کا پڑھنا کما حقہ مفید نہ ہو گا۔

اہل سنت والجماعت کے اکابرین فقہاء و صوفیاء کرام کا عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات ذاتیہ نہ تو عین ذات ہیں اور نہ ہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات سے جدا ہیں، اور یہ صفات ذاتیہ زائد بالذات ہیں اور ان کو صفات خارجی بھی کہا جاتا ہے، ان کو سمجھنے کے لئے شریعت، علم الکلام اور کشف حقیقی تینوں کی ضرورت ہے۔

اس امت کے ۷۳ فرقوں میں سے ۷۲ فرقے ایسے ہیں جو صفات سے یا تو بالکل منکر ہیں یا ان کے متعلق ان کا عقیدہ غلط ہے، صرف ایک فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت ہے جس کا عقیدہ ہے کہ صفات ذاتیہ نہ تو عین ذات اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہیں اور نہ ہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات سے جدا اور الگ ہیں اور یہ کہ یہ صفات وجود خارجی رکھتی ہیں۔

بد قسمتی سے دور حاضر میں اکثر صوفیاء بے علم ہیں نہ تو شرعی علوم کے حصول میں کوشاں ہیں اور نہ ہی مکتوبات شریف کا مطالعہ کرتے ہیں اور پڑھ بھی لیں تو اس کے معارف کو سمجھنے سے قاصر ہیں،

اگر کوئی معتزلی ان سے بقیہ ۷۲ فرقوں میں سے ہر فرقے کے عقائد کے متعلق صرف ایک ایک سوال کرے تو یوں ۷۲ سوالات ہو جائیں گے اور میرے علم کے مطابق اس معتزلی کو ایک سوال کا جواب بھی نہیں مل سکے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے پاس شرعی دلائل ہی نہیں ہوتے۔ اس لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ صوفیاء کرام سب سے پہلے دین کا علم حاصل کریں اور دین کے علوم میں سب سے پہلے عقائد کی درستگی ضروری ہے پھر فقہی احکام کا جاننا ہے، تیسرے درجے میں سلوک ہے۔

قال الشیخ الامام فخر الاسلام علی البزدوی فی اصول الفقه العلم نوعان احدهما علم التوحید و الصفات و علم الشرائع و الاحکام۔[1]

ترجمہ: حضرت شیخ الامام فخر الاسلام علی البزدوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اصول فقہ میں فرمایا ہے کہ علم کی دو اقسام ہیں: اول: علم توحید اور صفات۔ دوم: علم شرائع اور احکام۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ:

اگر کوئی کہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا کیا عقیدہ ہے؟

تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ صفات ذاتیہ نہ تو عین ذات ہیں اور نہ ہی ذات سے جدا ہیں اور دلیل کے طور پر ہم یہ حدیث مبارکہ پیش کریں گے کہ:

قال النبی ﷺ ان للہ تعالیٰ سبعون الف حجاباً من نورٍ و ظلمةٍ لو کشفت لاحرقت سبحات وجهہٖ ما انتهیٰ الیہ بصرہ من خلقہٖ۔

---

[1] (ابو المنتھی شرح فقہ الاکبر، ص ۳)

ترجمہ: حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایاہے کہ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے نور اور ظلمت کے ستر ہزار حجاب ہیں اگر وہ حجابات دور ہو جائیں تو جہاں تک اس کی نظر جائے اس کی ذات کی عظمت اور جلال اس کی مخلوق کو جلا دے۔

روح انسانی پر نورانی حجابات بھی پڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ظلمانی حجاب بھی۔ ظلمانی حجاب تو ہم خود ہیں اور ہماری نفسانی خواہشات اور شیطانی حرکات بھی ظلمانی حجاب ہیں جبکہ نورانی حجاب یہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات ذاتیہ ہیں جن پر ہم بحث کر رہے ہیں جب سالک پر انوار وارد ہوتے ہیں تو انہی صفات ذاتیہ کی تجلی سے نزول کرتے ہیں۔

اب اگر کوئی معترض کہے کہ جب تجلی، صفات سے ہوتی ہے اور صفات کی تجلی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات سے جلوہ افروز ہوتی ہے (کیونکہ صفات کی نورانیت بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے ہی ہے) تو پھر یہ تجلی سالک کو یا جہان کو جلا کر راکھ کیوں نہیں بنا دیتی؟

تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات ذاتیہ کو جہان کے ساتھ ایک گونہ نسبت ہے۔ مثلاً اللہ سبحانہ و تعالیٰ عالم، قادر، سمیع اور بصیر ہے اور انسان میں بھی ایک نسبت کے ساتھ علم، قدرت، سمع اور بصر کی صفات پائی جاتی ہیں اور بندہ کی یہ صفات بھی صفات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فیض سے ہی ماخوذ ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ بندہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات میں شراکت رکھتا ہے کہ یہ کفر ہے (نعوذ باللہ من ذٰلک) بلکہ بندے کا عالم و قادر ہونا صرف شراکت اسمی ہے اور بس۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ علم کا لفظ بندے نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے علم سے حاصل کیا اور اسی طرح بندے کی قدرت اور سمع و بصر کی صفات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات سے مستفاد ہیں لیکن بندوں کی یہ صفات اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات کا صرف اور صرف ایک نمونہ ہیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات کا

نمونہ تو دنیا و آخرت میں بھی ناممکن ہے مگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی صفات کا پر تو ڈال کر ان صفات کا اثر اپنے بندوں میں بھی پیدا فرمادیا۔ یہ صفات ذاتیہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ بلا کیف اتصال رکھتی ہیں اور یہی صفات عارف کے کشف میں ظہور فرماتی ہیں۔

سالک سب سے پہلے جس صفت کا مشاہدہ کرتا ہے وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفت حیات ہے۔ چنانچہ جب اس صفت کا پر تو سالک کے قلب پر پڑتا ہے تو اس صفت کے اثر سے سالک کا قلب زندہ ہو جاتا ہے۔ ویسے تو انسان خود زندہ ہوتا ہے مگر اس کی صفات رذیلہ سے اس کا قلب مردہ ہو جاتا ہے لیکن جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفت حیات کے اثر سے انسان کا مردہ قلب زندہ ہو جاتا ہے تو اسے ابدی حیات نصیب ہو جاتی ہے البتہ سالک کے قلب کی ابدی حیات ویسی نہیں ہو سکتی جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حیات ہے۔

کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (٢٦) وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمٰن ٢٧)

ترجمہ: زمین پر جتنے ہیں سب کو فنا ہے اور باقی ہے تمہارے رب کی ذات عظمت اور بزرگی والا۔

پھر جب تک اللہ سبحانہ و تعالیٰ چاہے سالک کو زندہ رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے دنیا سے اٹھا لیتا ہے۔ دوسری صفت جس کا اثر صوفی (سالک) پر نمودار ہوتا ہے وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفت علم ہے۔ اس کے اثر کی وجہ سے سالک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی وحدانیت، حضور نبی کریم ﷺ کی رسالت اور قرآن عظیم الشان کے اوامر پر عالم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسی طرح سالک پر صفات ذاتیہ میں سے سمع، بصر اور کلام وغیرہ کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عین

صفات سالک میں جلوہ گر ہوتی ہیں بلکہ معاملہ یوں ہے کہ ان صفات کے اثرات سالک کے لطائف میں پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سالک اپنے آپ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا مقرب سمجھتا ہے۔

جب تک انسان میں حیات نہ ہو تب تک وہ کسی کام پر قادر نہیں ہو سکتا۔

اور اگر وہ کسی کام پر قادر نہ ہو تو وہ مثل پتھر یا دوسری جمادات کے حکم میں ہو گا۔ اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جب کسی پتھر یا لکڑی میں حیات نہ ہو تو وہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے اور حیات پانے کے بعد ہی کسی حرکت پر یا کسی کام کو کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں یونہی جب کسی سالک کے قلب میں صفت حیات کا اثر پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی حیی ہو جاتا ہے اور حیات کا اثر پیدا ہونے کے بعد اس میں صفت علم کا اثر نمودار ہوتا ہے اور یونہی باقی صفات کا حال ہے۔

اہل سنت والجماعت کے علاوہ ۷۲ فرقے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کو بھی عین اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہی سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں ساری صفات کا ثمرہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ عالم ہے تو اپنی ذات کے ساتھ عالم ہے اور اگر قادر ہے تو اپنی ذات کے ساتھ قادر ہے، وعلیٰ ھذا القیاس۔

جب کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ صفات ذاتیہ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر ان کا وجود خارجی ہے، اور اگر خدانخواستہ کوئی شخص یوں کہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود اپنی ذات کے ساتھ عالم ہے اور اسے صفات کی کچھ ضرورت نہیں ہے (یعنی صفات کا انکار کرے) تو ایسا شخص اہل سنت والجماعت سے خارج ہو جائے گا اور اس کا شمار بھی ۷۲ گمراہ فرقوں میں ہو گا۔

جہاں تک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا تعلق ہے تو اس کے متعلق ہم بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کسی صفت کی محتاج نہیں ہے لیکن ہم صفات کا انکار بھی نہیں کرتے۔ اور ہم

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات مقدسہ پر صفات کی زیادتی کے فوائد کے قائل ہیں۔ اگر صفات کا انکار کر دیا جائے تو وہ فوائد منقطع ہو جائیں گے۔ پیچھے حدیث مبارکہ میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اگر یہ نورانی (اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات) اور ظلمانی حجابات دور ہو جائیں تو سب اشیاء جل جائیں، تو صفات کے فوائد میں سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے وجود کی وجہ سے پورا جہان قائم و دائم ہے اور ان صفات کے طفیل ہی سالک بھی سلامت رہتا ہے اور وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے استفادہ کرتا ہے۔ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات کا محتاج نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ چاہے تو بغیر بادل کے بارش برسا دے اور بغیر بارش کے خشک اور مردہ زمین کو آباد کر دے، لیکن وہ اپنی صفات سے کام لیتا ہے اور قدرت کاملہ سے عالم کن فیکون کا نظام چلا رہا ہے۔ لہٰذا صفات ذاتیہ کا ہمیں ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ انہوں نے ہمیں احراق "جلنے" سے بچایا اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ہم میں کشش پیدا فرمائی جس سے ہم خدائے بزرگ و برتر سے استفادہ کر رہے ہیں اور یہی صفات ہیں جو ہمارے لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صنع اور اس کی خدائی کو نمایاں کر رہی ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ صفات نہ ہوتیں تو ہمارا استفادہ کرنا ناممکن ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ معراج کے لئے تشریف لے گئے تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے ملاقات سے پہلے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ:

قِفْ یَا مُحَمَّد فَاِنَّ رَبک یُصَلِّی عَلَیْک

ترجمہ: اے محمد ﷺ! ٹھہر جائیں بے شک آپ ﷺ کا پروردگار آپ ﷺ پر رحمت کی بارش برسا رہا ہے۔

اور اسی رحمت کی بارش کی وجہ سے آپ ﷺ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو دیکھنے، سننے اور بلاواسطہ ہم کلام ہونے کی استعداد پیدا ہوئی اور یہی وہ استفادہ ہے جس کی ہم بحث کر رہے ہیں۔ تو جب تک

ان صفات کی وجہ سے سالک کی استعداد اتنی زیادہ نہ ہو جائے۔اس وقت تک وہ (قلبی وروحی) دیدار کے لائق نہیں ہو سکتا۔ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سب کاموں کو وسائل کے تحت کیا ہوا ہے لیکن وہ وسائل کے بغیر بھی قادر ہے۔مثال کے طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماں باپ کے بغیر پیدا کر کے، حضرت اماں حوا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماں کے بغیر مرد سے اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بغیر باپ کے صرف ماں سے پیدا کر کے اپنی قدرت کاملہ کا نمونہ دکھایا کہ اگر میں چاہوں تو یوں بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن زیادہ تر اس نے اس نظام کو اپنے قانون کے تحت کیا ہوا ہے۔ جیسے بچے کے پیدا ہونے کے لئے مرد اور عورت دونوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی بارش برسنے کے لئے بادل کا ہونا شرط ہے، وغیرہ۔ جس وقت سالکین کے عروجات شروع ہوتے ہیں تو ان کی ابتدأ صفات فعلیہ کے ظل کے ظل سے شروع ہوتی ہے۔جب پیر و مرشد سالک کے قلب پر توجہ کرتے ہیں تو اس توجہ کے اثر سے سالک کا قلب حرکت میں آجاتا ہے اور شیخ کے ساتھ اس کی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور انہی توجہات کے انعکاسی اثرات کی وجہ سے وہ سالک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء کے ساتھ مناسبت پیدا کر لیتا ہے تو جس سالک کی مناسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء کے ساتھ نہ ہو اور اس کو کلام اللہ یعنی (اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت) کے وظیفہ پر لگا دیا جائے تو اس کی باطنی استعداد میں بجائے بہتری پیدا ہونے کے ابتری آجائے گی گویا اول کلاس کے طالب علم کو کالج میں داخل کر دیا گیا ہو یعنی جیسے سبزہ اگانے کے لیئے پہلے بارش درکار ہے، بارش سے زمین میں نمی آئے گی تو زمین بیج بونے کے قابل ہو گی۔ اس طرح سلوک میں شیخ پہلے سالک کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء کی تلقین کرے، جب سالک میں قابلیت پیدا ہو جائے، پھر صفات فعلیہ کی تلقین کرے تو یوں وہ سالک (مرید)صفات ذاتیہ کے اثرات پر مشرف ہو سکے گا۔

لیکن بد قسمتی سے ہم لوگوں نے مشائخ کبار اور طریقت کے اصول و قوانین سے روگردانی اختیار کرلی ہے جو کام ہمیں اچھا لگے اسے طریقت میں شامل کر لیتے ہیں چاہے وہ طریقت کی روح کے منافی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے مکتوبات شریف میں کئی جگہوں پر طریقت میں نئی نئی بدعات کی نشاندہی فرما کر ان کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ جن کی تفصیل انشاء اللہ اگلے مکاتیب میں آئے گی۔

اب ہم پھر اصل بات کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب کوئی سالک ولایت کا درجہ حاصل کرلیتا ہے تو وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسماء سے صفات اضافیہ اور پھر صفات فعلیہ پر مشرف ہوتا ہے، اس کے بعد اس کی مناسبت صفات ذاتیہ کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ صفات ذاتیہ، ظل ذاتِ خدا ہیں اور صفات ذات سے فائدہ حاصل کرتی ہیں۔

اب اگر کوئی کہے کہ آپ تو ان صفات کو ظل کہتے ہیں اور فائدہ ذات سے لیتے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ صفات حادث ہیں (نعوذ باللہ من ذٰلک) حالانکہ اہل سنت والجماعت (علماء احناف) کا عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسماء و صفاتِ ذاتیہ و فعلیہ ازلی اور قدیمی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات کی طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات بھی ازلی ہیں اور اسماء بھی۔ لیکن جب کسی شمع کو روشن کیا جائے تو اس کا ظل بھی اس کے ساتھ ہی ہوتا ہے جیسے شمع سے کسی بھی صورت میں ظل علیحدہ اور جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی صفات خداوندی کا حال ہے۔ **العاقل تکفیہ الاشارہ**

صوفیاء کرام صفات ذاتیہ (صفات خارجی) کا مشاہدہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صفات ذاتیہ اپنی ذات میں ممتاز ہیں اور یہ امتیاز بے چون و چگون ہے۔ یہ امتیاز ایسے نہیں جیسے عالم اِمکان اور عالم

وجود میں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات نہ تو عین ذات ہیں اور نہ ہی ذات سے جدا۔ اگر سالک ابتدأ میں ان صفات کے انوارات کو دیکھ لے تو ان انوارات کی تیزی کی وجہ سے اندھا ہو جائے اور ہر شے اس کی نظر سے پوشیدہ ہو جائے، جیسے اگر کوئی شخص تیز دھوپ سے کمرہ میں جائے یا سورج کی طرف دیکھنے کے بعد کسی اور طرف متوجہ ہو تو اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد اس صوفی (سالک) پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فضل ہوتا ہے اور وہ اپنی آنکھوں کو نور تجلی ذات کے سرمہ سے سرمگین کرتا ہے تو وہ ان صفات کو ذات باری تعالیٰ سے جدا دیکھتا ہے اور صفات کے انعکاس کا مشاہدہ خود اپنے وجود میں کرتا ہے۔ اسی لئے جب حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے رات کو ان صفات کا مشاہدہ کیا تو باوجود ان پڑھ ہونے کے صبح پورے قرآن عظیم الشان کے حافظ ہو چکے تھے اور قرآن عظیم الشان کے علوم واسرار ان کے سینے میں مؤجزن ہو چکے تھے۔

ہم لوگ فرائض و واجبات اور سنن نبویہ ﷺ پر عمل نہیں کرتے۔ علم دین حاصل نہیں کرتے جو کہ فرض ہے۔ عقائد کی درستگی نہیں کرتے۔ صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ کا علم نہیں رکھتے، لیکن باتیں بہت بڑی بڑی کرتے ہیں۔ عام لوگوں کو بالعموم اور صوفیاء کو بالخصوص انسانی صفات اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات میں فرق کرنا چاہیئے۔ کچھ لوگ جہالت کی وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے پیر صاحب کا علم ایسے ہے جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا علم (**نعوذ باللہ من ذٰلک**) یہ کفریہ الفاظ ہیں۔ عقائد احناف کی کتب میں لکھا ہے کہ انسان دیکھنے کے لئے آنکھ، سننے کے لئے کان، سونگھنے کے لئے ناک اور بات کرنے کے لئے زبان کا محتاج ہے لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کاموں کے لئے ان چیزوں کا محتاج نہیں۔ پھر انسان کی صفات اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات میں کون سی چیز مشترک ہو سکتی ہے؟ ہرگز، ہرگز نہیں۔ ہماری صفات نقائص سے پر ہیں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات ہر قسم کے نقائص

سے پاک ہیں۔ اور صفات ذاتیہ تک سالک کی رسائی بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فضل ہی سے ممکن ہے۔ کیونکہ صفات پر مشرف ہونا ولایت ہے اور ولایت صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عطاء ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے دلیل کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہے:

ذَلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیہِ مَنْ یَشَاءُ (الجمعۃ ۴)

یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے۔

قرآن عظیم الشان جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفت کلام ہے وہ سارے کمالات کا مجموعہ ہے۔ اور جتنی بھی صفات ذاتیہ ہیں وہ سب اس ایک صفت میں درج ہیں۔ اور شیون ذاتیہ دائرہ اصل میں داخل ہیں۔ اور صفات ذاتیہ ثمانیہ کے ظلال صفات فعلیہ ہیں اور ممکنات یعنی دنیا، زمین اور آسمان صفات فعلیہ کے ظلال ہیں۔ اسی وجہ سے کائنات ظِل کے ظِل کا ظِل ہوئی۔ تو تمام برکات و فوائد چاہے دنیوی ہوں یا اخروی وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے کلام قرآن عظیم الشان میں موجود ہیں اور تمام ظلی فوائد رمضان المبارک میں میسر ہیں۔ اسی وجہ سے رمضان کو قرآن عظیم الشان کے ساتھ خاص مناسبت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم باقی مہینوں کی نسبت رمضان المبارک میں زیادہ قرآن خوانی کرتے ہیں۔ اس ماہ مبارک میں جو فیوض و برکات نازل ہوتے ہیں وہ سارا سال تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ پھر نیکوکاروں کے علاوہ فاسق و فاجر بھی مساجد کا رخ اختیار کر لیتے ہیں اور قرآن عظیم الشان اور رمضان المبارک کی برکات سے مستفید ہوتے ہیں۔ انہیں برکات کے طفیل کچھ لوگوں کی زندگیاں ہی بدل جاتی ہیں اور کچھ دوبارہ شیطان لعین کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔

مکتوب نمبر ۴ کا اصل متن

[عظیم القدر ماہ مبارک رمضان شریف کے فضائل اور حقیقت محمدیہ علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان میں۔۔۔۔۔۔۔یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

حقیر ترین خادم کی عرضداشت یہ ہے کہ ایک مدت سے بذریعہ خط مبارک اس بلند آستانہ کے خادموں کے متعلق کچھ اطلاع اور واقفیت نہیں رکھتا۔ ہر وقت منتظر ہے۔ ماہ رمضان مبارک کی آمد آمد ہے۔ اس ماہ مبارک کی قرآن مجید کے ساتھ جو تمام کمالات ذاتی اور شیونی کا جامع ہے اور دائرہ اصل میں اس طرح داخل ہے کہ ذرہ برابر ظلیت اس کی طرف راہ نہیں پاسکتی۔ اور حقیقت محمد علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام اس کا ظل اول ہے، مکمل مناسبت رکھتا ہے۔ اسی مناسبت کی بنا پر اس مقدس کتاب کا نزول اس ماہ مبارک میں واقع ہوا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (البقرۃ ۱۸۵)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا۔

اس بات کا مصداق ہے۔]

تشریح

کلام ربی (قرآن عظیم الشان) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتی صفت ہے اور یہ اصل ہے اور ماہ رمضان المبارک اس کا ظل ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن عظیم الشان اور ماہ رمضان المبارک کے دو دو درجات ہیں۔

ایک قرآن عظیم الشان کی صورت ہے اور ایک قرآن عظیم الشان کی حقیقت ہے۔

اسی طرح ایک مارہ رمضان المبارک کی صورت ہے اور ایک ماہ رمضان المبارک کی حقیقت ہے۔

قرآن عظیم الشان اور رمضان المبارک کی صورتاً ایسی عظیم نعمتیں ہیں جن سے عابد و فاسق دونون ہی مستفید ہوتے ہیں۔ قرآن عظیم الشان کی تلاوت کرکے ثواب کماتے ہیں اور روزے رکھ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا حاصل کرتے ہیں۔ جبکہ ان کی حقیقت پر وہی لوگ فائز ہوتے ہیں جن کے باطن تجلی ذاتی سے منور ہو چکے ہوں۔ انہیں قرآن عظیم الشان کے ہر حرف کی تجلی نصیب ہوتی ہے اور وہ تجلی خاص بھی انہیں کا نصیب ہے جو رمضان المبارک میں ظہور کرتی ہے۔ پس جو شخص حقیقت قرآن عظیم الشان اور حقیقت رمضان سے واقف ہو جائے وہ فاسق وفاجر سے درجہا بہتر ہے۔

[اور اسی مناسبت کی وجہ سے یہ مہینہ تمام خیرات و برکات کا جامع ہے۔ ہر طرح کی خیر و برکت، تمام سال میں جس کسی کو پہنچتی ہے جس راہ سے بھی پہنچتی ہے، اس عظیم القدر ماہ مبارک کی بے نہایت برکات کا ایک قطرہ ہے۔ اگر اس مارہ مبارک میں جمعیت نصیب رہی تو سارا سال جمعیت حاصل رہے گی۔ اور اگر اس ماہ مبارک میں پراگندگی رہی تو سارا سال پراگندگی پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ تو کتنا مبارک ہے وہ شخص جس کے پاس یہ مہینہ آیا اور اس سے راضی اور خوش ہو گیا۔ اور خرابی ہے اس شخص کے لیے جس سے یہ مہینہ ناراض ہو گیا اور اس کی برکات اور خیرات سے محروم رہا۔ اور اس مارہ مبارک میں قرآن مجید کے ختم کی سنت بھی اسی تعلق کی بنا پر معلوم ہوتی ہے تاکہ تمام اصلی کمالات اور ظلی برکات میسر ہوں۔]

تشریح

قرآن عظیم الشان کی تلاوت اور حقیقت کے کمالات اصلی ہیں جب کہ رمضان المبارک کے کمالات ظلی حیثیت رکھتے ہیں۔ رمضان المبارک میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتوں کا نزول مثل دریا ہوتا ہے بلکہ پورے سال کی خیر و برکتیں اس مہینہ کی برکات کے سامنے قطرہ کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے کوشش کرنی چاہیئے کہ دن کو روزہ رکھ کر زیادہ سے زیادہ تلاوت کرے اور رات کی تراویح میں ختم قرآن عظیم الشان کی سنت بجالائے۔ چونکہ انسان کی پہلی مناسبت ظل کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے سالک کو رمضان کے ساتھ تعلق کو پہلے پیدا کرنا ضروری ہے اور ظل کے بعد سالک اصل کے ساتھ مناسبت پیدا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ مشائخ نقشبندیہ ابتدائی مرید کو وظیفہ کے طور پر تلاوت کرنے سے منع فرماتے ہیں کہ ابھی اس کا باطن اصل کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے کا اہل نہیں ہے، لہٰذا پہلے اسے اسماء وصفات فعلیہ کی تلقین کی جاتی ہے تا کہ وہ ظل سے مناسبت پیدا کرکے اصل یعنی صفات ذاتیہ سے مستفید ہونے کے قابل بن جائے۔

[تو جس نے ان دونوں کو جمع کر لیا امید ہے کہ وہ اس کی برکات سے محروم نہیں رہے گا اور اس کی خیرات سے روکا نہیں جائے گا۔ وہ برکات جو اس مبارک مہینہ کے ایام سے متعلق ہیں، اور ہیں اور وہ خیرات جو اس کی راتوں سے وابستہ ہیں کچھ اور ہیں۔ اسی راز کے باعث شاید یہ بات ہے کہ جلدی روزہ افطار کرنے کا حکم ہے اور سحری میں تاخیر کرنے کے متعلق وارد ہوا ہے۔ تا کہ دن رات کے دونوں وقتوں کے اجزاء میں امتیاز و فرق حاصل ہو۔ قابلیت اولیٰ جس کا اوپر ذکر ہوا، اور حقیقت محمدیہ علیٰ مظہرہا الصلوات والتسلیمات کہ اس سے عبارت ہے وہ قابلیت ذات نہیں جو صفات سے متصف ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے بلکہ عز سلطانہٗ کی ذات کی قبلیت مراد ہے جو اعتبار علمی کے ساتھ ملحوظ

ہے اور جو تمام کمالات ذاتی اور شیونی سے متعلق ہے۔یہی حقیقت قرآن مجید کو حاصل ہے۔باقی رہی اتصاف کی قابلیت جو خانہ صفات سے تعلق رکھتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے درمیان برزخ اور پردہ ہے]

تشریح

صفات ذاتیہ سے اوپر شیونات ہیں اور شیونات الٰہی سے بلند مقام اعتبارات کا ہے شیونات اور اعتبارات صفات میں سے ہیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات سے نہیں ہیں بلکہ یہ انتزاعی ہیں۔ انتزاعی کا مفہوم سمجھنے کے لئے ایک خارجی مثال پر غور فرمائیں۔

ایک کیمرہ مین اپنا کیمرہ لے کر ایک پھول کی تصویر لیتا ہے جب وہ تصویر سامنے آتی ہے تو اسے دیکھ کر ہو بہو اصل پھول کا گمان ہوتا ہے حالانکہ اصل پھول تو اپنی کیاری میں پودے پر موجود ہے یہ تصویر تو اس کا عکس ہے۔

اب شیونات ذاتیہ اور اعتبارات کو اس مثال کی کسوٹی میں پرکھیں۔ جب سالک اپنے دل کے کیمرے میں شیونات اور اعتبارات کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ ان شیونات اور اعتبارات کو عین اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات سمجھنے لگتا ہے حالانکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات مقدسہ تو وراً الوراً ہے وہ اصل پھول کی طرح سالک کے قلب میں پرتو تو ڈالتی ہے لیکن سالک کے قلب میں منتقل نہیں ہوتی۔ اس باریک ترین معرفت کو اس سے زیادہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ **العاقل تکفیہ الاشارہ (العلم عنداللہ)**

[یہ دوسرے انبیاء کرام علی نبینا و علیہم الصلوات والتسلیمات کی حقیقت ہے۔یہی قابلیت بعض اعتبار کے لحاظ سے جو اس میں پائے جاتے ہیں متعدد حقیقتوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ حقیقت محمدی

علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی گو ظلیت رکھتی ہے تاہم صفات کا رنگ اس سے آمیزش نہیں رکھتا اور کوئی واسطہ درمیان میں حائل نہیں۔]

تشریح

حقیقت محمدی ﷺ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات میں سے سمجھنا غلط اور باطل عقیدہ ہے۔ حقیقت محمدی ﷺ اگرچہ خاص الخاص حُب فی سبیل اللہ ہے مگر صفات فعلیہ اور صفات ذاتیہ سے نیچے ہے۔ اسے صفات میں داخل کرنا اکابرین اہل سنت والجماعت اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے عارفین کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ حقیقت محمدی ﷺ حادث اور مخلوق ہے جبکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات ازلی، قدیم اور واجب ہیں۔

[اور محمدی المشرب ﷺ جماعت کی حقیقتیں ذاتِ عزشانہٗ کی قابلیلات ہیں اعتبار علمی کے ساتھ جو بعض ان کمالات سے متعلق ہے۔ اور محمدی ﷺ قابلیت ذات واجب تعالیٰ اور ان قابلیلات متعددہ کے درمیان برزخ وپردہ ہے۔]

تشریح

قابلیت کا جو نقطہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے بیان فرمایا ہے اس کو سمجھنا نہایت ضروری ہے ورنہ عقیدہ کے غلط ہونے کا قوی امکان ہے اس بات کو اس مثال کے ساتھ سمجھنا چاہیئے کہ جیسے ملک پاکستان کے وزیر اعظم میں چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اور وہ ان شرائط کو پورا کر کے وزیر اعظم بن جاتا ہے لیکن اس ملک میں کچھ دیگر لوگ بھی تو موجود ہوں گے جن میں وہی شرائط موجود ہوں گی البتہ ان شرائط کی وجہ سے انہیں کوئی بھی پاکستان کا وزیر اعظم نہیں کہے گا۔ یوں ہی تصوف کا یہ باریک مسئلہ ہے کہ محمدی المشرب ﷺ اولیاء کرام میں بعض ایسی صفات

پائی جاتی ہیں جو علمی اعتبار کے لحاظ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات ہیں لیکن ان صفات کی وجہ سے ایسے محمدی مشرب ﷺ صوفیاء کرام کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ ہرگز ہرگز شراکت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شریک ٹھہرائے گا تو اس کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کے بھی خلاف ہو گا اور تصوف سے بھی انحراف ہو گا۔

[اور ان بعض کا حکم اس واسطہ سے ہے کہ ان کا قدم خانہ صفات میں ہے اور بس۔ اور اس خانہ صفات کا نہایت عروج اس قابلیت تک ہے۔ تو ضروری طور پر اس کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف کی گئی ہے۔ اور چونکہ یہ قابلیت اتصاف ہرگز منتقع نہیں ہو سکتی۔ تو ان بعض نے بھی یہ حکم لگا دیا کہ قابلیت محمدی علیٰ مظہرہا الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ ہمیشہ حائل رہتی ہے۔ ورنہ قابلیت محمدیہ کو علیٰ مظہرہا الصلوٰۃ والسلام جو صرف ایک اعتبار ہے، اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ذات میں نظر سے ارتفاع ممکن ہے بلکہ اس کا وقوع بھی ہو چکا ہے۔ اور اتصاف کی قابلیت بھی اگرچہ ایک اعتبار ہے۔ لیکن برزخیت کی وجہ سے صفات کا رنگ اختیار کر چکا ہے جو خارج میں زائد وجود کے ساتھ موجود ہیں اور جن کا ارتفاع غیر ممکن ہو چکا ہے۔ لہٰذا ضروری طور پر یہ اتصاف دائماً بیچ میں حائل رہتا ہے۔]

تشریح

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مقربین کے مختلف مراتب ہیں۔ سب سے اونچا مرتبہ ہمارے آقا و مولیٰ تاجدار عرب و عجم حضور نبی کریم ﷺ کا ہے۔ دوسرے درجہ میں انبیاء اولوالعزم علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ پھر باقی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے بعد اولیاء امت کا مرتبہ ہے۔ (اور اولیاء امت کے بھی مختلف مراتب ہیں۔)

پھر ان مقربین کی ابتدائے عروج بھی ان مراتب کے لحاظ سے ہے۔ اولیاء کرام اور سالکین تصوف جب اپنے مرشد سے جام طہور (باطنی توجہ) پیتے ہیں تو ان کا عروج شروع ہوتا ہے اور یہ عروج صفات فعلیہ کے اثر سے شروع ہوتا ہے پھر اگر وہ شریعت کی کامل اتباع کریں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا فضل ان کے شامل حال ہو تو وہ صفات کی اصل تک پہنچتے ہیں اور بس۔ جبکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ابتدائی عروج صفات کے اصل سے شروع ہوتا ہے اور وہ عروج کے مراتب طے کرتے ہوئے قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ ان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا عروج جس مقام سے شروع ہوتا ہے اسے تعین اول کہا جاتا ہے۔ اور اس سے اگلا تعین تعین ثانی ہے جو کہ ہمارے نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کے عروج کی ابتدا ہے۔ اس سے ہمارے رسول اکرم ﷺ کے مقام کا اندازہ لگا لیں۔ اور ان لوگوں کے لئے بھی یہ ایک بہت بڑی دلیل ہے جو اپنے آپ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

اب ہم سالک کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سلوک کی ابتدا میں سالک اور مرشد ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی پھلدار درخت کے نیچے چھوٹا سا بچہ اور اس کا باپ ہو۔ جب بچہ درخت پر لگے پھل کو دیکھتا ہے تو اسے کھانے کی خواہش کرتا ہے لیکن پست قد ہونے کی وجہ سے وہ نہ تو اسے توڑ سکتا ہے اور نہ ہی کھاسکنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پھر وہ اپنے باپ سے مدد چاہتا ہے اس کا باپ اس کی حالت پر شفقت کرتے ہوئے پہلے تو پھل کو درخت سے توڑتا ہے اور پھر اپنے منہ میں اسے چبا کر نرم کرتا ہے اور پھر اپنے بچہ کے منہ میں ڈالتا رہتا ہے تاکہ وہ اس پھل سے قوت و توانائی حاصل کر سکے۔ لیکن جب وہی بچہ اپنے باپ کی کوششوں سے بڑا ہو جاتا ہے تو خود ہی اس پھل کو توڑنے اور اس سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی قدرت حاصل کر لیتا ہے ایسے ہی سلوک میں ابتدائی سالک کی حیثیت ہوتی

ہے۔ اس کا مرشد جو خود صفات فعلیہ اور صفات ذاتیہ سے مستفید ہو چکا ہے۔ وہ ان صفات سے استفادہ کر کے ان کا فیض اپنے اس مرید کے قلب میں منتقل کر دیتا ہے جو ابھی سلوک میں پست قد ہے اور اس کی رسائی صفات تک نہیں ہے پھر وہ مرید اپنے پیر و مرشد کی شفقتوں اور کوششوں سے بالآخر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فضل و کرم کے درخت سے صفات کے فیض کا پھل حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس مثال سے جہاں سالک کی ابتدائی کیفیت اور اس کی ترقی کی منازل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہیں اس یہ یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ مرید کو سلوک کی منازل طے کروانے کے لئے اس کے پیر و مرشد کا ان منازل کو پہلے طے کرنا ضروری ہے اگر وہ خود ہی سلوک سے بے بہرہ ہو گا اور صرف سجادہ نشینی تک ہی محدود ہو گا تو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اس مخلوق کی کیا خاک باطنی تربیت کرے گا جو اس کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے اور اس کو دین و دنیا کا پیشوا بنا کر اس سے امیدیں وابستہ کر چکی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے آگے ایک مکتوب میں اس شیخ سے بیعت کرنے سے منع فرمایا ہے جو صرف اپنے اباءواجداد کی مسند پر براجمان تو ہے مگر سلوک و تصوف کی ان منازل سے غافل اور محروم ہے۔

اب ہم پھر اصل بات کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

علم کے تین بنیادی درجات ہیں

(۱) لفظ علم　　(۲) صفت العلم　　(۳) شان العلم

سالک کی نظر یا پہنچ صرف علم تک ہوتی ہے۔ جبکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے حضرت ابراہیم و حضرت نوح علیہم الصلوٰۃ والسلام کے عروج کی ابتدا شان العلم سے ہے۔ یعنی باقی انبیاء علیہم

الصلوٰۃ والسلام ترقیات کے حصول کے بعد جہاں پہنچے وہاں سے ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کی ابتدا ہے اور آپ ﷺ کی انتہا کو خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

[اس قسم کے علوم جن کا منشاء اصالت اور ظلیت کی جامعیت ہے، بہت وارد ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کاغذ پر لکھ لیئے جاتے ہیں۔ قطبیت کا مقام جو دقیق علوم کا منشاء ہے ظلی مقام ہے۔]

تشریح

یہاں پہنچ کر حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے ایک باریک معرفت بیان فرمائی ہے اور وہ یہ کہ قطبیت کا مقام ایک ظلی مقام ہے۔ یعنی قطب ارشاد اور قطب مدار کے مقام پر فائز ہونے والا شخص ظل سے فیض اخذ کرتا ہے نہ کہ اصل سے۔ کیونکہ اولیاء اللہ کی ولایت ہے ہی ظلی۔ اصلی ولایت صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خاصہ ہے۔ جبکہ دور حاضر کے صوفیاء کرام کی نظر میں تو ظل کی حیثیت ہی کچھ نہیں۔ یہ تو اپنے آپ کو اصل سمجھے ہوئے ہیں اور صوفیاء کرام کا اپنے آپ کو اصل سمجھنا صوفیانہ طور پر پیغمبری کا دعویٰ کرنے کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صفات کے اصل سے فیض لینا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صفت ہے اور جو شخص یہ کہے کہ میں صفات کے اصل سے فیض لیتا ہوں تو گویا وہ اپنے آپ کو پیغمبر سمجھتا ہے (العیاذ باللہ) پس ایسے شخص کی یہ خوش فہمی جہالت کی نشانی ہے۔ اگر وہ علماء حق اور کسی کامل و مکمل شیخ کی صحبت اختیار کرے اور پھر عقائد اور اصول تصوف کو سیکھے تو اسے اپنے دیگر کفریات سمیت اس غلط سوچ کا بھی اندازہ ہو۔ اسی لئے مشائخ نے فرمایا ہے کہ بغیر علم کے پیری مریدی کرنا ہی کفر کے لئے کافی ہے۔ تو سالکین طریقت پر تجلیات کے ظل سے فیض آتا ہے اس لئے صوفیاء کرام کی ولایت ظلی ہوتی ہے نہ کہ اصلی۔ پس اگر جاہل ایسی غلطی کرے گا تو کوئی عالم یا شیخ کامل اس کو ایسی غلطی سے روکے گا اور اس کی اصلاح کرے

گا۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے عالم و پیر ہونے کے دعویٰ کے ساتھ ایسی بڑی غلطی کا مرتکب ہو تو اس کی اصلاح کیسے ہو گی؟ اس لئے سلوک سے پہلے علم دین کا حاصل کرنا ضروری ہے تا کہ بجائے فائدے کے نقصان نہ ہو۔ پس ان سب باتوں کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ ولی اللہ کا تعین ظل سے ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تعین اصل سے۔ اور چونکہ ظل، اصل نہیں ہو سکتا اس لئے کوئی بھی امتی پیغمبر کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

[اور فردیت کا مقام دائرہ اصل کے معارف کے ورود کا واسطہ ہے۔]

تشریح

جو شخص مقام فردیت پر فائز ہو اسے قطب فرد کہتے ہیں، قطب فرد دعوت و ارشاد نہیں کر سکتا بلکہ اس کی ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں، مجاہدین اسلام اور پورے عالم اسلام کی فلاح و کامیابی اور فتح و نصرت کی دعائیں مانگتا ہے اور ان امور میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اجازت سے تصرف کرتا ہے اس کے برعکس لوگ دوسروں کے لئے بد دعائیں کرتے ہیں اور اپنے غیر شرعی طریقوں سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مخلوق کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دور کرنے کی کوششیں کرتے ہیں ایسی خصلت رکھنے والا نہ تو قطب فرد کے مقام پر پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی ولایت کے کسی دوسرے درجے پر فائز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اولیاءاللہ کو لوگوں کی اصلاح اور ان کے حق میں دعائیں کرنے کا ذمہ سونپا جاتا ہے تو جو شخص اس ذمہ سے عہدہ برانہ ہو، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اسے کیونکر اپنا ولی بنائے گا۔ اس لئے جو شخص مقام ولایت پر فائز ہونا چاہے اسے دیگر شرعی امور پر عمل کرنے کے علاوہ لوگوں کی اچھائی کے لئے دعائیں کرنی چاہیئیں اور بد دعا کرنے سے بچنا چاہیئے۔

[ان دولتوں (مقام قطبیت اور مقام فردیت) کے حصول کے بغیر ظل اور اصل کے درمیان فرق و امتیاز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا بعض مشائخ قابلیت اولیٰ کو جسے تعین اول بھی کہتے ہیں ذات سے زائد نہیں مانتے اور اس قابلیت کے شہود کو ہی تجلی ذاتی خیال کرتے ہیں۔ لیکن حق بات وہی ہے جو میں نے بیان کی اور جس کی میں نے وضاحت کر دی ہے اللہ سبحانہ و تعالیٰ حق کو حق ظاہر کرتا ہے اور وہی سیدھے راستے کا ہادی ہے۔

جس رسالے کی تحریر کا بندہ کو حکم ہوا تھا اس کے مکمل کرنے کی توفیق میسر نہ آسکی اور جتنی لکھ چکا تھا اتنی ہی تحریرات پڑی ہیں۔ پتہ نہیں اس توقف میں خدا تعالیٰ جل سلطانہٗ کی کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ زیادہ گستاخی ادب سے دور ہے۔]

مکتوب نمبر ۵

[خواجہ برہان الدین کی سفارش کے سلسلہ میں جو آپ کے مخلصوں میں تھے اور کچھ دوسرے حالات کے بیان میں۔۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

کمترین خادم کی عرضداشت یہ ہے کہ حضرات خواجگان نقشبندیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کی طریقت کے بارے میں لکھ کر ارسال خدمت کیا ہے، آپ کی نظر مبارک سے گزرے گا، ابھی مسودہ ہے۔ خواجہ برہان آپ کی طرف جلد ہی چل پڑے، نقل مسودہ کی فرصت نہ مل سکی۔ اس امر کا احتمال ہے بعض دوسرے علوم بھی اس سے لاحق کر دیئے جائیں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بارے میں کچھ تحریر لکھی تھی اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مسودے کو اپنے پیر بزرگوار کی خدمت اقدس میں پیش کیا تاکہ وہ اس مسودے کا مطالعہ کر کے اس میں جن باتوں کی کمی ہے ان کی نشاندہی کریں اور جو باتیں اضافی ہوں اُن کو ختم کر دیں۔

[ایک روز رسالہ سلسلۃ الاحرار نظر سے گزرا اور اس کے مطالعہ سے میرے دل سُست میں گزرا کہ حضرت کی خدمت میں عرض کروں آپ خود اس رسالہ کے علوم کے بارے میں کچھ تحریر فرمائیں یا اس فقیر کو حکم دیں، تاکہ بندہ اس سلسلہ میں کچھ لکھ سکے۔ یہ خیال کافی قوت پکڑ گیا تو اس کے ساتھ ہی مسودہ سے متعلق بعض مزید علوم کا فیضان وورود ہوا۔ بہر حال اس رسالہ کے بعض علوم کی وضاحت ہو سکی۔ اگر اس مسودہ کو تکملہ تصور کر لیں تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ اور اگر بعض مناسب

کو منتخب کرکے اس رسالہ سے ملحق کردیں تو یہ صورت بھی ٹھیک ہے۔ زیادہ جرأت ادب سے دور ہے۔]

تشریح

رسالہ سلسلۃ الاحرار، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس اللہ سرہٗ العزیز کی تصنیف ہے اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے دادا پیر کے دادا پیر ہیں، رسالہ سلسلۃ الاحرار میں آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بعض انتہائی باریک معارف کو بیان فرمایا ہے اور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے ارادہ فرمایا کہ ان معارف کی اس انداز میں تشریح کی جائے کہ ان معارف کی مطابقت شریعت غرأ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے ساتھ ہو جائے کیونکہ تشریح نہ ہونے کی وجہ سے علماء ظواہر صحیح توجیہات نہیں کرسکتے اور اسی لا علمی اور جہالت کی وجہ سے مشائخ کبار پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تصوف میں بعض دفعہ کسی سالک پر ایسی کیفیت رونما ہوتی ہے جس میں اُس کو ہر جگہ اور ہر شے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نظر آتا ہے۔ اور وہ سالک (صوفی) اپنی اس کیفیت کو اُسی طرح بیان کر دیتا ہے اور اسی طرح اُس کو تحریر میں لے آتا ہے، جس سے عام علماء غلط مفہوم لے کر سالک کے بارے میں بد ظن اور بد گمان ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سلوک کی ایسی کیفیات کی تشریح کر دینی چاہیئے تاکہ تصوف پر ہونے والی بد گمانی کو دور کیا جاسکے۔ ایسے ہی جس سالک پر ایسی کیفیت طاری ہو اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی کیفیت کو شریعت کی کسوٹی میں تولے۔ اگر شریعت کے مطابق نکلے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اگر خلاف ہو تو اُس کی نفی کرے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے استغفار کرے۔ کیونکہ وہ سالک جسے ہر چیز میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ظہور دکھائی دے اور وہ اس پر خوش ہو کر کہے گا کہ میں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو دیکھ لیا ہے تو اسی طرح

وہ اشیاء کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا مکان ثابت کر رہا ہو گا، حالانکہ عقائد کی رُو سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی مکان میں نہیں آسکتا اور نہ ہی دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ظاہری آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اس لئے صوفی اپنی ایسی حالت پر عقیدہ نہ رکھے بلکہ اُسے صرف ایک باطنی کیفیت ہی سمجھے۔

ان ہی تشریحات کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے رسالہ سلسلۃ الاحرار کو اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں ارسال کیا اور اپنی تحریر اور تشریح کی درستگی کے لئے اپنے پیر و مرشد سے درخواست کی۔

[خواجہ برہان نے اس مدت میں خوب کام کیا ہے اور تیسری سیر سے جو مقامِ جذبہ سے تعلق رکھتی ہے اس سے بھی ان کو حصہ مل چکا ہے۔ صوبہ مالوہ میں معاش کے لحاظ سے ان کا وقت پراگندہ اور مشوش ہو گیا ہے۔ ملازمت کے لئے حاضر ہو رہے ہیں، آپ جو حکم بھی فرمائیں گے مبارک ہو گا۔]

تشریح

سیر کی تین اقسام

۱۔ پہلی سیر کو "رجوع" کہتے ہیں۔ یعنی کفر اور فسق وفجور سے اسلام اور اعمال صالحہ کی طرف رجوع کرنا یہ پہلی سیر ہے، اور یہ ظلی کیفیت میں ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری سیر "محبت" ہے یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ، حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم، قرآن عظیم الشان اور دینِ اسلام کے ساتھ محبت کرنا۔

اور اس سیر کی نشانی یہ ہے کہ جب کسی سالک سے خدانخواستہ نماز یا روزہ فوت ہو تو وہ پریشان ہو جائے اور فورًا قضاء لوٹانے کی کوشش کرنے لگے، اور قضاء کر لینے کے بعد بھی سوچتا رہے کہ معلوم

نہیں کہ میری یہ نماز وروزہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں قابل قبول بھی ہے یا نہیں؟ پس وہ شخص جو کبھی نماز پڑھے اور کبھی نماز سے بے فکر ہو اور رمضان میں کبھی روزہ رکھ لے اور کبھی نہ رکھے، تو وہ اس سیر سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو زبانی عاشق نہ بنائے۔ ایسے ہی لوگ وہ لوگ ہیں جو صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود نہ توجہ کرتے ہیں اور نہ ہی زکوٰۃ کا فرض ادا کرتے ہیں اور پھر مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں اپنے آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا عاشق کہتے ہیں لیکن صورتیں کفار ویہود جیسی بنائی ہوئی ہیں پس ایسے لوگ اس محبت سے خالی اور محروم ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ أَيُّ الْعَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللهِ؟ قَالَ: أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ۔[1]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہمیشگی اور پابندی والا عمل خواہ تھوڑا ہی ہو۔

۳۔ تیسری سیر کو "جذبہ" کہتے ہیں یعنی جب کوئی شخص دینِ حقہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور وہ پختگی کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم اور طریقت کی برکات کے طفیل جذبہ میں جا پہنچتا ہے۔ اب دونوں طرف سے کشش پیدا ہو

---

[1] (رواہ الصحیح المسلم، ص ۲۶۲ باب فضیلۃ العمل الدائم، الخ)

جاتی ہے۔ بندہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ بندہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ میرا بندہ نفس و شیطان اور لعین دنیا کی وجہ سے گمراہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ تین چیزیں بندہ کو بدبخت کر دیتی ہیں۔ دنیا کی مثال تو سانپ کی طرح ہے، سانپ کا بدن دیکھنے میں مخمل کی طرح بہت خوبصورت اور جاذب نظر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جوں ہی اس کے قریب ہوں تو وہ فوراً ڈس کر مار ڈالتا ہے ایسے ہی دُنیا ہے کہ دیکھنے میں تو بہت خوبصورت اور میٹھی ہے، لیکن جو شخص اس کی زیب و زینت پر عاشق ہو جائے تو یہ اُس کے ایمان اور آخرت کو فوراً ضائع کر دیتی ہے۔ اُس پر شہوت طاری ہو جاتی اور وہ غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہی چیزیں انسان کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دور کرتی ہیں پس اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فضل اُس کے شامل حال نہ ہو اور اُسے جذبہ نصیب نہ ہو تو پھر ان دشمنوں سے نجات متصور نہیں ہو سکتی۔

مکتوب نمبر ٦

[جذبہ اور سلوک کے حصول کے بیان میں اور جمال وجلال دونوں صفتوں کے ساتھ تربیت پانے اور فنا وبقاء اور ان کے متعلقات اور نسبت نقشبندیہ کے فائق اور اعلیٰ ہونے کے بیان میں۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

کمترین غلام، احمد کی عرضداشت یہ ہے کہ مرشد علی الاطلاق (اللہ تعالیٰ) جل شانہٗ نے آپ کی توجہ کی برکت سے جذبہ اور سلوک دونوں طرح پر (اس ناچیز کی) تربیت فرمائی ہے اور جمال وجلال دونوں صفتوں کی تربیت کے ساتھ نوازا ہے۔ اب جمال عین جلال اور جلال عین جمال ہے۔ رسالہ قدسیہ (مصنفہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے بعض حواشی کی اس عبارت کو اپنے مفہومِ صریح سے بدل دیا گیا ہے۔ اور ایک موہوم معنی پر حمل کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ عبارت اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے، اس میں تاویل وانحراف کی گنجائش نہیں۔ اور اس تربیت کی علامت یہ ہے کہ مجھے محبتِ ذاتی سے متحقق کر دیا گیا ہے۔ محبتِ ذاتی کے ساتھ موصوف ہونے سے قبل اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اور محبتِ ذاتی فناء کی علامت ہے۔ اور فناء ماسویٰ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بھول جانے کا نام ہے۔ تو جب تک تمام علوم سینہ سے دور نہ ہو جائیں اور انسان جہل مطلق سے موصوف نہ ہو جائے فنا سے حصہ نہیں پا سکتا۔ اور یہ حیرت اور جہل دائمی ہے، اس کے زوال کا امکان نہیں۔ اور نہ یہ بات ہے کہ کبھی زائل ہو جائے اور کبھی حاصل ہو جائے۔]

تشریح

اگرچہ پہلے مکاتیب میں جذبہ، سلوک اور فنا کو بیان کیا گیا ہے مگر پھر بھی اجمالی طور پر اس مکتوب شریف میں انہیں پھر بیان کیا جارہا ہے۔

جذبہ: یہ ہے کہ انسان بغیر سلوک اور بغیر مُرشد کے بچپن ہی سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دوستی کا خواہش مند اور اس کی طرف میلان کرنے والا ہو۔ اس وجہ سے اس کا قلب، روح، سِر، خفی اور اخفیٰ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف میلان پیدا کر لیتے ہیں، مگر سلوک طے کرنے کے بغیر اس کا کوئی چارہ نہیں ہوتا جیسے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم ماں کے پیٹ سے ہی ولی اللہ پیدا ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے بچپن ہی سے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں جذبہ تھا اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے محبت واحترام سے پیش آتے تھے، مگر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سلوک کی بھی ضرورت تھی، اس لئے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے بالمشافہ سارے اوامر خدا، اذکار اور تصوف کا راستہ سیکھا۔ اور یہ جذبہ ابتدائی ہے اس کے بعد وہ جذبہ ہے جو سلوک کی منازل کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

جذبہ سیر انفسی کا نام ہے اللہ تعالیٰ کے فضل اور مرشد کامل کی توجہات سے سیر انفسی میں عالم امر کے لطائف کا تذکیہ ہو جاتا ہے۔ اور لطائف اپنے اصل میں فنا ہو جاتے ہیں، یہ کیفیت جذب ہے، اور اس تربیت کے حاصل کرنے والے کو مجذوب کہتے ہیں۔

سلوک سیر آفاقی کا نام ہے، مرشدِ کامل کی ہدایت کے مطابق اتباع سنت وشریعت وریاضت ومجاہدہ کے ذریعے طہارتِ نفس وعناصر حاصل کرنا سیر آفاقی ہے، اس کو سلوک کہتے ہیں اور اس قسم کی تربیت حاصل کرنے والے کو مجذوب سالک کہا جاتا ہے۔

جذبہ سلوک سے مقدم ہو تو ایسے مرید کو مجذوب سالک کہتے ہیں۔ اگر سلوک جذبہ پر مقدم ہو تو ایسے مرید کو سالکِ مجذوب کہتے ہیں۔

حضرات نقشبندیہ جذبہ کو سلوک پر مقدم رکھتے ہیں، اس لئے اکثر نقشبندی صوفیاء مجذوب سالک ہوتے ہیں۔ دیگر سلاسل کے بزرگ سلوک کو جذبہ پر مقدم کرتے ہیں، اس لئے ان کے اکثر صوفیاء سالک مجذوب کہلاتے ہیں۔

یہاں مجذوب کا عوام میں متعارف معانی مراد نہیں۔ بلکہ مجذوب کا لفظ توجہ ٔ شیخ سے فضیلت ہونے والے پابند شریعت صوفی پر استعمال فرمایا ہے۔

اقسامِ جذبہ

جذبہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ جذبہ ٔہدایت　　　　۲۔ جذبہ ٔنہایت

جذبہ ٔہدایت کو جذبہ ٔصوری ، اور جذبہ ٔنہایت کو جذبہ ٔحقیقی کہتے ہیں۔ جذبہ ٔہدایت سلسلہ ٔ نقشبندیہ کا خاصہ ہے، جو حضرت خواجہ ٔنقشبند بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نسبت کا خصوصی فیضان ہے۔ اندراج النہایۃ فی البدایۃ کا بھی یہی مفہوم ہے۔ جذبہ ٔنہایت تمامِ سلاسل طریقت میں مشترک ہے۔

تعبیراتِ جمال وجلال

صوفیاء کرام کے نزدیک جمال وجلال کے متعدد مفہوم ہیں، مثلاً:

- جمال سے مراد اللہ تعالیٰ کا انعام واکرام ہے، جو بصورتِ راحت ورحمت اور صحت وشفاء ظاہر ہوتا ہے۔
- جلال سے مراد اللہ تعالیٰ کا قہر وغضب ہے۔ جو بصورتِ رنج والم وتکلیف ومصیبت ظاہر ہوتا ہے۔

- جمال سے مُراد تجلیٔ لُطف ورحمت ہے، تمام افعال وآثار خیرات وطاعات اور اعمالِ عبادات وحسنات کا صدور اسی تجلیٔ جمال سے وابستہ ہے۔
- جلال سے مراد تجلیٔ قہاری ہے۔ تمام افعال وآثار، ضلالت وشرارت اور اعمالِ کثافت کا صدور اسی تجلیٔ جلال سے ظاہر ہوتا ہے۔
- جمال سے مرتبۂ وحدت اور جلال سے مرتبۂ احدیت بھی مراد لیا گیا ہے۔
- جمال سے التفاتِ محبوب اور جلال سے استغناء محبوب مراد ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم!

سالک جب تزکیۂ نفس کے بعد مقامِ معرفت پر فائض ہوتا ہے اور جذبہ وسلوک کی دونوں جہتوں سے حصہ پاتا ہے اور جمالی وجلالی صفتوں کے ساتھ تربیت پاتا ہے تو اس کو ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ محبت ذاتی کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے اس مرتبے میں اسے جمال اور جلال دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ جمال اور جلال دونوں اللہ تعالیٰ کے فعل ہیں۔ محبوب کے فعل بھی محبوب ہوتے ہیں۔ اسی لئے جمال وجلال کی خصوصیات اس کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں اور اس کی ساری توجہ صرف محبوب کی طرف رہتی ہے۔[1]

سلوک: یہ وہ راستہ ہے جس پر سب سے پہلے ہمارے آقا ومولیٰ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم عملی طور پر چلے اور پھر ظاہری وباطنی کوششوں سے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو چلایا پھر اُس زمانے سے لے کر آج تک کے علماءِ حق اور مشائخ کرام اس راستے پر چلتے آئے ہیں۔ اور جس طرح اُن مشائخ نے اپنے مشائخ سے طریقہ ذکر وفکر سیکھا اسی طرح وہ اپنے

---

[1] (البینات شرح المکتوبات، ص ۲۵۸ تا ۲۶۰)

مریدین کو لطائف قلب، روح، سِر، خفی اور اخفیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور اسی راستے پر چل کر سالکانِ طریقت مقامِ ولایت پر فائز ہوتے ہیں۔

صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ میں زہد و تقویٰ کا دار و مدار خود حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی صحبتِ مبارکہ پر تھا اور اُس وقت ان محافل اور اُن کی کیفیاتِ ظاہری و باطنی کو سلوک کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ مگر سلوک کا طریقہ یہی تھا۔ دوسری صدی ہجری میں اُس راستے کا نام سلوک پڑا پھر ۶۰۰ ہجری میں وحدت الوجود کی کیفیت پیدا ہوئی اور اس میں اضافہ ہوتا گیا، تاوقتیکہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کا ظہور ہوا اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقائد اور متقدمین صوفیاء کی وحدت الشہود کی کیفیات کو دوبارہ زندہ کیا اور قال و حال دونوں طریقوں سے اپنے اسلاف کا نام پھر روشن کر دیا۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ میری تربیت بھی دونوں طریقوں سے ہوئی ہے، اب جلال بھی میرے لئے جمال ہی کی طرح ہے، یعنی اب اگر مجھ پر غم واندوہ آتا ہے تو میں اس پر بھی بہت خوش ہوتا ہوں اور اس پر میرا دل تنگ نہیں ہوتا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔

ابتدائی سالک پر جب شیخ جلالی توجہ کرتا ہے تو اس سے مختلف کیفیات کا ظہور ہوتا ہے، کبھی تو اُس کا دل تنگ ہو جاتا ہے، اور وہ اس کیفیت کی وجہ سے اپنے شیخ سے دور ہونا چاہتا ہے، لیکن اسی جلالی کیفیت میں کبھی وہ بار بار روتا ہے، اور کبھی وہ چاہتا ہے کہ اُس کا شیخ اُس کی نظروں سے ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل نہ ہو۔ پھر جب شیخ (پیر و مُرشد) اُس سالک پر جمال کی توجہ کرتا ہے تو سالک کا دل

جمالی کیفیت سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ پس شیخ کامل و مکمل وہ ہے جو احکامِ شرع کا پابند بھی ہو اور جلال وجمال کی صفت سے بھی موصوف ہو تا کہ اپنے مریدین کی دونوں طریقوں سے تربیت کر سکے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنی فنا کی کیفیت کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ میں اس طرح فانی ہو گیا کہ میری جلال وجمال کی کیفیت دائمی ہو گئی لیکن یوں نہیں کہ کسی وقت میں ذکر میں مشغول ہوں اور کسی وقت ذکر سے غافل بلکہ میری فنا کی حالت یہ ہے کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر سے غفلت محسوس نہیں کرتا۔

[غایۃ درجہ یہ بات ہے کہ بقا سے پہلے محض جہالت ہوتی ہے اور بقا کے بعد جہالت اور علم دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔]

تشریح

بقا: جب کسی سالک کو فنا حاصل ہو جائے تو اسے بقا سے بھی مشرف کیا جاتا ہے اور بقا سے یہ مراد ہے کہ سالک کے لطائف کو ابدی حیات مل جائے اور اُس کے جسم کو مَرنے کے بعد قبر میں مٹی نہ کھائے۔ اور اَبدی حیات سے مراد وہ حیات نہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ ہر چیز فانی ہے جیسا کہ قرآن عظیم الشان میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (٢٦) وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمٰن ٢٧)

ترجمہ: زمین پر جتنے ہیں سب کو فنا ہے، اور باقی ہے تمہارے رب کی ذات عظمت اور بزرگی والا۔

اور بقا کی کیفیت میں حیرت ونادانی ہوتی ہے یعنی ابتدا میں تو سالک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کا مشاہدہ کرتا ہے اُسے حلاوت ووجدان نصیب ہوتا ہے، لیکن انتہاء میں جب سالک اپنے آپ کو اللہ

سبحانہ وتعالیٰ سے دور اور جدا دیکھتا ہے تو حیرت میں ڈوب جاتا ہے اور اُس کا وہ پہلا علم نادانی سے بدل جاتا ہے۔ یہ حیرت ونادانی ایسی نہیں ہوتی جیسے بعض جاہل صوفیاء کہتے ہیں کہ ہم حیرت ونادانی کے ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اب ہم سے حلال وحرام میں تمیز نہیں ہو سکتی ایسی حیرت ونادانی شریعت وطریقت کے سراسر خلاف ہے۔ اور جس حیرت ونادانی کی بات ہم کر رہے ہیں وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں پیدا ہوتی ہے۔ سالک کہتا ہے کہ میں نے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو پالیا تھا مگر اب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کہاں ہے اور یہ تو اہلِ سُنت وجماعت کے متفقہ عقائد ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی مکان کا مکین نہیں ہے۔ اور نہ اُس کا جسم ہے وہ وہ جوہر وعرض ہے نہ اُس کی کوئی حد ہے نہ اُس کی کوئی ضد ہے اور نہ اُس کے لئے گنتی والا "ایک" استعمال ہو سکتا ہے (کیونکہ گنتی والا ایک تقسیم ہو سکتا ہے، جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تقسیم ہونے سے پاک ہے) نہ اُس کا کوئی شریک ہے نہ کوئی ہم جنس، نہ اُس کی کوئی مثال ہے، اور نہ ہی اُس پر وقت گزرتا ہے۔ نہ اُس کے لئے چھ سمتوں میں سے کوئی سمت ہے اور نہ اُس پر کوئی کام واجب ہے۔ وہ خود واجب الوجود ہے ایسا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کوئی چیز تو ہے لیکن ہماری عقل وفکر اور وہم وفہم سے بالاتر ہے اور یہی حیرت ونادانی ہے۔ عقائد کی کتابوں میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی ذات اور اسماء وصفات کے ساتھ موجود اور قدیم وازلی ہے، اور اس کی صفات حادث نہیں ہیں۔

اگر ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء وصفات کو حادث (یعنی بعد میں پیدا شدہ) کہیں تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ ان اسماء وصفات کے حدوث سے پہلے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان صفات سے محروم تھا جبکہ یہ بات نہ صرف ناممکن ہے بلکہ ایسا عقیدہ رکھنا ہی کفر ہے۔ اسی لئے اکابرِ احناف نے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کی طرح اُس کے اسماء وصفات بھی ازلی اور قدیمی ہیں۔ اور جس طرح اللہ

سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کسی دوسری چیز کے مشابہ نہیں ہے، اسی طرح اُس کی صفات بھی کسی چیز کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتیں۔ پس اگر کوئی کہے کہ کسی نبی یا اولیاء اللہ میں سے کسی ولی اللہ کی قدرت یا علم ایسے ہیں جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت اور علم ہے تو اس سے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اور اُس پر مشرک کا اطلاق ہو گا۔ پھر مُشرک کی بھی دو اقسام ہیں۔

مُشرک کی دو اقسام

۱۔ مُشرک بالذات　　　　۲۔ مُشرک بالصفات

مشرک بالذات

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے زمانۂ مبارک سے قبل کفارِ مکہ نے مختلف کاموں کے لئے مختلف قسم کے بتوں کو اپنا معبود بنایا ہوا تھا یعنی اُن کے رزق، سفر اور شادی وغیرہ کے معاملات کے الگ الگ بُت تھے۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کے پیروکار ہیں اور ہمارے بُت ہماری ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ہیں۔ یہ لوگ بتوں کے نام پر جانوروں کو ذبح کرتے تھے اس لئے یہ مشرک بالذات ہوئے۔ اب جو لوگ بھی ان کی طرح کے افعال کریں وہ بھی مشرک بالذات ٹھہریں گے کیونکہ انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی دوسرے نفس کو شریک کر لیا ہے۔ (اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں شرک سے محفوظ رکھے، آمین)

مشرک بالصفات

مشرک بالصفات وہ شخص ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات میں کسی دوسرے کو شریک ٹھہرائے مثلاً یوں کہے کہ فلاں بزرگ کا علم ایسے ہے جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم یا (خدانخواستہ) فلاں

پیر صاحب کی قدرت ایسی ہے جیسی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت، یا مثلاً اولیاء اللہ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرح ہر چیز کا علم ہر وقت اور ہر جگہ رہتا ہے، تو یہ الفاظ شرک بالصفات کے ہیں۔ اور ان سے بچنا اپنے ایمان کو بچانے کے لئے بہت ضروری ہے، اسی لئے شریعت محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے دینِ اسلام کے بارے میں علم حاصل کرنے کو فرض کیا ہے۔

[عین نادانی میں شعور ہوتا ہے اور عین حیرت میں شہود حاصل ہوا ہوتا ہے۔]

تشریح

سالک کو شہود بھی ہوتا ہے اور نادانی بھی، اثرات معلوم ہوتے ہیں، مشاہدہ ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ نادانی بھی ہوتی ہے۔ یہاں اس کی عقل وفکر کام نہیں کرتی کہ یہ کیا چیز ہے۔

[اور یہ حق الیقین کا مقام ہے، جہاں علم اور عین ایک دوسرے کے لئے حجاب نہیں ہیں۔ اور وہ علم جو اس جہالت سے پہلے حاصل ہوا ہوتا ہے، وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اگر علم ہے تو اپنے میں ہے، اگر شہود ہے تو وہ بھی اپنے اندر ہے، اور اگر معرفت یا حیرت ہے تو وہ بھی اپنے ہی اندر ہے۔]

تشریح

سالک کا وہ علم جو ایمانِ مفصل میں مذکور ہے اس کے اثرات سے جب سالک مستفید ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کے اثرات اس پر پڑتے ہیں تو وہ انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے مگر وہ ان تجلیات اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات میں فرق نہیں کر سکتا۔

حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی کیفیت کو شعر میں یوں بیان فرمایا تھا کہ:

علمِ حق در علمِ صوفی گم شود — این سخن کئے باورِ مردم شود

ترجمہ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم، صوفی کے علم میں محو اور گم ہو جاتا ہے مگر یہ بات لوگوں کی سمجھ میں کیسے آئے گی۔

مراد یہ ہے کہ ایمانیات کا علم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم ہے۔ جب تک سالک اس علم پر ایمان لاتا ہے اور زبان سے تکرار بھی کرتا ہے، تو وہ حیرت میں چلا جاتا ہے کہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ایمان بھی لایا، کیفیات کا مشاہدہ بھی کیا لیکن میں اس واحد ولا شریک ذات کو کیوں نہیں دیکھ پایا۔ پس وہ علم اس کے علم میں گم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان کیفیات سے ناواقف لوگ جو مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس جیسے دوسرے کلام پر اعتراض کرتے ہیں وہ خود ہی گمراہ ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں ہدایت دے تاکہ وہ اہل اللہ پر زبانِ طعن نہ کھولیں۔

البتہ ناقص صوفیوں نے اس شعر سے غلط مفہوم لیا۔ وہ کہتے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم جس صوفی کے علم میں گم ہو جائے اس کو نہ نماز پڑھنے کی حاجت ہے، نہ روزہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اب اس سے شرعی احکام اٹھ گئے۔ ان کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ جب نماز، روزہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اور ان کے اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو معاف نہیں ہوئے تو ان خام صوفیوں کو کیسے معاف ہو سکتے ہیں؟ پس اے ناسمجھ! یہی وہ حیرت ونادانی کا مقام ہے جس میں صوفی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب تو پالیتا ہے مگر اس کی عقل وفکر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اور یہی مقام فناو بقا کا مقام کہلاتا ہے۔

[جب تک نظر باہر ہے، بے نتیجہ ہے۔ اگرچہ اپنے اندر ہی نظر ہو اِدھر اُدھر سے نظر کو بالکل منقطع کرنا ضروری ہے۔ حضرت خواجہ بزرگ (خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہٗ) فرماتے ہیں کہ اہل اللہ فنا اور بقا کے بعد جو کچھ دیکھتے ہیں اپنے اندر دیکھتے ہیں اور جو کچھ پہچانتے ہیں اپنے اندر پہچانتے ہیں۔ ان کو اپنے وجود میں حیرت ہوتی ہے۔ اس سے بھی صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ شہود، معرفت اور حیرت، یہ سب چیزیں صرف نفس میں ہیں، باہر کہیں بھی نہیں ہیں۔ جب تک ان تینوں سے باہر ہے چاہے اپنے اندر ہی ہو فنا سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا، تو بقا سے کیسے حصہ پا سکتا ہے۔]

تشریح

انسان کا جسم مٹی سے بنا ہے اور اس کی روح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اَمر سے ہے پس جو انسان فنا و بقا سے مشرف ہو جائے تو وہ اپنے جسم اور رُوح کا الگ الگ مشاہدہ کرتا ہے حالانکہ عام آدمی ان دونوں میں تمیز کرنے کے قابل نہیں۔ پس فانی و باقی ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ صوفی فنا کی صورت میں اپنے نفس کو نیست و نابود جانتا ہے اور بقا کی صورت میں جنت میں پہنچنے تک بقا کے اثرات کا مشاہدہ کرتا ہے اور مرنے کے بعد قبر میں بھی اس کا جسم سلامت رہتا ہے پس فنا و بقا والے صوفیاء جس چیز کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں، اپنے جسم کے اندر ہی کرتے ہیں، نہ کہ باہر۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ علم اپنے آپ پر حاضر ہوتا ہے۔ پس جس نے اپنی کدوراتِ نفسانی و شیطانی کو دیکھ لیا وہ فانی ہو گیا اور جس نے ان چیزوں اور اپنی روح میں تمیز کرلی وہ فنا و بقا پر مشرف ہو گیا۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ صوفی جو مشاہدہ کرتا ہے وہ اپنے اندر کرتا ہے تو اس کو عالمِ صغیر و عالمِ کبیر کی مندرجہ ذیل مثالوں سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

انسان عالمِ صغیر ہے۔ اور کائنات، زمین و آسمان، لوح و قلم اور عرش و کرسی عالمِ کبیر ہیں۔

دنیا کی میٹھی چیزوں کو انسان اپنے جسم کے اندر کی مٹھاس کے طور پر جانتا ہے۔ اگر انسان کے منہ میں مٹھاس نہ ہو تو اسے میٹھی اشیاء کا ذائقہ ہی میٹھا نہ لگے۔ پس صوفی دُنیا کی مٹھاس کو اپنے جسم میں مشاہدہ کرتا ہے جبکہ باہر کی کڑواہٹ انسان کے کانوں کے کڑوے پانی کی صورت میں موجود ہے۔ اسی طرح نمک بھی انسان کے جسم کے اندر آنسوؤں کی صورت میں موجود ہے۔ دوسری طرف عالمِ کبیر کا سورج انسان کے جسم میں آنکھوں کی صورت میں موجود ہے۔ لوح میں قرآن عظیم الشان محفوظ ہے اور انسانی جسم میں قلبِ انسان نے قرآن عظیم الشان کو محفوظ کیا ہوا ہے۔ یوں وہ تجلیات وانوار جو عالمِ کبیر میں عرش پر نازل ہوتے ہیں عالمِ صغیر میں وہ انسانی قلب پر وارد ہوتے ہیں۔

جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ:

قلب المؤمن عرش اللہ۔

ترجمہ: مؤمن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔

لیکن خبردار! اس سے کوئی شخص یہ مفہوم نہ لے کہ جیسے قرآن عظیم الشان لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے بعینہ میرے دل کی تختی پر بھی محفوظ ہے اور میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفتِ کلام بن گیا ہوں کہ اس سے شرک لازم آتا ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات وصفات میں کوئی شریک نہیں ہے اور اللہ جل مجدہٗ مشابہت سے بھی پاک ہے۔

[فنا اور بقا کا نہایت مرتبہ یہی ہے۔ اور یہ فنا مطلق ہے اور مطلق فنا عام ہے۔ بقا فنا کے اندازے کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا بعض اہل اللہ فنا اور بقا سے موصوف ہونے کے باوجود باہر کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن ان حضرات نقشبندیہ قدس سرہم تعالیٰ اسرارہم کی نسبت تمام نسبتوں سے فائق ہے۔

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ترجمہ: ہر آئینہ رکھنے والا سکندری کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر سر تراشنے والا قلندری ہی جانتا ہے۔]

تشریح

فنا کی دو اقسام ہیں:

۱۔ فناءِ مطلق ۲۔ مطلق فناء

بظاہر دونوں میں کچھ فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں کے الفاظ ایک ہی طرح کے ہیں، لیکن دراصل دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس مثال پر غور فرمائیں کہ ایک شخص کسی دوسرے ملک سے مکہ معظمہ کے لئے سفر پر روانہ ہو کر مکہ معظمہ میں پہنچ جاتا ہے لیکن وہ صرف اس شہر میں پہنچنے تک ہی محدود رہتا ہے۔ جبکہ دوسرا شخص مکہ معظمہ کو جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر وہ حج و عمرہ بھی ادا کرتا ہے اور باقی مقدس مقامات کی زیارت سے بھی مستفید ہوتا ہے تو دونوں میں کتنا فرق ہوا؟ حالانکہ ہیں دونوں ایک ہی شہر میں۔ اسی طرح جب ایک سالک مطلق فنا پر مشرف ہوتا ہے تو اسے نفسِ فنا تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن وہ اس فنا تک ہی محدود رہتا ہے جبکہ دوسرا سالک جو فناءِ مطلق پر فائز ہوتا ہے تو وہ اسے مکمل طور پر حاصل کر لیتا ہے اور اسے فنا کے تمام مراحل پر مشرف کر کے اس پر مکمل عبور عطا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان دو قسم کے فانی سالکوں میں بہت فرق ہوا۔

[جب اس سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے اکابر میں سے صدیوں کے بعد صرف ایک یا دو کو اس نسبت سے مشرف کرتے ہیں تو دوسرے سلاسل میں تو اس نسبت کے حصول کا تناسب بہت ہی کم ہے یہ

نسبت دراصل حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی قدس سرہٗ کی نسبت ہے۔ اور نسبت کو تمام وکمال تک پہنچانے والے خواجہ خواجگان حضرت خواجہ بہاؤالدین المعروف نقشبند قدس سرہم ہیں۔ اور آپ کے خلفاء میں سے حضرت خواجہ علاؤالدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس دولت سے مشرف ہوئے ہیں۔

این کار دولت است کنوں تا کرا دہند

ترجمہ: یہ ایک عظیم دولت ہے، اب دیکھیئے یہ کسے عطا ہوتی ہے۔]

تشریح

ایسی عظیم کیفیات کا دعویٰ تو ہر کوئی کرتا ہے مگر درحقیقت صدیوں میں ایک یا دو کو یہ کیفیات حاصل ہوتی ہیں، ہر آدمی کو یہ کیفیت عطا نہیں کی جاتی کیونکہ ہر آدمی ان رموز واَسرار کو نہیں سمجھ سکتا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے ہی یہ رموز واسرار بیان فرمائے ہیں۔

[عجیب بات ہے پہلے ہر بلاو مصیبت جو واقع ہوتی تھی، فرحت و سرور کا باعث تھی۔ اور یہ ناچیز مزید کا مطالبہ کرتا تھا۔ اور جس قدر سامان دنیوی کم ہوتا تھا اس سے خوشی ہوتی تھی، اور اسی طرح کی آرزو رکھتا تھا۔ لیکن اب جب کہ پھر عالمِ اسباب کی طرف لایا گیا ہے، تو نظر اپنے عجز اور اپنی محتاجی پر پڑی۔ اگر تھوڑا سا ضرر لاحق ہوتا ہے تو فورًا ہی ایک درجہ غم وحزن محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ جلد ہی زائل بھی ہوتا ہے اور اس کا کچھ اثر باقی نہیں رہتا۔]

تشریح

جتنی فنا وبقا حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو حاصل تھی دنیا وآخرت میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی ہے، مگر اس کے باوجود حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم

ایک نوالہ روٹی بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مانگتے تھے جبکہ بعض صوفی کہتے ہیں کہ ہمیں نہ تو دُنیا کی پرواہ ہے اور نہ ہی دوزخ کی نہ ہمیں مال کی ضرورت ہے اور نہ ہی مکان کی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ مجھ پر بھی یہ حالت گزری ہے اس وقت مجھے دنیا، جان، مال، اولاد، درد اور غم کسی چیز کی بھی پرواہ نہیں تھی، مگر جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے اس کیفیت سے نکال دیا تو اب اگر تھوڑا سا غم ومصیبت بھی آئے تو میں فوراً پریشانی محسوس کرتا ہوں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرنے کی برکت سے اسی وقت وہ تکلیف ختم ہو جاتی ہے بلکہ اس کا اثر بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سالک فناءِ مطلق پر فائز ہو جائے اور اس پر مقام حقیقت محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے فیوضات وبرکات آنی شروع ہو جائیں تو پھر وہ اپنے حوائج درد، غم وخوشی سب کو سمجھتا ہے اور عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔

[اسی طرح پہلے جب بارگاہِ الٰہی میں دفع بلا ومصیبت کے لئے دُعا کرتا تھا تو اس سے مقصود اس کا رفع اور ازالہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم اُدْعُوْنِیْ کی بجا آوری مقصود ہوتی تھی۔ لیکن اب دعا سے مصائب وبلایات کا رفع مقصود ہوتا ہے اور وہ غم وخوف جو زائل ہو چکا تھا واپس لوٹ آیا ہے۔ اور معلوم ہوا ہے کہ یہ سب سُکر کی وجہ سے تھا۔ حالتِ صحو میں جس طرح عوام الناس کو خوف، غم، عجز، محتاجی اور خوشی کے عوارض لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح اس بندۂ خدا کو بھی ہوتے ہیں۔ ابتداء میں بھی جب دُعا سے مقصود دفع بلا ومصیبت نہیں تھی، دل کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن غلبۂ حال کے باعث دل میں یہ بات گزرتی تھی کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دُعائیں بھی حصول مراد کے لئے نہیں ہوتی تھیں۔ اب جبکہ اس حالت سے مشرف کیا گیا ہے اور معاملہ کی اصل حقیقت واضح کر

دی گئی ہے تو پتہ چلا ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دُعائیں عجز و محتاجی، خوف و غم کے تحت تھیں، صرف حکم کی بجا آوری مقصود نہ تھی۔

بعض باتیں جو وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہتی ہیں ان کے پیش خدمت کرنے کی گستاخی کرجاتا ہوں۔]

تشریح

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام الصمد بھی ہے جس کا مطلب و مفہوم یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ بے نیاز ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں البتہ ساری مخلوق اسی کی محتاج ہے۔ پس اس مبارک نام کی تجلیات جب کسی سالک پر نزول کرتی ہیں تو وہ بھی ان کے اثر سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ میری حالت سے واقف ہے تو میں کیوں دعا کروں؟ حالانکہ یہ سُکر کی کیفیت ہے لیکن وہ سالک اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہیں سکتا۔ چاہیئے کہ انسان ہر وقت اور ہر حال میں ہر چیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مانگے تا کہ اس کی عاجزی، محتاجی اور بشریت کا اقرار ہو جائے۔ حقیقی معنوں میں بے نیاز ذات تو صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی ہے۔

مکتوب نمبر ۷

[اپنے بعض عجیب وغریب حالات اور ضروری امور کے استفسار کے بیان میں۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

کم ترین غلام، احمد کی عرضداشت یہ ہے کہ وہ مقام جو عرش سے اوپر تھا، یہ ناچیز اپنی روح کو بطریق عروج اس مقام میں پاتا تھا۔ اور وہ مقام حضرت خواجہ بزرگ (خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہٗ) کے ساتھ خاص تھا۔ ایک زمانے کے بعد اپنے بدن عنصری کو بھی اسی مقام میں پایا۔ اور اس وقت خیال میں یوں گزرا کہ تمام عالم عنصریات وفلکیات نیچے کو چلا گیا ہے، اور اس کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا۔ اور جبکہ اس مقام میں صرف بعض اکابر اولیاء تھے۔ اب تمام عالم کو اپنے سمیت اس مقام میں پاکر حیرت ہوتی ہے کہ مکمل بیگانگی کے باوجود اپنے آپ کو ان کے ساتھ باقی پاتا ہے الغرض وہ حالت جو کبھی کبھی رونما ہوتی تھی اور اس میں بندہ نہ اپنے آپ کو دیکھتا تھا نہ جہاں کو، نہ نظر سے کچھ دیکھتا تھا اور نہ علم میں کوئی چیز تھی۔ وہ حالت اب دائمی ہو چکی ہے، اور خلقت عالم کا وجود دید ودانش سے باہر ہو چکا ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی سوانح عمری جو آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ حضرت علامہ بدر الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تحریر کردہ ہے اور حضرات القدس کے نام سے موسوم ہے اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے تصوف وسلوک میں عملی قدم رکھنے سے پہلے شریعت حقہ کے علوم کو حاصل کیا اور اس کے بعد سلوک کو طے کیا اور پھر سلوک میں آپ پر جو کیفیات نمودار ہوئیں ایک ہزار سال کا مجدد

ہونے کے باوجود آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان کیفیات سے اپنے پیر و مرشد کو مطلع کیا۔ اور کبر و غرور میں مبتلا نہیں ہوئے۔ پس سالکینِ طریقت کو چاہیئے کہ سلوک سے پہلے دین کا علم حاصل کریں پھر سلوک کو طے کریں اور اگر بالفرض علم کو حاصل کرنے سے پہلے ہی سلوک میں شامل ہو گئے تو چاہیئے کہ اب سلوک کے ساتھ ساتھ دینی علوم کے لئے بھی وقت نکالیں تاکہ یہ فریضہ بھی پورا ہو جائے۔ پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عنایت سے جو کیفیات طاری ہوں ان سے اپنے شیخ کو مطلع کریں اور غرور میں مبتلا نہ ہوں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ میں نے اپنی رُوح کو عرش سے اوپر دیکھا اور باقی سب ممکنات (مخلوقات) نیچے تھیں۔ تو یہ کیفیت مقامِ فنا میں میسر آتی ہے۔ جہاں نہ مال واولاد کا خیال رہتا ہے نہ دُنیا کا۔ اور تصوف میں اس کیفیت کو عروج کہا جاتا ہے اور یہ عروج دو مراحل میں طے ہوتا ہے۔ پہلے مرحلے کو سیر الی اللہ فی الاشیاء کہا جاتا ہے۔ یعنی اس سیر میں سالک زمین وآسمان، جنت ودوزخ، لوح و قلم اور عرش میں سیر کرتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف عروج حاصل کرتا ہے۔ اس سیر کو ابتدائی سیر بھی کہا جاتا ہے۔

دوسرے مرحلے کو سیر فی اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کائنات کی سیر کو سالک کے پس پشت ڈال دیتا ہے۔ یہ سیر حقیقتِ اسماء وصفات کی سیر ہوتی ہے۔ اس سیر کو حقیقی سیر بھی کہا جاتا ہے۔ جب یہ سیر پوری ہو جاتی ہے تو سالک میں دوام وثبات پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ میں ہمیشہ ان کیفیات کو پاتا ہے۔ جب سالک کی سیر، سیر الی اللہ فی الاشیاء کی ہوتی ہے تو اس پر صفات زائدہ سے تجلی پڑتی ہے اور جب وہ سیر فی اللہ سے مشرف ہوتا ہے تو اس پر صفات ذاتیہ، شیونات اور اعتبارات سے تجلیات آتی ہیں۔ لیکن یہ باریک بات جان لیں کہ سالک اور اس کی رُوح عالمِ ممکنات سے ہیں۔

اس میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اور صفات سے واقف ہو سکے۔ پس جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عنایت سے اس کی سیر واقع ہوتی ہے تو ان مقاماتِ عالیہ پر سالک کی نظر پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو وہاں پاتا ہے، لیکن جسداً ایسا نہیں ہوتا۔ یہ صرف روح کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہ الاقدس کی بیان کردہ کیفیت کو غلط رنگ دے کر صوفی اپنے آپ کو غلطی میں نہ ڈالے۔ جیسا کہ دوسری جگہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایاہے کہ میں نے اپنی رُوح کے ساتھ ساتھ اپنے جسد کو بھی عرش سے اوپر پایا۔ تو اس سے کسی کو یہ شبہ نہ ہوا کہ اولیاء اللہ کے جسم بھی وہاں پہنچ سکتے ہیں کیونکہ اس معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی رُوح نے ہی جسد کی شکل اختیار کر لی تھی جس سے آپ کو گمان ہوا کہ یہ میرا جسد خاکی ہے جو عرش سے اوپر آ گیا ہے۔ پس چاہیئے کہ اپنی کیفیاتِ روحانی کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اگر شریعت کے مطابق نکلیں تو درست ہوں گی ورنہ ایسی کیفیات لائقِ اعتبار نہیں۔

[اس کے بعد اس مقام میں ایک بلند محل ظاہر ہوا کہ اس کو سیڑھیاں لگی ہوئی ہیں۔ بندہ ان سیڑھیوں سے باہر آیا، اس کے بعد وہ مقام بھی باقی جہان کی مانند آہستہ آہستہ لمحہ بہ لمحہ نیچے چلا گیا، اور فقیر نے اپنے آپ کو بلندی پر پایا۔ بندہ اتفاق سے تحیۃ الوضوء کے نفل ادا کر رہا تھا کہ ایک بہت ہی اونچا مقام نمایاں ہوا، اور چار اکابرِ نقشبندیہ کو اس میں دیکھا۔ اور دوسرے مشائخ بھی جیسے سید الطائفہ جنید بغدادی وغیرہ کو اس مقام میں پایا، اور بعض دوسرے مشائخ اس سے اوپر کے مقام میں ہیں۔ لیکن ان کے پائے پکڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور بعض نیچے اپنے اپنے درجات کے مطابق۔ اور اپنے آپ کو ان سے بہت دور پایا۔ بلکہ ان سے کچھ نسبت ہی نہ دیکھی۔ اس واقعہ سے سخت پریشانی اور

اضطراب ہوا۔ قریب تھا کہ دیوانہ ہو جاؤں، اور غم وغصہ کی زیادتی سے جسم کو ہی خالی کر دے۔ کچھ وقت ایسے ہی گزرا، آخر آپ کی توجہات سے اپنے آپ کو بھی اس مقام کے مناسب پایا۔ پہلے میرا سر اس مقام کے برابر ہوا، پھر بتدریج اوپر بلند ہوتا گیا اور اس مقام بلند میں بیٹھ گیا۔ توجہ کے بعد یوں دل میں گزرا کہ وہ مقام تکمیل تام کا مقام ہے کہ تمام سلوک طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچتے ہیں۔ سلوک پورا نہ کرنے والے مجذوب سالک کو اس مقام سے حصہ نہیں مل سکتا۔ اور اس وقت یہ بھی خیال میں گزرا کہ اس مقام پر پہنچنا اس واقعہ کے نتائج سے ہے جو حضور کی خدمت میں رہنے کے زمانہ میں دیکھا تھا۔ اور خدمت اقدس میں عرض بھی کیا تھا کہ حضرت امیر (علی کرم اللہ وجہہ الکریم) تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تجھے آسمانوں کا علم سکھانے آیا ہوں۔ جب خوب توجہ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ تمام خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے یہ مقام حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خاص ہے۔ **واللہ سبحانہٗ اعلم**]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس جن کیفیات اور حالات کا ذکر کر رہے ہیں وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کے ظل کی کیفیات ہیں اس لئے ان کو ظلی کیفیت کہا جاتا ہے اور وہ کیفیات جو اصل سے تعلق رکھتی ہیں وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا حصہ ہیں۔ اسی لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا عروج صفات کی اصل سے شروع ہوتا ہے، جبکہ اولیاء اللہ کا عروج ظل سے۔ تو دونوں میں کتنا فرق ہوا؟ پس اگر کوئی اس طرح کہے کہ اولیاء اللہ کا عروج اصل سے شروع ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اولیاء اللہ کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مساوی سمجھتا ہے اور ہم اس بات سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ کسی ولی کو نبی کے برابر سمجھیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے واقعہ میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو دیکھنے کی بات کی ہے لیکن باقی خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو کیوں نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قُرب حاصل کرنے کے دو راستے ہیں، ایک قُرب ولایت اور دوسرا قُرب نبوت۔ اور قُرب ولایت کے راستے میں ولایت کی آخری حد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پائی ہے اور چونکہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس وقت ولایت کے درجات کا مشاہدہ فرما رہے تھے اس لئے تکمیل ولایت کے مراحل کو طے کر کے آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے قُرب حاصل کرنے کے وسیلوں میں سے ایک وسیلہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔

اور جہاں تک حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تعلق ہے تو یہ دونوں حضرات قرب نبوت کے فیوض وبرکات سے وافر حصہ لے کر واصل ہوئے ہیں کیونکہ حضرت رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر جب صفاتِ ذاتیہ اور ذاتِ الٰہیہ کی تجلیات پڑتی تھیں تو ان کا انعکاس ان دونوں بڑے صحابہ میں ظہور کرتا تھا اس لئے ان دونوں کے لئے خلیفہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور باقی دو کے لئے امیر کا۔ باقی رہا معاملہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو ان کو ولایت سے بھی وافر حصہ ملا ہے اور نبوت کے فیوض سے بھی۔ اس لئے ان کو ذوالنورین کہنے کی دو وجوہات ہیں، ایک ظاہری اور دوسری صوفیانہ۔ ظاہری وجہ یہ ہے حضرت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں دیں اور ان کو ذوالنورین کہنے کی صوفیانہ تشریح یہ ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کمالاتِ ولایت کو بھی حاصل کیا ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل

و مکمل اتباع سے تجلیاتِ مقام نبوت سے بھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حصہ عطا فرمایا گیا۔ پس ان دو کمالات کے حصول کی وجہ سے بھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذوالنورین کہلائے۔ اور ادب واحترام میں تو سارے ہی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم برابر ہیں چاہے وہ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کیوں نہ ہوں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَکْرِمُوْا اَصْحَابِیْ فَاِنَّهُمْ خِیَارُکُمْ۔

ترجمہ: حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا میرے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عزت واحترام کرو بے شک وہ تم میں سے بہترین لوگ ہیں۔

اولیاء کرام کے درجات میں بھی فرق ہوتا ہے اس لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ میں نے ولایت میں اپنے سلسلہ کے اولیاء اللہ کو الگ الگ درجات پر دیکھا اور میں نے اپنے آپ کو اُن سے الگ پایا۔ تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ ۱۰۰۰ ہجری کے بعد نائب رسول حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس ہی ہیں اسی وجہ سے آپ نے خود کو اُن اولیاء اللہ سے الگ دیکھا۔

[دوسری بات یہ ظاہر ہوئی کہ بُرے اخلاق وعادات ہر گھڑی مجھ سے الگ ہو رہے ہیں۔ بعض اوقات یوں خیال گزرتا ہے کہ سب الگ ہو گئے ہیں اور دوسرے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اور شے ظاہر ہوئی ہے اور وہ بھی الگ ہو گئی ہے۔]

تشریح

جب کوئی سالک فانی ہو جاتا ہے تو اس سے اَفعال رَزیلہ (بُرے اخلاق وعادات) دور ہو جاتے ہیں۔ سالک اس کو دو طرح سے دیکھتا ہے، بعض وقت سالک بیٹھا ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کے بدن سے دھوئیں کی شکل میں کوئی چیز نکل رہی ہے وہ سمجھ جاتا ہے کہ اَفعال رَذیلہ دھوئیں کی شکل میں میرے بدن سے نکل رہے ہیں اور کسی وقت دھاگے کی شکل میں سالک اَفعالِ رَزیلہ کو اپنے بدن سے نکلتے ہوئے دیکھتا ہے۔

یاد رکھیں جو سالک فنا پر مشرف ہو جائے تو وہ حاسد، کاذب، ظالم، زانی، سود خور، رشوت خور اور قاتل ہو سکتا بلکہ اُس سے اگر کسی وقت غلطی سے ایک چیونٹی کو بھی ضرر پہنچتا ہے تو وہ اُس پر بھی بہت نادم ہوتا ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ آج لوگ اپنے آپ کو صوفی کہتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہیں یہ کیسی فنا ہے؟ وہ اپنے آپ کو فانی خیال کرتے ہیں اور ساتھ ہی لوگوں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں۔ مُرید اپنے شیخ پر تہمت لگاتا ہے اور شیخ اپنے مُریدین کا استقبال ڈنڈوں سے کرتا ہے۔ پس ایسی حرکات وسکنات اور ایسے اخلاق ان لوگوں کے فانی نہ ہونے کی بڑی علامت ہیں۔ اور اگر بالفرض کوئی سالک فنا پر مشرف ہو کر بھی ایسے کردار کا مظاہرہ کرے تو اس کی فنا کامل نہیں بلکہ ناقص ہے۔ کامل فنا والا سالک وہ ہے کہ اگر خدانخواستہ اس پر کوئی ظلم کرے یا اس کا مال کھالے تو وہ نہ تو زبان سے کہے اور نہ ہی دل میں یہ خیال لائے کہ وقت آنے پر میں اُس سے دگنا بدلہ لوں گا۔ بلکہ سالک (صوفی) میں عفو ودرگزر کا مادہ ہونا چاہیئے، اور اسے اپنے آپ کو ضبط میں رکھنا چاہیئے۔ اگر خدانخواستہ کسی دوسرے انسان کے بارے میں اس کے منہ سے غلط الفاظ نکل بھی جائیں تو فوراً جاکر انہیں معاف کروالے۔

روزِ قیامت کے بارے میں قرآن عظیم الشان میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَإِذَاالْوُحُوشُ حُشِرَتْ (التکویر ۵)

ترجمہ: اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ حیوانات کے درمیان بھی قیامت کے دن قصاص کیا جائے گا۔ اگر دنیا میں کسی سینگ والے جانور نے بغیر سینگ والے کو مارا ہو گا تو قیامت کے روز بغیر سینگ والے کو سینگ عطاء کیئے جائیں گے اور وہ سینگ والے جانور سے بدلہ لے گا۔ پس اگر حیوانات کے درمیان نظام عدل کے تحت فیصلہ کیا جائے گا تو انسان جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکام کا مکلف ہے اُسے تو حتماً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے لازم کردہ حقوق و فرائض میں کوتاہی کا جواب دینا ہو گا۔

رہاوہ شخص جسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ صفاتِ ملائکہ عنایت کر دے، تو ایسا انسان نہ کسی کو گالی دیتا ہے اور نہ کسی پر ظلم کرتا ہے۔ بلکہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات پر عمل پیرا ہو کر انہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاتا ہے۔ کیا کبھی کسی نے سُنا ہے کہ کسی شخص کے کراماً کاتبین نے اس شخص کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی پر جھگڑا کیا ہو؟ پس فنا پر مشرف ہو جانے کے بعد سالک کی عادتیں بھی ملائکہ کی عادات واطوار کی طرح پاکیزہ ہو جاتی ہیں۔

فنا پر فائز ہونے کے بعد بقا کا مقام آتا ہے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مقامِ فنا میں سالک کو دو مراحل میں عروج نصیب ہوتا ہے پھر جب وہ بقا پر فائز ہوتا ہے تو اسے نزول کے ذریعے واپس لایا جاتا ہے اور تیسری وچوتھی سیر مکمل کرنے کے بعد سالک دعوت وارشاد کے قابل ہو جاتا ہے۔ سیر نزولی کے بعد سالک کی روزمرہ زندگی عام انسانوں کی طرح گزرتی ہے۔ اُسے کھانے، پینے اور بیوی بچوں کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ خوشی اور غم کو محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے درد والم کا احساس فرمایا ہے اور خوشی کو بھی محسوس کیا ہے۔ پس فنا اور بقا پر مشرف ہونے والے سالک کو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل و مکمل اتباع نصیب ہوتی ہے۔ اُس کی روح پر اَنوارِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے، اور وہ مخلوقِ خدا کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دین کی طرف بلاتا ہے۔ اور ایسی ہی مکمل اتباع کے بعد دُنیا سے چلے جانے پر اس کے جسم کو قبر میں مٹی نہیں کھاتی اور وہ قبر میں بھی باقی رہتا ہے۔ پس دعوت و تبلیغ کے لئے شرط ہے کہ ایسا شخص فنا وبقا پر مشرف ہو اور تصوف کی چاروں سیروں سے علماً و عملاً واقف ہو۔

[دوسری گزارش یہ ہے کہ بعض امراض اور شدائد کو دور کرنے کی غرض سے توجہ کرنے کے لئے کیا یہ شرط ہے کہ مرضیٔ خدا تعالیٰ معلوم ہو کہ اس معاملہ میں توجہ چاہیئے یا نہ چاہیئے یا یہ شرط نہیں؟ رشحات کی ظاہر عبارت سے جو حضرت خواجہ (عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) سے نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ پیشگی جاننا شرط نہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں آپ کا کیا ارشاد ہے۔ حالانکہ مجھے توجہ کرنا اچھا بھی نہیں لگتا۔]

تشریح

بعض صاحبانِ توجہ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ تصرفات میں سے ایک تصرف یہ بھی ہے کہ وہ توجہ عالیہ سے کسی بیمار شخص کی بیماری کو سلب کر لیتے ہیں اور وہ شخص بیماری سے صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اسی تصرف کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس سے پوچھا کہ آیا ایسی توجہ کرنا بہتر ہے یا نہیں۔ اگرچہ حضرت عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی اجازت فرمائی ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ خلفاء کو چاہیئے کہ وہ ایسی توجہ نہ کریں۔ کیونکہ "توجہ" اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احسانات میں سے ایک عظیم احسان ہے جو اس زمانے میں نادر الوجود ہے۔ پس ایسی عظیم چیز کو ایسے کاموں میں صرف کرنا ہی بہتر ہے جن سے قُربِ الٰہی حاصل ہو اور اس کی برکت سے دوسرے لوگ بھی دین کی طرف مائل ہو کر اَخلاق حمیدہ پر فائز ہوں۔ اور اگر اس "توجہ" کو کسی بیماری کے سلب کے لئے استعمال کیا گیا تو عین ممکن ہے کہ وہ شخص صحت مند ہو کر شراب پینا شروع کر دے، یا زنا میں مشغول ہو جائے، یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نافرمانی والے دوسرے اُمور میں لگ جائے۔ تو جو "توجہ" اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صوفی کو عروجات ودرجات کی بلندی کے لئے عنایت کی تھی اُس نے اُس صفت کو دُنیاوی اُمور میں استعمال کی تو خیانت ہو گی۔ ویسے بھی بیماریوں سے شفاء کے لئے قرآن عظیم الشان یا حدیثِ مبارکہ میں جو دعائیں موجود ہیں ان سے دم کرنا ہی زیادہ موزوں ہے جو کہ بزرگانِ دین سے ثابت بھی ہے اور بیماری کا علاج کروانا بھی سنت ہے۔ اس لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ ایسی توجہ کرنا مجھے پسند نہیں۔ اگرچہ آپ ایسی توجہ کرنے کے منکر نہیں ہیں۔

[تیسری گزارش یہ ہے کہ طالبوں کو حضور میسر آجانے کے بعد ذکر سے روک دینا اور حضور کی نگہداشت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور پھر وہ کون سا مرتبہ حضور ہے جس میں ذکر نہیں کرتے۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو اول سے آخر تک ذکر میں مصروف رہتے ہیں اور انہیں ذکر سے کسی وقت بھی نہیں روکا گیا۔ اور اپنا کام نہایت کے قریب پہنچا چکے ہیں۔ اصل حقیقت کیا ہے؟ اس بارے میں آپ کا ارشاد کیا ہے؟]

تشریح

ابتدائی سالک کو چونکہ ذکر کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی اس لئے تصورِ شیخ کرنا اُس کے لئے زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ اور تصورِ شیخ کا طریقہ یہ ہے کہ سالک اپنے شیخ کے چہرۂ مبارکہ کو تصور میں لائے۔ اگر ایسا نہ ہوسکے تو یہ تصور کرے کہ میں اپنے شیخ کی محفل میں ہوں اور وہ مجھ پر توجہ فرما رہے ہیں۔ اور اگر یہ تصور بھی قائم نہ ہوسکے تو ایسے سالک کو ذکر میں مشغول رہنا چاہیئے۔

[چوتھی گزارش یہ ہے کہ حضرت خواجہ (عبید اللہ احرار قدس سرہٗ) نے اپنے ملفوظات میں فرمایا ہے کہ آخر میں بھی ذکر کا حکم دیا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض مقاصد ایسے ہیں کہ وہ اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے۔ ان مقاصد کا تعین فرمایا جائے۔]

تشریح

سلسلہ نقشبندیہ کے عظیم بزرگ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہٗ اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ وہ سالک جس نے تصوف میں نیا نیا قدم رکھا ہو اُس کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ذکر اور تصورِ شیخ دونوں ضروری ہیں لیکن جب سالک کو ترقی دے کر ابتدائی کیفیت سے نکال دیں اور وہ منتہی ہو جائے تو چاہیئے کہ وہ صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو قصداً تصورِ شیخ نہ کرے۔ ہاں اگر خود بخود تصورِ شیخ آجائے تو کوئی حرج نہیں۔ سلوک کے آخر میں سالک کو ذکر کی پھر ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اس کے بغیر چند ایک مقاصد پورے نہیں ہوسکتے۔ مثلاً ظلی اور اصلی کیفیات میں فرق کرنا بغیر ذکر کے ممکن نہیں۔ ظلی کیفیات میں لطائف پر احساس زیادہ ہوتا ہے، لیکن انتہاء میں یہ احساس یا تو ختم ہو جاتا ہے یا پھر کم ہو جاتا ہے لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا عشق زیادہ ہوتا ہے۔

[خدمتِ اقدس میں پانچویں گزارش یہ ہے کہ بعض طالبِ طریقہ نقشبندیہ کی تعلیم کی طلب کا اظہار کرتے ہیں، لیکن غذا میں احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ لیکن اس بے احتیاطی کے باوجود حضور قلب اور قدرے استغراق پیدا کر لیتے ہیں۔ اور غذا کے متعلق تاکید سے کام لیا جائے تو سُستی اور کاہلی کے باعث بالکلیہ طریقہ ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اِرادت کے ساتھ اس سلسلہ سے صرف اتصال چاہتے ہیں، ذکر کی تعلیم نہیں چاہتے۔ کیا اس قسم کا اتصال جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس سے زیادہ طویل سلسلہ کلام گستاخی اور بے ادبی ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو اُن کے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی طرف سے خرقہ خلافت ملا اور انہیں دعوت وارشاد اور تلقینِ ذکر کی اجازت دی گئی تو بعض امور میں انہیں دِقّت ہوئی۔ اس لئے انہوں نے مکتوب کے ذریعہ اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس سے راہنمائی حاصل کی۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دورانِ سلوک اگر مریدین کی تربیت میں کچھ مشکل پیش آئے تو فوراً اپنے شیخ سے رابطہ کر کے مشورہ لیا جائے تاکہ بروقت اُس مشکل کا ازالہ کیا جا سکے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے مکتوب شریف میں اُن لوگوں کی نشاندہی کی ہے جو تصوف کو صرف ایک رسم سمجھ کر بیعت کر لیتے ہیں اور نہ تو سلاسلِ طریقت کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں اور نہ شریعتِ غرّاَ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی پابندی۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ سلوک میں قدم رکھنے کے بعد باطنی کیفیات سے مستفید ہونے کے

باوجود مالِ حرام کھاتے ہیں اور رزقِ حلال کی کوشش نہیں کرتے۔ حالانکہ مؤمن کے لئے رزقِ حلال اتنا ضروری ہے جتنا کہ زندہ رہنے کے لئے ہوا اور پانی۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اور جب ایسے مریدین کو رزقِ حلال کی تاکید کی جائے تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکامات پر عمل کر کے رزقِ حرام سے توبہ کریں، سلسلہ کو ہی ترک کر دیتے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ شریعت کے احکام پر عمل کیا جائے اور اس کے نواہی سے اجتناب کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ سے وابستگی رکھی جائے تاکہ اس سے ظاہری و باطنی راہنمائی ملتی رہے۔ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو اور کامل و مکمل شیخ مل جائے تو زہے نصیب ورنہ مقاماتِ عالی کے راستے میں رہ جانے والا شیخ بھی کافی ہے کہ ایک تو شریعت کی تعلیم دیتا رہے گا اور دوسرے اس کے ذریعہ سے اکابرِ مشائخ اور سلاسل کی برکات سے اتصال و وابستگی بھی میسر آئے گی۔

مکتوب نمبر ۸

[ان حالات کے بیان میں جو بقا اور صحو سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

کمترین غلام، احمد کی عرضداشت یہ ہے کہ جب سے مجھے صحو میں لائے ہیں اور بقاسے نوازا ہے، علوم غریبہ اور معارف نادرہ غیر متعارفہ مسلسل اور لگاتار فائض اور وارد ہو رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے بیان اور ان کی مستعمل اصطلاح سے موافقت نہیں رکھتے۔ جو کچھ مسئلہ وحدت وجود اور اس کے متعلقات کے بارے میں کہا گیا ہے، مجھے اول حال ہی میں اس سے مشرف کر دیا گیا ہے۔ اور کثرت میں وحدت کا مشاہدہ میسر آ چکا ہے۔ پھر اس مقام سے کئی درجے بلند مجھے ترقی عطا فرمائی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں انواع واقسام کے علوم عطا فرمائے گئے ہیں۔ ان مقامات و معارف کی صریحًا تصدیق قوم کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔]

تشریح

تصوف میں صحو اور سُکر کی دو اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ ان پر مکتوب نمبر ۲ میں بحث ہو چکی ہے تاہم کچھ اضافی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔

صحو کی تین اقسام ہیں

۱۔ صحوِ عام ۲۔ صحوِ متوسط ۳۔ صحوِ عالی

اسی طرح سُکر کی بھی تین اقسام ہیں:

۱۔ سُکرِ عام ۲۔ سُکرِ متوسط ۳۔ سُکرِ عالی

صحو، خالص ہوش وحواس کی حالت کو کہا جاتا ہے جبکہ سُکر سے مراد ہے ایک قسم کا نشہ۔ اب صحو و سُکر کی الگ الگ اقسام اور فرق کو بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ صحوِ عام

جب کوئی شخص لین دین، کھانا، پینا، لباس پہننا اور نفع و نقصان جیسی ضروریات کو اچھی طرح سمجھتا ہو تو ایسی کیفیت کو صحوِ عام کہا جاتا ہے۔ اور یہ صحو عام لوگوں کو بھی حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ صحوِ متوسط

جب عوام میں سے کوئی شخص تصوف میں داخل ہو جائے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل سے ولایتِ صغریٰ میں قدم رکھے تو یہاں اُسے جو صحو نصیب ہوتی ہے، اُسے صحوِ متوسط کہتے ہیں۔

۳۔ صحوِ عالی

جب صوفی ولایتِ صغریٰ سے ترقی حاصل کر کے ولایتِ کبریٰ میں پہنچ جائے تو اُسے جو صحو نصیب ہوتی ہے اُسے صحوِ عالی کہا جاتا ہے۔ ایسا شخص ہر اچھی بُری چیز میں صحیح اور درست تمیز کر لیتا ہے۔ وہ خُدا کو خُدا اور بندے کو بندہ سمجھتا ہے۔

سُکر کی تین اقسام ہیں

پہلی قسم کا سُکر اُس شخص کا ہے جو دُنیا کا عاشق ہو اور شراب و چرس کا عادی ہو اور نشہ کے استعمال سے دیوانہ ہو جائے۔ ایسا سُکر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکام کی مخالفت کی وجہ سے گناہ ہے۔ یوں ہی سُکر میں جان ومال کا بھی نقصان ہے اور ایمانِ فعلی کا بھی۔

دوسری قسم کا سُکر وہ ہے جس کا حصول تصوف میں ہوتا ہے اس سُکر میں صوفی ممکنات (مخلوق) اور ذاتِ بحت (اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ) میں فرق وامتیاز نہیں کر سکتا۔ ایسے سالک کو وحدت الوجودی کہتے ہیں۔ جب حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس سُکر کی اس کیفیت سے گُزرے اور اس کے نشیب وفراز سے آگاہ ہوئے تو فرمایا کہ چونکہ وحدت الوجودی باقی ممکنات کو خدا سمجھ لیتے ہیں اور انا الحق جیسے کلمات ان کی زبان سے جاری ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میرا ان سے اختلاف ہے لیکن چونکہ وہ سُکر کی وجہ سے ایسے کلمات ادا کرتے ہیں اس لئے وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتے البتہ کوئی سالک صحو اور ہوش میں ایسے الفاظ منہ سے نکال دے تو اُس پر کُفر کا فتویٰ جاری ہو گا۔ پس ثابت ہوا کہ علماءِ ظواہر میں سے وہ علماء جو حضرت منصور حلاج اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما پر اُن کے سُکری اقوال کی وجہ سے فتویٰ کفر کا اطلاق کرتے ہیں، وہ خود غلطی پر ہیں، کیونکہ اُن دونوں اولیاء نے صحو کی حالت میں "انا الحق" اور "لِوَائی اَرْفَعُ مِنْ لِوَاءِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم" نہیں کہا بلکہ سُکر کی حالت میں کہا تھا۔ اور سُکر والے شخص پر کفر کا اطلاق نہیں ہوتا۔

تیسری قسم کا سُکر وہ ہے جو سالک کے شیونات پر فائز ہونے سے قبل آتا ہے۔ جب سالک شیونات پر مُشرف ہو جائے تو سُکر کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور اُسے صحو کی حالت نصیب ہو جاتی ہے۔

ہم مزید کہتے ہیں کہ ۷۲ گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقۂ حلولیہ ہے جن کا عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ انسان، پتھر اور درخت وغیرہ میں حلول کرتا ہے یعنی ان اشیاء میں داخل ہو جاتا ہے اس لئے ہم جب ان اشیاء کو سجدہ کرتے ہیں تو دراصل ان کو سجدہ نہیں کر رہے ہوتے بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو سجدہ کر رہے ہوتے ہیں، جیسے ہندو پتھر کے بتوں کو سجدہ کرتا ہے تو اس کے باطل عقیدے کے

مطابق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس پتھر میں پوشیدہ ہوتا ہے اس لئے وہ پتھر کو سجدہ کرتا ہے یونہی بعض عیسائی حضرت بی بی مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پُوجا اس نیت سے کرتے ہیں کہ ان دونوں میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حلول کیا ہے۔ پس یہ ساری باتیں علم سے دوری کی وجہ سے ہیں اور ایسا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ اس لئے اگر کوئی صوفی یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے میرے مُرشد کے وجود میں حلول کیا ہے تو ایسا صوفی دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں ہندوؤں اور عیسائیوں کے عقائد کی پیروی کرنے والے گمراہ پیروں سے محفوظ رکھے جو انسان میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حلول کو جائز سمجھتے ہیں، آمین!

[اجمالی اشارات ورموز بعض بزرگوں کے کلام مبارک میں پائے جاتے ہیں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ وحدت الشہود کی جو بات میں کرتا ہوں یہ بات بعض بزرگوں یعنی حضرت عبدالخالق غجدوانی، حضرت فضیل بن عیاض، حضرت بشر حافی اور خواجہ علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم نے اپنے کلام میں رموز وکنایات سے فرمائی ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمارا پروردگار اور ہم اس کی مخلوق ہیں۔

حضرت خواجہ علاؤالدین عطار، حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بڑی معمولی سی بات پر ولایت عنایت فرمائی۔ جبکہ بعض لوگ سُنتِ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو ادا کرنے میں سُستی کرتے ہیں اور چھوٹی سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسی ہی سُنتوں میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا شامل ہوتی ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ابتدائی عمر میں ڈاکوؤں کے سردار تھے، آپ فقیرانہ لباس پہنے جنگل میں خیمہ ڈالے پڑے رہتے آپ کے دوست سب کے سب ڈاکو تھے۔ لوٹ مار کرکے سارامال آپ کے سامنے لا کر رکھ دیتے، اس مال سے جو کچھ آپ پسند کرتے اپنے لئے رکھ لیتے، اور باقی سب تقسیم کر دیتے۔ لیکن باوجود اس کے آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہمیشہ نماز باجماعت ادا کرتے اور اپنے ان تمام دوست ڈاکوؤں کو بھی جو نماز نہ پڑھتے نکال دیتے تھے۔

آپ کے توبہ کرنے کا قصہ یوں ہے کہ ایک رات قافلہ لوٹنے کی غرض سے آپ کے ساتھی گئے ہوئے تھے۔ جب وہ قافلہ آپ کے نزدیک سے گزرا تو ایک شخص قرآن عظیم الشان کی تلاوت کرتا ہوا جارہا تھا اس وقت اس کی زبان پر یہ آیت تھی:

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (الحدید ١٦)

ترجمہ: کیا ایمان والوں کو ابھی وہ وقت نہ آیا کہ اُن کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد اور اس حق کے لیے جو اترا۔

یہ آیت کریمہ آپ کے کانوں تک پہنچی اور سُنتے ہی آپ کے دل پر ایک سخت چوٹ لگی اور کہنے لگے فضیل تو کب تک نافرمانی اور راہزنی کرتا رہے گا؟ ایک طرف تو ڈاکے ڈالتا ہے اور دوسری طرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور چوری تو گناہ کبیرہ ہے۔ فریاد کرتے ہوئے کہا کہ اب توبہ کا وقت آگیا ہے بعد ازاں آپ ہر اس شخص کے پاس گئے جس کو آپ سے رنج پہنچا تھا اور اس سے معافی مانگی یا اس کی تلافی کر دی۔ اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہو گئے۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک دفعہ حالتِ نشہ اور مستی میں کسی طرف کو جارہے تھے اس حالت میں آپ کو کاغذ کا ٹکڑا نظر آیا۔ جس پر بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا ہوا تھا آپ نے اس

کاغذ کو اُٹھا کر صاف کیا اور عطر خرید کر معطر کیا اور ایسی جگہ رکھ دیا جہاں بے ادبی ہونے کا خوف نہ تھا، اُسی رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ آدمی کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ حکم فرما رہا ہے کہ تم جا کر بشر حافی کو کہہ دو کہ تم نے ہمارے نام کی عزت کی اور اس کو معطر کر کے بلند جگہ پر رکھ دیا ہم بھی اسی طرح تمہیں پاک کر کے تمہارا مرتبہ بلند کریں گے۔

حضرت علاؤ الدین عطار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک دن مسجد میں تھے کہ ایک آدمی نے مسجد کی دیوار پر بلغم پھینکا، آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بڑی محبت اور ادب کے ساتھ دیوار سے بلغم کو صاف کیا اور اس جگہ پر عطر لگایا اور کہا کہ یا اللہ ہم اپنے گھروں کو صاف رکھتے ہیں اس لئے میں آپ کے گھر کو گندا نہیں دیکھ سکتا۔ تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس عمل کے بدلے میں اُن کو یہ کیفیت عنایت فرمائی کہ جب تک وہ زندہ تھے اُن کے جسم سے مشک وعنبر کی خوشبو آتی تھی، اسی وجہ سے آپ کو حضرت علاؤ الدین عطار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہا جاتا ہے۔

یونہی ماضی قریب میں افغانستان کا ایک باشندہ چوری کیا کرتا تھا۔ ایک دن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل اس کے شامل حال ہوا اور اس نے توبہ کر کے ہر شخص کا مال واپس کر دیا اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو کر فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرح درجہ ولایت پر فائز ہو گیا۔ لوگ اس تائب شخص کو حضرت مولانا سید امیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نام سے جانتے ہیں۔

پس چاہیئے کہ ہم اپنے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سُنتوں پر عمل کریں اور کسی سُنت کو چھوٹی نہ سمجھیں اور فرائض خداوندی کو ترک نہ کریں۔ اسی قاعدے پر عمل کرتے ہوئے ہم بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت فضیل بن عیاض، حضرت بشر حافی اور حضرت علاؤ الدین عطار رحمہم اللہ تعالیٰ کی طرح ولایت پر مشرف ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ

ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی کو احتیاط سے گزاریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم احکامِ قرآن عظیم الشان اور احادیث نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے استہزأ کے مرتکب ہو جائیں، العیاذ باللہ!

فقہی مسئلہ ہے کہ اگر دورانِ نماز کسی عورت کے اعضاء میں کسی عضو کا چوتھائی حصہ ننگا ہو جائے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور وہ عذاب کی مستحق ہو گی۔ دوسری طرف عورتوں کا لباس دیکھیں کہ لباس پہن کر بھی ننگی ہیں اور سر، گلا اور بازو تو ویسے بھی ننگے چھوڑے ہوئے ہوتی ہیں کہ دین دار شخص اُن کی طرف دیکھ کر ہی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ تو کیا یہ قرآن عظیم الشان اور احادیث نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی تعلیمات کا عملی استہزاء نہیں ہے؟ اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ "اسلام میں تو سختی ہے ہی نہیں، ان مولویوں نے اسلام کو مشکل کر دیا ہے" کیا وہ قولی استہزأ کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ قرآن وحدیث سے ہی تو یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ مذاق کرنا کفر ہے۔ پس ہمیں چاہیئے کہ اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو سختی کے ساتھ پردہ کی تلقین کریں ورنہ ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ناراضگی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

[لیکن ان علوم ومعارف کی صحت کا گواہ حال یہ ہے کہ علوم ومعارف ظاہر شریعت، اجماع علماء اہل سنت کے بالکل موافق ومطابق ہیں، روشن شریعت کے ظاہر سے ذرہ بھی مخالفت نہیں رکھتے، اور حکماء اور اصول عقلیہ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ بلکہ علماء اسلام میں وہ جماعت جو اصول اسلام میں مخالفت رکھتی ہے ان کے اصولوں سے بھی ان علوم کی کوئی موافقت نہیں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ مجھ پر کشف میں جو علوم ومعارف اور کیفیات طاری ہوئیں وہ ظاہر شریعت، اجماع اُمت اور اہلِ سنت وجماعت کے عقائد سے مخالفت نہیں رکھتیں بلکہ ان کے عین مطابق ہیں۔ حکماء یونان اور عقلی متکلمین جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور کائنات کے بارے میں عقلی دلائل دیتے ہیں میری کشفی کیفیات اُن کے ساتھ بالکل مناسبت نہیں رکھتیں، بلکہ اُن سے مخالفت ہیں اور جو جماعت اصولِ اسلام سے مخالفت رکھتی ہے، میری کشفی کیفیات اُن سے بھی موافق نہیں ہیں، یعنی میرے علوم ومعارف اور کشفی کیفیات اہلِ سُنت وجماعت کے عین مطابق ہیں۔

[یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ استطاعت فعل کے ساتھ ہوتی ہے، فعل سے قبل انسان قدرت نہیں رکھتا۔]

تشریح

اہل سنت وجماعت کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ (فعل کی) استطاعت فعل کے ساتھ ہوتی ہے، نہ تو قبل از فعل ہوتی ہے اور نہ ہی بعد از فعل۔ ابو المنتہی میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول نقل ہے آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر استطاعت فعل سے پہلے بندے کو میسر ہوتی تو بندہ فعل کے وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مستغنی ہوتا، جبکہ یہ بات قرآن عظیم الشان کے خلاف ہے۔

کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَاللّٰہُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (محمد ۳۸)

ترجمہ: اور اللہ بے نیاز ہے اور تم سب محتاج۔

اور اگر استطاعت فعل کے بعد ہوتی تو استطاعت کے بغیر فعل کا حصول ناممکن ہوتا۔

حکماءِ یونان یعنی متکلمین اور فلسفی کہتے ہیں کہ انسان کے پاس کسی قسم کی قدرت نہیں ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے خود ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پر ایسے ایسے گناہ کرے گا تو اب ہمارا کیا قصور؟ اور گناہ کے بعد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں دوزخ میں ڈالے گا تو یہ ہمارے ساتھ ظلم ہو گا کیونکہ ہم نے اپنی مرضی سے تو گناہ نہیں کیا بلکہ ہماری تقدیر میں ہی لکھ دیا گیا تھا اور انسان تقدیر کے آگے بے بس ہے۔(نعوذ باللہ من ذٰلک)

اہلِ سُنت و جماعت کا عقیدہ یوں ہے کہ جب انسان کوئی اچھائی یا بُرائی کرتا ہے تو اس کام کی طاقت اُس وقت پیدا ہوتی ہے، اچھے کام کا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ حکم دیتا ہے اور برے کاموں سے منع کرتا ہے۔ پھر جو شخص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بات مان کر اچھے کام کرتا ہے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا ہے اور اسے اجر وثواب عنایت کرتا ہے اور جو شخص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور بُرے کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اُسے جہنم کا مستحق کر دیتا ہے۔یعنی بندہ اپنے اچھے اور بُرے کاموں میں بالکل بے بس نہیں ہے بلکہ خود بھی طاقت وقدرت رکھتا ہے۔

[قدرتِ فعل کے ساتھ بخشتے ہیں اور احکاماتِ شریعت کی تکلیف اسباب اور اعضاء کی سلامتی پر دیتے ہیں، جیسا کہ علماءِ اہلِ سنت نے اس کی تحقیق کی ہے۔ اور فقیر اس مقام میں اپنے آپ کو حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے قدم مبارک پر پاتا ہے۔ آپ اسی مقام میں تھے۔ اور حضرت علاؤ الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بھی اس مقام سے حصہ ملا ہے۔ اس سلسلہ عالیہ کے بزرگوں

میں سے حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اور پہلے مشائخ میں سے حضرت معروف کرخی، امام داؤد طائی، حضرت خواجہ حسن بصری اور حضرت حبیب عجمی قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم المقدسہ بھی اسی مقام میں تھے۔

ان سب مقامات اور علوم و معارف کا حاصل و خلاصہ بُعد اور بیگانگی ہے۔ علاج معالجہ سے کام گزر چکا ہے۔ جب تک پرے لٹکے ہوئے تھے، انہیں اٹھانے کے لئے سعی اور اہتمام کی گنجائش تھی۔ اس وقت تو اس کی بزرگ اس کا حجاب ہے۔

فَلَا طَبِیْبَ لَھَا وَلَا رَاقِیْ!

ترجمہ: اب نہ تو اس کا کوئی معالج ہے اور نہ جھاڑ پھونک کرنے والا۔

مگر نہایت ہی عجیب معاملہ ہے کہ کمال بے مناسبتی اور بیگانگی کا نام وصل و اتصال رکھا ہوا ہے۔ وہی کتاب یوسف زلیخا کی ایک بیت مناسب حال ہے:

در افگندہ دَف ایں آواز ز دوست　　　کز و بر دست دَف کوباں بود پوست

ترجمہ: دَف نے دوست کی طرف سے آواز بلند کر رکھی ہے۔ مگر اس دوست کی طرف سے دَف بجانے والوں کے ہاتھوں میں سوائے ہاتھ کے پوست اور چمڑے کے اور کوئی شے نہیں۔

شہود کہاں ہے، شاہد کون ہے اور مشہود کیا ہے:

"خلق را روئے کے نماید او"

ترجمہ: وہ مخلوق کو چہرہ کب دکھاتا ہے۔

ماللتراب ورب الارباب

ترجمہ: یعنی "چہ نسبت خاک با عالم پاک"

فقیر خود کو بندۂ مخلوق بے قدرت تصور کرتا ہے اور اسی طرح تمام جہان کو، خالق اور قادر اللہ تعالیٰ ہی کو جانتا اور مانتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نسبت ثابت نہیں کرتا۔ ماسوا اللہ کو اس کا عین اور مرآۃ بننے کی کہاں گنجائش ہے۔

در کدام آئینــہ در آید او

ترجمہ: وہ کس آئینے میں آسکتا ہے۔

فرقۂ صحیحہ اہل سنت وجماعت کے علماءِ ظاہر اگر بعض اعمال میں کوتاہی کر جاتے ہیں لیکن ذات وصفات سے متعلق ان کے عقائد کی درستی کا جمال اس قدر نُورانیت رکھتا ہے کہ ان کی کوتاہی اس نورانیت کے آگے مضمحل اور ناچیز ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس بعض صوفی ریاضات ومجاہدات کے باوجود چونکہ ذات وصفات کے متعلقہ عقائد میں وہ درستی نہیں رکھتے تو علماءِ ظاہر جیسا جمال ونورانیت بھی نہیں رکھتے۔ علماءِ کرام اور دینی طلبہ کے ساتھ بہت محبت پیدا ہو چکی ہے، ان کی روش بہت اچھی لگتی ہے۔ فقیر آرزو کرتا ہے کہ علماء اور طلبہ کے گروہ میں بیٹھا ہو اور (اصول فقہ کی آخری اور مشہور کتاب) تلویح کے مقدمات اربعہ کی کسی طالب سے تکرار کر رہا ہو۔ نیز (فقہ حنفی کی مشہور کتاب) ہدایہ کی تکرار بھی شروع کر رکھی ہو۔ اور یہ فقیر معیت اور احاطۂ علمی کے مسئلہ میں علماء کے ساتھ شریک ہے۔]

تشریح

اس اُمت کے ۷۲ گمراہ فرقے دراصل اہل سنت وجماعت کے حقہ عقائد سے دوری کی بنا پر ہی وجود میں آئے ہیں۔ اور ان کا آپس میں اختلاف بھی عقائد ہی کی بنیاد پر ہے۔ ان میں سے بعض آسمان اور زمین کو قدیم مانتے ہیں اور زمین وآسمان کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں

جو کہ سراسر کفر ہے۔ بعض رُوح انسانی کو قدیم کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو تو مانتے ہیں لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کے منکر ہیں۔ حکماءِ یونان کہتے ہیں کہ ہر کام اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کرتی ہے اس کی صفات کچھ نہیں کر سکتیں۔ جب کہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات، صفات اور اسماء بھی قدیم اور ازلی ہیں، ان کے علاوہ کوئی چیز قدیم و ازلی نہیں ہے۔ اس طرح نہ تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کی شرکت لازم آتی ہے اور نہ ہی اسماء وصفات کا انکار ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ اہل سنت و جماعت کے ان درست عقائد ہی کی وجہ سے ان کے جمالِ نورانیت کا یہ حال ہے کہ علماء اہل سنت کے بعض اعمال کی کوتاہی اس نورانیت کے آگے ہیچ ہے۔ البتہ اگر سالک کوئی عملی ریاضت اور مجاہدات کی تو کثرت کرے لیکن اس کے عقائد درست نہ ہوں تو علماءِ ظواہر والی نورانیت بھی اس کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے جگہ جگہ تحصیل علم اور عقائد کی درستگی پر زور دیا ہے۔ اور خود علم کے بحرِ عمیق اور ایک ہزار سال کے مجدد ہونے کے باوجود اصولِ دین اور فقہ کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں۔ پس ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر سالک کے لئے عقائد کو درست کرنا اور فقہ کی کتابوں کو پڑھنا ضروری ہے تاکہ روز مرہ کے ضروری معاملات وعبادات صحیح ہو سکیں اور اخروی نجات بھی ممکن ہو۔

[اسی طرح یہ فقیر حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو نہ عین عالم جانتا ہے اور نہ عالم سے متصل، نہ عالم سے منفصل اور نہ عالم کے ساتھ اور نہ عالم سے جدا۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کا کشف و شہود اور باطنی کیفیات ساری کی ساری شریعتِ مصطفوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے عین مطابق تھیں اور ان کے معارف میں سے کوئی معرفت بھی شریعت کے خلاف نہیں تھی۔ خود حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اس بات کو مکتوبات شریف میں کئی جگہوں پر ذکر فرمایا ہے۔ ان ہی معارف میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو عالم (جہان) نہیں کہتے۔ کیونکہ عالَم مخلوق ہے، اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق کہنا یا مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا عقائدِ احناف کے خلاف ہے۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ عالَم، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مخلوق اور اس کے علم میں ہے نہ کہ احاطۂ علم سے باہر۔

[اور نہ محیط اور نہ سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور تمام ممکن اشیاء یا ان کی صفات اور ان کے افعال کو مخلوق جانتا ہے اور یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ ممکنات کی صفات اس کی صفات ہیں، اور ان کے افعال اس کے افعال ہیں۔]

تشریح

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو جہان پر محیط اور جہان کے اندر سرایت کئے ہوئے بھی تصور نہیں کرنا چاہیئے کہ محیط ہونا اور سرایت کرنا اُس چیز کی صفت ہے جس کا جسم ہو اور ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے جسم کے قائل نہیں ہیں اس لئے اُس کے جہان میں سرایت کرنے کو بھی محال سمجھتے ہیں۔ اور ممکنات یعنی مخلوقات اور اس کی صفات وافعال سارے کے سارے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اور مخلوق کی صفات اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے، مثلاً مخلوق کا علم محدود ہوتا ہے، اور علم بھی کبھی ہوتا ہے اور کبھی ہوتا ہی نہیں۔ اور جو علم مخلوق کو حاصل ہوتا ہے اس میں کمی بیشی بھی

ہوتی رہتی ہے جبکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا علم ازلی ہے اور ابد تک رہے گا۔ نہ اس میں کمی ہوتی ہے نہ زیادتی، اور وہ علم محدود بھی نہیں۔ اس لئے مخلوق کے علم اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علم میں کوئی مناسبت ہو ہی نہیں سکتی، باقی رہا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء عظام کا علم تو اُس کے بارے میں اہلِ سنت وجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کا علم، علمِ عطائی ہے نہ کہ علمِ ذاتی۔ یوں ہی مخلوقات کے افعال اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے افعال کا معاملہ ہے۔ بندوں کے افعال مخلوق ہیں، جبکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے افعال مخلوق نہیں۔

حکایت

ایک مُرید اپنے پیر صاحب کے پاؤں میں جوتے پہنا رہا تھا۔ پیر صاحب جوش میں آئے اور پوچھا کہ جانتے ہو کہ یہ پاؤں کس کے ہیں؟ اُس نے کہا نہیں جناب! تو پیر صاحب نے کہا کہ یہ پاؤں اللہ کے ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)

پس ایسے کُفریہ اقوال وعقائد سے بچنا نہایت ضروری ہے کیونکہ ایسے عقائد اہلِ سنت وجماعت کے عقائد وتعلیمات کے خلاف ہیں۔

[بلکہ ہر شے کے افعال میں اسی ذاتِ واحد کی قدرت کو مؤثر جانتا ہے ممکنات کی قدرت میں فی الحقیقۃ اثر نہیں جانتا، جیسا کہ حکماء اور متکلمین کا مذہب ہے۔]

تشریح

متکلمین (جو کہ قدریہ فرقہ ہے) ان کا عقیدہ ہے کہ اچھے بُرے کاموں پر ہم اپنی ذات سے قدر ہیں۔ اور ہمارے افعال میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو کچھ دخل نہیں (نعوذ باللہ من ذٰلک) جبکہ حضرت

امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس یہاں پر اہل سنت وجماعت کے اُس عقیدے کو بیان فرما رہے ہیں جس کے مطابق ہم کہتے ہیں کہ:

وَ الْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہ تعالیٰ

ترجمہ: کہ اچھی اور بُری تقدیر (دونوں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

اور مخلوق کو حقیقی قدرت حاصل نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ فرقہ ٔقدریہ کے عقائد باطل ہیں۔

[اسی طرح سات صفات حقیقیہ واجب تعالیٰ کو موجود جانتا ہے، اور حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو ہر شے کا ارادہ کرنے والا جانتا ہے۔ اور قدرت بمعنی صحتِ فعل اور ترکِ فعل بالیقین تصور کرتا ہے۔ قدرت بمعنی:

ان شاء فعل و ان لم یشاء لم یفعل

ترجمہ: اگر چاہے تو کرے اور اگر نہ چاہے نہ کرے۔

نہیں مانتا۔ کیونکہ جملہ شرطیہ ثانیہ ممتنع ہے۔ جیسا کہ بعض حکماء اور صوفیہ مانتے ہیں۔ کیونکہ اس معنی سے واجب تعالیٰ پر وجوب لازم آتا ہے۔ اور یہ لزوم تسلیم کرنا حکماء کے اصولوں کے موافق ہے۔ اور قضا وقدر کے مسئلے کو علماء کے طور پر مانتا ہے کہ مالک کو اس بات کا مکمل اختیار ہے کہ اپنی ملک میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ اور قابلیت اور استعداد کا کچھ دخل نہیں مانتا۔ کیونکہ اس سے بھی وجوب لازم آتا ہے۔ اور وہ سبحانہٗ وتعالیٰ مختار ہے، جیسا چاہے کرے۔ اسی طرح اور سب باتیں۔ چونکہ ان حالات کا عرض کرنا ضروری اُمور میں سے ہے، اس لئے ان کے عرض کرنے کی جرأت اور گستاخی کی ہے۔

بندہ باید کہ حد خود داند

ترجمہ: بندے کو چاہیئے کہ اپنی حد کے اندر رہے۔]

تشریح

اس سے پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ بعض فرقے ایسے ہیں جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات سے منکر ہیں اُن کا عقیدہ ہے کہ ہر کام اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کرتی ہے اور صفات کا کچھ عمل دخل نہیں۔ اور یہ عقیدہ رکھنے والوں کو معتزلہ کہا جاتا ہے۔

حکماءِ یونان مادہ پرست ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے، ہاتھوں سے مَس نہیں کر سکتے تو ایسے اللہ کو کیسے مان لیں؟ ان کا یہ عقیدہ بھی اہلِ سنت وجماعت سے متضاد ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تو وہ ذات پاک ہے جس کو نہ تو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی انسانی ہاتھ کو اُس تک رسائی ہے، بلکہ وہ تو اس قدر وراء الوریٰ ذات ہے کہ عقل وسوچ اور وہم وفہم کا بھی اُس تک گزر نہیں۔ اور چونکہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے یہ سارے معارف عقائد کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، اس لئے نہایت ہی ضروری بات ہے کہ ہم پہلے فقہاءِ احناف کے عقائد کی کتابوں کی کسی عالم باعمل سے تکرار کریں تاکہ ہمارے عقائد درست ہو جائیں۔ عقائد کی درستگی کے بعد ہی تصوف کی چاشنی مل سکتی ہے ورنہ سراسر استدراج والی بات ہو گی اور عقائدِ احناف کے عقائد کی کتب میں نور ظلم، ابو المنتہیٰ، ملا علی قاری، عقائد النسفی اور نبراس مشہور ومعروف کُتب ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات، سُکر وصحو اور عقائد کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ پس اگر کسی نے عقائد کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے بیان کردہ عقائد کے مطابق ہی اپنے عقائد کو درست کر لے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو لازماً اس کا شمار ۷۲ گمراہ

فرقوں میں سے کسی فرقے میں ہو گا، اور حدیث مبارکہ میں فرمادیا گیا ہے کہ اہل سنت وجماعت کے علاوہ دیگر سارے فرقے جہنم میں ہوں گے۔(**العیاذ باللہ العظیم**)

مکتوب نمبر ۹

[ان حالات کے بیان میں جو نیچے آنے کے مقام سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں لکھا ہے:

بد قسمت، سیاہ رُو، کوتاہی میں مبتلا، بد خُو، وقت وحال کے مفرور اور وصل وکمال کے فریب خوردہ کی عرضداشت جس کا ہر کام مولیٰ کریم کی نافرمانی ہے۔ اور اس کا سارا عمل عزیمت اور اولیٰ کا ترک ہے، اپنے ظاہر کو آراستہ کر رکھا ہے اور خدا تعالیٰ کی نظارہ گاہ باطن کو خراب اور ویران کر رکھا ہے۔ اس کی ہمت نے ظاہر آرائی پر ہی کفایت کر رکھی ہے اور باطن ہمیشہ اس راستے سے رسوائی میں مبتلا ہے۔ اس کا قال حال کے منافی ہے، اور حال خواب وخیال پر مبنی ہے۔ اس خواب وخیال سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ اور ایسے قال وحال سے کیا عقدہ کشائی ہو سکتی ہے۔ بے نصیبی اور خسارہ نقد وقت ہے۔ غبادت وضلالت ہاتھ میں ہے، فساد وشرات کا مبداء اور ظلم ومعصیت کا منشا ہے۔ مختصر یہ کہ مجسمہ ٔعیوب اور مجمع ذُنوب ہے۔ اس کی نیکیاں لعنت وردّ اور اس کی حسنات طعن ودفع کر دینے کے لائق ہیں۔]

تشریح

سلوک میں عروج کی کیفیت کے بعد نزول کی کیفیت آتی ہے۔ عروج میں بعض سالکین کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا دیکھتے ہیں (نعوذ باللہ من ذٰلک) جیسے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی روح کو دورانِ مشاہدہ خدا سمجھ لیا تھا، اور دس سال تک اُس کی عبادت کی تھی۔ اور عروج کی اس کیفیت میں اکثر لوگ گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ کوئی خدائی کا دعویٰ کر جاتا ہے اور کوئی اپنی کیفیات ومشاہدات پر غرور وتکبر کی چادر اوڑھ لیتا ہے، لیکن ہر وقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے

فضل کے طالب ان قباحتوں سے بچ کر کامیاب وکامران صوفی بن کر نزول کرتے ہیں تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان کو مخلوق کا پیشوا بنا کر رُشد وہدایت کا ذمہ سونپتا ہے ایسے لوگ غرور وتکبر میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بے پایاں عنایات کے باوجود اپنے آپ کو عاجز وناقص خیال کرتے ہیں۔ جس کی زندہ مثال حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے مندرجہ بالا الفاظ ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس جب پایۂ تکمیل کو پہنچے اور عروج کے بعد نزول کیا تو مقام عبدیت کے مناسب اپنی بندگی اور عاجزی وانکساری کو بیان فرمایا۔ پس آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ان باتوں سے کوئی شخص دھوکے میں پڑ کے غلط مطلب نہ لے اور نہ ہی اس قدسی صفت ہستی پر طعن کرے کیونکہ کمال پر پہنچنے والے لوگ اپنے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی الفاظ سے عاجزی وانکساری کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ جب کوئی سالک تکمیل کے مراحل سے گزر کر کامل ولی بنتا ہے تو وہ خدا کو خدا اور بندے کو بندہ جانتا ہے۔ نفس کی طرف سے خدائی کے سارے دعوے ختم ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ذلیل وخوار، مکدر وقاصر اور گناہوں کا پُتلا سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔[1]

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو (فخر وغرور، ذلیل وخوار، بدبختی وکدورت اور گناہ ونافرمانی کی صفات کے ساتھ) پہچان لیا اُس نے اپنے خالق ومالک کو (اُس کی اعلیٰ صفات کے ساتھ) پہچان لیا۔

اور صوفیاء کرام کا طریقِ تصوف وسلوک انسان کو یہی پہچان عنایت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس عظیم ترین ولایت کے باوجود اپنے کمال کو چھپا

---

[1] (دیلمی بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)

رہے ہیں اور عجز وانکساری کے ساتھ مقامِ عبدیت کے لائق تنزلی کی صفات بیان فرمارہے ہیں۔ پس سلوک میں قدم رکھنے والوں کو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عاجزی وانکساری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے اور غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ یہی وہ اعلیٰ صفت ہے جو سالک کے لئے ترقی کا سبب بنتی ہے ورنہ اپنے آپ کو کامل تصور کرنے والے اور تکبر میں مبتلا ہو جانے والے صوفی راستے میں ہی رہ جاتے ہیں۔

[رُب قاری یقرؤ القراٰن و القراٰن یلعنہٗ

ترجمہ: بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں لیکن قرآن ان پر لعنت کرتا ہے۔

حدیث کا یہ مضمون اس کے حق میں گواہ عادل ہے۔

و کم من صائم لیس لہ من صیامہ الا الظماء الجوع

ترجمہ: کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنہیں روزہ سے سوائے پیاس اور بھوک کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اس حدیث کا مضمون بھی اس کے حال پر شاہد وصادق ہے۔ تو اس شخص پر افسوس جس کا یہ حال ہو اور یہ مرتبہ اور یہ کمال اور یہ درجہ ہو۔ اس کا استغفار کرنا بھی اس کے گناہوں کی طرح گناہ ہے، بلکہ ان سے بدتر ہے اور اس کی توبہ اس کے دوسرے معاصی کی طرح سراسر معصیت ہے۔ بلکہ ان سے قبیح تر۔ قبیح جو فعل کرتا ہے وہ بھی قبیح ہوتا ہے۔]

تشریح

انسان قبیح اور مکدر ہے (سوائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے) وہ جو فعل کرتا ہے وہ بھی اسی طرح قبیح اور مکدر ہوتا ہے، انسان کو اپنے فعل پر مغرور نہ ہونا چاہیئے۔ کوئی بھی نمازی، روزہ دار اور

قرآن خوان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کا جس طرح حق ہے وہ اس طرح ادا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ظاہراً تو ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کرتے ہیں مگر جس طرح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عبادت کا حق ہے ہم اس طرح حق ادا نہیں کر سکتے، اس لئے کہ قبیح کا عمل قبیح ہوتا ہے، پس انسان کو اپنے اعمال پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے ایک ولی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے:

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک ولی تھا جس نے پچیس سال تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عبادت کی ایک دن اس ولی نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا کہ اے کلیم اللہ میں نے پچیس سال اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عبادت کی ہے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے میرے متعلق عرض کریں کہ وہ میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ٹھیک ہے جب حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کوہِ طور پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے راز و نیاز کے لئے تشریف لے گئے تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے عرض کی کہ اے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تیرا ایک بندہ ہے اس نے یہ عرض کی ہے کہ میں نے پچیس سال میں تیری کوئی نافرمانی نہیں کی، صرف اور صرف تیری عبادت کی ہے تو میرے ساتھ کیا مکافات کرے گا؟ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا اس بندے سے کہو کہ جاؤ میں اپنے فضل و کرم سے تجھے جنت میں ایک محل عطا فرماتا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کوہِ طور سے واپس تشریف لائے تو اس ولی سے فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل و کرم سے جنت میں ایک محل عطا فرمادیا ہے اس ولی نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مجھے جنت میں ایک جگہ تو دے دی مگر وہ پچیس سال کی عبادت و ریاضت جو میں نے کی ہے اس کے

عوض مجھے کیا عطا کرے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اس کے بارے میں تو مجھے علم نہیں، میں پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے اس بات کے متعلق عرض کروں گا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام دوبارہ کوہِ طور پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے راز و نیاز کے لئے تشریف لے گئے تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے عرض کی کہ اے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تیرا وہ بندہ کہتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مجھے جنت میں ایک جگہ تو دے دی ہے مگر وہ پچیس سال عبادت وریاضت جو میں نے کی ہے اس کے عوض مجھے کچھ عطا نہیں کیا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا۔۔۔۔!اسی وقت اس ولی کی داڑھ میں اتنا شدید درد شروع ہوا کہ اس نے چلانا شروع کر دیا، اور فوراً حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور عرض کی کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ میری داڑھ کا درد ٹھیک ہو جائے اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی آئی کہ اس بندے سے کہو کہ میں اس کی پچیس سال کی عبادت کے عوض اس کی داڑھ کے درد کو فوراً ٹھیک کرتا ہوں، اگر اس کو منظور ہو تو ٹھیک ہے ورنہ درد اسی طرح رہے گا۔ اس ولی نے کہا کہ میں اپنی پچیس سال کی عبادت داڑھ کے درد کے عوض دیتا ہوں۔ جونہی اس ولی نے یہ الفاظ ادا کئے طرفۃ العین میں اس کی داڑھ کا درد ٹھیک ہو گیا۔ پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے اس بندے سے فرمایا کہ اب تیری پاس کیا بچا ہے جس کے عوض تو مجھ سے کچھ مانگے، یہ تو میرا فضل وکرم تھا کہ میں نے تجھے جنت میں جگہ عطاء فرمائی تھی۔

اس لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ انسان قبیح اور مکدر رہے (سوائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے) وہ جو فعل کرتا ہے وہ بھی اسی طرح قبیح اور مکدر ہوتا ہے۔ جب ہم ایک داڑھ کے درد کا عوض ادا نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں اپنی عبادات وریاضات پر مغرور نہیں

ہونا چاہیئے بلکہ صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا حکم بجالانا چاہیئے اور اس کے فضل و کرم کا انتظار کرنا چاہیئے کیونکہ جو شخص اپنی عبادات وریاضات پر مغرور ہوتا ہے وہ شخص ولی اللہ نہیں ہو سکتا۔ انسان ہر وقت اس طرح دعاء کرے کہ اے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ میں تیری عبادت کرکے تیرا حکم بجالاتا ہوں معلوم نہیں کہ یہ سب کچھ تیری بارگاہ میں قبول ہوتا ہے یا نہیں بس میں تو صرف تیرے فضل وکرم کا منتظر ہوں۔

[ناچیز اس کا مصداق بن چکا ہے:

زگندم جوز جَو گندم نیاید

ترجمہ: گندم سے جَو اور جَو سے گندم حاصل نہیں ہو سکتی۔]

تشریح

جس طرح گندم کے بیج سے جَو حاصل نہیں ہو سکتے اور جَو کی کاشت سے گندم کا حصول ناممکن ہے، یوں ہی انسان کی قباحت اور کدورت کا نتیجہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ گوبر کا کیڑا جو سارا دن گوبر میں پڑا رہتا ہے اس سے نیکی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ پس انسان کی کامیابی اس کے ناقص افعال سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی کامیابی وکامرانی اور قُرب کو محض اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل سمجھے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل سے ہی ہر چیز ممکن ہے۔

[اس ناکارہ کا مرض ذاتی علاج ہے، علاج پزیر نہیں، اور اس کی بیماری اصلی (پختہ) ہے۔ علاج کو قبول نہیں کرتی۔ جو چیز خلقت اور ذات میں داخل ہو وہ اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔

سیاہی از حبشی کے رود کہ خود رنگ است

ترجمہ: حبشی سے سیاہی دور نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ اس کا طبعی رنگ ہے۔

کیا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

ان سب خرابیوں کے باوجود اتنی بات ضرور ہے کہ خیر محض کے ساتھ ساتھ شر محض بھی چاہیئے، تاکہ خیر کی حقیقت واضح ہو سکے، اشیاء ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ خیر و کمال کے ساتھ شر و نقص بھی چاہیئے، حسن وجمال کے لئے آئینہ درکار ہے، اور آئینہ شے کے مقابل ہوتا ہے۔ لہٰذا خیر کے لئے شر اور کمال کے لئے نقص کا آئینہ ضروری ہے۔ تو ہر وہ شے جس میں نقص وشرارت زیادہ ہوگی وہ خیر وکمال کی نمائندگی بھی زیادہ کرے گی۔ عجیب کاروبار ہے کہ ذم نے مدح کے معنیٰ پیدا کر دیئے اور یہ شرارت ونقصان خیر وکمال کا محل بن گیا۔ اسی وجہ سے مقامِ عبدیت تمام مقامات سے بلند ہے۔ کیونکہ یہ معنیٰ مقامِ عبدیت میں اَتم واَکمل ہے۔ محبوبوں کو ہی اس مقام سے مشرف کرتے ہیں، اور محب، ذوقِ شہود سے لذت لیتے ہیں۔ بندگی میں لذت اور اس سے اُنس محبوبوں کے ساتھ خاص ہے۔ محبوب کا اُنس محبوب کے مشاہدہ سے ہے، مگر محبوبوں کو محبوب کی بندگی میں اُنس نصیب ہوتا ہے۔]

تشریح

عقلاء نے فرمایا ہے کہ چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ دن کی روشنی سے رات اور رات کے اندھیرے سے دن کی پہچان ہوتی ہے، خیر و بھلائی سے شر اور شر سے خیر وخوبی کا پتہ چلتا ہے۔ آنکھوں کے نور کا تصور کرکے دیکھ لیں۔ جب آنکھوں کی بینائی چلی جائے تب ان کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے پس ایسے ہی انسان کے جسم میں بھی یہ دونوں ضدیں موجود ہیں۔ ایک رُوح ہے اور دوسرا انسان کا نفسِ امارہ۔ رُوح عالمِ اَمر وعالمِ عُلیا سے ہے اور نفس عالمِ خلق وعالمِ سُفلی سے۔ انسان آئینے میں اپنی خوبصورتی کو آئینے کے پیچھے لگے ہوئے سیاہ رنگ کی بدولت دیکھتا ہے، اگر وہ سیاہی نہ ہو

تو انسان اپنے حُسن کو دیکھ ہی نہ سکے۔ پس یہ نفس ہی ہے جس سے رُوح کے کمالات کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے جو شخص جتنا اپنے نقص کی طرف متوجہ ہو گا اتنا ہی اُسے کمال حاصل ہو گا اور اعلیٰ ترین کمال مقامِ عبدیت میں میسر آتا ہے، اسی لئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو عَبۡدُہٗ کہہ کر سارے کمالات عنایت فرما دیئے کہ عبدیت سے اونچا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ لہٰذا صوفی کی کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ کبر وغرور سے بچے اور مقامِ عبدیت سے مستفید ہو۔

مُحب اور مَحبوب میں فرق

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے علاوہ باقی انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشارب سے فیض پانے والا سالک محب کہلاتا ہے۔ محب کو ظلی مقامات سے فیض آتا ہے، پہلے چار لطائف حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صفتِ تکوین سے فیض آتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صفتِ علم سے فیض ملتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام صفتِ کلام سے فیض اخذ کرتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صفتِ قدرت سے فیض آتا ہے، جبکہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو شان العلم سے فیض ملتا ہے، شان العلم اور صفت العلم کے درمیان ایک پردہ ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے، اور اسے برزخ کہتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اسی جگہ سے فیض ملتا ہے۔ پس حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے علاوہ باقی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے فیض اخذ کرنے والے سالک محب کہلاتے ہیں، جبکہ امام الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم

سے فیض لینے والے سالک محبوب کہلاتے ہیں۔ پس ہمارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی الگ شان ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ مُحب کو مرید اور محبوب کو مراد بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ:

موسیٰؑ ز ہوش رفت از یک تجلی صفات
تُو عین ذات می نگری و دَر تبسمی

ترجمہ: حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام صرف تجلیٔ صفات سے ہوش وحواس کھو بیٹھے (اور بے ہوش ہوگئے) لیکن (اے آقا) آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم عینِ ذاتِ خداوندِ اقدس کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور (اور قوت باطنی کا یہ حال ہے کہ) تبسم بھی فرما رہے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ایک سالک جس نبی کے مشرب پر ہوتا ہے، وہ عین اُس صفت پر فائز نہیں ہوتا جس صفت سے اُس نبی کو فیض ملتا ہے، بلکہ اُس صفتِ خدا کا اثر سالک میں نمودار ہوتا ہے۔

محب، وحدت در کثرت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا نظارہ کرتا ہے، یعنی محب کو ہر چیز میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نظر آتا ہے، وہ ان کیفیات میں اپنے آپ کو بھی خدا سمجھنے لگتا ہے، جبکہ محبوب اپنے آپ کو بندہ تصور کرتا ہے اور خدا کو خدا جانتا ہے۔

پس جو سالک مجذوبیت میں ہوتا ہے، وہ محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نہیں ہوتا بلکہ دوسرے مشارب میں سے کسی مشرب پر فائز ہوتا ہے، اور محب و محبوب میں یہی باریک فرق ہے۔

[اس اُنس میں سے اس دولت (دید تصور) تک پہنچاتے ہیں، اور اس نعمت سے سرفراز فرماتے ہیں۔ اس میدان میں یکہ دوڑانے والے شہسوار سرورِ دنیاودِین اور سید الاولین وآخرین حبیب رب العالمین ہیں علیه من الصلوٰة اتمها و من تحیات اکملا۔ آپ کے علاوہ جسے چاہتے ہیں کہ اپنے فضل سے نوازیں تو اسے یہ دولت حضور کی کمالِ متابعت کی برکت سے عطا کرتے ہیں۔ اس کمال سے اُسے موصوف کرادیتے اور اس متابعت کے ذریعے بلند مقام تک پہنچادیتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جیسے چاہے عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ فضل عظیم کا مالک ہے۔]

تشریح

عبدیت اور محبوبیت کا مقام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل ومکمل تابعداری سے حاصل ہوتا ہے، سالک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی جتنی تابعداری کرتا ہے اتنا ہی وہ عبدیت اور محبوبیت کے مقام کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور چونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم محبوبین کے سردار ہیں پس ہر سالک کو خود اپنی طرف متوجہ ہونا چاہیئے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کتنی تابعداری کرتا ہے۔ سالک محبوبیت کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی طرح محبوب کوئی بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ محبوبیت میں بھی درجات ہیں۔ اور اعلیٰ ترین درجہ ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے ساتھ خاص ہے، جس میں کسی دوسرے کی شرکت ناممکن ہے۔

[(صوفی میں کمال وشر کے پائے جانے سے مراد) شر و نقص کا علمِ ذوقی ہے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ شر و نقص سے متصف بھی ہوتا ہے۔ اس علم والا متخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے۔ یہ علم ذوقی بھی اس تخلق

کے ثمرات میں سے ہے، ورنہ شرارت ونقص کی وہاں کیا گنجائش ہے؟ اس سے صرف علمی تعلق ہوتا ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ میں نے یہاں شر کی بات کی ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ شر کے کام شروع کر دیں کہ میں تو شر ہوں اب شر والے کام کروں گا بلکہ یہاں صرف ممکنات کی اصل حقیقت کو علمی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

[یہ علم خیر محض کے شہود تام کے واسطہ سے ہے۔ جو اس تمام خیر کے پہلو میں شر محض دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ نفس مطمئنہ کے اپنے مقام پر نیچے اتر آنے کے بعد ہوتا ہے، اسے یاد رکھو۔ ایسا شخص جب تک اپنے آپ کو زمین پر نہیں مارے گا اور اس کا کام یہاں تک نہیں پہنچے گا۔ اپنے مالک ومولیٰ جل شانہٗ کے کمال سے بے نصیب رہے گا۔ تو وہ شخص کیونکر بے نصیب نہیں رہے گا جو اپنے آپ کو عین مولیٰ خیال کرے اور اپنی صفات کو اس کی صفات تصور کرے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے۔

یہ تو اسماء وصفات واجب تعالیٰ میں کج روی کا راستہ ہے۔ اس عقیدہ کے لوگ

وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ (الأعراف ١٨٠)

ترجمہ: اور انہیں چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں حق سے نکلتے ہیں۔

میں داخل ہیں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو بندہ اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو اپنا پروردگار سمجھنا چاہیئے سالک کو یوں نہ کہنا چاہیئے کہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات

کے ساتھ متصف ہو گیا کہ اس طرح کہنا الحاد وزندیقیت ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کے آثار میرے بطن میں نمودار ہوتے ہیں۔

[یہ بات نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جس کا جذبہ اس کے سلوک سے مقدم ہے وہ محبوبوں میں سے ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ سالک یہ بھی خیال نہ کرے کہ اس سالک کا جذبہ سلوک سے مقدم ہو وہ محبوبوں میں سے ہے۔ حضرت بہاؤ الدین نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے جو سالک طریقہ عالیہ نقشبندیہ میں شامل ہو تو اس کا جذبہ سلوک پر مقدم ہوتا ہے کیونکہ سالک کو ابتدا ٔ میں جذب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ سلوک میں داخل ہوتا ہے یہ کمال طریقہ عالیہ نقشبندیہ کا ہے، جبکہ دوسرے سلاسل میں سلوک مقدم ہے اور جذبہ بعد میں حاصل ہوتا ہے۔ وہ جذبہ جو سلوک سے مقدم ہے اور وہ جذبہ جو سلوک کے بعد ہے وہ حقیقی ہے۔ جب کوئی سالک تصوف میں داخل ہوتا ہے تو شیخ کی توجہ سے اس سالک کا جذبہ سلوک سے مقدم ہو جاتا ہے، یہ صوری جذبہ ہوتا ہے، حقیقی جذبہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب شیخ کی توجہ اس سے ہٹ جاتی ہے تو جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور جب پھر شیخ کی توجہ ہو تو جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ جذبہ ولایت کا حصہ نہیں ہے، بلکہ یہ صرف ولایت کے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور جذبہ کی حقیقت تک سالک کو پہنچاتا ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا یہ فضل وکرم طریقۂ عالیہ نقشبندیہ پر ہی ہے دوسرے سلاسل میں یہ نعمت نہیں ہے۔

[ہاں اتنی بات ہے کہ محبوبیت کے لئے جذبے کا مقام ہونا شرط ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ ہر جذبہ میں محبوبیت کے کچھ معنی پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ جذب محبوبیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس قسم کی محبوبیت عارضی ہے، ذاتی نہیں۔ محبوبیت ذاتی بلا علت ہے۔ جس طرح ہر منتہی کو آخر کار جذبہ میسر آجاتا ہے۔ لیکن یہ محبوں کے زمرہ میں ہی رہتا ہے (محبوبین کے زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتا) اور وہ معنی عارضی تزکیہ اور تصفیہ ہے۔ بعض مبتدی حضرات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع کے باعث اگرچہ بعض اُمور میں ہی اتباع ہو، کسی حد تک اس معنی کو حاصل کر لیتے ہیں۔ بلکہ منتہی میں بھی اتباع کا ہونا ضروری ہے اور بس۔ محبوبوں میں اس معنی (محبوبیت ذاتی فضلی) کا ظہور بھی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اتباع سے وابستہ ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ وہ معنی ذاتی بھی آپ کے ساتھ مناسبت ذاتی اور اس اسم کی بنا پر ہے جو آپ کا رب ہے۔ اس وجہ سے یہ خصوصیت اس میں پیدا ہوئی ہے۔ اور وہاں سے یہ سعادت حاصل کی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم بالصواب والیہ المرجع الماب، واللہ یحق الحق وھو یھدی السبیل]

تشریح

محبوب کے لئے جذبۂ حقیقی کا مقدم ہونا شرط ہے نہ کہ صوری جذبہ کا۔ کیونکہ صوری جذبہ تو شیخ کی توجہات کی وجہ سے ہوتا ہے توجہات نہ ہوں تو جذبہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ حقیقی جذبہ ختم نہیں ہوتا۔ اور صوری جذبہ والا اپنے آپ کو محبوب نہ سمجھے کیونکہ محبوب گمراہی اور بدبختی کے کاموں سے محفوظ ہوتا ہے جبکہ صوری جذبہ والے سے گمراہی والے کاموں کا صادر ہونا عین ممکن بلکہ ثابت ہے۔

مکتوب نمبر ۱۰

[قُرب وبُعد کے حصول اور فرق ووصل بمعنی غیر مشہور اور اس سے مناسب بعض علوم کے بیان میں۔۔۔۔۔ یہ خط بھی اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں لکھا:

حقیر ترین خادم کی عرض داشت یہ ہے کہ ایک مدت سے اس بلند آستانہ کے خادموں کے حالات سے کوئی اطلاع نہیں رکھتا، منتظر ہے۔

عجبے نیست اگر زندہ شود جان عزیز

چوں ازاں یار جدا ماندہ پیامے برسد

ترجمہ: کوئی عجب نہیں کہ اگر جان عزیز زندہ ہو جائے جب اس جدا شدہ دوست کا پیغام پہنچے۔ بندہ جانتا ہے کہ حاضر درگاہ ہونے کی دولت اور نعمت کے لائق نہیں۔

ایں بسکہ رسد زدور بانگ جرسم

ترجمہ: یہ کافی ہے کہ دُور ہی سے جَرَس (گھنٹی) کی آواز آتی رہے۔

عجیب کاروبار ہے۔ نہایت بُعد کا نام قُرب رکھا ہوا ہے، اور غایت فراق کو وصل وملاقات کہا جاتا ہے۔ گویا فی الحقیقت اس کے ضمن میں قُرب ووصال کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔

کیف الوصول الی سعاد و دونہا

قلل الجبال و دونہن خیوف

ترجمہ: سعاد (معشوقہ) کا وصل کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اور ان چوٹیوں تک پہنچنے سے پہلے دشوار گزار نشیب وفراز واقع ہیں۔ تو حزنِ اَبدی اور فکرِ دائمی دامن گیر ہو چکا ہے۔]

تشریح

ہم لوگ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر وفکر اور طلب ویاد میں مصروف رہتے ہیں تا کہ ہمیں اُس کا وصل نصیب ہو جائے اور ظاہراً ہم یہ احساس بھی کرتے ہیں کہ ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے قریب ہو گئے ہیں لیکن یہ قُرب وہ وصل ویسا نہیں ہو سکتا جیسے ہم چاہتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ورأ الوریٰ ثم ورأ الوریٰ ہے۔ وہ ہماری سوچ، فکر، وہم، فہم اور خواب وخیال سے بھی دور ہے۔ جو صوفی یہ کہتا ہے کہ میں واصل ہو چکا ہوں اور پھر وہ وصل کی کیفیات بیان کرتا ہے وہ سب ظلی کیفیات ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے بہترین بندے ہیں اُن کا ایمان شہودی ہوتا ہے اور جب وہ تبلیغِ دین کے لئے مبعوث ہوتے ہیں تو ایمان بالغیب سے مشرف ہوتے ہیں جبکہ ولی اللہ تو صفات کے ظل سے مستفید ہو کر ایمان بالغیب رکھتے ہیں وہ جس کا مشاہدہ کرتے ہیں اُسے خدا سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ خدا نہیں ہوتا۔ وہ تو انوارات و تجلیات ہوتی ہیں اور یہ سب ظلی کیفیات ہیں ان کو قُرب نہیں کہا جاسکتا۔

[مُراد کو بھی آخر الامر مُرید کے ارادہ سے مُرید ہونا پڑتا ہے۔ اور محبوب کو بھی مُحب کی محبت میں محب بننا پڑتا ہے۔ دین ودنیا کے سردار علیہ من الصلوٰۃ اکملھا ومن التحیات افضلھا مُرادیت اور محبوبیت کے مقام کے باوجود محبین اور مُریدین میں سے تھے۔ اسی لئے آپ کے حال کی یوں خبر آئی کہ:

کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم متواصل الحزن دائم الفکر۔

ترجمہ: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہمیشہ غمگیں اور متفکر رہتے تھے۔

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود فرمایا:

مَا اُوْذِیَ نَبِیٌ مِثْلَ مَا اُوْذِیْتُ۔

ترجمہ: کسی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتنی اذیت نہیں پہنچائی گئی جتنی مجھے پہنچائی گئی ہے۔

محب لوگ تو محبت کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ محبوبوں کے لئے اس بوجھ کا اٹھانا دشوار ہے۔ یہ قصہ بڑا دراز ہے۔

قصّة العشق لا انفصَام لها

ترجمہ: قصہ ٔعشق ختم نہیں ہو سکتا۔]

تشریح

یعنی مُراد لوگ جو کہ دراصل محبوب ہوتے ہیں اُن کو بھی وصل خدا کی نیت سے مُرید بننا پڑتا ہے۔ پس اس بات سے عوام الناس کا اندازہ کر لیں جو سرے سے سلوک کے قریب بھی نہیں آتے اور پھر اپنی اُخروی کامیابی کے بھی دعویدار ہوتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہمیشہ غمگیں ومتفکر رہتے تھے اور وصلِ عریان کے خواہش مند رہتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم محبت بھی تھے اور محبوب بھی۔ جب آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا یہ حال ہے تو ہم کیا چیز ہیں اور کیونکر بے فکر ہو گئے ہیں۔

[اس عرضداشت کا حاصل وخلاصہ یہ ہے کہ شیخ اللہ بخش قدرے جذبہ ومحبت رکھتا ہے۔ مجبور کرکے یہ چند کلمات آپ کے خادموں کی طرف لکھوائے ہیں۔ غرض یہ کہ ملازمت کا شوق ظاہر کرکے ان حدود کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ اول کچھ مخصوص ارادوں کا اظہار کیا مگر میری طرف سے

اُن کے متعلق عدم دلچسپی محسوس کر کے اب صرف ملاقات پر راضی ہو گیا ہے، اور یہ چند کلمات لکھوائے۔

زیادہ گستاخی ادب سے دور ہے۔]

مکتوب نمبر ۱۱

[بعض مکاشفات اپنے قصور دیکھنے کے مقام کے حصول اور تمام اعمال واقوال میں اپنے آپ کو عیب ناک جاننے اور شیخ ابو الخیر کے اس کلام "عین نمی ماند اثر کجا ماند" کے راز کے ظاہر ہونے اور بعض دوستوں کے حالات کے بیان میں۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

کمترین غلام، احمد کی عرضداشت یہ ہے کہ جس مقام میں ناچیز نے اپنے آپ کو پہلے دیکھا تھا آپ کے حکم عالی کے مطابق جب دوبارہ اس کا ملاحظہ کیا تو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عبور اس مقام میں دکھائی دیا مگر چونکہ اس مقام میں قیام واستقرار نہ تھا، اس وجہ سے پہلی دفعہ نظر نہ پڑی۔ جس طرح آئمہ اہلِ بیت میں سے سوائے امامینِ کریمین اور امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اس میں استقرار نہ رکھتے تھے۔ اور وہ جو پہلی دفعہ اپنے آپ کو اس مقام کے مناسب نہ پایا، یہ بے مناسبتی دو طرح کی ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے یہ مکتوب اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو اپنی کیفیات اور حالات کے بارے میں لکھا ہے اور مکاشفات میں جو بات حضرت شیخ ابو سعید الخیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیان کی ہے کہ "جب اصل مٹ جائے گا تو اس کا اثر کہاں باقی رہے گا" اولیاء اللہ کے مکاشفات آج ایک قسم کے ہوتے ہیں تو کل دوسری طرح۔ اسی کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ابتدائی حالت میں استعداد کم ہوتی ہے اور وہ ان کو صحیح بیان نہیں کر سکتے یعنی جو بیان کرنے کے لائق ہوتی ہے وہ بیان نہیں کر سکتے۔ حضرت مجدد الف ثانی

قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ پہلے جب میرا عبور اس مقام پر ہوا تو میں نے خلفاء ثلاثہ (حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذوالنورین) رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو وہاں نہیں دیکھا تھا مگر اب میں اُن کو اس مقام میں دیکھتا ہوں۔ اس میں سالک پر دو قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے ابتداً میں سالک اپنے استقرار اور تعین مبدأ کو دیکھتا ہے یعنی اپنے اسمِ مُربی جو کہ سالک کے استقرار کی جگہ ہے دیکھتا ہے اس لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو وہاں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نظر نہ آئے۔ اب جب وہ دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب یہ جگہ استقرار کی نہیں ہے، بلکہ عبور کی ہے بعض اولیاء کا استقرار اور مبدأ تعین نیچے ہوتا ہے مگر اُن کا عبور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام یا بڑے بڑے اولیاءاللہ رحمہم اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک کمشنر دو حالتوں میں بادشاہ کے پاس جاتا ہے یا تو اپنی کوئی حاجت لے کر جاتا ہے اور یا صرف ملاقات کی نیت سے جاتا ہے البتہ اس کمشنر کے استقرار کی جگہ کمشنری ہوتی ہے اور جہاں کمشنر بادشاہ کے پاس جاتا ہے وہ کمشنر کے عبور کا مقام ہوتا ہے۔

اولیاءاللہ کے مختلف درجات ہوتے ہیں کچھ تو استقراری ہوتے ہیں اور کچھ عبوری۔ استقراری سے مراد یہ ہے کہ وہ جن مقامات کے مکاشفہ کی بات کرتے ہیں وہ خود اُن مقامات میں قرار پزیر ہوتے ہیں اور عبوری سے مراد یہ ہے کہ وہ مقامات جن کو وہ کشف یا شہود میں دیکھتے ہیں وہ مقامات اُن کے اپنے نہیں ہوتے بلکہ صرف ان مقامات کا ملاحظہ اور سیر کرتے ہیں اور اس کے بعد واپس اپنے مقام میں آجاتے ہیں۔ پس حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے جو حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مقامات کی بات کی ہے وہ صرف عبور کی بات ہے نہ کہ استقرار کی۔

[ایک تو یہ کہ طریقوں میں سے کسی طریقہ کے ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے بے مناسبتی طاری ہوتی ہے۔جب اس طرف راستہ دکھا دیتے ہیں تو وہ بے مناسبتی ایک طرف کو ہٹ جاتی ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جسے بے مناسبتی مطلق کہتے ہیں۔یہ کسی طرح بھی قابلِ زوال نہیں ہے۔

اور وہ راستے جو اس مقام تک پہنچاتے ہیں صرف دو ہیں۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔یعنی نظر میں ان دو طریقوں کے علاوہ اور کوئی طریقہ ظاہر نہیں ہوتا۔

ایک تو اپنے نقص اور قصور کو دیکھنا اور خیرات اور نیک کاموں میں اپنے آپ کو متہم اور عیب ناک تصور کرنا ہے۔

دوسرا اس شیخ کامل مکمل مجذوب کی صحبت ہے جس نے سلوک مکمل کر لیا ہو۔]

تشریح

صُوفیت دو طریقوں سے حاصل ہوتی ہے

اول: یا تو کوئی مسلمان اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکام پر صدق دل سے عمل کرتا ہے اور نواہی سے بچتا ہے اور تلاوت ونوافل میں مشغول رہتا ہے لیکن اُس کا کوئی شیخ نہیں ہوتا بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل اُس کے شامل حال ہو جاتا ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اُسے اپنا مقرب بنالیتا ہے اور اس کی طرف اُس حدیث مبارکہ میں صراحت ہے جس میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ:

وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنْ

اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ وَلَا بُدَّ لَهُ مِنْهُ۔ [1]

ترجمہ: اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ساتھ میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اُسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں، جب میں اُسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اُس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سُنتا ہے اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اگر مجھ سے مانگتا ہے تو میں اُسے دیتا ہوں اگر میرے پاس پناہ لیتا ہے تو میں ضرور اُسے پناہ دیتا ہوں اور میں توقف اور دیر نہیں کرتا اُس کام میں جسے میں کرنے والا ہوتا ہوں جتنا کہ میں بندۂ مؤمن کی جان قبض کرنے میں توقف اور دیر کرتا ہوں، بندۂ مؤمن موت کو نہیں چاہتا اور میں نہیں چاہتا کہ اُسے تکلیف میں ڈالوں حالانکہ موت کا اس پر طاری ہونا ضروری اَمر ہے۔

لیکن یہ فضل لاکھوں میں سے ایک یا دو پر ہی ہوتا ہے۔ یا کوئی شخص کسی پیر کا دامن صدقِ نیت سے تھام تولیتا ہے مگر بد قسمتی سے اُس کا شیخ ناقص ہوتا ہے اور تصوف سے ناآشنا۔ لیکن چونکہ مُرید کی نیت درست ہے اور وہ اخلاص وولایت کے حصول میں صادق ہے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اُسے اُس کے نیک اعمال اور تواضع کی وجہ سے وصول تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے شخص کو چاہیئے کہ اپنے اعمال کو ناقص خیال کرے اور ان پر مغرور نہ ہو۔

دوم: تصوف کے حصول کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ارادت مند مسلمان شیخ کامل و مکمل کی تلاش میں رہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی وانکساری کرتا رہے اور جب اُسے شیخ کامل مل جائے

---

[1] (رواہ البخاری، مشکوٰۃ باب ذکر اللہ عزوجل والتقرب الیہ، ص ۱۹۷)

تو مکرر استخاروں کے بعد اُس سے بیعت کر لے اور پھر اُس کی تعلیمات کے مطابق عمل کرے۔ فرائض، واجبات اور سُنن نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر عمل کرے، منہیات سے بچے، علم دین حاصل کرے اور شیخ کی توجہات سے استفادہ کرے۔

حضرت مرزا عبد القادر بیدل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کیا خوب کہا ہے کہ:

بہ یک نگاہ می کشی و زندہ می کنی   گویا کہ چشم مست تو پروردگار ماست

ترجمہ: ایک نگاہ سے مار ڈالتے ہیں اور زندہ کر دیتے ہیں، گویا کہ آپ کی مست آنکھ ہمارا پروردگار ہے۔

لیکن یہ طریقہ ہے بڑا مشکل اور دشوار۔ البتہ اس راستے سے وصول تک پہنچنا بڑے بڑے درجات کا مؤجب ہے۔ ہاں اپنے عمل کو ناقص و نامکمل سمجھے اور مغرور نہ ہو۔ پس ہر مسلمان کو چاہیئے کہ شیخ کامل و مکمل سے بیعت ضرور کرے کیونکہ جو بیعت نہیں کرتا اُس کا پیر شیطان ہوتا ہے۔

جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ:

مَنْ لَا شَیْخَ لَهٗ فَشَیْخُهٗ اِبْلِیْس۔[1]

ترجمہ: جس کا شیخ (پیر) نہ تو اس کا شیخ ابلیس ہے۔

اور نیز حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

مَنْ لَا شَیْخَ لَهٗ لَا دِیْنَ لَهٗ۔[2]

ترجمہ: جس کا شیخ (پیر) نہ ہو تو اُس کا کوئی دین نہیں ہے۔

---

[1] (سیرت نقشبند، حصہ اول، ص ٦)

[2] (سیرت نقشبند، حصہ اول، ص ٦)

[حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپ کی عنایت ومہربانی کی طفیل پہلا راستہ بقدر استعداد عنایت فرمادیا ہے۔ چنانچہ کوئی عمل اعمال خیر میں سے واقع نہیں ہوتا مگر ناچیز اپنے آپ کو اس میں متہم اور عیب ناک تصور کرتا ہے۔ جب تک کسی طرح سے اپنے آپ پر تہمت اور عیب نہیں رکھتا بے قرار اور بے آرام رہتا ہے۔ اپنے خیال میں ہی جانتا ہے کہ اپنے سے کوئی بھی ایسا عمل صادر نہیں ہوتا جو نیکیاں لکھنے والے فرشتوں کے لکھنے کے قابل ہو۔

اور ایسا جانتا ہے کہ نیکیوں کا اعمال نامہ اعمالِ خیر سے خالی ہے، اور انہیں لکھنے والے کراماً کاتبین معطل اور بے کار ہیں۔ خدائے جل وعلا کے لائق ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو کچھ جہان میں ہے، حتیٰ کہ کافر فرنگ اور ملحد زندیق، سب کو اپنے سے کئی اعتبار سے بہتر جانتا ہے اور ان سب سے بدتر خیال کرتا ہے۔ اور جزبے کی جہت سے اگرچہ سیر الی اللہ مکمل اور تمام ہو چکی ہے، لیکن اس کے بعض لوازم اور توابع باقی تھے جو اس فنا کے ضمن میں جو سیر فی اللہ کے مرکز کے مقام میں واقع ہوئی ہے، تمام اور مکمل ہو گئے ہیں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں اپنی ابتدائی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہے کہ میں اپنے اعمال نامہ میں کوئی نیکی نہیں پاتا، ساری برائی ہی برائی نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ کافر فرنگ اور ملحد زندیق سے بھی اپنے آپ کو بدتر سمجھتا ہوں۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے یہ الفاظ زبانی، لفظی اور عقیدۃً نہیں کہے بلکہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو کشف میں ہی اس طرح دکھائی دیا کیونکہ مؤمن کافر فرنگ اور ملحد زندیق کے مقابلے میں پاک اور

ایمان دار ہوتا ہے، کشف میں جب انسان کی رُوح اور جسد جدا ہو جاتے ہیں تو رُوح اوپر پرواز کر لیتی ہے اور جسد دنیاوی ظلمت میں رہ جاتا ہے تو رُوح عالمِ اَمر سے اپنے جسد کو دیکھتی ہے، اور چونکہ جسم انسانی کی نورانیت رُوح کی وجہ سے ہوتی ہے اور رُوح اپنے جسد سے علیحدہ ہو کر عالمِ اَمر کی طرف پرواز کر جاتی ہے، اس لئے جب رُوح عالمِ اَمر سے نیچے اپنے جسد کو دیکھتی ہے تو اُسے اس جسدِ عنصری میں کسی قسم کی نُورانیت نظر نہیں آتی۔ دوسری طرف کافر کی رُوح اور جسد چونکہ اکٹھے ہوتے ہیں اور کافروں کے کچھ اچھے کاموں کی وجہ سے اُن میں کچھ نورانیت پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا جب صوفی کی روح عالمِ اَمر سے اپنے جسدِ خاکی اور کافر کے جسد کا موازنہ کرتی ہے تو اُسے اپنا جسد تو نورانیت سے خالی نظر آتا ہے، جبکہ کافر کی نُورانیت اُس کے جسم میں اُسی طرح موجود نظر آتی ہے، تو صوفی اپنے آپ سے کافر کو بہتر سمجھنے لگتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اسی معرفت کی وجہ سے فرمایا ہے کہ میں اپنے آپ کو کافرِ فرنگ اور ملحدِ زندیق سے بدتر خیال کرتا ہوں۔ اور یہ حالت صوفیانہ صفت کی وجہ سے ہے ورنہ ایک ادنیٰ مسلمان بھی ''ایمان'' کی وجہ سے ساری دُنیا کے کفار سے کئی درجہ بہتر ہے۔

اے گروہِ صوفیاء! آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ نہ تو نبی آخر الزمان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سُنتوں کو بجالاتے ہیں اور نہ ہی آخری ہزار سال کے مجدد کے مکتوبات کو پڑھتے ہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو کفار سے بھی بدتر خیال کرتے تھے اور آپ کا نفس خدائی دعویٰ کر جاتا ہے۔ وہ اپنے اعمال کو ناقص خیال کرتے تھے اور کثرت سے استغفار کرتے تھے جبکہ آپ اپنے اعمال پر مغرور ہیں اور اپنے آپ کے لئے آپ نے غوث وقطب کے مقامات مقرر کیے ہوئے ہیں۔ اگر آپ واقعی اولیاءِ اُمت سے پیار کرتے ہیں اور ان کی مطابعت کا دَم بھرتے ہیں تو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ

سرہٗ الاقدس کی بیان کردہ صفات اپنے اندر پیدا کریں۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس میں یہ کیفیات تو سلوک کی ابتدا ٔ میں ہی پیدا ہو گئی تھیں لیکن اگر آپ میں انتہا میں جا کر بھی ایسی صفات پیدا ہو جائیں تو کامیابی تصور ہو گی۔ پس اپنے آپ کو ناقص اور اپنے اعمال کو کوتاہ خیال کرنے سے بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل وکرم شاملِ حال ہو ہی جاتا ہے۔

[اور اس فنا کے حالات اس سے پہلی عرضداشت میں تفصیلاً لکھ دیئے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس فنا کو نہایت کام جو کہا ہے اس سے مراد وہی فنا ہو جو تجلی ذات اور سیر فی اللہ کے تحقق ووجود کے متحقق ہوتی ہے۔ اور ارادے کی فنا بھی اسی فنا کے شعبوں میں سے ہو۔

ہیچکس راہ تا نگردد او فنا نیست راہ در بارگاہِ کبریا

ترجمہ: کوئی شخص بھی جب تک فنا نہ ہو بارگاہِ خداوندی کی طرف اسے راستہ نہیں مل سکتا۔]

فنا کے درجات

فنا کا درجۂ اول: جب صوفی فانی ہو کر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا دوست بن جاتا ہے تو اس پر صفاتِ ذاتیہ کی تجلی کا انعکاس ہوتا ہے اور سالک میں ان صفاتِ ذاتیہ کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ فنا اُن صوفیاء کو میسر ہوتی ہے جو کہ محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے علاوہ باقی مشارب پر فائز ہوں۔

فنا کا درجۂ دوم: جب صوفی پر شیوناتِ ذاتیہ کی تجلی پڑتی ہے تو وہ اُس سے پہلے کی تجلیاتِ صفاتِ ذاتیہ کو بھول جاتا ہے اور وہ تجلیات اس کی نظروں سے معدوم ہو جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں معدوم نہیں ہوتیں کیونکہ وہ اَزلی واَبدی ہیں۔ اور شیوناتِ ذاتیہ کی تجلی جب دائمی ہو جاتی ہے تو اُس وقت وہ

صوفی کامل و مکمل ولی اللہ بن جاتا ہے۔ اور یہ فنا اُن اولیاء اللہ کا حصہ ہے جو محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہوں۔

[اور اس مقام سے مناسبت رکھنے والے دو گروہ بھی نظر میں ہیں۔

ایک جماعت اس مقام کی طرف متوجہ اور وصول کے راستے کی متلاشی ہے۔ اور ایک گروہ اس مقام کی طرف کچھ التفات اور توجہ نہیں رکھتا۔ اس مقام تک وصول کے طریقوں میں سے طریقہ دوم آپ کی توجہ سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور مناسبت بھی اسی طریقہ سے محسوس کرتا ہے چونکہ آپ کی جانب سے مامور تھا اس لئے تعمیل حکم کے طور پر بعض اُمور کے بیان میں جرأت اور گستاخی کی ہے، ورنہ:

من ہماں احمد پارینہ کہ ہستم ہستم

ترجمہ: میں وہی پرانا احمد ہوں جو تھا۔]

تشریح

"اس مقام تک وصول کے طریقوں میں سے طریقہ دوم آپ کی توجہ سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے"

اس فقرے سے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں اشارۃً عرض کیا کہ طریقہ دوم یعنی شیوناتِ ذاتیہ اور "محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم" کا جو طریقہ ہے وہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی توجہ سے مجھ میں زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔

[دوسری عرض یہ ہے کہ اس مقام کو دوبارہ ملاحظہ کرنے سے کچھ اور مقامات اُوپر نیچے ظاہر ہوئے۔ عاجزی اور شکستگی کے ساتھ توجہ کرنے کے بعد جب اس مقام پر جو مقام سابق سے فوق اور

اُوپر تھا پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقام ہے، اور دوسرے خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی اس مقام سے عبور حاصل ہو چکا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل وارشاد کا مقام ہے، اسی طرح اُوپر دو اور مقام بھی جن کا ابھی ذکر ہو گا۔ اور اس مقام سے اُوپر ایک مقام دکھائی دیا۔ جب اس مقام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقام ہے، اور دوسرے خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی اس مقام سے عبور حاصل ہو چکا ہے۔ اور اس مقام سے بھی اُوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقام ظاہر ہوا۔ اس مقام تک بھی پہنچنا نصیب ہوا۔ اور مشائخ میں سے حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو ہر مقام میں اپنے ساتھ پایا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسرے خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی اس مقام سے عبور واقع ہو چکا ہے۔ فرق صرف عبور اور قیام اور گزرنے اور ٹھہرنے کا ہے۔ اور اس سے اوپر کوئی مقام محسوس نہیں ہوتا، سوائے رسالت خاتمیت کے مقام کے علیہ من الصلوات اتمہا و من التحیات اکملہا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام کے بالکل مقابل ایک اور مقام ظاہر ہوا جو نہایت ہی نُورانی تھا۔ ایسا نُورانی مقام کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام سے کچھ بلند تھا۔ جس طرح چبوترے کو زمین سے قدرے بلند بناتے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ وہ مقام مقامِ محبوبیت ہے اور یہ مقام رنگین اور منقش تھا۔ میں نے اس کے پَرتَو سے اپنے آپ کو بھی رنگین اور منقش پایا۔]

تشریح

مقامِ صدیقیت سے اُوپر کسی کا عبور نہیں ہے سوائے آقائے دو جہان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے یعنی صوفی کا عبور صرف مقامِ صدیقیت تک ہے، یہ صوفی کے استقرار کی جگہ نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف عبور کی جگہ ہے صوفی کے استقرار و تمکن کی جگہ اس سے بہت نیچے ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں عبور و تمکن اور ملائکہ وبشر میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ ملائکہ بیرونی مشاہدات کر سکتے ہیں مگر اندرونی مشاہدات اُن کے لئے نہیں ہیں ملائکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مقرب مخلوق ہے، مگر ان میں عشق و محبت نہیں ہے۔ وہ صرف اپنے کام پر مامور ہیں۔ ان کو یہ خواہش نہیں ہوتی کہ ہم اگلے مقام میں ترقی کریں۔ بلکہ وہ اپنے مقام میں خوش اور مطمئن ہیں جبکہ انسان میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے عشق و محبت اور کشش پیدا کی ہے، انسان اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اُس کو چاہتا ہے، یہ کیفیت صرف انسان میں موجود ہے ملائکہ اس کیفیت سے فارغ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو اس کے عشق و محبت اور محبوبیت کی وجہ سے ملائکہ پر فضیلت حاصل ہے۔ انسان کو ہر چند اللہ تعالیٰ نے ادنیٰ چیز سے پیدا کیا ہے، مگر اس میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے عشق و محبت پیدا کر کے باطنی ترقیات کے قابل بنایا ہے اور اس پر فضلِ عظیم فرمایا ہے۔

ذَلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ (الجمعۃ ۴)

ترجمہ: یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

[اس کے بعد اسی کیفیت میں اپنے آپ کو لطیف پایا اور ہوا کی طرح یا قطعہ بادل کی طرح آفاق میں منتشر دیکھا اور بعض کناروں کو پکڑے ہوئے پایا۔ اور حضرت خواجہ بزرگ (حضرت شاہ نقشبند

بخاری قدس سرہٗ) صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام میں اپنے آپ کو ان کے مقام کے مقابل پاتے ہیں۔اس کیفیت کے مطابق جو عرض کی گئی ہے۔]

تشریح

جب انسان اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا محبوب بندہ بن جاتا ہے تو اُس کی ساری کیفیات لطیف ہو جاتی ہیں اور اُس میں فرشتوں کے خواص و کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ شخص رہتا انسان ہی ہے فرشتہ نہیں بن سکتا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ "فلاں فرشتہ صفت انسان ہے"یعنی اُس کی صفات ملائکہ جیسی ہیں۔

[دوسری عرض یہ ہے کہ تلقین وارشاد کو ترک کر دینا اچھا نہیں لگتا۔اور یہ بات اچھی بھی کیسے لگ سکتی ہے جس طرح سارا عالم گرداب ضلالت وگمراہی میں غرق ہو رہا ہو۔ایک شخص اگر اپنے اندر انہیں نکالنے کی قوت اور طاقت رکھتا ہو تو کیسے بری الذمہ تصور کر سکتا ہے۔اگرچہ دوسرے کاموں کی بھی مشغولیت ہے مگر وعظ وارشاد میں مشغول رہنا بھی ضروری اور پسندیدہ ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ دورانِ عمل جو وساوس وخطرات پیش آتے ہیں ان سے توبہ واستغفار لازم رکھے۔اس شرط کے ملحوظ رکھنے سے رضا کے دائرہ میں داخل ہو سکتا ہے۔اس شرط کو ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں رضا میں داخل نہیں ہو سکتا، بلکہ نیچے تہہ میں ہی کھڑا رہتا ہے۔لیکن حضرت خواجہ نقشبند اور حضرت خواجہ علاؤالدین عطار قدس اللہ تعالیٰ اسرارہما کے بارے میں اس شرط کے لحاظ کے بغیر ہی پسندیدگی ہے۔ اور اس (مجدد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کم درجہ حال کا عمل اس شرط کے لحاظ کے بغیر داخل ہوتا ہے،اور کبھی نیچے تہہ میں کھڑا رہتا ہے۔]

تشریح

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

إِنَّ اللّٰہَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا (النساء ۵۸)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے اہل لوگوں کے ہی سپرد کرو۔

اسی طرح حدیث مبارکہ میں بھی آیا ہے کہ:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غير أَهله كمقلد الْخَنَازِير الْجَوْهَر واللؤلؤ وَالذَّهَبَ۔[1]

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے روایت کی کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے، علم کو نااہل کے آگے رکھنا (یعنی نااہل کو علم عطاء کرنا) خنزیر کے گلے میں لؤلو، جواہرات اور سونا ڈالنے کے مترادف ہے۔

پس یہ امانت اس کے اہل اور حقدار کے سپرد کرنے سے ہی دینِ حقہ کی تبلیغ واشاعت کا کام ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم افسوس کے ساتھ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ امانت (مقامِ دعوت و تلقین یعنی مقامِ خلافت) ہم نے بارہا دُنیا کے عوض بکتی دیکھی ہے۔ اور جب یہ بکنے لگے گی تو دین اور تلقین وارشاد کا کون سا فریضہ ادا ہو گا؟

---

[1] (مشکوٰۃ المصابیح، ج ۱، ص ۷۶، نور الایضاح، ص ۶)

اب ہم خلافت کی اقسام کو بیان کرتے ہیں:

خلافت کی دو اقسام ہیں

۱۔ مقید خلافت   ۲۔ مطلق خلافت

خلافتِ مقید

خلیفہ مقید وہ ہوتا ہے جو اپنے مُرید کو جذب کی کیفیت تک پہنچا سکے۔ البتہ خلیفۂ مقید وساوسِ شیطانی اور محبتِ دُنیا سے مکمل طور پر محفوظ نہیں ہوتا۔ وہ جب کسی مسلمان کو بیعت کرتا ہے تو پہلے خوب استخارے کرتا ہے اور مُرید سے بھی استخارہ کرواتا ہے۔ تب اُسے بیعت کرتا ہے، پھر جب اس کے مُریدین میں سے کوئی جذب و سلوک طے کر لے اور اس کی استعداد اعلیٰ ہو تو چاہیئے کہ ایسا مقید خلیفہ اپنے مُرید کو اپنے سے کسی بہتر شیخ سے کسب کرنے اور مقاماتِ اعلیٰ کے حصول کی اجازت دے دے۔ لیکن آج کے دور میں کون ایسا شیخ ہو گا جو اپنے نقص کو تسلیم کرے گا یا اپنے آپ کو مقید کہے گا؟ حالانکہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اپنے لئے عاجزی وانکساری کے کون کون سے الفاظ استعمال نہیں کیے؟

آج کے دور میں لوگوں کے دین سے دور ہونے میں جہاں اور کئی وجوہات ہیں وہیں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مشائخ کرام خود بھی علمی اور عملی سطح پر دِین سے دور چلے گئے ہیں۔ ضروریاتِ دین اور دعوت وارشاد جیسے اہم کاموں کو پسِ پُشت ڈال دیا گیا ہے اور غیر ضروری رسموں کو دین وتصوف بنادیا گیا ہے۔ ایسے مشائخ اپنے مُریدین کو زر خرید غلام تصور کرتے ہیں۔ نہ تو اُن کی باطنی تربیت وترقی کے اوصاف رکھتے ہیں اور نہ ہی سچ بات زبان پر لاتے ہیں۔ ایسے لوگ پتہ نہیں کل آقائے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اور مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو کیسے منہ

دکھائیں گے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں ہدایت عطا فرمائے اور ایمان کی سلامتی نصیب فرمائے۔ اور آمین کہنے والوں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے، آمین۔

خلافتِ مطلقہ

خلیفۂ مطلق وہ ہوتا ہے جس کے دل سے وساوسِ شیطانی اور محبتِ دُنیا محو ہو جائیں۔ اور وہ خدمتِ اسلام کے لئے کمر باندھ لے۔ ایسا شخص بغیر استخارے کے بھی لوگوں کو بیعت کر سکتا ہے، لیکن استخارہ کرنا افضل ہے۔

[ایک اور عرض یہ ہے کہ کتاب نفحات الانس (مصنفہ حضرت مولانا جامی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس) میں حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات میں آیا ہے کہ "عین نمی ماند، اثر کجا ماند" (عین باقی نہیں رہتا تو اثر کیسے باقی رہ سکتا ہے) لَاتَبْقِیْ وَلَاتَذَر آتش عشق کسی شے کو باقی نہیں چھوڑتی۔ یہ بات پہلی نظر میں تو مشکل محسوس ہوئی۔ کیونکہ حضرت شیخ محی الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے متبعین اس بات پر ہیں کہ کسی معلوم چیز کا اللہ تعالیٰ کے معلومات میں سے زائل ہو جانا محال ہے۔ ورنہ واجب تعالیٰ کے لئے علم کے بجائے جہل لازم آئے گا، اور ذات ہی نہ ہو تو اثر کہاں جائے گا۔ اسی طور پر یہ بات ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کلام کے مفہوم کا عقدہ حل نہیں ہو رہا۔ لیکن کامل توجہ کے بعد حق تعالیٰ نے اس کلام کا راز بھی منکشف کر دیا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ نہ ذات رہتی ہے اور نہ اثر۔ اور میں نے اپنے اندر بھی یہی معنی پایا، اور کوئی مشکل باقی نہیں رہی۔ اس معرفت کا مقام بھی دکھائی دیا۔

یہ نہایت ہی بلند مقام ہے جو حضرت شیخ اور ان کے متبعین کے بیان سے بھی اُونچا ہے۔ یہ دو باتیں باہم مختلف اور متناقض نہیں بلکہ دونوں الگ الگ جگہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو تفصیل سے بیان کرنا طوالت اور رنج و ملال کا باعث ہے۔]

تشریح

حضرت شیخ محی الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات ذاتیہ کا زائل ہونا محال ہے اور حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ جب اصل باقی نہیں رہتا تو اس کا اثر کیسے باقی رہ سکتا ہے، اب دونوں فقراؑ کے درمیان اشکال پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ میں حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بات کو تسلیم کرتا ہوں مگر حضرت شیخ محی الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بات سے بھی انکار نہیں کرتا۔ چونکہ حضرت شیخ محی الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر صفات ذاتیہ سے فیض آتا تھا اس لئے اُن پر ابتدائی فنا کی کیفیت تھی اور حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر شیونات ذاتیہ سے فیض آتا تھا اس لئے اُن پر فنا مطلق کی کیفیت تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ میں حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بات کو بھی تسلیم کرتا ہوں مگر اس مقام سے عبور کرنا ضروری ہے اگر عبور نہ کیا تو پھر سالک **انا الحق** اور **سبحانی ما اعظم شانی** کہے گا اس لئے اس طرح کی کیفیت رکھنے والے سالک کے بدن میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات منتشر ہوتی ہیں، کیونکہ اس کا ایمان مشاہدے میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کو ہر چیز میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نظر آتا ہے اور جب اس مقام سے عبور کر لیتا ہے تو پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو بندے سے جدا دیکھتا ہے یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو اپنا پروردگار دیکھتا ہے اور بندہ کو بندہ۔

[اور حضرت شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس بات کے دوام اور ہمیشگی کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایاہے اس کا بھی پتہ چلا کہ بات سے کیامراد ہے اور دَوام سے کیامراد ہے۔ اور اپنے اندر بھی یہ کیفیت دائمًا محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بات نوادرات سے ہے۔

ایک گزارش یہ ہے کہ کتاب دیکھنے کو طبیعت بالکل نہیں چاہتی۔ ہاں اکابر کے مقامات و مراتب عالیہ اگر کسی جگہ درج ہوں تو انہیں دیکھنے سے طبیعت بہت خوش ہوتی ہے۔ مشائخ متقدمین کے حالات بڑے مرغوب ہیں۔ حقائق و معارف سے متعلق کتابیں علی الخصوص توحید اور تنزلات مراتب سے متعلق مضامین کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ بندہ اپنے آپ کو اس باب میں حضرت شیخ علاؤ الدولہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بہت مناسبت پاتا ہے۔ اور اس مسئلہ میں ذوق وحال کے اندر شیخ مذکور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے متفق ہے لیکن اس سلسلہ میں سابق علم اس کام کی طرف اور اس بارے میں شدت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔]

تشریح

حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبند اور حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم فرماتے ہیں کہ جس سالک کو دوم فنا (فناءِ مطلق) حاصل ہو جائے تو اس پر تجلیات، شیوناتِ ذاتیہ دائمی ہو جاتی ہیں اور اس کی حالت، کیفیات اور اذکار بھی دائمی ہو جاتے ہیں یعنی وہ دوسرے سالکوں کی طرح نہیں ہوتا کہ ان کے اذکار و لطائف کبھی چلتے ہوں اور کبھی بند ہو جاتے ہوں۔

اس کے برعکس عام لوگ جب کسی پیر سے بیعت کر لیتے ہیں تو کفر و اسلام میں تو فرق کر نہیں کر سکتے مگر پہلے دن سے ہی اپنے پیر سے یہ تقاضا شروع کر دیتے ہیں کہ مجھ پر کچھ توجہ فرمائیں کہ میری حالت، کیفیات اور اذکار دائمی ہو جائیں چونکہ ایسا سالک تصوف سے بے خبر ہوتا ہے اس لئے ایسے

تقاضے کرتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے کہ یہ کیفیت نوادرات میں سے ہے، نادر کا مطلب ہے کبھی کبھار اور مراد یہ ہے کہ لاکھوں اولیاء اللہ میں سے کوئی ایک اس کیفیت سے مشرف ہوتا ہے۔

[دوسری گزارش یہ ہے کہ بعض امراض کے دفع کرنے کی توجہ کی گئی اور اس کا اثر بھی ظاہر ہوا۔ اسی طرح بعض فوت شدگان جو عالمِ برزخ سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے حالات بھی ظاہر ہوئے۔]

تشریح

تصوف کی کچھ حالتیں پہلے بیان ہو چکی ہیں اب اُن کے علاوہ کچھ کیفیات بیان کی جارہی ہیں تاکہ سالکین کو بھی اور دوسرے لوگوں کو بھی پتہ چلے کہ تصوف میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی کون کون سی برکات پوشیدہ ہیں۔

اول: صاحبِ توجہ کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تصرف کی ایسی طاقت عنایت فرماتا ہے کہ وہ اس طاقت سے لوگوں کی بیماریاں سلب کر لیتا ہے اور اُن بیمار لوگوں کو شفا مل جاتی ہے لیکن صاحبِ توجہ پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کی جسمانی بیماریوں پر زیادہ توجہ نہ دے بلکہ قلب کے امراض کو رفع کرنے کے لئے توجہات کرے تاکہ لوگوں کے دلوں میں کفر، شرک، ریا، کذب اور دوسرے گناہوں کی بیماریاں دور ہوں تاکہ وہ حقیقی معنوں میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی پیروی کر سکیں بہر حال جسمانی بیماریوں میں بھی توجہ تاثیر رکھتی ہے اور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دوم: حالاتِ قبر، قلبِ انسان اور عرش اللہ عالمِ برزخ میں شامل ہیں۔ تصوف میں وہ لوگ جن کی اَرواح قوی ہوتی ہیں انہیں قبر اور قلب وغیرہ کے حالات سے بھی آگاہی بخشی جاتی ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فوت شدہ لوگوں کے حالات سے مطلع ہونے کی بات کی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ صوفی کے اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم اور اُس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ صوفیاء حالات پر اپنی گرفت کا دعویٰ نہیں کیا کرتے بلکہ ہر کام کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مرضی کے تابع خیال کرتے ہیں دوسری طرف نجومیوں اور کاہنوں نے بورڈ لگا رکھے ہیں کہ آئیں ہم آپ کی ہر تمنا پوری کریں گے۔(**نعوذ باللہ من ذٰلک**) انسان کے چاہنے سے کیا ہوسکتا ہے جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی نہ چاہے۔

کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَمَاتَشَاءُونَ إِلَّآ أَنْ يَشَاءَاللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (التکویر ۲۹)

ترجمہ: اور تم کیا چاہو مگر یہ کہ چاہے اللہ جو سارے جہان کا رب۔

پس اگر صوفی بھی اس طرح کے دعوے کرنے لگیں تو پھر نجومیوں اور صوفیوں میں کیا فرق رہے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ایسے حالات کو صوفی کے کشف وشہود یا خواب میں ظاہر کرے تو چاہیئے کہ ایسے حالات کے بیان میں کذب اور کمی بیشی نے کرے بالخصوص خواب کے بارے میں کہ اس سے کُفر کا خطرہ ہے۔

حضرت خواجہ عبداللہ انصاری ہروی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ وہ صوفی پیر بننے کے لائق نہیں جو اپنے مُرید کی باطنی کیفیات پر مطلع نہ ہوسکے۔ یعنی وہ یہ فرق نہ کرسکے کہ مُرید ہونے کے ارادے سے آنے والا مسلمان بھی ہے یا اسلام کا لبادہ اوڑھے کافر ہے۔ اور واقعی سلوک کا شوق رکھتا

ہے یا حصولِ دُنیا کا خواہش مند ہے۔ پس کامل شیخ اپنے مُرید کے قلب کے ارادہ پر منکشف ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ چیز میسر نہ ہو تو وہ پیر بننے یا پیر کہلانے کا مستحق نہیں۔

[ان کے عالمِ برزخ کے آلام وشدائد کے رفع کرنے کے لئے توجہ کی گئی۔ لیکن اب توجہ پر قدرت نہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ آج کل میں کسی ایک کام پر بھی اپنے آپ کو جمع اور حاضر نہیں کر سکتا۔ لوگوں کی کچھ سختیاں فقیر پر گزری ہیں اور مجھے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے۔ اور مجھ سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کو ناحق خرابی وبربادی میں ڈالا ہے اور جلاوطن کیا ہے۔ اس کے باوجود دل پر اس سے ذرا سا غبار یا بے چینی تک محسوس نہیں ہوئی۔ دل میں ان کے متعلق برائی کا گزرنا تو بہت دور ہے۔

بعض دوستوں نے اس مقامِ جذبہ سے شہود ومعرفت حاصل کی ہے لیکن اب تک انہوں نے سلوک میں قدم نہیں رکھا۔ ان کے کچھ حالات بھی عرض خدمت کیئے ہیں۔ اُمید ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ جذبہ کے پہلو کی تکمیل کے بعد انہیں دولت سلوک سے بھی مشرف کرے گا۔]

تشریح

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے یہاں پر اپنی زندگی میں پیش آنے والی چند پریشانیوں کا ذکر کیا ہے حالانکہ اگر آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بہت زیادہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جن کا فرداً فرداً ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مختلف قسم کے حالات ومصائب کے پیش آنے کے باوجود آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دینِ حق پر ثابت قدم رہے اور ساری مصیبتوں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے جان کر برداشت کیا۔ البتہ ایسی مشکلات طبعی طور پر انسان پر اثر انداز ضرور ہوتی ہیں

اور ایک قسم کی بے چینی محسوس ہوتی ہے، جس کی طرف آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہاں اشارہ کیا ہے۔

پس حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو ماننے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تقلید کو اپنے اوپر لازم کریں اور حالات سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ کسی شخص سے تکلیف پہنچے تو عفو ودر گزر سے کام لیں۔ حقوق اللہ کی ادائیگی تو ضروری ہے ہی مگر اس سے کہیں زیادہ ضروری حقوق العباد ہیں اور ہم نے تو تصوف کو صرف نماز وروزہ میں مقید کر دیا ہے۔ جبکہ والدین، بہن، بھائی، دوست واحباب اور پڑوسیوں کے ساتھ ہمارا رویہ تصوف کی تعلیمات اور اولیاء کرام کی زندگیوں کے سراسر مخالف ہوتا ہے۔ پیر صاحب جن کو مریدین کے لئے عملی نمونہ ہونا چاہیئے وہ مریدین سے صرف اس لئے ناراض ہو جاتے ہیں کہ اس نے ہماری خدمت نہیں کی۔ حالانکہ ایسے اخلاق، مشائخ یا خلیفہ مقید کو بھی زیب نہیں دیتے، خلیفۂ مطلق کی تو بات ہی نہ کریں کہ وہ تو تقویٰ کی عملی صورت ہوتا ہے۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هَذَا وَيُعْرِضُ هَذَا وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ۔[1]

ترجمہ: حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے کسی بھائی سے تین دن سے

[1] (صحیح البخاری، ج ۱۹، ص ۲۲، المکتبۃ الفاروقیۃ)

زیادہ کے لئے تعلق توڑے۔ اس طرح کہ جب دونوں کا سامنا ہو جائے تو یہ بھی منہ پھیر لے اور وہ بھی منہ پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ حدیث نقل کرتے ہیں: کہ ایک دوسرے قطع تعلق مت کرو، اگر ایسا کرنا ہی ہو تو تین دن سے زیادہ نہ ہو اور جو دو مسلمان اس قطع تعلق کی حالت میں مَر جائیں گے وہ جنت میں اکٹھے نہیں ہوں گے۔

پس چاہیئے کہ اول تو ناراض ہی نہ ہوں اور اگر ایسی صورتِ حال پیش آجائے تو تین دن کے اندر صلح کرلیں اور اگر آپ نے اپنی طرف سے تو صلح کرلی لیکن فریقِ مخالف راضی نہیں ہونا چاہتا تو اس کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوگی۔ پھر بھی چاہیئے کہ جب وہ سامنے آجائے تو آپ اُسے سلام کہہ دیں شاید اس سے اُس کے دل کا حسد و کینہ ختم ہو جائے۔

دوسری اہم بات جو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے بیان فرمائی کہ بعض سالکین نے جذبہ کا حصول تو کرلیا ہے مگر ابھی تک انہوں نے سلوک میں قدم نہیں رکھا تو اس کا بیان مندرجہ ذیل ہے۔

جذبہ اور سلوک میں فرق

جذبہ: جذبہ وہ شوق ہے جس کی وجہ سے مرید اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور نماز وروزہ، ذکر واذکار اور عبادت میں کوشش کرتا ہے۔ ایسا شخص جذبہ والا صوفی کہلاتا ہے۔

سلوک: سلوک یہ ہے کہ ایک شخص کسی کامل و مکمل ولی اللہ سے بیعت کرنے کے بعد شریعت غرا أحمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر دل وجان سے عمل کرے اور جذبہ کو طے کرنے کے بعد باطنی مقامات کو طے کرے۔ ایسا شخص صاحبِ سلوک کہلاتا ہے۔

پس ہر مُرید کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے فرائض، واجبات اور سُنت و مستحبات کا جذبہ پیدا کرے، پھر لطائف باطنی کی طرف متوجہ ہو۔ لوگ نماز وروزہ اور دیگر فرائض کو تو اہمیت نہیں دیتے لیکن لطائف (قلب، رُوح، سِر، خفی، اخفیٰ، نفسی اور قالبی) کے تقاضے کرنے لگتے ہیں یا پھر بیعت کو رَسم سمجھ کر ادا کر لیتے ہیں اور پھر شریعت کے احکام سے بے خبر ساری زندگی یونہی گزار دیتے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اگر کسی مُرید میں جذبہ ہی نہ ہو اور اس کا شیخ مُرید کو عالمِ اَمر اور عالمِ خلق طے کروادے تو اس سے مُرید کو کیا خاک فائدہ ہو گا؟ بلکہ یہ تو مُرید کے ساتھ دھوکا ہو گا۔ اور اس کی مثال یوں ہو گی کہ کسی بچے کو حروفِ ہجا تو آتے ہی نہ ہوں اور اُسے قرآن عظیم الشان کی تلاوت و ترجمہ پر لگا دیا جائے۔ اور ان ساری غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو مشائخ مکتوبات شریف کو پڑھ کر عمل کرتے ہیں اور نہ ہی مُریدین اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

[شیخ نور اسی مقام میں بند ہے۔ نقطۂ فوق تک جو مقام جذبہ سے تعلق رکھتا ہے ابھی تک نہیں پہنچا، حرکات و سکنات سے آزار دیتا ہے۔ خرابی اور قباحت کو محسوس نہیں کرتا تو بے اختیار اس کا کام توقف اور رکاوٹ کا شکار رہتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے دوست بھی جو آداب کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے ان کا کام بھی توقف میں پڑا رہتا ہے۔ اس بارے میں حیران ہے کہ میری طرف سے کوئی ارادۂ توقف نہیں، بلکہ ان کی ترقی کا ارادہ ہے۔ بے اختیار کام میں رکاوٹ واقع ہو جاتی ہے، ورنہ قُرب کا راستہ بہت قریب ہے۔

مولانا معہود نیچے کے نقطہ تک پہنچ چکے ہیں۔ جذبہ کے کام کو انجام تک پہنچا دیا ہے۔ اور اس مقام کی برزخیت تک پہنچ گئے ہیں، اور فوق کو بھی من وجہ نہایت تک لے گئے ہیں۔ پہلے تو صفات کو

بلکہ اس نور کو جس کے ساتھ صفات قائم ہیں اپنے سے جدا محسوس کیا اور اپنے آپ کو شیخ فانی پایا۔ پھر صفت کو ذات سے جدا دیکھا اور اَحدیت کی اس دِید کے ذریعے مقام پر پہنچے۔]

تشریح

شیخ نور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے مُرید تھے جو کہ اُس وقت تک مقامِ جذبہ سے سلوک میں داخل نہیں ہو سکے تھے، ہمارے بعض دوستوں نے ساری عمر جی بھر کر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے احکامات کی نافرمانی کی ہوتی ہے پھر جونہی وہ کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو تھوڑے ہی عرصہ بعد اپنے پیر سے خود کو سلوک میں داخل کرنے کا تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ شیخ نور جذبے کے آخری نقطے تک پہنچ جائے اور سلوک میں داخل ہو جائے مگر وہ بے ادبی کرتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا باطنی سبق تبدیل کریں، فلاں کا سبق تبدیل ہو گیا ہے جبکہ میرا نہیں ہوا، فلاں مجھ سے بعد میں آیا تھا وہ آگے نکل گیا ہے میں پیچھے رہ گیا ہوں وغیرہ۔ شیخ نور کی طرح اور بہت سے دوست بھی جو آداب کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے ان کا کام بھی توقف کا شکار ہے اور میرے ذہن پر بھی بوجھ ڈالتے رہتے ہیں۔ حالانکہ میری طرف سے اُن کے اس مقام میں ٹھہرے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا بلکہ میرا ارادہ تو ان کی ترقی کا ہوتا ہے۔ لیکن بے اختیار اُن کے کام میں رُکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ ورنہ قُرب وسلوک کا راستہ تو بہت قریب ہے۔

تصوف سے ناواقف لوگوں میں جہاں اور بہت سی بے بنیاد باتیں مشہور ہیں، وہیں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ فلاں پیر صاحب نے اپنے خلیفہ سے خلافت چھین لی یا کسی ولی اللہ سے ولایت چھین لی گئی تو اس سلسلہ میں تصوف کے قوانین کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اگلے مکاتیب میں ولایت کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل فرمایا ہے۔

ذَلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیہِ مَنْ یَشَاءُ (الجمعة ۴)

ترجمہ: یہ (ولایت) اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے۔

اور حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ:

اللَّهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ۔[1]

ترجمہ: اے اللہ! جسے تو عطا کرے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے منع کر دے اُسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی بڑے کی بڑائی کوئی نفع نہیں دے سکتی۔

پس جس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنا فضل کرے اور اُسے اپنا دوست بنالے اُسے کوئی دوسرا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی دوستی سے کیسے جُدا کر سکتا ہے اور وہ خود کیسا ولی اللہ ہے جو دوسروں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دور کرنے کی سازشوں میں مصروف ہو، ولی اللہ تو وہ ہوتا ہے جس کی شان یہ ہو کہ وہ گمراہ اور بے دین کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دین کی طرف بلائے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دور بھاگنے والوں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے وصل کر دے۔

چنانچہ حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مثنوی شریف میں فرمایا ہے کہ:

ما برای وصل کردن آمدیم　　　　نہ برای فصل کردن آمدیم

---

[1] (صحیح البخاری، ج۳، ص ۳۴۸، المکتبۃ الفاروقیۃ)

ترجمہ: ہم (اولیاء کرام) لوگوں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دور کرنے نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ وصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔

اور وہ جو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے کہ یہ بزرگ جس طرح نسبت کے عطا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اسی طرح نسبت کے سلب کرنے کی بھی قدرت رکھتے ہیں تو اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ وہ ایسا کر گزرتے ہیں۔(**نعوذ باللہ من ذٰلک**) بلکہ یہ سلب ابتدائی کیفیت کا سلب ہے اور اولیاء کرام یہ سلب بھی نہیں کرتے۔ ہاں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے ایک قدرت کا عطا ہونا امر دیگر ہے اور اس قدرت کا استعمال دیگر امر ہے۔ کیا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو دُنیا وآخرت کے خزانے عنایت نہیں فرمائے تھے۔ یقیناً فرمائے تھے بلکہ یہاں تک فرما دیا تھا کہ اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اگر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم چاہیں تو ہم اُحد کے پہاڑ کو سونا بنا دیں اور جدھر جدھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم چاہیں تو یہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے پیچھے پیچھے چلے۔

لیکن ایسی دنیا پر طاقت رکھنے کے باوجود آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے تصرف نہ فرمایا بلکہ فقر کو اختیار فرمایا تو وہ کون سا ولی اللہ ہو گا جو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے اخلاق حسنہ کے خلاف کرے گا اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عنایات کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق کے خلاف استعمال کرے گا۔ پس ثابت ہوا کہ نہ تو خلافت چھن جانے والی نعمت ہے اور نہ ہی ولایت۔ ہاں اگر یہ چھینی جاتی ہے تو اُس شخص سے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اُس کے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے لگے اور پھر توبہ بھی نہ کرے۔ اور ایسے شخص سے ولایت

کے واپس کرنے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے کسی بندے کا محتاج تھوڑا ہی ہے۔ جب وہ دیکھے گا کہ میرا ایک مقرب بندہ میرے احکامات کی خلاف ورزی کرنے لگ گیا ہے تو وہ خود ہی اُسے اپنے سے دور کر دے گا۔ کسی دوسرے کی کیا مجال؟

اب ہم پھر اصل بات کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو سالک جذبہ طے کر کے سلوک میں داخل ہوتا ہے تو اُس کی باطنی رسائی صفات کے اصل تک ہو جاتی ہے اور اُس کے مقامات شروع ہو جاتے ہیں اور اگر مقامات شروع نہ بھی ہوں لیکن وہ جذبے کے آخری نقطہ تک پہنچ چکا ہو تو اُس پر صفاتِ ذاتیہ سے فیض آنا شروع ہو جاتا ہے اور وہ کیفیات کا مشاہدہ اپنے وجود میں کرنے لگتا ہے جیسا کہ مولانا معہود کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ پس جو صوفی متلون المزاج (مغلوب الحال) ہو اُس پر جب صفات کی تجلی پڑتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ہی خدا سمجھنے لگتا ہے۔ (**نعوذ باللہ من ذٰلک**) جیسے حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مثال ہے۔ جن پر تجلیٔ صفات پڑی تو بے خودی کے عالم میں اُن سے انا الحق کا کلمہ نکل گیا۔ اور جس سالک پر ایسی کیفیات طاری ہونے لگیں اُسے اپنے شیخ کی رہنمائی کی اشد ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ اپنے مرید کے لئے توبہ و استغفار کرے اور مُرید خود بھی کثرت سے استغفار کرے اور اپنے ہر عمل کو قاصر سمجھے تاکہ شیطان کے بہکاوے میں نہ آجائے۔

[اب میرے حال اور اپنے حال کو اس قدر گم کر چکا ہے کہ نہ احاطہ کا قائل ہے اور نہ معیت کا۔ خیال کو اَبطن بُطون (مرتبۂ وحدت صرفہ) کی طرف متوجہ کر لیا ہے کہ حیرت اور نادانی کے سوا کچھ ہاتھ میں نہیں رکھتا۔]

تشریح

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اپنے ایک مرید کے بارے میں فرمایا کہ وہ نہ تو احاطہ کا قائل ہے اور نہ ہی معیت کا۔ یعنی اُس پر حیرت، یاس اور نادانی کی کیفیت طاری ہے۔ کیونکہ صوفی کائنات کا مشاہدہ تو کر لیتا ہے لیکن جب صفات کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو حیرت و یاس اور نادانی میں چلا جاتا ہے، اپنی کیفیات کا احساس تو کرتا ہے لیکن بیان نہیں کر سکتا۔ اس مقام میں اثر بھی ہوتا ہے اور صفات بھی۔ کبھی اُس سے صفات غائب ہو جاتی ہیں لیکن صفات کا اثر باقی رہتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد اُن کا اثر بھی غائب ہو جاتا ہے اور یاس و نا اُمیدی رہ جاتی ہے اور وہ صوفی صفات کے اثر کے ختم ہونے پر اُداس و پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ میرے ساتھ کیا معاملہ درپیش ہے۔ چاہیئے کہ سلوک طے کرنے والے مُریدین اس سارے عمل کے ساتھ اپنی کیفیات کا موازنہ کریں۔ بعض مُریدین ہم سے شکایت کی صورت میں عرض کرتے ہیں کہ حضرت صاحب! پہلے میرے لطائف چلتے تھے لیکن اب ان کا احساس نہیں ہوتا اور ہم اشارۃً انہیں کہہ دیتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ آپ کے لطائف کو چلائے۔ کیونکہ اگر ہم اُن سے کہیں کہ آپ تو اب تک تصوف سے ہی ناواقف ہیں تو وہ شاید اس بات سے ناراض ہو جائیں گے کیونکہ اگر وہ جانتے کہ جب صوفی آخری مقامات تک واصل ہوتا ہے تو اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے، تو ایسی شکایت زبان پر نہ لاتے۔

اسی لئے ہم بھی مشائخ کبار کے تعلیمات کے مطابق اس بات کے قائل ہیں کہ تصوف سے پہلے حصول علم انتہائی ضروری ہے اور اگر تصوف سے پہلے یہ فرض پورا نہیں کیا تو کم از کم دورانِ تصوف تو شریعت و طریقت کو علماً و عملاً سیکھا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی صوفیانہ درس میں شرکت بھی ضروری ہے کہ ایک تو صحبتِ شیخ نصیب ہوتی ہے اور دوسرے علم بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

[اور سید شاہ حسین بھی مقامِ جذبہ کے ذریعہ آخری نقطہ تک پہنچ گیا ہے اور ان کا سِرّ آخری نقطہ تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح صفات کو ذات سے جدا دیکھا۔ لیکن ذاتِ اَحد کو ہر جگہ پاتا ہے اور ظہور سے محفوظ ہوتا ہے۔]

تشریح

جذبہ کا آخری نقطہ ولایتِ کبریٰ میں ہے اور ولایتِ کبریٰ سے مشرف ہونے والا وہ خوش نصیب سالک ہوتا ہے جو وحدت الشہودی کیفیت رکھتا ہے اور وحدت الشہود میں سالک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو صفات سے جدا اور ذاتِ بحت کو صفات سے جدا دیکھتا ہے لیکن اس پر کسی وقت وحدت الوجودی کیفیت بھی عود کر سکتی ہے اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے سید شاہ حسین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ "ذاتِ احد کو ہر جگہ پاتا ہے" اور ذاتِ اَحد کو ہر جگہ وہی پاتا ہے جو وحدت الوجودی کیفیت کا حامل ہو۔

[اسی طرح میاں جعفر بھی آخری نقطہ کے قریب پہنچ چکا ہے اور بہت شوق وولولہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی شاہ حسین کے قریب ہے۔ دوسرے دوستوں میں بھی فرق وتفاوت ظاہر ہوتا ہے۔ میاں شیخی اور شیخ عیسیٰ اور شیخ کمال جذبہ میں نقطۂ فوق تک پہنچ گئے ہیں۔ شیخ کمال بھی نزول کی طرف متوجہ ہے۔ اور شیخ ناگوری بھی نقطۂ فوق کے نیچے آ چکا ہے، لیکن ابھی کافی مسافت درپیش ہے۔ اور اس جگہ کے دوستوں میں سے اس وقت تک آٹھ یا نو بلکہ دس افراد نقطۂ فوق کے نیچے آ چکے ہیں۔ بعض نقطہ سے واصل ہو چکے ہیں اور نزول کی طرف رُخ کر چکے ہیں۔ اور کچھ قریب ہیں اور کچھ ابھی دور ہیں۔]

تشریح

بعض سالکین اپنے تعین وجوبی کے ادراک کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور جب اُن کا تعینِ وجوبی ہو جائے تو وہ دعوتِ خلق الی اللہ کے لئے نزول کرتے ہیں لیکن جو صوفی راستۂ فوق کا سالک ہو اور اس کا تعینِ وجوبی نہ ہو اس کا کشف اہلِ سنت و جماعت کے عقائد کے مخالف واقع ہوتا ہے۔ جیسے حضرت محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو نقطۂ فوق تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس لئے وہ اور اُن کی اِتباع کرنے والے کہتے ہیں کہ ہم نے کشف میں دیکھا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں۔ اور اس قول کی وجہ یہ ہے کہ اُنہیں کشف میں غلطی ہوئی جس کی وجہ سے صفات اور ذات میں فرق نہ کر سکے۔

جبکہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اور اُن کے سلسلے کے سالک اپنے کشف میں دیکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ الگ ہے اور صفات الگ ہیں اور یہ کیفیت اُس شخص کی ہوتی ہے جو آخری نقطہ تک پہنچ جائے۔

پس ان مقامات کے حصول سے پہلے ان کے بارے میں علم کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کے موافق کیفیات پر نکتہ چینی نہ کر سکے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر عرب کے علماء نے کُفر کا فتویٰ ہی اس وجہ سے لگایا تھا کہ وہ علماء ان مقامات و کیفیات سے لاعلم تھے اور یہ فرق نہیں کر سکے تھے کہ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو باتیں ظاہر کر رہے ہیں اُن کا تعلق محض ان کے کشف سے ہے، لیکن ان کا عقیدہ یوں نہیں ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اولیاء کرام کی محبت واتباع نصیب فرمائے اور ان پاک لوگوں پر اعتراض کرنے کی غلطی سے محفوظ رکھے، آمین۔

[میاں شیخ مزمل اپنے کو گم پاتا ہے اور صفات کو اصل سے دیکھتا ہے۔ اور مطلق کو تمام جگہوں میں پاتا ہے، اور اشیاء کو سراب کی طرح بے اعتبار جانتا ہے۔ بلکہ کچھ بھی نہیں پاتا۔

مولانا معہود کے متعلق ایسا خیال ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اگر لوگوں کو تعلیم دینا شروع کر دیں تو یہ ایک پسندیدہ بات ہے لیکن وہی اجازت جو مقامِ جذبہ سے مناسبت رکھتی ہے۔ اگرچہ بعض امور ابھی رہتے ہیں ان کا استفادہ اور حصول ہونا چاہیئے۔ لیکن اس نے جانے میں جلدی کی، توقف نہ کیا۔ حضور اقدس کی خدمت میں آرہا ہے، جو مناسب جانیں اس کا حکم فرمادیں۔ اس کمینہ کے علم میں جو کچھ تھا عرض کر دیا ہے۔ اصل حکم آپ کا ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے مرید مولانا معہود کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں نے اُن میں لوگوں پر توجہ کرنے کی لیاقت دیکھ کر پہلی قسم کی خلافت دینے کا ارادہ کیا تو وہ اس سے پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو گئے اس لئے میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔

بعض سالکین ابھی تکمیل کے مراحل سے فارغ نہیں ہوئے ہوتے لیکن لوگوں کو توجہات کے ذریعے احکام شریعت کی طرف مائل کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں اس لئے مشائخ انہیں توجہ کی خلافت عنایت فرما دیتے ہیں تاکہ وہ عوام الناس کو تعلیمِ طریقت دے سکیں اور ایسی خلافت کا تعلق مقامِ جذبہ سے ہے نہ کہ مقامِ سلوک سے۔ کیونکہ ان کے سلوک کے بعض مراحل ابھی طے نہیں ہوئے ہوتے اور ان ہی کی طرف حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے بعض اُمور اور استفادہ اور حصول کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے یہ مکتوب شریف تحریر فرمایا اُس وقت آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خلیفہ ٔمقید تھے، نہ کہ خلیفہ ٔمطلق۔ اور خلیفہ ٔمقید اپنے مُریدین کے افکار تبدیل کرنے اور اُنہیں خلافت دینے میں اپنے شیخ کے مشورے اور اجازت کا پابند ہوتا ہے۔ جبکہ خلیفہ ٔمطلق کے لئے اپنے شیخ سے اجازت لینا ضروری نہیں ہوتا، تاہم اگر وہ ان امور میں اپنے پیر و مرشد سے اجازت و مشورہ لے تو اچھی بات ہے۔

[خواجہ ضیاء الدین محمد چند روز یہاں رہے۔ قدرے حضور اور جمعیت قلب پیدا کر لی تھی۔ آخر کار اسباب معاش کی قلت کی بناء پر یہاں رہنے میں اپنا خاطر جمع نہ رکھ سکے اور فوج کی ملازمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مولانا شیر محمد کا لڑکا بھی ملازمت کی طرف میلان رکھتا ہے۔ قدرے حضور جمعیت قلب اسے بھی حاصل ہے۔ بعض رکاوٹوں کے باعث خاص ترقی نہیں کر سکا۔ زیادہ گفتگو گستاخی ہے۔

بندہ باید کہ حد خود داند

ترجمہ: غلام کو اپنی حد کے اندر رہنا چاہیئے۔]

تشریح

ایسے مُریدین جو سلوک پر دُنیاوی کاروبار کو ترجیح دیتے ہوں اُن کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس میں شیخ کا کوئی قصور نہیں ہوتا اس لئے آداب کا تقاضا ہے کہ ایسا مُرید اپنے شیخ پر نقطہ چینی اور اعتراض نہ کرے کہ میری ترقی نہیں ہو رہی بلکہ چاہیئے کہ ہمیشہ کی زندگی کے لئے کوشش کرے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا والے کام کرے تا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اُسے اپنا قُرب نصیب فرمائے۔

[اس عرض داشت کے بعد ایک اور کیفیت رونما ہوئی، اور ایک حال پیش آیا۔ تحریراً جس کے بیان کی گنجائش نہیں ہے۔ اس جگہ ارادے کی فنا متحقق ہوئی۔ جس طرح سابقاً مرادوں سے ارادے کا تعلق بر طرف تھا ایسا ہی ہوا۔ مگر اصل ارادہ ابھی باقی تھا۔ جیسا کہ عرض داشت میں عرض کیا جا چکا ہے۔ اب ارادے کی بھی بیخ کنی ہو گئی ہے۔ اب نہ تو کوئی مراد ہے نہ ارادہ۔ اور اس فنا کی صورت بھی دکھائی دے۔ اور بعض علوم جو اس مقام سے مناسبت رکھتے تھے وہ بھی فائض اور وارد ہوئے۔ ان علوم کے دقیق اور مشکل ہونے کے باعث چونکہ انہیں تحریر میں لانا مشکل تھا اس لئے اشہب قلم کی باگ ان علوم سے پھیر لی ہے۔ اس فنا کے تحقق اور علوم عطا کیے جانے کے وقت ایک خاص نظر وحدت سے اُوپر بھی پہنچی۔ اگرچہ یہ بات طے شدہ ہے کہ وحدت سے اُوپر کوئی نظر نہیں جا سکتی۔ بلکہ اُس سے اُوپر کوئی نسبت نہیں لیکن بندہ کو جو کچھ پیش آتا ہے عرضِ خدمت کرتا ہے۔ اور جب تک یقین نہ ہوا لکھنے کی جرأت نہ کی۔

اس مقام کی صورت کو وحدت سے اُوپر اس طرح دیکھتا ہے جس طرح آگرہ دہلی سے آگے ہے۔ اور اس راہ میں کچھ شک و شبہ نہیں پاتا۔ اگرچہ نظر میں نہ وحدت ہے نہ اس سے اوپر کوئی شے اور نہ کوئی مقام جسے حقیقت کے عنوان سے جان سکے، یا حق کو اس سے اوپر تصور کرے۔ حیرت و جہل پورے طور پر موجود ہیں، اور دید سے کچھ فرق نہیں پڑا۔ میں نہیں جانتا کہ کیا عرض کروں۔ سب تناقض در تناقض ہے۔ معاملہ گفتگو میں نہیں آسکتا اور حال بے شبہ متحقق اور موجود ہے۔ میں اللہ کے حضور استغفار کرتا ہوں اور قول، فعل، خیال اور نظر میں سے ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے میں اس سے توبہ کرتا ہوں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے پیر بزرگوار میں خدمت میں اپنی کیفیت عرض کر رہے ہیں کہ میں نے وحدت سے اُوپر بھی ایک مقام دیکھا اگرچہ وحدت سے اوپر کوئی مقام ہی نہیں ہے، یہ کیا معاملہ ہے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ورآ الوریٰ ثم ورآ الوریٰ ہے جہاں تک حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے ذہن نے کام کیا وہاں تک پہنچ گئے اور جہاں ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا وہاں حیرت ونادانی اور یاس وناامیدی میں مبتلا ہو گئے اور اس کیفیت کو تحریر میں نہ لا سکے۔

[نیز اس وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ قبل ازیں میں جو صفات کی فنا جانتا تھا وہ در حقیقت صفات کی فنا نہیں بلکہ خصوصیاتِ صفات اور ما بہ الامتیاز کی فنا تھی، جو وحدت میں مندرج تھی، اور خصوصیات زائل ہو جاتی ہیں۔ اب اصل صفات ایک دوسرے میں خلط اور درج ہو کر ایک طرف ہو گئی ہیں۔ اب احدیت کے غلبہ نے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا۔ اور وہ تمیز جو مرتبہ علم اجمالی یا تفصیلی میں حاصل تھی باقی نہیں رہی۔ اور نظر مکمل طور پر خارج پر آچکی ہے۔ اللہ کی ذات تھی اور اس کے ساتھ کچھ نہ تھا۔ اور وہ اب بھی ایسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ اور اب علم حال کے مطابق ہو چکا ہے۔ پہلے اس مضمون کا صرف علم تھا، حال نہیں تھا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ درستی یا خرابی پر متنبہ فرمائیں گے۔

دوسری بات یہ نظر آئی ہے کہ جس طرح مولانا قاسم علی کو مقام تکمیل میں حصہ ہے اسی طرح یہاں کے دوستوں کا حصہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ **واللہ سبحانہٗ اعلم بحقیقۃ الحال۔**]

تشریح

سالک طریقت و حقیقت کی منازل طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علاوہ ہر چیز کی نفی کر دیتا ہے حتیٰ کہ صفاتِ الٰہی بھی اُس سے محو ہو جاتی ہیں، اسی کیفیت کی طرف حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا تھا کہ:

علمِ حق در علم صوفی گم شود　　　این سخن کے باورِ مردم شود

ترجمہ: اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا علم (صفات) صوفی کے علم میں محو اور ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ بات لوگوں کی فہم میں کیسے آئے گی۔

اکثر لوگ بالعموم اور غیر مقلدین بالخصوص حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس شعر کی وجہ سے آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر کُفر کا فتویٰ دے دیتے ہیں لیکن وہ جاہل جو ابھی قال سے بھی پورا واقف نہ ہو وہ حال کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے، سوائے اس کے کہ حال والوں پر کفر کا گمان کرنے لگے، اور ہم اس بات سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

مکتوب نمبر ۱۲

[مقام فنا وبقا کے حصول اور ہر شے کی وجہ خاص کے حصول اور سیر فی اللہ کی حقیقت اور تجلی ذاتی برقی وغیرہ کے بیان میں۔۔۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے مرشد بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:]

تشریح

وہ علوم جو فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مقامات سے متعلق تھے اُنہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی رحمت وعنایت سے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس پر منکشف فرمایا جس سے اُنہیں معلوم ہوا کہ ہر شے کی وجہ خاص کیا ہے اور سیر فی اللہ و تجلی برقی کیا ہے اور محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کون ہوتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت کا نسیان، ماسویٰ کے نسیان کی وجہ سے ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کے انعکاس کی وجہ سے عارف متخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اور عالم قُدس میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فیوضات کے توسط سے وہ عارف صفات تک پہنچتا ہے اور ہر مقام میں لوازم وضروریات کو نمایاں کرتا ہے یعنی ہر مقام کو مفصل طور پر نمایاں کرتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ وہ باتیں جو اولیاء کرام نے اس راہ کے بارے میں بیان کی ہیں ان میں سے بہت کم ایسی باتیں ہوں گی جو مجھ پر منکشف نہیں ہوئیں۔ نیز فرمایا کہ وہ شخص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو گیا جس کا کشف اہلِ سُنت وجماعت کے مطابق ثابت ہوا۔ نیز فرمایا کہ جس طرح اشیاء کی ذوات مخلوق ہیں اسی طرح ان کی قابلیت اور استعداد بھی مخلوق ہے اور کوئی چیز اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر حاکم نہیں ہے۔ اور یہ قول فلاسفۂ یونان کی تردید ہے کیونکہ وہ کہتے

ہیں کہ استعداد حاکم ہے اور اُس کی ذات اپنا بھی تقاضا کرتی ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر یہ بات لازم ہے کہ وہ صاحبِ استعداد کو اس کی استعداد کے مطابق عنایت کرے۔(نعوذ باللہ من ذٰلک)

سیر الی اللہ میں قلب اور رُوح دونوں کوشش میں لگے رہتے ہیں یعنی قلب وروح کا ممکنات کو طے کرکے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تک پہنچنا سیر الی اللہ کہلاتا ہے۔یعنی سالک کا قلب اور رُوح جنت، دوزخ، لوح وقلم اور زمین وآسمان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور یہ ساری مسافتیں طے کرکے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ سارا عمل سیر الی اللہ کہلاتا ہے۔ پس قلب ورُوح کا تعلق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ اور صفاتِ فعلیہ کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ شیونات کا ایک رُخ ممکنات کی طرف اور دوسرا رُخ خارجِ ممکنات کی طرف ہوتا ہے۔ ان سب کی سیروں کو سیر الی اللہ، سیر عن اللہ اور سیر فی اللہ کہتے ہیں۔ سیر فی اللہ سے مراد یہ ہے کہ سالک کی نظر صفاتِ فعلیہ اور ممکنات سے آگے ہو۔

[کم ترین غلام، احمد درگاہِ عالی میں عرض کرتا ہے کہ اپنی تقصیرات کیا عرض کرے جو اللہ نے چاہاوہ ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہو۔ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم]

تشریح

باطنی سیر اور مقاماتِ عالی کے حصول کے دوران صوفی کو وساوسِ شیطانی گھیرے رکھتے ہیں اور خطرات کا باعث بنتے ہیں۔ پس ان خطرات سے بچنے کے لئے ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کا پڑھنا صوفیاء کرام کا مجرب عمل ہے، اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے بھی ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھ کر اس طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

[وہ علوم جو مقام فنا اور بقاباللہ سے تعلق رکھتے تھے حق سبحانہٗ کی مہربانی سے منکشف ہو چکے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر شے کی وجہ خاص کیا ہے۔ اور سیر فی اللہ کس معنی میں ہے۔ اور تجلی ذاتی برقی کسے کہتے ہیں۔ اور محمدی المشرب کون ہوتا ہے؟ اور اسی طرح کے اور علوم]

تشریح

ہر چیز کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا باطنی (اور اس باطنی رُخ کو ہی حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے وجہ خاص سے تعبیر کیا ہے) عوام الناس اور علماء ظواہر صرف ظاہری رُخ کا ہی علم رکھتے ہیں جبکہ دوسرا رُخ جو کہ باطنی رُخ ہے، اس کا علم صرف صوفیاء کرام کا نصیب ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں شلوار کو بیٹھ کر پہننے کی تعلیم دی گئی ہے۔ پس شلوار پہننے کا یہ ظاہری رُخ ہے جس کے باطنی رُخ کا علم نہ ہونے کی وجہ سے شاید لوگ اعتراض کرنے لگیں کہ بیٹھ کر شلوار پہننا تو ہم نے نہ کبھی پڑھا، نہ ہی سُنا لیکن اس کے باطنی رُخ (یعنی وجہ خاص) پر صوفیاء کرام ہی مطلع ہوئے ہیں۔ ایسے دیگر اُمور کا حال ہے اور وجۂ خاص کا علم فنا وبقا پر مشرف ہونے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ (وجۂ خاص کے بارے میں) فنا وبقا پر مشرف ہونے کے بعد مجھے ہر شے کی وجۂ خاص بھی معلوم ہو گئی۔

تجلیٔ ذاتی برقی اُس صوفی پر پڑتی ہے جو صفاتِ ذاتیہ کے اثر سے مستفید ہو چکا ہو۔ اور یہ تجلی بجلی کی طرح اچانک ایک لمحہ کے لئے نمودار ہوتی ہے اسی لئے اسے تجلی برقی کہا جاتا ہے۔ اگر بالفرض یہ تجلی دائمی ہو تو ہر چیز کو جلا کر رکھ دے۔ باقی رہا معاملہ محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم والے صوفی کا تو محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم وہ خوش نصیب سالک ہوتا

ہے جسے شیونِ ذاتیہ میں سے شان العلم سے تربیت دی جائے اور ایسا سالک نادر الوجود ہوتا ہے۔ اور یہ مشرب بھی باقی مشارب پر فضیلت و بزرگی رکھتا ہے۔

[اور ہر مقام میں اس کے لوازم و ضروریات بھی دکھاتے ہیں۔ اور کم ہی ایسی شے باقی رہی ہے جس کا اولیاء اللہ نے نشان بتلایا ہے اور جو انہیں راہ میں پیش آتی ہے مجھے نہ دکھائی گئی ہو۔]

تشریح

تصوف کے لوازمات میں سے ایک لازمی جزو عقائد کی درستگی ہے بلکہ اسے اگر تصوف کی بنیاد کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اور عقائد سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ فقہ اکبر، نور الظلم، ابو المنتہیٰ، ملا علی قاری اور شرح عقائد النسفی کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کتب میں وہی عقائد درج ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اپنے اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو سکھائے اور پھر ہمارے امام صاحب اور مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ عقائد ہمارے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے سیکھ کر کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچائے اس لئے یہی سب سے بہترین اور قابلِ قبول عقائد ہیں۔ لیکن اگر بد قسمتی سے کوئی شخص ان عقائد سے تفصیلاً واقف نہ ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ یوں کہے کہ "وہ عقائد جو ہمارے امام صاحب نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے سیکھ کر قلم بند کئے ہیں، میرا اُن سب عقائد پر ایمان و یقین ہے"۔ تو اس اجمالی عقیدہ کا اُسے ایسا ثواب ہو گا جیسے وہ تمام عقائد پر تفصیلی ایمان رکھتا ہو۔ اور جو سالک ان عقائد کو فقہاء کرام کے طریقے کے مطابق حاصل کرتا ہے اور پھر سلوک کی منازل طے کرتا ہے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان عقائد کو سالک کے کشف و شہود میں بھی ظاہر فرما دیتا ہے۔ اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے جگہ جگہ

ان کے بارے میں اپنی کشفی معلومات بیان فرمائی ہیں جو کہ شریعتِ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے عین مطابق ہیں۔

[جو مقبول ہوتا ہے بلا علت اور بلا سبب ہی مقبول ہوتا ہے۔ اور جس طرح ذواتِ اشیاء کو مجہول و مخلوق جانتا ہے، ان کی اصل قابلیتوں اور استعدادوں کو بھی مصنوع و مخلوق ہی جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ قابلیت کے تابع نہیں۔ اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شے اُس پر حاکم ہو۔ زیادہ گستاخی نہ کی۔

بندہ باید کہ حد خود داند

ترجمہ: بندے کو چاہیئے کہ اپنی حد میں رہے۔]

تشریح

وہ لوگ جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہوتے ہیں وہ بغیر کسی وجہ کے بھی مقبول ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (البقرة ۲۱۳)

ترجمہ: اور اللہ جسے چاہے سیدھی راہ دکھائے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ:

وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ (البقرة ۱۰۵)

ترجمہ: اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے۔

پس ہمارے اعمال تو ایسے نہیں ہیں کہ وہ قبول کئے جائیں ہاں جسے قبول کرتا ہے محض اپنے فضل سے اور علت ہی سے قبول فرماتا ہے اور وہ ہمارے اعمال کا محتاج نہیں بلکہ ہم سب اُس کے فضل کے محتاج ہیں۔

مکتوب نمبر ۱۳

[راہِ عرفان کی بے نہایتی اور علومِ حقیقت کا علومِ شریعت کے مطابق ہونے کے بیان میں۔۔۔۔

یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

کمترین غلام، احمد عرض کرتا ہے اس راہ کی بے نہایتی پر آہ ہزار آہ۔ اس جلدی سے سیر اور اس قدر واردات اور عنایات! نہایت ہی حیرانی کی بات ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق مشائخ نے فرمایا ہے کہ سیر الی اللہ پچاس ہزار سال کا راستہ ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (المعارج ۴)

ترجمہ: ملائکہ اور جبریل اس کی بارگاہ کی طرف عروج کرتے ہیں وہ عذاب اس دن ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔

اس آیت میں شاید اسی طرف اشارہ ہے۔ جب کام نا اُمیدی کو پہنچا اور تمام امیدیں منقطع ہو گئیں تو:

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ (الشوریٰ ۲۸)

ترجمہ: اور وہی ہے کہ مینہ اُتارتا ہے اُن کے نااُمید ہونے پر اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے۔

تو اُس نے کام بنا دیا۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے تصوف و سلوک کے راستے کی دوری اور درازی کو سیر الی اللہ سے تعبیر فرماتے ہوئے بیان فرمایا کہ سیر الی اللہ پچاس ہزار سال کا راستہ ہے اور سیر الی اللہ سے مراد یہ ہے کہ سالک اپنے نفس سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تک ایسی سیر جس میں سالک

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تک پہنچانہ ہو۔ کیونکہ آگے مزید سیر واقع ہونی ہے اور اس سیر کے چار درجات ہیں جن میں سے ہر درجہ پچاس ہزار سال کا ہے۔ تو یہ چاروں درجے مل کر دولاکھ سال کے برابر ہوئے۔ جبکہ کوئی بھی بشر اتنی عمر کو نہیں پہنچ سکتا۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہو گا کہ سالک ان دولاکھ سالوں کا راستہ قلیل عمر میں کیسے طے کرے گا؟ تو اس معمے کا حل یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے کمال کرم سے یہ کمال قدرت صرف رُوحِ انسانی اور ملائکہ عظام کو بخشی ہے کہ وہ اتنا طویل فاصلہ پلک جھپکنے میں طے کر لیتے ہیں۔ اب ان چار درجوں (سیر کی اقسام) کو بیان کیا جاتا ہے:

سیر کے چار درجات

۱۔ سیر الی اللہ ۲۔ سیر عن اللہ ۳۔ سیر فی اللہ ۴۔ سیر فی الاشیاء

سیر الیٰ اللہ

یہ وہ سیر ہے جس میں سالک کی رُوح اپنے جسم سے شروع کر کے ممکنات (جنت، دوزخ، لوح، قلم، زمین اور آسمان وغیرہ کی مسافتوں) کو طے کرتی ہے۔

سیر عن اللہ

جب سالک پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کے ظل کا پَرتَو پڑتا ہے تو اس کی کیفیت کو سیر عن اللہ کہا جاتا ہے، لیکن ایسا سالک ابھی واصل نہیں ہوا ہوتا اگرچہ یہ سیر ممکنات میں نہیں ہوتی بلکہ ممکنات سے اُوپر واقع ہوتی ہے تاہم ایسے سالک کو ابھی تکمیل کے دیگر مراحل طے کرنا ضروری ہیں۔

سیر فی اللہ

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کے ظل سے گزر کر سالک صفاتِ ذاتیہ میں سیر کرتا ہے اور یہ سیر، سیر فی اللہ کہلاتی ہے۔

سیر فی الاشیاء

پہلی تین سیریں مکمل کرنے کے بعد چوتھی سیر، سیر فی الاشیاء شروع ہوتی ہے اور سالک واپس ممکنات کی سیر میں مشغول ہو جاتا ہے۔ کسی بھی سالک کی تکمیل کے لئے یہ چاروں قسم کی سیریں ضروری ہیں۔ جن میں سے دو سیروں میں عروج ہوتا ہے اور دو میں نزول۔

اب یہ بات سمجھ لیں کہ اولیاء کرام وصوفیاءِ عظام سیر اور عروج کے درجات طے کر کے جس آخری مقام پر پہنچتے ہیں اور جس جگہ ان کی سیر ختم ہوتی ہے وہاں سے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سیر کی ابتداء ہوتی ہے۔ پس وہ لوگ جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور عوام الناس کی برابری کے قائل ہیں اس بات سے اندازہ لگا لیں کہ عوام تو عوام رہے اس اُمتِ مرحومہ کے خواص بلکہ اَخص الخواص بھی انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے برابر نہیں ہو سکتے۔

باقی رہا سیروں کی تکمیل کا معاملہ تو جو سالک عروج کے راستے میں ہی رہ گیا اور سیر الی اللہ کو مکمل نہ کیا تو وہ ولایتِ صغریٰ میں ہی رہے گا اور اگلی ولایتوں تک اُس کی رسائی نہیں ہو سکے گی۔ اور اُس پر منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ والی کیفیات وارد ہو سکتی ہیں جو اُس کے لئے خطرہ سے خالی نہیں۔ اور جس نے سیر الی اللہ قطع کر لی اس پر صفاتِ ذاتیہ کا پَر تَو پڑ جائے گا اور اُسے سیر عن اللہ کی کیفیت نصیب ہو جائے گی۔ لیکن ایسے سالک پر بھی حالتِ سُکر کے وارد ہونے کا امکان رہتا ہے۔ البتہ اس کو اگر اس مقام سے آگے لے جائیں تو اُس کا عروج اَتم واَکمل ہو جاتا ہے۔

[چند روز ہوئے ہیں کہ اشیاء میں سیر واقع ہوتی ہے۔ رُشد وہدایت کے طالبوں نے پھر غلو اور زور دینا شروع کر دیا ہے۔ لہٰذا اقدرے ان کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس وقت تک اپنے آپ کو رُشد و تکمیل کے قابل نہیں پاتا۔ لیکن لوگوں کے اصرار کے باعث بتقاضائے مُروت وحیا کچھ نہیں رہتا۔ مسئلہ توحید وجودی میں جیسا کہ سابقاً متوقف ومتردد تھا جیسا کہ مکرر عرض کیا جا چکا ہے اور افعال وصفات کو اصل سے ملاتا تھا۔ جب حقیقت حال معلوم ہو گئی تو وہ توقف اور تردد اَب ختم ہو گیا ہے اور ہمہ ازوست کا پلہ بھاری ہو چکا ہے۔ یافت اور کمال کو اس میں بہت پایا ہے۔ مقولہ ہمہ اُوست اور افعال وصفات کو اور رنگ میں معلوم کیا ہے۔ ہر ایک ایک سے گزار کر آگے اُوپر کی طرف لے گئے ہیں۔ اور ہر طرح کا شبہ بالکلیہ زائل ہو گیا ہے۔ تمام مکاشفات ظاہرِ شریعت کے مطابق ہو چکے ہیں۔ بال برابر ظاہر شریعت سے مخالفت نہیں رکھتے۔ بعض صوفیہ جو خلاف ظاہر شریعت مکاشفے بیان کرتے ہیں۔ یہ بات یا تو سہو وفراموشی کے باعث ہے یا سُکر کی بنا پر۔ ورنہ باطن ظاہر کے ہر گز مخالف نہیں۔ راستے کے دوران مخالفت محسوس ہوتی ہے، اور جمع اور توجیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ حقیقتاً انتہاء کو پانے والا باطن کو ظاہرِ شریعت کے مطابق پاتا ہے۔]

تشریح

وحدت کے لحاظ سے سالک پر دو طرح کی کیفیات آتی ہیں ایک وحدت الوجود کی کیفیت اور دوسری وحدت الشہود کی کیفیت۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے زمانہ مبارک سے لے کر سنہ ۴۰۰ ہجری تک وحدت الشہود کی کیفیات کا دور دورہ تھا۔ اور سنہ ۴۰۰ ہجری سے سنہ ۱۰۰۰ ہجری تک وحدت الوجود کی کیفیات کا دور تھا اور سنہ ۱۰۰۰ ہجری کے بعد پھر وحدت الشہود کی کیفیات کا دور شروع ہو گیا۔ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زمانے

(چوتھی صدی ہجری) میں وحدت الوجود کی کیفیت ظاہر ہوئی اور اس کا غلبہ ہونے لگا۔ لیکن اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ اس سے قبل وحدت الوجودی کیفیت سرے سے تھی ہی نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ پہلے یہ حالت بہت کم رونما ہوتی تھی پھر صوفیاء کرام نے حضرت شیخ محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تقلید شروع کرلی اور وحدت الشہود والے کم رہ گئے تاوقتیکہ حضرت شاہ نقشبند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دوبارہ وحدت الشہود کی کیفیات کو زندہ فرمایا اور یوں ہوتے ہوتے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کا ظہور ہوا۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مکتوب میں فرمایا ہے کہ سلوک کی ابتدا ٔمیں مجھ پر بھی وحدت الوجود کی کیفیات طاری ہوئیں اور ان حالات میں میری زبان سے (ہمہ اُوست) کے الفاظ نکلے لیکن اب (ہمہ از وست) کا پلہ بھاری ہوچکا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہمہ اُوست سے صوفیاء کرام کی کیا مُراد ہے۔ وہ سالک جس پر وحدت الوجود کا غلبہ ہو اُسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے عشق کی وجہ سے ہر جگہ اور ہر چیز میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات میں کچھ فرق وامتیاز نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی شخص کو (سُکر والا) یا (مجذوب) کہا جاتا ہے۔ پھر اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل شامل حال ہو تو یہ سالک وحدت الوجود سے وحدت الشہود کی طرف ترقی کر جاتا ہے، وحدت الشہود میں سالک ہمہ از وست کا قائل ہو جاتا ہے ہمہ از وست سے مراد یہ ہے کہ تمام مخلوق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے ہے کوئی چیز بذات خود موجود نہیں بلکہ وہ اپنی ہستی میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محتاج ہے۔ یہ کیفیت حالتِ صحو کی ہے اور سالکینِ طریقت کو چاہیئے کہ اللہ

سبحانہٗ وتعالیٰ سے اسی کیفیت کی دُعا کریں کیونکہ اس کیفیت والا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات وذات میں فرق وامتیاز کرتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو اللہ اور مخلوق کو مخلوق جانتا ہے۔

اب ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ جب میں ولایتِ صغریٰ سے ولایتِ کبریٰ میں داخل ہوا تو مجھ سے وحدت الوجود والی کیفیات ختم ہو گئیں اور وحدت الشہود کے حالات طاری ہو گئے جس سے میں نے خالق ومخلوق میں تمیز کرلی۔

ولایتِ صغریٰ میں سالک سے گاہے شریعتِ حقہٗ کی عملاً مخالفت ہو جاتی ہے اور کیفیات کے غلبہ سے غیر شرعی الفاظ بھی ادا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ ولایت کبریٰ میں پہنچتا ہے تو اُس کی ساری حرکات وسکنات اور حالات وکیفیات شریعتِ حقہٗ کے مطابق ہو جاتی ہیں۔ ضروری امر یہ ہے کہ ولایتِ صغریٰ والے کو چاہیئے کہ ظاہری کیفیات کی پراگندگی کی وجہ سے اُس کے عقائد خراب نہ ہوں۔ کیونکہ نجات اخروی کے لئے سب سے ضروری چیز عقائد کی درستگی ہے۔ اور شریعت کے فقہی احکام کا سیکھنا ہے دوسرے نمبر پر اُن پر عمل کرنا ہے اور تیسرے نمبر پر سلوک وتصوف ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس کے اُلٹ حالات ہیں۔ لوگوں کو اپنے مسالک کے عقائد کا علم ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی شریعت کی پرواہ کرتے ہیں لیکن بیعت کو ان سب سے ضروری خیال کرتے ہیں۔

آخری اہم بات جس کی طرف حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ”حقیقتاً انتہا کو پانے والا باطن کو ظاہر شریعت کے مطابق پاتا ہے“ جبکہ شریعت وطریقت سے ناواقف لوگ کہتے ہیں کہ شریعت الگ ہے اور طریقت الگ۔ وہ نہ تو شریعت کو طریقت کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں اور نہ طریقت کے اصل مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ اور ایسے

لوگوں میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو مجذوبین کے صحبت یافتہ ہوں یا پھر ایسے لوگ کہا کرتے ہیں جو بزرگی اور ولایت کے خواہشمند تو ہوتے ہیں لیکن شریعت پر عمل کرنا انتہائی دشوار سمجھتے ہیں اور فرائض وواجبات کی ادائیگی میں سُستی اور کاہلی کرتے ہیں۔ اپنے مکر وفریب سے اصحابِ سُکر کے اقوال کو حجت اور دلیل بناتے ہیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ولایت کے حصول کے لئے شریعت پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ انسانی زندگی کی بقاء کے لئے پانی اور ہوا لازمی جزو ہیں۔ بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ۔ پس وہ شخص جس کا ظاہر شریعت کے مخالف ہو یعنی وہ شرعی احکام کا پابند نہ ہو اور ولایت کا دعویدار ہو تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا اور کذاب ہو گا۔ اس کی صحبت زہر قاتل ہے ایسے شخص سے دور رہنا اپنے ایمان کو بچانے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

[علماء اور ان بزرگواروں کے درمیان صرف اسی قدر فرق وتفاوت ہے کہ علماء دلیل اور علم سے جانتے ہیں، اور یہ بزرگ اسی شے کو کشف وذوق سے پالیتے ہیں۔ اور ان کے صحت حال پر اس مطابقت سے بڑی اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی:

یضیق صدری ولا ینطلق لسانی

ترجمہ: میرا سینہ تنگی محسوس کرتا ہے، اور میری زبان نہیں چلتی۔

نقد وقت ہے میں نہیں جانتا کہ کیا عرض کروں۔ بعض احوال کو لکھ کر رکھنے کی توفیق نہیں پاتا، اور آپ کی خدمت میں عرض کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ شاید اس میں کوئی حکمت ہو۔ اس محروم جدا ماندہ کو غریب پروری کی توجہ سے محروم نہ رکھیں اور راہ میں ہی نہ چھوڑ دیں۔

ایں سخن راچوں تومبد اُبودہ　　　　گر فزوں گردد تواش افزودہ

ترجمہ:اس بات کا محل آغاز آپ ہی بنے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ دراز ہو جائے تو اس کے دراز کرنے والے آپ ہی ہیں زیادہ گستاخی نہ کی۔

بندہ باید کہ حد خود داند

ترجمہ: بندے کو چاہیئے کہ اپنی حد کو پہچانے۔]

اللھم اغفر لکاتبہٖ و لمن سعٰی فیہٖ و لو الدیھم و لاساتذیھم و لاھل بیتھم اجمعین آمین یا رب العالمین بحرمت سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہٖ و آلہٖ و اصحابہٖ و سلم

مکتوب نمبر ۱۴

[اُن واقعات کے حاصل ہونے میں جو دورانِ راہ پیش آئے ہیں اور بعض طالبوں کے حالات کے بیان میں۔۔۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے مُرشد بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

کمترین غلام احمد کی عرضداشت یہ ہے کہ وہ تجلیات جو مخلوقات کے مراتب میں ظاہر ہوئی تھیں ان کا کچھ حصہ گزشتہ عرضداشت میں عرض کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد مرتبہ ٔوجوب جو تمام صفات کا جامع ہے، ظاہر ہوا اور بدصورت سیاہ رنگ عورت کی شکل میں سامنے آیا۔ اس کے بعد مرتبہ ٔاحدیت دراز قد مرد کی شکل میں نمودار ہوا، جو کشادہ اور چھوٹی دیوار پر کھڑا ہوا۔ اور یہ دونوں تجلیات حقانیت کے عنوان میں ظاہر ہوئیں بخلاف پہلی تجلیات کے کہ وہ دوسرے عنوان میں ظاہر ہوئیں۔]

تشریح

طریقت کے چار سلاسل میں سے کسی بھی سلسلہ میں سلوک طے کرنے والے سالک کے لئے مکتوبات امام ربانی کا مطالعہ کرنا اور ان کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ صرف نقشبندی سالکوں کے لئے ہی رہنما نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف کے قوانین سارے سلاسل کے لئے ایک ہی ہیں فرق صرف ذکر کرنے کے طریقے کا ہے۔ چونکہ مکتوبات شریف کے مصنف حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس خود بھی چاروں سلاسل کے جامع تھے اس لئے ان کے لکھے ہوئے خطوط (مکتوبات) اور تعلیمات ہر چار سلاسل کے صوفیاء کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ لیکن چونکہ مکتوبات شریف کی عبارات میں دقیق معارف ہیں اس لئے ان کو سمجھنے کے لئے کسی شیخِ کامل کی رہنمائی ضروری ہے۔ بالخصوص حصہ اول اور دوم میں تصوف کی اصطلاحات درج ہیں اور مکتوبات

شریف کے معارف کو سمجھنے کے لئے ان اصطلاحات سے واقفیت رکھنا بھی ضروری ہے اگر ان اصطلاحات سے آگاہی نہ ہو گی تو نہ تو مکتوبات شریف سے استفادہ ممکن ہو گا اور نہ ہی دورانِ سلوک پیش آنے والے واقعات و کیفیات میں امتیاز ہو سکے گا۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

مَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ تَحَقَّقَ۔

ترجمہ: جس نے فقہ (کا علم) حاصل کیا اور تصوف کو نہ جانا وہ فسق و فجور میں پڑ گیا اور جو تصوف میں ڈوب گیا اور فقہ سے نابلد رہا وہ زندیق ہوا اور جس نے دونوں کو جمع کیا اس نے حق کو پالیا۔

فسق کے تین درجات ہیں

۱۔ ایک درجہ وہ ہے جس میں فاسق سُنّتِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی خلاف ورزی کرتا ہو مثلاً کھڑے ہو کر کھانا پینا، سر کو ننگا چھوڑنا، بائیں ہاتھ سے کھانا اور قمیص اتارے ہوئے لوگوں میں آنا جانا وغیرہ۔

۲۔ دوسرے درجے کا فاسق وہ ہوتا ہے جس سے کبھی گناہِ صغیرہ سرزد ہو جائے مثلاً غیر محرم عورت کی طرف دیکھنا ایسے گناہ توبہ و استغفار، وضو کرنے اور نماز پڑھنے سے محو ہو جاتے ہیں۔

۳۔ تیسرے درجے کا فاسق وہ ہوتا ہے جو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر ایمان بھی رکھتا ہو اور ساتھ ساتھ گناہِ کبیرہ کا مرتکب بھی ہو، مثلاً زانی ہو، رشوت کھاتا ہو، جھوٹ بولتا ہو، غیبت اور چغلی کا مرتکب ہو ایسے شخص کے لئے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف سے دُنیا میں بھی سزا ہے اور آخرت میں بھی۔ اور ایسے فاسق کو فاسقِ مجاہر بھی کہا جاتا ہے۔

زندیق کی دو اقسام ہیں

ا۔ زندیق لازمی: یہ وہ شخص ہوتا ہے جو خود تو زندیق ہو لیکن اس کی زندیقیت سے دوسروں کے زندیق ہونے کا خدشہ نہ ہو ایسا شخص اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دربار میں توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔

۲۔ زندیقِ متعدی: یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر حقیقتاً ایمان نہ رکھتا ہو اور اس کی زندیقیت دوسرے لوگوں میں بھی سرایت کر چکی ہو۔ ایسے شخص کی توبہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دربار میں قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ خود تو توبہ کرتا ہے مگر جن لوگوں کو اس نے زندیق بنایا ہے وہ توبہ نہیں کرتے۔

پس جو شخص عالم تو ہو لیکن تصوف میں داخل نہ ہو تو وہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول کی روشنی میں فاسق کہلائے گا اس لئے کہ اُس نے علم تو حاصل کر لیا لیکن تقویٰ کا حصول چونکہ تصوف سے وابستہ ہے اس لئے ایسا عالم تصوف کے بغیر متقی نہیں بن سکتا۔ دوسری طرف وہ صوفی جس نے فقہ کا علم حاصل نہ کیا اور تصوف میں ہی مگن رہا وہ زندیق کہلائے گا۔ گزشتہ دور میں علم سے دور رہنے کی وجہ سے بہت سے صوفیاء کے زندیق ہو جانے کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

پشتو زبان میں ایک محاورہ ہے کہ:

بي علمه شيخی کري دا كفر دي بس دي

ترجمہ: جو شخص علم کے بغیر شیخی (پیری، مُریدی) کرتا ہے تو اس کا یہ کفر ہی کافی ہے۔

اب ہم بے علم صوفی کی زندیقیت کے امکان کو مزید واضح کرتے ہیں کہ کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔۔ جب ایک سالک پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی تجلیات کا پَرتَو پڑتا ہے تو اگر وہ علم سے بے بہرہ

ہو گا تو وہ یہ تمیز نہیں کر سکے گا کہ تجلی کا یہ پَرتَو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کا ہے جو کہ میرے جسم میں نمودار ہوا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہی قادر اور بصیر جانے گا۔ جب وہ اپنے آپ کو قادر کہے گا تو زندیق ہو جائے گا کیونکہ قادر تو صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہے اور اگر وہ عالم ہو گا تو کہے گا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات وصفات میں کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ اور یہ جو مجھ میں قدرت ظاہر ہوئی ہے یہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفتِ ذاتیہ کا اثر ہے نہ کہ عینِ قدرت۔ اور یوں وہ فاسق وزندیق ہونے سے بچ جائے گا اس لئے علم کو تصوف اور تصوف کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ ان دونوں کے بغیر انسان نہ اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے اور نہ ہی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو۔

تجلیاتِ الٰہی کی اقسام

اجمالی طور پر تجلیات کی دو اقسام ہیں:

ا۔ ایک وہ تجلی ہے جس کا احساس سالک اپنے آپ یا دوسری اشیاء میں کرتا ہے۔ یعنی تجلیات کا پَرتَو جب عدمات (مخلوقات) پر پڑتا ہے تو ان میں تجلیات کا اثر نمودار ہوتا ہے۔ اس درجے میں سالک تجلیات اور اپنی کیفیات میں فرق وامتیاز نہیں کر سکتا، اور تجلیات کو اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ اور یہ حالت سالک کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے جیسا کہ اُوپر گزرا۔

۲۔ دوسری قسم حقیقی تجلی کی ہے: اس تجلی کے پڑنے سے سالک اپنے آپ کو بندۂ ناچیز اور حقیر تصور کرتا ہے۔ جبکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو اپنا معبودِ حقیقی جانتا ہے اور اُس کی ذات وصفات میں کسی کو کسی بھی صورت میں شریک نہیں ٹھہراتا۔ لیکن یہ تجلی سالکوں پر اُس وقت تک وارد نہیں ہوتی جب تک اُن کو ان کے اِسمِ مُربی کا نشان نہ مل جائے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

اس مکتوبِ قُدسی میں آپ نے دورانِ سلوک پیش آنے والے مشاہدات اور واقعات کا ذکر فرمایاہے اور ساتھ ہی بعض طالبان طریقت کے باطنی حالات پر بھی تبصرہ فرمایاہے۔ چنانچہ آپ رقم طراز ہیں کہ قبل ازیں جو تجلیات مرتبۂ ممکنات میں ظاہر ہوئی تھیں، بندہ نے ان کا حال سابقہ مکتوبات میں عرض کر دیا ہوا ہے۔ اب مرتبۂ وجوب کی تجلیات اور ان کے مشاہدات کا بیان عرضِ خدمت ہے۔ مناسب ہے کہ پہلے تجلی کے مفہوم وثبوت اور اس کی اقسام کا ذکر کر لیا جائے۔

تجلی کا مفہوم

تجلی کا لغوی معنیٰ ”ظاہر کرنا وظاہر ہونا“ ہے۔ اصطلاحِ صوفیاء میں اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اسماء وافعال کا کسی شان یا رنگ، کیفیت یا حالت میں اظہار تجلی کہلاتا ہے۔

تجلی کا ثبوت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رَبِّ اَرِنِیْ کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی۔

فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (الاعراف ۱۴۳)

ترجمہ: پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا اسے پاش پاش کر دیا اور موسیٰ گرا بے ہوش۔

حدیث پاک میں ہے:

أَتَانِي رَبِّي فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ۔[1]

---

[1] (سنن الترمذی، ج۲، ص ۱۵۶)

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ میرا رب میرے پاس ایک اچھی صورت میں آیا۔

تجلیات لاتعداد ہیں

چونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ظہور کی شانیں بے انتہاء ہیں لہٰذا تجلیات بھی لاتعداد ہیں۔ ہر شخص پر اس کی استعداد کے مطابق جُداگانہ تجلیات ہوتی ہیں۔ جو تجلی ایک شخص پر ایک مرتبہ ہوتی ہے وہ پھر دوبارہ اس پر یا کسی اور پر کبھی نہیں ہوتی، کیونکہ تجلیات میں تکرار نہیں۔

ہر دم، ہر لحظہ اور ہر آن وہ نئی نئی شان میں تجلی فرماتا رہتا ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن ۲۹)

جس طرح اس کی ذات لامتناہی ہے اسی طرح اس کی تجلیات بھی حدو حصر سے باہر ہیں۔

اے ترا بر طورِ دل ہر دم تجلائے دِگر　　طالبِ دیدار تو ہر لحظہ موسائے دگر

(معینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

اقسامِ تجلیات

ان لامتناہی تجلیات کا احاطہ و حصر قطعًا ناممکن ہے تاہم نمونہ کے طور پر چند تجلیات کا ذکر درج ذیل ہے:

تجلی آثاری

اس کو تجلی صوری بھی کہتے ہیں۔ سالک اس تجلی میں حضرت حق سبحانہٗ کو صورتِ تمثیلی میں دیکھتا ہے اور وہ جان بھی لیتا ہے کہ یہ تجلی اسی ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ابتداء میں تجلی بصورتِ نار ہوئی پھر بصورتِ شجر انہوں نے یہ بھی جان لیا کہ اس صورت

میں کون متجلّی ہے۔ کبھی یہ تجلی خواب میں بھی ہوتی ہے لیکن محتاجِ تعبیر رہتی ہے۔ یہ تجلی کام طور پر صورتِ انسان میں ہوتی ہے۔

تجلی فعلی

اس تجلی میں سالک حق تعالیٰ کو صفاتِ فعلیہ ربوبیتہ میں سے کسی صفت کے ساتھ متجلّی پاتا ہے اس مشاہدے میں سالک سے حول و قوت اور فعل وارادہ سلب ہو جاتا ہے اور وہ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کو متصرف وجاری دیکھتا ہے۔

تجلی صفاتی

اس تجلی میں سالک حق تعالیٰ کو اُمہاتِ صفات میں متجلی پاتا ہے۔اُمہات صفات آٹھ ہیں، ان کو صفاتِ ثمانیہ حقیقیہ بھی کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ تکوین	۲۔حیات	۳۔ علم	۴۔ قُدرت
۵۔ارادہ	۶۔ سمع	۷۔بصر	۸۔کلام

تجلی ذاتی

اس تجلی میں سالک فانی مطلق ہو کر اپنے علم، شعور اور ادراک سے بے تعلق ہو جاتا ہے، عبد فانی ہو جاتا ہے اور حق باقی رہتا ہے۔ اسی فنائیت کے بعد بقاباللہ کا مقام آتا ہے۔ اس تجلی میں سالک اپنے آپ کو بلا تعین جسمانی ورُوحانی اطلاق کے رنگ میں پاتا ہے اور کمال توحید عیانی کا مشاہدہ کرتا ہے۔

مزید اقسام

ان کے علاوہ بھی تجلیات غیر متناہیہ ہیں حق سبحانہٗ وتعالیٰ جس صورت میں جس چیز کے ساتھ جس طرح اور جب جس پر چاہتا ہے ہر معقول مفہوم، موہوم، مسموع و مشہود میں تجلی فرماتا ہے اور سالک ان ہی تجلیات پر قانع نہیں رہتا بلکہ هَلْ مِنْ مَزِيْد کی صدائیں بلند کرتا رہتا ہے۔

بعض صوفیاء نے حسبِ ذیل تجلیات کی بھی نشاندہی فرمائی ہے:

تجلی ظہوری، تجلی رحمانی، تجلی رحیمی، تجلی شہودی، تجلی جمادی، تجلی نباتی اور تجلی حیوانی وغیرہا۔

حضرت امامِ ربانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس مرتبہ ٔوجوب میں سیر کے دوران پیش آنے والے واقعات وواردات کا بیان فرمارہے ہیں۔

مرتبہ ٔوجوب

یہ مرتبہ صفاتِ کُلیہ کا جامع مرتبہ ہے اور دائرہ اصل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ عارف کے لئے مشاہدے کا مقام ہے اور وہ اس رُتبے میں صفاتِ حقیقیہ ثمانیہ کی سیر کرتا ہے۔

مشاہدہ

کسی امر کے استحضار اور یقینی تصور کا قلبِ سالک پر اس طرح غالب اور قوی ہو جانا کہ گویا وہ دل کی آنکھ سے اسے دیکھ رہا ہے مشاہدہ کہلاتا ہے۔

جیسا کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

نَكُونُ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ، يُذَكِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ، حَتَّى كَأَنَّا رَأْيُ عَيْنٍ۔[1]

---

[1] (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۵۵)

ہم لوگ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی خدمت میں جب دوزخ وجنت کا ذکر سُنتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

وجوب کے مرتبے میں سالک کو دو قسم کا مشاہدہ ہوتا ہے کبھی صفات بدون تعلقات اس کی نظر میں بعنوان کُلیّت مشہود ہوتی ہیں اور کبھی صفات متعلق بہ معلومات و مقدورات بعنوانِ جزئیت نظر آتی ہیں۔

قسمِ اول

پہلی قسم کے مشاہدے کو شہود صفاتِ کلیہ کا نام دیتے ہیں۔ اس مرتبے میں صفاتِ مجردہ مشہود ہوتی ہیں ان کا ممکنات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

قسمِ دوم

دوسری قسم کو شہود صفاتِ جزئیہ کہا جاتا ہے اس مرتبے میں صفات کا ممکنات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور سالک مشاہدہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت علم فلاں معلوم کے ساتھ صفتِ قدرت فلاں مقدور کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ علیٰ ھذا القیاس تمام صفات ممکنات سے متعلق نظر آتی ہیں۔ سالکین کے نزدیک مشاہدے کی پہلی قسم (شہودِ صفاتِ کُلیہ) زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔

تجلیّات عالمِ وجوب

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو مرتبۂ وجوب میں سیر باطنی کے دوران عالمِ وجوب کی تجلیات مختلف صورتوں میں نظر آئیں۔ مثلاً مرتبۂ وجوب بصورت سیاہ رنگ کی عورت کی شکل میں نظر آیا اور مرتبۂ احدیت ایک دراز قد آدمی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کی معنویت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سالکین پر تجلیات کا نزول کبھی صورت میں ہوتا ہے اور

کبھی بے صورتی میں، کبھی کسی خاص کیفیت میں اور کبھی بے کیفی میں۔ لیکن اس مرتبے میں کامل تجلی انسان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کیونکہ تنزیہہ اور تشبیہہ دونوں مرتبے توحید کے ہیں اور ان دونوں مرتبوں میں سالکین کو مشاہدہ نصیب ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے صراحت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن قرآن کے ہر حرف کی صورت میں تجلی فرمائے گا۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

اگر خواہد در ہر صورت از صور عالم ظاہر گردد واگر خواہد از ہمہ منزہ باشد۔[1]

یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کائنات کی ہر صورت میں ظہور فرمائے اگر چاہے تو ہر صورت سے منزّہ رہے۔

عنوانِ حقانیّت

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ دونوں تجلیاں بعنوان حقّانیت ظاہر ہوئیں جبکہ سابقہ تجلیات اس عنوان کے ساتھ ظاہر نہ ہوئی تھیں، عنوانِ حقانیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ تجلیاں اپنی حقیقت کے ساتھ مشہود ہوئیں اور انہیں اچھی طرح پہچان لیا گیا کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے یہ شناخت کامل استعداد والے اہلِ حال کے شہود سے مربوط ہے، عام درجے کے سالک اس استعداد کے مالک نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۴۶)

---

[1] (شرح مکتوبات قُدسی آیات مکتوب ۱۴)

[اسی اثناء میں موت کی آرزو پیدا ہوئی اور یوں نظر میں آیا کہ گویا میں ایک شخص ہوں جو تمام زمین کا احاطہ کئے ہوئے دریا کے کنارے کھڑا ہوں، اس ارادے سے کہ اپنے آپ کو اس میں پھینک دے۔ لیکن ایسا بھی محسوس کیا کہ اسے پیچھے سے مضبوط رَسی سے باندھا ہوا ہے کہ دریا میں گر نہیں سکتا۔ اور وہ رَسیاں بدن عنصری کے ساتھ تعلق سے عبارت ہیں۔ اور میں نے آرزو کی کہ رَسیاں ٹوٹ جائیں، اور ایک خاص کیفیت بھی رونما ہوئی کہ اس وقت ذوق کے طور پر جانا کہ سوائے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے کوئی حاجت نہیں رہی۔ اس کے بعد صفاتِ کلیہ وجوبیہ جو اپنے جائے نزول اور مظاہر خصوصیات کے اعتبار سے ظاہر تھیں نظر پڑیں۔]

تشریح

جب سالک تجلیٔ حقیقی کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو وہ حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو بندہ تصور کرتا ہے اور اپنے نقص کا معترف ہوتا ہے۔ صوفیاء کرام اس مقام پر فائز ہونے کے بعد اس قول کے مصداق ہو جاتے ہیں کہ:

موتوا قبل ان تموتوا

ترجمہ: مرنے سے پہلے مر جاؤ۔

ایسا سالک اپنے آپ کو محکوم جانتا ہے اور محکوم سے چونکہ غلطی کا قوی امکان ہوتا ہے اس لئے وہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ موت ہی وہ زینہ ہے جس پر قدم رکھ کر سالک اپنے محبوبِ حقیقی سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث میں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کے دو درجے بیان فرمائے ہیں:

ا۔ صفاتِ کُلیہ وجوبیہ   ۲۔ صفاتِ جُزئیہ

ا۔ صفاتِ کُلیہ وجوبیہ: صفاتِ کُلیہ کی تجلّی جب کسی سالک پر پڑتی ہے تو وہ ساری ممکنات کو بھول جاتا ہے اور فانی ہو جاتا ہے وہ دنیا میں رہ کر بھی دُنیا سے بے خبر رہتا ہے۔

۲۔ صفاتِ جُزئیہ: صفاتِ جُزئیہ کی تجلّی جب کسی سالک پر نمودار ہوتی ہے تو وہ لذیذ کھانوں، پھولوں اور دوسری خوبصورت اشیاء میں اس تجلّی کا مشاہدہ کرتا ہے اور یہ ساری اشیاء اُسے اچھی لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکتوب نمبر ا میں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ عورتوں کے لباس، لذیذ کھانوں اور میٹھے پانی میں لطافت و حُسن کے عجیب نظارے ظاہر ہوئے۔ لیکن چاہیئے کہ سالک یوں کہے کہ ان اشیاء کی خوبصورتی و حُسن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عطا کردہ ہے جو کہ صفاتِ فعلیہ وصفاتِ ذاتیہ کے پڑنے سے پیدا ہوئی ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

خواہشِ وصل

سطور بالا میں حضرت امام ربانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ عالمِ وجوب کے مشاہدہ کے دوران مجھ پر موت کی آرزو غالب ہونے لگی اس آرزو کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عارف جب عالمِ وجوب کی نورانیت، قُدسیت اور لطافت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس پر وصل کی خواہش غالب آجاتی ہے۔ لیکن جب حیاتِ دنیوی میں یہ وصل ممکن نظر نہیں آتا تو عارف لا محالہ موت کی آرزو کرتا

ہے کیونکہ اَلْمَوْتُ جَسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ یعنی موت ایک پُل ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔

آرزوئے موت

محبوبانِ خدا وصل کے شوق میں موت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے شوقِ شہادت میں فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوَدِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ۔[1]

یعنی مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قُدرت میں میری جان ہے میری یہ تمنا ہے کہ میں خُدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔

دراصل عاشقوں کے لئے موت ذریعۂ وصل ہے اور عید نظارہ ہے۔ انہیں قاتل کی شمشیر میں ہلال عید کی تابانیاں نظر آتی ہیں وہ وصالِ دوست کے لئے زہر کو تریاق اور موت کو حیات سمجھتے ہیں۔ سلطان العشاق حضرت سیدنا بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جب نزع کا عالم طاری ہوا آثارِ وفات نمودار ہوئے تو احباب واہلِ خانہ غمگین ہوگئے ان کی بیوی شدتِ اضطراب سے بے قرار ہوئیں تو بے ساختہ ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "وَاحَرَبَاہْ" یعنی ہائے مصیبت۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ لفظ سُن کر تڑپ اٹھے اور جلال میں آکر بولے وَاطَرَبَاہْ غَدًا اَلْقٰی اَلْاَحِبَّةَ مُحَمَّدًا وَصَحْبَہٗ۔[2] فرمایا تم یہ ہرگز نہ کہو وَاحَرَبَاہْ (یعنی ہائے مصیبت) بلکہ یہ کہو وَاطَرَبَاہْ (واہ خوشی) کیونکہ میں اپنے محبوب

---

[1] (صحیح البخاری، ج ۱، ص ۳۹۲، مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۲۹)

[2] (زرقانی، ج ۲، ص ۳۱۸)

آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے دیدار اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ملاقات کے لئے جارہاہوں۔ یہ مصیبت اور غم کا موقع نہیں بلکہ مسرت وشادمانی کا مقام ہے۔

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
قبر کی رات ہے اس گل سے ملاقات کی رات

اسی لئے عارفانِ ذات موت سے ڈرتے ہیں نہ گھبراتے ہیں بلکہ والہانہ شوق کے ساتھ مسکراتے ہوئے موت کا استقبال کرتے ہیں۔

نشانِ مردِ مؤمن باتو گویئم ۔۔۔ چو مرگ آید تبسم بَر لب اُو

جب کسی صاحبِ حال بزرگ پر شوقِ وصال اور لذتِ جمال کی اضطرابی کیفیت طاری ہوتی ہے تو کبھی نیم جان ہوکر یوں فریاد کرتے ہیں:

اِمروز دیگرم در انتظارِ تو شام شُد ۔۔۔ در انتظارِ وصل تو عُمرم تمام شُد
آمد نمازِ شام و نہ آمد نگارِ من ۔۔۔ اے دیدہ پاسدار کہ خوابم حرام شُد

(سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

یعنی اے محبوب! آج دوسرے دن بھی تمہارے انتظار میں شام ہوگئی اسی طرح ساری عُمر تیرے وصل کے انتظار میں تمام ہوگئی ہے ابھی میرا دوست نہیں آیا لیکن نماز شام ہوگئی ہے اے آنکھ گنتی جا کہ کس طرح میری نیند حرام ہوگئی ہے۔

اور کبھی بادیدۂ پُر نم اور بادلِ پُر غم اپنے جذباتِ قلبی کا یوں اظہار کرتے ہیں:

خودکشی ہے معصیت ہستی حجابِ روئے دوست
تو گرفتارِ محبت ہائے کس مشکل میں ہے!

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس شوقِ وصل اور سوزِ فصل کی ان ہی ملی جُلی کیفیات سے سرشار ہو کر اپنے مُرشدِ برحق کی بارگاہ میں عرض گزار ہیں کہ "آرزوئے موت پیدا شُد"، یعنی وصالِ الٰہی کی حقیقی لذتوں سے شام کام ہونے کا شوق اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اب اس دُنیا میں رہنے کی بجائے آخرت کی آرزو غالب آگئی ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۴۹)

[اس کے بعد وہ تمام خصوصیات نیچے چلی گئیں اور الکلیۃ الوجوبیہ کے عنوان کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ اور ان کے خصوصیات سے خالی ہونے کی حالت بھی دکھائی دی۔ اور اس وقت معلوم ہوا کہ اب در حقیقت صفات کو اصل کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ اور خصوصیات سے خالی ہونے سے پہلے صفات کو اصل کے ساتھ ملانے کا کچھ معنی تھا۔ مگر مجازی طور پر۔ جس طرح کہ تجلی صوری والوں کا حال ہے۔ اور حقیقی فنا اس وقت متحقق ہوئی۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ جب ایک حقیقی سالک اپنے آپ کو خالی محض پاتا ہے تو گویا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ کُلیۃ الوجوبیہ کا اقرار کرلیتا ہے۔ اور اسی وقت دراصل فنائے حقیقی سے مشرف ہوتا ہے۔ اور وہ فنا جو اس سے پہلے ہوتی ہے وہ فنائے صوری کہلاتی ہے۔

[اس حالت کے موجود ہونے کے بعد اپنے اور دوسروں میں پائی جانے والی صفات سب کو ایک ہی طرح پر پایا اور مقامات کا امتیاز اُٹھ گیا۔ اس وقت شرکِ خفی کے بعض باریک اور دقیق اقسام سے بھی خلاصی اور نجات میسر آگئی۔ اس وقت نہ عرش رہا، نہ فرش، نہ زمان رہا، نہ مکان، اور نہ ہی جہات

وحدود۔ اگر سالہاسال غور کرتا رہوں تو بھی یہ بات ہرگز علم میں نہیں آتی کہ عالم کا ایک ذرہ بھی پیدا اور مخلوق ہوا ہے۔]

تشریح

سلوک کے مراحل کو طے کرتے ہوئے سالک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات وصفات کی طرف متوجہ رہتا ہے اور دیگر ممکنات یعنی عرش وفرش، زمان ومکان اور حدود کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔

جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار وعدۃ الابرار میں کہا گیا ہے:

مکن در جسم وجان منزل — کہ این دونست وآن والا

قدم زین ہر دو بیرون نہ — نہ اینجا باش ونہ آنجا

ترجمہ: اپنے جسم ورُوح کو منزل نہ بناؤ کہ یہ کم ترین منزل ہے اور وہ منزل بلند ہے اپنے قدم ان دونوں (جسم ورُوح) سے باہر لے جاؤ۔ نہ اِدھر (جسم میں) اور نہ اُدھر (رُوح میں) (بلکہ صفات تک رسائی حاصل کرو)۔

اس دوران سالک اپنی صفات کو بھی محو کر دیتا ہے۔ اور صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات ہی اُس کی نظر میں رہتی ہیں ایسا سالک کامل ولی اللہ ہوتا ہے۔ پہلے وہ شرکِ جَلی سے آزاد ہوتا ہے، لیکن یہاں پہنچ کر وہ شرکِ خَفی سے بھی پاک ہو جاتا ہے لیکن وہ لوگ جو تصوف سے بے خبر ہوں اور صرف نماز وروزہ کے پابند ہوں وہ شرکِ جَلی سے تو بچ سکتے ہیں لیکن شرکِ خَفی سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ پس اس بات سے بھی تصوف کی ضرورت واہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ والعاقل تکفیہ الاشارہ (عقلمند کے لئے اشارہ ہی کافی ہے)۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے مرتبۂ وجوب میں سیر کے دوران جب صفات کو تعلقات اور خصوصیات سے خالی مشاہدہ فرمایا اور اپنے آپ کو بھی صفات سے خالی جانا تو اس وقت آپ پر صفات کو اصل کے ساتھ ملا دینے کی حقیقت واضح ہوئی۔

صفات کو اصل کے ساتھ ملانے کا مفہوم

سالک جب صفات کو اپنی ذات یا کائنات سے متعلق دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو بھی صفات (قدرت و علم و ارادہ وغیرہا) سے متصف پاتا ہے اور اپنی صفات کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا پَرتو جانتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی صفات کو تعلقات اور خصوصیات سے بالکل خالی مشاہدہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو بھی صفات سے خالی دیکھتا ہے تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ صفات کے اصل کے ساتھ مل جانے کا یہی معنی ہے اور یہی صفاتِ کُلیہ وجوبیہ کا مشاہدہ ہے اور یہی توحیدِ خالص ہے اور یہی مرتبہ فنائے حقیقی ہے جہاں پہنچ کر سالک شرکِ خفی سے نجات پاتا ہے کیونکہ شہودِ صفات جزئیہ کے مرتبے میں پَرتَو صفات کی وجہ سے سالک اپنے آپ کو صاحبِ علم و قدرت وغیرہا دیکھتا ہے اور یہ کاملین کے نزدیک شرک کی ایک قسم ہے۔ ان ہی حقائق کی وضاحت کے لئے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں مشاہدۂ توحید کا وہ مرتبہ جس میں صفات (بلا تعلقات و خصوصیات) اصل کے ساتھ ملی ہوئی مشہود ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا اور اس وقت مجھ پر فنائے حقیقی متحقق ہوئی اور شرک کی کئی دقیق اقسام سے خلاصی میّسر ہوئی۔ (والحمدللہ علیٰ ذٰلک)

متن

وپیش از تجرید از خصوصیات باصل دادن معنی نداشت مگر آنکہ بطریق تجوز باشد کَمَاھُوَ حَالُ اَرْبَابِ التَّجَلِّیْ الصُّوَرِیِّ۔

ترجمہ: اور خصوصیات (تعلقات) سے الگ ہونے سے پہلے صفات کو اصل کے ساتھ جاننے کی کوئی حقیقت نہیں ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ مجاز کے طور پر ہو جیسا کہ تجلی صوری کے مقام والوں کا حال ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ صفات کے تعلقات سے الگ ہونے سے پہلے صفات کو اصل کے ساتھ ملا دینے کا دعویٰ حقیقت پر مبنی نہیں۔ البتہ مجازاً ایسا کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ تجلی صوری کا مشاہدہ کرنے والوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم نے صفات کو اصل کے ساتھ ملا دیا ہے۔ حالانکہ ان کا یہ دعویٰ بالکل بے معنی ہے کیونکہ صفات کو اصل کے ساتھ ملا ہوا مشاہدہ کرنا فنائے حقیقی پر موقوف ہے اور صاحبان تجلی صوری فنائے حقیقی سے مشرف نہیں ہوتے۔

تجلی صوری

حضرت حق جلّ وعلاء کو صورت تمثیلی یا وجود جسمانی کی صورت میں اس طرح دیکھنا کہ سالک کو یقین آجائے کہ میں واقعی حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابتداء میں تجلی بصورت نار دیکھی پھر آخر میں انہوں نے یہ بھی پہچان لیا کہ اس صورت میں کون متجلّی ہے اس کو تجلی آثاری بھی کہتے ہیں اس تجلی میں اکمل ترین تجلی صورت انسان میں ہوتی ہے کیونکہ انسان ہی مظہر کامل ہے۔

حضرت خواجہ رکن الدین علاؤالدولہ سمنانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے کلام رُشحات میں ہے:

بدانکہ سالکانِ راہِ حق را سُبحانہ بتجلیاتِ صوری می بینند وآن بآثار نسبت وارد وبتجلیاتِ نوری می بینند وآن بافعال نسبت دار وبہ تجلیات معنوی می بینند وآن بصفات نسبت دارد وبہ تجلیات ذوقی می بینند وآن بذات نسبت دارد ودر تجلیات صوری کہ بآثار نسبت دارد حق تعالیٰ در صورت جمیع اشیاء بر بندہ تجلی می کند از مفردات عنصریات ومعادن وحیوانات وافراد وانسان۔[1]

جاننا چاہیئے کہ راہ طریقت کے سالکین حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو تجلیاتِ صوری کے ساتھ دیکھتے ہیں یہ آثار کے ساتھ نسبت رکھتی ہے اور تجلیات نوری سے دیکھتے ہیں وہ افعال کے ساتھ نسبت رکھتی ہے اور تجلیات معنوی کے ساتھ دیکھتے ہیں وہ صفات کے ساتھ نسبت رکھتی ہیں اور تجلیات ذوقی سے دیکھتے ہیں وہ ذات سے نسبت رکھتی ہیں اور تجلیاتِ صوری میں جو کہ آثار کے ساتھ نسبت رکھتی ہیں حق تعالیٰ تمام اشیاء کی صورت میں بندہ پر تجلی فرماتا ہے مفردات، عنصریات، معدنیات، حیوانات اور افرادِ انسان سے۔

---

[1] (دفتر اول مکتوب ۱۴، حاشیہ ۳)

فنائے حقیقی

فنائیت عدم شعور واحساس کا نام ہے، سالک کو جب ذاتِ حق میں اس قدر فنائیت ہو جائے کہ اپنا ہوش بھی نہ رہے تو یہ فنا ہے اور جب اس ہوش نہ رہنے کا بھی ہوش نہ ہو تو اسے فناء الفناء کہتے ہیں۔

ہستیٔ من رفت وخیالش بماند   ایں کہ تو بینی نہ منم بلکہ اوست

فنا کی عام طور پر دو قسمیں ہیں:

۱۔ فنائے ابتدائی   ۲۔ فنائے انتہائی

چنانچہ ان دونوں کے درمیان فنا کی بہت سی اقسام ہیں۔

فنائے ابتدائی یہ ہے کہ سالک شہودِ ممکنات سے گزر کر شہودِ ظلالِ صفات تک پہنچ جائے۔

فنائے انتہائی یہ ہے کہ سالک اسماء وصفات اور شیونات واعتباراتِ ذاتیہ اور مراتب شہودِ ظلالِ وجودیہ کے مرتبوں سے گزر کر ذاتِ حق جلّ وعلا تک پہنچ جائے، یہ فنائے اکمل ہے، اس کو عین الیقین سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہی فنائے حقیقی ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۵۴)

[اس کے بعد اپنا تعین نظر آیا اور اپنی وجہ خاص بھی نظر آئی۔ اپنا تعین تو بوسیدہ اور پارہ پارہ کپڑے کی شکل میں جسے کسی شخص نے پہن رکھا ہو دکھائی دیا۔ اور میں نے اس شخص کو وجہ خاص جانا۔ لیکن یہ حقانیت کے عنوان سے متصور نہ ہوا۔

اس کے بعد اس شخص کے نزدیک ہی ایک باریک چمڑا نظر آیا۔ میں نے اپنے آپ کو عین وہ چمڑا محسوس کیا اور اس تعین کے کپڑے کو اپنے سے الگ دیکھا۔ اور وہ نور جو اس چمڑے میں تھا نظر آیا۔

ایک گھڑی بعد وہ نور نظر سے غائب ہو گیا اور یہ پوست اور کپڑا بھی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ اور وہ پہلی جہالت ہی باقی رہ گئی۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے میرے تعین وجوبی (اسمِ مُربی) پر مطلع فرمایا گیا اور ٹکڑوں میں نظر آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اِسم مُربی میرے اور انوارات کے درمیان برزخ تھا۔ اسی برزخ کو طے کرنے کے بعد سالک پر صفاتِ ذاتیہ کی تجلیات وانوارات شروع ہوتے ہیں۔

تعینِ وجوبی کو اسمِ مربی بھی کہا جاتا ہے اور اسمِ اعظم بھی۔ اگر اس کا حصول اتنا آسان ہوتا تو عوام الناس اور اولیاء عظام میں فرق وامتیاز ہی نہ رہتا۔ غور فرمائیں کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے کتنے مراحل اور منازل طے کرنے کے بعد اسمِ اعظم کے حصول کی خبر دی ہے۔ پس ان منازل کے طے کئے بغیر اور شریعت مصطفوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل ومکمل اتباع کے بغیر اسمِ اعظم کا نشان کیسے مل سکتا ہے۔ اور اگر بالفرض کسی کے بتانے سے پتہ چل بھی جائے تو وہ نااہل شخص اس اسمِ اعظم کو غلط مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرے گا جو دوسروں کے لئے بھی نقصان دہ ہو گا اور خود اس شخص کے ایمان کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو گا۔

حکایت

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ولی اللہ کہیں جارہے تھے۔ راستے میں انہیں ایک جاہل شخص نے دیکھ کر پہچان لیا اور آپ سے اسمِ اعظم سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس خواہش سے باز رہو۔ لیکن جتنا آپ اسے روکتے رہے اتنا ہی اس کا اصرار بڑھتا گیا آخرکار

انہوں نے مجبور ہو کر اُسے اسمِ اعظم بتا دیا۔ جب وہ چلے گئے تو اُس جاہل کو راستے میں کچھ گلی سڑی ہڈیاں نظر پڑیں، اُس نے اسمِ اعظم کی پڑتال کے لئے جوں ہی اسمِ اعظم پڑھ کر ان ہڈیوں پر پھونک ماری اچانک ان میں سے ایک دھاڑتا ہوا شیر وجود میں آ گیا جس نے فوراً ہی اُس شخص پر حملہ آور ہو کر کچا چبا ڈالا۔ کچھ دیر بعد وہی بزرگ جب واپسی ادھر سے گزرے تو دیکھا کہ ایک شیر بیٹھا ہوا ہے اور اُس جاہل شخص کے بقیہ ماندہ جسم کو کھا رہا ہے۔ انہوں نے شیر سے واقعہ کے بارے میں پوچھا تو شیر بولا کہ یہ شخص میرا خالق تو بنا لیکن میرا رازق نہ بن سکا اس لئے میں نے مجبوراً اسے ہی اپنی خوراک بنا لیا۔

اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور اپنے شیخ کو اسمِ اعظم بتانے پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اسمِ اعظم کو مخفی رکھنے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ اُخروی نجات کے لئے عقائد کی درستگی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ پھر حلال و حرام کا علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا درکار ہے۔ بعدہٗ تصوف کا حصول ہے اور جب بندہ ان سارے کام کو عملی طور پر کرتا ہے اور اس میں لیاقت پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اُسے اسمِ اعظم بتانے میں تاخیر نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے فضل سے اسمِ اعظم کی اطلاع عنایت فرما دیتے ہیں اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسمِ اعظم صرف ایک ہی اسم نہیں ہے بلکہ ہر سالک اور ہر ولی کا اپنا علیحدہ اسمِ اعظم ہوتا ہے، پس دوسروں سے اسمِ اعظم پوچھنے کا کیا فائدہ؟

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اپنے مرشدِ بزرگوار کی خدمتِ اقدس میں عرض گزار ہیں کہ میں نے سیر عالمِ وجوب کے دوران اپنے تعین اور اپنی وجہ ٔخاص کو مشاہدہ کیا۔

تعین

کسی شخص کے ذاتی تشخص اور اس کے وجودِ خاص کو اس کا تعین کہا جاتا ہے۔

وجۂِ خاص

شخصِ واحد کے اسمِ مربّی کی تجلیات کا پر تو جو اس شخص کی حقیقت عدمیہ کے ساتھ ممتزج (ملا ہوا) ہو اس کی وجہ خاص کہلاتا ہے۔

بینہ نمبر ا

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے تعیّن کو پرانے پھٹے ہوئے کپڑے کی مانند دیکھا جس کو کسی شخص نے پہنا ہوا ہو۔ اس شخص کو میں نے اپنی وجہ خاص جانا لیکن یہ امر حقانیت کے طور پر متصور نہیں ہوا یعنی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حقیقت میں بھی یہ میری وجۂِ خاص ہے یا نہیں۔

بینہ نمبر ۲

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص کے اُوپر متصل ہی ایک باریک پوست (کھال) نظر آیا اور میں نے اپنے آپ کو اس کھال کا عین معلوم کیا اور تعین کے اس کپڑے کو میں نے اپنے آپ سے بیگانہ دیکھا اور جو نور کہ اس کھال میں تھا نظر آیا کچھ دیر کے بعد وہ نور بھی نظر سے غائب ہو گیا اور یہ پوست اور کپڑا بھی نظر سے ہٹ گیا اور وہی جہالت (نسیانِ ماسویٰ اللہ) باقی رہ گئی۔

آپ کا یہ فرمان دراصل بیانِ واقعہ ہے اور اس کی تعبیر بھی آپ خود ہی ارشاد فرمارہے ہیں۔

واقعہ

حضرات صوفیائے کرام کی اصطلاح میں واقعہ اس امر کو کہا جاتا ہے جو سالک کے قلب میں واقع ہو۔ خواہ بیداری کی حالت میں ہو یا نیند کے عالم میں لیکن یہ ضروری ہے کہ اس وقت سالک کے حواسِ ظاہری معطّل ہوں۔ یاد رہے کہ صوفیاء کرام واقعات کے مشاہدے میں نیند کے محتاج نہیں ہوتے، کیونکہ وہ مشغولیتِ اذکار اور محویتِ مراقبات کی وجہ سے مسدود الحواس ہو جاتے ہیں۔ ان کے ظاہری حواس دنیا کی طرف سے بند ہو جاتے ہیں اور باطنی حواس خالق کی طرف کھل جاتے ہیں۔ پھر پردۂ غیب سے ان پر القاء والہام کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ذَلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیہِ مَنۡ یَشَاءُ (المائدۃ ۵۴)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۵۵)

[اس واقعۂ مذکورہ کی صورت جو علم میں آئی عرض کرتا ہے، تاکہ اس کی صحت و سقم معلوم ہو جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ صورتِ مذکورہ صورتِ علمیہ ہے، جس طرح وجوب اور امکان کے درمیان واسطہ۔ کہ اس کی ہر طرف ایک دوسری سے الگ ہے اور درمیان میں مکمل اور پورا فرق موجود ہے۔ اور وہ پوست (چمڑا) جو اس پرانے کپڑے اور نور کے درمیان واقع ہے وہ عدم اور وجود کے درمیان واسطہ ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اس پوست کے آخر پر جو دیکھا تو اس سے اس برزخ (واسطے) تک پہنچ جانے کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس سے پہلے میں نے اپنے آپ کو واقعات میں عدم اور وجود کے درمیان برزخ اور واسطہ محسوس کیا۔ لیکن ظاہراً وہ آفاق کی نظر سے تھا، اور یہ انفس کی طرف سے۔ اور اس وقت ایک فرق اور بھی ظاہر ہوا تھا بوقت تحریر یاد نہ رہا، اسے ذہن میں رکھیں۔

جو کچھ دائمًا اور ہمیشہ حاصل ہے وہ تو حیرت اور نادانی ہے۔ ہاں کبھی کبھی اس طرح کے شعبدے ظاہر ہوتے ہیں اور پھر ختم ہو جاتے ہیں، اور ان کی صرف معرفت باقی رہ جاتی ہے۔ اور بعض

واقعات کے بیان سے عاجز ہے۔ اگر کوئی چیز علم میں آتی ہے تو اس پر اعتماد نہیں کرتا۔ اسی مناسبت سے عرض داشتوں میں گستاخی کر بیٹھتا ہے۔ ممکن ہے آپ کے بتانے سے کسی امر کا یقین حاصل ہو جائے۔ اس بات کا اُمیدوار ہے کہ آپ کی بلند توجہات سے کمینے اور فضول تعلقات کی گرفتاری سے نجات حاصل ہو جائے۔]

تشریح

حضرت شیخ احمد سرہندی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس ایک ہزار سال کے مجدد ہونے کے باوجود اپنے پیر مرشد کو اپنے حالات سے آگاہ فرما رہے ہیں اور ساتھ دعا اور باطنی توجہ کی بھی درخواست کر رہے ہیں اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ سالکِ راہ کو اپنے شیخ سے دعاؤں اور توجہات کی درخواست کرتے رہنا چاہیئے۔ صاحب توجہ شیخ شروع میں اپنے مُریدین کو صحبتِ توجہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے خاموشی اختیار فرماتے ہیں اور ذکر کی صورت کو ظاہر کرتے ہیں تاکہ نئے مریدین و مبتدی توجہ کے حصول کے لئے متوجہ ہو جائیں اور اپنے لطائف پر توجہ مرکوز کریں تاکہ توجہ کا اثر پیدا ہو جائے لیکن اگر شیخ صاحب توجہ میں مشغول ہوں اور مرید دنیا کے خیالات میں گم سُم بیٹھا ہو تو توجہ کے کامل اثرات نہیں پڑتے۔ بعد ازاں جب مُریدین توجہات کو محسوس کرنے لگیں تو ضروری نہیں کہ اُن کا شیخ انہیں متوجہ کرنے کے لئے خاموشی اختیار کرے بلکہ عین گفتگو اور بحث و مباحثہ کے دوران بھی توجہ کی جا سکتی ہے کیونکہ توجہ باطن سے ہوتی ہے جبکہ گفتگو تو ظاہر کی محتاج ہے۔ ہاں سالکوں کو چاہیئے کہ محفل کے آداب کا خاص خیال رکھیں اور اپنے قیمتی وقت کو ہنسی مذاق اور غفلت میں ضائع نہ کریں بلکہ خاموشی کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر اپنے شیخ سے توجہات حاصل کریں کہ ترقی ان ہی توجہات کی مرہونِ منت ہے۔ توجہ کے لئے اپنے شیخ سے درخواست بھی کی جا

سکتی ہے لیکن چونکہ پیر و مرید کا باطنی رشتہ اور روحانی رابطہ برقرار رہتا ہے اس لئے توجہ خود بخود مُرید کی طرف متوجہ رہتی ہے شیخ سے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا حافظ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

جامِ جہاں نما است ضمیرِ منیرِ دوست   احتیاج خود آنجاہ چہ حاجت است

ترجمہ: میرے شیخ کا قلب جام جہان نما ہے وہ میری محتاجی کو سمجھتے ہیں کہ مجھ پر توجہ فرمائیں جب مجھے توجہ کی محتاجی کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھے اپنے شیخ سے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

تعبیراتِ واقعہ

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے اس واقعہ کی تعبیرات کو خود اس مکتوب میں بیان فرما کر اپنے مُرشدِ برحق سے استدعا کی ہے کہ اس بیانِ تعبیر کی صحت و غلطی پر بندہ کو مطلع فرمایا جائے تاکہ تسکین واعتمادِ قلبی حاصل ہو جائے۔(آپ کی یہ استدعا بر سبیل انکسار ہے۔)

چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ واقعہ میں جو کچھ دیکھا گیا ہے یہ اعیانِ ثابتہ کا شہود ہے۔

واقعہ میں آپ نے جس شخصِ لابس (پھٹے پرانے کپڑے والا) کو دیکھا اس سے مراد اسمِ مُربی کی تجلیات ہیں اور لابس سے مُراد اس شخص کی حقیقتِ عَدمی ہے اور وہ باریک پوست (کھال) جو کپڑے اور نور کے درمیان تھا وجود وعدم کا مقامِ برزخیت ہے کہ نور سے اشارہ عالمِ وجود کی طرف ہے اور کپڑے سے مراد عدم ہے۔

اعیانِ ثابتہ

عَدَماتِ متقابلہ و صورِ علمیہ جو مرتبۂ اولیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود تھیں لیکن خارج میں ان کا وجود نہ تھا۔ مرتبۂ ثانیہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کے انعکاس نے انہیں خارج میں بھی موجود کر دیا، اعیانِ ثابتہ کہلاتی ہیں۔ یعنی حقیقت کائنات عدم اور پر تو صفات سے مرکب ہے کیونکہ عدم وجودِ خارجی نہیں رکھتا تھا جب اس کے ساتھ صفت کا ملاپ ہوا تو وجودِ خارجی پیدا ہو گیا۔ پس اعیانِ ثابتہ اپنے وجودِ خارجی سے پہلے عدمات وصفات کے امتزاج کے مرتبے کا نام ہے اور ممکنات کا وجود خارجی اس کے وجودِ علمی کا ظلّ ہے۔

اعیانِ ثابتہ اور حضرت ابنِ عربی قُدس سرہٗ

حضرت شیخِ اکبر محی الدین ابنِ عربی قدس سرہٗ اور ان کے مؤیدین صوفیائے وجود یہ فرماتے ہیں:

اَلْاَعْیَانُ مَا شَمَّتْ رَائِحَۃَ الْوُجُوْدِ۔[1]

یعنی اعیان ثابتہ اور موجوداتِ علمی نے وجودِ خارجی کی خوشبو کو بھی نہیں سونگھا۔

ان کا مسلک یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا خارج میں کوئی شے موجود نہیں اور صفاتِ ثمانیہ حقیقۃً بھی وجود خارجی نہیں رکھتیں، بلکہ صفات عین ذات ہیں اور اُن کے نظریۂ ہمہ اُوست کی یہی بنیاد ہے۔

---

[1] (فصوص الحکم، کلمۂ ادریسیہ)

اعیانِ ثابتہ اور حضرت امامِ ربانی قُدِّس سرہٗ

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور آپ کے مؤیدین صوفیائے شہودیہ کے نزدیک ممکنات خارج میں موجود ہیں اور صفات ثمانیہ حقیقیہ بھی وجود خارجی رکھتی ہیں اور ذات سے خارج میں متمیّز ہیں اور وہ تمیز بھی ہمارے ادراک سے وراء ہے۔ آپ کے نزدیک اعیانِ ثابتہ ان حقائق ممکنات کا نام ہے جو عدماتِ متقابلہ اور انعکاساتِ صفاتِ کاملہ کے ظلال سے وجود پزیر ہوئے ہیں۔ چونکہ تمام ممکنات عدم سے بنے ہیں اور عدم محض ظلمت وشر ہے، اسی لئے ممکنات عالمِ وجوب سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور نہ ہی ممکنات عینِ ذات ہوسکتے ہیں۔

تَعَالَی اللہُ عَنْ ذَالِکَ عُلُوًّا کَبِیْرًا ان کے نظریہ ہمہ از اُوست کی یہی بنیاد ہے۔[1]

بینہ نمبر ۳

واضح ہو کہ صوفیائے وجودیہ نے صفات ثمانیہ کے وجود خارجی کا اس لئے انکار کیا ہے کہ ابتدائی مرتبے میں مراتبِ وجوب کے مشاہدے کے دوران بسببِ ضعفِ بصیرت انہیں صفات مشہود نہیں ہوتیں۔ اسی بناء پر وہ سرے سے صفات کے وجودِ خارجی کا انکار کردیتے ہیں لیکن جب ان کی بصیرت ذاتی تجلی کے نور سے منور ہوتی ہے تو پھر انہیں صفات، ذات سے الگ مشہود ہو جاتی ہیں۔ ثابت ہوا کہ توحیدِ وجودی کے مرتبے میں عالمِ وجوب کی تجلیات سالک کی بصیرت کو مغلوب کردیتی ہیں اور توحیدِ وجودی غلبۂ احوال وسُکر ہی کا نتیجہ ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۵۷)

---

1 (تفصیل کے لئے دفتر دوم، مکتوب اول ملاحظہ فرمائیں۔)

[ورنہ کام بہت مشکل ہے۔

بے عنایت حق وخاصان حق گر ملک باشد سیاہ ہستش ورق

ترجمہ: اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے بندگان خاص کی عنایات کے بغیر اگر کوئی فرشتہ سرشت بھی ہو تو اس کا نامہ عمل سیاہ ہی ہے۔]

تشریح

حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے خاص بندوں کے ساتھ دوستی اور قلبی رابطہ نہ ہو تو وہ کتنا ہی نیک خصلت کیوں نہ ہو اس کا نامہ اعمال سیاہ ہی رہے گا۔

حضرت عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک نوجوان آیا سلام کیا اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے آمنے سامنے خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ کون ہے؟ وہ نوجوان بہت زیادہ خوبصورت تھا کچھ دیر تک وہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجلس میں بیٹھا رہا پھر اجازت چاہی آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کے حق میں دعاء فرمائی وہ بہت خوش ہوا اور چلا گیا۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے نوجوان آیا، اور آپ نے دعا اور توجہ فرمائی اور وہ چلا گیا، اس کے جانے کے بعد اہل مجلس نے آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت یہ نوجوان کون تھا لوگوں کے بہت اصرار پر آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ یہ چوتھے آسمان کا فرشتہ تھا اس سے کوئی لغزش ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس کو زمین پر اتار دیا وہ میرے پاس آیا کہ دعا فرمائیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ میری لغزش معاف فرما دے جب میں نے دعا کی تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس کی لغزش معاف فرما دی اور اسے اس کا مقام واپس عنایت کر دیا۔

ملائکہ کرام گناہ ونافرمانی سے محفوظ رہتے ہیں البتہ لغزش ان سے بھی واقع ہوسکتی ہے جس کی مثال اوپر کی حکایت میں موجود ہے پس چاہیئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے مُقربین کے ساتھ تعلق قائم ہو جائے اور پھر اُن کی محافل کی حاضری کو اپنے اوپر لازم کرلیں تاکہ دنیاوی واخروی نجات حاصل ہو۔ کہ ان قدسی صفات لوگوں کی عنایات ہی کامیابی وکامرانی کا سبب ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابوالبیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اپنے مرشد بزرگوار علیہ الرحمۃ کی خدمت میں عرض پرداز ہیں کہ واقعات وواردات کی تعبیر وتاویل میں آپ کی طرف اس لئے رجوع کرتاہوں تاکہ آپ کی وضاحت اور نشاندہی سے ان امور کے ساتھ یقین پیدا ہو جائے کیونکہ آپ کی بلند توجہات کے بغیر کام بے حد مشکل ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی عنایات کے بعد اس کے نیک اور خاص بندوں کی توجہاتِ قُدسیہ ہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے وسیلہ بنتی ہیں، حتیٰ کہ فرشتوں کا اعمال نامہ بھی سیاہ ہی رہتاہے۔ جب تک کہ خاصانِ حق کی عنایاتِ کریمانہ شامل نہ ہوں، آپ نے اس امر کا اظہار ایک شعر کی صورت میں فرمایاہے اور اہلِ کشف کے نزدیک یہ حقیقت نفس الامر میں ثابت ہے کہ مقربین ذات کے فیوض وبرکات انسانوں اور جنوں کے علاوہ فرشتوں کو بھی حاصل ہوتے ہیں، لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتاہے، جس کا جواب دیناضروری معلوم ہوتاہے۔

سوال: جب فرشتے معصوم ہیں، ارتکابِ معصیت بھی نہیں کرتے، نیز اپنے مقامات سے آگے عروج وترقی بھی ان کے لئے ثابت نہیں تو پھر ان کو خاصانِ حق کی عنایات کی کیاحاجت ہے؟

جواب: بلاشبہ فرشتوں سے گناہ صادر نہیں ہوتے مگر تقصیر اور ترکِ اولیٰ ان سے ممکن ہے۔

جیسا کہ حکایت ہے کہ خواجۂ جہاں حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی قدس سرہٗ کی مجلس شریف میں

ایک خوبرو نوجوان حاضر ہوا اور اپنی حاجت پیش کی۔ حضرت خواجہ نے فوراً دستِ دُعا اٹھائے اور اس کے لئے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا فرمائی، وہ خوبصورت جوان بہت خوش ہوا اور اجازت لے کر رُخصت ہو گیا۔ مجلس میں حاضر کسی محرم راز نے اس معاملے کی وضاحت پوچھی تو حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ چوتھے آسمان کا فرشتہ تھا کسی تقصیر یا ترکِ اولویت کی وجہ سے اس کو آسمان سے دنیا کی طرف اتار دیا گیا تھا۔ آج اللہ تعالیٰ نے کمال لطف و کرم سے اس فقیر کی دعاء اس کے حق میں قبول فرمالی ہے اور اس کو دوبارہ چوتھے آسمان میں اس کے مقام پر فائز کر دیا گیا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی طرف احتیاج رکھتے ہیں۔ [1]

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۵۹)

[شیخ عبد اللہ نیازی کا بیٹا شیخ طٰہٰ جو سرہند کے مشہور مشائخ میں سے ہے اور حاجی عبد العزیز بھی ان سے پوری واقفیت رکھتا ہے۔ قدم بوسی اور نیاز مندی عرض کرتا ہے۔ اور اسے بھی بلند اور شریف طریقہ کی طرف رجوع اور تقاضا پیدا ہو چکا ہے۔ صدق و نیاز سے التجاء کرتے ہیں۔ میں نے اسے استخارہ کرنے کو کہا ہے۔ ویسے ظاہراً وہ اس طریقہ سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور وہ دوست جنھوں نے یہاں سے ذکر کی تعلیم حاصل کی ہے، ان میں سے اکثر رابطہ کے طریقہ پر مشغول ہیں۔ ان میں سے بعض تو واقعات میں دیکھ کر رابطہ اختیار کر چکے ہیں اور ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ اور بعض دہلی سے آنے سے پیشتر رابطہ کا تعلق رکھتے تھے اور پہلے سے حضور و استغراق کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان میں سے بعض صفات کو اصل دیکھتے ہیں اور بعض اصل سے نہیں دیکھتے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان میں سے کوئی بھی توحید وجودی کے انوار و مکاشفات کے راستے پر نہیں چل رہا۔]

---

[1] (نفحات الانس)

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس برصغیر کی وہ بلند پایہ شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے مکتوبات کے ذریعے شریعت وطریقت کے قوانین کو لوگوں تک پہنچایا۔ اور یہاں بھی آپ تصوف کے شائقین کو اپنی عملی زندگی سے ایک پیغام دے رہے ہیں کہ جب کوئی شخص ایک شیخ طریقت سے بیعت کرنے کے لئے آئے تو شیخ کو چاہیئے کہ قبل از بیعت خود بھی استخارہ کرے اور آنے والے کو بھی استخارہ کرنے کو کہے تاکہ اس اہم معاملے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مرضی ومنشاء معلوم ہو جائے اور ان دونوں کو بھی اطمینان ہو جائے۔ اور چاہیئے کہ استخارہ بھی مکرر کیا جائے۔ استخارے کی تعلیم ہمیں حدیث مبارکہ سے بھی ملتی ہے اور مشائخ کرام کی تعلیمات سے بھی۔ اور استخارے کا طریقہ کار بھی حدیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم میں بتا دیا گیا ہے۔ تاہم مشائخ نقشبندیہ میں ایک مجرب طریقہ کار یہ ہے کہ استخارہ کرنے والا عشاء کی نماز کے بعد سونے سے قبل باوضوء ہو کر قبلہ رُخ بیٹھے اور اول وآخر گیارہ دفعہ درود ابراہیمی پڑھے اور اس کے درمیان سورۃ الفاتحہ بمعہ تسمیہ کے اکتالیس دفعہ پڑھ کر اس سارے عمل کا ثواب حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی رُوح پُر فتوح کو پہنچا کر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ میں فلاں پیر صاحب سے بیعت کرنا چاہتا ہوں اور آپ سے دعا کرتا ہوں کہ میرے اس کام میں برکت ڈال کر مجھے مطلع فرمایئے۔ اس کے بعد باوضوء حالت میں قبلہ رُخ ہو کر سو جائے اور کسی سے بات چیت نہ کرے۔ پھر اگر کوئی نشانِ راہ مل جائے تو فبہا ورنہ دوسرے دن پھر اسی طرح استخارہ کرے، سات دن یہی عمل کرنے سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ رہنمائی فرما دیتے ہیں۔

البتہ خواب میں معلومات کا حاصل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر معلومات نہ ہوں تو ساتویں دن صبح اُٹھ کر اپنے دل سے مشورہ کرے۔ جو خیال غالب ہو اسی پر عمل کرے۔ اور اگر خواب کی صورت میں کوئی اشارہ مل جائے تو کسی متقی عالم سے اس کی تعبیر کے متعلق پوچھ کر اُس پر عمل کرے۔

جہاں تک ہم نے دیکھا ہے بہت ہی کم ایسے مشائخ ہوں گے جو کسی کو مرید بنانے سے پہلے اُسے استخارے کی ترغیب دیتے ہوں۔ ورنہ ہر کسی کو اپنے مُریدوں کی تعداد بڑھانے کا شوق ہے۔ اور ہر کوئی ان کی کثرت پر نازاں ہے جبکہ مریدین کی کثرت تو تصوف میں مقصود نہیں ہے، بلکہ ظاہری وباطنی اور اخلاقی تربیت ہی وہ اہم ذمہ داریاں ہیں جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے مُقربین کو سپرد کی ہوتی ہیں۔ اگر ان ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مریدین کی کثرت بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں اور اگر مریدین تو لاکھوں میں ہو جائیں لیکن ان کی تعلیم وتربیت کا فریضہ ادا نہ ہو سکے تو کیا مُریدین کی کثرت اُخروی زندگی میں کچھ فائدہ دے سکے گی؟ ہر گز نہیں۔ ہاں دُنیا میں شہرت اور خدمت خوب ہو جائے گی۔

رابطۂ شیخ

دوسری اہم بات جو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے بیان فرمائی ہے وہ ہے رابطۂ شیخ۔ رابطۂ شیخ سے مراد یہ ہے کہ مُرید اپنے شیخ سے ملاقات کے وقت ان کے چہرہ کو غور سے دیکھ کر اپنے دل میں جاگزین کر لے اور پھر جب اکیلا ہو تو اپنے شیخ کے چہرہ مبارک کو اپنے تصور میں لائے۔ اگر یہ تصور قائم نہ ہو سکے تو پھر یہ تصور کرے کہ میں اپنے پیر ومرشد کی صحبت میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اس طریقہ کو رابطۂ شیخ کہتے ہیں اور باطنی ترقی میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ پس جب تک کسی سالک کا قلب صوری یا حقیقی معنوں میں ذاکر نہ ہو جائے اور اُس کا رابطۂ شیخ پختہ نہ ہو جائے اُس

وقت تک وہ سالک اہلِ قبور سے فیض اخذ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اتنی دفعہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے ہیں یا اتنا عرصہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مزار پر رہے ہیں لیکن اخذ فیض نہیں کر سکے۔ بھلا اخذِ فیض کیسے ہو جبکہ اُن کے دل کے قفل ابھی تک بند ہیں۔ نہ تو انہوں نے کسی کامل شیخ سے بیعت کی ہے، نہ اُن کا قلب ذاکر ہوا ہے اور نہ ہی وہ رابطۂ شیخ کی دولت سے مستفید ہوئے ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی خدمت میں جو مریدین سلوک کی تفصیلی سیر کے لئے حاضر تھے آپ ان کی استعداد کے بارے میں اپنے مُرشدِ برحق کی خدمت میں رقم طراز ہیں کہ ان طالبوں کی اکثریت طریقِ رابطہ میں مشغول ہے۔

طریقِ رابطہ

رابطہ سے مراد یہ ہے کہ مُرید اپنے شیخ کی صورت کو اپنے دل یا خیال میں محفوظ رکھے اس طرح کہ شیخ کا تصور اس پر غلبہ کر جائے۔ جب یہ رابطہ بڑھ جائے اور ہر طرف شیخ کی صورت نظر آئے تو اُسی کو فنا فی الشیخ کہتے ہیں، اسی طریق رابطہ کو تصورِ شیخ اور شُغلِ برزخ بھی کہا جاتا ہے۔

اثبات طریقِ رابطہ

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "سایۂ رہبر بہتر است از ذکرِ حق" یعنی رابطہ کا طریقہ ذکر سے زیادہ مفید ہے۔

- حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "صاحب ایں معاملہ مستعد تام المناسبت است" یعنی صاحبِ طریق رابطہ صاحبِ استعداد اور کامل مناسبت کا حامل ہوتا ہے۔
- حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے طریقِ رابطہ کے ثبوت پر دلائل بھی پیش فرمائے ہیں۔[1]
- قرآن پاک میں فرمایا گیا: كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (التوبۃ ۱۱۹) یعنی صادقین (سچوں) کے ساتھ صحبت رکھو اور یہ کینونیت اور صحبت دو قسم پر ہے۔ کینونیتِ ظاہری اور کینونیتِ باطنی۔ طریق رابطہ کینونیت باطنی ہی کا نام ہے۔
- طریقِ رابطہ (تصورِ شیخ) کے ثبوت میں مندرجہ ذیل حدیث بھی دلیل ہے:

قَالَ عَبْدُ اللهِ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْكِي نَبِيًّا مِنْ الْأَنْبِيَاءِ۔[2]

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ گویا میں دیکھتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی طرف کہ آپ حکایت فرماتے ہیں حال ایک نبی کا منجملہ انبیاء کے۔

اس حدیث کا یہ جملہ "گویا میں دیکھتا ہوں" رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اس حالت (غائب کو خیال نظر سے مثل حاضر کے دیکھنا) کی طرف اشارہ ہے جو حقیقت ہے۔ طریقِ رابطہ کی یہ حالت کبھی خود بخود طاری ہو جاتی ہے اور کبھی تکلف کے ساتھ پیدا کی جاتی ہے۔

---

[1] (مکتوبات معصومیہ، دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۶۵)

[2] (صحیح البخاری، ج ۱، ص ۴۹۵)

تصورِ شیخ کے فوائد

تصورِ شیخ کے بے شمار فوائد ہیں۔

پہلا فائدہ

تصورِ شیخ سے وحدتِ خیال کی مشق ہوتی ہے اور وحدتِ خیال کے حصول کے ذریعے ذاتِ احدیت کے مشاہدے کے لئے راہ کھلتی ہے۔

دوسرا فائدہ

تصورِ شیخ باطنی مناسبت کے حصول کا مؤثر ذریعہ ہے۔ مبتدی طالب ابتدائی مرحلے میں عالمِ وجوب کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتا بلکہ عالمِ وجوب میں قدسیت محضہ ہے اور طالب میں بشریت محضہ ''چہ نسبت خاک را بعالم پاک'' لیکن شیخِ کامل ''قُدسیت وبشریت'' دونوں کا جامع ہوتا ہے۔ اس کے باطن میں قُدسیت کی نسبت ہوتی ہے اور ظاہر میں بشریت کا رنگ۔ لہٰذا طالب بشریت کی بناء پر شیخ کے ساتھ یک گونہ مناسبت رکھتا ہے۔ انبیاء کو بشریت کے ساتھ مبعوث فرمانے میں بھی یہی حکمت کار فرما ہے کہ مخلوقِ خدا بشریت کی نسبت سے ان سے فیوض حاصل کر سکے۔ واللہ اعلم

قیومِ ثانی حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ اپنے مکتوباتِ قُدسیہ میں فرماتے ہیں کہ ہر سالک قبورِ اولیاء سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ یہ سعادت اس سالک کو حاصل ہوتی ہے جو فنائے قلب سے مشرف ہو کیونکہ فنائے قلب سے پہلے اس میں عدمِ مناسبت کی بناء پر استفادہ کی اِستعداد نہیں ہوتی۔

تیسرا فائدہ

تصورِ شیخ سے طالبِ صادق ہر جگہ شیخ کو اپنے ساتھ ملاحظہ کرتا ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام زلیخا کے فتنے سے تصور حضرت یعقوب علیہ السلام کے سبب سے نجات پاگئے تھے معلوم ہوا کہ نسبتِ رابطہ سببِ نجات ہے۔

چوتھا فائدہ

نسبتِ رابطہ (تصورِ شیخ) باطنِ شیخ سے انوار و تجلیات اور فیوض وبرکات حاصل کرنے کا وسیلہ ہے جب طالب نسبت رابطہ قائم کرتا ہے تو شیخ کے لطائفِ باطنیہ سے اس کے لطائف پر انوار و تجلیات منعکس ہوتے ہیں کیونکہ فیوض انعکاسی ہوتے ہیں۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں:

نسبتِ رابطہ ہموارہ شمار ابا صاحبِ رابطہ میدارد وواسطہ فیوض انعکاسی می شود شکر این نعمتِ عظمیٰ بجا باید آورد۔[1]

یعنی رابطہ کی نسبت تم کو ہمیشہ صاحبِ رابطہ کے ساتھ رکھتی ہے اور شیخ کے فیوض وبرکات کے پرتو کا واسطہ ہے اس بڑی نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہیئے۔

آپ کے اس فرمان سے معلوم ہوا کہ تصورِ شیخ مُرشد کے کمالات کے جذب کا واسطہ ہے۔

رابطے کے طریقے

تصورِ شیخ کے کئی طریقے ہیں۔

---

[1] (دفتر دوم، مکتوب نمبر ۲۴)

پہلا طریقہ

مُرید ہر تصور اور خیال سے اپنے دل کو خالی کر ڈالے۔ آنکھیں بند کر لے اور شیخ کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ سمجھتے ہوئے شیخ کو اپنے سامنے بیٹھا ہوا تصور کرے اور اس کے لطیفہ ٔقلب سے اپنے لطیفہ ٔقلب میں فیض آتا ہوا دیکھے۔

دُوسرا طریقہ

اپنے شیخ کی صورت اپنے دل کے آئینے میں ملاحظہ کرتا رہے۔

تیسرا طریقہ

شیخ کی صورت کو اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان محبت اور تعظیم کے طور پر خیال کرتا رہے اگرچہ بظاہر شیخ دور بھی ہو، اس کی صورت بھی وہی فائدہ دے گی جو اس کی صحبت فائدہ دیتی ہے۔

چوتھا طریقہ

مُرید اپنا وجود شیخ کے وجود میں گم کر دے اور اپنے آپ کو عین شیخ تصور کرے، بعض اوقات مرید غلبہ ٔمحبت شیخ کی وجہ سے شیخ کے افعال واقوال اور آثار و حرکات بھی اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کی طبیعت میں سے "انا الشیخ" کی آواز آنے لگتی ہے۔

حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ اسی منزل میں اپنے شیخ کے متعلق لکھتے ہیں:

خُسرو رین سہاگ کی سوئی میں پی کے سنگ
تن مورا مَن پی کا ہو یا دونوں ایک ہی انگ

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۶۳)

آگے چل کر حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ میرے سارے مریدین وحدت الشہودی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی وحدت الوجودی کیفیت کا حامل نہیں ہے۔ تاہم اگر کسی سالک پر وحدت الوجودی کیفیت طاری ہو جائے تو اُس کے شیخ کو چاہیئے کہ وہ اُسے اہلِ سنت وجماعت کے عقائد کی تلقین کرے اور اس کے باطن پر توجہات دے تا کہ اُس کی وحدت الوجودی کیفیت محو ہو جائے۔ کیونکہ اس کیفیت میں سالک کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

[ملا قاسم علی، ملا مودود محمد اور عبد المؤمن مقام جذبہ سے بظاہر نقطۂ فوق تک پہنچ چکے ہیں، لیکن ملا قاسم علی ارشاد و تکمیل کے لئے مخلوق کی طرف توجہ رکھتا ہے۔ دوسرے دو کے متعلق معلوم نہیں کہ اس طرف توجہ ہے یا نہیں۔]

تشریح

تصوف میں داخل ہونے والا ہر شخص سب سے پہلے جذبہ کو اور اس کے بعد سلوک کے مقامات کو طے کرتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ تاہم دونوں میں فرق بیان کر دیا جاتا ہے تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ جذبہ والا مُرید وہ ہوتا ہے جس نے بچپن ہی سے اپنے آپ کو بُرے کاموں سے بچایا ہو اور نیک کاموں کی کوشش کی ہو۔ اور سلوک والا مرید وہ ہوتا ہے جو لطائفِ خمسہ کو طے کر رہا ہو۔ ان لطائفِ خمسہ کو طے کرنے کے بعد سالک نقطۂ فوق تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسا سالک ہی ولی اللہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے وہ خود بھی ہر وقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے اور لوگوں کو بھی اپنے مالکِ حقیقی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

[شیخ نورا ابھی نقطہ تک پہنچا نہیں، اس کے نزدیک ہے۔ ملا عبد الرحمٰن بھی نقطہ کے نزدیک ہے۔ تھوڑی سی مسافت درمیان میں باقی ہے۔

ملا عبد الہادی نے حضور میں استغراق پیدا کر لیا ہے، اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ذاتِ مطلق جل شانہٗ کو میں اشیاء کے اندر صفتِ تنزیہ کے ساتھ دیکھتا ہوں اور افعال کو بھی اس ذاتِ مقدس کی طرف سے جانتا ہوں۔ یہ آپ کے گھر کی دولت ہے جو طالبوں اور سعادت مندوں پر فائض اور وارد ہو رہی ہے۔ اور اس کمینے کا اس فیض رسانی میں کچھ حصہ نہیں۔

من ہماں احمد پارینہ کہ ہستم ہستم

ترجمہ: میں تو وہی پُرانا احمد ہوں جو کہ تھا۔]

تشریح

ذاتِ مطلق جل شانہٗ کو اشیاء کے اندر صفتِ تنزیہ کے ساتھ دیکھنے سے مراد ہے "ذاتِ مطلق جل شانہٗ کو اشیاء میں جدا دیکھنا"۔

"اور اس فیض رسانی میں کچھ حصہ نہ ہونا" یہ قول توحیدِ حقیقی کا اثر ہے۔ اس توحید پر مشرف ہونے والا سالک ہر معاملے میں اپنی ذات کی نفی کرتا ہے اور ہر کام کو صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے جانتا ہے تاہم مشائخ کرام کے احسانات کو بھی نہیں بھولتا بلکہ ان کا مشکور رہتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

مَنْ لَایَشْکُرُ النَّاسَ لَایَشْکُرُ اللہَ عَزَّ وَ جَلَّ۔[1]

ترجمہ: جو شخص لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔

---

[1] (مسند احمد، ج۱۸، ص۲۳۳، مشکوٰۃ، باب العطایا، ص۲۶۱)

اس لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ یہ آپ کے گھر کی دولت ہے جو طالبوں اور سعادت مندوں پر فائض اور وارد ہو رہی ہے۔

[آپ نے ایک روز واقعات میں سے ایک واقعہ کے درمیان فرمایا تھا کہ اگر اس (مجدد صاحب قدس سرہٗ) میں محبوبیت کے معنیٰ نہ ہوتے تو مقصد تک پہنچنے میں بہت دیر لگتی۔ اور اس (مجدد صاحب قدس سرہٗ) کی محبوبیت بھی اپنی عنایت ومہربانی سے بیان کی تھی۔ اس بات سے پوری امید ہے، اور یہ جرأت اور گستاخی اسی بنا پر ہے۔]

تشریح

سالکین تصوف کے عموماً دو درجات ہیں۔ ایک درجہ کے سالکین مُحب کہلاتے ہیں جبکہ دوسرے درجہ کے سالک کو محبوب کہا جاتا ہے۔ اور محبوب، مُحب سے بہت اونچے درجے کا ولی اللہ ہوتا ہے۔ پھر محب وہ سالک ہیں جو بعد از بلوغت گناہوں سے تائب ہو کر ذکر وفکر میں مشغول ہوں جبکہ محبوبین کی زندگیوں میں قبل از بلوغت بھی سُنتِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا رنگ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی لئے محبوب جب کسی کامل شیخ سے بیعت کرتے ہیں تو اونچے درجات تک جلد ہی رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور اسی بات کی طرف حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اشارہ فرمایا ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے قول کے مطابق اگر مجھ میں محبوبیت کے نشانات نہ ہوتے تو میں مقصدِ حقیقی تک بہت دیر سے پہنچتا۔ البتہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل وکرم اور اپنے شیخ مقتدا کی توجہات کے طفیل محبوبیت کی وجہ سے جلد ہی واصل ہو گیا۔ محبوب ہونے کے باوجود حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے شیخ کے احسانات کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں تاکہ نفس کی گمراہی اور تکبر کا راستہ نہ ڈھونڈ لے۔ ہاں یہ بات

بھی ذہن نشین رہے کہ سالکینِ طریقت میں محبوبیت رکھنے والے صوفی عموماً بہت قلیل ہوتے ہیں ہر کس وناکس اس عالی مقام کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

اس فرمان سے معلوم ہوا کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس درجہ محبوبیت پر فائز ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شانِ محبوبی سے سرفراز ہیں۔

درجہ محبوبیت

یہ مقام حُبّ حقیقی کا مرتبہ ہے۔ حدیث قُدسی: کنت کنزا مخفیا فأحببت أن أعرف۔ [1] کے مطابق یہاں حُبّ ظہور و توجہ بہ خلق رونما ہوئی۔

سرِّ حب ازلی در ہمہ اشیاء ساریست ورنہ بر گل نہ زدے بلبلِ نالاں فریاد

حقیقتِ محبت تمام محبتوں اور محبوبوں میں جاری وساری ہے، محبیت و محبوبیت لوازمِ حقیقت محبت سے ہیں۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس رقم طراز ہیں:

سَرِ حلقۂ محبّان حضرت کلیم اللہ است علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام وسر گروہِ محبوبان حضرت خاتم الرسل است علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیمات والتحیات وبہ تبعیت ووراثتِ این صاحب دولتان ہر کرا باین دو مقام مشرف سازند۔ [2]

---

[1] (روح المعانی، ج ۱۴، جزء ۲۷، ص ۲۱)

[2] (دفتر دوم، مکتوب نمبر ۷۴)

ترجمہ: مُحبوں کے سردار حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں اور محبوبوں کے سرتاج خود حضرت خاتم الرسل علیہ و علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات ہیں۔ باقی جس کو بھی یہ دو مقام (محبیت یا محبوبیت) عطا ہوئے ان ہی بزرگوں کی نیابت اور وراثت کے طور پر حاصل ہوئے ہیں۔

اولیائے محبوبین

واضح ہو کہ محبوبیتِ مطلقہ خاصہ ٔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہے بعض اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کو آپ کی متابعت ووراثت کی برکت سے یہ مرتبہ ٔمحبوبیت عطا ہوا ہے جن میں حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت نظام الدین دہلوی، محبوب الٰہی حضرت خواجہ سید بہاؤ الدین محمد اویسی بخاری المعروف شاہِ نقشبند اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی قدست اسرارہم سرفہرست ہیں۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیہِ مَنْ یَشَاءُ (المائدۃ ۵۴)

امامِ ربانی محبوب سبحانی ہیں

زیرِ نظر مکتوبِ گرامی سے واضح ہوا کہ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ''محبوب'' کے لقب سے نوازا۔

ایک مکتوب میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے:

''میرا طریق سُبحانی ہے کیونکہ میں تنزیہہ کی راہ سے خدا تک پہنچا تا ہوں''۔[1]

[1] (مکتوبات، دفتر سوم، مکتوب نمبر ۸۷)

نیز آپ محبوب خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے نائب ہونے کی حیثیت سے بھی محبوبِ خدا جلّ وعلا ٹھہرتے ہیں۔ آپ کے اس ارشاد سے آپ کا سُبحانی نسبت کا حامل ہونا بھی معلوم ہوا اس لئے آپ کو "محبوب سُبحانی" کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۶۶)

اللھم اغفر لکاتبہٖ ولمن سعٰی فیہٖ ولوالدیھم ولاساتذیھم ولاھل بیتھم اجمعین

آمین یارب العالمین

مکتوب نمبر ۱۵

[ان حالات کے بیان میں جو ہبوط اور نزول سے مناسبت رکھتے ہیں۔ نیز بعض مخفی اسرار کے بیان میں۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے مرشد بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:]

تشریح

ہبوط ونزول ایک ہی معنی رکھتے ہیں اور ان سے مراد یہ ہے کہ سالک کے لطائف عروج حاصل کرنے کے بعد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق کو دعوت الی اللہ کے لئے واپس رجوع کریں۔ اگر کسی سالک کو عروج ملے لیکن اُس کا نزول نہ ہو یا صرف نزول ہی ہو اور عروج حاصل نہ ہو تو وہ سالک ناقص ہی رہتا ہے۔ نہ تو وہ سلوک میں کمال حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ ہاں ضروری نہیں یہ عروج ونزول سارے لطائف میں ہو۔ کسی ایک لطیفہ میں عروج ونزول کا حاصل ہو جانا بھی بڑی غنیمت ہے۔

[اس بندے کی عرض داشت جو حاضر بھی ہے اور غائب بھی، جو پانے والا بھی ہے اور نہ پانے والا بھی اور رجوع کرنے والا بھی ہے اور اعراض کرنے والا بھی۔]

تشریح

حاضر وغائب، پانا و نہ پانا اور رجوع واعراض کرنا یہ سب باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کی تشریح یوں ہے کہ حاضر سے مراد یہ ہے کہ سالک کی رُوح نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف عروج کیا ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو گئی ہے اور غائب کے یہ معنی ہیں کہ سالک کا نفس نزول کر کے غائب ہو چکا ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس

[عرض یہ ہے کہ مدت دراز تک وہ مطلوب حقیقی کی تلاش کرتا رہا مگر اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ہی پایا۔]

تشریح

تصوف میں شامل ہونے کے بعد صوفی کو شیخ کامل و مکمل کی توجہات کی برکت سے عروج حاصل ہوتا ہے لیکن اگر عروج کے بعد اُس کا نزول نہ ہو تو وہ سالکِ وحدت الوجودی کیفیت کا حامل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ ہر عروج میں اپنے آپ کو ہی پاتا ہے۔ جیسے حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عروج میں اپنے آپ کو پایا ت انا الحق کہہ دیا۔ یوں ہی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عروج میں اپنے آپ کو پایا تو سبحانی ما اعظم شانی کہہ دیا۔ تو یہ وہ حالت ہوتی ہے جس میں روح اور جسم اکٹھے ہوتے ہیں اور اس کو مقامِ جمع کہا جاتا ہے اور اسی کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ میں کافی عرصہ تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو تلاش کرتا رہا مگر میں نے اپنے آپ ہی کو پایا۔ اسی لئے تصوف کی ابتدا میں جب سالک کا عروج ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہی پاتا ہے۔ جب پہلے دن ہی اس کا قلب ذاکر ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ولی اللہ جانتا ہے اور اپنے لئے خود ہی مقام بھی متعین کر لیتا ہے لیکن یہ سالک ابھی ناقص ہوتا ہے جو اِسمِ مُربی سے لاعلم ہوتا ہے۔ جب وہ اپنا اسمِ مُربی پالیتا ہے تو اس کی رُوح کو اپنے پروردگار سے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ والا کیا ہوا وعدہ یاد آجاتا ہے کہ میں نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو اپنا پروردگار تسلیم کیا تھا۔ پھر وہ اپنے جسم کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اُسے مکدر اور قبیح پاتی ہے۔ اس مقام کو مقامِ تفریق کہا جاتا ہے کیونکہ اس مقام میں رُوح اور جسم علیحدہ ہو جاتے ہیں، روح عروج حاصل کر کے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو جاتی ہے

اور جسم غائب ہوتا ہے۔یعنی روح کا ایمان شہودی ہو جاتا ہے جبکہ جسم کا ایمان غیبی، اور ہم ان دونوں کے قائل ہیں۔

[اس کے بعد اس کا کام اس مقام تک پہنچا کہ اگر اس نے اپنی تلاش کی تو پھر بھی بجائے اپنے مطلوبِ حقیقی کو ہی پایا۔ اب اس کو گم کر چکا ہے اور اپنے آپ ہی کو پاتا ہے۔ اور اس کو گم کرنے کے باوجود اس کا متلاشی نہیں رہا۔]

تشریح

پہلے مرحلہ میں سالک دورانِ عروج اپنے آپ کو پاتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کا نزول ہوتا ہے اور وہ اپنے اسمِ مُربی کو پالیتا ہے تو اس کی روح مشاہدہ میں ہوتی ہے اور جسم دعوتِ خلق میں مگن ہوتا ہے۔ ایسا سالک دیکھنے میں عام لوگوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے لیکن باطن میں مخلوق سے کنارہ کش ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم بازاروں میں گھومتے، سودا سلف خریدتے اور زندگی کی دوسری ضروریات کو بھی ادا کرتے اور اسی سے کفار کو یہ مغالطہ لگا کہ یہ تو عام انسانوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے ہم جیسے ہی انسان ہیں۔ لیکن وہ ظاہر پر ہی نظریں جمائے تھے اور باطن سے بے خبر تھے پس جس سالک کا عروج بھی اَتم واَکمل ہو اور نزول بھی مکمل ہو اُس کی ظاہری زندگی عوام الناس کی طرح ہی لگتی ہے لیکن باطن کا معاملہ لوگوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

زیرِ نظر مکتوب گرامی میں عارف کے مقاماتِ عروج و نزول کے مناسب احوال اور بعض پوشیدہ اَسرار کا بیان ہے۔

کیفیاتِ عروج ونزول

حضرت امام ربانی قُدس سرہٗ اپنے مقام واحوال کی وضاحت فرماتے ہیں کہ یہ خادم آج کل عروج ونزول کی کیفیات سے حصہ پا رہاہے۔ اسی لئے کبھی حاضر، کبھی غائب، کبھی واجد، کبھی فاقد، کبھی مقبل اور کبھی مُعرض ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ عارف جب اپنے مبدأ فیض تک رسائی حاصل کرلیتاہے تو اس وقت اس کا نفس نزول کرتاہے اور اس کی روح عروج کرتی ہے۔ اس وقت عارف روح کے اعتبار سے حاضر، واجد اور مقبل ہوتاہے اور نفس کے اعتبار سے غائب، فاقد اور معرض ہوتاہے کیونکہ عروج کی حالت میں اس کی روح کی توجہ عالمِ وجوب کی طرف ہوتی ہے اور نزول کی حالت میں عارف کا ایمان باعتبار نفس کے ایمان بالغیب ہوتاہے اور باعتبار روح کے ایمان بالمشاہدہ ہوتاہے۔

نیز آپ کا یہ فرمان کہ ''مدتوں مطلوب کو ڈھونڈتا تھا تو اپنے آپ کو پاتا تھا'' یہ مرتبۂ نزول کی کیفیت کا بیان ہے اور یہ فرمان ''کہ اگر اپنے آپ کو ڈھونڈتا تو اس کو پاتا تھا''۔ یہ مرتبۂ عروج کی کیفیت کا بیان ہے کیونکہ عارف کے لئے عروج کی حالت میں عالمِ امکان فراموش رہتاہے اور عالمِ وجوب مشہود ہوتاہے اور نزول کے وقت اس کا ایمانِ شہودی ایمان غیبی کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر آپ نے فرمایاہے کہ ''اب اس کو گم کرچکاہے لیکن اپنے آپ کو پاتاہے اور گُم کر دینے کے باوجود اس کا متلاشی نہیں''۔ یعنی اب عروج کے بعد نزول کے مرتبے میں آگیاہوں اور یہاں آکر عدمِ طلب کا احساس اس امر کا غماز ہے کہ وصل کا مرتبہ حاصل ہو چکاہے (کیونکہ وصل کے بعد طلب نہیں رہتی) اب یہاں عارف دعوتِ خلق کے مرتبے پر فائز ہوتاہے۔

[اور مطلوبِ حقیقی کے فقدان کے باوجود اس کا خواہاں نہیں۔ علم کے لحاظ سے حاضر پانے والا اور رجوع کرنے والا ہے، اور ذوق کے لحاظ سے غائب، گم کرنے والا اور اعراض کرنے والا ہے۔ اس کا ظاہر بقا ہے اور اس کا باطن فنا۔ عین بقا میں فانی ہے اور عین فنا میں باقی۔ لیکن فنا علمی ہے اور بقا ذوقی۔]

تشریح

سالک کے قلب سے تمام ممکنات (مخلوقات) کے فراموش ہونے کو فنا کہتے ہیں۔ لیکن یہ فنا علمی ہوتی ہے نہ کہ حقیقی۔ اور ایمانِ حقیقی پر مستقیماً باقی رہنے کو بقا کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے:

اَلْمُؤْمِنُوْنَ حَیٌّ فِی الدَّارَیْن۔ (کنز الدقائق)

ترجمہ: مؤمنین دونوں جہانوں میں زندہ ہوتے ہیں۔

لیکن فنا کے بعد بقا کا حصول بھی ضروری ہے کہ صرف فنا کا حاصل ہونا اور بقا سے محروم رہنا بھی ایک طرح کا نقص ہے۔ البتہ فنا و بقا کا وہ مفہوم جو لوگ سمجھے ہوئے ہیں وہ قطعاً غلط ہے۔ لوگ فنا سے نیست و نابود ہونا مراد لیتے ہیں اور فانی شخص کو ضروریاتِ زندگی سے مستغنی خیال کرتے ہیں، حالانکہ فنا کا یہ مفہوم سراسر غلط ہے ایسے اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کے جسم فانی نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ ضروریاتِ زندگی سے قطع تعلق کر لیتے ہیں بلکہ ان کے نفوس طیبہ، اخلاقِ رذیلہ سے تائب ہو جاتے ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

آپ فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس وقت عالمِ وجوب کا مشاہدہ ثابت نہیں اور ذوقِ حال کے اعتبار سے غیوبیت ہے مگر چونکہ سابقہ علم کا حضور موجود ہے، اور مراتبِ وجوب کے سابقہ شہود کو از روئے علم جانتا ہوں لیکن از روئے ذوقِ حال وہ سابقہ شہود موجود نہیں ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ "ظاہر بقا ہے اور باطن فنا" یعنی آپ اپنی حالت یوں بتاتے ہیں کہ نفس کے اعتبار سے تو میں صفاتِ باری تعالیٰ کے انعکاس سے رنگین ہوں اور عالمِ خلق کی طرف نزول کر چکا ہوں (یعنی مرتبۂ بقا میں ہوں) لیکن روح کے اعتبار سے فانی اور شہود ممکنات سے بے خبر ہوں (یعنی مرتبۂ فنا میں ہوں) لیکن فنا کے علمی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کے اعتبار سے اس وقت فنا میرے علم میں ہے اور فنا کی حالت گزر چکی ہے اور بقا ذوقی ہے یعنی انعکاسِ صفات سے رنگین ہوں اور اخلاق اللہ سے متخلق ہوں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۷۱)

[اس کا کاروبار ہبوط و نزول (نیچے کے مقام میں) قرار پا چکا ہے۔ اور عروج و بلندی سے رہ چکا ہے۔ اور جس طرح سے دل سے دلوں کے پھیرنے والے (حق جل وعلا) کی طرف لے گئے تھے۔ اب دلوں کے پھیرنے والا (حق تعالیٰ) سے پھر مقامِ قلب کی طرف نیچے لے آئے ہیں۔]

تشریح

مقلب القلوب اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے جو قلوب کو برائیوں سے نیکی کی طرف موڑنے والی ذات ہے جب تک سالک کا قلب، مقلب القلوب کی طرف عروج کرکے واپس قلب کے مقام میں نزول نہ کرے اس وقت تک اس کا سلوک ناقص و نامکمل ہوتا ہے۔ ابتدا میں سالک کی

حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے شیخ کے پاس ہو تو اس کا قلب ذکر میں مشغول رہتا ہے لیکن جوں ہی وہ اپنے شیخ کی صحبت سے دور ہوتا ہے اس کی کیفیت بدل جاتی ہے اور وہ دنیا میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سالک کا قلب تمکین میں نہیں پہنچا ہوتا بلکہ متلون المزاج ہوتا ہے کیونکہ اس نے عروج ونزول کو مکمل نہیں کیا۔ جب قلب عروج ونزول کو مکمل کرلے تو مطمئن ہو جاتا ہے اور دینِ اسلام پر تمکین حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے بعض مریدین کہتے ہیں کہ حضرت صاحب! جب ہم آپ کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں تو ذکر محسوس ہوتا ہے لیکن جب یہاں سے رُخصت ہوتے ہیں تو ذکر کا احساس ختم ہو جاتا ہے ایسے مریدین کو چاہیئے کہ شیخ کی عدم موجودگی میں زیادہ کوشش وزاری کریں تاکہ اُن کے دل تلوین سے نکل کر مطمئن ہو جائیں۔ اور یہ درجہ دینا تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ پس اگر قلب صالح ہو گیا تو سارا بدن صالح ہو جائے گا اور اگر قلب ہی طالح ہوا تو باقی بدن بھی طالح ہی رہے گا۔

کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیه و آلہٖ و اصحابہٖ و سلم ان فی جسد ابن اٰدم لمغضغة اذا صلحت صلح لها سائر الجسد و اذا فسدت فسد لها سائر الجسد۔

ترجمہ: حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک بنی آدم کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا (دل) ہے جب وہ (ٹکڑا) صالح ہو جائے تو سارا بدن صالح ہو جاتا ہے اور جب وہ (ٹکڑا) فاسد (طالح) ہو جائے تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے۔

اس لئے صوفیت میں سارے کام کا دار و مدار قلب پر ہے لہٰذا ہر سالک کو اپنے قلب پر زیادہ محنت کرنی چاہیئے پھر جب سالک قلب سے ترقی کر کے روح کے لطیفہ میں پہنچتا ہے تو رُوح ساری زندگی عروج میں رہتی ہے کیونکہ اس کا سفر لا متناہی ہے اگر سالک دُنیا سے رُخصت بھی ہو جائے تو

اس کی رُوح عروج کے مراحل طے کرتی رہتی ہے۔پس قلب کی پرواز عرشِ عظیم تک ہے اور رُوح کی پرواز عرش سے اوپر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور چونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ورآ الوریٰ ثم ورآ الوریٰ ہے اس لئے روح کی پرواز ختم ہونے والی نہیں ہوتی۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

سطورِ بالا میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اپنے مقام وحال کی خبر دے رہے ہیں کہ اس فقیر کا معاملہ صعود وعروج سے رُک گیا ہے اور اب ہبوط ونزول پر ٹھہر گیا ہے یعنی مقامِ قلب پر استقرار ہے۔

صعود وعروج

یہاں صعود وعروج سے مراد عالمِ بالا کی طرف اوپر جانا اور اسماء وصفات الٰہیہ میں سیر واقع ہونا ہے اور ہبوط ونزول سے مراد نیچے آنا اور مسندِ دعوت وارشاد پر متمکن ہو کر مخلوق کی تکمیل وہدایت کے لئے متوجہ ہونا ہے اور یہ (ہبوط ونزول) تکمیل کا مرتبہ ہے جہاں سالک، وراثت نبوت کے منصب سے شاد کام ہوتا ہے۔

مُقلبِ قلب

مقلبِ قلب (دل کے پھیرنے والے) سے مُراد ذاتِ حق تعالیٰ یا عارف کا اسمِ مُربی ہے۔

مقام قلب

مقامِ قلب سے مراد شہودِ عالم اور مقامِ فرق بعد الجمع ہے۔

سالک کی روح اور نفس کی دونوں جہتوں کے جامع ہونے کا مفہوم

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اس فقیر کی روح کو اللہ تعالیٰ نے روح اور نفس کی دونوں جہتوں کا جامع بنایا ہے اور ان کی برزخیت سے مشرف فرمایا ہے اس فرمان کا مفہوم سمجھنے کے لئے درج ذیل بنیادی نکات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے:

- روح ایک نوری لطیفہ ہے جس کا اصلی وطن عالمِ امر ہے جو عرش کے اوپر ہے ملائکہ کی طرح روح بھی ایک مقام پر ٹھہری ہوئی اور ترقی سے رُکی ہوئی تھی چونکہ اس کی فطرت میں ترقی اور عروج کی استعداد موجود تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ ازلی کا تقاضا ہوا کہ رُوح ترقی کرکے قربِ حق سے مشرف ہو جائے مگر عالمِ اسباب میں قُربِ حق مجاہدہ پر موقوف تھا اس لئے مجاہدہ کی منزل عبور کرانے کے لئے روح کو نیچے اتارا گیا اور انسان کے جسم میں نفس کے مدمقابل اس کو جگہ دی گئی اور روح کو نفس کی مخالفت کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ روح جب عاصیوں اور نافرمانوں کے جسموں میں داخل ہوئی تو نفس کے غلبے کی وجہ سے نفسانی تقاضوں کے تابع ہو کر نفس میں فانی ہو گئی اور عالمِ امر کو بھول گئی اور جب صالحین و مقربین کے جسموں میں داخل ہوئی تو اپنے وطنِ اصلی (عالمِ امر) کی مناسبت پا کر اسی کی طرف رجوع کر گئی۔

حضرت شاہ شرف بو علی قلندر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رُوح سے مخاطب ہیں:

چند باشی از مقامِ خود جُدا　　　چند گردی دربدر اے بے حیا

یعنی اے روح تو کب تک اپنے مقام سے جدا رہے گی اور اے بے حیا تو کب تک دربدر پھرتی رہے گی۔

چنانچہ صالحین کی روح عروج کے وقت نفس کو اپنے انوار میں جذب کر لیتی ہے اور اپنے ساتھ عالمِ وجوب کی طرف لے جاتی ہے اور ان کا نفس اپنے مبدأ فیض تک پہنچ کر مطمئنہ ہو کر روح سے جدا ہو کر واپس عالمِ شہود میں دعوتِ خلق کے لئے نزول کر لیتا ہے تو اب ایک ہی وقت میں عارف کی رُوح عالمِ وجوب سے استفادہ کرتی ہے اور اس کا نفس عالمِ شہود کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ چنانچہ سالک روح اور نفس کی دونوں جہتوں کا جامع بن جاتا ہے اور دونوں کی برزخیت سے مشرف ہو جاتا ہے گویا فائدہ حاصل کرنے کی حالت میں فائدہ پہنچانے والا بھی ہوتا ہے اور فائدہ پہنچانے کے وقت فائدہ حاصل کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ یعنی روح عالمِ اَمر سے متعلق رہتی ہے اور نفس عالمِ شہادت سے مربوط رہتا ہے۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے ان کلمات میں اپنی اسی باطنی حالت اور روحانی کیفیت کا اظہار فرمایا ہے۔

بینہ نمبر ا

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ جس مرتبے کا بیان فرما رہے ہیں یہ مرتبہ آپ کو اثنائے سلوک میں حاصل ہوا تھا اور یہ انجامِ کمالاتِ عالیہ سے پہلے کی حالت کا بیان ہے کیونکہ عالمِ وجوب میں سیر عروجی سے فارغ ہونے کے بعد عارف کی رُوح بھی نفس کی طرح نزول کرتی ہے۔ رُوح اور نفس دونوں کا عالمِ شہود میں نزول کرنا وہ تکمیل مرتبہ ہے جو دعوت وارشاد اور کمالاتِ نبوت سے تعلق رکھتا ہے۔ عارف اس مرتبے میں مظہرِ کمالاتِ عالمِ وجوب ہو جاتا ہے اور صفاتِ الٰہیہ کر پر تو سے رنگین ہو کر کدوراتِ بشریہ سے پاک ہو جاتا ہے۔

عارفِ رُومی فرماتے ہیں:

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شُد　　　　اُو ز حرص و عیب کلی پاک شُد

یعنی جو کوئی عشق کے غلبے سے کدوراتِ بشریہ کا لباس چاک کر دیتا ہے، وہ ہر قسم کی حرص اور ہر قسم کے عیب سے پاک ہو جاتا ہے۔

بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ (حضرت امام ربانی قدس سرہٗ) کو اس مرتبے کی آخری اور تکمیل منازل پر فائز فرما دیا تھا جس کا اظہار آپ کے دیگر مکتوبات سے ہوتا ہے۔ **والحمدللہِ علیٰ ذٰلک**۔

مقامِ جمع و مقامِ فرق

گزشتہ سُطور میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے مقامِ قلب کا ذکر فرمایا ہے صوفیائے مجددیہ علیہم الرحمۃ کے نزدیک مقامِ قلب سے مُراد مقامِ فرق بعد الجمع ہے، مقامِ جمع و فرق کے بارے میں صوفیائے کرام کے درمیان اختلاف ہے۔

مقامِ جمع

صوفیائے وجودیہ کے نزدیک واجب اور ممکن کو ایک چیز جاننا مقامِ جمع ہے۔

دوسرے صوفیاء کے نزدیک جمع حالت سے مُراد ہے جس میں سالک مشاہدۂ حق میں مستغرق رہتا ہے اور غلبۂ توجہ اِلی الحق کی بناء پر مخلوق سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز شانِ تجدید و تحقیق کے بلند مرتبے پر فائز اور حقائق اشیاء کے علم سے بہرہ ور تھے۔ اس لئے آپ کے نزدیک رُوح اور نفس کو ایک دیکھنے کا نام مقامِ جمع ہے۔

مقامِ فرق

صوفیائے وجودیہ کے نزدیک واجب اور ممکن میں امتیاز کا نام مقامِ فرق ہے۔

دُوسرے صوفیاء کے نزدیک سالک کا متوجہ الی الخلق ہونا اور خلق کو حق کے انوار کا آئینہ نہ سمجھنا مقامِ فرق ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک رُوح اور نفس کے امتیاز کو مقامِ فرق کہا جاتا ہے۔

بینہ نمبر ۲

جب تک نفس روح کے انوار میں مستغرق اور مستور رہے تو یہ مقامِ جمع ہے۔ اور جب نفسِ مطمئنہ ہونے کے بعد رُوح سے جُدا ہو کر دعوتِ خلق کے لئے نیچے آ جائے یہ مقامِ فرق بعد الجمع ہے۔

بحث روح و نفس

روح

روح عالم امر کی چیز ہے جو غیر مادی ہے عقلِ انسانی اس کی حقیقت کا اِدراک کرنے سے عاجز ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

قُلِ الرُّوحُ مِنۡ أَمۡرِ رَبِّي (الإسراء ۸۵)

مذہبِ اہل سنت کی رو سے رُوح کی تعریف یہ ہے:

أَنَّهٗ جِسۡمٌ مُخَالِفٌ بِالۡمَاهِيَّةِ لِهٰذَا الۡجِسۡمِ الۡمَحۡسُوۡسِ وَهُوَ جِسۡمٌ نُوۡرَانِيٌّ عَلَوِيٌّ خَفِيۡفٌ حَيٌّ مُتَحَرِّكٌ يَنۡفَذُ فِيۡ جَوۡهَرِ الۡأَعۡضَآءِ وَيَسۡرِيۡ فِيۡهَا سَرَيَانَ الۡمَآءِ فِيۡ الۡوَرۡدِ وَسَرَيَانُ الدَّهۡنِ فِيۡ الزَّيۡتُوۡنِ وَالنَّارِ فِي الۡفَحۡمِ۔[1]

ترجمہ: روح ایک جسم ہے جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے اِس محسوس جسم عنصری کے مخالف ہے وہ جسم نورانی، علوی، ہلکا، زندہ اور متحرک ہے، جو تمام اعضائے جسم میں نفوذ کرتا ہے جسم میں اس کا سُریان ایسا ہے جیسے گلاب کے پھول میں پانی، زیتون میں روغن اور کوئلے میں آگ کا سریان ہے۔

---

[1] (کتاب الروح، ص ۲۲۴)

امام ابو القاسم سہیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

فَهُوَ أَيْضًا جِسْمٌ وَلٰكِنّهُ مِنْ جِنْسِ الرّيحِ وَلِذٰلِكَ سُمّيَ رُوحًا مِنْ لَفْظِ الرّيحِ وَنَفْخُ الْمَلَكِ فِي مَعْنَى الرّيحِ۔[1]

ترجمہ: اور وہ (روح) بھی جسم ہے مگر ریح یعنی ہوا کی جنس سے ہے اسی وجہ سے اس کو روح سے موسوم کرتے ہیں جو ریح سے مشتق ہے اور نفخِ ملک ریح کے معنی میں ہے۔

بینہ نمبر ۳

ثابت ہوا کہ رُوح کی پیدائش، نفخِ ملائکہ سے ہوئی اور ملائکہ کی پیدائش نور سے ہے، لہٰذا روح ملائکہ سے زیادہ لطیف ہوئی۔ جیسے جسمِ انسانی کا سانس اس کے جسم سے زیادہ لطیف ہے ایسے ہی ملائکہ کا سانس ان کے جسم سے زیادہ لطیف ہے۔

بینہ نمبر ۴

روح جوہرِ مجرد، لطیف اور لامکانی ہے اس کی حقیقت سے کوئی باخبر نہیں۔ رسولِ اکرم، نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے پوچھا گیا تھا کہ اَيْنَ كَانَ رَبُّنَا یعنی ہمارا رب ارض وسماء کی تخلیق سے پہلے کہاں تھا تو آپ نے فرمایا: كَانَ فِيْ عَمَآءٍ۔[2] یعنی عماء میں تھا، لفظِ عماء عدمِ بینائی (اندھے پن) پر بولا جاتا ہے، چونکہ لامکان کی حقیقت سمجھنے سے عقل اندھی ہے، غالبًا لفظ عماً اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ مکان کا اطلاق ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے محال اور منفی ہے۔

---

[1] (روض الانف، ج ۲، ص ۷۰)

[2] (فتاویٰ عزیزیہ)

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

مُحرک تن روح است و مُحرک روح نور و مُحرک نور ذات، عزیز من این مقام را کما ینبغی دانستن کمال محال است۔[1]

بدن کو حرکت دینے والی روح ہے اور روح کو حرکت دینے والا نور ہے اور نور کو حرکت وحیات ذاتِ باری تعالیٰ سے ملتی ہے۔ میرے عزیز اس مقام کو کما حقّہٗ سمجھنا محال ہے۔

نفس

لفظِ نفس، نفاست یا تنفس سے ہے اس کو نفس بوجہ نفاست و لطافت کے کہا جاتا ہے، یا سانس کی آمد و رفت کی وجہ سے۔

اِنَّ النَّفْسَ وَالرُّوْحَ مُسَمَّاهُمَا وَاحِدٌ وَهُمُ الْجَمْهُوْرُ۔[2]

ترجمہ: نفس اور رُوح کا مصداق ایک ہی ہے اور جمہور کا یہی مؤقف ہے۔

یوں سمجھیے کہ نفس اور رُوح ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ حدیث لیلۃ التعریس سے امر کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اَخَذَ بِنَفْسِیْ الَّذِیْ اَخَذَ بِنَفْسِکَ۔۔۔۔ وَفِیْ رَوَایَۃ فَقَالَ یَاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ اللہَ قَبَضَ اَرْوَاحَنَا۔[3] میری روح کو اسی ذات نے پکڑ رکھا تھا جس نے آپ کی روح کو پکڑا۔ دوسری روایت میں ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو قبض کر لیا تھا۔

---

[1] (فتاویٰ عزیزیہ)

[2] (کتاب الروح، ص ۴۸۸)

[3] (مؤطا امام مالک، ص ۱۰۷۹)

- اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز کو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نفس سے تعبیر کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم رُوح سے تعبیر فرماتے ہیں، اس میں تطبیق یونہی ممکن ہے کہ رُوح اور نفس کو ایک ہی شے مانا جائے۔
- قرآن حکیم میں بھی روح پر لفظ نفس کا اطلاق موجود ہے۔ اللّٰہُ یَتَوَفَّی الْأَنْفُسَ حِینَ مَوْتِہَا (الزمر ۴۲) (اللہ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی موت کے وقت) آیت مذکورہ میں نفس کا لفظ بولا گیا لیکن مراد روح ہے۔

بینہ نمبر ۵

جمہور علماء روح اور نفس کے اتحاد کے قائل ہیں ان میں تغایر بوجہ اَوصاف ہے۔ اولیت کے اعتبار سے تو روح ہے، یعنی فرشتہ جب ماں کے پیٹ میں پھونکتا ہے تو روح ہے اور بعد میں جب یہ روح بدن سے عشق کر کے مصالح بدن میں مشغول ہو جاتی ہے تو اسی پر لفظ نفس بولا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ قبل از اکتساب اوصاف روح پر لفظ نفس بولنا جائز نہیں، بعد از اکتسابِ اوصاف جب اس میں غفلت اور شہوت وغیرہ کی صفت پیدا ہو جاتی ہے تو اس پر نفس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ نفس کا فعل بھی غفلت اور شہوت وغیرہا ہے۔

بینہ نمبر ٦

واضح ہو کہ نفس کی صفاتِ ذمیمہ کو مجاہدہ اور ریاضت سے کم یا ختم کیا جا سکتا ہے جب تزکیۂ نفس حاصل ہو جائے اور سکون تام و کامل ہو جائے تو یہ نفسِ مطمئنہ کا درجہ ہے۔

معلوم ہوا کہ روح اور نفس کے درمیان فرق باعتبار صفات کے ہے نہ کہ باعتبار ذات کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۷۳ تا ۴۸۰)

[روح کے نفس سے نجات پا جانے اور اطمینان کے بعد نفس کے نکل جانے کے باوجود غالب آنے والے انوار سے اس کی روح کو روح و نفس دونوں جہتوں کا جامع کر دیا گیا ہے، اور ان دونوں کی برزخیت اور واسطے سے مشرف کر دیا گیا ہے۔ اوپر کی طرف سے فائدہ حاصل کرنے اور نیچے والوں کو فائدہ پہنچانے والا۔ اس واسطہ برزخیت کے حصول کی وجہ سے مجھے اوپر سے فیض لینے اور نیچے والوں کو فائدہ پہنچانے کا مرتبہ بھی عطا کر دیا گیا ہے۔ عین فائدہ حاصل کرنے کی حالت میں فائدہ پہنچا بھی رہا ہے۔ اور عین فائدہ پہنچانے کی حالت میں استفادہ بھی کر رہا ہے۔

گر بگویم شرح ایں بیحد شود　　　　ور نویسم بس قلمہا بشکنند

ترجمہ: اگر میں اس کی شرح کروں تو بہت دراز ہو جائے۔ اور اگر لکھنے لگوں تو کتنی ہی قلمیں ٹوٹ جائیں۔]

تشریح

حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ:

ان للہ سبعون الف حجاب من نور و ظلمة لو كشفت لا حرقت سبحات وجهه ما انتهى إليه بصره من خلقه۔[1]

---

[1] (تفسیر المظھری، ج ۱، ص ۳۶۷)

ترجمہ: حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے لئے نور اور ظلمت کے ستر ہزار حجاب ہیں، اگر وہ حجابات دور ہو جائیں تو جہاں تک اس کی نظر جائے اس کے چہرے (یعنی اس کی ذات مبارکہ) کی عظمت اور جلال اس کی مخلوق کو جلا دے۔

قلب کے سارے پردے ظلمانی اور روح کے سارے پردے نورانی ہوتے ہیں اس لئے جب سالک کا قلب اسمِ مُربی پر فائز ہو جاتا ہے تو قلب پر انوارات آتے ہیں جس طرح سورج یا بلب کی شعاعیں جب انسان کی آنکھوں پر پڑتی ہیں تو پھر انسان دیکھ نہیں سکتا بلکہ صرف روشنی کو محسوس کرتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ میری روح عروج میں ہے اور میرا قلب دعوت خلق میں مصروف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فائدہ واستفادہ دونوں کر رہا ہے۔

[بعد ازیں عرض کرتا ہے کہ دست چپ مقامِ قلب سے عبارت ہے۔ جو مقام قلب یعنی واجب تعالیٰ تک عروج کرنے سے پہلے حاصل ہے۔]

تشریح

دست چپ سے مراد قلب ہے اور یہ مقلب القلوب تک پہنچتا ہے اور دست راست سے مراد رُوح ہے۔ اور روح مقلب القلوب تک عروج بھی کرتی ہے اور قلب کو نزول بھی دیتی ہے یعنی روح دونوں کام کرتی ہے۔ خود عروج کرتی ہے اور قلب کو نزول دیتی ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

سطورِ بالا میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اپنے پیرِ بزرگوار علیہ الرحمۃ کی خدمت میں بعض اسرارِ تصوف پر خصوصی تبصرہ پیش کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

صوفیاء کی اصطلاح میں مقامِ قلب کو دستِ چپ (بائیں ہاتھ) کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔واضح ہو کہ لفظ مقامِ قلب کے دو مفہوم ہیں:

پہلا مفہوم

مقامِ قلب کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ سالک مُبتدی کو ابھی مقلب قلب (حق تعالیٰ) کی طرف عروج حاصل نہ ہوا ہو، اس مقامِ قلب کو دستِ چَپ کہا جاتا ہے۔

دوسرا مفہوم

مقامِ قلب کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سالک منتہی فوق سے نزول کے بعد مقامِ قلب میں نیچے آجائے یہ مقامِ چپ وراست کے درمیان برزخ (واسطہ) ہے۔ اس مقامِ قلب سے مُراد وہ مقامِ قلب نہیں جس کو دستِ چَپ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اَصحابِ حُجب

حجاب ہر وہ چیز جو بندے کو حق تعالیٰ سے بے خبر یا دور کرے حجاب کہلاتی ہے۔یعنی تمام اشیاء اور خیالاتِ ماسویٰ حجابات ہیں۔سب سے بڑا حجاب، حجابِ خودی (بندے کی اپنی ذات) ہے۔

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

حجابِ چہرۂ جاں می شود غبارِ تنت
توخود حجابِ خودی حافظ ازمیاں برخیز

اصحابِ حُجب تین ہیں:

۱۔ اصحابِ شمال (صاحبانِ دستِ چَپ)

۲۔ اصحابِ میمنہ (صاحبانِ دستِ راست)

۳۔ سابقان (واصلانِ ذات بلا کیف)

حجابات بھی تین ہیں:

۱۔ حجاباتِ ظلمانی ۲۔ حجاباتِ نورانی ۳۔ حجاباتِ کیفی

حجاباتِ ظلمانی

ہر قسم کے گناہ اور لذاتِ نفسانی طبیعی ہیں انہیں حجاباتِ ناسوتی بھی کہا جاتا ہے۔ سالک کو سب سے پہلے ان حجابات کو دفع کرنا پڑتا ہے۔ اصحابِ شمال صاحبانِ حجاباتِ ظلمانی کو ہی کہا جاتا ہے۔

حجاباتِ نورانی

علوم ظاہریہ رسمیہ، عباداتِ عادیہ اور انوار ملکوتیہ حجاباتِ نورانی ہیں۔ انہیں حجاباتِ ملکوتی بھی کہا جاتا ہے۔ سالک کو حجاباتِ ظلمانی کے بعد انہی حجابات کو اٹھانا پڑتا ہے۔ سالک کے لئے ان حجابات کا اٹھانا حجاباتِ ظلمانی سے زیادہ مشکل ہوتا ہے، کیونکہ حجاباتِ نورانی مزے اور لذت میں حجاباتِ ظلمانی سے بڑھے ہوئے ہیں، اصحاب میمنہ، صاحبانِ حجاباتِ نورانی کو کہا جاتا ہے۔

حجاباتِ کیفی

کیف و کم اور امکان وحدوث کے تمام مناظر و مظاہر حجاباتِ کیفی ہیں۔ تَعَالَی اللهُ عَنْ ذَالِکَ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔ سالک کو آخر میں مشاہدۂ ذات کے لئے تمام حجاباتِ کیفی کا پردہ چاک کرنا پڑتا ہے اور یہ کام سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور اس کے بغیر ذاتِ بے کیف تک رسائی ناممکن ہے۔ سابقان سے مُراد وہی حضرات ہیں جو حجاباتِ ظلمانی، نورانی اور کیفی سے گزر کر ذاتِ بلا کیف تک وصول بلا کیف کے انعام سے سرفراز ہیں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۸۰ تا ۴۸۲)

[اوپر سے نزول کے بعد جب مقامِ قلب پر آتے ہیں یہ دوسرا مقام ہے جو چپ راست کے درمیان برزخ واسطہ ہے جیسا کہ اس کے واقف کار لوگوں پر ظاہر واضح ہے۔ اور سلوک نا مکمل کردہ مجذوب اصحاب قلب ہیں۔]

تشریح

اصحاب قلب وہ سالک ہیں جنہوں نے سلوک کو مکمل نہ کیا ہو اور قلب تک ہی محدود ہوں، اگلے لطائف تک ان کی رسائی نہ ہو۔ یہ متلون المزاج سالک ہوتے ہیں اور ان کا عروج صرف عرش تک ہی ہوتا ہے۔ ایسے سالک ناقص ہوتے ہیں اور دوسروں کو دعوت وارشاد نہیں کر سکتے۔

اصحابِ رُوح وہ سالک ہیں جنہوں نے سلوک کو مکمل کر لیا ہو۔ انہیں دستِ راست بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عروج بھی کرتے ہیں اور اس کے بعد نزول کر کے دعوت وارشاد کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں اور یہی کامل و مکمل ولی ہوتے ہیں۔

مجذوب اس صوفی کو کہا جاتا ہے جو مادر زاد ولی ہو لیکن جب تک وہ سلوک طے نہ کرے اس کا جذبہ بھی ناقص ہی رہتا ہے اور یہ بھی اصحابِ قلب کے زمرے میں ہی آتا ہے اور دوسروں کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ عوام الناس ایسے مجذوبوں کو ہی اعلیٰ درجہ کا ولی مانتے ہیں اور جہاں کوئی مجذوب نظر آ جائے تو اس کے ارد گرد ڈیرہ لگا لیتے ہیں۔ البتہ اصحابِ رُوح کی طرف بالکل میلان نہیں رکھتے۔ انہیں چاہیئے کہ مجذوبوں کے ساتھ رابطہ نہ رکھیں کیونکہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے انہیں نامکمل سالک کہا ہے اور جو خود نامکمل ہو وہ دوسروں کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ اسی لئے ہم شریعت و طریقت کے درس کو انتہائی ضروری خیال

کرتے ہیں کہ درس و تدریس سے ہی انسان اچھے و برے میں تمیز کر سکتا ہے اور اس کی بدولت ہلاکت سے بچ سکتا ہے۔ باقی رہی ولایت تو وہ صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی دین ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

اِتصالِ بے تکیّف بے قیاس ہست رَبُّ الناس را باجانِ ناس

اربابِ قُلُوب

قلب کی جمع قلوب (دل) ہے۔ منازلِ قلب میں سے ایک منزل کا نام قلب بھی ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک قلب ایک جوہرِ نورانی ہے جو مادہ سے مجرد اور روح و نفس کے درمیان برزخ ہے۔ حکماء اسے نفسِ ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت جل جلالہٗ نے آیتِ نور یعنی مَثَلُ نُورِہٖ کَمِشْکَاۃٍ فِیھَا مِصْبَاحٌ، الخ (النور ۳۵) میں جسم کو مشکوٰۃ، قلب کو زجاجہ، روح کو مصباح اور نفس کو شجرہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

حدیث قدسی ہے: قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللہِ۔[1] یعنی مؤمن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔ نیز: مَا وَسِعَنِیْ اَرْضِیْ وَلَاْ سَمَائِیْ وَلٰکِنْ وَسِعَنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ۔[2] قلب میں حق تعالیٰ بالذات ظہور فرماتا ہے۔ قلب اَسرارِ الٰہیہ کا مرکز ہے۔ قلب حقائقِ وجود کا آئینہ ہے، قلب اللہ تعالیٰ کا ایک نور ہے جس کی چمک تمام موجودات کا خلاصہ ہے۔ قلب ایک نقطۂ نور ہے جس پر اسماء و صفات کا دور

---

[1] (تفسیر یعقوبی، ص ۲۴۹)

[2] (اتحاف السعادۃ، ج۷، ص ۲۳۴)

گردش کرتا رہتا ہے۔ ظہوراتِ رحمانی بہ نسبت عرش کے دل پر زیادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ دل غیب وشہادت کے درمیان برزخ ہے۔،دل کعبے اور عرش سے افضل ہے۔

دِل بدست آور کہ حجِ اکبر است
ازہزاراں کعبہ یک دِل بہتر است
کعبہ بنیادِ خلیلِ اطہر است
دِل گزرگاہِ جلیلِ اکبر است

(عارف رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

قرآنِ حکیم کی روسے محلِ تقویٰ قلب ہے اور محلِ وحی بھی قلب ہے۔ قلب سلیم بھی ہوتا ہے اور سقیم بھی، قلب مخاطب بھی ہے اور متکلم بھی، قلم عالم وفاہم بھی اور سامع وباصِر بھی، قلب کی صحت وقوت کے لئے غذائے صالح اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد ۲۸) اس کا نام قلب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے محلِ اصلی کی طرف منقلب ہوتا رہتا ہے یا اس کے احوال تغیر پزیر ہوتے رہتے ہیں۔ اصلاحِ باطن کا دارومدار قلب پر ہے۔ صوفیاء کی تمام منازل کا اِنحصار قلب پر ہے۔

اربابِ قُلوب

جن سالکین کے قلوب تقلیبِ احوال کی وجہ سے مقلّبِ قلب (حق تعالیٰ) اور اپنے مبدأ فیض تک نہ پہنچے ہوں انہیں اربابِ قلوب کہا جاتا ہے۔ اصحابِ تلوین بھی انہیں سالکین کو کہا جاتا ہے۔ وہ مجذوب جو ابھی سلوک مکمل نہ کرسکے ہوں اگرچہ نزول کرچکے ہوں اربابِ قلوب میں شامل ہیں۔

اربابِ قلوب کی دو حالتیں ہوتی ہیں:

پہلی حالت عروج سے قبل مقامِ قلب میں سیر ہوتی ہے، یہ مقام تقلّبِ احوالِ قلب سے عبارت ہے۔ دوسری حالت نزول کے بعد مقامِ قلب میں سیر ہوتی ہے۔ یہ مقام فرق بعد الجمع سے عبارت ہے۔ اس مقام میں قلب کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ روح کے انوار نفس تک پہنچاتا رہتا ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۸۲ تا ۴۸۴)

[مقلب قلوب (حق تعالیٰ) تک پہنچنا سلوک سے وابستہ ہے۔ اور کسی شخص کے ساتھ مقام کا تعلق اس کے اس مقام میں شانِ خاص حاصل ہونے سے کنایہ ہے۔ اور اس مقام کے اصحاب میں اس کی امتیازی اور علیحدہ حیثیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کی امتیازی حیثیتوں میں ہماری اس بحث میں انجذاب کی سبقت اور بقا خاص ہے۔ جو اس مقام کے مناسب علوم و معارف کا منشا ہے۔ مقامِ قلب کے علوم اور جذبہ، سلوک، فنا و بقا وغیرہ کی حقیقت اس رسالہ میں تفصیل سے لکھ دی گئی ہے جس کا وعدہ ہو چکا ہے۔

میر سید شاہ حسین پریشانی کے عالم میں روانہ ہو گئے۔ ان علوم و حقائق کے نقل کرنے کی فرصت نہ ملی۔ ان شاء اللہ جلد ہی ان کے مطالعہ کا شرف حاصل ہو گا۔

ایک عزیز جو مقامِ فوق میں رُکا ہوا تھا نیچے مقامِ جذبہ میں آ چکا ہے۔ لیکن عالم (جہان) کی طرف اس کی کوئی توجہ نہیں۔ فوق کی طرف ہی توجہ رکھتا ہے۔ چونکہ اوپر کی طرف عروج بے اختیار تھا اس لئے وہ بالطبع مقامِ جذبہ سے مناسبت رکھتا تھا۔ اوپر سے نیچے آنے کے وقت اپنے ساتھ بہت کم چیزیں لایا ہے۔ اس نسبت کا سرمایہ جو توجہ بلا اختیار اور اس کے عروج کا اثر تھا اب بھی باقی ہے۔ جذبہ کی نسبت میں جسم میں رُوح اور ظُلمت میں نور کی طرح ہے۔ لیکن یہ جذبہ حال حضرات خواجگان قدس اسرارہم کے جذبہ سے علاوہ ہے۔ بلکہ یہ وہ جذبہ ہے جو حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو

اپنے آباء کرام کی طرف سے ملا ہے اور اس میں انہیں خاص شان حاصل ہے۔ اور ایک واقعہ میں بعض طالبوں کو جو دکھائی دیا کہ حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس طرح دکھائی دیئے کہ اس عزیز متوقف (رُکے ہوئے) نے کھالیا ہے، اس کا اثر اس مقام میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ جذبہ مقام افادہ سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس مقام میں رُخ ہمیشہ فوق کی طرف ہے اور سُکر دائمی ہمیشہ اس کو لازم ہے۔]

تشریح

وہ عزیز جس کا ذکر حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اس مکتوب شریف میں کیا ہے وہ آپ کے مرشد بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس ہیں جو مقامِ جذبہ میں رُکے ہوئے تھے لیکن حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے مکتوب شریف کی برکات اور توجہات سے حضرت خواجہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اُس مقام سے ترقی فرما گئے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اس مکتوب میں آگے چل کر اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے مکتوبات شریف میں مجددِ وقت کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "مجدد وہ ہوتا ہے کہ فیوض وبرکات میں سے جو کچھ اس مدت میں اُمتیوں کو پہنچتا ہے اس کے واسطہ سے پہنچتا ہے اگرچہ اس وقت کے قطب اور اوتاد ہوں اور ابدال ونجباہوں"۔[1]

---

[1] (مکتوب نمبر ۴، ج ۲، ص ۹۵۴، دفتر دوم، حصہ اول)

اور چونکہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خود ہزار سالہ مجدد تھے اس لئے سارے اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فیوض وبرکات سے مستفید ہوئے ہیں حتیٰ کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اپنے شیخ نے بھی آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے استفادہ حاصل کیا ہے اور اسی بات کی طرف آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے۔

اور "اس عزیز متوقف نے کھالیا ہے" سے یہ مراد ہے کہ جو جذبہ حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تھا وہ جذبہ اس عزیز کو بھی حاصل ہو گیا اور حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے باطنی علوم وکیفیات اس عزیز کے باطن میں بھی پیدا ہو گئیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ حضرت خواجہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جانب تحریر فرماتے ہیں کہ عزیزِ متوقف (رُکا ہوا عزیز) فوق سے نیچے آگیا ہے۔ یعنی عروج سے نزول کر کے مقام جذبہ میں داخل ہو گیا ہے، جس کو مقامِ قلب سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی توجہ عالم کی طرف نہیں بلکہ فوق کی طرف ہی متوجہ رہتا ہے اور اس کا فوق کی طرف متوجہ رہنا فقیر (حضرت مجدد) کی توجہ کی بناء پر ہے اور یہ معاملہ اس کی طبیعت کے برعکس تھا کیونکہ وہ عزیزِ متوقف فطری طور پر نزولی جذبے کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا۔

جذبہ ٔ احراریہ

عزیزِ متوقف کی عروج فوقانی کی جانب توجہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خاص جذبہ کی جانب اشارہ ہے جو ان کو اپنے آباء واجداد مادری میں سے حضرت شیخ عمر یاغستانی فاروقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کی اولاد سے ورثے میں ملا ہے اور ان کو اس مقام میں ایک خاص امتیازی

نشان حاصل ہے۔ جیسا کہ رشحات میں موجود ہے، یہ جذبہ سالک کو ذاتِ بلا کیف تک پہنچانے والا ہے، لیکن خواجگانِ نقشبند علیہم الرحمۃ والرضوان کا جذبہ اس جذبہ ٔ احراریہ کے علاوہ ہے۔

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ عزیزِ متوقف پر فقیر کی اس توجہ کا اثر یہ مکتوب لکھنے تک نسبتِ جذبہ میں اس طرح باقی ہے جیسے جسم میں روح ہے اور اندھیرے میں نور ہے۔

عزیز متوقف سے مُراد

عزیزِ متوقف کے تعین میں اختلاف ہے اور اس میں تین اقوال سامنے آئے ہیں:

پہلا قول

عزیز متوقف سے مُراد حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا کوئی خاص مخلص عزیز ہے۔

دوسرا قول

خود حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی ذاتِ مقدسہ مراد ہے۔

تیسرا قول

عزیزِ متوقف سے مُراد حضرت باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ تیسرا قول ہی راجح معلوم ہوتا ہے اور اس پر مندرجہ ذیل شواہد و دلائل پیش کیئے جاسکتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

- حضرت خواجہ دہلوی علیہ الرحمۃ جب حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی طرف مکتوب ارسال فرماتے تو اس پر اپنے آپ کو فقیرِ متوقف لکھتے تھے۔ اسی بناء پر حضرت امام ربانی قدس سرہٗ آپ کے مکتوبات کی موافقت میں جواباً عزیزِ متوقف لکھا کرتے تھے اور اس امر پر دلیل یہ ہے کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اس مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "اُمید است کہ

در وقتِ مطالعۂ ایں کلماتِ نامربوطہ دخول تام در آں مقام میسر شود"یعنی اُمید ہے کہ میرے ان بے ربط کلمات (شریفہ) کے مطالعہ کے وقت آپ کو اس مقام میں پورے طور پر داخل ہونا میسر ہو جائے گا۔اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے مکتوب کا مطالعہ تو حضرت خواجہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے اور یہ مکتوب بھی ان ہی کی طرف ہے اگر عزیزِ متوقف کوئی دوسرا شخص تھا تو حضرت خواجہ کا مطالعہ اس کو کیا فائدہ پہنچا سکتا تھا۔

- سولھویں مکتوب سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت امام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔
- سترہویں مکتوب میں بھی حضرت خواجہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عزیزِ متوقف ہونے کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔
- حضرت شاہ فضل اللہ مجددی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"از مکتوب ہائے حضرت خواجہ کہ بحضرت امام نوشتہ اند استفادہ حضرت خواجہ از حضرت امام معلوم می شود"۔(عمدۃ المقامات)

یعنی حضرت خواجہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو مکتوبات (خطوط مبارکہ) حضرت امام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ ان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

- صاحبِ روضۃ القیومیہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے جو مکتوبات اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھے ہیں ان میں سے

بعض میں تحریر فرمایاہے کہ ”میں نے عزیزِ متوقّف کو فلاں مقام تک پہنچادیااور فلاں مقام سے فلاں مقام تک ترقی کرائی“۔جب حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ سے بعض احباب نے جرأت کرکے دریافت کیا کہ ”عزیز متوقف سے کون صاحب مُراد ہیں؟“تو حضرت خواجہ نے فرمایا:”میں ہی عزیز متوقف ہوں،مجھے ہی اشارتاً عزیز متوقف لکھتے ہیں“۔[1]

- شیخ تاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (آپ کے پیر بھائی) فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے آپ کے موسومہ بعض مکاتیب میں جو الفاظ ”عزیزِ متوقف“ تحریر کرکے اس کا چارہ کار دریافت کیا عزیزِ متوقف سے مُراد خود ذات بابرکات حضرت پیر ومرشد تھے۔[2]

اس امر کی تائید حضرت خواجہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس مشہور ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو حضرت امام ربانی کی تعریف میں فرمایا تھا کہ:

”میاں شیخ احمد آفتابی است کہ مثلِ ماہزاراں ستارگان در ضمنِ ایشاں گُم است“۔[3]

شیخ احمد ایک ایسا آفتاب ہے کہ ہمارے جیسے ہزاروں ستارے اس کے نور میں گُم ہیں۔

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ موجودہ حالات میں جبکہ آپ (حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ) نے حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کا جذبہ حاصل کرلیاہے،ہمارے بعض یارانِ طریقت نے واقعہ (کشفِ روحانی) میں دیکھا ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ ایک پکی

---

[1] (روضۃالقیومیہ(مترجم)،ص ۲۰۴)

[2] (جواھر مجددیہ،ص ۲۷)

[3] (زبدۃالمقامات،مقصددوم،فصل سوم)

ہوئی روٹی کی مانند ہیں اور حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انہیں کھالیا ہے۔ اس واقعہ سے یہ مطلب اخذ ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نسبتِ خاصہ جذبۂ احراریہ کو اپنے اندر سمولیا ہے اور ان کے کمالات کو پورے طور پر حاصل کرلیا ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۸۴ تا ۴۸۹)

[جذبہ کے بعض مقامات ان میں داخل ہونے کے بعد سلوک کے منافی ہیں۔ اور کچھ دوسرے مقاماتِ سلوک کے منافی نہیں۔ بلکہ ان میں داخل ہونے کے بعد سلوک کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ جذبہ ایسا ہے کہ ان میں داخلے کے بعد منافی سلوک ہے۔

اس عریضہ کی تحریر کے دوران بندہ اس مقام کی طرف متوجہ ہوا تو اس کے بعض دقائق ظاہر ہوئے۔ جب تک کوئی سبب پیش نہ آئے توجہ میسر نہیں آتی۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال

چند ماہ ہوئے کہ وہ عزیز نیچے آچکا ہے۔ البتہ مکمل طور پر مقامِ جذبہ مذکورہ میں داخل نہیں ہوا۔ اس مقام کی شان کا علم نہ ہونا اور توجہات کا منتشر ہونا اس کا مانع ہے۔ اُمید ہے کہ ان بے جوڑ اور بے ربط کلمات کے مطالعہ کے وقت اس مقام میں مکمل دخول میسر آجائے گا۔ اس کے بعد حضرت خواجہ کو وہ عزیز مکمل طور پر نیچے لے آئے گا۔]

تشریح

جب تک سالک جذبہ میں ہوتا ہے اس وقت تک اس میں شوق وذوق زیادہ ہوتا ہے لیکن جذبہ سے گزر کر سلوک میں داخل ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ جذبہ جدا چیز ہے اور سلوک اَمرِ دیگر ہے۔ اور جذبہ کا وہ مقام جو سلوک کے منافی ہے وہ مقام ہے جس پر حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فائز

تھے۔اس مقام میں بند ہو جانے والا شخص نہ تو سلوک میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی سلوک کو فائدہ دے سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سلوک والے سالک کی مجذوب کے ساتھ صحبت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اور جذبہ کے وہ مقامات جو سلوک کے منافی نہیں وہ مقامات ہیں جو سلوک کے بعد حاصل ہوتے ہیں کہ ان مقامات پر پہنچنے والا سالک دوسروں کے لئے بھی مفید ثابت ہوتا ہے یعنی خود بھی شریعت پر عمل پیرا ہوتا ہے، دوسروں کو بھی دعوت دیتا ہے اور سالکین کی باطنی تربیت بھی کر سکتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جذبہ ٔاحراریہ فائدہ پہنچانے کے مقام کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ اس میں توجہ عالم کی بجائے فوق کی طرف رہتی ہے اور دائمی سکر کی کیفیت طاری رہتی ہے کیونکہ اس مقام کا جذبہ دوسرے مقام کے جذبے سے مختلف ہے۔

جذبہ دو قسم کا ہے:

پہلی قسم

منافیٔ سلوک ہے۔

دوسری قسم

موافقِ سلوک ہے۔

جذبہ ٔاحراریہ منافیٔ سلوک ہے کیونکہ اس میں سالک پر اضمحلالُ استہلاک کا غلبہ ہوتا ہے اس کی توجہ نزول کی بجائے عروج کی طرف مائل ہوتی ہے۔لہٰذا سلوک کی جانب توجہ نہیں رہتی۔یہی وجہ

ہے کہ یہ جذبہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے مقام کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ برخلاف دوسری قسم کے جذبہ کے کہ وہ موافق سلوک ہے اور افادہ واستفادہ کی مناسبت کا حامل ہے۔ (**واللہ اعلم**)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۸۹ تا ۴۹۰)

مکتوب نمبر ۱۶

[عروج ونزول وغیرہ کے حالات کے بیان میں۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے مرشد بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

احقر الطلبہ کی عرض داشت یہ ہے کہ مولانا علاؤالدین نے آپ کے نوازش نامے پہنچائے۔ ان نوازش ناموں کے ہر ایک مقدمہ کی وضاحت وشرح وقت کے مطابق کی گئی ہے۔ ان تحریر شدہ علوم کے بعض متممات و مکملات بھی دل میں آئے۔ ان کی تحریر کی فرصت نہ ملی۔ میری طرف سے عریضہ لانے والا صرف عریضہ لے کر ہی روانہ ہو گیا۔ انشاء اللہ بعد کو جلد ہی خدمت اقدس میں ارسال کئے جائیں گے۔ اس وقت وہ رسالہ جو تیار ہو چکا تھا ارسال خدمت کیا ہے۔ اور وہ رسالہ بعض دوستوں کی فرمائش پر میسر آیا ہے۔ ان دوستوں نے فرمائش کی تھی کہ بعض ایسے نصائح لکھو جو اس طریقہ میں نفع مند ثابت ہوں اور ان کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالہ ہٰذا بے نظیر اور کثیر البرکات ہے۔ رسالہ ہٰذا کی تحریر کے بعد یوں معلوم ہوا کہ حضرت رسالت خاتمیت علیہ الصلوٰۃ والسلام اُمت کے مشائخ کی جماعت کثیرہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور یہ رسالہ دست مبارک میں پکڑا ہوا ہے۔ اور کمال کرم ومہربانی سے اسے بوسہ دے رہے ہیں اور مشائخ کو دکھا رہے ہیں کہ اس طرح کے عقائد رکھنے چاہئیں اور مشائخ کی وہ جماعت جو اس رسالہ کے علوم سے سعادت مند تھی وہ بہت نورانی اور ممتاز تھی اور نادر الوجود تھی۔ اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے روبرو کھڑی تھی۔ یہ قصہ بہت دراز ہے۔ اور اسی مجلس میں اس واقعہ کی اشاعت کا بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس احقر کو حکم دیا۔

باکریماں کارہا دشوار نیست

[ترجمہ: کریم لوگوں کے لئے کوئی کام مشکل نہیں۔]

تشریح

عروج اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف جانے کو کہتے ہیں۔ اور نزول ارشاد و تبلیغ (دینِ اسلام کی دعوت دینے) کے لئے واپس آنے کو کہتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت اقدس میں عرض کرتے ہیں کہ جو بعض سوالات آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمائے تھے اُن کے جوابات میں نے لکھ دیئے ہیں اور ان کے علاوہ بعض مشکل سوالات جن کا تعلق متتمات و مکملات سے ہے اُنہیں بندہ آئندہ مکتوب میں تحریر کرے گا۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس ارشاد و تکمیل کی تعریف یوں بیان فرماتے ہیں کہ ایک مُرید ہوتا ہے اور دوسرا مُراد، اور ایک مُحب ہوتا ہے اور دوسرا محبوب۔ جو شخص مرید و مراد اور محب و محبوب میں فرق نہ کرسکے تو وہ شخص کامل و مکمل پیر بننے اور اس کی کیفیات سے ہی بالکل بے خبر ہوتا ہے۔

پیر کی تین اقسام ہیں

اول درجے کا پیر وہ ہوتا ہے جس کو اولوالعزم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مقامات سے فیض آتا ہو۔

دوم درجے کا پیر وہ ہوتا ہے کہ جس کو مقامِ رسالت سے فیض آتا ہو اس ولی کا مقام اول درجے کے پیر سے کم ہوتا ہے۔

سوم درجے کا پیر وہ ہوتا ہے جس کو مقامِ نبوت سے فیض آتا ہو اس کا مقام اول و دوم درجے کے پیر سے کم ہوتا ہے۔

عقائد کا یہ مسئلہ اپنے دماغ میں اچھی طرح نقش کرلیں کہ ولی نہ تو اولوالعزم نبی بن سکتا ہے، نہ نبی اور نہ ہی رسول۔ کیونکہ کوئی بھی ولی کسی بھی نبی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا جو صوفی اولوالعزم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مکمل تابعداری کرے تو اس صوفی کو اولوالعزم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مقام سے فیض آتا ہے۔ جو صوفی مکمل طور پر رسول کی تابعداری کرے تو اس صوفی کو مقامِ رسالت سے فیض آتا ہے اور جو صوفی مکمل طور پر نبی علیہ السلام کی تابعداری کرے تو اس صوفی کو مقامِ نبوت سے فیض آتا ہے۔ نبی، رسول اور انبیاء اولوالعزم علیہم الصلوٰۃ والسلام کے درمیان فرق کو عقائدِ اہل سنت وجماعت کی اہم کتاب ابو المنتہٰی میں واضح کیا گیا ہے، وہاں سے ملاحظہ کرلیں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ جو رسالہ (مکتوبات شریف) میں نے لکھا اس رسالہ کی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے تصدیق فرمائی اور اس کو بوسہ دیا اور مجھے حکم فرمایا کہ اس رسالے کو شائع کرو میں اس لئے آپ کی خدمت اقدس میں یہ سب باتیں عرض کررہا ہوں کہ یہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا حکم تھا ورنہ میں اس رسالے کو شائع نہ کرتا۔

مختصر یہ کہ یہ وہی رسالہ ہے جس میں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے دینِ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی تجدید فرمائی۔ اگر کوئی شخص عقائد کو سیکھنا چاہتا ہے تو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے مکتوبات شریف سے سیکھے اور اس پر عمل کرے کیونکہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقائد بعینہٖ حضرت امام ابو حنیفہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ

الاقدس کے عقائد ہیں جو کوئی بھی ان عقائد سے ہٹ کر عقائد رکھے وہ سراسر گمراہی میں ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ انہیں راہِ راست پر چلنے کی ہدایت فرمائے اور ہم پر اور تمام صالحین پر سلامتی کا نزول ہو، آمین۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

یہ مکتوب حضرت خواجہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ایک مکتوب کے جواب میں لکھا گیا جس میں انہوں نے طریقت کے بعض مقامات واحوال کی وضاحت کے لئے حکم فرمایا تھا۔ یہ مکتوب آپ نے بدست حضرت مولانا علاؤالدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ارسال فرمایا تھا۔ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رقم طراز ہیں کہ حضور والا کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے تمام مقدماتِ مذکورہ میں توجہ کی گئی ہے بحمدہٖ تعالیٰ ان کا شافی حل ظاہر ہو گیا ہے جو تحریری صورت میں عنقریب آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔

بعض احبابِ طریقت نے حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے گزارش کی تھی کہ آپ ایک رسالہ (مضمون) تحریر فرمائیں جو اہل سنت کے عقیدوں اور طریقت میں نفع دینے والی نصیحتوں پر مشتمل ہو تاکہ ہم اس کے مطابق عملی زندگی بسر کر سکیں، چنانچہ آپ نے وہ رسالہ تحریر فرما دیا جس کا نام کثیر البرکات رکھا گیا۔

رسالہ کثیر البرکات کو سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے بوسہ دیا

آپ فرماتے ہیں کہ در حقیقت یہ رسالہ بے مثل اور کثیر البرکات (بہت برکتوں والا) ہے جو اپنی نورانیت کی وجہ سے ممتاز اور عزیز الوجود (نادر) ہے۔ آپ فرماتے ہیں اس رسالہ کو لکھنے کے بعد مکاشفہ کی حالت میں معلوم ہوا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اپنی امت کے

مشائخ کی ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور اس رسالہ کو اپنے دستِ اقدس میں لیئے ہوئے اپنے کمالِ کرم سے اس کو چوم رہے ہیں اور مشائخ کو دکھا کر فرماتے ہیں کہ:

"این نوع معتقدات می باید حاصل کرد"۔

یعنی اس قسم کے عقائد حاصل کرنے چاہئیں۔

بینہ نمبر ۱

اس کثیر البرکات رسالہ کی حتمی طور پر نشاندہی تو مشکل ہے البتہ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ شاید اس سے مراد مکتوب نمبر ۲۶۶ دفتر اول ہے۔(واللہ و رسولہٗ اعلم)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۹۳، ۴۹۴)

[جس روز سے بندہ ملازمت سے الگ ہوا ہے مقامِ فوق کی طرف رغبت کے سبب مقامِ ارشاد سے چنداں مناسبت نہیں رکھتا۔ چند بار یہ ارادہ اور قصد بھی کیا کہ کسی گوشہ میں بیٹھ رہے۔ ہم نشینی کرنے والے لوگ ببر اور شیر کی طرح نظر آتے تھے۔ عزلت اور گوشہ نشینی کا ارادہ پختہ ہو چکا تھا لیکن استخارہ اس کے موافق نہ آیا۔ مدارجِ قُرب میں عروج انتہاء کی انتہاء کو پہنچ چکا ہے جس کی کوئی حد وغایت نہیں، یہ بھی میسر ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے، مجھے لے جاتے ہیں اور لے آتے ہیں۔ ہر دن وہ نئی شان و حالت میں ہے۔ تمام مشائخ کرام الا ماشاء اللہ کے مقامات سے بھی گزر واقع ہو چکا ہے۔

گلے بردند زیں دہلیزۂ پست　　　　بداں درگاہِ والا دست بر دست

ترجمہ: اس پست دہلیز سے ایک خاک کو اس درگاہ والا میں ہاتھوں ہاتھ لے گئے۔]

تشریح

"جس روز سے بندہ ملازمت سے الگ ہوا ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ جس وقت پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے مجھے خلافت عطا فرمائی اور ارشاد و دعوت کا حکم دیا اُس وقت یہ دعوت مجھ پر اتنی بھاری تھی کہ میں جس مُرید کی طرف متوجہ ہوتا تھا وہ مجھے جنگل کے ببر شیر کی طرح نظر آتا تھا کہ کہیں مجھ پر حملہ کرکے مجھے کھا ہی نہ لے۔

اس کے برعکس آج کیا ہو رہا ہے مرید کو دو دن نہیں ہوئے ہوتے کہ اس کے سب لطائف تبدیل کرکے اس کو خلافت نامہ دے دیا جاتا ہے، تیسرے دن وہ مرید بنانا شروع کر دیتا ہے اور پھر فسق و فجور میں غرق ہو جاتا ہے کیونکہ وہ کفر و اسلام میں فرق نہیں کر سکتے نہ تو ان کو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی تعلیمات معلوم ہوتی ہیں اور نہ ہی حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقائد اور نہ ہی اُن کو تصوف کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں، اس طرح کے پیر کے اگر لاکھوں مُرید ہی کیوں نہ بن جائیں بغیر گمراہی کے اس کا اور کچھ فائدہ نہیں۔ ان کی مثال اس ڈاکٹر یا انجینئر کی ہے جس نے کتاب میں تو ڈاکٹری یا انجینئرنگ کے بارے میں پڑھا ہو مگر اس میدان میں پریکٹیکل نہ کیا ہو تو یہ ڈاکٹر اور انجینئر مخلوق کو بغیر جانی و مالی نقصان کے اور کیا دے سکتے ہیں؟ اس طرح کے صوفی کو اگر خلافت مل بھی جائے تو اس کو چاہیئے کہ پہلے علم حاصل کرے اور پھر لوگوں کو عقائد اور مسائل بتائے اس سے پچھلے مکتوبوں میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ صوفی دو چیزوں سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ وصل ہوتا ہے یا کامل و مکمل پیر کے ذریعے یا قصر قاصر کے ذریعے۔ اگر آپ کے پاس کامل و مکمل پیر نہیں تو قصر قاصر تو ہے جس طرح حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس خلافت کے بعد فرماتے ہیں کہ مجھے مریدین جنگل میں ببر شیر کی طرح دکھائی دینے لگے کہ یہ

مجھے کھا جائیں گے اور میں کب اس قابل ہوں کہ میں ان کی تربیت کر سکوں یہ کتنی عجز وانکساری کی بات ہے۔ مگر حیران کن بات یہ ہے کہ آج کل پیر صاحب کے پاس کسی چیز کے نہ ہونے کے باوجود غرور و تکبر انتہاء تک پہنچا ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی طرح کے شیخ کہ باوجود اس کے کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا رسالہ (مکتوبات شریف) اور عقائد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے دربار میں قبول و مقبول ہیں پھر بھی انکساری فرماتے ہیں ایسے لوگ چند ہی ہوتے ہیں اس کے باوجود آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مریدین کو ارشاد و تکمیل کی دعوت دینے سے ڈرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے چند بار یہ ارادہ اور قصد بھی کیا کہ کسی گوشہ میں بیٹھ جاؤں۔ عزلت اور گوشہ نشینی کا ارادہ پختہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہم نشینی کرنے والے لوگ مجھے ببر شیر کی طرح نظر آتے تھے۔ لیکن جب بھی اس بارے میں استخارہ کرتا تو اس میں نظر آتا کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مجدد دین ہیں آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دین کی تجدید کریں اور لوگوں کو ارشاد و تکمیل کی دعوت دیں، گوشہ نشینی اختیار نہ کریں۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے عروج کے دوران راستے میں بہت سے مشائخ اور اُن کے مقامات کو دیکھا اور اُن مقامات سے مجھے فیض بھی ملا۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت خواجہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو خلافت اور مسندِ ارشاد کی اجازت سے نوازا تھا اور حکم فرمایا کہ خلقِ خدا کی رُشد و ہدایت میں مصروف ہو جاؤ۔

چونکہ حضرت امامِ ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طبیعت مبارکہ پر اس وقت عروج کا رُحجان غالب تھا اس لئے مخلوق کے ساتھ التفات اور میل جول سے گریز فرماتے تھے اسی بناء پر آپ فرماتے ہیں کہ

ملنے جلنے والے لوگ مجھے ببر شیر کی طرح نظر آتے ہیں، اور ان سے دور بھاگنے میں ہی عافیت نظر آتی ہے کیونکہ سالک قُرب کی منزلوں میں عروج کے وقت ماسویٰ اللہ کی طرف التفات نہیں کرتا۔ حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ایک بار تو گوشہ نشینی کا پختہ عزم کر لیا تھا مگر استخارہ میں اس امر کی اجازت نہ ملی چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ کبھی عروج ہوتا ہے اور کبھی نزول اور شاید ہی سابقہ مشائخ امت میں سے کوئی رہ گیا ہو جس کی روحانیت اس خادم کے شاملِ حال نہ ہوئی ہو۔ غرضیکہ تمام مقدماتِ اصل سے مقاماتِ ظل کی مانند گزر کرایا گیا ہے یعنی اس قدر اللہ تعالیٰ کی عنایات شامل حال ہوئی ہیں کہ صفات کی سیر ظلال صفات کی طرح کرائی گئی ہے اور اب معاملہ قُرب و عروج کی انتہاء کو پہنچ چکا ہے۔ حالانکہ اس کے قرب کے مدارج کی کوئی انتہاء نہیں اور یہ سب کچھ بلا سبب محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوا ہے اور گزشتہ مشائخ امت کی یہ توجہات بھی محض اللہ تعالیٰ کی عنایات کا نتیجہ ہیں۔

بینہ نمبر ۲

آپ جامع کمالاتِ ولایتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ تھے۔ جیسا کہ اسی مکتوب کے مضمون سے ظاہر ہے کہ آپ نے عروج ونزول کے تمام مراتب کو طے کر لیا تھا اور آپ محبوبیت و مرادیت کے منصب پر فائز تھے۔ **والحمدللہ علیٰ ذٰلک۔**

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۹۶، ۴۹۷)

[اس دوران میں اگر مشائخ کرام کی روحانیت کی وساطت و مدد کا شمار کروں تو بات بہت لمبی ہو جائے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ مجھے عروج کے دوران مشائخ کرام کی روحانیت کے وسیلے سے جتنا فیض آیا اگر میں اُن سب کو بیان و شمار کروں تو وہ لاتعداد ہیں بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس کے برعکس آج کل اگر ایک پیر کا خلیفہ دوسرے پیر کے پاس چلا جائے تو پیر صاحب کہتے ہیں کہ میرا یہ خلیفہ گمراہ ہو گیا، کیونکہ یہ دوسرے پیر صاحب کی مجلس میں چلا گیا ہے۔ بعض پیر اپنے مُریدین کو ایک دوسرے کی مجلس میں جانے سے منع کرتے ہیں۔ ہر صوفی کو چاہیئے کہ یہ عقیدہ رکھے کہ اگر مشرق یا مغرب جہاں کہیں بھی کوئی ولی اللہ ہے میں اس کے تابع ہوں، میں اس کو ماننے والا ہوں یا اللہ اس ولی اللہ کے وسیلہ سے (اگر وہ میرا دُشمن بھی ہے) مجھ پر فیض وبرکات نازل فرما کر میرا قلب ورُوح ذاکر فرما۔ اگر چہ میں اس ولی اللہ کو نہیں جانتا، اگر یہ ولی اللہ اس شخص سے ناراض بھی ہو تو بھی اس شخص کو فیض آتا ہے اس لئے کہ اس ولی اللہ کا باطن تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی شخص ایک پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام یا ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مثلاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے (جو یارِ غار بھی ہیں اور خود قرآن بھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحابیت پر ناطق ہے) انکار کرے تو اس پر وہ شخص کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی اصلی ولی اللہ (جس کی تعریف پیچھے گزر چکی ہے) سے منکر ہو جائے تو یہ شخص اس انکار کی وجہ سے کافر تو نہیں ہو گا مگر کفر کا خطرہ لاحق رہے گا۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی ولی کی ذاتی شخصیت سے منکر ہو تو اس میں اس پر کوئی گناہ نہیں۔

[خلاصہ یہ کہ اصل کے تمام مقامات سے ظل کے مقامات کی طرح گزار کرلے گئے۔ عنایاتِ ربانی کے متعلق کیا لکھے۔ جو بھی مقبول و منظور ہوا بلا علت و بلا سبب ہی منظور و مقبول ہوا۔ ولایت کے طریقے اور اس کے کمالات اس قدر دکھائے گئے ہیں کہ انہیں کس طرح تحریر میں لائے۔

ذوالحجہ شریف کے مہینہ میں مدارج نزول کی طرف مقامِ قلب تک نیچے آنا ہوا۔ یہ مقام تکمیل وارشاد کا مقام ہے۔ لیکن ابھی تک مکمل اور پورا کرنے والی چیزیں جو اس مقام سے تعلق رکھتی ہیں، مزید درکار ہیں۔ دیکھیئے کب میسر ہوں، معاملہ آسان نہیں ہے۔ مُراد ہونے کے باوجود اس قدر منازل طے کرنے پڑتے ہیں کہ مُریدوں کو اگر عمر نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی مل جائے تو شاید طے نہ کر سکیں اور انہیں یہ میسر نہ آسکے۔ بلکہ یہ وجوہ اور طریقے مُراد لوگوں کے ساتھ خاص ہیں۔ مُریدوں کے لئے ان میں قدم رکھنے کی کوئی جگہ نہیں۔ افراد کا انتہائی عروج مقام اصل کی ابتدا تک ہے۔ بہت سے لوگ ادھر گزر نہیں سکتے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ فضلِ عظیم کا مالک ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ مُرادوں اور محبوبوں کے لئے اتنی مشکلات ہیں اگر مُریدوں کی عمر حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر تک بھی پہنچ جائے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل وکرم کے بغیر وہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔ مُرید اور مُراد میں فرق مکتوب نمبر ۹ میں بیان ہو چکا ہے، یہاں پر مختصراً بیان کیا جارہا ہے کہ مراد اُس صوفی کو کہا جاتا ہے جو محمدی مشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہو اور مُرید اس صوفی کو کہا جاتا ہے جو دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مشرب پر ہو۔

ولایت کی اقسام

ولایت کی تین اقسام ہیں:

۱۔ولایتِ صغریٰ ۲۔ولایتِ کبریٰ ۳۔ولایتِ ملاءالاعلیٰ

۱۔ولایتِ صغریٰ والا صوفی ظلی ہوتا ہے کیونکہ اس صوفی کی ساری کیفیات ظلی ہوتی ہیں۔

۲۔ولایتِ کبریٰ اصلی ہوتی ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جب پیدا ہوتے ہیں تو بچپن ہی سے وہ ولایتِ کبریٰ پر فائز ہوتے ہیں۔انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اصل سے شروع کر کے ولایتِ ملاءالاعلیٰ میں پہنچتے ہیں۔ جبکہ ولی کی ابتداً ظل سے شروع ہوتی ہے جو صوفی ولایتِ صغریٰ میں محمدی المشرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہو وہ ظل سے اصل میں پہنچ سکتا ہے اور اُسے تجلی برقی و تجلیاتِ صفاتِ اصلی سے فیض ملتا ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس کی استعداد زیادہ کر دیتا ہے۔اور جو صوفی ولایتِ صغریٰ میں دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مشرب سے ہو وہ ظل سے اصل میں نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ولایتِ ملاءالاعلیٰ وہ ولایت ہے جس میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر اسمِ باطن سے تجلی ذات پڑتی ہے۔انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کامل و مکمل تابعداری کرنے والے اولیاء کرام کو بھی اسی ولایت سے حصہ ملتا ہے اور وہ اس ولایت پر فائز ہو جاتے ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابوالبیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں عرض گزار ہیں کہ اس خادم پر اللہ تعالیٰ کی عنایات عالمِ بیان سے باہر ہیں۔ولایت کے اعلیٰ مراتب و حقائق اور کمالات اس قدر عطا ہوئے ہیں کہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔

کمالاتِ ولایت کے تین مفہوم

آپ کا یہ قول تین مفاہیم پر مشتمل معلوم ہوتا ہے۔

پہلا مفہوم

آپ کو ولایت کے تمام مراتب و کمالات عطا کیئے گئے مثلاً:

ولایتِ صغریٰ (جو اولیائے کرام کی ولایت ہے)

ولایتِ کُبریٰ (جو انبیائے عظام کی ولایت ہے)

ولایتِ علیا (جو ملاءِ اعلیٰ کی ولایت ہے)

اسی طرح مقام قطبیت، فردیت، قیومیت، مرادیت، شہادت و صدیقیت بھی آپ کو عنایت فرمائے گئے۔

دُوسرا مفہوم

آپ کو ولایت انبیائے اولوالعزم سے بھی نوازا گیا جیسا کہ آپ کو حقیقتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ آدم و نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے حقائق اور نشانات علیحدہ علیحدہ عطا فرمائے گئے اور یہ بھی نشاندہی کی گئی کہ انبیائے کرام کی کون سی ولایت کس لطیفے اور کس اسم اور صفت سے تعلق رکھتی ہے اور ان کے مبادیٔ تعینات کیا ہیں اور ولایتِ انبیاء کے کمالات میں کیا فرق ہے۔

تیسرا مفہوم

آپ کو مختلف کمالات کے درمیان امتیازات کا علم بھی دیا گیا۔ مثلاً کمالاتِ نبوت، کمالاتِ رسالت اور کمالاتِ اولوالعزم کا فرق بتایا گیا اور انبیائے کرام کے مشارب کے اسرار بھی آپ پر واضح

کئے گئے اسی طرح ماہیاتِ حقائق، تجلیّات اسماء وصفات وشیونات اور مراقبات کے جملہ علوم ومعارف بھی آپ کو ودیعت کئے گئے۔ والحمدللہ علیٰ ذٰلک۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز ارشاد فرماتے ہیں کہ ماہ ذی الحجہ میں راہِ سلوک طے کرتے ہوئے نزولی مرتبوں میں سیر واقع ہوئی اور مجھے مقامِ قلب تک نیچے لایا گیا، یہ مرتبہ تکمیل وارشاد کا مقام ہے۔

مقامِ دعوت

اس مقام میں مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اور ہدایت وتربیت دی جاتی ہے۔ اس کو مسند ارشاد اور مقامِ دعوت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کو مسندِ ارشاد اور مقامِ دعوت بھی کہا جاتا ہے، یہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے، کاملین اولیاء کو انبیاء کی تبعیت میں یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (یوسف ۱۰۸)

ترجمہ: تم فرماؤ یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور جو میرے قدموں پر چلیں دل کی آنکھیں رکھتے ہیں۔

اس مقام کے اولیائے کرام کو راجعین الی الدعوۃ کہا جاتا ہے۔ مخلوق کو خدا کی طرف بلانے کے لئے عالمِ امر سے عالمِ خلق کی طرف ان کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ یہ مرتبہ سیر عن اللہ، باللہ اور سیر عن اللہ فی الاشیاء سے عبارت ہے۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ عنایتِ خداوندی سے مجھے یہ بلند مرتبہ (مقامِ دعوت) نصیب ہو گیا ہے مگر اس مرتبے کو مزید کمال تک پہنچانے والی چیزوں

کا انتظار ہے۔ اُمید ہے کہ وہ بھی آپ (حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ) کی توجہات سے جلد میسر ہوں گی۔ وَبِاللہِ التَّوْفِیْق۔

بینہ نمبر ۳

اولیاء کے حق میں کمالاتِ نبوت ورسالت سے منصبِ نبوت ورسالت ہر گز مراد نہیں، بلکہ تبعیت ووراثت کے طور پر ان کے کمالات اور فیضان کا پَرتو مُراد ہے۔ امکان وقوعی اور امکان عقلی کا فرق واضح رہنا چاہیئے۔

مُراد و مُرید

آپ فرماتے ہیں کہ دعوت وارشاد کا یہ مقام حاصل ہو جانا آسان کام نہیں، بسا اوقات مُراد ہونے کے باوجود اس قدر مشکل اور سخت منزلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ مُرید لوگ عمرِ نوح علیہ السلام (ہزار سال) کی محنتوں کے بعد بھی یہ مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

کیونکہ یہ کمالات مُراد اور محبوب اولیاء کے ساتھ مخصوص ہیں بلکہ مُرید تو اس وادی میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔ اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مُراد اور مُرید کا فرق واضح کیا جائے۔

مُراد

وہ اولیائے کرام جن کو جذبۂ الٰہی نے اپنی طرف کھینچ لیا ہو اور وہ بلا کسب وریاضت محض فضل کے راستے خدا تک پہنچیں مُراد و محبوب کہلاتے ہیں۔

مُرید

وہ سالکین جو اپنے ارادہ کو اللہ کے ارادے میں خود فنا کر کے راضی برضا ہو جائیں مُرید کہلاتے ہیں۔ اہل تصوف کا قول ہے "اَلْمُرِیْدُ مَنْ لَا یُرِیْدُ اِلَّا اللہُ"۔ مرید وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ارادہ نہ رکھتا ہو۔ چونکہ مُرید اپنے شیخ کے ساتھ یہی نسبت رکھتا ہے اس لئے اس کو مُرید کہا جاتا ہے۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو لوگ سلوک وریاضت اور توبہ وانابت کے راستے خدا تک پہنچیں مُرید اور مُحب کہلاتے ہیں۔

بینہ نمبر ۴

مذکورہ بالا دونوں مرتبوں کا ذکر درج ذیل آیات میں ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران ۳۱)

اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ (الشوریٰ ۱۳)

محبوبیت اور محبیّت، اجتباء اور اِنابت جیسی مصطلحاتِ تصوف دراصل قرآن کریم سے ثابت وماخوذ ہیں۔

بینہ نمبر ۵

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو جو حقائق وکمالاتِ ولایت اور مراتبِ ارشاد ودعوت سے نواز کر مُرادیّت ومحبوبیّت کا مقام عطا فرما دیا تھا، اس مقام کا حصول اپنی قابلیت اور محنت پر موقوف نہیں اس کے فضلِ محض پر موقوف ہے۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا کہ ابھی اس مقام کو تمام وکمال تک پہنچانے والی چیزیں درکار ہیں اس کا مطلب بھی یہی ہے

کہ توقف و تاخیت کی وجہ بھی اس کے علم میں ہے اور وہ مطلوبہ چیزیں بھی اسی کے فضل سے ہی میّسر ہوں گی نہ کہ اپنی کوشش سے۔

بینہ نمبر ٦

ممکن ہے ان چیزوں سے کمالاتِ نبوت ورسالت و کمالاتِ اولوالعزم مُراد ہوں۔ واللہ اعلم!

حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ قطبِ افراد کا حصہ بہ نسبت قطبِ ارشاد کے مقامِ اصل (وجوب) میں زیادہ ہے لیکن قطب افراد کا یہ حصہ مقامِ اصل کی ابتدأ تک ہے۔ اس سے آگے مقامِ اصل میں تفصیلی سیر میں اکثر افراد کا گزر بھی نہیں ہے۔

واضح ہو کہ قطبِ ارشاد اور قطبِ افراد کے فرائض ودرجات میں فرق ہے۔

قطبِ ارشاد

یہ اولیائے ظاہرین میں سے ہوتا ہے۔ خلافتِ الٰہیہ اور نیابت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ سے سرفراز ہوتا ہے۔ مخلوق کے لئے ہر قسم کی حسنات وبرکات کا ذریعہ اور گناہوں سے مغفرت کا وسیلہ ہوتا ہے۔ دینی وتشریعی اُمور اس کے تصرف میں ہوتے ہیں۔

حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

"قطب ارشاد واسطۂ وصولِ فیوض است کہ بارشاد وہدایتِ عالم تعلق دارد"۔[1]

یعنی قطبِ ارشاد ہدایت وارشاد (دعوت) سے متعلق اُمور میں وصولِ فیض کا واسطہ ہوتا ہے۔

---

[1] (معارفِ لدنیہ معرفت، ص ۳۵)

قطبِ افراد

جو متابعتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ کے باعث فردیت ذات کی تجلی سے ممتاز ہو اور اپنے انتہائی کمال کی وجہ سے دائرۂ قطب الاقطاب سے خارج ہو۔ یہ روئے زمین پر اولیاء کرام میں سے صرف تین ہوتے ہیں۔[1]

فرد اور قطبِ وحدت ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ فرد اور قطبِ وحدت کا مرتبہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بطور دعا کے غزوۂ بدر میں ارشاد فرمائی وہ یہ ہے:

اللھُمَّ إِنَّکَ إِنْ تُھْلِکْ ھَذِہِ الْعِصَابَۃَ مِنْ أَھْلِ الْإِسْلامِ، فَلا تُعْبَدُ فِي الْأَرْضِ أَبَدًا۔[2]

"یعنی اے اللہ! اگر اس جماعت کو ہلاک کر دیا گیا تو آپ کی عبادت زمین میں کبھی نہ کی جائے گی"۔

گویا دعاؤں کی قبولیت اور فیضانِ معرفت قطبِ افراد اور قطبِ وحدت کی خصوصیات میں سے ہے۔ واللہ اعلم!

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۴۹۹ تا ۵۰۳)

[مراتب تکمیل وارشاد میں توقف اور رُکنے کی وجہ یہ ہے اور نورانیت کا حاصل نہ ہونا غیب کی ظُلمت کے نور کے ظاہر ہونے کی وجہ سے اور کسی بناء پر نہیں۔ لوگ اپنے خیالات میں بہت کچھ پکاتے رہتے ہیں، ان کا کچھ اعتبار نہیں۔

در نیابت حال پختہ ہیچ کام پس سخن کوتاہ باید والسلام

---

[1] (اصطلاحاتِ صوفیہ)

[2] (مسند احمد، ج ۱، ص ۳۲)

ترجمہ: ناقص انسان پختہ شخص کے حال سے واقف نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا بات ختم کرنی چاہیئے۔ والسلام۔ اس قسم کے ظنی اُمور میں نقصان کا احتمال ہے۔ اس جماعت کو فرمادیں کہ اس خستہ دل سے اپنے خیالات کی نظر پوشیدہ کرلیں۔ نظر دوڑانے کی جگہیں اور بہت ہیں۔

من گم شدہ ام مرا مجوئید　　　با گم شدگان سخن مگوئید

ترجمہ: میں گم ہو چکا ہوں مجھے تلاش نہ کرو، اور گم شدہ لوگوں سے بات نہ کرو۔]

تشریح

بعض لوگوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو شکایت کی کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس لوگوں کو ذکر نہیں دیتے بلکہ بغض وحسد کرتے ہیں اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی خدمت اقدس میں عرض کرتے ہیں کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجھے لوگوں کو ارشاد و تکمیل کی دعوت دینے کا حکم فرمایا اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا حکم مبارک سر آنکھوں پر، مگر میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں لوگوں کو ارشاد و تکمیل کی دعوت دوں اور جو لوگ یہ کھچڑی پکاتے ہیں کہ بندے کو حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے حکم سے انکار ہے تو بندے کی کیا مجال جو آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حکم مبارک سے انکار کرے بندہ آپ کے حکم مبارک کے تابع ہے۔

پس ہمیں بھی چاہیئے کہ مشائخ کے پاس جا کر ایک دوسرے کی چغلی نہ کریں۔ اور نہ ہی غیبت کریں کہ ایک تو یہ گناہِ کبیرہ ہیں اور پھر اخلاقیات کے بھی خلاف ہیں، اور یہ باتیں صوفیاء کرام کو زیب بھی نہیں دیتیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے کسی خاص روحانی مقام کے بارے میں قبل ازیں اپنے مُرشد بر حق سے عرض کیا تھا کہ فلاں مقام میں نورانیت معدوم ہے۔ اب یہاں عدم نورانیت کا سبب بیان فرما رہے ہیں کہ مقامِ مذکور میں نورانیت نہ ہونے کا سبب ظلمتِ غیب کے نور کا ظہور ہے، چونکہ ظلمت مناسبیتِ غیب ہے اور غیب بذاتِ خود ایک ایسا باطنی نور ہے جس کی نورانیت مشہود نہیں ہوتی گویا عالمِ غیب عدمِ نورانیت کے لباس میں پوشیدہ ہے لہٰذا عدمِ نورانیت کا سبب اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔(و اللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ حسد کرنے والوں کے ایک گروہ نے حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں شکایت کی تھی کہ آپ نے ان کو مخلوق کی تربیت وہدایت کے لئے مسندِ ارشاد سپرد فرمائی ہے مگر انہوں (حضرت مجدد) نے ابھی تک تعمیل حکم کا فرض ادا نہیں کیا، علاوہ ازیں کچھ اور باتیں بھی آپ کی طرف منسوب کی گئی تھیں۔ جب حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو بعض لوگوں کی ان حاسدانہ حرکتوں کا علم ہوا تو آپ نے زیرِ نظر سطور میں صورتِ حال کی وضاحت فرمائی کہ فریضۂ ارشاد (تبلیغ وہدایت) انجام نہ دے سکنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ فقیر ابھی تک عروجی منازل میں مشغول ہے۔ ارشاد کے لئے نزولی مراتب میں واپس آنا ضروری ہوتا ہے۔ انشاء اللہ نزول کے مرتبوں پر فائز ہوتے ہی ارشاد کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ و باللہ التوفیق۔

نیز آپ نے اس مکتوب میں اپنے مُرشدِ بر حق کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی ہے کہ حاسدوں کی اس جماعت کو آپ تلقین فرمائیں کہ اس فقیر کے ساتھ خیالی باتیں منسوب نہ کیا کریں۔

اس سے ظاہری وباطنی نقصان کا خدشہ ہے ہم تو اپنی ہستی رضائے مولیٰ میں گم کر چکے ہیں اس لئے گمشدہ لوگوں سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں۔

بینہ نمبر ۷

اُستاد کے قابل شاگرد اور شیخ کے کامل خلیفہ کے ساتھ بسا اوقات ہم جنسوں اور پیر بھائیوں میں حسد اور رقابت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جو روحانی ارتقاء سے مانع ہوتے ہیں۔ اہلِ سلوک ونسبت کو ایسی کدورتوں سے پاک رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ مقصود تک پہنچنے میں آسانی میسر آئے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۰۳ تا ۵۰۵)

[غیرتِ خداوندی سے ڈرنا چاہیئے۔ وہ کام جسے حق تعالیٰ کمال قرار دے اس کی تنقیص کرنا بہت ہی نامناسب ہے، بلکہ فی الحقیقت خدا تعالیٰ کے ساتھ معارضہ اور مقابلہ ہے۔ اور مقامِ قلب میں نزول کرنا در حقیقت یہ مقامِ فرق میں آنا ہے، جو مقامِ ارشاد ہے۔ اس جگہ مقامِ فرق سے مراد نفس کا رُوح اور رُوح کا نفس سے جدا ہونا ہے۔ اس کے بعد کہ نفس رُوح کے نور میں داخل اور جمع تھا۔ جمع اور فرق کے بیان میں جو مفہوم اس سے زائد ہو وہ سُکر کی وجہ سے ہے۔ خدا تعالیٰ کو مخلوق سے جدا دیکھنا جسے اہلِ سُکر مقامِ فرق خیال کرتے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ رُوح کو حق خیال کرتے ہیں اور رُوح کو نفس سے جُدا اور الگ دیکھنے کو حق تعالیٰ کا دیکھنا خیال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خلق سے پاک ومنزہ ہے۔

اربابِ جذبہ کے اکثر علوم کا یہی حال ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں حقیقت معاملہ مفقود ومعدوم ہے اور معاملہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دوسرے رسالے میں اربابِ جذبہ اور

سلوک کے علوم اور ان دونوں کی حقیقت بہ تفصیل تحریر کر دی گئی ہے، آپ کی نظر مبارک سے انشاء اللہ گزرے گا۔]

تشریح

مقامِ فرق اور مقام جمع

وحدت الشہودی اور وحدت الوجودی کے درمیان فرق

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کا عقیدہ وحدت الوجودی نہیں بلکہ وحدت الشہودی تھا آپ فرماتے تھے کہ جب سالک آخری نقطہ تک عروج کرے اور پھر واپس قلب کی طرف نزول کرے (یعنی رُوح تو عروج میں ہو اور قلب نزول کر کے دعوت وارشاد کا فریضہ سرانجام دینے لگے تو) سالک کے رُوح اور قلب میں اس جدائی کو مقامِ تفریق، مقامِ فرق اور مقامِ جدائی کہا جاتا ہے۔

مقامِ جمع میں سالک کا نفس اُس کی روح کے ساتھ ملا ہوتا ہے۔ کہیں رُوح غالب ہو جاتی ہے اور کہیں نفس۔ اور ابتدائی سالک مقامِ جمع کی اس کیفیت میں تمیز نہیں کر سکتا۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

مقامِ ارشاد

حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ مقامِ ارشاد کی حقیقت بیان فرماتے ہیں کہ سالک کا مقامِ قلب میں نزول ہی در حقیقت مقامِ فرق ہے۔ اور اسی کا نام مقامِ ارشاد ہے۔

مقامِ جمع وفرق

روح، بدنِ انسانی میں داخل ہونے سے پہلے عرش سے اوپر عالمِ امر میں تھی، بدن میں داخل ہونے کے بعد نفس میں فنا ہو کر نفسِ امارہ کے نام سے تعبیر ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے روح کو فوق عرش کی طرف عروج بخشا تو نفس بھی عروج کی منزل تک پہنچ کر روح کے انوار میں مستور ہو گیا۔ اسی مقام کو مقامِ جمع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد حق الیقین کی منزل میں جب نفس امارہ ترقی کر کے نفس مطمئنہ ہو گیا تو روح کے انوار سے جدا ہو کر دعوت وارشاد خلق کے لئے مقامِ قلب میں واپس اُتر آیا۔ لیکن روح کمالاتِ عالیہ طے کرنے کے لئے عروج میں ہی رہی۔ اس مقام کو مقام فرق بعد الجمع کہا جاتا ہے۔

خلاصۃ المرام

روح اور نفس کے اتحاد کا مقام، مقامِ جمع ہے اور روح و نفس کی جدائی کا مقام، مقامِ فرق ہے۔ مقامِ جمع وفرق کی یہ معرفت حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی انفرادیت ہے۔ صوفیائے وجودیہ کے نزدیک واجب اور ممکن کے اتحاد (واجب اور ممکن کو ایک دیکھنا) کا نام مقامِ جمع ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا دیکھنا مقامِ فرق ہے۔ امام ربانی کے نزدیک صوفیائے وجودیہ کا یہ قول سُکر کے قبیل سے ہے کیونکہ حق اور خلق کے درمیان اتحاد کی باتیں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتیں۔ ذاتِ واجب تعالیٰ اس قسم کی قیاس آرائیوں سے وراء ہے۔ اس مقام میں بہت سے صوفیاء حقیقتِ حال سے بے خبر ہو کر رُوح کو خدا سمجھتے رہے اور اس کی پرستش کرتے رہے، بعض مشائخ اس مقام میں تیس برس تک روح کو خدا جان کر پوجتے رہے۔ جب اس مقام سے اوپر گزر ہوا تو اپنی غلطی پر نادم اور تائب ہوتے

رہے۔ یہ لغزش اربابِ سُکر میں سے بعض کو پیش آئی ہے، اسی لئے امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک علوم سکریہ میں حقیقت الامر مفقود سمجھنی چاہیئے۔

بیّنہ نمبر ۸

بعض اوقات سیر باطنی کے دوران جب سالک کی نظر عالمِ ارواح پر پڑتی ہے تو مرتبۂ وجوب سے مناسبتِ صوری کی بناء پر اس کو حق سمجھنے لگتا ہے اور شہود عالمِ ارواح کو شہودِ عالمِ وجوب تصور کرکے لذت وسرور حاصل کرتا ہے اور سجدۂ عبودیت بجالاتا ہے۔ بعد میں جب سالک اس مرتبے سے آگے ترقی کر جاتا ہے تو حقیقت معلوم ہونے پر نادم اور تائب ہو جاتا ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۰۶، ۵۰۷)

اللھم اغفر لکاتبہٖ و لمن سعیٰ فیہ و لو الدیھم و لا ساتذیھم و لا ھل بیتھم اجمعین آمین یا رب العالمین بحرمت سید المرسلین و خاتم النبیین

حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ و سلم

مکتوب نمبر ۱۷

[بعض ایسے حالات کے بیان میں جو عروج و نزول سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور باتوں کے بیان میں۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے مرشد بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

ادنیٰ ترین خادم کی عرض داشت یہ ہے کہ وہ عزیز جو ایک عرصہ سے رُکا ہوا تھا، تحریر کے دن ایسا ظاہر ہوا کہ اسے اس مقام سے قدرے عروج حاصل ہوا ہے، اور بہت نیچے لائے ہیں، لیکن مکمل طور پر نزول نہیں کیا۔ اور دوسرے لوگ جو اس مقام کے نیچے تھے انہوں نے بھی عروج حاصل کر کے اسی مقامِ فوق کے راستے نزول کی طرف رُخ کر لیا ہے۔ اس کے بعد جو کیفیت بھی ظاہر ہو گی عرض خدمت کر دی جائے گی۔

اگر صاحبِ معاملہ اپنے انکشافِ حال کے بعد کچھ لکھے تو درستی کے بہت قریب ہے۔

چونکہ اس قضیہ نزول کا ظہور فوری تھا اور اس حقیر کو جلاب لینے کی وجہ سے لاغری اور ضعف طاری تھا۔ آخر کار اس نزول کو اختیار نہ کر سکا۔ اُمید ہے کہ انشاءاللہ اس کا ظہور بھی ہو جائے گا۔]

تشریح

انسان کا ہر کمال اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل کی علامت ہے۔ اور انسان میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محبت کا پیدا ہونا بھی فضل ایزدی ہے۔ یونہی سلوک کی منازل طے کر کے مقاماتِ عالیٰ تک پہنچنا بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل کا ہی مرہونِ منت ہے۔ لیکن یہ بات سمجھنی چاہیئے کہ سلوک میں جہاں عروج و نزول کی بات ہوتی ہے وہاں یہ عروج و نزول مقامات سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ محبتِ الٰہی سے۔ کیونکہ اگر محبت کا نزول ہو تو اس کے نتیجے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دوری پیدا ہو جائے گی جو کہ تصوف

میں مطلوب و مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اتباع صرف "محبت" ہی کے طفیل ممکن ہے اور جب محبت نہ ہو گی تو شریعت پر عمل کرنا ممکن نہ ہو گا۔ پس ثابت ہوا کہ محبت کا نزول نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض یہ نزول ہو جائے تو ایسا تصوف غیر شرعی اور غیر اخلاقی ہو گا۔ ایسے ہی قُرب کا نزول بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اس کا نزول ہو گا تو قُرب کی ضد لازم آئے گی جو کہ "دوری" ہے۔ لہٰذا عروج ونزول مقامات کی کیفیات کو ملتا ہے۔ عروج سے کیفیات بڑھتی ہیں اور نزول سے کم ہوتی ہیں۔ تاہم عروج اور نزول میں سے ہر ایک کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ صرف عروج والا سالک دوسروں کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ یوں ہی صرف نزول والا بھی شریعت سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔ اور جس سالک کے عروج ونزول (دونوں) اَتم واَکمل ہوں وہ شریعت وطریقت کا حقیقی خادم ہوتا ہے اور اس کی دعوت وارشاد بھی مکمل ہوتی ہے اس کی گفتگو میں بھی اثر ہوتا ہے اور نگاہ میں بھی۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

سطور بالا میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ عزیزِ متوقف (ترقی سے رُکے ہوئے عزیز) کو اس کی روحانی ترقی اور مقامِ توقف سے عروج اور اس کے بعد نزول کی خبر دے رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ صراحت بھی فرما رہے ہیں کہ ابھی کامل طور پر نزول نہیں ہوا۔

بینہ نمبر ا

عزیزِ متوقف کا یہ لفظ دفتر اول کے مکتوب نمبر ۱۵ اور مکتوب ۱۷ میں استعمال ہوا ہے۔ شارحین کے نزدیک اس میں دو احتمال ہیں:

اول یہ کہ اس سے مُراد حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ دوسرا یہ کہ خود حضرت شیخ مجدد قدس سرہٗ مراد ہیں۔ حضرت مولانا نصر اللہ قندہاری کابلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شرح مکتوبات (فارسی) میں پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے۔ (تفصیل کے لئے مکتوب نمبر ۱۵ کی شرح ملاحظہ فرمائیں)

سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے احوال وواردات کسی صاحبِ مقام یا اپنے شیخ کے سامنے تحریرًا یا تقریرًا من وعن پیش کرے تاکہ شیخ کی توجہات ہر حال میں اس کے ساتھ شامل رہیں اور راہِ سلوک کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا سلامتی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔

مانا کہ عشق کی منزل میں ہر گام پہ سو سو خطرے ہیں
لیکن یہ سفر آسان بھی ہے گر ساتھ تمہارا ہو جائے

آیاتِ قرآنیہ:

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (النحل ۴۳)

اور

كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (التوبة ۱۱۹)

سے اسی مقصد کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

آپ کے فرمان سے دو اَمر ثابت ہوئے پہلا یہ کہ راہِ طریقت میں سالک کے لئے مجاہدہ وریاضت کے ساتھ ساتھ شیخ کی باطنی توجہات بھی ضروری ہیں اور اس کے لئے سالک کو کمالِ اہتمام اور اخلاص کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سالک کو جس طرح عروجی مراتب میں مُرشد کی توجہ درکار ہے اسی طرح نزول کے مرتبوں میں بھی خصوصی توجہ کی ضرورت باقی رہتی ہے اور سالک (مُرید) کسی وقت بھی اپنے شیخ کی توجہات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

دوسرا یہ کہ باطنی اُمور کے کشف و ظہور میں صَرفِ ہمت اور وظائفِ طریقت کی ادائیگی کے معاملات کے لئے سالک کی ظاہری جسمانی صحت و تندرستی بھی لازمی ہے کیونکہ جسمانی صحت، روحانی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنّت اور طبِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ میں حفظانِ صحت کے اصول و قواعد بتائے گئے اور معاملاتِ زندگی میں اعتدال وتوازن کی طرف خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ سالک کو چاہیئے کہ وظائفِ عبودیت بجالانے اور آداب طریقت ادا کرنے کے لئے جسمانی صحت وعلاج معالجہ کے اصولوں پر بھی مکمل طور پر کاربند رہے ۔ حدیثِ نبوی فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۔[1] (تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے) اسی اَمر پر دال ہے۔

ہمارے مشائخ کے نزدیک عبادات ومعاملات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ رزق، صحت اور دوا جیسی نعمتوں کا بھی مناسب اہتمام واستعمال ہونا چاہیئے۔ غیر شرعی جسمانی مشقتوں اور غیر مسنون چلوں وریاضتوں کے ذریعے روحانی ترقی حاصل کرنے کی بجائے سنت وشریعت پر عمل کرکے روحانی ارتقاء حاصل کرنا چاہیئے، چنانچہ عزیمت پر عمل کرنا خصوصیاتِ نقشبندیہ میں سے ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۱۱ تا ۵۱۴)

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۲۶۵، صحیح مسلم، ج ۱، ص ۳۶۶)

مکتوب نمبر ۱۸

[تمکین کے بیان میں جو تلوین کے بعد حاصل ہوتی ہے۔اور ولایت کے تین مراتب کے بیان میں اور اس اَمر کے بیان میں کہ واجب تعالیٰ کا وجود اس کی ذات سے زائد ہے وغیرہ ذٰلک کے بیان میں۔۔۔یہ مکتوب بھی اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ سرہٗ الاقدس کی خدمت میں لکھا:]

تشریح

تمکین کی کیفیت تلوین کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ تلوین ناقص صوفی کو کہا جاتا ہے اور تمکین کامل صوفی کی کیفیت کو کہا جاتا ہے۔ تکوین کی کیفیت رکھنے والے صوفی کے دل میں وساوس شیطانی پیدا ہوسکتے ہیں جبکہ تمکین کی کیفیت رکھنے والے صوفی کو وساوس شیطانی کا خطرہ نہیں رہتا۔ پھر تمکین کی بھی دو اقسام ہیں۔

تمکین کی اقسام

۱۔ تمکینِ لطیفہ ۲۔ تمکینِ عارفانہ

تشریح

جس صوفی نے لطیفہ قلب، روح، سر، خفی اور اخفٰی میں سے کسی ایک لطیفہ کے اصل کو پالیا تو اس کو تمکینِ لطیفہ ٔ قلب، تمکینِ لطیفہ ٔروح، تمکینِ لطیفہ ٔسِر، تمکینِ لطیفہ ٔخفی اور تمکینِ لطیفہ ٔاخفٰی والا صوفی کہا جائے گا۔ جس صوفی کو جتنے لطائف میں تمکین حاصل ہو اُس نے اتنے ہی لطائف کی اصل کو پالیا مگر پانچوں لطائف میں تمکین پانے والے صوفیاء کرام نادر الوجود ہیں ایک ہزار سال میں کہیں

ایک یا دو صوفیاء کرام کو ہی پانچوں لطائف پر تمکین حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر ہر صوفی یہ دعویٰ کرے کہ میرے پانچوں لطائف کو تمکین حاصل ہے تو یہ کذب ہو گا بلکہ آج کل کے دور میں تو سارے لطائف تلوین والے ہیں اور جس صوفی کا ایک لطیفہ بھی تمکین میں ہو جائے تو وہ کامل و مکمل ولی ہے اور اگر کسی کے پانچوں لطائف متلون ہوں اور اس کو مختلف قسم کی کیفیات نظر آئیں تو وہ صوفی ناقص ہوتا ہے۔ پس اُن مریدین پر افسوس جو اپنے شیخ سے سارے لطائف کی رنگ برنگی کیفیات کی خواہش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ تمکین کے بھی آرزومند ہوں۔ کیونکہ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ رنگ برنگی کیفیات صوفی کے متلون ہونے کی علامت ہیں۔ اور متلون صوفی ناقص ہوتا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ بعض سالک کہتے ہیں کہ پہلے ہمارے قلب یا رُوح کی فلاں فلاں رنگینی تھی جو کہ اب نہیں ہے اور اس بات پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس رنگینی کا ختم ہو جانا اُن کے لطیفہ کو تمکین حاصل ہو جانے کی وجہ سے ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ زیادہ تر مُریدین تلوین کے مقام پر خوش تھے وہ اپنے آپ کو کامل سمجھ بیٹھے اور مجھ سے چلے گئے اگر وہ ایک لطیفہ پر بھی تمکین حاصل کر لیتے تو کبھی گمراہ نہ ہوتے۔

تمکینِ عارفانہ

تمکینِ عارفانہ اُس سالک کی ہوتی ہے جسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل سے پانچوں لطائف پر تمکین نصیب ہو جائے البتہ ایسا سالک نادر الوجود ہوتا ہے۔

کمالات کے تین مراتب

۱۔ولایت ۲۔شہادت ۳۔صدیقیت

ولایت

کمالات کا پہلا مرتبہ (درجہ) ولایت ہے۔ اور اس درجہ کا سالک تلوین میں ہوتا ہے۔ یعنی کبھی تو اس کے لطائف چلتے ہیں اور کبھی رُک جاتے ہیں۔ البتہ اگر اس کا ایک لطیفہ بھی تمکین حاصل کر لے تو وہ کامل و مکمل ولی اللہ کہلانے کا مستحق ہو گا۔ اور ایسے ولی کا انکار گویا ایسے ہے جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے کسی نبی کا انکار ہو۔ (العیاذ باللہ)

شہادت

کمالات کا دوسرا درجہ شہادت کہلاتا ہے۔ اور یہ پہلے درجہ سے بہت بلند درجہ ہے جن چیزوں کو قرآن عظیم الشان یا احادیثِ نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے بیان کیا ہے ان پر باقی لوگوں کو تو ایمان بالغیب ہوتا ہے لیکن شہادت کے مرتبہ پر فائز ہونے والا ان ہی چیزوں کا کشف وشہود میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی لئے ایسے ولی اللہ کو یقین کی اعلیٰ دولت نصیب ہو جاتی ہے۔

صدیقیت

یہ مرتبہ پہلے بیان کردہ مراتب سے بہت بلند ہے۔ اور اس مقام پر سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فائز ہوئے اس لئے آپ کو صدیق کہا جاتا ہے۔ اس مقام کی کیفیت یہ ہے کہ انسان جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا کلام سُنتا ہے یا پڑھتا ہے تو اس کلام کے حقائق سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی دل کی گہرائیوں سے اسے تسلیم کر لیتا

ہے اور فوراً تصدیق کر لیتا ہے۔ اگرچہ وہ حقائق اس کے مشاہدے میں نہیں آئے ہوتے۔ مثال کے طور پر جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے معراج کی خبر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سُنی تو بغیر تفتیش کئے ہوئے اور حقائق سے بے خبر ہونے کے باوجود اس خبرِ معراج کی تصدیق کر دی۔ جس پر بارگاہِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صدیق کا لقب اور مقام نصیب ہوا۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ اللہ ورسول کے واضح احکام کو پڑھ اور سن لینے کے باوجود بھی ان پر عمل نہیں کرتے اور عمل نہ کرنے کی درپردہ وجہ یہ ہے کہ ہم ان احکامِ الٰہیہ کی دل سے تصدیق نہیں کرتے۔ لیکن باتیں اور دعوے بہت بڑے بڑے کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں توفیق عنایت کرے کہ ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکام کو دل کے کانوں سے سن کر ان پر عمل کریں اور مقامِ صدیقیت کی برکات سے مستفید ہوں۔

یہ تینوں درجات قرآن وحدیث مبارکہ، اصول دین اور عقائد کے عین مطابق ہیں اور ان پر فائز ہونے والا صوفی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات پر بھی عمل کرتا ہے اور حقوق العباد بھی ادا کرتا ہے۔ تاہم جہلاء کی نظر میں ولی کا مفہوم کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ولی وہ ہوتا ہے جو چلہ کشی کرے۔ کھانا پینا بند کر دے۔ ایک ہی بد دعا سے لوگوں کو تباہ وبرباد کر دے اور تعویز گنڈوں سے لوگوں کو اپنا مُرید بنالے۔ چاہے درپردہ جادو ٹونے کا کام کرتا ہو یا نا محرم عورتوں سے تعلقات استوار کر رکھے ہوں۔ اور ہم نے توکئی جگہوں پر ایسے عملی مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ لیکن قرآن عظیم الشان احادیث نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اور صوفیاء کرام کی تعلیمات کے مطابق ایسا شخص کبھی ولی اللہ نہیں بن سکتا جو غیر شرعی اور غیر اخلاقی اعمال کا مرتکب ہو۔ بلکہ ولی اللہ

توکسی کو بد دعا تک نہیں دیتا۔ اس کا کام تو لوگوں کے لئے دعائیں کرنا اور انہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے وصل کرنا ہوتا ہے۔

[کمترین غلام پُر تقصیر احمد بن عبد الاحد کی عرضداشت یہ ہے کہ جب تک احوال وواردات رُخ دکھاتے رہے تو ان کے عرض کرنے کی گستاخی اور جرأت کرتا رہا۔ جب خدا تعالیٰ سبحانہٗ نے آپ کی بلند توجہات سے احوال کی غلامی سے آزادی عطا کی اور تلوین کے بعد تمکین سے مشرف فرمایا۔ تو حاصل کار یہ ہے کہ سوائے حیرت وپریشانی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اور وصل سے فصل کے سوا اور قُرب سے بُعد کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اور معرفت سے نادانی اور علم سے جہل کے سوا کسی بات میں اضافہ نہیں ہوا۔ اس بناء پر عریضے ارسال کرنے میں توقف ورکاوٹ ہو گئی۔ اور صرف روزمرہ کی خبریں لکھنے کی جرأت نہیں کی۔ اس کے ساتھ ساتھ دل پر انجماد وسردی اس قدر غالب ہو چکی ہے کہ کسی بھی کام میں سرگرمی نہیں ہے اور بے کار لوگوں کی طرح کوئی کام نہیں کر سکتا۔

من ہیچم وکم زہیچ ہم بسیارے — وز ہیچ وکم از ہیچ نیاید کارے

ترجمہ: میں بالکل ہیچ بلکہ ہیچ سے بھی بہت ہی کم ہوں۔ ہیچ اور ہیچ سے بھی کم شخص سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

اصل بات کی طرف آتا ہوں:

عجب بات ہے کہ اب حق الیقین سے مجھے مشرف کیا گیا ہے کہ اس مقام میں علم اور عین ایک دوسرے کے لئے حجاب اور پردہ نہیں ہیں۔ اور فنا اور بقا اس مقام میں جمع ہیں۔ یہ ناچیز عین حیرت اور بے نشانی میں علم وشعور سے متصف ہے۔ اور عین غیبت حضور کا حکم رکھتی ہے۔ علم ومعرفت کے باوجود جہل ونادانی کے علاوہ کچھ اضافہ نہیں ہوا۔

عجب این ست کہ من واصل و سر گردانم

ترجمہ: تعجب تو یہ ہے کہ میں واصل بھی ہوں اور سرگردان بھی۔

خدا تعالیٰ نے محض اپنی عنایت بے کراں سے مدارج کمالات میں ترقیات عطا فرمادی ہیں۔ مقامِ ولایت سے اُوپر مقامِ شہادت ہے۔ ولایت کی نسبت شہادت کی نسبت کے سامنے اس طرح ہے جس طرح تجلی صوری تجلی ذاتی کے سامنے۔ بلکہ ان دو نسبتوں میں بُعد و فاصلہ ان دو تجلیوں کے بُعد و فاصلہ سے کئی مرتبہ زیادہ ہے۔ اور شہادت کے مقام کے بعد صدیقیت کا مقام ہے اور وہ فرق و تفاوت جو ان دو مقاموں کے درمیان ہے وہ اس سے زیادہ ہے کہ اسے کسی عبارت سے تعبیر کیا جا سکے اور اس سے بڑھ کر ہے کہ اس کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ اور اس مقامِ صدیقیت سے اوپر کوئی مقام نہیں مگر مقامِ نبوت حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات۔ صدیقیت اور نبوت کے درمیان اور کوئی مقام نہیں ہے۔ بلکہ کسی اور مقام کا ہونا محال ہے۔ اور اس کے محال ہونے کا حکم کشف صریح صحیح سے معلوم ہو چکا ہے۔ بعض اہل اللہ نے ان دو مقاموں کے درمیان واسطہ بیان کیا ہے اور اس کا نام قُربت رکھا ہے، فقیر کو اس بھی مشرف کیا گیا ہے۔ اور اس مقام کی حقیقت پر بھی مطلع کیا گیا ہے۔]

تشریح

مقامِ ولایت، مقامِ شہادت اور مقامِ صدیقیت کے درمیان جو تفاوت ہے وہ یہ ہے کہ مقامِ ولایت میں تجلی صوری، مقامِ شہادت میں تجلی اصلی برقی اور مقام صدیقیت میں تجلی اصلی دائمی ہوتی ہے۔ اور ان تینوں مقامات سے آگے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مقام ہے۔ اور اس مقام پر اُمت میں سے کسی کا فائز ہونا ناممکن اور محال ہے ہاں اس مقام سے فیض آ سکتا ہے اور بس۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اپنے شیخ کی خدمت میں عرض پرداز ہیں کہ جب تک بندہ پر احوال وواردات اور تلوینات کا غلبہ رہا، خطوط ومکاتیب کے ذریعے تفصیلات عرض کرتا رہا مگر جب سے آپ کی بلند توجہات کی برکت سے احوال کے تسلط سے آزادی ملی ہے اور تلوین سے تمکین میں لائے ہیں تب سے حیرت وپریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ لامحالہ آپ کے ساتھ تحریری رابطے میں بھی توقف واقع ہو گیا ہے۔ یعنی جب تک بندہ مقامِ تلوین میں تھا مختلف اور متعدد احوال کا مشاہدہ ہوتا رہتا تھا، جو آپ کی خدمت میں عرض کر دیئے جاتے تھے۔ اب چونکہ مقامِ تمکین سے مشرف کر دیا گیا ہے اس مقام میں مختلف احوال وواردات کا سلسلہ بند ہو گیا ہے تو حیران ہوں اب آپ کو کیا عرض کروں۔

تلوین و تمکین

تلوین

صوفیاء کرام کی اصطلاح میں مقامِ تلوین مختلف تجلیات اور واردات سے عبارت ہے جو سالک پر اس کے لطیفہ کے اپنے مبدأ فیض تک پہنچنے سے پہلے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

تمکین

مختلف حالات اور واردات کا سلسلہ منقطع ہونے اور سالک کے لطیفہ کا اپنے مبدأ فیض تک پہنچ جانے کو مقامِ تمکین کہا جاتا ہے۔ صوفیاء کی اصطلاح میں تلوین کو حال اور تمکین کو مقام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

- تلوین، مقامِ طلب ہے جس میں احوال آتے اور جاتے رہتے ہیں اور سالک اکثر مغلوب الحال رہتا ہے۔

گہے گریاں گہے خنداں گہے حیراں گہے نالاں
بجز ایں شغل یک لحظہ بنُودے روزگارِ من

- تمکین، مقامِ رسوخ واستقرار ہے جس میں سالک صاحبِ مقام ہوتا ہے اور مغلوب الحال نہیں ہونے پاتا۔

مردماں در من و بے ہوشئ من حیراانند
من در آں کس کہ ترا بیند و حیراں نشود

- جب مصر کی عورتوں نے جمالِ یوسف کو دیکھ کر عالمِ مدہوشی میں ہاتھ دیئے تو یہ ان کا مقامِ تلوین تھا لیکن زلیخا وارفتۂ محبت ہو کر بھی ہوش میں رہی وہ مقامِ تمکین میں تھی۔
- سالک مقامِ تمکین میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کمالاتِ معنویہ سے فیض پاتا ہے لیکن مقامِ تلوین میں وہ ان کمالات سے محروم رہتا ہے، گویا مقامِ تمکین، تلوین سے بہت بلند مقام ہے۔
- حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جلوۂ طور کے وقت مدہوش ہو گئے یہ مقامِ تلوین تھا لیکن سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والتسلیم معراج کی رات عینِ ذات کے مشاہدے کے وقت بھی ہوش میں رہے یہ مقامِ تمکین تھا۔

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتوِ صفات   تُو عینِ ذات می نگری و دَر تبسمی

- تلوین اربابِ احوال کی صفت ہے اور تمکین اربابِ حقائق کی صفت ہے۔(واللہ اعلم)

- تلوین فقر کا ایک مقام ہے جس میں سالک کے دل پر مختلف اقسام کے حالات وارد ہوتے اور پھرتے رہتے ہیں۔ فقیر ایک حال پر نہیں رہتا تجلیات آتی اور جاتی رہتی ہیں۔

گہے بَر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پُشت پائے خود نہ بینم

- تمکین سلوک کا ایک مقام ہے جس میں سالک قربِ الٰہی کے مرتبے میں پہنچ کر اطمینان قلب حاصل کر لیتا ہے اور دائمی طور پر کشفِ حقائق سے ممتاز رہتا ہے اور مختلف و متنوع احوال وواردات سے فارغ ہو جاتا ہے۔

حیرت و پریشانی

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "کام کا حاصل حیرت و پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا" اس کا مطلب یہ ہے کہ مقامِ تمکین کے بعد مقاماتِ قُرب کی انتہاء میں مرتبۂ ذات کے ادراک سے عجز کی بنا پر حیرت و پریشانی کا غلبہ ہو گیا کیونکہ عالمِ وجوب کے مقابلے میں عالمِ امکان کی بے مناسبتی دیکھ کر حیرت کا چھا جانا ایک قُدرتی امر ہے۔ آپ کا یہ فرمان کمال پر دلالت کرتا ہے نہ کہ نقص پر، کیونکہ یہ تکمیلی مرتبہ ہے جیسا کہ اگلے الفاظ میں اس حقیقت کی نشاندہی بھی موجود ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "از وصل جُز فصل واز قُرب جز بُعد حاصل نشد" یعنی اس وصل اور قُرب کے مقام میں پہنچ کر بھی مرتبۂ ذات کے اِدراک سے عجز کی بناء پر سوائے جدائی اور دُوری کے کچھ حاصل نہ ہوا اور واضح رہے کہ تمام اولیاء کرام کو مشاہدۂ عظمت و جلال کے وقت یہ حیرت حاصل ہوتی ہے۔

معنوی سردی

آپ کا یہ فرمانا کہ "دل پر معنوی سردی غالب آگئی ہے" اس امر پر دال ہے کہ کام پورا ہو جانے کے بعد جب منزلِ مقصود مل جائے تو سوائے آرام اور بے کاری کے کوئی کام نہیں رہتا اسی کو معنوی سردی کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی لئے بعض صوفیاء وصل پر فصل اور قُرب پر بُعد ک ترجیح دیتے ہیں گو یہ مرتبہ تکمیلی نہیں ہوتا مگر لذت وشوق ضرور دیتا رہتا ہے اسی لئے یہ اَبرار کا مرتبہ کہلاتا ہے نہ کہ مُقربین کا۔(واللہ اعلم)

حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ مرتبۂ حق الیقین سے مشرف ہونے کے بعد اس مرتبے کے کمالات بیان فرمارہے ہیں۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یقین کے تین مرتبے ہیں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ نے تینوں مرتبوں کی تعریف اس طرح بیان فرمائی ہے۔

علم الیقین

علم الیقین در ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ عبارت از شہود آیاتے ست کہ دال اند بر قدرتِ او تعالیٰ وتقدس وشہود آن آیات را سیر آفاقی گویند۔[1]

ترجمہ: حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات میں علم الیقین ان آیات ونشانات کے شہود سے مراد ہے جو اس کی قدرت پر دلالت کرتے ہیں۔ ان آیات کے شہود کو سیر آفاقی کہتے ہیں گویا مشاہدۂ آفاقی مفید علم الیقین ہے۔ جیسے دھواں، آگ کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے۔

---

[1] (مکتوب ۲۷۷، دفتر اول)

عین الیقین

عبارت از شہودِ حق است سُبْحَانَہٗ بَعْدَ اَنْ کَانَ مَعْلُوْمًا بِالْعِلْمِ الْیَقِیْنِ واین شہود ومستلزم فنائے سالک است در غلبۂ این شہود تعین او بالکلیہ گم می گردد ودر دیدۂ شہودِ او اثرے از ان باقی نمی ماند ودر مشہودِ خود فانی ومستہلک می گردد واین شہود نزدِ این طائفۂ علیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم مُعبر است بادراکِ بسیط ومعرفت نیز گویند۔[1]

ترجمہ: عین الیقین سے مراد حق سبحانہٗ کا شہود ہے۔ علم الیقین کے طریقے پر معلوم ہو جانے کے بعد اس کا شہود سالک کی فنا کو لازم ہے اور اس شہود کے غلبہ میں سالک کے وجود کا تعین بالکل گم ہو جاتا ہے اور اس کے دیدۂ شہود میں اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور سالک خود اپنے شہود میں فانی ومستہلک ہو جاتا ہے۔ اور یہ شہود اس بزرگ جماعت کے نزدیک ادراکِ بسیط سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کو معرفت بھی کہتے ہیں۔

حق الیقین

حق الیقین عبارت از شہود اُوست سبحانہٗ بعد ارتفاع التعین واضمحلال المتعین ما این شہود او حق را سبحانہٗ بحق است جل وعلانہ باُو وَلَا یَحْمِلُ عَطَایَا الْمَلِکِ اِلَّا مَطَایَاہُ واین در بقا باللہ کہ مقامِ بِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ است صورت بندد کہ سالک را بعد از تحقق بفناء مطلق کہ فنائے ذات وصفات است حق سبحانہٗ وتعالیٰ بمحض عنایتِ خویش از نزدِ خود وجودے می بخشد واز سکرِ حال وبے خودی

---

[1] (مکتوب ۲۷۷، دفتر اول)

بصحو وافاقت می آرد واین وجود را وجودِ موہوبِ حقانی گویند دران موطنِ علم وعین حجابِ یک دیگر نمی شوند۔[1]

ترجمہ: اور حق الیقین سے مراد اس سبحانہ کا ایسا شہود ہے جس کے بعد طالب کا تعین اور اضمحلال ختم ہو جائے لیکن (عارف کے لئے) حق سبحانہٗ کا یہ شہود حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ عارف کے اپنے ساتھ کیونکہ:

"بادشاہ کے عطیات کو اس کی سواریاں ہی اٹھا سکتی ہیں"۔

اور یہ شہود بقا باللہ میں جو بِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ "یعنی وہ میرے ہی ذریعے سُنتا ہے اور میرے ہی ذریعے دیکھتا ہے" کا مقام ہے حاصل ہو جاتا ہے۔ جہاں سالک کو فنائے مطلق کی تحقیق کے بعد جو ذات وصفات کی فنا ہے حق سبحانہٗ وتعالیٰ محض اپنی عنایت سے اپنی طرف سے ایک وجود عطا فرماتا ہے اور سُکر حال اور بے خودی سے صحو وافاقت (ہوشیاری) میں لاتا ہے اور اس وجود کو وجودِ موہوب حقانی (اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ وجود) کہتے ہیں اس مقام میں علم اور عین ایک دوسرے کا حجاب نہیں ہوتے۔

بینہ نمبر ۱

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں بحمدہٖ تعالیٰ مجھے حق الیقین کے مرتبے سے مشرف فرمایا گیا ہے جو کمال علم و معرفت کا مرتبہ ہے لیکن اس کے باوجود سوائے بے علمی اور حیرت کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا، یعنی مرتبہٗ ذات کے اِدراک سے عاجز و حیران ہوں گویا واصلِ متحیّر ہوں کیونکہ وصل وعرفان کی انتہاء یہی ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ انسانی ادراک اور شعور میں نہ آئے۔

---

[1] (مکتوب نمبر ۲۷۷، دفتر اول)

جیساکہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

اے برتراز خیال وقیاس وگمان ووہم
وزہرچہ گفتہ ایم وشنیدہ ایم وخواندہ ایم

اقسامِ عارف

عارف دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ بعض عارف عمر بھر مرتبۂ خیال میں ہی رہتے ہیں۔

۲۔ بعض اس مرتبے سے آگے گزر کر مرتبۂ ادراکِ بلا کیف سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔

پہلی قسم کے عارفین مرتبۂ ذات کے ادراک سے قطعاً عاجز ہوتے ہیں، دوسری قسم کے عارفین جب مقامِ بیچونی سے مشرف ہو کر خود بھی بے چون ہو جاتے ہیں تو بے چونِ حقیقی (مرتبۂ ذات) کے اِدراکِ بلا کیف سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

جیساکہ مولانا روم علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

اِتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست ربّ الناس را باجانِ ناس

بینہ نمبر ۲

یاد رہے کہ عارفین کے لئے بے چونی کے لفظ کا اطلاق مجازاً ہے اور ذات کے لئے حقیقی ہے۔ علمائے معقولین نے جو فرمایا ہے کہ لَا یُتَصَوَّرُ وَ لَا یُدْرَکُ یعنی ذات کا اِدراک و تصور محال ہے۔ ان کا یہ قول مرتبۂ خیال سے تعلق رکھتا ہے اور یہ جو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ لَا تَتَفَکَّرُوْا فِی الْخَالِقِ۔ یعنی خالق (تعالیٰ) میں تفکر نہ کرو اس سے مراد تفکر باعتبار کیف و کم (چون وچند) ہے نہ کہ

تفکر بلا کیف (بے چون) بعض صوفیاء نے فرمایا کہ ظلالِ صفات کا تفکر وادراک جائز ہے کیونکہ صفات کا نمونہ اس جہاں میں موجود ہے۔ جیسا کہ بندہ کی صفتِ علم وقدرت وغیرہا اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم وقدرت کا نمونہ ہے لیکن اس کی ذاتِ مقدسہ ہر قسم کے نمونے ومثال سے پاک ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞ (الشوریٰ ۱۱)

پس ذاتِ واجب تعالیٰ ادراک وخیال سے وراء الوراء ہے۔ فافهم

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ رقم طراز ہیں کہ ولایت تین مراتب پر مشتمل ہے:

۱۔ مقامِ ولایت ۲۔ مقامِ شہادت ۳۔ مقامِ صدیقیت

یہ تینوں مراتب (علی فرق المراتب) ولایت کے حصے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ مقامِ ولایت سے اُوپر مقامِ شہادت ہے اور مقامِ شہادت سے اُوپر مقامِ صدیقیت ہے اور مقامِ ولایت کی مقامِ شہادت کے ساتھ وہی نسبت ہے جو تجلی صوری کی تجلی ذاتی کے ساتھ ہے، بلکہ ان دو تجلیوں کے درمیان جو مسافت ہے ولایت اور شہادت کے درمیان اس سے بھی کئی درجے زیادہ بُعدِ مسافت ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا دونوں تجلیوں کے درمیان تعین ولاتعین (یعنی توحیدِ تمثیلی اور توحیدِ عیانی) کا فرق ہے۔ واللہ اعلم

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اسی طرح مقامِ شہادت اور مقامِ صدیقیت میں جو تفاوت ہے وہ تو کسی عبارت یا اشارے سے بھی تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

تعریفاتِ مراتب

پہلا مرتبہ

اللہ تعالیٰ کے قُرب اور محبت کا پہلا مرتبہ ولایت ہے۔وَلِیٌّ بروزنِ فَعِیْلٌ فاعل اور مفعول دونوں معنوں میں آتا ہے۔اِنَّ الْوَلِیَّ مَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّہٖ۔[1] ولی وہ ہوتا ہے جو اپنے رب کی طرف سے واضح اور روشن دلیل پر ہو۔جیسا کہ اللہ رب العزت جل مجدہ الکریم نے فرمایا: وَ جَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ (الأنعام ۱۲۲) یعنی ہم نے اسے ایک نور دیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔اولیاء دراصل انبیاء کے ورثاء ہوتے ہیں نبوت کے بعد یہی حضرات زمین پر اخلاقِ الٰہیہ کی تصویر اور سراپا رُشد وہدایت ہوتے ہیں اور اس دنیا کے رہنے والوں کے لئے ان کا وجود ذریعۂ رحمت وبرکت ہوتا ہے۔

دوسرا مرتبہ

ولایت کا دوسرا مرتبہ شہادت ہے و المراد بهم الذين بذلوا أرواحهم في طاعة الله تعالى و إعلاء كلمته۔[2] یعنی شہداء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے دین کی سربلندی کے لئے وقف کر دیں۔شہادت کی دو قسمیں ہیں، شہادتِ صغریٰ اور شہادتِ کبریٰ۔ شہادتِ صُغریٰ کی متعدد اقسام ہیں ان میں سب سے اعلیٰ شہادت اللہ تعالیٰ کی راہ میں غازی ہونے کی حالت میں کفار ومشرکین کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دینا ہے۔

---

[1] (روح المعانی، جز ۵، ج۳، ص ۷۶)

[2] (روح المعانی، جز ۵، ج۲، ص ۷۷)

شہادتِ کبریٰ کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم اللہ تعالیٰ کی صفات کی وجہ سے اس کے ساتھ بلا علت محبت کرنا ہے۔

دوسری قسم شہادت کی اعلیٰ قسم ہے اور وہ یہ ہے کہ عارف کو حق تعالیٰ کا مشاہدہ (بلا کیف) نصیب ہو جائے۔ وھم أھل الحضور مع اللہ تعالی علی بساط العلم بہ۔ [1]

یعنی اہل شہادت وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بساطِ علم کے مطابق شرفِ حضوری حاصل ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ (آل عمران ۱۸)

اس آیت میں مرتبۂ شہادت والوں کو اولوا العلم قرار دے کر بساطِ شہادت پر فرشتوں کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ یہاں شہادت سے عُرفِ عام والی شہادت مراد نہیں بلکہ شہادت بمعنی حضور ومشاہدہ مُراد ہے شہادت کی ان دو قسموں کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔

تلوار کی شہادت، شہادتِ صغریٰ ہے۔

اور محبت کی شہادت، شہادتِ کبریٰ ہے۔

یوں سمجھ لیجئے ایک وہ شہید ہے جو لوہے کی تلوار سے شہید ہوتا ہے دوسرا وہ شہید ہے جو عشق کی تلوار سے شہید ہوتا ہے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ لوہے کی تلوار جب چلتی ہے تو ایک کو دو کر دیتی ہے اور عشق کی تلوار جب چلتی ہے تو دو کو ایک کر دیتی ہے۔

[1] (روح المعانی، جز ۵، ج ۲، ص ۷۷)

حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے:

بِسیار دیدہ ایم کہ یک را دو کرد تیغ　　　شمشیر عشق بیں کہ دو کس را یکے کند

تیسرا مرتبہ

ولایت کے تیسرے درجے کا نام مرتبہ صدیقیت ہے۔ صدیق مبالغے کا صیغہ ہے بمعنی اَلْمُتَقَدِّم فِي التَّصْدِيْق یعنی تصدیق میں آگے بڑھنے والا اور جلدی کرنے والا۔ بعض علماء نے صدیق کا معنی یوں بیان فرمایا كَثِيْرُ الصِّدْقِ وَ كَثِيْرُ التَّصْدِيْقِ۔[1] یعنی بہت زیادہ سچ بولنے والا اور بہت زیادہ تصدیق کرنے والا۔

بیہقیٔ وقت حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یوں رقم طراز ہیں:

الصدّیقون وهم المبالغون فی الصدق المتصفون بكمال متابعة الأنبياء ظاهرا و باطنا المستغرقون فی كمالات النبوة و التجلّيات الذاتية۔[2]

یعنی صدیق مبالغے کی حد تک سچے ہوتے ہیں اور ظاہری و باطنی طور پر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کامل ترین اتباع سے متصف ہوتے ہیں اور کمالاتِ نبوت اور تجلیات ذاتیہ میں مستغرق ہوتے ہیں۔

---

[1] (تفسیر خازن)

[2] (تفسیر مظھری، ج۲، ص ۱۶۱)

چار کامل مرتبے

صاحبِ تفسیر روح المعانی علامہ محمود آلوسی بغدادی نقشبندی مجددی قدس سرہٗ نے آیت مبارکہ: أُولَئِکَ مَعَ الَّذِینَ أَنْعَمَ اللہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیِّینَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصَّالِحِینَ وَحَسُنَ أُولَئِکَ رَفِیقًا (النساء ٦٩) کے تحت فرمایا ہے:

ونقل بعض تلامذة مولانا الشيخ خالد النقشبندي قدس سره عنه أنه قرر يوما أن مراتب الكمل أربعة: نبوة وقطب مدارها نبينا صلّى الله عليه وسلّم، ثم صديقية وقطب مدارها أبو بكر الصديق رضي الله تعالى عنه، ثم شهادة وقطب مدارها عمر الفاروق رضي الله تعالى عنه، ثم ولاية وقطب مدارها علي كرم الله تعالى وجهه۔[1]

ترجمہ: حضرت مولانا شیخ خالد نقشبندی قُدِّس سرہٗ (خلیفۂ مجاز حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے بعض شاگردوں نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک دن چار کامل مرتبوں کو مقرر کیا اور فرمایا کہ:

پہلا کامل مرتبہ نبوت ہے اور نبوت کے قطب مدار ہمارے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہیں، دوسرا کامل مرتبہ صدیقیت ہے اور اس کے قطب مدار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، تیسرا کامل مرتبہ شہادت ہے اور اس کے قطب مدار حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ چوتھا کامل مرتبہ ولایت ہے اور ولایت کے قطبِ مدار حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہیں۔

---

[1] (روح المعانی، جز ۵، ج ۳، ص ۷٦)

غایۃ مافی الباب

مقامِ ولایت میں معاریف سُکریہ کا اکثر اظہار ہوتا رہتا ہے جیسا کہ وحدت الوجود کے معارف (کثرت میں وحدت کا شہود وغیرہا)۔

- مقامِ شہادت میں مَعاریفِ سُکریہ بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اگرچہ یہ مقام ایسے معارف سے بالکل خالی بھی نہیں۔
- مقامِ صدیقیت میں معاریف سُکریہ کا وجود قطعًا ناپید ہوتا ہے کیونکہ معارفِ صدیقیت، معارفِ نبوت کی مانند ہوتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ معارفِ نبوت قطعی ہوتے ہیں اور معارفِ صدیقیت ظنی۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۱۷ تا ۵۳۰)

[بہت توجہ اور بے شمار تضرع اور عاجزی کے بعد پہلے تو صرف اسی قدر ظاہر ہوا جس قدر بعض اکابر نے بیان کیا ہے۔ آخر الامر حقیقت کا علم بھی دے دیا گیا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس مقام کا حصول عروج کے وقت مقامِ صدیقیت کے حصول کے بعد ہے۔ لیکن اس کا واسطہ بننا محل تامل ہے۔ ظاہری ملاقات کے وقت انشاء اللہ تعالیٰ حقیقت کو تفصیل سے عرض کرے گا، وہ مقامِ قُربِ نہایت ہی بلند مقام ہے۔ منازل عروج میں اس مقام سے اوپر کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ وجود کے ذات واجب تعالیٰ پر زائد ہونے کی کیفیت اس مقام میں ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ علماء حق شکر اللہ تعالیٰ سعیہم کی تحقیق ہے۔ اس جگہ وجود بھی راہ میں ہی رہ جاتا ہے۔ اور عروج اس سے بھی اوپر واقع ہو جاتا ہے۔]

تشریح

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا عروج صفاتِ ذاتیہ سے شروع ہوتا ہے جہاں تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ چاہے لیکن ان پاک ہستیوں کے علاوہ باقی لوگوں کا عروج صفاتِ فعلیہ کے ظل سے شروع ہوتا ہے اور اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ چاہے تو وہ سالک صفاتِ ذاتیہ تک عبور حاصل کرلیتا ہے لیکن ایسا سالک لاکھوں میں شاید ایک ہو۔ اور ایسا سالک صفاتِ ذاتیہ میں اس مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں سے اُس کو فیض آتا ہے۔ یعنی صفت العلم کی اصل تک، یا صفتِ قدرت کی اصل تک وعلیٰ ھذا القیاس۔

اس وقت سالک کا تعینِ وجوبی ہوتا ہے اور تعین سے مراد اُس کا وہ اسمِ مُربی ہے جس سے اُس کی روح کی پرورش ہوتی ہے، اور اسی کو اسمِ اعظم بھی کہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر سالک تلوین سے نکل کر تمکین حاصل کرلیتا ہے، چاہے ایک ہی لطیفہ پر ہو۔ لیکن سالک کو ان صفاتِ ذاتیہ سے صرف فیض ملتا ہے، یہ شک نہ گزرے کہ سالک کی بھی وہ صفات ہو جاتی ہیں جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ہیں کہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک میں داخل ہے۔ اور شرک بھی کیوں نہ ہو جبکہ صفاتِ خدا اور ذاتِ خدا کے بارے میں سوچ وفکر سے منع کیا گیا ہے تو اُن صفاتِ مقدسہ پر فائز ہونے کا دعویٰ کرنا شرک کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟

کیونکہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ:

تَفَکَّرُوْا فِیْ اٰلَآءِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِیْ ذَاتِ اللّٰہِ۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں میں سوچ وفکر کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ میں فکر نہ کرو۔

اس لئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات مبارک کہ وجو د زائدہ ہے اور اس کا نمونہ انسان کی عقل، وہم اور سوچ میں نہیں آسکتا کیونکہ انسان کی عقل، وہم اور سوچ ان چیزوں تک ہو سکتی ہے جس کا نمونہ دُنیاومافیہا میں موجود ہو۔ اور اگر یہ نمونہ موجود نہ ہو تو وہ ان میں سوچ نہیں کر سکتا اس لئے ہماری رسائی ذاتِ مجردہ تک ناممکن ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ صدیقیت اور نبوت کے درمیان کوئی مقام نہیں، اور بعض اکابر (مثلاً شیخ اکبر ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وغیرہ) نے ان دونوں کے درمیان جو مقام ثابت کیاہے اس کا نام قربت رکھاہے اور اس کو واسطہ قرار دیاہے۔ان کا یہ فرمان محل تامل اور غور طلب ہے کیونکہ قرآن پاک نے نبی اور صدیق کے درمیان کوئی مقام ثابت نہیں کیا۔

كَمَا قَالَ اللّٰہ تعالیٰ:

أُولَئِکَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ (النساء ٦٩)

قرآن کا انبیاء کے بعد صدیقین کا تذکرہ کرنا اس امر پر دلیل ہے کہ نبی کے بعد اگر کوئی درجہ ہو سکتاہے تو وہ صرف صدیق کاہے۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم

بینہ نمبر ۳

واضح ہو کہ نبوت اور صدیقیت کے درمیان مقامِ قربت واسطہ نہیں ہو سکتا کیونکہ مقام وہ ہے جو عروج ونزول کا متقاضی ہو اور قربت وہ ہے جو عروج ونزول سے خالی ہو، نیز قربت، صدیقیت سے علیحدہ کسی چیز کا نام نہیں بلکہ یہ صدیقیت کا جزوِ اخیر ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ مقامِ قربت کی

توجہ خالص تنزیہہ کی طرف ہے اور وہ بتامہٖ عروج وفنا ہے۔ اور مقامِ صدیقیت و نبوت سراسر نزول وصحو وبقا ہے۔ پس ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ واللہ اعلم

- مفسرین کرام بھی اسی امر کے قائل ہیں کہ نبوت کے نیچے صرف مرتبۂ صدیقیت ہے۔

تفسیر صاوی میں ہے:

فَالصِّدِّيْقِيَّةُ تحتَ مَرْتَبَةِ النَّبُوَّةِ۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو مقامِ صدیقیت کی سیر و معرفت کے دوران بذریعہ کشف والہام معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اس کی ذات پر زائد ہے۔ آپ کا یہ کشف علمائے حق اہل سنت وجماعت کے عقیدہ کے عین مطابق ہے کیونکہ ان کے نزدیک وجودِ حق ذاتِ حق پر زائد ہے۔ یعنی ذات موجود، عالمِ ہستی ووجود سے منزہ و مُبرّا ہے، اور ذات کائنات سے وراء الوراء ہے جبکہ صوفیائے وجودیہ ذات اور کائنات میں اتحاد ثابت کرتے ہیں۔ صوفیائے شہودیہ کے امام حضرت ابوالمکارم رکن الدین شیخ علاؤالدولہ سمنانی قدس سرہٗ کے فرمان "فَوْقَ عَالَمِ الْوُجُوْدِ عَالَمُ مَلِکِ الْوَدُوْدِ"۔ (عالمِ وجود وہستی کے اوپر بہت محبت کرنے والے بادشاہ کا عالم ہے) کا بھی یہی مطلب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا کشف و شہود علمائے شریعت (اہل سنت وجماعت) کے اصول سے بال برابر بھی مخالف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے شرعی نظری، استدلالی علوم کو ضروری کشفی بنا دیا تھا۔ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ بہاؤالدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ سلوک سے مقصود یہی ہے کہ اجمالی معرفت تفصیلی اور استدلالی معرفت کشفی ہو جائے۔ پس ثابت ہوا کہ علوم شرعیہ ہی اصل علوم ہیں، راہ سلوک میں جو علوم سکریہ پیش آتے ہیں وہ اصلی علوم نہیں ہوتے ان سے گزر جانا چاہیئے۔ (وَبِاللہِ التَّوْفِیْق)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۳۱ تا ۵۳۳)

[ابو المکارم رکن الدین شیخ علاؤ الدولہ اپنی بعض تصانیف میں فرماتے ہیں فوق عالم الوجود عالم ملک الودود یعنی عالمِ وجود سے اوپر ملک الودود (حق تعالیٰ) کا عالم ہے۔ صدیقیت کا مقام مقاماتِ بقا میں سے ہے جس کا رُخ عالم کی طرف ہے۔ اس سے بھی بہت نیچے مقامِ نبوت ہے جو فی الحقیقت بہت بلند ہے اور کمال صحو وبقا کا مقام ہے۔ قُرب کا مقام مقامِ صدیقیت اور مقامِ نبوت کے درمیان برزخیت اور واسطہ کی لیاقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کا رُخ صرف تنزیہہ کی طرف ہے اور تمام عروج سے اس کا تعلق ہے اور ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ہر چہ استادِ ازل گفت بگو میگویم

ترجمہ: مجھے طوطی کی طرح آئینے کے پیچھے بٹھا دیا گیا ہے۔ جو کچھ استادِ ازل کہتا ہے کہ کہو میں وہ کہتا ہوں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ میں نے جو باتیں اور کیفیات بیان کی ہیں اُنہیں میں نے اپنی طرف سے بیان نہیں کیا بلکہ مجھے جس طرح استادِ ازل (اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ) نے فرمایا میں نے اسی طرح کہا اس طوطی کی طرح کہ جس کو اس کا مالک آئینے کے پیچھے بیٹھ کر باتیں سکھاتا ہے مالک جو بات اسے کہتا ہے طوطی بالکل اسی طرح کہہ دیتی ہے اور اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتی۔

پس اہلِ تصوف کے لئے ضروری بات ہے کہ اپنی کیفیات کو بالکل اسی طرح بیان کریں جس طرح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان پر وارد کی ہوں اپنی طرف سے اس میں کمی یا زیادتی نہ کریں۔

[علومِ شرعیہ نظریہ استدلالیہ کو فقیر کے لئے ضروریہ کشفیہ کر دیا گیا ہے۔ علماءِ شریعت کے اصولوں سے بال برابر بھی مخالفت نہیں ہے۔ ان ہی علومِ اجمالیہ کو تفصیلی کر دیا گیا ہے اور نظریت (محتاج غور و فکر) سے ضروریت وبداہت کی طرف لایا گیا ہے۔]

تشریح

"علومِ شرعیہ نظریہ استدلالیہ" یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے قرآن وحدیث اور علم عقائد وعلمِ فقہ کشف میں سکھا دیا اس سے پہلے میں وہ سب کچھ کتاب کی رُو سے بیان کرتا تھا اور اب میں سب کو کشف سے بیان کرتا ہوں۔

[کسی شخص نے حضرت خواجہ بزرگ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس سے پوچھا کہ سلوک سے مقصود کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا تاکہ اجمالی معرفت تفصیلی معرفت کی شکل اختیار کر لے اور علومِ استدلالی کشفی ہو جائیں یہ نہیں فرمایا کہ ان کے سوا کچھ اور علوم حاصل ہو جائیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ راہ سلوک میں بہت سے علوم و معارف رونما ہوتے ہیں جن سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب تک نہایۃ النہایۃ تک جو مقام صدیقیت ہے کوئی نہ پہنچے، ان علوم سے حصہ نہیں پا سکتا۔ کاش! میں جان لیتا کہ بعض اہل اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ انہیں یہ مقامِ شریف حاصل ہو چکا ہے۔ حالانکہ فی الواقع انہیں اس مقام کے علوم و معارف سے کوئی مناسبت نہیں۔ تو وہ کس طرح اس کے قائل ہیں؟ اور ہر علم والے سے اوپر علم والا موجود ہے۔

اور مجھے مسئلہ قضاوقدر کے راز پر بھی اطلاع بخشی گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ اس طرح مجھے بتایا گیا ہے کہ روشِ شرع سے ذرہ بھی مخالفت نہیں رکھتا۔ اور اس کی اس سے کوئی منافات لازم نہیں آتی۔ اور

پھر یہ مسئلہ جس طرح مجھے بتایا گیا ہے وہ ایجاب کے نقص اور جبر کے شائبہ تک سے مبرا اور منزہ ہے۔اور اس طرح ظاہر و باہر ہے جیسے چودھویں رات کا چاند۔]

تشریح

حضرت خواجہ بزرگ سے مراد حضرت بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں ان سے کسی نے پوچھا کہ سلوک کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جب ایمانِ اجمالی ایمانِ تفصیلی میں تبدیل ہو جائے یعنی اجمالی عقیدہ تفصیلی عقیدہ میں تبدیل ہو جائے یہ بات علمی ہے اور صوفیانہ بات یہ ہے کہ اہل سنت وجماعت کے عقائد جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں کہ اٰمَنْتُ بِاللهِ وَمَلَائِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اِلٰی آخِرِہٖ اب اس کی تفصیل معلوم ہوئی ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات،صفات،اسماء وافعال اور ملائکہ پر کس طرح ایمان رکھوں۔

مقامِ صدیقیت پر پہنچنے سے پہلے سالک کے علم کا یہ حال ہوتا ہے کہ اُس کے عقائد بعض تو صرف علمی ہوتے ہیں اور بعض کشفی اور کشفی علوم میں غلطی کا امکان بھی رہتا ہے لیکن جب وہ مقامِ صدیقیت پر پہنچتا ہے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اُس کے صوری ایمان کو حقیقی اور علمی عقائد کو کشفی وشہودی علوم میں تبدیل کر دیتا ہے۔اور اس کی اجمالی معرفت تفصیلی ہو جاتی ہے،پہلے وہ کُتب سے استدلال کرتا ہے لیکن یہاں پہنچ کر اُس کی رہنمائی کشفِ صحیح اور شہود سے کی جاتی ہے اور یہی تصوف وسلوک کا اصل مقصد و مدعا ہے۔پس سالک کی یہ خواہش نہیں ہونی چاہیئے کہ اُسے ایسا کشف نصیب ہو جائے جس سے وہ لوگوں کے دلوں کے خیالات یا قبروں کی اندرونی کیفیات سے واقف ہو جائے اور لوگوں کو اُن کی خواہشات یا اُن کا کھایا پیا بتاتا رہے کہ ایسا کشف خلافِ تصوف ہے۔ہاں اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ

یہ علم بھی ضمناً عطا کر دے تو ٹھیک ہے لیکن لوگوں سے ان واردات و کیفیات کا پوشیدہ رکھنا ضروری ہے۔

دوسری اہم بات جو اس مکتوب میں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے بیان فرمائی ہے وہ مسئلہ قضاوقدر ہے۔ اہل سنت وجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ خیر و شر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے ہے جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ "والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" پس اگر کوئی اچھی چیز نصیب ہو یا نیکی کے کاموں کی توفیق مل جائے تو اسے بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے جاننا چاہیئے اور اگر کوئی برائی ملے تو وہ بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کی طرف منسوب کی جائے۔ تاہم یہ بات ذہن نشین رہے کہ انسان نہ تو اپنے افعال میں مختارِ کُل ہے اور نہ ہی سرے سے بے بس و مجبور۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ازل میں عالم دنیا کو دیکھا تو جو شخص یہاں جو کچھ کر رہا تھا وہ کچھ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں لکھ دیا۔ مثال کے طور پر جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے روزِ ازل میں دیکھا کہ زید دُنیا میں آنے کے بعد فلاں دن فلاں وقت اور فلاں جگہ پر جاکر چوری کرے گا تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے زید کو لوحِ محفوظ میں چور لکھ دیا۔ اور یہ بھی لکھ دیا گیا کہ اس جرم کی پاداش میں زید کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔ پھر جب زید دُنیا میں آتا ہے تو اپنی نجس عادت کی بناء پر چوری کا ارتکاب کر لیتا ہے اور نتیجتًا اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں زید کے لئے یوں حکم نہیں دیا کہ "زید کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دُنیا میں جاکر چوری کے کام کرے" بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآن عظیم الشان میں یوں فرمایا کہ:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ (المائدة۳۸)

ترجمہ: اور جو مرد یا عورت چور ہو۔

اور اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے یوں کہلوایا کہ:

ولاتسرقوا۔(رواہ الصحیح المسلم والمشکوٰۃ)

ترجمہ: اور چوری مت کریں۔

پس یہ جرم کرنے کے بعد زید اگر یوں کہے کہ "میری قسمت میں ہی چوری کرنا لکھا تھا اور میں قسمت کے آگے مجبور تھا اس لئے میرا کیا قصور؟ اور میرے ہاتھ کیوں کاٹے گئے اور مجھے جہنم میں داخل کرکے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ مجھ پر ظلم کیوں کرے گا؟(نعوذ باللہ من ذٰلک)" تو ایسی بات کہنا بھی کفر کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ ایسا کہنا دراصل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ظالم ثابت کرنا ہے جبکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ظالم نہیں بلکہ عادل بادشاہ ہے۔ اس کے عدل کا تقاضا ہی یہ تھا کہ زید چوری کرے گا اور پھر سزا پائے گا۔

مندرجہ بالا مثال لوگوں کو سمجھانے کے لئے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ تقدیر کا مسئلہ بڑا نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس میں بحث ومباحثہ سے حدیث شریف میں منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس پر اس حد تک ایمان رکھنا ضروری ہے جس حد تک فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے اور بس۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی سے مجھے مسئلہ تقدیر کی اصل حقیقت سے مطلع فرمایا ہے اور ایسے علوم سے بہرہ مند علماءِ راسخین کو ہی کیا جاتا ہے۔ عوام اور علماءِ ظواہر کو اس جیسے نازک مسائل کی آگاہی نہیں ہو سکتی۔(واللہ اعلم بالصواب)

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ مقامِ شہادت کے معارف کے ضمن میں اس فقیر کو مسئلہ قضاوقدر کے راز پر بھی مطلع فرمایا گیا یعنی اس راز کی استدلالی معرفت فقیر کے لئے کشفی معرفت ہو گئی ہے اور بذریعۂ کشف والہام معلوم ہو گیا ہے کہ واجب تعالیٰ ایجاب کے نقص اور جبر کے شائبہ سے قطعاً مبرّا ہے اور علمائے اہلِ سنت کا یہی متفقہ عقیدہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز تقدیر الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ۔[1] یعنی ہر چیز قضاوقدر سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ایک قسم کا اختیار عطا فرما رکھا ہے اور وہ جمادات کی طرح مجبورِ محض نہیں ہیں، جیسا کہ جبریہ کا عقیدہ ہے کیونکہ جبریہ کے عقیدے کی صورت میں بندہ ثواب وعذاب کا مستحق نہیں رہے گا اور یہ عقیدہ شریعت مطہرہ کے سراسر خلاف ہے۔ لہٰذا امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ انسان نوشتۂ تقدیر پر مجبور نہیں مختار ہے کیونکہ بندہ خالقِ فعل نہیں کاسبِ فعل ہے اور مسئلہ قضاوقدر میں یہ امر ثابت ہے کہ بندہ اپنے کسب اور اختیار سے جو کچھ کرنے والا تھا اللہ تعالیٰ نے تحریر قضاوقدر سے پہلے اس کے اختیاری فعل کو اپنے علم ازلی سے جان لیا تھا اور قضاوقدر میں اس کو مرتبۂ علم میں ثابت کر دیا تھا لہٰذا انسان تقدیر کے لکھے ہوئے پر مجبور نہیں بلکہ تقدیر کا لکھا ہوا اس کے فعل اختیاری کے تابع ہے پس نوشتۂ تقدیر کو نوشتۂ تاریخ کی طرح محمول کرنا چاہیئے۔ واللہ اعلم

فرقۂ قدریہ بندہ کو خالقِ افعال مانتا ہے لیکن علماءِ متکلمین اہل سنت وجماعت نے افراط و تفریط کے برعکس اعتدال منتخب کیا ہے جو قرآن وسنت کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ ان کے نزدیک

---

[1] (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۳۶) نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر ۴۹)

خالقِ افعال اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ آیت قرآنیہ شاہد ہے: وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصافات ۹٦) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور جو کچھ تم کرتے ہو۔

بندہ قدرتِ مخلوقہ کے بل بوتے پر کسبِ افعال اور عدمِ کسب دونوں پر قادر و مختار ہے۔ اگر چاہے کسی فعل کو انجام دے اور اگر چاہے چھوڑ دے اسی بناء پر وہ ثواب و عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

جَزَاءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (الأحقاف ۱۴)

یعنی (دخول جنت و دوزخ بندوں کے) اعمال کی جزا ہے۔

نیز فرمایا:

فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ (الکھف ۲۹)

یعنی جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

آیِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ "ایمان لانا اور کفر کرنا" بندے کے ارادہ و اختیار کے ساتھ مربوط ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جبریہ و قدریہ کے عقائد نصوصِ قرآنیہ کے خلاف ہیں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۳۴، ۵۳۵)

[تعجب کی بات ہے کہ اصول شریعت سے مخالفت نہ ہونے کے باوجود اسے کیوں پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اگر مخالفت کا شائبہ ہوتا تو البتہ اخفا اور پوشیدگی مناسب تھی۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس کے افعال کے متعلق باز پُرس نہیں ہو سکتی۔

کرا زہرۂ آنکہ از بیم تو | کشاید زباں جزبہ تسلیم تو

ترجمہ: کس کی طاقت و قدرت ہے کہ تیرے خوف و ہیبت کے باعث تسلیم کے سوا اعتراض کی زبان کھولے۔

علوم و معارف موسلا دھار بارش کی طرح برسارہے ہیں قوتِ مدرکہ ان کے اٹھانے سے عاجز ہے۔ قوتِ مدرکہ تو محض تعبیر ہے۔ ورنہ بادشاہ کی عطاؤں کو بادشاہ کی سواریاں ہی اٹھاسکتی ہیں۔

پہلے پہلے یہ شوق تھا کہ ان علومِ غریبہ کو قیدِ کتابت میں لے آئے۔ لیکن توفیق نہ مل سکی اور اس راہ میں بوجھ محسوس کیا۔ آخر الامر تسلی دی گئی کہ ان علوم کے افاضہ سے مقصود حصول ملکہ ہے، یاد کرنا مقصود نہیں۔ جس طرح طالب علم تحصیل علوم اس مقصد کے لئے کرتے ہیں کہ مولویت کا ملکہ حاصل کرلیں۔ صرف و نحو وغیرہ علوم کے قواعد واصول ضبط کرنا مقصود نہیں ہوتا۔]

تشریح

آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ فرمانا کہ "بادشاہ کی عطاؤں کو بادشاہ کی سواریاں ہی اُٹھاسکتی ہیں" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قدر علوم و معارف اور حصولِ درجات و کیفیات کا حامل وہی ہو سکتاہے جسے بادشاہِ حقیقی عنایت کرے ورنہ ہر خس وخاشاک کے بس کی بات نہیں ہے۔

علاوہ ازیں جس طرح ظاہری علم کا ملکہ ہوتا ہے ایسے ہی باطنی علم کا بھی ملکہ ہے جس کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ یہ ملکہ عنایت فرمائے وہ وارداتِ غیبیہ کا ادراک بھی کرلیتاہے اور انہیں کھول کھول کر بیان بھی کرسکتاہے اور جسے یہ ملکہ عطانہ ہو وہ بیان کرنے سے عاجز ہوتاہے یاپھر کماحقہ بیان نہیں کر سکتا۔

[ان علوم میں سے کچھ علوم عرض کرتاہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتاہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡبَصِيرُ (الشوریٰ ۱۱)

ترجمہ: اس جیساکوئی نہیں اور وہی سُنتادیکھتاہے۔

اس کلام کا ابتدائی حصہ تو تنزیہہ محض کے اثبات کے لئے ہے، جیسا کہ خود ظاہر ہے۔ اور هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْر کے الفاظ تنزیہہ کی تکمیل واتمام کے لئے ہیں۔

اس کا بیان اس طرح ہے کہ جب ثبوت سمع وبصر عالم کے ساتھ ثبوت مماثلت کا وہم ڈالتا ہے۔ اگرچہ کچھ قدرے ہی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دفع کرنے کے لئے مخلوقات سے سمع وبصر کی نفی فرمادی یعنی صرف وہی ذات جل شانہٗ سمیع اور بصیر ہے۔ وہ سمع وبصر جو مخلوق میں پائی جاتی ہے اس کا دیکھنے اور سننے میں کچھ دخل نہیں۔ مخلوق میں ان دو صفات کو پیدا کرنے کے بعد جس طرح خدا تعالیٰ سمع وبصر پیدا کرتا ہے مخلوق سننے اور دیکھنے کا کام لیتی ہے۔ اور یہ بھی عادتِ الٰہی کے جاری ہونے کے مطابق ہے۔ بغیر اس کے کہ مخلوق کی صفات کی اس میں تاثیر ہو۔ اور اگر تاثیر تسلیم بھی کی جائے تو وہ بھی حق تعالیٰ ہی کی پیدا شدہ ہے۔ لہٰذا جس طرح مخلوق کی ذوات جمادِ محض ہیں اسی طرح ان کی صفات بھی جمادِ محض ہیں۔ جس طرح صاحبِ قدرت محض اپنی قدرت سے پتھر میں صفتِ کلام پیدا کردے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ فی الحقیقت پتھر کلام کررہا ہے اور اس میں صفتِ کلام موجود ہے۔ جس طرح پتھر جمادِ محض ہے اسی طرح یہ صفت اگر فرض کرلی جائے تو وہ بھی جمادِ محض ہی ہے۔ حروف وآواز کے پیدا ہونے میں اس کا کوئی دخل نہیں۔ تمام صفات اسی طرح کی ہیں۔ غایۃ مافی الباب اتنی بات ہے کہ یہ دو صفات چونکہ زیادہ ظاہر تھیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی نفی خصوصیت سے فرمائی۔ اس سے باقی صفات کی نفی بطریق اولیٰ ہو جاتی ہے۔]

تشریح

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ”اس کی مثل کوئی شے نہیں اور وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے“۔
پس ثابت ہوا کہ مخلوقات میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ تشبیہ دی جاسکے اور نہ ہی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو کسی چیز کے ساتھ مشابہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی دو صفاتِ ذاتیہ بھی بیان فرمادیں۔ گویا اپنی صفات بیان کرکے مخلوقات کی صفات کی نفی فرمائی کہ دراصل سُننے والا اور دیکھنے والا میں (اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ) ہی ہوں میرے سوا کوئی نہیں۔ اور چونکہ مخلوق بھی سننے اور دیکھنے کی اہلیت رکھتی ہے اس لئے ان صفات انسانی کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ مشابہت کا شبہ تو پیدا ہو سکتا تھا اس لئے پہلے ہی لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ (اس کی مثل کوئی شے نہیں) فرما کر اس شبہ کا ازالہ فرمادیا۔
فقہ اکبر کی مشہور و معروف اور پہلی شرح جو کہ نور الظلم کے نام سے موسوم ہے اُس میں لکھا ہے کہ:

وَصِفَاتِهٖ کُلُّهَا ذَاتِیَّةٌ اَوْ فِعْلِیَّةٌ بِخِلَافِ صِفَاتِ الْمَخْلُوْقِیْنَ لِاَنَّ اللہ تعالیٰ یَعْلَمُ لَا کَعِلْمِنَا وَیَقْدِرُ لَا کَقُدْرَتِنَا وَیَرٰی لَا کَرُؤْیَتِنَا وَیَتَکَلَّمُ لَا کَکَلَامِنَا وَیَسْمَعُ لَا کَسَمِعْنَا لِاَنَّ اللہ قَوِیٌّ وَالْاِنْسَانُ ضَعِیْفٌ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ بِلَا اٰلَةٍ یُحْتَاجُ اِلَیْهِ کَالسَّمْعِ وَالْبَصَرِ وَالْاُذُنِ وَغَیْرِ ذٰلِکَ۔

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی ساری صفات چاہے ذاتیہ ہوں یا فعلیہ، وہ مخلوقات کی صفات کے خلاف ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ علم رکھتا ہے لیکن (اس کا علم) ہمارے علم کی طرح نہیں اور وہ (اللہ تعالیٰ) قدرت رکھتا ہے لیکن (اس کی قدرت) ہماری قدرت کی طرح نہیں اور وہ (اللہ تعالیٰ) دیکھتا ہے لیکن (اس کا دیکھنا) ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں اور وہ (اللہ تعالیٰ) کلام کرتا ہے لیکن (اس کا کلام) ہمارے کلام کی طرح نہیں اور وہ (اللہ تعالیٰ) سُنتا ہے لیکن (اس کا سُننا) ہمارے سُننے کی طرح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ

قوی ہے (جبکہ) انسان ضعیف ہے، انسان کسی چیز پر بھی آلات ووسائل کے بغیر قدرت نہیں رکھتا (بلکہ) ان آلات اور وسائل کا محتاج ہے جیسے سُننے اور دیکھنے کے لئے (کانوں اور آنکھوں) کا۔ وغیرہ ذٰلک۔

اور یہی بحث ابوالمنتہیٰ میں صفحہ نمبر ۲۷ پر بھی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ انسان جو ان صفات کا حامل ہونے کی وجہ سے متکلم، سمیع اور بصیر ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ مبارکہ میں صرف اور صرف اس کی شراکت اِسمی ہے اور بس۔ اور اس کی وضاحت یوں ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بصیر ہے، اُس نے آنکھوں کی احتیاج کے بغیر ازل میں ہی ہر چیز کو دیکھ لیا تھا اور اس کے دیکھنے میں کوئی چیز مثلاً زمانہ یا دیوار رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اور وہ کسی بھی چیز کے صرف ظاہر کو ہی نہیں دیکھتا بلکہ اس کے باطن سے بھی آگاہ ہوتا ہے جبکہ انسان جو کہ بصیر ہونے کے ناطے چیزوں کو دیکھتا ہے تو آنکھوں کا محتاج ہے۔ پھر انسان دیوار کے اُس طرف کسی چیز کو دیکھنے پر قادر نہیں ہے۔ اور نہ تو ماضی کی کسی چیز کو دوبارہ دیکھ سکتا ہے، نہ آئندہ ہونے والے واقعات کو دیکھنے پر قادر ہے اور جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو صرف اس کے ظاہر تک ہی محدود رہتا ہے اور اس کی ساری صفات کا یہی حال ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان کی بصارت اور دیگر ساری صفات اس کی ذاتی نہیں ہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عطا سے ہیں جبکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جملہ صفات اُس کی ذاتی ہیں اُن میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں ہو سکتی۔ پس ایسا ضعیف اور محتاج انسان اپنے خدا کے ساتھ کیسی مشابہت رکھ سکتا ہے۔ ہر گز نہیں، ہر گز نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

انسان ہوا میں اُڑے بھی تو خدا ہو نہیں سکتا۔

[اللہ تعالیٰ نے پہلے صفت علم پیدا فرمائی، اس کے بعد اس کی معلوم کی طرف توجہ پیدا فرمائی۔ اس کے بعد معلوم کے ساتھ اس کا تعلق پیدا فرمایا۔ اس کے بعد معلوم کو اس پر منکشف کر دیا۔ پھر اس میں صفت علم پیدا فرمانے کے بعد اپنی عادت کے مطابق اس میں انکشاف پیدا فرمایا تو اس سے ثابت ہو گیا کہ علم کا انکشاف میں کیا دخل ہے۔

اسی طرح پہلے صفت سمع پیدا فرمائی، پھر کان لگانا، پھر مسموع کی طرف توجہ، پھر سننا، پھر مسموع شے کا ادراک۔

اسی طرح پہلے بصر کو پیدا فرمایا، پھر پتلی کا گھمانا، پھر دکھائی دینے والی چیز کی طرف توجہ، اس کے بعد دیکھنا پیدا فرمایا، پھر اس دیکھی جانے والی شے کا ادراک۔ **علیٰ ھذاالقیاس**۔

سمیع و بصیر در حقیقت وہ ذات ہے جس کے سماع اور رُویت کا مبدأ یہ دو صفات ہوں اور مخلوق میں ایسا کوئی نہیں تو مخلوق میں کوئی در حقیقت سمیع و بصیر بھی نہیں۔

اس گفتگو سے ثابت ہو گیا کہ مخلوق کی صفات بھی اس کی ذوات کی طرح جماد محض ہیں۔ تو آیہ کریمہ کے آخری الفاظ سے مقصود مخلوقات کی صفات کی بالکلیہ نفی ہے۔ یہ مقصود نہیں کہ ان کی بھی صفات ہیں اور یہ صفات اللہ تعالیٰ کے لئے بھی ثابت ہیں تاکہ تشبیہ و تنزیہہ کا اجتماع لازم آئے بلکہ تمام آیۃ کریمہ مکمل طور پر تنزیہہ کے اثبات اور تشبیہ کی نفی کے لئے ہے۔]

تشریح

انسان کا علم ایک محدود علم ہے جو صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عنایت سے ہے قرآن عظیم الشان میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العلق ۵)

ترجمہ: آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔

اس بات کی واضح دلیل ہے۔ اصل، حقیقی اور ذاتی علم صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ہے۔ اور اُس نے اس صفت سے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مستفید کیا جب انہیں اشیاء کے ناموں سے مطلع فرمایا۔ اور یوں ہی باقی صفات کا حال ہے۔ پس جیسے حقیقت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علاوہ ہر چیز معدوم محض ہے اسی طرح ان کی صفات بھی عدمات میں سے ہیں۔ اس لئے کسی بھی معنی میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ کے ساتھ مخلوق کی مشابہت ناممکن ہے۔ (و اللہ اعلم بحقیقت الحال)

[علمِ اول یعنی ان کی صفات کا حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے لئے اثبات اور ان کی ذوات کو جمادِ محض جاننا اور ذوات کو پرنالے اور کوزے کی طرح تصور کرنا کہ ان سے پانی صرف ظاہر ہوتا ہے، مقامِ ولایت سے مناسبت رکھنے والے علوم میں سے ہے۔ اور علمِ ثانی یعنی ان صفات کو بھی جماد کی طرح جاننا اور ان کو مکمل طور پر بے علم جاننا جب کہ وارد ہوا ہے:

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ (الزمر ۳۰)

ترجمہ: بے شک تمہیں انتقال فرمانا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے۔

یہ علمِ ثانی مقامِ شہادت سے مناسبت رکھنے والے علوم میں ہے۔

اس جگہ بھی کچھ فرق دونوں مقاموں کے درمیان سمجھا جاتا ہے۔ تھوڑی چیز زیادہ پر دلالت کرتی ہے اور ایک گھونٹ بڑے سمندر پر دلالت کرتا ہے۔

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

ترجمہ: سال کا اچھا ہونا اس کے موسم بہار کے اچھا ہونے کی وجہ سے ہے۔]

تشریح

یہاں پر حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے دو علوم کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ علمِ اول، صفات کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے لئے ثابت کرنے کا علم ہے اور اس معرفت کا تعلق مدارجِ قُرب کے پہلے درجہ یعنی ولایت کے ساتھ ہے۔ جبکہ قُرب کے دوسرے درجہ یعنی مقامِ شہادت پر متمکن ہونے والے سالک کو علمِ ثانی عنایت کیا جاتا ہے اور جسے یہ علم عطاء ہو جائے وہ صفات کو بھی جماد (پتھر کی طرح) جانتا ہے اور یہ انتہائی باریک معرفت ہے جسے مقامِ شہادت والا صوفی ہی سمجھ سکتا ہے۔ ہر شخص کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

جب انسان اپنے آپ کو بندہ اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو اپنا معبود ہونے کی کیفیت پائے تو یہ مقام شہادت ہے۔ اسی لئے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

نیز دوسری جگہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ:

اَعْلَمَکُمْ بِنَفْسِہٖ اَعْلَمَکُمْ بِرَبِّہٖ۔ [1]

ترجمہ: تم میں سے جو شخص اپنے نفس کو زیادہ پہچانتا ہے وہی تم سے زیادہ اپنے رب کو پہچاننے والا ہے۔

[اسی طرح اس بلند مقام والے افعال مخلوقات کو بھی میت اور جماد کی طرح پاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کے افعال کو حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ ملتے ہیں، اور ان افعال کا فاعل حق سبحانہٗ کو جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند وبرتر ہے۔]

تشریح

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے افعال سارے کے سارے اَزلی ہیں۔ اس لئے بندے کے فعل اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فعل میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ پس بندے کے فعل کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فعل قرار دینا کھلی گمراہی ہے اور وہ جو حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مثنوی شریف میں فرمایا ہے کہ:

گفتہ او گفتہ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

ترجمہ: ولی کا بولنا اس طرح ہوتا ہے جس طرح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا بولنا اگرچہ یہ بولنے کے الفاظ بندے کے حلق سے نکلتے ہوں۔

تو اس سے دراصل وہ بات مراد ہے جو کہ حدیثِ قدسی میں منقول ہے کہ:

فاذا احببته کنت له سمعًا یسمع بی و بصراً یبصر بی و یداً یبطش بی۔ [2]

---

[1] (کشف الاسرار وعدۃ الابرار، ج۲، ص۹۰)

[2] (کشف الاسرار وعدۃ الابرار، ج۳، ص۴۵)

ترجمہ: پس جب وہ (بندہ) میرے ساتھ محبت کرنے لگتا ہے تو میں اُس کی سماعت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سُنتا ہے اور اُس کی بصارت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں جن کے ساتھ وہ پکڑتا ہے۔

قرآن عظیم الشان میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (المائدۃ ۵۴)

ترجمہ: تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ وہ اللہ کے پیارے اور اللہ ان کا پیارا۔

یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے محبت کی بنا پر اس کے احکام پر دل وجان سے عمل کریں اور اس قابل ہو جائیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بھی ان سے پیار کرنے لگے۔

الغرض یہ سب کیفیات انسان کی بزرگی اور شرافت کے طور پر عطا کی جاتی ہیں، یوں نہیں کہ انسان حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کی سمع، بصر اور ہاتھ بن جاتا ہے۔ بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات میں کسی طور پر بھی شرکت ناممکن ہے۔ اس کی صفات بلا کیف ہیں۔ اور ان صفات کی کیفیات اور اثرات انسان میں ظاہر ہوتے ہیں۔

پس ایسا بندہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا اتنا محبوب بن جاتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس کے فعل کو تکریماً وتشریفاً اپنا فعل قرار دیتا ہے نہ کہ حقیقتاً۔

[اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص پتھر کو حرکت دے اور اس کو جنبش میں لائے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ شخص جنبش وحرکت میں ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے گا یہ شخص پتھر میں حرکت کا مؤجد ہے اور حرکت پتھر میں ہے۔ اس کے ساتھ جس طرح پتھر جمادِ محض ہے اس کی حرکت بھی جمادِ محض ہے۔

بالفرض اگر کوئی شخص اس پتھر کی حرکت سے ہلاک ہو جائے تو یہ نہیں کہتے کہ اس پتھر نے ہلاک کیا ہے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے ہلاک کیا ہے۔ اور علمائے شریعت شکر اللہ سعیہم کا قول اس علم کے موافق ہے۔]

تشریح

ساری مخلوق جمادِ محض ہے یعنی مٹی اور پتھر کی طرح بے حِس ہے۔ اس کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ کیا نسبت ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات مبارکہ نہ بندے میں حلول کرتی ہے اور نہ ہی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے افعال بندے کے افعال میں دخول کرتے ہیں بلکہ انسان جس کی پیدائش ایک گندے نطفے سے ہے وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے افعال کو اپنے افعال یا اپنے افعال کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے افعال قرار دینے کا اہل کب ہو سکتا ہے۔

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

ترجمہ: مٹی کو عالمِ پاک کے ساتھ کیا مناسبت ہو سکتی ہے؟

پس انسان کو چاہیئے کہ غرور و تکبر میں مبتلا نہ ہو بلکہ اپنے نقائص پر نگاہ رکھے۔ تکبر اور بڑائی صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے لئے ثابت ہے۔

[علمائے کرام فرماتے ہیں کہ مخلوق سے افعال کا صدور اگرچہ ارادہ اور اختیار سے ہے مگر ان کا مفعول حق تعالیٰ کا مخلوق و مصنوع ہے اور ان کے افعال کو اس کو مصنوعیت و مخلوقیت میں کچھ دخل نہیں۔ ان کے افعال محض چند حرکات ہیں۔ مخلوق و مجعول کی مجعولیت میں ان کی قطعاً کوئی تاثیر نہیں اس پر اگر یہ شبہ وارد کیا جائے کہ اس صورت میں افعال مخلوقات کو ثواب و عذاب کا باعث قرار دینا

غیر معقول بات ہے۔ یہ تو بالکل اس طرح ہوا جیسے پتھر کو کسی امر کا مکلف قرار دیں اور اس کے فعل پر اس کی مدح یا مذمت کریں۔]

تشریح

یہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ بندے کا فعل بھی بندے کی طرح مخلوق ہے، اور انسان اتنا عاجز ہے کہ جب تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نہ چاہے اپنی مرضی سے حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں۔ پس ہر کام اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ارادے و مشیت سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی نیک شخص کسی بیمار کو دَم کرتا ہے تو اُسے شفا مل جاتی ہے۔ اور دَم کرنے والا اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ میں نے اسے شفا دی ہے تو غلط ہو گا۔ شفا دینے والی ذات تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ہے اُس نے چاہا تو دَم میں تاثیر پیدا ہوئی۔ وہ نہ چاہتا تو دَم کرنے والا ہزار پھونکیں مارتا لیکن کچھ نہ ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ سب کچھ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مرضی سے ہوتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

ما شاء اللہ کان و ما لم یشاء لم یکن۔

ترجمہ: جو اللہ تعالیٰ چاہے وہ ہو جاتا ہے اور جو وہ نہ چاہے نہیں ہوتا۔

[اس شبہ کے ازالے کے لئے میں کہتا ہوں کہ پتھر اور مکلفین میں فرق ہے۔ کیونکہ مدار تکلیف قدرت و ارادہ ہے۔ اور پتھر میں کوئی ارادہ نہیں، لیکن چونکہ مکلفین میں بھی ارادہ حق تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے، حصولِ مراد میں ان کے ارادے کی کوئی تاثیر نہیں تو ارادہ بھی میت کی طرح ہے۔ اس نے صرف اتنا کام کیا کہ ارادہ کے موجود ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حسبِ عادت اس شے کو پیدا فرمادیا۔ اور اگر قدرت کو کسی قدر مؤثر مان بھی لیں جیسا کہ علماء ماوراء النہر شکر اللہ سعیہم نے فرمایا ہے۔ جب

بھی ان میں تاثیر تو خدا تعالیٰ نے ہی پیدا کی ہے۔ جس طرح اس نے پیدا کی ہے، تو اس کی تاثیر بھی بالکل بے اختیار ہے تو اس کی تاثیر بھی جماد کی طرح ہے۔]

تشریح

دوسری اہم بات یہ ہے کہ بندے کو سرے سے بے اختیار کہنا بھی درست نہیں ہے۔ اگر انسان میں ارادہ واختیار کی مطلق نفی کر دی جائے تو پھر وہ احکامِ الٰہی کا مکلف نہیں رہے گا۔ جیسے پتھر کی مثال ہے کہ اُس پر نہ نماز فرض ہے، نہ روزہ اور نہ دیگر اُمور۔ پس انسان میں قدرت اور ارادہ کی صفات بھی ہیں لیکن وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اسی بنا پر وہ فقہی مسئلہ ہے جس کے مطابق ایسا شخص جو دونوں ہاتھوں اور پاؤں سے محروم ہو جائے اُس پر نماز فرض نہ ہو گی کیونکہ اس صورت میں اُس کی قدرت نہ رہی جس سے وہ استنجاء اور وضوء کر کے نماز کے قابل ہوتا۔

[مثلاً ایک شخص نے ایک پتھر کسی کی حرکت دینے سے اُوپر سے نیچے آتے ہوئے دیکھا۔ وہ پتھر کسی حیوان کو لگا اور اسے ہلاک کر دیا۔ تو وہ شخص جس طرح اس حیوان کو جماد جانتا ہے بالکل اسی طرح اس کی حرکت کو بھی جماد جانتا ہے اور اس سے جو اثر مرتب ہوا ہے یعنی ہلاک کرنا اسے بھی جماد ہی جانتا ہے۔ لہٰذا ذوات، صفات اور افعالِ مخلوقات سب کے سب جمادِ محضہ اور امواتِ صرفہ ہیں۔ پس وہی ذات حي و قیوم اور سمیع و بصیر ہے اور علیم و خبیر اور اپنے ارادے کے مطابق جو چاہے کرنے والی ہے۔ آپ فرمادیں:

”اگر تمام سمندر میرے رب کے کلمات کے لئے سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے مگر میرے رب کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ اگر اتنے ہی اور سمندر مدد کو لائے جائیں“۔

بہت گستاخی کر دی ہے اور بے حد جرأت واقع ہوگئی ہے۔ کیا کیا جائے کہ بات کی اچھائی نے جو جمیلِ مطلق (حق تعالیٰ) کی طرف سے ہے۔ اس بات پر آمادہ کر دیا ہے کہ سخن اور سلسلہ کام جس قدر دراز ہو جائے اچھا ہی ہے۔ اور یہ فقیر اس ذات کی طرف سے جو کچھ کہتا ہے بہت خوب دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باوجود اپنے آپ کے لئے کچھ مناسبت نہیں پاتا کہ اس کی طرف سے بات کرے یا اس کا نام زبان پر لائے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب　　　ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

ترجمہ: میں نے ہزار بار اپنا منہ مشک وگلاب سے دھو لیا۔ پھر بھی آپ کا نام لینا بے ادبی ہے۔

بندہ باید کہ حد خود داند

ترجمہ: بندہ کو چاہیئے کہ اپنی حد کو پہچانے۔

عنایت اور توجہ کا امیدوار ہے، اپنی خرابی کے متعلق کیا عرض کرے۔ اپنے اندر جو عنایات بھی پاتا ہے، آپ کی توجہ عالی سے ہی پاتا ہے۔ ورنہ:

من ہماں احمد پارینہ کہ ہستم ہستم

ترجمہ: میں وہی پُرانا احمد ہوں جو تھا۔

میاں شاہ حُسین توحید وجودی کا راستہ رکھتا ہے اور اس میں حظ اٹھاتا ہے۔ دل میں آتا ہے اسے نکال کر حیرت کی طرف لایا جائے، جو مقصود ہے۔

محمد صادق بچپن کی وجہ سے اپنے آپ کو ضبط نہیں کر سکتا۔ اگر کسی سفر میں ہمراہ رہے تو بہت ترقیات حاصل کرے۔ دامن پہاڑ کی سیر میں ہمراہ تھا تو اسے بہت ترقی حاصل ہوئی۔ مقامِ حیرت میں غوطہ لگا چکا ہے اور حیرت میں فقیر کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے۔ شیخ نور بھی اسی مقام میں

ہے۔ بہت ترقی کر چکا ہے۔ اس فقیر کے خویشوں میں سے ایک نوجوان ہے جس کا حال بہت اچھا ہے۔ تجلیاتِ برقیہ کے نزدیک ہے اور پوری طرح مستعد ہے۔]

تشریح

وہ شیخ جسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق کی ظاہری وباطنی تربیت کا ذمہ سونپا گیا ہو اُس میں جہاں دیگر ضروری خواص کا ہونا ضروری ہے وہاں اس کے لئے فراست وبصیرت کا ہونا بھی انتہائی ضروری ہے تاکہ وہ اپنے مریدین کی باطنی اور چھپے ہوئے امراض کا روحانی علاج کر سکے۔ اور اُن ترقیات پر بھی مطلع ہو تاکہ اگر کوئی سعادت مند مُرید کسی مقام پر فائز ہو تو اس کے لئے اگلے مقامات کی راہ ہموار کر سکے۔ یا اگر کوئی سالک کسی مقام پر رُک جائے تو اپنی فہم وفراست اور عجز وانکساری کے ساتھ اسے اس مقام سے نکال سکے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو ایسے ہی کمال عطا کیئے تھے جن کی بناء پر آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کئی جگہوں پر اپنے مریدین کے مقامات اور باطنی کیفیات کی اطلاع دی ہے۔ باقی رہی مریدین کی باطنی ترقی تو اس کے لئے سب سے ضروری چیز عقائد کی درستگی ہے۔ اگر عقائد اہلِ سُنت وجماعت کے مطابق ہوئے تو ترقی بھی جلد ہو گی اور کیفیات بھی اعلیٰ ہوں گی۔ اور اس کے ساتھ اُخروی نجات بھی متصور ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے کئی مکتوبات میں عقائد اہل سنت وجماعت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور شیخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مریدین کے عقائد واعمال کو جانچے جو مرید اچھے اعمال کا حامل ہو اور اپنے عقائد کو درست کر چکا ہو اس کے ساتھ شفقت ومہربانی سے پیش

آئے۔ اس سے دوسروں میں بھی شوق وذوق بڑھے گا۔ اور اگر مریدین کی ظاہری حالت اور خدمت کو مدنظر رکھے گا تو یہ باقی مریدین کے ساتھ بھی خیانت ہو گی اور تصوف کا بھی مذاق ہو گا۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ مقامِ شہادت کے مناسب بعض علوم و معارف بیان فرما رہے ہیں جو آپ پر بطریقِ کشف والہام وارد ہوئے چنانچہ آپ فرماتے ہیں آیۂ مبارکہ: لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ (الشوریٰ ۱۱) کے دو جزو ہیں:

پہلا جزو لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ اللہ تعالیٰ کی شانِ تنزیہہ کا بیان ہے اور دوسرا جزو وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ بھی اس کی شانِ تنزیہہ ہی کو پورے طور پر ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن صوفیائے وجودیہ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ آیت کا پہلا جزو تنزیہہ اور دوسرا جزو تشبیہ کا بیان ہے، ان کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جامع تنزیہ و تشبیہ ہے۔

تشبیہ و تنزیہہ

- اہلِ تصوف کے نزدیک اشیائے کائنات میں ظہورِ ذات کا نام تشبیہ ہے اور ذاتِ حق کا صفات ممکنات سے پاک و منزہ ہونا تنزیہہ ہے۔
- صوفیائے وجودیہ کے نزدیک مراتبِ وجوب چھ ہیں اور وہ مرتبہ تشبیہ کو بھی ان ہی مراتب سے جانتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ہماری سمع و بصر بھی اللہ تعالیٰ کی ہی سمع و بصر ہے جو یہاں ظہور کر آئی ہے جیسے کہ بارش کا پانی پرنالے سے ظاہر ہوا ہے دراصل پرنالے سے نہیں۔
- حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک ذاتِ حق تعالیٰ بے مثل اور بے چون و بے چگون ہے اور مرتبۂ تشبیہ سے منزہ و مبرا ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذَالِكَ عُلُوًّا كَبِيۡرًا۔

- حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک صوفیائے وجودیہ کا مذکورہ قول سُکر کے قبیل سے ہے اور مقامِ ولایت کے علوم کے مناسب ہے اور آپ کا مکشوف صحو کے قبیل سے ہے اور مقامِ شہادت کے علوم کے مناسب ہے جو شریعت کی منشاء کے عین مطابق ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ۔
- حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک آیت مبارکہ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (الشوریٰ ۱۱) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سمیع و بصیر ہے اور بندہ بذات خود ہر گز سمیع و بصیر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی عادتِ جاریہ کے مطابق ہماری سمع و بصر (کان و آنکھ) کو سننے اور دیکھنے کی تاثیرات عطا فرماتا ہے، جو سننے اور دیکھنے کا سبب بنتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ وہ تاثیرات نہ بخشیں تو بندے سُننے اور دیکھنے سے محروم ہو جائیں کیونکہ بندوں کی یہ صفات جمادِ محض ہیں اور سننے دیکھنے میں کوئی تاثیر نہیں رکھتیں۔
- صوفیائے وجودیہ کا اس آیت کے حصر واختصاص سے مرتبۂ تشبیہ پر دلیل لانا از قبیل سُکر ہے جو حقیقت سے بعید ہے کیونکہ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي (الکھف ۱۰۹) کے مطابق صفات باری تعالیٰ حد و حصر سے باہر ہیں۔
- ذاتِ حق کو ممکنات کے کسی مرتبے کے ساتھ تشبیہ و تمثیل سے وراء جاننا چاہیئے جیسا کہ آیت کریمہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ میں صریح حکم موجود ہے۔ بعض آیات واقوالِ صوفیاء میں جو تشبیہ و تمثیل کے الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ تشبیہ یا تمثیل مِنْ کُلِّ الْوُجوہْ نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص امر میں ہوا کرتی ہے اور وہاں بھی عارضی اور حقیقی کا فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اصل بات یہ ہے کہ عالمِ مثال میں واجب سے لے کر ممکن تک ہر چیز مثال ہے اگرچہ اس

کی مثل کوئی چیز نہ ہو،**مَثَلُ نُورِهِ (النور ۳۵)** وغیرہا کی تمثیل کو بھی اسی قاعدہ پر محمول کرنا چاہیئے۔**واللہ اعلم**

(البینات شرح مکتوبات، ج ا، ص ۵۳۶ تا ۵۳۸)

مکتوب نمبر ١٩

[بعض حاجت مندوں کی سفارش کے سلسلہ میں۔۔۔ یہ مکتوب بھی اپنے مرشد بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

حقیر ترین خادم کی عرض داشت یہ ہے کہ ایک شخص لشکر سے آیا ہے۔ اس نے بتایا ہے دہلی اور سرہند کے وظیفہ لینے والے فقراً کے وظائف کی مقدار جو فصل خریف سے تعلق رکھتی ہے، اس بلند درگاہ کے ملازموں کے حوالے کر دی گئی ہے۔ تحقیق حق کے بعد مستحقین تک پہنچا دیں۔ اس بنا پر یہ گستاخی کی جارہی ہے کہ فَصلانے کے ہزار ٹکے شیخ ابوالحسن حافظ اور صاحب علم کے لئے اور ہزار ٹکے شیخ شاہ محمد حافظ کے نام پر سرکار نواب شیخ کی طرف سے مقرر ہیں۔ یہ دونوں مذکورہ حضرات زندہ اور قائم ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ انہوں نے اپنا کوئی آدمی بھیجا ہے جو با اعتماد ہے اگر اس خبر کو سچ تسلیم کر لیں تو ان دونوں کے وظیفے کی رقم اس عریضہ لانے والے کے حوالے کر دیں۔ یہ دونوں حضرات اس وقت سرہند میں ہیں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے مکتوب نمبر ١٩ اور ٢٠ اپنے کچھ حاجت مند شاگردوں کی سفارش کی غرض سے تحریر فرمایا ہے۔ آپ کی سفارش کرنا شریعت غرأ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی رُو سے کیسا ہے۔ اس کی تحقیق میں چند احادیث مبارکہ زیر نظر ہیں۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ:

خیر الناس من ینفع الناس

ترجمہ: لوگوں میں سے بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔

دوسری حدیث مبارکہ میں ہے کہ:

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کی ضرورت کو پورا کرے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس شخص اور دوزخ کے درمیان ایک بہت بڑی خندق بنادیتا ہے جس کی مسافت پانچ سو سال ہوتی ہے۔

تیسری حدیث مبارکہ میں ہے کہ:

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کی ضرورت کو پورا کرے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس شخص کی آخرت کی ضروریات کو پور فرمائے گا اور یہ اس کے گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنائے گا۔

ان احادیث کی بناء پر حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے مختلف موقعوں پر اپنے حاجت مند شاگردوں کی سفارش کی ہے تاکہ ضرورت مندوں کی مشکلات آسان ہوں اور انہیں نفع پہنچ سکے۔ پس ثابت ہوا کہ نیک اور جائز کاموں میں سفارش کرنا نہ صرف مستحسن ہے بلکہ احادیث نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہٖ وسلم کے عین مطابق ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

یہ مکتوب گرامی حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے بعض حاجت مندوں کی امداد کے لئے بطور سفارش اپنے مرشدِ برحق کی بارگاہ میں ارسال فرمایا ہے۔ جس میں شیخ ابوالحسن حافظ، مولانا علی اور شیخ

شاہ محمد حافظ ودیگر اہلِ علم حضرات علیہم الرحمۃ کے سالانہ وظائف ایک ایک ہزار تنکہ (سِکّہ رائج الوقت) کی ادائیگی وحاجت بر آری کے لئے درخواست پیش کی گئی ہے۔

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پیر بھائی خانقاہ عالیہ باقویہ دہلی شریف کے منتظم اعلیٰ حضرت خواجہ شیخ سید فرید بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو صوفی مشرب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ ثروت، امیر، سخی دل اور فیاض طبع بھی تھے۔ انہوں نے خانقاہ کے اخراجات کے علاوہ خاص خاص حاجت مند علماء اور فقراء کے معقول وظائف بھی مقرر فرمارکھے تھے جو حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کی معرفت ادا فرمایا کرتے تھے۔

واضح ہو کہ اربابِ حوائج کی حاجتیں پوری کرنا، موجبِ اجر عظیم اور عاداتِ اہلِ کرم سے ہے۔ حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ: خَيْرُ النَّاسِ مَنْ نَفَعَ النَّاسَ۔ [1] کے مطابق حضرت خواجہ دہلوی اور حضرت امام ربانی قدس اللہ اسرارہما غرباء ومساکین کی خیر خواہی، ہمدردی اور ہر ممکن معاونت فرمایا کرتے تھے اور اس سلسلے میں آپ نے اپنے کئی مکتوبات میں اہلِ ثروت حضرات کو اس امرِ خیر کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اہلِ علم اور اہلِ ذکر کی خصوصیت کے ساتھ دستگیری اور مالی معاونت بجائے خود ایک بہترین عبادت ہے، کیونکہ اس طرح بالواسطہ دواعیِٔ علم وذکر کی سرپرستی ہوتی ہے۔ جو صدقہ جاریہ کے زمرے میں شامل ہے۔

بزرگانِ دین کا معمول رہا ہے کہ وہ علماء اور صوفیاء کو اپنے جُود وسخا کا مرکز قرار دیتے تھے، جب اُن سے اس کا سبب دریافت کیا جاتا تو فرماتے یہ وہ خوش نصیب حضرات ہیں جن کا نصب العین فقط

[1] (شعب الایمان، ج٦، ص١١٧)

اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو پوری یکسوئی کے ساتھ قرب الٰہی اور خدمتِ دین کے درجات کے حصول کے درپے ہیں، اگر ان کی مددنہ کی جائے توان کی یکسوئی اور اخلاص میں فرق آئے گا۔

حضرت عبداللہ بن مبارک علیہ الرحمۃ ہمیشہ اپنے صدقات وعطیات علماء وصوفیاء کے لئے وقف رکھتے۔

حدیث نبوی ہے:

أَطْعِمُوا طَعَامَكُمُ الأَتْقِيَاءَ، وَأُولُوا مَعْرُوفَكُمُ الْمُؤْمِنِينَ۔[1]

اپنی دعوتوں میں ان ہی لوگوں کو شریک کرو جو نیک اور پرہیز گار ہیں یا ایسے مومنوں کو جن کو نیکی سے شغف ہے۔

آپ اس کا سبب یہ بیان فرماتے کہ علماء کا علمِ دین کی تعلیم و تبلیغ کی طرف متوجہ رکھنا فرائض میں داخل ہے۔ اگر یہ حضرات روزمرہ کی ضروریات میں الجھے رہے تو علمی ودینی مشاغل کیونکر جاری رکھ سکیں گے۔

صوفیاء کرام کے نزدیک خدمتِ خلق اور مصیبت زدہ افراد کی ہر ممکن امداد بڑی اہم عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا، نَفَّسَ اللهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔[2]

یعنی جس شخص نے کسی مؤمن کی دنیاوی تکالیف میں سے ایک تکلیف رفع کی اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی تکالیف میں سے ایک تکلیف رفع کردے گا۔

---

[1] (مسندابی یعلی، ج ۱، ص ۴۷۱)

[2] (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۴۵)

غالبًا حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی لئے فرمادیا تھا:

طریقت بجُز خدمتِ خلق نیست بتسبیح و سجادہ و دلق نیست

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۱۵۴۱ تا ۵۴۳)

اللھم اغفر لکاتبہٖ و لمن سعٰی فیہٖ و لو الدیھ و لاساتذیھم و لاھل بیتھم اجمعین آمین یا رب العالمین بحرمت سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ و سلم

مکتوب نمبر ۲۰

[یہ خط بھی بعض حاجت مندوں کی سفارش کے سلسلہ میں اپنے مرشد بزرگوار حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو لکھا:

احقر ترین خادم کی عرض داشت حبیب اللہ سرہندی کی والدہ اور اس کی زوجہ منکوحہ اور دوسرے خادموں کے وظائف کے بارے میں۔ تحریر کردہ عریضہ کے اندر اس بلند درگاہ کے خادموں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ اگر ان کے وظائف کی رقم دہلی آچکی ہو تو مولانا علی کو فرما دیں کہ ان کی تسلی کر دیں۔ ان میں سے بعض وکالۃً واصالۃً آچکے ہیں۔ اگر مبلغات نہ آئے ہوں تو بھی چونکہ مذکورہ حضرات زندہ اور قائم موجود ہیں، ان کے پروانجات کی تصحیح فرمادیں، زیادہ گستاخی ہے۔]

تشریح

اس مکتوب میں بھی آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے شیخ کی خدمت میں سفارش لکھی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات قابل تشریح نہیں۔ سوائے وکالۃً اور اصالۃً کے الفاظ کے۔ اور ان کی تشریح یوں ہے کہ مثال کے طور پر کسی شخص نے عدالت میں کوئی درخواست جمع کرنی ہو اور اس مقصد کے لئے اگر وہ خود چل کر جائے گا تو کہا جائے گا کہ فلاں شخص نے درخواست اصالۃً جمع کی ہے۔ اور اگر کوئی دوسرے شخص کی وساطت سے درخواست دے گا تو اسے وکالۃً کہا جائے گا یا مثال کے طور پر نکاح کے وقت دولہا ایجاب و قبول کے لئے خود موجود ہوتا ہے۔ اسے اصالۃً کہا جاتا ہے لیکن دولہن چونکہ خود نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے کسی عزیز کو ایجاب و قبول کا حق دے دیتی ہے اس لئے اسے وکالۃً کہا جاتا ہے۔

مقدمہ مکتوب نمبر ۲۱

اجمالاً فنا کی دو اقسام ہیں

۱۔ فناءِ آفاقی ۲۔ فناءِ اَنفسی

فناءِ آفاقی

جب انسان کے دل سے معبوداتِ باطلہ کی محبت ختم ہو جائے اور خاص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہو جائے اس کو فناءِ آفاقی کہا جاتا ہے۔

فناءِ اَنفسی

جب سالک حقیقتِ اسلام، حقیقتِ ایمان اور حقیقتِ قرآن پر فائز ہو جائے اور خصائلِ رَزیلہ اور وساوس شیطانی سے محفوظ ہو جائے تو ایسے سالک کی فنا کو فنائے انفسی کہا جاتا ہے۔ ایسے سالک کو تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی دولت میسر آجاتی ہے۔ اور جب تک یہ میسر نہ ہو اس وقت تک اس کی نماز اور روزہ اور دیگر احکام صرف صورتاً ہوتے ہیں، حقیقتاً نہیں ہوتے۔

صورتاً اور حقیقتاً کی وضاحت یوں ہے کہ ایک وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکام پر ظاہری عمل بھی کرتا ہے، اور اس کا باطن بھی ان کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر دوسرا شخص جو دراصل منافق ہوتا ہے، ظاہراً تو احکام الٰہی پر عمل کرتا ہے لیکن اس کا باطن تصدیق کی دولت سے محروم ہوتا ہے، یہی حال عام لوگوں کا ہے۔ یورپ کی اندھی تقلید نے اُن کے دلوں کی تصدیق اور باطنی قوت کو ختم کرکے رکھ دیا ہے۔ اب اکثریت اگر نماز وروزہ ادا کرتی ہے تو رسمِ اجداد سمجھ کر۔ پس جب عوام میں یہ فرق وامتیاز موجود ہے تو عام مؤمنین اور اولیاء کرام میں کتنا فرق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ عوام

الناس تو صورتِ ایمان پر فائز ہیں جبکہ صوفیاء کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حقیقتِ ایمان سے مشرف فرمایا ہے اور اُن کو ظاہری اعمال کے ساتھ قلبی تصدیق کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے، پھر امتیوں میں حقیقتِ ایمان کی دولت سب سے پہلے اور سب سے اکمل درجہ کی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو نصیب ہوئی ہے اور باقی صوفیاء کرام کو آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل اتباع سے میسر آتی ہے۔

جب مؤمن ایمانِ حقیقی پر فائز ہوتا ہے تو اُسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سارے احکام کے حقائق میسر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر نماز کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ صورتاً نماز پڑھنے والے ظاہری رکوع و سجود ادا کرتے ہیں اور وہ بھی سُستی اور کاہلی کے ساتھ ایک بوجھ سمجھ کر ادا کرتے ہیں، نہ ذوق وشوق رکھتے ہیں اور نہ ہی منہیات سے بچتے ہیں، جبکہ ایمانِ حقیقی والا شخص ہر وقت نماز کا منتظر رہتاہے وہ اپنی نماز کو آخری نماز سمجھ کر حضور قلب سے ادا کرتا ہے۔

کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ:

لا صلوٰۃ الا بحضور القلب۔

حضورِ قلب کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔

حضورِ قلب والی نماز ہی کے بارے میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

الصلوٰۃ معراج المؤمن۔

ترجمہ: نماز مؤمن کی معراج ہے۔

ایسی ہی نماز میں مؤمن اپنے پروردگار کا قلبی مشاہدہ کرتا ہے جس کے بارے میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا تھا کہ:

مشرف گرچہ شد جامی زلطف اش　　　خدایا ایں کرم بارے دیگر کن

ترجمہ: (میں) جامی (نے ایک مقبول نماز ادا کی اور اس میں) اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے لطف و کرم (دیدار) سے مشرف ہوا۔ اے خدا ایسا رحم و کرم مجھ پر دوبارہ فرما (تاکہ میں ایسی نماز ادا کر کے پھر تیرا مشاہدہ کر سکوں)۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جب نفسِ ولایت کے اصول میں اتنی مشکلات در پیش ہیں (کہ حضورِ قلب بھی نصیب ہو، حقیقتِ ایمان بھی حاصل ہو اور فنا بھی میسر آئے) تو غوث و قطب، ابدال واوتاد اور قیومیت کے مقامات تک پہنچنے میں کیسی کیسی مشکلات اور نشیب و فراز سے واسطہ پڑتا ہوگا۔ اور یہی بات سمجھانی مقصود ہے کہ ولایت بے شک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے تاہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل بھی اتنا ارزاں نہیں کہ ہر نا اہل اس کا دعویٰ کرنے لگے۔

فنا کا حصول ولی کے لئے اتنا لازمی ہے جتنا کہ نماز کے لئے وضوء ضروری ہے۔ جب تک وضوء نہ کرے گا نماز نہ ہوگی۔ ایسے ہی جب تک فانی نہ ہوگا ولی نہ بن سکے گا اور فانی شخص کی علامات وضروریات (جو کہ خود فنا سے مشرف اولیاء کرام نے بتلائی ہیں) ایسی ہیں کہ بہت کم لوگ ان علامات کے حامل ملتے ہیں جبکہ فنا اور ولایت کے دعویٰ دار لاکھوں پھر رہے ہیں۔

حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ہیچ کس را تا نہ گردد اُو فنا　　　نیست رہ در بارگاہِ کبریا

ترجمہ: جب تک سالک فنا کا مقام حاصل نہ کرے بارگاہِ کبریا تک راستہ نہیں پا سکتا۔

مکتوب نمبر ۲۱

[درجاتِ ولایت خاص کر ولایت محمدیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے بارے میں۔ نیز طریقۂ نقشبندیہ علیہ قدس سرہم کی مدح وثنا اور ان کی نسبت کی بلندی اور دوسرے تمام سلاسل سے افضل ہونے اور اس بیان میں کہ ان کا حضور دائمی ہے۔ شیخ محمد مکی ولد حاجی قاری موسیٰ لاہور کی طرف لکھا گیا:

آپ کا مکتوب شریف ولطیف اس عبدِ ضعیف ونحیف کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اجر وثواب کو عظیم کرے۔ تمہارے کام آسان کرے، تمہیں شرح صدر نصیب فرمائے اور تمہارے عذر قبول کرے بحرمۃ سید البشر جو بصر کی کجی سے پاک ومطہر ہیں۔ علیہ وعلیٰ آلہٖ من الصلوٰۃ افضلہا ومن التسلیمات اکملہا۔

میرے بھائیو! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جب تک وہ موت جو حسی موت سے پہلے ہے، جسے اہل اللہ کے ہاں فنا سے تعبیر کرتے ہیں حاصل نہ ہو اس پاک جناب تک وصول میسر نہیں آسکتا۔ بلکہ آفاق سے تعلق رکھنے والے معبودانِ باطلہ اور نفسانی خواہشات کے الٰہوں کی عبادت سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ اس وقت تک حقیقتِ اسلام اور کمالِ ایمان میسر آسکتا ہے۔ تو مقبول بندوں کے گروہ اور اوتاد کے درجے میں بندہ کیسے داخل ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اطوار ولایت میں یہ فنا پہلا قدم ہے جو رکھا جاتا ہے۔ اور یہ سب سے پہلا کمال ہے جو ابتداء میں حاصل ہوتا ہے، اوّل ولایت سے اس کے آخر کا حال، اس کے آخر کا حال اس کی ابتداء سے اس کی انتہاء کو قیاس کرنا چاہیئے۔

فارسی میں کیا ہی اچھا کہا گیا ہے:

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ترجمہ: میرے باغ کی رعنائی سے میری بہار کا اندازہ کرلو۔

اور فارسی میں یوں بھی کہا گیا ہے:

سالے نکوست از بہارش پیداست

ترجمہ: سال کی خوبی اس کی بہار کی خوبی کی وجہ سے ہے۔

اور پر نیچے ولایت کے بہت سے درجات ہیں۔ کیونکہ ہر نبی کے قدم پر ایک ولایت ہے جو اس سے خاص ہے۔

اور سب سے اعلیٰ درجے کی ولایت وہ ہے جو ہمارے نبی علیہ وعلیٰ جمیع اخوانہ من الصلوٰۃ اتمہا ومن التحیات ایمنہا۔ اس لئے کہ تجلی ذاتی جس میں اسماء صفات شیون واعتبارات کا نہ بطور ایجاب اور نہ بطور سلب کوئی اعتبار نہیں۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولایت کے ساتھ مخصوص ہے، اور علم وعین ہر لحاظ سے تمام وجودی اور اعتباری حجابات کا اٹھ جانا اسی مقام میں حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت وصل پوری طرح نصیب ہوتا ہے، اور وجد درجہ گمان میں نہیں بلکہ حقیقتاً حاصل ہو جاتا ہے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اتباع کرنے والوں میں سے کاملین کو نصیب کامل اور حصہ وافر اس نادر الوجود مقام سے عطا ہوتا ہے۔]

تشریح

وخرق جمیع الحجب الوجودیۃ یتحقق فی ھذا المقام[1]

ترجمہ: اور تمام وجودی اور وجوبی پردوں (اور کیفیات کا) اُٹھ جانا اس مقام میں متحقق ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور انسان کے درمیان ستر ہزار نورانی اور ظلمانی پردے موجود ہیں۔

جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

قال النبی ﷺ ان للہ تعالیٰ سبعون الف حجاباً من نورٍ و ظلمۃٍ لو کشفت لاحرقت سبحات وجھہٖ ماانتھیٰ الیہ بصرہٖ من خلقہٖ۔ (رواہ المشکوٰۃ)

ترجمہ: حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے نور اور ظلمت کے ستر ہزار حجاب ہیں اگر وہ حجابات دور ہو جائیں تو جہاں تک اس کی نظر جائے اس کی ذات کی عظمت اور جلال اس کی مخلوق کو جلا دے۔

ہر شخص کی رُوح پر دو طرح کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ ایک نورانی اور دوسرے ظلمانی۔ نورانی پردے (حجاب) اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات ہیں جو کہ بندے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے درمیان حائل ہیں اور ان کا بیان پیچھے گزر چکا ہے۔ تاہم چند ضروری باتیں بیان کرنا ضروری اور مناسب ہوگا۔

نورانی پردے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو صفاتِ ثمانیہ ثبوتیہ جو زائد بالذات ہیں۔ اور دوسرے شیونات واعتبارات ہیں جو نہ تو ذاتِ بحت پر زائد ہیں اور نہ خارجی وجود رکھتے ہیں۔ ان نورانی

---

[1] (شرحِ مکتوبات قدسی آیات مولوی نصر اللہ ہوتکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میدان وردک خلیفہ حضرت نور المشائخ محمد عمر رحمۃ اللہ تعالیٰ مشہور بہ حضرت صاحب شور بازار، کابل، ص ۹۳)

پردوں کا بندے کی روح سے اٹھنا زوالِ علمی کہلاتا ہے نہ کہ زوال حقیقی۔یعنی یہ حجاب سالک سے علماً غائب ہوتے ہیں،حقیقتاً دور نہیں ہوتے کہ ان کا حقیقی طور پر زائل ہونا محال ہے۔

ان کے زوالِ علمی کے وقت ہی حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا تھا:

علمِ حق در علمِ صوفی گم شود　　　　این سُخن کے باورِ مردم شود

ترجمہ: حق تعالیٰ کا علم صوفی کے علم میں محو ہو جاتا ہے۔لیکن یہ بات لوگوں کی سمجھ میں کیسے آئے گی؟

حجابات کی دوسری قسم ظلمانی ہے اور ان میں مندرجہ زیل چیزیں شامل ہیں:

شہوتِ انسانی، خواہشات نفسانی، کدورات بشری اور عالمِ امکانی بلکہ خود وجودِ انسانی سے بڑا حجاب ہے اسی لئے حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا تھا کہ:

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست

تو خود حجابِ خودی حافظ از میان برخیز

ترجمہ: عاشق (بندے) اور معشوق (اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ) کے درمیان کوئی (دوسری چیز) حائل نہیں بلکہ اے حافظ تو خود ہی اپنی رکاوٹ ہے۔اس لئے (اپنی اِن خواہشاتِ نفسانی کو) دور کر دے (تاکہ وصل نصیب ہو)۔

ظلمانی حجاب چونکہ وجودی ہوتے ہیں اس لئے ان کا زوال بھی حقیقی ہوتا ہے محض گمان نہیں ہوتا۔اور یہ سارے کے سارے حجابات ستر ہزار ہیں، وصلِ عُریان اور تجلی ذاتی دائمی کے لئے ان حجابات کا اُٹھنا ضروری ہے، لیکن ان ستر ہزار پردوں کا ایک دم اور اچانک اُٹھنا محال اور خطرناک ہے۔ اگر یہ ایک دَم کسی سالک سے اُٹھ جائیں تو وہ جل کر راکھ ہو جائے تاہم حکمتِ الٰہی سے اِن کو آہستہ آہستہ ہٹایا جاتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص تصوف میں داخل ہوتا ہے اور کامل

و مکمل شیخ سے بیعت کرتا ہے تو اس کا سلوک سات لطائف میں مکمل ہوتا ہے اور ہر لطیفہ سے دس ہزار حجابات دور ہوتے ہیں، جب سات لطائف حقیقی طور پر مکمل ہو جائیں تو ستر کے ستر ہزار حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور سالک کو وصلِ عُریان نصیب ہو جاتا ہے اور اُسے تجلی ذاتی نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ تجلی ذاتی سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں دائمی ہوتی ہے جبکہ باقی سلاسل میں یہ تجلی برقی ہوتی ہے اور اس سلسلہ کی دوسری سلاسل پر فضیلت کی یہ بھی بہت بڑی دلیل ہے۔

اور چونکہ لطائف کا طے ہونا، حجابات کا اٹھنا اور تجلی ذاتی کا حصول صرف تصوفِ حقیقی میں ہی میسر ہوتا ہے اس لئے اندازہ لگالیں کہ شیخ سے بیعت کرنا کتنا ضروری اور اہم کام ہے جس سے لوگ غافل ہیں اور اگر بیعت کر بھی لیں تو آباؤ اجداد کی رَسم سمجھ کر ادا کر لیتے ہیں نہ شیخ کامل و مکمل کی تلاش کرتے ہیں نہ قبل از بیعت استخارہ۔ پھر سالکِ حقیقی تصوف میں داخل ہو کر جتنی زیادہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی مکمل پیروی کرتا ہے اتنی ہی زیادہ اور جلد اُسے تجلی نصیب ہوتی ہے اور اتنی ہی اُس کی ترقی ہوتی ہے۔ پس ان نعمتوں کے حصول کے لئے تصوف میں داخل ہونا چاہیئے نہ کہ رَسمی طور پر۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز ارشاد فرماتے ہیں کہ فنا (نسیان ماسوی اللہ) کے بغیر سالک کو خدا تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بزرگان دین کا قول مُوْتُوْ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ) اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا:

موتِ معروف (طبعی موت) سے پہلے مر جانا لطائفِ ستہ قالبیہ سے جُدا ہو جانا ہے اور وہ اس طرح ہے کہ سالک کا نفس ترقی کر کے مقامِ قلب تک پہنچتا ہے۔ اور پھر یہ دونوں مل کر مقامِ روح تک اور پھر یہ تینوں مقامِ سِر تک پھر چاروں مل کر مقام خفی تک پھر پانچوں مل کر مقامِ اخفیٰ تک پہنچتے ہیں۔ پھر سارے مل کر عالمِ قدس (وطنِ اصلی) کی طرف پرواز کر جاتے ہیں اور لطیفہ قالبیہ کو خالی چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن ابتداء میں یہ پرواز بطریق احوال ہوتی ہے اور انتہاء میں بطریقِ مقام اور اس جدائی کے باوجود قالب میں حِسّ و حرکت باقی رہتی ہے۔[1]

اس حقیقت کو پنجابی زبان کے معروف شاعر حضرت میاں محمد بخش (عارفِ کھڑی) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یوں قلم بند کیا ہے:

تن حویلی تے توں وچہ بیلی جان مکان تمہارا
میں مر چکی آں سچ کر منّیں سیف ملوکا یارا

مُوْتُوْ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا

موت تفرقۂ ہیئتِ اجتماعیہ کا نام ہے۔

موت دو قسم پر ہے:

۱۔ موتِ اضطراری ۲۔ موتِ اختیاری

مفارقتِ روح از بدن (روح کا بدن سے جدا ہونا) موتِ اضطراری ہے۔

---

[1] (معارف لدنیہ، معرفت نمبر ۲۴)

خواہشاتِ نفس کا مقاطعہ لذات جسمانیہ سے اعراض اور گناہوں سے کامل توجہ موت اختیاری ہے اور مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا سے اسی موت کی طرف اشارہ ہے۔

موتِ اختیاری کی اقسام

اس موت کی چار قسمیں ہیں:

موتِ اَبیض (سفید موت)

یعنی بھوک، پیاس، نیند پر قابو پالیا، چونکہ اس موت سے اشراقیت بڑھتی ہے لہٰذا اسے سفید موت کہہ دیتے ہیں۔

موت اَسود (سیاہ موت)

یعنی دونوں جہاں سے منہ پھیر لینا۔ جیسا کہ فرمایا گیا: اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ "فقیر دارین سے منہ کالا کر لینا (پھیر لینا) ہے"۔ چونکہ دونوں جہان سے آنکھ بند کر لی جاتی ہے لہٰذا اسے سیاہ موت کہتے ہیں۔

موت احمر (سُرخ موت)

یعنی خواہشات ولذاتِ دنیاوی کو قربان کرکے ان پر غلبہ پالینا اور ان کا خون بہا دینا چونکہ یہ قربانی خواہشات کا خون کرکے سرخروئی کا باعث بنتی ہے لہٰذا اسے سُرخ موت کہتے ہیں۔

موت اَخضر (سبز موت)

یعنی آئندہ کے لئے اُمیدوں اور اُمنگوں پر پانی پھیر دینا اور طولِ امل یعنی لمبے منصوبوں کو خیر باد کہہ دینا۔ چونکہ اس سے سالک کی خوشحالی اور سرسبزی کا آغاز ہوتا ہے، لہٰذا اسے سبز موت قرار دیا گیا۔[1]

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ جب تک سالک مقامِ فنا میں قدم نہیں رکھتا آفاقی اور انفسی معبودوں سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اسلام اور ایمان کی حقیقت ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ مرتبہ تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اگر اسلام ہے تو صورتِ اسلام ہے، اگر ایمان ہے تو صورتِ ایمان ہے۔ اسی طرح تزکیہ سے پہلے نماز وزکوٰۃ، روزہ وحج کی بھی صورتیں ہی ہیں نہ کہ حقیقتیں۔

صورتِ ایمان اور حقیقتِ ایمان کا فرق

صورتِ ایمان، تصدیق احکام شرعیہ کا نام ہے۔ حقیقتِ ایمان شہودِ مصداقِ احکامِ شرعیہ کو کہا جاتا ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ظاہر شریعت کے حکم میں صرف آفاقی معبودوں کی نفی کرنے سے ایمان ثابت ہو جاتا ہے، یہ ایمان کی صورت ہے لیکن ایمان کی حقیقت انفسی معبودوں کی نفی پر موقوف ہے۔ صورتِ ایمان کے تو زائل ہونے کا احتمال ہے لیکن حقیقتِ ایمان اس احتمال سے محفوظ ہے۔[2]

---

[1] (سِرِّ دلبراں)

[2] (معارف لدنیہ معرفت)

اسی طرح اعمالِ صالحہ (نماز، روزہ وغیرہا) اگر تکلف اور مزاحمتِ نفس کے ساتھ ادا ہوں تو یہ ان کی صورت ہے اور اگر بلا تکلف رغبتِ نفس کے ساتھ ادا ہوں تو یہ ان کی حقیقت ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایمانِ تقلیدی ۔۔۔ ۲۔ ایمانِ تحقیقی

ایمانِ تحقیقی بھی دو قسم پر ہے:

۱۔ استدلالی ۔۔۔ ۲۔ کشفی

اور ہر ایک ان دو قسموں سے یا تو حد و نہایت رکھتا ہے یا نہ، جو حد و نہایت رکھے وہ علم الیقین ہے اور جو نہ رکھے اس کی پھر دو قسمیں ہیں یا مشاہدہ ہے کہ اس کا نام عین الیقین ہے اور یا مشہودِ ذاتی ہے کہ اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔[1]

استشہاد بالحدیث

حقیقتِ ایمان، اطمینانِ قلب کے بعد ہوتی ہے، اور اطمینانِ قلب اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔ أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد ۲۸) اور اس کی علامت یہ ہے کہ مؤمن کا دل اس قدر منور ہو جائے کہ اس کی روشنی میں عرش و فرش، جنت و دوزخ اور عالمِ برزخ وغیرہا اس کے سامنے منکشف ہو جائیں۔

جیسا کہ حدیثِ حارث بن مالک اس امر پر شاہد ہے ملاحظہ ہو:

عَنِ الْحَارِثِ بن مَالِكٍ الأَنْصَارِيِّ، أَنَّهُ مَرَّ بِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ لَهُ: " كَيْفَ أَصْبَحْتَ يَا حَارِثُ؟" قَالَ: أَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا، فَقَالَ: فَإِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ حَقِيقَةً، فَمَا حَقِيقَةُ

---

[1] (تفسیر عزیزی، پارہ الٓم، ص ٢٦)

إيمَانِک؟فقَالَ: قَدْعَزَفَتْ نَفْسِي عَنِ الدُّنيَا وَاَهْلِهَا، وَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى عَرْشِ رَبِّي بَارِزًا، وَ إِلَى أَهْلِ الْجَنَّةِيَتزَاوَرُونَ فِيهَا، وَأَهْلِ النَّارِيُعَذِّبُونَ فِيهَا، فَقَالَ: عَبْدٌنَوَّرَ اللهُ قَلْبَهُ۔ [1]

ترجمہ: حضرت حارث بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے قریب سے گزرا، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا اے حارث تیرا کیا حال ہے؟ میں نے کہا "میں حقیقی مؤمن ہوں" تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہر حق کی حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ میں نے کہا دنیا اور اہلِ دُنیا سے رُخ پھیر لیا ہے، گویا کہ میں عرش الٰہی کو ظاہر دیکھ رہا ہوں، اور اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے ملاقاتیں کر رہے ہیں اور اہلِ دوزخ کو دیکھ رہا ہوں کہ انہیں عذاب دیا جارہا ہے۔ تو رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا یہ ایسا بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے منور کر دیا ہے۔

بینہ نمبر ا

حدیثِ مذکور میں ایمانِ شہودی کو ہی ایمانِ حقیقی قرار دیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں اسی ایمان کو نور کہا گیا ہے:

اللّٰہُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (البقرۃ ۲۵۷)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللّٰہُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ (النور ۳۵)

---

[1] (کتاب الروح، ص ۷۹۷، طبرانی کبیر، ج ۳، ص ۳۰۲)

اور یہی وہ نورِ ایمان ہے جس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ (الحدید ۱۲)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۴۹ تا ۵۵۴)

[تو اگر تم لوگ اس بلند درجہ دولت اور اس درجہ علیا کے حصول کی توجہ رکھتے ہو تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع و پیروی کو مضبوط پکڑو۔

اور اکثر مشائخ کرام رحمھم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تجلی برقی ہے۔ یعنی حضرت ذات جل سلطانہٗ سے تمام حجابات کا اُٹھ جانا۔ بجلی کی طرح تھوڑے وقت کے لئے ہوتا ہے، پھر اسماء وصفات کے پردے لٹکا دیئے جاتے ہیں اور انوارِ ذات کی شعاعیں پھر پوشیدہ ہو جاتی ہیں۔ تو حضور ذاتی بجلی کی مانند ایک لمحہ کے لئے ہوتا ہے۔ اور اکثر اوقات غیبت ذاتی ہی رہتی ہے۔ اور ان مشائخِ نقشبندیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے نزدیک حضورِ ذاتی ودائمی کا اعتبار ہے۔ زائل ہونے اور غیبت سے بدل جانے والے حضور کا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا ان اکابر کا کمال تمام کمالات سے بڑھ کر ہے اور ان کی نسبت تمام نسبتوں سے فوقیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ ان کی عبارات میں واقع ہو چکا ہے کہ ہماری نسبت تمام نسبتوں سے اوپر ہے۔ اور نسبت سے ان کی مراد حضور ذاتی دائمی ہے۔

اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کاملین کے طریقہ میں انتہاء ابتدا میں درج ہے۔ اور اس معاملہ میں ان کی اقتدا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی پہلی صحبت میں وہ کچھ پا گئے جو دوسروں کو نہایت میں جا کر میسر آتا ہے۔ اور نہایت کے بدایت میں درج ہونے سے ہوتا ہے۔ تو جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ولایت تمام انبیاء ورُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ولایتوں سے فائق اور اعلیٰ ہے اسی طرح ان اکابر کی ولایت تمام اولیاء قدس اللہ

تعالیٰ اسرارہم کی ولایتوں سے فائق واعلیٰ ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو حالانکہ ان اکابر نقشبندیہ قدس اسرارہم کی ولایت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

ہاں دوسرے سلاسل کے بعض کاملین کو بھی یہ نسبت نصیب ہوئی ہے۔ لیکن وہ بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولایت سے اخذ کرکے۔ جیسا کہ حضرت ابو سعید خراز نے اس نسبت کے دوام حصو؛ل کی خبر دی ہے۔ کیونکہ اس شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جُبہ شریف پہنچا تھا۔ جیسا کہ صاحبِ نفحات (مولانا جامی قدس سرہٗ) نے نقل کیا ہے۔

اس طریقہ نقشبندیہ عالیہ کے ان بعض کمالات کے اظہار سے مقصود طالبانِ فقر کو اس طریقہ کی طرف رغبت دلانا ہے۔ ورنہ میں اس سلسلہ کے کمالات کی شرح کہاں کر سکتا ہوں۔ مولوی معنی مثنوی شریف میں فرماتے ہیں:

شرح او حیف است بااہلِ جہاں ہمچوں رازِ عشق باید در نہاں

لیک گفتم وصف او تاراہِ برند پیش ازاں کز فوت او حسرت خورند

ترجمہ: اس کی شرح اہلِ جہان کے سامنے کرنا ظلم و ستم ہے۔ جس طرح رازِ عشق پوشیدہ ہی رہے تو بہتر ہے۔ لیکن اس کی صفت اس لئے بیان کر دی ہے تاکہ لوگ اس راہ کو اختیار کریں، اس سے قبل کہ اس کے فوت اور ہاتھ سے نکل جانے کے بعد حسرت اور افسوس کریں۔

آپ کو السلام علیکم اور ان تمام کو جو ہدایت کے پیروکار ہیں۔]

تشریح

سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اور دوسرے سلاسل میں کئی ایک وجوہ سے فرق ہے۔ من جملہ ایک یہ ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ میں نسبت اور ترقی کا اکثر دار و مدار صحبتِ شیخ پر ہے جبکہ باقی سلاسل میں ریاضات وشاقہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور صحبتِ شیخ کی بات بھی خود صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی صحبتِ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے مستفاد ہے۔یعنی جیسے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی صحبت ومجالست سے باطنی ترقی کے اعلیٰ ترین مقامات پر فائز ہوئے بعینہٖ سلسلہ نقشبندیہ کے سالکین بھی شیخ کی صحبت سے عروج ونزول کے مقامات طے کرتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے سلاسل میں مقاماتِ عالی تک پہنچنے کے لئے ریاضت وشاقہ کرنی پڑتی ہیں۔

یہ بات یہاں سمجھنے کے لائق ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کچھ تو ایسے ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ وقت صحبتِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم میں گزارا ہے اور بعض بہت کم عرصہ صحبت میں رہے۔ پس جنھوں نے اکثر وقت محفلِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم میں گزارا، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فضیلت بھی اُن ہی کو بخشی جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جن کا کم وقت حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے ساتھ گزرا، انہیں وہ فضیلت نہ مل سکی۔ البتہ صحابیت میں دونوں برابر ہیں۔ اور یہی حال سلوک طے کرنے والے صوفیاء کا ہے۔ اور صحبتِ شیخ میں کثرت سے موجود رہنے والا سالک جلد ترقی کرتا ہے اور مقاماتِ عالی تک پہنچتا ہے لیکن صحبتِ شیخ پر دُنیا کو ترجیح دینے والا سالک فضیلت وترقی سے محروم رہ جاتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے سلسلہ نقشبندیہ مبارکہ کے سر حلقہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ چونکہ تمام فقہاء کرام، امامانِ دین اور اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد دُنیا کے افضل ترین شخص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اس لئے اُن سے منسوب سلسلہ بھی تصوف کے دیگر سلاسل سے افضل واشرف ہے۔ اور چونکہ شان العلم کی تجلیات سے بطریقِ وراثت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سب سے زیادہ اور کامل واکمل حصہ نصیب ہوا، اس لئے سلسلہ ٔنقشبندیہ کے سالک بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شان العلم کی تجلیات اور فیوض وبرکات حاصل کرتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ نقشبندی سالک کمالاتِ نبوت کا فیض حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اخذ کرتے ہیں اور کمالاتِ ولایت کا فیض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ دونوں نسبتیں ان بڑے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ملی ہیں اور حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان دونوں نسبتوں کے حامل ہیں، اس لئے یہ دونوں نسبتیں صرف سلسلہ ٔنقشبندیہ میں ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سلسلہ میں دو نسبتوں کا ورود ہے تو پھر یہ دونوں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جائیں گی اور اسی طرح تنسیخ لازم آئے گی۔۔۔۔؟

تو اس سوال کا جواب ہم قرآن عظیم الشان سے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دو نسبتیں ہرگز ہرگز ایک دوسرے کو نسخ نہیں کرتیں۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ (۱۹) بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (الرحمٰن ۲۰)

ترجمہ: اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں معلوم ہوں ملے ہوئے، اور ہے ان میں روک کہ ایک دوسرے پر بڑھ نہیں سکتا۔

پس جب ان دو دریاؤں کا پانی ایک دوسرے میں مکس نہیں ہو سکتا تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل کے طفیل یہ دو نسبتیں بھی جاری وساری دریا کی طرح ہیں جن کا فیض الگ الگ جاری ہے اور ایک دوسرے میں مکس نہیں ہوتا اور یہ معرفت جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اس مکتوب میں یہ دلچسپ بات بھی فرمائی ہے کہ مشائخِ نقشبندیہ کی مخصوص دولتِ نسبت سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے دوسرے سلاسل کے چند کامل اولیاء اللہ کو بھی حصہ نصیب فرمایا ہے لیکن وہ بھی مشائخِ نقشبندیہ کے تبرکات کی وجہ سے۔ جیسا کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس سلسلہ کے امام وسرحلقہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جُبہ کے حضرت شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تک پہنچنے کی بات کی ہے۔ اور تصوف سے آگاہی رکھنے والے احباب جانتے ہیں کہ حضرت شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جُبہ مبارک سے حضورِ دائمی کی دولت (جو کہ بالخاصہ مشائخ نقشبندیہ کا حصہ ہے) نصیب ہوئی۔

حضرت شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک بہت مشہور ولی اللہ گزرے ہیں، آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جُبہ شریف وراثت میں پہنچا۔ جب حضرت شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دُنیا سے رُخصت ہونے لگے تو آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے

شاگردوں سے فرمایا کہ میرے اس جُبہ کو اس کے صاحب (یعنی اس کے اہل) کے سپرد کر دینا۔ اور اس کی کیفیت آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس طرح بیان فرمائی کہ اس جُبہ کو ایک اونچی جگہ پر رکھیں اور اس کے ساتھ ایک روٹی کا ٹکڑا بھی رکھ دیں اور فرمایا کہ یہ روٹی کا ٹکڑا اٹھاتے وقت گرم ہو گا، اس کو سیڑھی کے بغیر جس کسی کا ہاتھ پہنچ گیا وہی اس کا مالک ہو گا۔ چنانچہ شاگردوں نے ایسا ہی کیا اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس دنیافانی سے رُخصت ہو گئے، بہت سے لوگ آتے گئے مگر کسی کا ہاتھ وہاں بغیر سیڑھی کے نہ پہنچ سکا۔ بالآخر ایک دن حضرت شیخ احمد جام زندہ پیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آئے جن کا تعلق افغانستان کے شہر ہرات سے تھا اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا روضہ بھی ہرات ہی میں ہے۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ہاتھ اوپر کیا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جُبہ شریف اور روٹی کے ٹکرے کو اٹھالیا۔ سب لوگوں نے اس عطاءِ خداوندی پر آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو مبارکباد دی۔ جب حضرت شیخ احمد جام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے تو آپ کے صاحبزادوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جبہ شریف کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے وراثت میں تقسیم کر دیا جُبہ کے ان ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا چند سال پہلے تک دارالنصرۃ، ہرات میں موجود تھا۔

یہاں سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ تبرکاتِ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام، صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اور مزارات سے فیض لینا نہ صرف ممکن ہے بلکہ عین ثابت ہے۔ لیکن ان سے کماحقہ فائدہ وہی لے سکتا ہے جو راہِ طریقت کا سالک ہو۔

اس بات کی تائید حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم جب حدیث بیان فرماتے تھے تو وہ مجھ سے بھول جاتی تھی، ایک دن حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے مجھے اپنے مبارک کپڑوں سے ایک ٹکڑا عنایت فرمایا تو میں نے وہ ٹکڑا مبارک اپنے سینے سے لگایا۔ اس ذاتِ پاک کی قسم جس نے مجھے پیدا فرمایا اس دن کے بعد مجھ سے کوئی حدیث نہیں بھولی۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے خلفِ رشید قیامِ زمان حضرت خواجہ معصوم قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اپنے مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں کہ جب تک عارف کو فنا حاصل نہ ہو وہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے روضوں سے فیض اخذ نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی مستعمل اشیاء (کپڑے، جائے نماز، ٹوپی اور دستار وغیرہ) سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ مُریدین کو بہت فوائد عطا فرماتا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو اولیاء اللہ فنا وبقا سے مشرف ہوتے ہیں اُن کی مجالس غارِ حرا میں منعقد ہوتی ہیں کیونکہ آقا ومولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اپنی مبارک زندگی کے بہت سے لمحات اسی مبارک جگہ پر بسر کئے ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے فرمان سے معلوم ہوا کہ ولایت کے کئی درجات ہیں جو ایک دوسرے سے بلند وبالا ہیں۔ واضح رہے کہ اس امر پر قرآن وحدیث کے واضح اشارات موجود ہیں اور کتبِ صوفیاء میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔

اربابِ طریقت کے نزدیک ولایت کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ ولایتِ عامہ

جو تمام مؤمنین کو حاصل ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اللّٰہُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (البقرة ۲۵۷)

۲۔ ولایتِ خاصہ

جو متقین (اربابِ سلوک) سے مختص ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ (الأنفال ۳۴)

یہ ولایت عروج ونزول اور فناوبقاسے عبارت ہے اس کی تعریف صوفیاء نے یوں فرمائی ہے:

هِيَ عِبَارَةٌ عَنْ فَنَآءِ الْعَبْدِ فِي الْحَقِّ وَبَقَآئِهٖ۔

عارفِ کامل حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کے ملفوظات میں ولایتِ خاصہ کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں: (اول) وَلایت (بفتح واؤ) (دوم) وِلایت (بکسر واؤ)

وَلایت (واؤ کی فتح (زبر) کے ساتھ) حق تعالیٰ کے ساتھ بندے کے قرب کو کہتے ہیں اور وِلایت (واؤ کے کسرہ (زیر) کے ساتھ) اس صفت کو کہتے ہیں جس کے سبب سے بندہ مخلوق میں مقبول ہو جاتا ہے اور دنیاوالے اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، خوارق وتصرفات اس دوسری قسم میں داخل ہیں اور جو برکات مستعد لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں وہ وَلایت (بالفتح) کا اثر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو ان دونوں قسموں میں صرف ایک قسم حاصل ہوتی ہے اور بعض حضرات کو ان دونوں کا کافی حصہ حاصل ہوتا ہے، اور بعض کو ان دونوں قسموں کی ولایتوں میں سے کسی ایک کا حصہ دوسری سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ مشائخ نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالیٰ پر ہمیشہ وَلایت (بالفتح) کا وِلایت (بالکسر) پر غلبہ رہتا ہے، اور اگر

کوئی مقتدا شخص اس دنیا سے انتقال فرماتا ہے تو وِلایت (بالکسر) کو اپنے کسی مخلص کے لئے چھوڑ جاتا ہے اور وَلایت (بالفتح) کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور کبھی کسی لغزش کی بناء پر وِلایت (بالکسر) کو ولی سے واپس لے لیتے ہیں۔[1]

درجاتِ ولایت

اہل علم کو اللہ تعالیٰ نے مختلف درجات سے نوازا ہے (خواہ علمِ ظاہری ہو یا باطنی)۔

جیسا کہ ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (المجادلة ۱۱)

صوفیاء کرام کے نزدیک ولایت کے دو درجے ہیں۔ اول ولایتِ صُغریٰ، دوم ولایتِ کُبریٰ (بعض نے ولایتِ عُلیا کا بھی ذکر فرمایا ہے)۔ ولایتِ صُغریٰ تو عامۃ المؤمنین وصالحین کو شامل ہے اور ولایتِ کُبریٰ کے چار درجے ہیں۔

پہلا درجہ خُلّت

یہ درجہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔

جیسا کہ قرآن میں ہے:

وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا (النساء ۱۲۵)

دُوسرا درجہ حُب

یہ درجہ محبوبِ خُدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے لئے ظاہر ہوا اور ان کو اللہ تعالیٰ نے حبیب کے لقب سے نوازا۔

[1] (زبدۃ المقامات، مقصد اول، فصل سوم)

جیسا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

اَنَا حَبِیْبُ اللّٰہِ وَلَا فَخْرَ۔[1]

حدیثِ قدسی میں ہے:

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ نُوْرَ مُحَمَّدٍ۔

بلکہ آپ کی تبعیت میں آپ کے غلاموں کو بھی یہ درجہ عطا ہوا جیسا کہ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران ۳۱) سے ثابت ہے۔

تیسرا درجہ ختام

یہ درجہ خاتمیتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ کے ساتھ مخصوص ہے۔

جیسا کہ فرمایا:

وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الأحزاب ۴۰)

یہ مرتبہ ختمِ نبوت سے ختمِ ولایت کی طرف مشعر ہے۔

چوتھا درجہ عبودیت

یہ درجہ عبدیت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ (الإسراء ۱) سے ظاہر ہے۔

نبوت اور ولایت کا باہمی تعلق

واضح رہے کہ سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم تمام کمالاتِ حقیہ وخلقیہ کے مظہر ہیں اور بمطابق حکم فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران ۳۱) کمالات انسانی کا انحصار بھی آپ کی

---

[1] (ترمذ، ج۲، ص ۲۰۲)

اتباع پر موقوف ہے جیسا کہ صحابہ کرام، اہل بیت عظام واولیائے فخام کو تمام کمالات ظاہری وباطنی آپ کی اتباع ہی کے ذریعے میّسر آئے اور آپ ہی کے مشکوٰۃ نبوت سے فیض یاب ہوئے۔

اتباع

اتباع کی دو قسمیں ہیں: متابعتِ ظاہری اور متابعت باطنی ۔ متابعت ظاہری مرتبۂ نبوت سے متعلق ہے اور متابعت باطنی مرتبۂ ولایت سے۔ مرتبۂ نبوت سے ان احکامِ شرعیہ کی طرف اشارہ ہے جو عالمِ وجوب سے بواسطۂ جبریل علیہ السلام سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر نازل ہوئے اور آپ نے خلقِ خدا تک پہنچا دیئے۔ مرتبۂ ولایت سے وہ اسرارِ توحید و معرفت مُراد ہیں جو سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے مقام لِیْ مَعَ اللّٰہِ سے بلاواسطۂ جبریل علیہ السلام (براہِ راست) حق سبحانہٗ وتعالیٰ سے حاصل کر کے خاصانِ اُمت کو سکھا دیئے۔

نبوت کا ظاہر و باطن

واضح رہے کہ نبوت کا ظاہر شریعت ہے اور نبوت کا باطن ولایت ہے۔ ظاہر کو باطن سے اور باطن کو ظاہر سے ایک خاص تعلق کی بناء پر امداد اور پرورش ملتی رہتی ہے۔

نبوت کا باطنی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کامل استغراق وفنائیت کا قوی تعلق قائم ہو جائے، اسی کا نام ولایت ہے۔ نبوت کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ اسی باطنی تعلق کی بناء پر عالمِ قدس سے جو کچھ حاصل ہو وہ خلقِ خدا تک بریق مناسب پہنچا دیا جائے تا کہ بیک وقت خالق و مخلوق دونوں کے ساتھ تعلقات استوار رہیں۔ یہی نبوت ہے، لہٰذا ہر نبی ولی ہوتا ہے، لیکن ہر ولی نبی نہیں ہوتا۔ جبکہ ولایت عروج الی الحق کا نام ہے اور نبوت نزول الی الحق کو کہا جاتا ہے۔

صوفیائے محققین کے نزدیک سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم تمام کمالاتِ حقیہ وخلقیہ کے اصل اور مظہر ہیں اور ساری کائنات کو تمام مراتب کمالیہ آپ کے ہی وجود سے حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا جملہ انبیاء ومرسلین کی روحانیات نے آپ کی ہی روحانیت اخذِ فیضان کیا ہے کیونکہ آپ ہی اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کے شرف سے مشرف ہیں۔

وَکُلُّھُمْ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ مُلْتَمِسٌ غَرْفًا مِّنَ الْبَحْرِ اَوْ رَشْفًا مِّنَ الدِّیَمِ[1]

اور یہ بات بھی محتاجِ دلیل نہیں کہ اولیاء اللہ، انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث اور نائب ہوتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام ہی سے اقتباس فیض کرتے ہیں۔ جس ولی کو جس نبی سے فیض ملتا ہے اس کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ولی فلاں نبی کے قلب پر یا زیرِ قدم ہے۔

ولایتِ انبیاء

یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ ہر اولوالعزم نبی ورسول ایک جداگانہ شانِ ولایت کا مظہر ہوتا ہے اور وہ اپنے ایک معیّن لطیفے سے مقامِ کمال تک پہنچتا ہے، مثلاً آدم علیہ السلام لطیفۂ قلب سے، نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام لطیفۂ روح سے، موسیٰ علیہ السلام لطیفۂ سر سے، عیسیٰ علیہ السلام لطیفۂ خفی سے اور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم لطیفۂ اخفیٰ سے اپنے مقام کمال تک پہنچے ہیں۔ نیز ہر نبی کے لئے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت مربی ہوتی ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کی مُربی صفت التکوین ہے، نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کی مُربی صفت العلم ہے، موسیٰ علیہ السلام کی مُربی صفت الکلام ہے، عیسیٰ علیہ السلام کی مُربی صفت القدرت ہے اور سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی مُربی شان العلم ہے جو صفات سے بلند تر ہے۔

---

[1] (قصیدہ بردہ شریف)

بینہ نمبر ۲

واضح ہو کہ دیگر تمام انبیاء کرام ان ہی انبیائے اولوالعزم کے مشارب میں ان کے ساتھ شریک ہیں اور صفات میں سے کوئی ایک صفت ان کی مربی ہوتی ہے۔ لیکن اولیائے کرام کے لئے صفت کے ظلال مُربی ہوتے ہیں اور ظلال تعلقات صفات اور تمثالِ صفات سے عبارت ہیں۔

بینہ نمبر ۳

حضور ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے لیکن آپ کی تبعیت میں تعلیم و تبلیغ ظاہری و باطنی کے لئے سلسلۂ ولایت تا قیامت جاری و ساری ہے۔ کوئی دور بھی اربابِ ولایت سے خالی نہیں رہا۔ دنیا کے انتظامات اولیاء کرام کے سُپرد ہوتے ہیں جس طرح ملائکہ عظام کو تدبیر امور کی خدمات سُپرد کی گئی ہیں۔ اسی طرح قدرت نے اولیاء اللہ کو تشریعی و تکوینی خدمات و کرامات سے بھی نواز رکھا ہے اور بے شمار کتبِ تصوف میں اولیاء اللہ کے مقامات و مناصب کی تفصیلات و تشریحات مذکور ہیں۔ متعدد احادیث مبارکہ میں بھی ان امور و مناصب کی نشاندہی موجود ہے۔

مناصب و مراتب اولیاء

اولیائے کرام کے درجات و مراتب اور مقامات و مناصب کے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور جن کے خلاف بدعات کے نام سے نفرتیں پھیلائی جاتی ہیں ان کے ازالہ کے لئے احادیثِ مبارکہ سے چند شواہد ہدیۂ ناظرین ہیں:

- حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اَللّآلِئُ الْمَصْنُوْعَةُ میں قریباً بیس کتبِ رواۃ سے ''ابدال'' کی احادیث نقل فرمائی ہیں[1] اور ان احادیث کے رُوات پر جرح کے بعد تمام احادیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔ تمام طُرق احادیث کو جمع کرنے پر ایک قدر مشترک (یعنی ابدال کے وجود کو تسلیم کرنے) پر علماء و مشائخ امت متفق ہیں اس موضوع پر امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام اَلْخَبَرُ الدَّالُ عَلیٰ وُجُوْدِ الْقُطْبِ وَ الْاَوْتَادِ وَ النُّجَبَآءِ وَ الْاَبْدَالِ[2] ہے۔

صوفیاء کی بعض اصطلاحات کی اصل تو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ مثلاً ولی، ابرار، اخیار، نجباء، نقباء، عمد، رجال اور ابدال وغیرہا۔ اسی طرح غوث، قیوم افراد اور اوتاد وغیرہا کی اصطلاحات کتبِ صوفیاء میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

---

[1] (اللالئ المصنوعۃ، ج ۲، ص ۳۳۰ تا ۳۳۲)

[2] (الحاوی للفتاویٰ، ج ۲، ص ۲۴۱ تا ۲۵۵)

علامہ سیوطی علیہ الرحمۃ نے "الخبر الدال" میں اس سلسلے کی چند احادیث نقل فرمائی ہیں:

حدیث اول

عَنْ عبد الله قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فِي الْخَلْقِ ثَلَاثَمِائَةٍ قَلْبُهُمْ عَلَى قَلْبِ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ أَرْبَعُونَ قُلُوبُهُمْ عَلَى قَلْبِ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ سَبْعَةٌ قُلُوبُهُمْ عَلَى قَلْبِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ خَمْسَةٌ قُلُوبُهُمْ عَلَى قَلْبِ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ ثَلَاثَةٌ قُلُوبُهُمْ عَلَى قَلْبِ مِيكَائِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ وَاحِدٌ قَلْبُهُ عَلَى قَلْبِ إِسْرَافِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامِ۔[1]

ترجمہ: حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا خدا تعالیٰ کے تین سو بندے مخلوق ہیں ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت آدم علیہ السلام کے قلب پر ہیں، چالیس ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں، سات ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کی مثل ہیں، پانچ ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت جبرائیل علیہ السلام کے قلب پر ہیں، تین ایسے ہیں جن کے دل میکائیل علیہ السلام کے دل پر ہیں اور ایک ایسا ہے جس کا دل حضرت اسرافیل علیہ السلام کے دل پر ہے۔

اس کے بعد رقم طراز ہیں:

والخطیب مِنْ طَرِيقِ عبيد الله بن محمد العبسي قَالَ: سَمِعْتُ الكناني يَقُولُ: النُّقَبَاءُ ثَلَاثُمِائَةٍ وَالنُّجَبَاءُ سَبْعُونَ وَالْبُدَلَاءُ أَرْبَعُونَ وَالْأَخْيَارُ سَبْعَةٌ وَالْعُمُدُ أَرْبَعَةٌ وَالْغَوْثُ وَاحِدٌ۔[2]

---

[1] (الحاوی للفتاوی، ج ۲، ص ۲۴۷)

[2] (الحاوی للفتاویٰ، ج ۲، ص ۲۵۰)

ترجمہ: خطیب نے بطریق عبید اللہ بن محمد العبسی اس حدیث کا اخراج کیا کہ میں نے کنانی سے سنا ہے کہ نقُباء تین سو ہیں، نجباء ستر ہیں، ابدال چالیس ہیں، اخیار سات، قطب چار اور غوث ایک ہے۔

حدیث ثانی

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ تَخْلُوَ الْأَرْضُ مِنْ أَرْبَعِينَ رَجُلًا مِثْلِ خَلِيلِ الرَّحْمَنِ فَبِهِمْ يُسْقَوْنَ وَبِهِمْ يُنْصَرُونَ۔ قَالَ الْحَافِظُ أبو الحسن الهيثمي فِي مَجْمَعِ الزَّوَائِدِ: إِسْنَادُهُ حَسَنٌ۔[1]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا چالیس آدمیوں سے زمین خالی نہ رہے گی، جو مثل خلیل اللہ کے ہیں، ان کی برکت سے ان پر بارش برسائی جائے گی اور ان کی وجہ سے ان کی امداد کی جائے گی۔

مجمع الزوائد میں ہے کہ اس حدیث کی اسناد حسن ہیں۔

واضح رہے کہ حدیثِ انس کے شواہد متعدد احادیث میں موجود ہیں اور حدیث ابن مسعود کی تفصیل حدیثِ خطیب سے بھی ثابت ہے۔

حدیث ثالث

(وَمِنْهَا خَبَرُ الْبَيْهَقِيِّ) إِنَّ أَبْدَالَ أُمَّتِي لَمْ يَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِالْأَعْمَالِ (وَلَكِنْ) إِنَّمَا دَخَلُوهَا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ وَسَخَاوَةِ الْأَنْفُسِ وَسَلَامَةِ الصُّدُورِ۔[2]

---

[1] (الحاوی للفتاوی، ج ۲، ص ۲۴۵)

[2] (الحاوی للفتاوی، ج ۲، ص ۲۴۸)

ترجمہ: بیہقی شریف کی حدیث ہے۔ تحقیق میری امت کے ابدال اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، نفسوں کی سخاوت اور سینوں کی سلامتی سے داخل ہوں گے۔

بعض اصطلاحاتِ مناصب کا مفہوم

لفظ ولی

حضرت علامہ سید شریف جرجانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ لفظ ولی کے دو معنی ہیں:

(اول) وَلِیٌّ بَرْوَزْنِ فَعِیْلٌ بِمَعْنیٰ فَاعِل۔ یعنی قریب (قرب رکھنے والا) جیسا کہ علیم وقدیر۔

(دوم) وَلِیٌّ بَرْوَزْنِ فَعِیْلٌ بِمَعْنٰی مَفْعُوْل۔ یعنی مُقرب (قریب کیا گیا) جیسا کہ قتیل بمعنیٰ مقتول۔[1]

باعتبار معنیٔ اول "ولی" اللہ تعالیٰ کا قُرب تلاش کرتا رہتا ہے۔ باعتبار معنیٔ ثانی "ولی" کو خود اللہ تعالیٰ اپنے قُرب میں رکھتا ہے۔ اسی طرح حسبِ تصریح مذکور ولی کے معنیٰ "مُحب اور محبوب" کے بھی آتے ہیں۔ غرضیکہ ولی کا تشخص اپنے تمام معانی کے لحاظ سے آیۃ کریمہ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (یونس ۶۲) سے مستفاد وثابت ہے اور جب مرتبۂ ولایت کسی کے لئے ثابت ہوتا ہے تو اپنے تمام لوازمات سمیت ثابت ہوتا ہے۔ اِذَا ثَبَتَ الشَّيْئُ ثَبَتَ بِجَمِيْعِ لَوَازِمِهٖ (وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ)

1 (کتاب التعریفات، ص ۱۱۲)

قُطب

لُغت عرب میں قطب چکی کی میخ (کیلی) کو کہتے ہیں جس پر چکی گردش کرتی ہے، اگر وہ نہ ہو تو چکی نہیں چل سکتی۔ یونہی قُطب کے بغیر نظام عالم بھی نہیں چل سکتا۔ قطب کے سبب ہی دائرۂ وجودِ عالم قائم و محفوظ رہتا ہے اور دنیا میں آثارِ برکات اور ظہورِ حسنات اسی کے دو قدم سے وابستہ ہوتے ہیں۔

اقسام اقطاب

اقطاب کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً قُطب الاقطاب، قطب الوحدت، قطبِ عالم، قطبِ اکبر، قطب الارشاد، قطب الابدال، قطب المدار، قطب اقلیم۔ بعض حضرات نے بارہ اقطاب کے وجود کا قول کیاہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

فرائضِ اقطاب

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز نے اقطاب کے فرائض کے متعلق فرمایاہے:

"قطبِ ابدال واسطۂ وصولِ فیوض است کہ بوجودِ عالم وبقائے آں تعلق دارد، وقطبِ ارشاد واسطۂ وصولِ فیض است کہ بارشاد وہدایتِ عالم تعلق دارد، پس تخلیق وترزیق وازالۂ بلیّات ودفعِ امراض وحصولِ عافیت وصحت منوط بفیوض مخصوصۂ قطبِ ابدال است، وایمان وہدایت و توفیق حسنات وانابت از سیئات نتیجۂ فیوضاتِ قطبِ ارشاد است"۔[1]

---

[1] (معارف لدینہ معرفت، ص ۳۵)

ترجمہ: قطبِ ابدال عالم کے وجود اور اس کی بقاء سے تعلق رکھنے والے امور میں وصولِ فیض کا واسطہ ہوتا ہے، اور قطبِ ارشاد ہدایت وارشاد سے متعلق امور میں وصول فیض کا ایک واسطہ ہوتا ہے۔ اس لئے پیدائش، رزق، مصائب واَمراض کے دور ہونے اور صحت وعافیت کے حاصل ہونے کا تعلق قطبِ ابدال کے فیض کے ساتھ مخصوص ہے اور ایمان وہدایت اور نیکیوں کی توفیق اور گناہوں سے توبہ کا تعلق قطبِ ارشاد کے فیض کا نتیجہ ہے۔

قُطبِ مدار

قطب مدار کے متعلق حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کے تحت حضرت امام ربانی قدس سرہٗ سے حضرت خضر علیہ السلام کا یہ قول نقل فرمایاہے:

و جعلنا الله تعالى معينا للقطب المدار من اولياء الله تعالى الّذي جعله الله تعالى مدارا للعالم جعل بقاءالعالم ببركةوجوده وإفاضته۔[1]

ترجمہ: حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہم کو قطبِ مدار کا معاون بنایاہے جو اللہ تعالیٰ کے ولیوں میں سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے عالم کا مدار بنایاہے اور جس کے وجود کو برکت اور فیض رسانی کی بقاکا سبب بنایاہے۔

---

[1] (تفسیر مظھری، ج٦، ص ٦٢)

غوث

غوث اسمِ مصدر مبنی للفاعل ہے، اس کے معنی ہیں دعا کرنے والا، فریاد کرنے والا، فریادرس، پکارنے والا۔ جیسے غَوْثُ الرَّجلِ وَ اسْتَغَاثَ صَاحَ وَ اَغْوَثَاہٗ۔[1]

اصطلاحِ صوفیاء میں غوث ایسے مستجاب الدعوات انسان کے لئے بولا جاتا ہے جس کی طرف لوگ اضطرار کے وقت دعا کے لئے محتاج ہوں اور وہ اگر کسی بات میں قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کر دیتا ہے۔ غوث اللہ تعالیٰ کے اِذن سے متصرف فی الاکوان والآوان ہوتا ہے۔

قیُّوم

قیوم مخلوق پر تمام انعاماتِ الٰہیہ کا سبب ہوتا ہے، اولوالعزم رسول کا نائب ہوتا ہے، اس کا مخالف اس کے فیض سے محروم ہوتا ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا:

"معاملۂ انسانِ کامل تا بجائے می رسد کہ اُو را قیومِ جمیع اشیاء بحکم خلافت می سازند وہمہ را افاضہ وجود وبقاء وسائر کمالاتِ ظاہری وباطنی بتوسط اومی رسانند"۔[2]

ترجمہ: قیوم انسانِ کامل ہوتا ہے جس کو تمام اشیاء کائنات کا قیوم یعنی خلیفۃ اللہ بنایا جاتا ہے۔ تمام مخلوق کو وجود اور بقاء اور تمام کمالاتِ ظاہری وباطنی اسی کے وسیلے سے پہنچتے ہیں۔

---

[1] (تاج العروس، ج ۱، ص ۶۳۶)

[2] (دفتر دوم، مکتوب نمبر ۷۴)

نیز آپ نے فرمایا:

"این عارفے کہ بہ منصب قیومیتِ اشیاء مشرف گشتہ است حکمِ وزیر وارد کہ مہماتِ مخلوق را باُو مرجوع داشتہ اند"۔[1]

ترجمہ: وہ عارف جو قیوم کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے وزیر کا حکم رکھتا ہے کہ مخلوق کے اہم معاملات کا تعلق اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔

قیُّوم کے دو مفہوم

لفظ قیوم جب ذات باری تعالیٰ جل مجدہ الکریم کے لئے بولا جائے تو اس کا معنیٰ قَائِمًا بِذَاتِہٖ وَمُقَوِّمًا لِغَیْرِہٖ ہو گا، یعنی جو بذاتِ خود قائم ہو اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہو اور یہ لفظ جب کسی مخلوق کے لئے بولا جائے تو اس کا لغوی معنیٰ مراد لیا جائے گا اور اس کی تاویل کی جائے گی یعنی کسی شے کے قیام اور بقا کا وسیلہ وذریعہ۔

صوفیائے کرام نے وضاحت فرمائی ہے کہ قیوم، غوث، قطب الاقطاب اور فرد کامل تقریباً ایک جیسا مفہوم رکھتے ہیں۔ صرف قیوم کی اصطلاح حضرت امام ربانی قدس سرہٗ سے مشہور ہوئی اور آپ نے قیومیت سے خلافت اور وزارت مُراد لی ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے متعلق اور اپنے جانشین عروۃ الوثقیٰ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق منصبِ قیومیت کے عطا ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔

---

[1] (شرح فقہ اکبر، ص ۱۹۳)

ملاحظہ فرمائیں:

"بعد از لمحہ دید کہ بفرزندیِ مرحمت فرمودند وآن خلعت او را ابتمام پوشانیدند واین خلعتِ زائلہ کنایت از معاملہ قیومیت بودہ است کہ بتربیت و تکمیل تعلق داشتہ"۔[1]

یعنی آپ نے واقعہ میں دیکھا تھا کہ آپ کے جسم سے ایک خلعت، لباس جدا ہو گئی اور وہ آپ کے فرزندِ ارجمند خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمۃ کو مرحمت فرمائی گئی، وہ خلعتِ زائلہ معاملۂ قیومیت ہے جو کہ تربیت و تکمیل سے تعلق رکھتا ہے۔ صاحب روضۃ القیومیۃ نے تصریح فرمائی ہے کہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اپنے دستِ اقدس سے قیومِ اول حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے سر مبارک پر دستار مبارک باندھی اور منصبِ قیومیت کی مبارک باد دی۔[2]

اَبدال

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ رقم طراز ہیں:

خصائصِ اُمت محمدی سے ہے کہ اس میں اقطاب واوتاد ونجباء وابدال موجود ہیں۔ حدیث مرفوع میں انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ابدال چالیس مرد اور عورتیں ہیں جب ان میں سے کوئی وصال کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کسی مرد یا عورت کو اس کے بدل میں پیدا کر دیتا ہے۔[3]

---

[1] (دفتر سوم، مکتوب ۱۰۴)
[2] (روضۃالقیومیۃ(مترجم) ص ۱۷۱)
[3] (مدارج النبوۃ(مترجم)، ج ۱، ص ۲۶۱)

بعض مشائخ نے ابدال کی وجہ تسمیہ یہ تحریر فرمائی ہے کہ وہ لوگ جو کدورات بشریّہ سے منقطع ہو کر اپنی صفاتِ ذمیمہ کو صفاتِ حمیدہ سے بدل لیتے ہیں۔

اَبدال چشم خلائق سے پوشیدہ ہوتے ہیں، اولیائے کاملین کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا۔

بینہ نمبر ۴

ابدالانِ حق باذن اللہ نظامِ عالم میں تصرفات فرماتے ہیں اور جب کوئی ان سے مدد طلب کرتا ہے تو وہ امداد اور فیض پہنچاتے ہیں اس کی تائید میں امام شمس الدین جزری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ حدیث نقل فرمائی ہے:

وَاِنْ اَرَادَعَوْنًا فَلْيَقُلْ يَا عِبَادَاللّٰهِ اَعِيْنُوْنِيْ يَا عِبَادَاللّٰهِ اَعِيْنُوْنِيْ۔[1]

یعنی جب کوئی ان سے مدد لینا چاہے تو کہے: "اے اللہ کے بندو میری مدد کرو"۔

واضح ہو کہ بزاز نے اپنی مسند میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس حدیث کو مرفوعًا روایت کیا ہے اور مجمع الزوائد میں ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔[2]

اسی مفہوم کی تائید میں قاضی محمد بن علی شوکانی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی یہ حدیث لکھی ہے:

إذا انفلتت دَابَّة أحدكم بِأَرْض فلاة فلينادِ يا عباد الله احْبِسُوا۔[3]

یعنی جب کسی کا جانور جنگل میں کھو جائے تو اس کو پکار کر یوں کہنا چاہیئے کہ اے اللہ کے بندو اس کو روکو۔

---

[1] (حصن حصین)

[2] (مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۳۵)

[3] (تحفة الذاكرين، ص ۱۵۵، ۱۵۶)

کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جو عالم کو گھیرے ہوئے ہیں تو اُمید ہیں کہ شاید وہ روک لیں۔

اس حدیث کو امام ابو یعلیٰ الموصلی[1] اور طبرانی[2] نے بھی ابن السنی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

استمدادِ اولیاء کا مسئلہ آج کل متنازعہ فیہ بنا ہوا ہے لیکن یہ امر یاد رہے کہ باذن اللہ کے عقیدے کے ساتھ یہ کمالات اولیاء کے لئے ماننا شرک کے زمرے میں نہیں آتا۔ ہاں اگر استقلالِ ذاتی اور بلا اذن اولیاء کے لئے یہ تصرفات مانے جائیں تو یقیناً شرک ہے لیکن ایسا عقیدہ کسی مسلمان کا نہیں ہے۔

حضرت مولانا روم مست بادۂ قیوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں:

شیر مردانند در عالم مدد　　آں زماں کافغان مظلوماں رسد

بانگ مظلوماں زہر جا بشنوند　　آں طرف چوں رحمتِ حق میدوند

آں ستون ہائے خلل ہائے جہاں　　آں طبیبانِ مرض ہائے نہاں

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ تجلی ذاتی میں اسماء وصفات اور شیونات واعتبارات کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہ حجابات ہیں اور تجلی ذاتی میں بے حجاب وصلِ عُریانی نصیب ہوتا ہے اور یہ تجلی ولایتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کے ساتھ مخصوص ہے۔ انبیائے عظام اور اولیائے کرام کو یہ تجلی بہ طفیل سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم تبعًا حاصل ہوتی ہے نہ کہ اصالتًا۔

اسماء وصفات اور شیونات واعتبارات تصوف کی دقیق اصطلاحات ہیں۔

---

[1] (مسند ابو یعلیٰ، ج ۴، حدیث نمبر ۵۲۴۷)

[2] (طبرانی کبیر، ج ۱۰، ص ۲۶۷)

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے بعض مکتوباتِ قدسیہ میں ان کی تعریفات اور ان کے باہمی فرق کو واضح فرمایا ہے۔ تفصیل دفتر اول مکتوب چہارم کی شرح میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں بھی اختصار کے ساتھ چند اشارات نذرِ قارئین ہیں۔

اسماء وصفات اور شیونات واعتبارات کی بحث

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ صفاتِ وجودیہ، حقیقیہ، اضافیہ، صفاتِ سلبیہ اور ان اسمائے حسنیٰ سے موصوف ہے جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ احادیث مبارکہ کے اشارات اور اولیاء کرام کے کشف وشہود سے پتہ چلتا ہے کہ اسماء وصفات کے ظلال بھی ہیں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات انبیاء اور ملائکہ کے مبادئ تعینات (جہاں سے وہ فیض حاصل کرتے ہیں) اور اسماء وصفات کے ظلال (حجابات، لطیفے اور واسطے) باقی مخلوق کے مبادئ تعینات ہیں۔

اسماء وصفات

اسم، اس لفظ یا عبارت کو کہتے ہیں جس سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب اشارہ کیا جائے۔ وہ اشارہ باعتبار اس کی ذات کے ہو، خواہ باعتبار اس کی صفات کے، اسمِ مسمّٰی کی تخصیص کرتا ہے اور صفت موصوف کی حالت بیان کرتی ہے۔

اصل

اسماء کی اصل ربوبیت ہے اور صفات کی اصل الہٰیت، تمام اسماء کا اشتقاق رب سے ہے اور جملہ صفات کا استخراج اللہ اور الٰہ سے ہے۔ اسماء وصفات، ذات کے حجابات ہیں جو جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی، ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ ان حجابات میں مستور اور ان سے وراء ہے۔ جب سالک یا عارف ان حجابات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کا سامنا اسماء وصفات کے نشانات وآثار سے ہوتا ہے اور جب ان سے

آگے نظر بڑھاتا ہے تو وہ ربوبیت اور الٰہیت کی معرفت کے بعد ذاتِ حق وحدہٗ لاشریک کا امتیاز معلوم کرلیتا ہے۔(واللہ اعلم)

اسماءِ حُسنٰی

اسماء وصفات غیر متناہی ہیں، کیونکہ اس کے افعال غیر متناہی ہیں لیکن ان سب کا مرجع اصولِ متناہیہ کی جانب ہوتا ہے، جو تعداد میں ننانوے ہیں، انہیں اسماء حسنٰی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا (الاعراف ۱۸۰)

ترجمہ: اور اللہ ہی کے ہیں بہت اچھے نام تو اسے ان سے پکارو۔

حدیث پاک میں ہے:

إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مِائَةً غَيْرَ وَاحِدٍ مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔[1]

ترجمہ: اللہ تعالٰی کے ننانوے (ایک کم سو) نام ہیں جس نے ان کا احصار کرلیا (ان کے عرفان وشہود سے باطن کو منور کرلیا) وہ جنت میں جائے گا۔

اُمہات اسماء

ان اسماء حُسنٰی کا مرجع آٹھ اصولوں کی جانب ہے، جنہیں اُمہات اسماء کہتے ہیں اور انہیں صفاتِ ثبوتیہ ثمانیہ بھی کہا جاتا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔حیات　　۲۔علم　　۳۔قدرت　　۴۔ارداہ

۵۔سمع　　۶۔بصر　　۷۔کلام　　۸۔تکوین

---

[1] (سنن الترمذی، ج۲، ص ۱۸۹)

اسمِ جامع

واضح رہے کہ جب اسماء وصفات غیر متناہیہ کا مرجع ننانوے اصول متناہیہ کی جانب ہے، جنہیں اسماء حسنیٰ کہتے ہیں۔ اور اسماء حسنیٰ کا مرجع آٹھ امہات اسماء کی جانب ہے تو لازمی طور پر یہ اُمہات اسماء وصفات بھی حقیقتاً ایک ہی اصل کی جانب راجع ہوں گے اور وہ اسم اللہ ہے جو جامع ہے جمیع اسماءالٰہیہ کا اور شامل ہے جمیع صفاتِ الٰہیہ کو۔

اعیانِ ثابتہ واعیانِ ممکنات

اسماء الٰہیہ جن صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں انہیں مظاہر اسماء کہتے ہیں۔ وہ صورتیں یا وہ مظاہر جن میں اسماء علمِ الٰہی میں ظاہر ہوتے ہیں اعیانِ ثابتہ اور صورِ علمیہ کے نام سے موسوم ہیں اور وہ مظاہر جو خارج میں ظاہر ہوتے ہیں اعیانِ ممکنات، وجود عینی اور عالمِ شہادت کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

ذات وصفات

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں:

"ذات آنست کہ قائم بنفسہٖ باشد وصفات قائم بأو"۔[1]

یعنی ذات اس کو کہتے ہیں جو خود اپنے نفس کے ساتھ قائم ہو اور صفات جو اسی ذات کے ساتھ قائم ہوں (لیکن ذات پر زائد ہوں)۔

جمہور علماء متکلمین (اہل سنت) کے نزدیک صفات نہ عینِ ذات ہیں اور نہ غیرِ ذات یعنی لَا ھُوَ وَلَا غَیْرُہٗ ہیں اور یہی فیصلہ صحیح اور واقعہ کے مطابق ہے۔

---

[1] (معارف لدنیہ معرفت، ص ۲۱)

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

اہل حق بوجود صفات قائل شدہ اند و وجود ایشاں را زاید بر وجودِ ذات می دانند حق سبحانہٗ را عالمِ بعلم می گویند و قادر بقدرت می دانند و علیٰ ھذا القیاس و معتزلہ و شیعہ و حکماء بنفیٔ صفات قائل اند۔[1]

ترجمہ: اہلِ حق صفات کے وجود کے قائل ہیں اور ان کے وجود کو ذات کے وجود پر زائد سمجھتے ہیں، وہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو علم کے ساتھ عالم اور قدرت کے ساتھ قادر جانتے ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس اور معتزلہ وشیعہ اور حکماء صفات کی نفی کے قائل ہیں۔

اسی معرفت میں آگے رقم طراز ہیں:

وبعضے از متاخرینِ صوفیاء کہ بوحدتِ وجود قائل اند در نفئ صفات بمعتزلہ وحکماء موافق اند۔

یعنی متاخرین صوفیہ میں سے بھی کچھ حضرات جو وحدت الوجود کے قائل ہیں، صفات کی نفی کے مسئلہ میں معتزلہ اور حکماء کے ساتھ متفقہ ہیں۔

شیونات

تعلقاتِ ذات یا سُبحاتِ وجہ اللہ کے مرتبے کا نام ہے۔ یعنی لاہوت کے ساتھ (جو انکشاف اشیاء کا مبدأ ہے) اشیائے کائنات کے جو اختصاصی تعلقات قائم ہیں ان ہی کو صوفیاء کی اصطلاح میں شیونات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بعض صوفیاء نے مرتبۂ احدیت یا وحدتِ محضہ کے اس جلالی

---

[1] (معارف لدنیہ معرفت، ص ۱۵)

مرتبے (سُرادقاتِ جلال) کو شیونات کا مرتبہ قرار دیا ہے، جس کے انکشاف (حجابات اُٹھنے) پر عالمِ امکان جل کر بھسم ہو جائے، جیسا کہ حدیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم شاہد ہے۔

اس اصطلاح کی اصل آیتِ قرآنیہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن ۲۹) ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا:

شیوناتِ الٰہی فرع اند مر ذات را جلّ شانہٗ۔[1]

یعنی اللہ تعالیٰ شیونات اس کی ذات کی فرع ہیں۔

واضح ہو کہ ہر تجلی کے لئے ایک حکمِ خاص ہے جسے شان کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ جب بندے پر تجلی فرماتا ہے تو اس تجلی کا نام حق کے اعتبار سے شانِ الٰہی رکھا جاتا ہے اور بندے کے اعتبار سے حال یا امر کہتے ہیں۔

اعتبارات

تعینات و تنوعات ذات کے ظہورات کا وہ مرتبہ جو ذات سے منتزع ہو اور اس کا وجود خارجی نہ ہو مرتبۂ اعتبارات کہلاتا ہے، جیسے شعلہ جوالہ کے گھمانے سے دائرے بنتے چلے جاتے ہیں، یہ دائرے اس شعلہ جوالہ کے اعتبارات ہیں۔ یہ مرتبہ عارفوں کے ادراک سے وراء ہوتا ہے اور مرتبۂ ذات کے ساتھ خاص مناسبت رکھتا ہے۔

---

[1] (معارفِ لدنیہ معرفت، ص ۲۰)

بینہ نمبر ۵

سالک کا ظلالِ صفات تک وصول ولایت صغریٰ ہے، اور صفات تک وصول ولایتِ کُبریٰ ہے۔ اور یہ انبیائے عظام کی ولایت ہے اور شیونات تک وصول ولایتِ ملاء اعلیٰ ہے، اور ذات تک وصول مرتبۂ کمالاتِ نبوت ہے۔

صفات، شیونات اور اعتبارات کے درمیان فرق یہ ہے کہ صفات کا وجود خارجی ذات پر زائد ہوتا ہے اور مرتبۂ شیونات مرتبۂ ذات سے منتزع ہے اور وجود خارجی نہیں رکھتا اور مرتبۂ اعتبارات بھی ذات سے منتزع اور وجود خارجی نہیں رکھتا۔ لیکن شیونات اور اعتبارات کے درمیان فرق باعتبار ادراکِ عارف ہے یعنی اگر عارف مشاہدہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ثمانیہ میں سے فلاں صفت مثلاً علم یا قدرت یا مخصوص و معلوم صفت منتزع ہوئی ہے۔ اس کو مشاہدۂ شیونات کہا جائے گا اور اگر عارف معلوم کرے کہ صفاتِ باری تعالیٰ سے کوئی ایک صفت منتزع ہوئی ہے لیکن اس صفت کا تعین عارف کے ادراک میں نہیں آتا اس کو مشاہدۂ اعتبارات کے نام سے پکارا جائے گا۔

واضح ہو کہ مرتبۂ ظلال سے مرتبۂ صفات بلند ہے اور مرتبۂ صفات سے مرتبۂ شیونات افضل ہے اور مرتبۂ شیونات سے مرتبۂ اعتبارات اعلیٰ ہے، کیونکہ اس آخری مرتبے میں عارف ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرتبہ قربِ ذات اور بے کیفی کے سبب سے عارف کے ادراک سے بہت بلند ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں عارف جب ولایتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کے مرتبے میں پہنچتا ہے تو اس مقام میں تمام حجابات وجودی و اعتباری اُٹھ جاتے ہیں اور عارف کو

وصلِ عُریانی حاصل ہو جاتا ہے اور مطلوب کی یافت حقیقی طور پر میسر آجاتی ہے جس میں گمان اور وہم کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ والحمد للہِ علیٰ ذٰلک

ظلال

مذکورہ بالا عبارت کو سمجھنے کے لئے ظلال و حجابات کے بارے میں کچھ وضاحتیں ہدیۂ قارئین ہیں:

عارفین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات انبیاء اور ملائکہ کے مبادی تعینات (جہاں سے فیض اخذ کیا جاتا ہے) ہیں اور اسماء کے ظلال باقی مخلوقات کے مبادی تعینات ہیں۔

ظلال سے مراد سائے نہیں بلکہ ظلال مخلوق کے وہ لطائف ہیں جن کو اسماء وصفات سے پوری مناسبت ہے۔ اور اسی مناسبت کی وجہ سے اسماء وصفات کا فیض مخلوق تک پہنچتا ہے، اسی بناء پر ان لطیفوں اور نسبتوں اور واسطوں کو سمجھنے میں آسانی کے لئے ظلال کہا جاتا ہے۔

حجابات

ممکن ہے کہ ظلال سے مراد وہی حجابات ہوں جن کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے:

حِجَابُهُ النُّورُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهَى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ۔ [1]

حِجَابُهُ النَّارُ لَوْ كَشَفَهَا لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ كُلَّ شَيْءٍ أَدْرَكَهُ بَصَرُهُ۔ [2]

ترجمہ: یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے نور اور نار کے حجابات ہیں اگر وہ اٹھ جائیں تو جہاں تک اس کی نظر جائے اس کے چہرے (ذات) کی تجلیات اس کی مخلوق کو جلا ڈالیں۔

---

[1] (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۹۹، مسند احمد، ج ۴، ص ۴۰۵)

[2] (مسند احمد، ج ۴، ص ۴۰۱)

یعنی اگر وہ حجابات (ظلال) نہ ہوتے تو دنیا اپنی پستیٔ مرتبہ اور ضعفِ استعداد کے باعث اقتباسِ فیض کے لئے غیر صالح ہونے کی وجہ سے ذات کے اسماء و صفات کی تجلیات کے آگے جل کر معدوم ہو جاتی۔

بینہ نمبر ٦

ولایتِ محمدیہ کے مرتبے میں تمام حجابات کے اُٹھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ ظلال کے تمام مرتبے طے ہو جاتے ہیں، اور عارف سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے مبدأ تعین تک رسائی حاصل کر کے ظلال سے گزر کر اسماء و صفات کے مرتبے میں پہنچ جاتا ہے اور بوجہ استعدادِ تامہ اور قابلیتِ جذبِ فیض کے عارف اس مقام کی تجلیات کا متحمل ہو جاتا ہے۔ وَبِاللہِ التَّوْفِیق

اقسامِ حجابات

حجابات کی دو قسمیں ہیں:

حجاباتِ نورانی و حجاباتِ ظلمانی۔

حجاباتِ نورانی سے مراد صفات، شیونات اور اعتبارات کے ظلال ہیں۔

حجاباتِ ظلمانی سے مراد عالمِ امکان اور کدوراتِ بشریہ ہیں۔

حجاباتِ نورانی کی دو قسمیں ہیں:

حجاباتِ وجودیہ و حجاباتِ اعتباریہ

حجاباتِ وجودیہ، ظلال اسماء و صفات ہیں۔

حجاباتِ اعتباریہ ظلال شیونات و اعتبارات ہیں۔

زوال حجابات بھی دو قسم پر ہے:

زوالِ علمی و زوالِ عینی (وجودی)

حجاباتِ نورانی کا زوال، زوال علمی ہے۔ کیونکہ صفات و شیونات درمیان میں رہتی ہیں صرف عارف کے علم و دید سے باہر ہوتی ہیں۔

جیسا کہ ایک عارف نے کہا:

حُسنے تو چناں کرد مرا زیروزبر　　　　کز خال و خطِ زُلف توام نیست خبر

حجاباتِ ظلمانی کا زوال، زوالِ عینی وجودی ہے کہ عالمِ امکان کی کثافتوں اور بشریت کی کدورتوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

وصلِ عُریانی

اس کا لغوی معنی ہے برہنہ وصل (بے پردہ ملاقات) اصطلاح صوفیاء میں وصلِ عُریانی "بدون اعتبار زئد بر ذات مجردہ صرفہ" کا نام ہے، یعنی ذاتِ حق کا ایسا مشاہدہ جس میں کسی اعتبار زائد کا نشان نہ ہو۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ولایتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کے مرتبے میں عارف کو مقصود حقیقی کا وصلِ تحقیقی میسر آتا ہے نہ کہ وصلِ گمانی۔ یعنی ایسا وصل کہ عارف اور ذات کے اسماء وصفات و شیونات کے درمیان نہ حجاباتِ ظلمانی حائل رہتے ہیں اور نہ حجاباتِ نورانی۔

آپ فرماتے ہیں اگر کوئی خوش نصیب اس مقام کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل متابعت ومحبت اختیار کرے اور سنت وشریعت کی پابندی کا خوب اہتمام کرے کیونکہ یہ مقام عزیزالوجود ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "تجلیٔ ذاتی" جو ولایتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اکثر مشائخ طریقت کے نزدیک برقی ہے یعنی یہ تجلی اولاً اور بالذات سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والثناء کو حاصل ہے۔ دیگر جملہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو توسلاً اور تمام اولیاء کرام کو تبعاً اور وراثتاً میسر آتی ہے، اور ولایت کا بلند ترین واکمل ترین درجہ ولایت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کا درجہ ہے۔

ولایتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ

صاحبِ فتوحاتِ مکیہ اور صاحب مرآۃ الاسرار نے ولایت کی چار اقسام بیان فرمائی ہیں اور ولایتِ محمدیہ مطلقہ کو تصرفات صوری ومعنوی کے درمیان جامع اور مقرون بہ خلافت قرار دیا ہے اور فرمایاہے کہ اس کے خاتم حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ چنانچہ اسی جہت سے آپ کا یہ قول نقل فرمایاہے کہ اگر اہلِ کتبِ اربعہ جمع ہو جائیں تو میں ان میں سے ہر ایک کو ان ہی کی کتابوں سے حکم کر سکتا ہوں۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

تجلیٔ ذاتی برقی

صوفیاء کے نزدیک ذاتِ احدیت کے پہلے مرتبۂ ظہور یا بے رنگ اور بے جہت تجلی کو تجلی ذاتی کہا جاتا ہے۔ تجلی ذاتی میں سالک وعارف فانی مطلق ہو کر اپنے علم وشعور اور ادراک سے بے تعلق ہو

کر اپنے آپ کو بلا تعین جسمانی وروحانی اطلاق کے رنگ میں پاتا ہے۔ اور بقا باللہ کے مرتبے پر فائز ہو کر کمالِ توحیدِ عیانی اور وصلِ عُریانی کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔ و باللہ التوفیق

یہ تجلی ذاتی جس کو اکثر مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے برقی کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تجلی ان کے نزدیک دائمی نہیں، بلکہ برق (آسمانی بجلی) کی طرح تھوڑی دیر کے لئے اسماء وصفات کے حجابات عارف کے علم اور اس کی دید وشنید سے باہر ہوتے ہیں اور پھر دوبارہ حائل ہو جاتے ہیں، ایسی حالت میں ان پر حضور ذاتی کم اور غیوبت زیادہ رہتی ہے۔

بگفت احوالِ ما برقِ جہاں است — دَمے پیدا و دیگر دَم نہاں است

تجلی ذاتی دائمی

اکابر مشائخ نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ "تجلی" برقی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ ان کا حضور ذاتی ودائمی ہوتا ہے، غیبوبت وزوالِ حضور کا ان کے نزدیک کوئی اعتبار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کمال اتمام کمالات سے بڑھ کر ان کی نسبت سب نسبتوں سے بالاتر ہے۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ رقم طراز ہیں کہ اکابر نقشبندیہ نے اپنی کتابوں میں اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ ہماری نسبت تمام نسبتوں سے بالاتر ہے وہ نسبت سے حضورِ ذاتی دائمی مراد لیتے ہیں۔

نسبتِ نقشبندیہ

اس نسبت کی بلندی وبرتری کا راز اِنْدِرَاجُ النِّھَایَۃِ فِی الْبِدَایَۃِ ہے، یعنی جذبہ جو دوسرے سلاسلِ طریقت میں انتہاء میں عطا فرمایا جاتا ہے وہ اس سلسلے کے سالکوں کو ابتداء میں ہی دے دیتے

ہیں۔ ان بزرگوں کے نزدیک جذبہ دو قسم پر ہے جذبۂ بدایت اور جذبۂ نہایت اس سلسلے میں جذبۂ بدایت سالک کو ابتداء میں اس لئے دیا جاتا ہے تا کہ طالب جذبہ کی لذت چکھے بغیر مر نہ جائے۔ یہ خواجۂ بلا گرداں حضرت خواجہ شاہ نقشبند بخاری قدس سرہٗ کی طرف سے اپنے مُریدوں کے لئے صدقہ اور خیرات ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں اِنْدِرَاجُ النِّھَایَۃِفِی الْبَدَایَۃِ کی اصطلاح کی اصل یہ ہے کہ یہ سلسلہ خصوصی طور پر طریقِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر قائم ہے۔یعنی اس میں حصولِ فیض کا دارومدار صُحبت اور محبت پر ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی پہلی صحبت میں ہی وہ فیوض وبرکات حاصل کر لیے تھے جو دوسروں (اولیاء کرام) کو انتہاء میں حاصل نہیں ہوتے۔

بینہ نمبر ۷

یہ امر ملحوظ رہے کہ طریقت کے تمام سلاسل عالیہ کی بنیاد عقائد اہل سنت اور اتباعِ صحابہ پر قائم ہے لیکن دوسرے تمام سلاسل کے نزدیک افادہ واستفادہ ریاضت پر موقوف ہے اور حضراتِ نقشبندیہ کے نزدیک یہ دولت صحبت پر منحصر ہے یہی مناسبت اس سلسلے کا خاصہ کہلاتی ہے جو اس کو دوسرے سلاسل سے ممتاز کرتی ہے۔

نسبتِ صدیقیہ

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

اَنَّ وَلَایَتَھُمْ مَنْسُوْبَۃٌ اِلَی الصِّدِّیْقِ الْاَکْبَرْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ۔

یعنی اکابر نقشبندیہ کی ولایت حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب ہے۔

واضح رہے کہ یہ بزرگ دو طریقوں سے اس نسبتِ جامعہ تک پہنچے ہیں۔

اَولاً۔۔۔بطریق حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ثانیًا۔۔۔بطریق حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جبکہ دوسرے سلاسل کے بزرگ صرف سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریق سے واصل ہیں۔

بینہ نمبر ۸

اس مقام پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے کہ جب اکابر نقشبندیہ اور دوسرے تمام طریقوں کے اکابر بھی حضرت سیدنا امام جعفر صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب ہیں تو پھر نقشبندی اکابر کے امتیاز کی وجہ کیا ہے؟ تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نسبتِ صدیقی اور نسبتِ علوی دونوں کے جامع تھے۔ آپ کے وجودِ مسعود میں یہ دونوں نسبتیں جداگانہ شان کے ساتھ ظہور پزیر تھیں اور آپس میں اختلاط و امتزاج نہ رکھتی تھیں۔ جیسا کہ دریائے جمنا و گنگا دونوں اکٹھے بہتے ہیں مگر ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں۔ کَمَا قَالَ اللہ تعالیٰ: مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ (۱۹) بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا یَبْغِیَانِ (الرحمٰن ۲۰)

بینہ نمبر ۹

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اگرچہ دوسرے سلاسل کے بعض کامل مشائخ کو بھی تجلّیٔ ذاتی دائمی کی نسبت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ حصول بھی حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولایت ہی سے مقتبس ہے جیسا کہ حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر قدس سرہٗ کو حضرت سیدنا صدیق

اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جُبہ مبارک پہنچنے سے یہ نسبت حاصل ہوئی تھی، چنانچہ اس جبہ مبارک کا ایک ٹکڑا آج تک دارالنصرت شہر ہرات میں موجود ہے۔[1]

بینہ نمبر ۱۰

جبہ، لباس یا کسی متبرک چیز کے ذریعے القائے نسبت و فیض کا مسئلہ قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کُرتہ مبارک کے مس سے حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آنکھوں کی بینائی واپس لوٹ آئی[2] یا جیسا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اپنا جبہ مبارک حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے بھیج کر انہیں اپنی خصوصی نسبت سے نوازا اور اُمت کے لئے اُن کی دعا کو قبولیت کی سند عطا فرما دی۔[3]

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۴۹ تا ۵۸۳)

اللھم اغفر لکاتبہ و لمن سعٰی فیہ و لو الدیھم و لاساتذیھم و لاھل بیتھم اجمعین آمین یا رب العالمین بحرمت سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ و سلم

---

[1] (شرح مکتوبات قُدسی آیات (شارح مولانا نصر اللہ))

[2] (یوسف ۹۶)

[3] (تاریخ مدینۃ الدمشق، ج ۳، ص ۱۶۹، مشکوٰۃ المصابیح، ص ۵۸۲)

مکتوب نمبر ۲۲

[روح اور نفس کے درمیان وجہ تعلق اور ان کے عروج ونزول اور فنا جسدی وروحی اور ان دونوں بقا اور مقامِ دعوت اولیاء کرام میں سے ذات حق تعالیٰ میں ہی مستہلک اور مستغرق شدہ اور دعوت کی طرف رجوع کرنے والے اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے درمیان فرق کے بیان میں۔۔۔۔ شیخ عبد المجید بن شیخ محمد مفتی لاہوری کی طرف لکھا:]

تشریح

ہر انسان دو چیزوں سے بنا ہوا ہے۔ ایک روح اور دوسرا نفس۔ صوفیاء کرام رُوح کو عالمِ امر اور نفس کو عالمِ خلق کا نام دیتے ہیں۔ اور سلوک میں ان دونوں کی ہی اصطلاح ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ عالمِ امر اور عالمِ خلق کے لطائف پہلے عروج کرتے ہیں اور پھر نزول۔ جس سالک کو عروج ونزول دونوں حاصل ہو جائیں وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ مخلوق کو دعوتِ حق دینے اور ان کے معاملات میں تصرف کرنے کی اہلیت حاصل کر لیتا ہے لیکن جس سالک کے لطائف عروج تو حاصل کر لیں لیکن نزول نہ کر سکیں وہ مستغرق و مستہلک ہو جاتا ہے اور دعوت وارشاد کی اہلیت نہیں رکھتا، اس کو عوام کی اصطلاح میں مجذوب کہا جاتا ہے۔

اب ہم اصل بات کو بیان کرتے ہیں کہ ایک روایت کے مطابق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے رُوح کو جسدِ انسانی سے پچاس ہزار سال پہلے پیدا فرمایا اور تمام انسانوں کی اَرواح سے اپنی ربوبیت تسلیم کروائی۔ اس بات کو قرآن عظیم الشان نے اَلَستُ بِرَبِّکُمۡ کے عنوان سے بیان فرمایا ہے۔

پس اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو اپنا رب مان کر تمام اَرواح مؤمن و مسلمان ہو جائیں۔ تب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انہیں اپنی بندگی کا فریضہ انجام دینے کا اَمر کیا۔ پھر جسدِ خاکی کو پیدا فرمایا جو کہ رُوح کی ضد

ہے۔ کیونکہ رُوح اَمرِ رَبی سے ہے، اور انتہائی لطیف ہے جبکہ جسد کثیف و مکدر ہے۔ پھر رُوح کو جسد میں داخل کر دیا۔ جب رُوح اپنے جسد میں داخل ہو گئی اور اپنی جنس مخالف (نفس) کے ساتھ اختلاط کیا تو اپنے رب سے اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی والا وعدہ بھول گئی اور نفس سے مغلوم ہو کر سرکشی کا راستہ اختیار کر لیا۔ تب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔ تاکہ وہ ان اَرواح کو اپنے رب سے کیا ہوا وعدہ دوبارہ یاد دلائیں۔ پس جن لوگوں کی روحوں کو اپنا وعدہ یاد آ گیا وہ تو فوراً مسلمان ہو گئے اور صادقین کہلائے اور کچھ بد بختی کی راہ چلے اور کفر و سرکشی اختیار کر لی۔

جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سلسلہ ختم ہوا تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مشن جاری رکھنے کے لئے اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کو یہ ذمہ سونپ دیا کہ وہ بھولی بھٹکی مخلوق کی اَرواح کو اپنا وعدہ یاد دلائیں۔ اسی لئے اولیاء اللہ کو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وارث کہا جاتا ہے۔ پس جب سالک عروج ونزول مکمل کر لیتا ہے تو وہ اس ذمہ داری کو نبھانے کی اہلیت رکھتا ہے لیکن جس سالک کو عروج تو ملے لیکن نزول نہ کر سکے، وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے عشق میں مستغرق ہو جاتا ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے یہ مکتوب ایسے ہی دو سالکوں میں فرق و امتیاز کرنے کے لئے لکھا ہے۔

[وہ ذات پاک ہے جس نے نور و ظلمت کو جمع کر دیا۔ اور لا مکانی جہت سے مبراَ کو ممکن شے کے ساتھ جو جہت میں موجود ہے ملا دیا تو نور کے لئے ظلمت کو محبوب بنا دیا، اور نور کو ظلمت پر عاشق کر دیا۔ نور کا ظلمت کے ساتھ کمال محبت کے ساتھ تعلق اور ربط قائم کر دیا، تاکہ اس طرح نور کی جلاء

میں مزید نورانیت پیدا ہو جائے۔ اور ظلمت کے ساتھ پڑوس کے باعث نور کی صفائی درجہ کمال کو پہنچ جائے، جس طرح آئینہ کو جب خوب صاف اور صیقل کرنا اور اس کی لطافت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو اولاً شیشہ پر مٹی ڈالتے ہیں۔ تاکہ مٹی کی ظلمت اس کے ساتھ لگنے سے اس کی خوب صفائی ہو۔ اور کثافت طینی کے تعلق سے اس کی رونق دوبالا ہو۔]

تشریح

نور سے مراد رُوحِ انسانی اور ظلمت سے مراد جسدِ خاکی ہے۔ رُوح بھی لا مکانی ہے لیکن اس کا لا مکانی ہونا اُس طرح نہیں ہے جس طرح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ لا مکان ہے۔ بلکہ رُوح تخلیق شدہ ہے اور اسے عبادت و بندگی کا فرض سونپا گیا ہے۔ روح کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرح لا مکان کہنا کفر ہے۔

اس نورانی مخلوق کی افادیت کے لئے کسی ظلمانی چیز کی ضرورت تھی کیونکہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے شیشہ ایک انتہائی شفاف اور روشن چیز ہے لیکن اس میں انسان کی شکل دیکھنے کا فائدہ تب ہی ہو سکتا ہے جب اس کی ایک طرف سیاہ رنگ لگا دیا جائے۔

ایسے ہی رُوح کی نورانیت کو واضح کرنے کے لئے ایک ظلمانی چیز (جسدِ خاکی) کو پیدا کیا گیا۔ اور روح کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم سے جسم میں داخل کر دیا گیا، پھر رُوح پر جسد کی ظلمت و کدورت اس قدر غالب آگئی کہ رُوح کی نورانیت پوشیدہ ہو گئی اور اس کی وجہ سے قلبِ انسانی بھی اپنے خالق و مالک سے غافل ہو گیا۔ اور چونکہ تصوف کا پہلا قدم قلب سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد رُوح کی باری آتی ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے قلب کی غفلت دور ہو اور اس کو دنیا کی کدورتوں سے پاک و صاف کیا جائے۔

پس اس کا علاج ظاہر و باطن کے طبیب حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے یوں تجویز فرمایا:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: لِكُلِّ شَيْءٍ صِقَالَةٌ وَ صِقَالَةُ الْقُلُوبِ ذِكْرُ اللّٰہِ۔[1]

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے منقول ہے کہ آپ فرماتے ہیں ہر چیز کا (کچھ نہ کچھ) صیقل (صفائی کرنے والا) ہوتا ہے اور دِلوں کا صیقل (صفائی) ذکرِ الٰہی ہے۔

جب قلب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر سے صاف ہو جائے تو پھر یہ فراست میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ مَرْأَةُ الْمُؤْمِنِ۔

ترجمہ: مؤمن کا قلب مؤمن کے لئے آئینہ ہے۔

دوسری جگہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ:

اِتَّقُوْا فِرَاسَتِ الْمُؤْمِنْ اِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ۔

ترجمہ: مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

نفسِ مضمون کی شرح سے قبل روح اور نفس کی حقیقت کے متعلق کچھ مواد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس مکتوبِ اقدس کے مضمون کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ و باللہ التوفیق!

---

[1] (مشكوٰة المصابيح، ج ٢، ص ٧٠٥، الناشر: المكتب الإسلامي - بيروت)

روح کا معنی

روح کا لفظ رِیح سے مُشتق ہے ریح کا معنی ہوا ہے، روح بھی ہوا کی جنس سے ہے۔ قرآن وحدیث سے اس کا نفخ (پھونک) ہونا ثابت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ نفخ ملک، ریح (ہوا) کے معنی میں ہے۔ لفظِ روح ذوات واؤ سے ہے اور اس کا اول مضموم ہے اور یاء کو واؤ سے بدل دیا گیا ہے، لہٰذا اس کی جمع اَرواح آتی ہے اور ریح کی ریاح، روح جسمِ نورانی ہے اور ریح جسمِ متحرک۔

جیسا کہ امام ابو القاسم سہیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے روض الانف میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔

رُوح کی تعریف

روح کی تعریف میں بہت اختلاف ہے۔

علامہ ابن قیم روح کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

أنه جسم مخالف بالماهية لهذا الجسم المحسوس وهو جسم نور أنى علوي خفيف حي متحرك ينفذ في جوهر الأعضاء ويسري فيها سريان الماء في الورد وسريان الدهن في الزيتون والنار في الفحم۔[1]

ترجمہ: بے شک روح ایک جسم ہے جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے اس محسوس عنصری جسم کے مخالف ہے اور وہ جسم نورانی، علوی، ہلکا، زندہ اور متحرک ہے جو بدن کے تمام اعضاء کے جوہر میں نفوذ کرتا ہے اور بدن میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے گلاب کے پھول میں پانی، زیتون میں تیل اور کوئلے میں آگ کا سیر مان ہوتا ہے۔

---

[1] (کتاب الروح، ص ۲۲۴، مطبوعہ بیروت)

امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ نے اہلِ حق کا مسلک یوں بیان فرمایا ہے:

مِنْهُم مَنْ قَالَ الرُّوْحُ غَيْرُ مَوْجُوْدٍ فِيْ دَاخِلِ الْعَالَمِ وَلَا فِيْ خَارِجِهٖ وَغَيْرُ مُتَّصِلٍ فِيْ دَاخِلِ الْعَالَمِ وَلَا فِيْ خَارِجِهٖ وَغَيْرُ مُتَّصِلٍ وَلَا مُنْفَصِلٍ عَنْهُ لٰكِنَّهٗ بِالْبَدَنِ تَعَلُّقُ التَّدْبِيْرِ وَالتَّصَرُّفِ۔[1]

ترجمہ: بعض محققین کا قول ہے کہ روح نہ عالم میں داخل ہے نہ خارج میں نہ داخل میں متصل ہے نہ خارج میں، نہ متصل ہے نہ اس سے منفصل، لیکن بدن انسانی سے اس کا تعلق تدبیر وتصرف کا ہے۔

علمائے متکلمین، صوفیائے محققین، حکمائے اشراقین ومشائین کا یہی مسلک ہے کہ روح جسمِ مادی، غیر فانی، محدث، متجزی، نورانی، لامکانی اور جوہرِ مجرد ہے۔

روح کے مادی، محدث اور غیر فانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قدیم نہیں کہ اس کے لئے ابتداء ہے مگر اس کے لئے انتہاء نہیں یعنی اس کے لئے فناء نہیں۔

جیسا کہ حدیث میں ہے:

خلق الأرواح قبل الأجساد بألفي عام۔[2]

یعنی روحوں کو جسموں سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا گیا اس حدیث سے اس کے لئے حدوثِ زمانی بھی ثابت ہو گیا۔

متجزی ہونے کا معنی یہ ہے کہ جمع و تفرقہ سے متہم ہے جو صفاتِ محدثات سے ہے بفحوائے حدیث نبویہ علٰی صاحبہا الصلوٰۃ اَلْأَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ۔[3] یعنی روحیں جمع کئے گئے لشکر ہیں اور یہ

---

[1] (تفسیر کبیر، ج۵، ص ۴۴)

[2] (کتاب الروح، ص ۴۰۷، مطبوعہ بیروت)

[3] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۴۶۹)

حدیث رد ہے ان صوفیائے وجودیہ کا جو کہتے ہیں کہ روح واحد ہے اور ممکنات اسی کے مظاہر ہیں حالانکہ حدیث کے مطابق ہر روح ایک الگ اور مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ نیز جوہر فرد بھی نہیں کہ حدیث میں کافر کی موت کے وقت روح کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے کہ تَتَفَرَّقُ فِيْ جَسَدِهٖ۔[1] کہ میت کے بدن میں متفرق ہو جاتی ہے۔

نورانی اس لئے کہا گیا کہ یہ عالمِ امر سے ہے اور نفخِ ملائک ہونے کی وجہ سے نور ہے اور فرشتوں سے زیادہ لطیف ہے کہ نفخ شیٔ اس شیٔ سے لطیف ہوتا ہے۔ جیسے انسان کا نفخ اس سے لطیف ہے اور لامکانی کا اطلاق مجازاً ہے۔ روح کی اس کیفیت کو حدیث میں لفظ عمار[2] سے بیان کیا گیا ہے۔

جوہر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ عرض نہیں اور مجرد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کثیف نہیں بلکہ جسمِ لطیف ہے اور اس کی شکل وصورت اس جسم کی شکل وصورت کے عین مشابہ ہوتی ہے جس جسم کی روح ہے اور روح کی جسمیت متعدد احادیث سے ثابت ہے۔

روح کے متعلق موجودہ سائنس کا یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ روح حیات کی ایک ترقی پذیر شکل کا نام ہے۔ اس نظریئے کے مطابق جسم اور روح میں دوئی کا فرق باقی نہیں رہتا۔ جس کے نتیجے میں حیات بعد الممات کا انکار لازم آئے گا۔ دہریت کی بنیاد بھی یہی عقیدہ ہے جو کفرِ صریح اور شرک قبیح ہے۔(وَالْعَیَاذُ بِاللهِ تَعَالٰی)

---

[1] (شرح الصدور، ص ۵٦)

[2] (مواهب اللدنیه، ج ۱، ص ۳۰)

متعلقاتِ مسئلہ روح

بہر حال روح ایک لاہوتی لطیفہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی جُثے میں ودیعت فرمایا ہے وہ ذی شعور اور مدرک الحقائق ہے لیکن خود کیفیت واینیت سے وراء ہے۔ محققین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انسان کی تین روحیں ہیں۔ روحِ نباتی، روحِ حیوانی اور روحِ انسانی۔ انسانی روح کو نفسِ ناطقہ اور نفسِ مدرکہ بھی کہتے ہیں۔

روح کے دو بدن

حضرت خواجہ پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"محققانِ کامل کہ کشفِ ایشان مقتبس از مشکوٰۃِ نبوت است برانند کہ روح رادو بدن است عنصری ومثالی در نشاءِ دُنیا ببدن عنصری تعلق دارد وبعد فسادِ ایں بدن بآں مثالے لطیف ودر حشر باز ببدنِ عنصری تعلق خواہد گرفت وہمہ رامعلوم است کہ بدنِ عنصری در خواب معطل می شود وآں بدنِ دیگر است کہ در خواب دیدہ می شود، دریں حالت روح تدبیر ہر دو بدن می کند والا بدنِ عنصری فاسد شود وروح در عالمِ مثال سیر می کند عجائبِ عالمِ ملکوت را، روح کمل اولیاء در حیات انسلاخ ازیں بدنِ عنصری می تواند کرد کہ آں راانتزاع وانخلاع می خوانند وایں موت اختیاری است کہ بریاضت حاصل می شود"۔[1]

ترجمہ: محققین کامل جن کا کشف مشکوٰۃ نبوت سے نور لیتا ہے، ان کے نزدیک روح کے دو بدن ہیں ایک عنصری اور دوسرا مثالی، ایک روح تو حیاتِ دنیوی میں اس عنصری اور محدود بدن سے متعلق

---

[1] (تحقیق الحق فی کلمۃ الحق (مترجم)، ص ۸۹)

رہتی ہے اور اس بدنِ ظاہری کے فنا ہو جانے کے بعد مذکورہ بدن مثالی میں جو بدن ظاہری کی نسبت لطیف ہوتا ہے منتقل ہو جاتی ہے اور قیامت کے دن بدنِ مثالی (برزخی) سے نکل کر دوبارہ بدنِ عنصری میں آجائے گی۔ سب کو معلوم ہے کہ انسان کا عنصری بدن نیند میں معطل اور بے کار ہو جاتا ہے اور انسان کو خواب میں جو بدنِ انسانی نظر آتا ہے وہ یہ بدنِ عنصری نہیں، بلکہ وہی مثالی بدن ہوتا ہے لہٰذا روح دونوں بدنوں کی تدبیر کرتی ہے ورنہ بدن عنصری فاسد ہو جائے اور روح عالمِ مثال میں عالمِ ملکوت کے عجائبات کی سیر کرتی ہے اور اولیائے کاملین کی روحیں اس بدنِ عنصری سے ذاتی اختیار کے تحت بھی جدا ہو سکتی ہیں۔ اس حالت کو اصطلاحِ تصوف میں انتزاع اور انخلاع (الگ ہونا) کہتے ہیں اور اس قسم کی موت اختیاری ہوتی ہے۔ جس پر مشق وریاضت سے قُدرت واختیار حاصل ہو سکتا ہے۔

دو گروہ

روح کے بارے میں اہلِ تحقیق کے دو گروہ ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ کا مؤقف یہ ہے کہ دراصل روح ایک ہی ہے جسے روح کُل، حقیقتِ محمدیہ، عقل اول، تعین اول، قلمِ اعلیٰ، لوحِ اول، نور اول کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اَرواحِ جزئیہ اسی روحِ کُل سے منعکس ہیں۔

دوسرا گروہ تعدد ارواح کا قائل ہے اور ہر تعین میں علیحدہ روح کا وجود مانتا ہے جو بلا انعکاس ذاتی لطافت کی مالک ہے اور وہ دلیل میں حدیث اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ۔[1] پیش کرتے ہیں۔ (وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب)

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۴۶۹)

اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ اَرواح کی تخلیق اجسام سے پہلے ہوئی یا اجسام کے بعد۔ قرآن وحدیث سے صراحتًا یہی ثابت ہے کہ اَرواح کی تخلیق اجسام سے قبل ہوئی۔

دو مکتبِ فکر

یہ امر طے شدہ ہے کہ رُوح کی صحیح تعریف اور اس کی حقیقت وماہیت کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا ایک مشکل ترین مسئلہ ہے۔ اور فرمان باری تعالیٰ: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (الإسراء ۸۵) کے مطابق ایمان رکھنا ہی حقیقی کامیابی ہے۔ صوفیاء محققین کے ایک گروہ نے روح کی ماہیئت اور اس کے تعین کے بارے میں توقف کو امرِ محمود قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہم ماہیئتِ روح کی دریافت کے لئے مکلف ہی نہیں پھر اس پر غور وخوض کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ ہم قرآن وسنت کے مطابق وجودِ رُوح کا اقرار کر لیں۔

دوسرا گروہ حکمائے مغرب کا ہے ان میں کچھ لوگ تو سرے سے روح کے قائل ہی نہیں۔ ان کے نزدیک انسان صرف جسدِ عُنصری کا نام ہے جس میں اعضاء و قویٰ کی ترکیب و تنظیم کے ساتھ زندگی کا سلسلہ قائم وجاری ہے۔ اس سے زیادہ وہ انسان کی کوئی حقیقت تسلیم نہیں کرتے، یہی وہ باطل خیال ہے جس سے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی نفی ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض نے روح کی حقیقت پا لینے کا دعویٰ بھی کیا ہے جبکہ ان کی تحقیق کا انحصار سائنسی اور مادی اصولوں پر ہے جس میں ناکامی یقینی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ روح ہمزاد ہی کو کہتے ہیں۔ ان کا خیال بھی باطنِ محض ہے کیونکہ روح عالَمِ امر سے ہے اور ہم زاد ناری اور جناتی حقیقت کا نام ہے۔ آج کل یورپ میں حاضراتِ ارواح کے مراکز بھی قائم ہیں جہاں روحوں کو بلاتے اور ملاقاتیں کرواتے ہیں، یہ بھی ایک

خوش فہمی ہے ممکن ہے کہ ہم زاد سے کام لیتے ہوں یا عالمِ ناسوت کے شیاطین و ارواحِ سفلیہ خبیثہ کا کرشمہ ہو۔(واللہ اعلم)

یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ صوفیائے عارفین میں کچھ حضرات ایسے بھی گزرے ہیں جو حضرتِ روح کی ماہیّت سے آگاہ ہیں (گو اس بارے میں ان کا علم قلیل اور اجمالی ہی ہو) یہ حضرات ریاضت و مجاہدات اور مراقبات و مکاشفات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشفِ سرائر کی توفیق پاتے ہیں، اور انسانوں کو حیرت میں ڈال دینے والے علوم کا اظہار فرماتے ہیں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۸۷ تا ۵۹۳)

[تو اس نور کو پہلے جو شہودِ قدسی حاصل تھا یہ اس کو بھول گیا۔ بلکہ اپنے معشوق ظُلمانی میں استغراق اور ہیکل جسمانی کے ساتھ تعلق کی وجہ سے یہ نور اپنی ذات اور توابع وجود کو بھی فراموش کر گیا۔ اور اس کے ساتھ صحبت اور ہم نشینی کے باعث اصحاب مشئمہ میں سے ہو گیا۔ اور اس کی مجاورت اور پڑوس کی وجہ سے اصحاب میمنہ کی کرامات کو بھی ضائع کر گیا۔ تو اگر اسی استغراق کی تنگی میں پڑا رہا، اور فضاء اطلاق کی طرف نہ نکلا تو اس پر افسوس اور بہت افسوس، کیونکہ اسے مقصود میسر نہ آسکا اور اپنی استعداد کا جوہر ضائع کر دیا۔ تو دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ اور اگر نیکی اس کی طرف سبقت کر کے آگئی۔ اور اعلیٰ درجے کی عنایت اس کے شامل حال ہو گئی۔ اور اس نے سر اٹھالیا۔ اور جس کو گم کر چکا تھا پالیا اور یہ کہتے ہوئے الٹے پاؤں لوٹ آیا:

الیک یامنیتی حجی و معتمری ان حج قوم الی ترب و احجار

ترجمہ: اے میری آرزو! میرا حج اور عمرہ تیری ہی طرف ہے۔ اگرچہ دوسرے لوگ خاک اور پتھروں کی عمارت کی طرف حج کو جاتے ہیں۔]

تشریح

اصحاب میمنہ سے مراد دائیں ہاتھ والے یعنی نیک لوگ اور اصحابِ مشئمہ سے مراد بائیں ہاتھ والے یعنی گنہگار لوگ۔ یعنی نیک اور گنہگار سب لوگوں کی رُوحیں نورانی اور نیک تھیں، ان سب کی روحوں نے عالمِ قدس کا مشاہدہ کیا تھا مگر اس رُوح نے انسان کے بدن میں اتنی انس والفت پیدا کی کہ وہ عالمِ قدس کو بھول گئی۔ یہ روح بھی برے لوگوں کی ہم نشینی میں رہ کر اُن کی طرح ہو گئی حالانکہ روح کی اصل نورانیت، پاکی اور شفافیت تھی۔ اس شخص پر افسوس صد افسوس جس کی روح قلب (جسم) کی تاریکی میں ڈوبی رہی اور اپنے مالکِ حقیقی کی طرف لوٹ کر نہ جا سکی۔

ہم لوگ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے فرائض کو کیوں ادا کرتے ہیں۔ ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد ورزش کرنا نہیں ہوتا بلکہ ہمارا مقصد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے ہم کلام ہونا اور اس کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح روزہ بھی ہم اس لئے نہیں رکھتے کہ ہمیں کھانا پینا میسر نہیں ہوتا یا ہم بچت کرتے ہیں بلکہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہم اس لئے نہیں کھاتے پیتے کہ یہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا حکم ہے ہم اس کو راضی کرنے کے لئے روزہ رکھتے ہیں تاکہ ہم پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں اور ہمیں تقویٰ نصیب ہو۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرة۱۸۳)

ترجمہ: اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر فرض ہوئے تھے کہ کہیں تمہیں پرہیز گاری ملے۔

اسی طرح اگر کوئی حج کے لئے صرف اس لئے جائے کہ میں مکہ معظمہ کے پتھروں کا طواف کرنے کے لئے جاتاہوں تو اس شخص سے حج کا اصل مقصد فوت ہو گیا۔ کیونکہ ہم مکہ معظمہ میں اپنے محبوب کی تلاش اور اُس کی رضا کے لئے جاتے ہیں کہ وہ ذاتِ پروردگار ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے میں ہمارا مقصد لوگوں کو یہ دکھانا نہیں ہوتا کہ میں بہت مال ودولت تقسیم کرتا ہوں بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا حکم بجالاناہوتا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جائے۔ یعنی انسان کے سب اعمال صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کے لئے ہوتے ہیں۔

[اور اگر احسن طریقہ پر مطلوب مقدس کے مشاہدہ میں دوبارہ استغراق حاصل ہو گیا۔ تو اس وقت ظلمات نور کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور نور کے غالب انور میں درج ہوتی ہے۔ جب یہ استغراق اس حد کو پہنچتاہے کہ اپنے ظلمانی تعلق کو بالکل فراموش کر دیتی ہے اور ایسا شخص اپنے نفس اور اس کے توابع وجود سے بھی کلیۃً بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور نور الانوار کے مشاہدہ میں ہلاک ہو جاتاہے اور پردوں کے پیچھے کے مطلوب کا حضور نصیب ہو جاتا ہے تو فنا جسمانی اور روحانی سے مشرف ہو جاتا ہے۔]

تشریح

تصوف میں داخل ہونے سے قبل انسان کی روح مغلوب ہوتی ہے اور نفس وشیطان اور جسدی تعلقات اس پر غالب ہوتے ہیں۔ جب انسان کسی شیخِ کامل ومکمل سے بیعت کرتاہے اور صحبت سے فیوض وبرکات حاصل کرتاہے۔ تو اس کی سابقہ حالت میں تبدیلی رونماہونے لگتی ہے، اور روح غالب ہونے لگتی ہے نفس اور جسد مغلوب ہو جاتے ہیں، پہلے نفس کی خواہشات یہ ہوتی ہیں کہ مال ودولت زیادہ ہو۔ عیاشی وفحاشی کی محافل ہوں اور ہر ایک پر اس کا حکم جاری ہو۔ لیکن جب روح قوی ہو کر غلبہ

حاصل کرتی ہے تو نفسانی خواہشات کمزور پڑ جاتی ہیں۔ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ صوفیاء کرام اور اولیاء کرام کا نفس مر جاتا ہے اور ان کی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں جبکہ حقیقت یوں نہیں ہے۔ اولیاء کرام کی ارواح قویٰ ہو جاتی ہیں اور نفس کمزور پڑ جاتا ہے تو قلبِ حقیقی کو قوت ارادہ اور روح کو اس قدر تقویت مل جاتی ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور نفس کی غلامی سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور خواہشاتِ نفسانی کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر کسی وقت خواہشات سر اٹھائیں بھی تو صوفی **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** اور **و لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** سے انہیں دفع کر دیتا ہے۔ ایسے سالک کو مشاہدے کی دولت نصیب ہوتی ہے اور وہ فنا پر مشرف ہو جاتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

نفس کا معنی اور وجہ تسمیہ

نفس کا لغوی معنی ہے "وجودِ شئ" یعنی کسی چیز کی ذات یا اس کے وجود کو نفس کہا جاتا ہے۔ لفظ نفس نفاست سے ہے یا تنفس سے، اگر نفاست سے ہو تو اس کا معنی ہے نفیس اور لطیف۔ تو نفاست اور لطافت کی وجہ سے اس کو نفس کہتے ہیں۔ اگر تنفس سے ہو تو اس کا مطلب ہے "سانس کا آنا جانا" تو سانس کے آنے اور جانے کی وجہ سے اس کو انفس کہا جاتا ہے، اگر نفس سے مراد روح لی جائے تو یہ اس معنی میں درست ہو گا کہ نیند کی حالت میں روح جسم سے نکل کر چلی جاتی ہے اور بیداری کی حالت میں واپس لوٹ آتی ہے۔ لیکن اصطلاحی طور پر نفس سے مُراد اخلاقِ ذمیمہ کی وہ کیفیات ہیں جو فطری اور خلقی ہیں۔ مثلاً حسد، بُخل، تکبر، غیبت اور کذب وغیرہا۔

نفس سے مراد ایک ایسا لطیف وجود ہے جو اخلاقِ ذمیمہ کا مورد و مصدر ہو جیسا کہ کان سننے کا، ناک سونگھنے کا اور زبان چکھنے کا مرکز و مصدر ہے۔ اسی طرح نفس اخلاقِ ذمیمہ و عاداتِ رذیلہ کا لطیف اور روحانی محلِ اتصاف ہے، نفس کا یہ مفہوم قرآن سے ثابت ہے: **إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ (یوسف ۵۳)** یعنی نفس برائیوں کا حکم دینے والا ہے۔ نفس کی اس تشریح سے روح کے متعلق بھی یہ نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اخلاقِ حمیدہ اور اعمالِ صالحہ کا نورانی محلِ اتصاف ہے اور ان کا مرکز و مورد و مصدر ہے۔ اور اس استدلال کی بنیاد یہ حقیقت تسلیم کی جاسکتی ہے کہ قرآن پاک میں کسی جگہ بھی بدی یا گناہ کو روح کی جانب منسوب نہیں کیا گیا۔ **واللہ اعلم بالصواب**!

اقسامِ نفس

صوفیائے کرام کے نزدیک نفس عالمِ خلق کے لطائف میں سے ایک لطیفہ ہے جس کا مقام جسم انسانی میں وسط پیشانی یا ناف کے متصل ہے، جو نفس عاداتِ سلفیہ سے مغلوب ہو اس کو نفسِ امارہ کہتے ہیں۔ **إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ (یوسف ۵۳)** جو نفس ریاضت و مجاہدہ کے نور کی برکت سے معصیت پر ملامت کا اظہار کرتا ہو اس کو نفسِ لوامہ کہتے ہیں۔ **وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیامۃ ۲)** جو نفس مُزکی و مطہر ہو کر صلاح و فلاح کے اعلیٰ مراتب پر فائض ہو جاتا ہے اس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔ **يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۲۷) ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر ۲۸)**

ابلیس اور نفس

عرفاء کے نزدیک ابلیس، نفس کی جہت، جلالت و ضلالت کا مظہر ہے اور اسے انسانوں پر نفس ہی کی وساطت سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ شیاطین، ابلیس ہی کی اولاد ہیں، انسانوں کو گمراہ کرنے میں ابلیس ایک خاص فن اور مہارت کا حامل ہے لیکن اس کے برعکس نفس بلا کا ضدی اور ہٹ دھرم

واقع ہوا ہے۔ اسی لئے شیاطین الجن سے شیاطین الانس زیادہ خطرناک قرار دیئے گئے ہیں۔ لیکن چونکہ نفس کی اصل خراب نہیں، اس لئے ہدایت کی معمولی سی تحریک سے اس کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ نفس کی یہ وہ خاصیت ہے جو ابلیس کو حاصل نہیں، چنانچہ اسی بناء پر جمہور علماء روح اور نفس کے اتحاد کے قائل ہیں۔

روح اور نفس حقیقتِ واحدہ ہیں

اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ نفس اور روح حقیقت واحدہ ہیں یا مختلفہ، جمہور علماء کے نزدیک روح اور نفس ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، ان میں تغایر باعتبار صفات کے ہے نہ کہ باعتبار ذات کے، باعتبار اولیت کے روح ہے اور باعتبار بغدیت کے نفس ہے، یعنی نفخِ ملک (فرشتے کا ماں کے پیٹ میں پھونکنا) کے وقت تو روح ہے لیکن کسبِ معصیت کے وقت اس پر نفس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام ابو القاسم سہیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے روض الانف میں بحث فرمائی ہے۔

اور کتاب الروح میں علامہ ابن قیم نے صراحتاً ذکر کیا کہ:

اِنَّ النَّفْسَ وَالرُّوْحَ مُسَمَّاهُمَا وَاحِدٌ وَهُمُ الْجَمْهُوْرُ۔ [1]

یعنی نفس اور روح کا مصداق و مسمّٰی واحد ہے اور جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔

اس امر کی دلیل قرآن حکیم سے ثابت ہے:

اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا (الزمر ۴۲)

ترجمہ: اللہ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی موت کے وقت۔

اس آیت میں نفس سے مراد روح ہے، اور روح پر ہی لفظ نفس کا اطلاق ہے۔

---

[1] (کتاب الروح، ص ۴۸۸)

اس کی دوسری دلیل حدیث لَیْلَةُ التَّعْرِیْس ہے:

قَالَ بِلَالٌ یَا رَسُولَ اللّٰہِ أَخَذَ بِنَفْسِي الَّذِي أَخَذَ بِنَفْسِکَ۔[1]

دوسری حدیث میں ہے:

فَقَالَ رَسُوْلَ اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم: إِنَّ اللّٰہَ قَبَضَ أَرْوَاحَنَا۔[2]

ترجمہ: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میری روح کو اسی ذات نے پکڑا جس نے آپ کی روح کو پکڑا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے ہماری روح کو قبض کر لیا۔

ملاحظہ فرمائیں! کہ جس چیز کو حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نفس سے تعبیر کرتے ہیں، اسی چیز کو سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم روح سے تعبیر فرماتے ہیں، تطبیق کی یہی صورت ہے کہ روح اور نفس کو حقیقت واحدہ مان لیا جائے۔ (واللہ الموفق)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۹۴ تا ۵۹۶)

[اور اس فنا کے بعد اس مشہود کے ساتھ بقا بھی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے لئے فنا و بقا کی دو جہتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔]

تشریح

ولایت کے ابتدائی اور درمیانے مرحلہ میں ولی کو صرف فنا کی دولت ہی نصیب ہوتی ہے لیکن جو ولی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل و مکمل اتباع کرتا ہے، دنیاوی تعلقات کو سکیڑ کر محدود کر لیتا ہے اور مباحات کا دائرہ بھی اپنے لئے تنگ کر لیتا ہے تو اسے فنا کے

---

[1] (موطا امام مالک، ص ۹)

[2] (موطا امام مالک، ص ۱۰)

ساتھ بقا کی نعمت بھی عطا کر دی جاتی ہے۔ اور بقا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کی ولایت زائل نہیں ہوتی اور نتیجتاً اس کے جسدِ خاکی کو مٹی نہیں کھا سکتی بلکہ وہ قبر میں صحیح سالم رہتا ہے اور دنیا کو فیض پہنچتا رہتا ہے۔

روایت ہے کہ ۵۹ ہجری میں جب مدینہ منورہ میں نہر کھودنے کے لئے چند شہداء احد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی قبروں کو کھولا گیا تو اُن سب کے جسم مبارک تر و تازہ تھے ان میں سے بعض شہداء نے اپنے زخموں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے جب ہاتھوں کو وہاں سے اٹھایا جاتا تو تازہ خون بہنے لگتا اور جب ہاتھوں کو دوبارہ زخموں پر رکھا جاتا تو خون بند ہو جاتا۔

اور چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اعلیٰ درجے کے فانی و باقی اولیاء کرام تھے اس لئے ثابت ہوا کہ جیسے اُن کے جسم عرصہ دراز گزرنے کے باوجود صحیح و سالم تھے اسی لئے باقی اُمت کے اولیاء کرام کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔

[اور اس وقت ہر ولایت کا حال درست ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت اس کا حال دو باتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو بالکلیہ دائماً مشہود میں استغراق اور استہلاک ہو جاتا ہے یا مخلوق کو خدا کی طرف دعوت دینے میں مصروف ہو جاتا ہے۔]

تشریح

سالک دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک کو مستغرق یا مستہلک کہا جاتا ہے اور دوسرا دعوت الی اللہ دینے والا۔ مستغرق وہ ہوتا ہے جو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے عشق میں محو ہو نہ تو اُسے دنیا کا دھیان ہو اور نہ مخلوق کی طرف متوجہ ہو۔ ایسے سالک کو مجذوب سالک کہا جاتا ہے۔

جبکہ دوسرا سالک وہ ہوتا ہے جو مقاماتِ عالیٰ کی طرف عروج کرکے واپس نزول کرتا ہے اور اپنے آقا ومولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا وارث بن کر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی شریعت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے اور ایسے سالک کو سالک مجذوب کہا جاتا ہے۔ان دونوں قسم کے سالکوں میں سے قُرب، مجذوب سالک کا حصہ ہے اور فضیلت سالکِ مجذوب کا نصیب ہے۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پہلے قسم کے سالک ہیں اس لئے اُن کے کسی مُرید کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ خود مشاہدہ میں مستغرق تھے اور مخلوق کی طرف کچھ توجہ نہیں فرمائی۔ جبکہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت علی اور دوسرے خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم دوسری قسم کے سالک ہیں اسی لئے انہوں نے دین کی بہت زیادہ خدمت کی ہے اور یہ باریک بات بھی ذہن نشین کرلیں کہ پہلی قسم کے سالک مقامِ ولایت سے جبکہ دوسری قسم کے سالک مقامِ نبوت سے فیض حاصل کرتے ہیں۔اسی لئے ان کی فضیلت زیادہ ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

خلاصہ ٔمکتوب

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ زیرِ نظر مکتوب اقدس میں روح اور نفس کے باہمی تعلق کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ذاتِ باری تعالیٰ سبحانہٗ نے اپنی قدرت کاملہ سے نور اور ظلمت، مکانی اور لامکانی کو جمع کردیا ہے۔یعنی روح کو جو کہ نور اور لامکانی ہے نفس کے ساتھ جو کہ ظلمت اور مکانی ہے، آپس میں اس طرح ملادیا ہے کہ نور (روح) کو ظلمت (نفس) کا عاشق بنادیا ہے اور نفس کو

روح کا محبوب و معشوق بنا کر باہمی اتصال و مجاورت کے ذریعے روح کی جِلا اور چمک میں اضافہ کر دیا ہے۔ کیونکہ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　　　چمن زنگار ہے آئینہ ٔبادِ بہاری کا

جیسا کہ آئینہ ساز گرد آلود آئینے میں صفائی اور لطافت پیدا کرنے کے لئے اس کو خاک آلود کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ظلمتِ ترابیہ کی رگڑ سے شیشے کی صورتِ نورانیہ ظاہر ہو جاتی ہے، پس جب حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا ہوا کہ روحِ انسانی کو اپنے قرب وارتقاء کی منزلوں پر فائض کیا جائے تو اس ذاتِ حق تعالیٰ نے جسموں سے پہلے روحوں کو پیدا کر کے ان کو فوق العرش یعنی عالمِ امر (لامکان) میں قیام بخشا اور ان کی توجہات کو عالمِ قدس (مرتبہ ٔوجوب) کی جانب مبذول کر دیا۔ لیکن چونکہ روحوں کو ذات کے مزید قُرب ووصال کی تمنا تھی اور کمالِ قُرب ووصال کو اللہ تعالیٰ نے مجاہدے اور ریاضت پر موقوف کر رکھا تھا اور عالمِ قدس (عالمِ اَمر) مجاہدے کی مشقتوں اور کلفتوں سے پاک تھا، بنابریں اللہ تعالیٰ نے روح کو عالمِ امر کی نورانیتوں سے نکال کر عالمِ خلق میں انسانی بدنوں کی ظلمتوں میں داخل کر کے نفس کی مخالفت پر مامور کر دیا حتیٰ کہ روح اپنے معشوقِ ظلمانی (نفس) میں فنائیت واستغراق کی وجہ سے اپنے شہودِ قدسی (اپنی نورانیت ولامکانیت) کو فراموش کر کے اصحاب یمین (دائیں جانب والوں) سے نکل کر اصحابِ شمال (بائیں جانب والوں) میں شامل ہو گئی۔

حضرت بو علی قلندر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اسی بناء پر روح کو خطاب فرماتے ہیں:

چند باشی از مقامِ خود جدا　　　　چند گردی در بدر اے بے حیاء

چنانچہ اگر روح اسی معشوقِ ظلمانی (نفس) کے استغراق میں باقی رہ کر فنائیت مطلقہ تک نہ پہنچی تو اس کے لئے یقیناً ہلاکت اور بربادی ہے کیونکہ وہ اپنے وطن اصلی سے دور رہ کر اپنی استعداد وصلاحیت

کے جوہر کو ضائع کر رہی ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں انبیاء و اولیاء کو اپنی طرف دعوت دینے کا فریضہ سونپا اور لوگوں کو ان کے وطن اصلی کی یاد دلانے کا حکم دیا۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

ہر کسے کہ دور ماند از اصل خویش　　　باز جوید روزگارِ وصل خویش

چنانچہ اہل سعادت کی روحیں انبیاء و اولیاء کی دعوت پر اپنے وطنِ اصلی کی طرف عروج کر جاتی ہیں اور صالحین و مقربین کا مقام حاصل کر لیتی ہیں اور اہلِ شقاوت کی روحیں دعوت سے اعراض و انکار کر کے اپنے معشوقِ ظلمانی یعنی نفس کی قید میں رہ کر فاسق و فاجر اور عاصی و کافر کا خطاب پاتی ہیں۔

روح نے بدنِ انسانی میں داخل ہونے کے بعد معشوقِ ظلمانی (نفس) میں فنا ہو کر اپنے وطنِ اصلی (لامکان) کو فراموش کر دیا تھا۔ ذکرِ لطائف اور شیخِ کامل کی توجہات کی وجہ سے جب روحِ انسانی بیدار ہو کر عالمِ قُدس کی جانب پرواز کرتی ہے تو نفس کو بھی اپنے ساتھ عروج کراتی ہے اور سیر عروجی کے ذریعے نفس کو مطمئنہ بنا دیتی ہے۔ چنانچہ نفس مزکّٰی و مطہر ہو کر نزول کرتا ہے اور روح مزید کمالاتِ قرب حاصل کرنے کے لئے عروج کرتی ہے۔ اس طرح یہ دونوں اپنے اپنے مقاماتِ اصلیہ و کمالاتِ عَلیّہ پر پہنچ کر عروج و نزول نفسی (جسدی) وروحی سے مشرف ہو کر فنا و بقائے نفسی وروحی سے شادکام ہو جاتے ہیں۔

روح کے بدن میں استغراق کی دو قسمیں ہیں۔ اگر روح اپنے وطنِ اصلی کو مکمل طور پر فراموش کر دے اور کچھ بھی یاد نہ رکھے تو ایسے لوگوں کو طائفہ ناسیاں کہتے ہیں اور اگر روح اپنے وطنِ اصلی کو بالکل فراموش نہ کرے تو ان کو طائفہ سابقاں کہا جاتا ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۹۶ تا ۵۹۸)

[اس طرح کہ اس کا باطن تو خدا کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کا ظاہر مخلوق کے ساتھ۔ اس وقت نور اس میں پائی جانے والی ظلمت سے خلاصی پا جاتا ہے اور مطلوب کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اس خلاصی کے باعث وہ اصحابِ یمین میں سے ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ہاں اگرچہ یمین و شمال کچھ بھی فی الحقیقۃ نہیں ہے۔ پھر بھی یمین اس کے حال و کمال کے زیادہ مناسب و اولیٰ ہوتا ہے کیونکہ یہ جہتِ خیر کا جامع ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کے یمین و شمال یمن و برکت دونوں میں مشترک ہیں جیسا کہ واجب تعالیٰ عزشانہٗ کی شان میں واقع ہو چکا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ یمین ہیں اور یہ ظلمت اس نور سے مقامِ عبادت اور ادائے طاعت کے مقام میں اُتر آتی ہے اور نور لا مکانی سے ہماری مراد روح ہے بلکہ اس کا خلاصہ اور ظلمت جو جہت سے مقید ہے اس سے نفس مراد ہے۔ اسی طرح باطن سے روح اور ظاہر سے نفس مراد ہے۔

اگر کوئی یہ شبہ پیش کرے کہ اولیاء مستہلکین (ذات حق میں مستغرق) کو بھی اس عالم کا شعور ہوتا ہے اور ان کی بھی اس جہاں کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اور وہ بھی اپنے بنی نوع سے خلط ملط اور میل جول رکھتے ہیں تو پھر استہلاک اور عالمِ قدس کی طرف دائمًا بالکلیۃ توجہ رہنے کے کیا معنی ہیں اور ان اولیاء مستہلکین اور دعوت و ارشاد کے لئے رجوع کردہ اولیاء کرام کے درمیان کیا فرق ہوا؟

تو ہم اس شبہ کے جواب میں کہتے ہیں کہ استہلاک اور بالکلیۃ توجہ نفس کے انوار روح میں درج ہونے کے بعد نفس اور روح کی توجہ سے عبارت ہے۔ جیسا کہ اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے اور جہاں اور اس جیسی چیزوں کا شعور حواس، قویٰ اور جوارح سے ہوتا ہے جو نفس کے لئے بمنزلہ تفصیل ہیں تو ان اولیاء مستہلکین کا مجمل اور خلاصی یافتہ باطنی حصہ تو مطالعہ شہود کے اندر انوار روح کے ضمن میں مستہلک و فانی ہوتا ہے اور ان کی تفصیل شعور سابق پر ہی باقی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فتور

لاحق نہیں ہوتا۔ بخلاف ان اولیاء کرام کے جو دعوت وارشاد کی خاطر جہان کی طرف رجوع کیئے ہوئے ہیں، کہ ان کا نفس مطمئنہ ہونے کے بعد دعوت کے لئے انوار روح سے نکل آتا ہے اور اسے اس وقت اس عالم سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس مناسبت کے سبب اس کی دعوت مقامِ اجابت میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ بات کہ نفس درجہ اجمالی میں ہے اور حواس وغیرہ درجہ تفصیل میں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس کا تعلق قلب صنوبری سے ہے۔ اور حقیقت جامعہ قلبیہ کے واسطے سے روح کا تعلق اس سے ہے۔ اور روح کی طرف سے وارد ہونے والے فیوض اولاً نفس پر وارد ہوتے ہیں۔ پھر اس سے تفصیل کے ساتھ قویٰ اور جوارح تک پہنچتے ہیں۔ تو ان حواس و قویٰ کا اجمالی طور پر خلاصہ نفس میں موجود ہوتا ہے لہٰذا اس تحقیق سے دونوں قسم کے اولیائے کرام کے درمیان فرق ظاہر وواضح ہو گیا۔

اور یہ بات بھی جاننے کے لائق ہے کہ پہلا گروہ اربابِ سُکر میں سے ہے اور دوسرا اصحابِ صحو میں سے۔ شرافت پہلے کو حاصل ہے اور فضیلت دوسرے کو۔ پہلا مقام ولایت کے مناسب حال ہے اور دوسرا نبوت کے مناسب حال۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کرامات اولیاء سے مشرف کرے اور کمال متابعت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ثابت قدمی نصیب کرے، آمین

کاتب الحروف اگرچہ عجمی ہونے کی وجہ سے عربی جیسی چاہیئے نہیں جانتا۔ لیکن چونکہ آپ کا مکتوب شریف عربی میں تھا، تو اس طرف سے بھی آپ کے طریقۂ املا پر ہی تحریر کر دیا گیا۔ سلام ہے مُہرِ کلام۔]

تشریح

قلب کی دو اقسام ہیں، ایک قلبِ صنوبری ہے اور دوسرا قلبِ نوری یا قلبِ حقیقی۔ قلبِ صنوبری اس قلب کو کہتے ہیں جو گوشت کا ٹکڑا ہے اور انسان کی مٹھی جتنی جسامت رکھتا ہے اور قلبِ نوری کا گویا برتن یا گھر ہے۔ اس کا تعلق نفس کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب روح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے اوامر کو اخذ کرتی ہے اور مشاہدہ حق کرتی ہے تو اس مشاہدے میں قلبِ نوری (قلبِ حقیقی) بھی شریک ہوتا ہے۔ قلبِ نوری فیوضات وبرکات لے کر قلبِ صنوبری کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور قلبِ صنوبری اُن کو جوارح (اعضاء) کی طرح بھیج دیتا ہے۔ جب تک روح انوارات و تجلیات کو اپنے معنوی برتن میں جمع نہ کرے اس وقت تک جوارح گناہوں کی طرف مائل رہتے ہیں اور جب انوارِ الٰہی روح اور قلبِ حقیقی پر وارد ہونے لگیں تو ان کی برکات سے جوارح گناہوں سے دور ہونے لگتے ہیں اور سالک کی زندگی پاکیزہ ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ عظام اپنے مریدین کو عالمِ امر اور عالمِ خلق کے لطائف طے کروانے کے بعد مراقبات کی اجازت عنایت کرتے ہیں۔

مراقبہ سے مراد ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت اور فیوض وبرکات کا انتظار کرنا۔ یہ برکات روح کے برتن میں جمع ہوتی ہیں اور روح ان کو جوارح کی طرف منتقل کر دیتی ہے اور پھر سالک کے سارے اعضاء نیکی کے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ جبکہ آج کل لوگ مراقبہ اس لئے کرتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں کا حال معلوم ہو جائے یا قبروں میں مُردوں کے حالات سے آگاہی ہو جائے حالانکہ یہ فرقہ اشراقیہ کا عمل ہے اور فرقہ اشراقیہ کافر ہے۔ پس اس نیت سے مراقبہ کرنا شرک ہے اور ہمارے مریدین کے لئے اس نیت سے مراقبہ کرنا منع ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

اولیائے مستہلکین و مرجوعین

جب نفس مطمئنہ ہو کر فنا و بقا سے مشرف ہو کر اپنے مبدأ فیض تک پہنچ جائے تو اس وقت ایسے شخصِ صادق پر لفظ ولایت کا اطلاق صادق آتا ہے۔

ولی دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا تو عالمِ قدس میں اس کا استغراق و استہلاک (عروج) دائمی ہو گا یا دعوتِ خلق کے لئے رجوع (نزول) ہو گا۔

اگر نفس اور روح کا استغراق و عروج دائمی ہو گا اور نزول نہ ہو گا تو وہ اولیائے مستہلکین میں سے ہو گا اور اگر نفس نزول کرے اور روح عروج میں رہے تو ایسا شخص اولیائے مرجوعین میں سے کہلائے گا۔

اولیائے مستہلکین کے استغراقِ دائمی کا یہ مفہوم نہیں کہ ان کا رابطہ اور تعلق مخلوق سے منقطع ہو جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کا روح اور نفس مشاہدۂ محبوب میں مصروف رہتا ہے اور ان کے حواس و جوارح (جو تفاصیلِ نفس ہیں) مخلوق کے ساتھ رہتے ہیں۔ جبکہ اولیائے مرجوعین کا نفس حصولِ اطمینان کے بعد نزول کر کے مخلوق سے ایک قسم کی مناسبت پیدا کر لیتا ہے اور روح بدستور عروجی منازل طے کرتی رہتی ہے۔

حواس و جوارح انسانی کو تفاصیل نفس کہنے کی حکمت یہ ہے کہ نفس اور قلبِ صنوبری (مضغۂ گوشت) آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہ دونوں عالمِ خلق سے ہیں اور قلبِ صنوبری (مضغۂ گوشت) حقیقتِ جامعہ (قلبِ صنوبری) کے ساتھ ظرفیت و مظروفیت کا تعلق رکھتا ہے اور قلبِ نوری، روح کے ساتھ خاص مناسبت کا حامل ہے کیونکہ یہ دونوں عالمِ امر کے لطیفے ہیں۔ مبدأ فیاض

(ذات حق) سے تمام فیوض وبرکات اولاً روح پر وارد ہوتے ہیں اس کے بعد روح سے قلبِ نوری پر اور قلبِ نوری سے قلبِ صنوبری پر اور وہاں سے نفس پر پھر بواسطۂ نفس حواس وجوارح تک پہنچتے ہیں اور چونکہ حواس وجوارح کا خلاصہ نفس میں موجود ہے اس لئے ان کو تفاصیل نفس کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ادراکِ حواس کے مسئلے میں علمائے معقول کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک حواس مُدرِکِ نفس ہیں اور بعض کے نزدیک حواس صرف آلۂ ادراکِ نفس ہیں۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے فرمان اور مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک حواس مُدرِکِ نفس ہیں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۵۹۹ تا ۶۰۰)

مکتوب نمبر ۲۳

[پیر ناقص سے طریقہ اخذ کرنے سے روکنے اور اور اس کے نقصان وضرر اور اہلِ کفر سے مشابہ القاب سے منع کرنے کے بیان میں۔۔۔ عبد الرحیم المشہور بخانِ خاناں کے خط کے جواب میں ان کی طرف ارسال کیا گیا:

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں اور تمہیں ایسی قیل و قال سے نجات دے جو حال سے خالی ہے اور علم سے بھی نجات عطا فرمائے جو عمل سے محروم ہے۔ بحرمۃ سید البشر جو ہر کالے اور گورے کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ علیہ وعلیٰ آلہٖ من الصلوٰۃ افضلہا ومن التسلیمات اکملہا۔ اور اللہ تعالیٰ اس بندے پر بھی رحم فرمائے، جو اس پر آمین کہے۔

باسعادت وباصداقت برادر نے تمہارا خط پہنچایا۔ اور زبانِ ترجمان سے تمہاری جانب کا حال نقل کیا جو نقل کیا تو میں نے یہ شعر پڑھا:

اھلا لسُعدیٰ والرسول وحبّذا   وجہ الرسول لحبّ وجہ المرسل

ترجمہ: اے سعدیٰ (معشوقہ) اور اے اس کے قاصد! تم اپنے اہل میں تشریف لائے ہو۔ اور تمہاری طرف سے آنے والے قاصد کا چہرہ کس قدر حسین ہے۔ کیونکہ روانہ کرنے والے کا چہرہ بڑا محبوب ہے۔]

تشریح

اس مکتوب میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ کسی ناقص پیر سے بیعت نہ کی جائے۔ دوسری یہ کہ قیل و قال کرتے وقت اپنی زبان پر قابو پاکر رکھنا چاہیئے سُکر کی حالت میں ہو یا صحو کی حالت میں۔ تاکہ اس کی زبان سے اس طرح کے الفاظ صادر نہ ہوں، جو اُسے دائرۂ کُفر میں داخل کردیں۔

علماء کرام ومشائخ عظام کو چاہیئے کہ لوگوں کو اچھی باتوں کی نصیحت کرنے سے پہلے خود عمل کریں۔ کیونکہ اگر خود عمل نہ کیا اور دوسرے کو تلقین کرتے رہے تو یہ عمل قرآن عظیم الشان کے سراسر خلاف ہو گا کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (۲) كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (الصف۳)

ترجمہ: اے ایمان والو کیوں کہتے ہو وہ جو نہیں کرتے، کتنی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو۔

پس مشائخ کو چاہیئے کہ وہ اپنی زندگیوں کو شریعت کا عملی جامہ پہنائیں تاکہ وہ اپنے مریدین کے لئے نمونہ بن سکیں اور ان کی نصیحت اور قیل و قال سے لوگوں پر اثر ہو۔

پیر و مرشد کئی طرح کے ہوتے ہیں ایک تو ناقص پیر ہے، جس کی بحث آگے آرہی ہے۔ اور ایک پیر وہ ہے جو زندیق ہو۔ اور زندیق بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ جو خود زندیق ہو لیکن اس کی زندیقیت دوسرے کے لئے خطرے کا باعث نہ ہو۔ اسے زندیق لازمی کہا جاتا ہے۔ دوسرا زندیق متعدی کہلاتا ہے اور یہ وہ ہوتا ہے جو خود بھی زندیق ہو اور اپنے قول و فعل سے دوسروں کو بھی زندیق بنادے۔ ایسا شخص بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اور اس کی توبہ بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بارگاہ میں قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ توبہ کرلے تو خود تو بری حرکات سے بچ جائے گا لیکن اس سے متاثر ہونے والے دوسرے زندیق تو اسی گمراہی کا شکار رہیں گے اور ان کے گناہوں اور غلط عقائد میں یہ برابر کا شریک رہے گا اس لئے اس کی توبہ اسے کچھ فائدہ نہ دے گی۔

ناقص پیر وہ ہوتا ہے جس کے باطن میں نقص ہو۔ اور نقص سے مراد یہ ہے کہ اُس نے کسی شیخ کامل سے بیعت تو کی ہو اور شیخ کے ہاتھ پر توبہ کرکے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف رجوع کرلیا ہو لیکن

اپنی بد بختی کی وجہ سے مشائخ کرام کے راستے اور تعلیمات پر کاربند نہ رہا ہو اور شریعت کی خلاف ورزی کر رہا ہو۔ جس کی وجہ سے اس کا سلوک بھی نامکمل ہو۔ چونکہ ایسے شخص کے باطن میں خرابی موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب رہتا ہے اس لئے ایسا شخص تصوف کی تعلیمات پھیلانے اور لوگوں کو اپنا مرید بنانے کی لیاقت نہیں رکھتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا اور لوگ اُس سے بیعت کریں گے تو یہ اُن کی اخلاقی اور باطنی تربیت نہیں کر سکے گا اور اس کی صحبت اُن لوگوں کے لئے زہر قاتل ہوگی اس لئے ایسے شخص سے بیعت کرنا نہ صرف فائدہ سے خالی ہے بلکہ دینی و دنیاوی نقصان کا باعث ہے۔ہاں اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل اس کے شامل حال ہو جائے اور وہ توبہ کر کے سلوک کے مراحل طے کر لے تو اس بد بختی سے نکل سکتا ہے لیکن ایسے پیروں کے لئے توبہ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے کیونکہ توبہ کے بعد دنیاوی لذتوں سے تعلق توڑنا پڑتا ہے اور دُنیا سے منہ موڑنا دشوار کام ہے۔

شیخِ کامل کی پہچان

شیخ کامل (کامل پیر) وہ ہوتا ہے جس نے خود کسی کامل شیخ سے بیعت کر کے جذبہ و سلوک کے مقامات طے کئے ہوں اور شریعت غرّاً محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی مکمل تابعداری کرتا ہو۔ ایسا ہی شخص ولی اللہ کہلانے کا مستحق ہے اور یہی وہ پیر ہے جو مریدین کی استعداد سے واقفیت رکھتا ہے۔ یعنی اُسے پہلی صحبت میں ہی مُریدین کے بارے میں آگاہی ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کون سا مُرید سلوک کے راستے کا اہل ہے، اور کون جذبہ کے راستہ سے تعلق رکھتا ہے اور پھر ایسا کامل پیر اپنے مُریدین کی مختلف استعدادوں کے مطابق اُن کی باطنی تربیت کرتا ہے۔ لیکن ایسا شخص بالخصوص دورِ حاضر میں تلاشِ بسیار سے ہی مل سکتا ہے کیونکہ ایسے وجود نادر ہیں۔ ہر کس وناکس کامل ہونے کا مدعیٰ نہیں ہو سکتا۔

مریدین بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک سلوک والے اور دوسرے جذبہ والے۔ اور جذبہ والے مُرید بہت کم ہوتے ہیں۔ سلوک والے مُرید توبہ کے بعد لطائفِ عشرہ کو اپنے شیخ کی توجہات سے مکمل کر کے ولایت حاصل کرتے ہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی مکمل پیروی کر کے بلاواسطہ اخذِ فیض کی قابلیت پیدا کر لیتے ہیں لیکن جذبہ والا سالک (جو کہ مادرزاد ولی ہوتا ہے) جب تک کسی شیخِ کامل سے مقاماتِ سلوک کو طے نہ کرے بلاواسطہ اخذِ فیض نہیں کر سکتا۔ چونکہ ایسے صوفی کا جذبہ قوی ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی کیفیات کا شہودی مشاہدہ کرتا ہے۔ ان دو قسم کے سالکوں میں قُرب اور کیف وسُرور تو جذبہ والے کا حصہ ہے لیکن فضیلت سلوک والے کا نصیب ہے اور اس کی دلیل اور مثال یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی صحبت میں کمالاتِ نبوت کے فیوض وبرکات سے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے وافر حصہ حاصل کیا۔ اور سلوک کے مقاماتِ عالیہ کو طے کر کے واصلِ بحق ہوئے۔ اسی لئے سارے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں فضیلت ان دو کے لئے مسلم ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ جذبہ والے تھے اور مادرزاد ولی اللہ تھے اس لئے اُن کو کمالاتِ ولایت سے مستفید کیا گیا لیکن فضیلت میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے آگے نہ بڑھ سکے۔

سلوک والے مریدین مقامات کو نفی اثبات تک طے کرتے ہیں لیکن جذبہ والے صوفی کی انتہاء مراقبات تک ہوتی ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

یہ مکتوب مرزا عبد الرحیم خانخاناں کے ایک مکتوب کے جواب میں صادر ہوا۔ جس میں شیخ ناقص سے طریقہ اخذ کرنے کی ممانعت اور شیخِ کامل سے ملازمت وصحبت کی ترغیب کا بیان ہے۔ نیز

اہلِ کُفر کے مشابہ القاب رکھنے پر سخت مذمت فرمائی گئی ہے۔مکتوب گرامی کی ابتداء ایک دعائیہ مصرع سے ہے:وَیَرْحَمُ اللّٰہُ عَبْدًا قَالَ اٰمِیْنَا۔یہ مصرع دراصل مجنوں کے ایک شعر کا ہے۔اس سلسلہ میں یہ قصہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ مجنوں کا باپ اس کو حرم بیت اللہ شریف میں لے گیا اور غلافِ کعبہ اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ اب دعا مانگ کہ لیلیٰ کی محبت تیرے دل سے نکل جائے۔

چنانچہ مجنوں نے دعا میں یہ شعر پڑھا:

یَا رَبِّ لَا تَسْلُبْنِیْ حُبَّهَا اَبَدًا وَیَرْحَمُ اللّٰہُ عَبْدًا قَالَ اٰمِیْنَا

یعنی اے اللہ! لیلیٰ کی محبت کو اب تک میرے دل سے دور نہ فرما اور رحم کر اس شخص پر جو میری اس دعا پر آمین کہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۲۰۳، ۲۰۴)

[اے ظہورِ کمالات کے لائق برادرِ عزیز! اللہ تعالیٰ تمہیں قوت سے فعل کی طرف لائے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔تو اس شخص پر افسوس جس نے اس میں کچھ نہ بویا اور زمینِ استعداد کو خالی رکھا اور تخمِ اعمال کو ضائع کر دیا۔

اور یہ بھی جاننا چاہیئے کہ زمین کو ضائع کرنا اور خالی رکھنا دو طرح پر ہے۔ایک یہ کہ اس میں کچھ نہ بوئے۔دوسرا یہ کہ اس میں خبیث اور ردی تخم ڈالے۔بیج ضائع کرنے کی یہ دوسری قسم ضرر و فساد میں پہلی قسم سے بہت زیادہ ہے،جیسا کہ مخفی اور پوشیدہ نہیں۔اور بیج کی خرابی اور فساد یہ ہے کہ انسان پیر ناقص سے اخذ طریقہ کرے اور اس کے راستہ پر چلے کیونکہ پیر ناقص اپنی خواہشِ نفس کا تابع اور پیرو کار ہوتا ہے۔اور جس چیز میں خواہش اور ہوائے نفسانی کی آمیزش ہو وہ مؤثر نہیں ہو سکتی۔اور اگر اثر کرے گی بھی تو خواہش نفس کی ہی معاونت کرے گی۔تو اسی طرح تاریکی پر تاریکی میں اضافہ ہو گا۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ پیرِ ناقص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تک پہنچانے والے راستوں اور نہ پہنچانے والے راستوں میں تمیز وفرق نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ خود اب تک غیر واصل ہے۔ نیز یہ پیر ناقص طالبوں کی مختلف استعدادوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور جب طرق جذبہ (سیر انفسی) اور طریقِ سلوک (سیر آفاقی) میں تمیز نہیں کر سکتا تو عین ممکن ہے کہ ایک طالب کی استعداد طریق جذبہ سے مناسبت رکھتی ہو اور ابتدائے حال میں طریق سلوک سے مناسبت نہ ہو، اور پیر ناقص طرق مختلفہ اور استعدادات مختلفہ میں تمیز نہ کر سکنے کی وجہ سے ابتداً سے طریقہ سلوک پر چلا دے، تو طالب کو بھی گمراہی میں ڈال دے۔ جس طرح خود گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔

پس شیخِ کامل، کامل کرنے والا جب اس طالب کی تربیت کا ارادہ کرے گا، اور اسے راہِ عرفان پر چلانا چاہے گا تو اولاً اسے پیر ناقص کی پیدا کردہ خرابی اور پیر ناقص کے سبب پیدا شدہ فساد کی اصلاح کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد اس کی زمینِ استعداد کے مطابق صالح اور مناسب بیج ڈالے گا تب جا کر اچھے پودے اگیں گے۔

مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اِجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ۔

ترجمہ: خبیث وردی کلمہ کا حال خبیث اور ردی درخت کی طرح ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ لیا گیا ہو، اس کے لئے کوئی قرار واستحکام نہ ہو۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔

ترجمہ: اور اچھے کلمے کا حال اچھے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوط اور ثابت ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوں۔

پس کامل، کامل بنانے والے شیخ کی صحبت کبریتِ اَحمر (سُرخ گندھک) ہے۔ اس کی نظر دوا اور اس کی باتیں شفا ہیں۔ اور اس کے بغیر تو خاردار درخت پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں

اور تمہیں شریعتِ مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیہ کے طریقہ پر قائم اور ثابت رکھے۔ کیونکہ متابعت شریعت ہی اصلِ کار اور مدارِ نجات، مناطِ سعادت ہے۔

فارسی میں کیا ہی اچھا کہا گیا ہے:

محمد عربی کابروئے ہر دو سراست

کسیکہ خاک درش نیست خاک بَر سَرِ اُو

ترجمہ: محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم جو دُنیا اور آخرت دونوں کے سردار ہیں۔ جو شخص آپ کے دروازے کی خاک نہیں بننا چاہتا اس کے سر پر خاک پڑے (وہ ذلیل ونامُراد ہو)۔

ہم اس مقالے کو حضور سید المرسلین کی صلوات پر ختم کرتے ہیں۔ آپ پر تسلیمات، تحیات اور برکات کا نزول ہوتا رہے۔]

تشریح

ہر چار سلاسلِ طریقت (قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ) کے مشائخِ کبار رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے سلسلہ کے لئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم سے اذکار متعین کئے ہیں اور سالکینِ طریقت کی باطنی اصلاح اور وصل کے لئے ان ہی اذکار کو ضروری قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں ذکر کا طریقہ کار بھی وضع فرما دیا ہے تاکہ بعد میں آنے والے مشائخ اور سالکوں کے لئے کوئی امر مخفی نہ رہے۔ اور تجربہ طویل اور مشاہدہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں اور ثابت ہو چکی ہے کہ اُن مشائخ کی تعلیمات پر چل کر ہی سالک واصل باللہ ہوئے ہیں اور جنہوں نے اُن تعلیمات کے خلاف کیا وہ تکمیل نہ پا سکے۔ پس ضروری ہوا کہ اُن ہی اذکار ووظائف کو ان کے وضع شدہ طریقہ کے مطابق کیا جائے تاکہ سلوک کی منازل طے ہو سکیں۔

یہ بات بھی جان لیں کہ شیطان انسان کا کھلا دُشمن ہے اور وہ کبھی یہ بات گوارہ نہیں کرتا کہ کوئی شخص اولیاء کرام کے مجرب طریقہ ہائے سلوک پر عمل کر کے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دوستوں کے زمرے میں شامل ہو اور نجاتِ اُخروی حاصل کرے۔ اس لئے وہ ہر حیلہ بہانے سے لوگوں کو علمائے حق اور مشائخ کرام کے طریقوں سے ہٹانے کے لئے دن رات کوشش میں لگا رہتا ہے۔ جہاں اُس کے دیگر ہتھکنڈے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ وہیں اُس کی ایک خباثت یہ بھی ہے کہ وہ کشف (کشفِ شیطانی) اور خواب کے ذریعہ سالکوں کو نئے نئے ذکر اور نئے طریقے سکھا کر طے شدہ راستے سے ہٹا دیتا ہے اور بے علم سالک ایسے کشف وخواب کو اپنی بزرگی سمجھ کر اس پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں وہ کیفیات نظر نہیں آتیں جو ہم نے کتابوں میں پڑھی ہیں۔ پس ضروری ہے کہ سلوک سے پہلے حصولِ علم کا فرض ادا کیا جائے اور مشائخِ طریقت کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تاکہ سلوک سے کماحقہ فائدہ حاصل کیا جاسکے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مشائخِ کرام کی تعلیمات کے مطابق سلسلۂ نقشبندیہ میں ذکرِ خفی کا طریقہ مروج ہے جبکہ سلسلۂ قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ میں لطائف کے ساتھ ذکرِ جہر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ نقشبندی کو ذکرِ جہر منع ہے اور یوں ہی قادری، چشتی اور سہروردی کے لئے جہر ضروری ہے اور ذکرِ خفی منع۔

پس اس طریقہ کو اپنانا چاہیئے اور مشائخِ طریقت کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔ یوں ہی اس دور کے مشائخ کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے وضع کردہ طریقہ کے مطابق اپنے مریدین کو چلائیں اور انہیں طریقت کی خلاف ورزیوں سے منع کریں۔ اگر مریدین کی تربیت نہ ہو سکے تو انہیں اندھیرے میں رکھنے کی بجائے کم از کم صحیح سمت کی طرف رہنمائی کر دیں۔

آج کل کے سالک مشائخِ کاملین کے طریقوں کو ضروری ہی خیال نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم مشائخِ کبار کی ارواح اور ان کی قبروں سے بلا واسطہ فیض اخذ کرتے ہیں حالانکہ یہ بات بھی خلافِ تصوف ہے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو پھر ہر دور میں اولیاء اللہ کی ضرورت باقی نہ رہتی اس لئے کہ ارواح قدسیہ سے فیض لینا اپنے شیخ کے توسط سے ہی ممکن ہے۔ لہٰذا شریعت حقہ کی اتباع کے ساتھ ساتھ مشائخِ طریقت کی تعلیمات پر عمل از حد ضروری ہے اور اس کے بغیر خاردار درخت پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

امام ربانی قدس سرہٗ السبحانی نے مرزا عبدالرحیم خانخاناں علیہ الرحمۃ کے لئے ایک دُعائیہ کلمہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں جو کمالاتِ ولایت بالقوت رکھے ہوئے ہیں ان کو بالفعل ظاہر فرمائے، تاکہ آپ کی استعداد و قابلیت عملی طور پر سامنے آجائے پھر دعا کے بعد ایک حدیث شریف کے مفہوم کی طرف توجہ دلائی کہ اَلدُّنْیَامَزْرَعَةُالْاٰخِرَةِ۔[1] (دُنیا آخرت کی کھیتی ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جسم انسانی تخمِ ولایت کی کھیتی ہے۔ اس شخص پر افسوس ہے کہ جس نے کھیتی میں فقر وولایت کا بیج نہ بویا، اعمالِ صالحہ کا پانی نہ دیا اور اس کی استعداد کو ضائع کر دیا۔

شیخ ناقص و شیخ کامل کی پہچان

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ زمین کی استعداد کو ضائع کرنا دو طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ زمینِ استعداد میں کچھ نہ بویا، دوسرے یہ کہ خراب اور فاسد بیج بو دیا، اور کچھ نہ بونے سے خبیث اور فاسد تخم بو دینا زیادہ نقصان دہ ہے، اور فاسد بیج بو دینا یہ ہے کہ طریقہ کسی شیخِ ناقص سے حاصل کر لے،

---

[1] (احیاء العلوم، ج ۴، ص ۲۱)

کیونکہ شیخ ناقص وہ ہے جو خواہشاتِ نفس کے تابع ہو، سنت و شریعت کا مکمل پابند نہ ہو، طریقِ موصل اور غیر موصل میں امتیاز نہ کر سکتا ہو، طالبوں کی مختلف استعدادات کو نہ سمجھتا ہو ظاہر ہے کہ جب شیخ ان اُمور میں ادراک و فہم نہ رکھتا ہو گا تو یقیناً جذبہ کی استعداد والے طالب کو سلوک کے راستے پر اور سلوک کی استعداد والے کو جذبہ کے طریق پر ڈال کر ان کی قابلیت کو ضائع کر دے گا۔ اس طرح خود بھی گمراہ ہے اور ان کو بھی گمراہ کر دے گا، کیونکہ طالبوں کی استعدادیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض محبوب، مجذوب اور محمدی المشرب ہوتے ہیں اور بعض محب سالک اور غیر محمدی المشرب ہوتے ہیں۔ ان میں ہر دو کے ذوق، سبق اور اوراد و وظائف بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ محبوبوں کا سبق تکرار اسمِ ذات و مراقبات ہیں تاکہ جذبہ بالقوۃ سے بالفعل ہو جائے، اور محبتوں کا سبق تکرارِ نفی اثبات اور مجاہدہ وریاضت ہیں تاکہ انہیں تزکیۂ نفس کی شان حاصل ہو جائے۔

شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبد اللہ انصاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کشف و فراست کی دو قسمیں ہیں:

اول کشف و فراست اہلِ جوع وریاضت جیسا کہ ہند کے جوگی، برہمن اور یونان کے حکیم و فلسفی جو فاقوں اور مجاہدوں کے ذریعے اُمورِ کونیہ کے کشف پر قادر ہو جاتے ہیں۔

دوم کشف و فراست اہلِ صلاح و معرفت جو طالبانِ حق کی استعدادوں میں تمیز کر سکتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کون شخص حصولِ معرفت کی قابلیت رکھتا ہے، اور کون نہیں رکھتا۔ یہی وہ نفوسِ قُدسیہ ہیں جو شیخِ کامل کہلانے کے مستحق ہیں۔

چنانچہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:

اَلشَّیْخُ الْکَامِلُ الْمُکَمِّلُ اِذَا اَرَادَ تَرْبِیَۃَ ھٰذَا لِطَّالِبِ وَتَسْلِیْکَہٗ اِحْتَاجَ اَوَّلاً اِلیٰ اِزَالَۃِ مَا اَصَابَ مِنَ السَّالِکِ النَّاقِصِ، الخ۔

یعنی شیخِ کامل مکمل جب طالب کی تربیت کرنے اور اس طریق پر چلانے کا ارادہ کرتا ہے، تو پہلے اس خرابی کو دور کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو اس کو شیخِ ناقص سے پہنچی ہے، پھر اس کی زمینِ قلب میں اس کی استعداد کے مطابق عمدہ تخم ڈالتا ہے۔ تب اس سے اچھی کھیتی اگنے کی اُمید وابستہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ آیات قرآنیہ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً (ابراھیم ۲۴) اور مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ (ابراھیم ۲۶) سے یہ ظاہری مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک شیخِ کامل مکمل کی صحبت کبریتِ احمر (سُرخ گندھک) کی طرح اکسیر ہے۔ اس کی نظر دوا اور اس کا کلام شفا ہے۔

چنانچہ حسبِ تصریحاتِ صوفیائے کرام شیخِ کامل کے شرائط و قیود درج ذیل ہیں:

پابندِ عقیدۂ اہل سنت، عالمِ قرآن وحدیث، عادل و متقی، عامل بالکتاب والسنۃ، زاھد فی الدنیا، راغب فی الآخرۃ، آمر بالمعروف، ناہی عن المنکر، مجذوب سالک، سلوک تمام کردہ، سالک مجذوب سلوک تمام کردہ، صاحب شجرہ مسلسلہ، صاحب اجازت و خلافت وغیرہم۔[1]

اولیائے نقشبندیہ مجذوب سالک ہوتے ہیں

سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے مشائخ زیادہ تر مجذوب سالک ہوتے ہیں کیونکہ وہ نسبتِ صدیقی کی وجہ سے صحبت اور جذب کی راہ سے پہنچتے ہیں۔ اسی لئے خواجگانِ نقشبندیہ پر جذب (محبت) کا غلبہ رہتا ہے اور انہیں محبوبیت کی مسند پر بٹھایا جاتا ہے۔

---

[1] (کمافی شفاء العلیل وغیرہ من کتب التصوف)

جیسا کہ حضرت خواجہ بلا گرداں شاہ نقشبند بخاری قدس سرہٗ العزیز نے فرمایا:

سی سال شُد آنچہ بہاؤالدین می گوید خدا اُو کند۔[1]

یعنی مجھے تیس برس سے محبوبیت کی مَسند پر یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں جو کہتا ہوں، خدا وہی کرتا ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں عالمِ امر کے لطائف کی سیر کو مقدم رکھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ عالمِ امر کی سیر کو جذبہ اور عالمِ خلق کی سیر کو سلوک کا نام دیا جاتا ہے۔ نیز عالمِ اَمر کی سیر سے طالب کو تصفیہ کی دولت سے نوازا جاتا ہے اور عالمِ خلق کی سیر سے تزکیہ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ عالمِ امر اپنی ذات کے اعتبار سے لطیف اور نورانی ہے اور عالمِ خلق اپنی ذات میں کثیف اور ظلمانی ہے۔ لطائف عالمِ خلق کی مصاحبت اور مجاورت سے عالمِ اَمر کے لطائف پر جو گرد و غبار اور ظلمت چھا جاتی ہے اس کا کثرتِ ذکر، اتباعِ سنت اور توجہاتِ شیخ سے تصفیہ کیا جاتا ہے اور عالمِ خلق چونکہ باعتبارِ ذات کے ظلمت اور کدورت سے ملوث ہے اس لئے مجاہدہ وریاضت سے اس کا تزکیہ لازم ہوتا ہے تاکہ بالفعل جذبے کی لیاقت پیدا ہو جائے کیونکہ جذبہ محبوبیت کا متقاضی ہے۔ محبوبیت خواہ ذاتی ہو جو کہ محمدی المشرب کا خاصہ ہے اور وہ تزکیہ سے پہلے بھی ایک قسم کا جذبہ رکھتا ہے اور محبوبیت خواہ عارضی ہو جو کہ غیر محمدی المشرب کی صفت ہے اور تزکیہ سے پہلے جذبہ کی لذت سے آشنا نہیں ہوتا۔

اقسامِ شیخ

شیخ کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

ا۔ مجذوب سالک (محبوب) ۲۔ سالک مجذوب (محبّ)

---

[1] (ملفوظات)

طالب کے لئے شیخِ اول کی صحبت اکسیر اور عزیز الوجود ہے۔ اگر ایسے شیخ کی صحبت حاصل نہ ہو سکے تو پھر شیخِ دوم کی صحبت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ گو دونوں صحبتوں میں بہت فرق ہے۔ جس مقام پر شیخ اول کی صحبت پہنچا سکتی ہے شیخِ دوم کی صحبت وہاں کے تصور سے بھی خالی ہے۔

شیخ کامل و مکمل طالب کے باطنی مزاج اور اس کی استعداد کے مطابق تربیت کرتا ہے۔ مثلاً اگر شیخ کسی صاحبِ استعداد محمدی المشرب کو سلوک کی راہ پر لے جائے تو لازماً اس کی استعداد کو ضائع کر دے گا۔ اسی لئے شیخِ کامل اگر کسی طالب کی تربیت اپنے ذمے لیتا ہے تو وہ پہلے شیخِ ناقص کی فاسد تربیت کے ضرر کو دور کرتا ہے اور اس کے بعد طالب کی استعداد کے مطابق اس کے قلب کی زمین میں صالح بیج ڈالتا ہے جو کارآمد اور نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۲۰۳ تا ۲۰۸)

[التتمّه:

کمال تعجب کی بات یہ ہے کہ برادرِ باسعادت نے یہ نقل کیا ہے کہ اس کے ہم نشینوں میں سے بعض ایسے فاضل شعرأ ہیں جنہوں نے اشعار میں اپنا لقب کُفری رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ شاعر ساداتِ عظام اور نقبائے (بہتر) کرام میں سے ہیں۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ اسے اس بین الشفاعۃ بُرے اسم پر کس چیز نے برانگیختہ کیا ہے۔ مسلمان کے لئے مناسب ہے کہ اس بُرے نام سے شیر سے بھی زیادہ بھاگے اور اس سے پوری طرح نفرت و کراہت کرے۔ کیونکہ یہ اسم اور اس کا مسمّٰی دونوں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے ہاں ناپسند ومبغوض ہیں۔ مسلمانوں کو تو حکم ہے کہ اہلِ کُفر سے عداوت رکھیں اور ان پر سختی کریں۔ لہٰذا ایسے برے اسم سے احتراز و پرہیز ضروری واجب ہے۔

اور بعض مشائخ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کی عبارات میں غلبہ سُکر میں جو کفر کی مدح اور زنّار وغیرہ باندھنے کی ترغیب واقع ہوئی ہے، اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں ان کی تاویل کی گئی ہے۔ کیونکہ مستوں کا کلام ٹھیک معنی پر محمول کیا جاتا ہے۔ اور ظاہری اور قریب الفہم معنی پر محمول نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ وہ غلبہ سُکر کے باعث ان ممنوعات کے ارتکاب میں معذور ہیں کیونکہ ان بزرگواروں کے نزدیک کُفر حقیقت اسلام حقیقی کی نسبت سراسر نقص اور خراب ہے۔ اور غیر مست اور غیر مغلوب الحال لوگ ان کی تقلید کرنے میں ان کے نزدیک اور اہلِ شرع کے نزدیک بھی قطعًا غیر معذور ہیں۔ کیونکہ ہر شے کا ایک موسم اور وقت خاص ہوتا ہے۔ کہ اس وقت میں وہ شے اچھی اور گوارا ہوتی ہے۔ اور دوسرے وقت میں وہی شے قبیح ہو جاتی ہے۔ اور عقلمند ایک وقت کو دوسرے وقت پر قیاس نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میری طرف سے انہیں کہیں کہ وہ اس لقب کو بدل کر کوئی اچھا اور اسلامی لقب اختیار کریں۔ کیونکہ مسلمان کے حال و قال کے موافق کوئی اسلامی لقب ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم علیہ السلام کے پسندیدہ دین کی طرف منسوب کرنا چاہیئے۔ اور تہمت اور بُرائی کے مقامات سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

جیسا کہ ہمیں اس کا حکم ہے:

اِتَّقُوْا مِنْ مَّوَاضِعِ التُّھَمِ۔

ترجمہ: تہمت کے مقامات سے بچو۔

نہایت سچا اور بے غبار کلام اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَیْرٌ مِنْ مُشْرِکٍ (البقرۃ ۲۲۱)

ترجمہ: اور بے شک مسلمان غلام، مشرک سے اچھا۔

وَ السَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

ترجمہ: ہر متبع ہدایت پر سلامتی کا نزول ہو۔]

تشریح

یہاں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے ایک اہم معاشرتی غلطی کی نشاندہی کی ہے اور وہ یہ لوگ نام، لقب یا تخلص رکھتے وقت اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ آیا یہ نام رکھنا صحیح بھی ہے یا نہیں، جیسے خود حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے زمانہ کے شعراَ نے اپنا تخلص کفری رکھ لیا تھا حالانکہ اس نام کے معنی جاننے کی بھی ضرورت نہیں صرف حروف سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ یہ کیسا نام ہے۔ پھر اگر نام ایسا ہو جس کے معنی معلوم نہ ہوں تو اس نام سے گریز کرنا چاہیئے یا پھر معنی پوچھ لئے جائیں اگر درست ہوں تو رکھ لیں اور اگر معنی درست نہ ہوں تو ایسا نام نہ رکھیں اور سب سے آسان حل یہ ہے کہ بچوں اور بچیوں کے نام یا اپنے تخلص کے طور پر اسلامی نام تجویز کئے جائیں۔ مثلاً عبد اللہ، عبد الرحمٰن، عبد الرحیم اور عبد الرافع وغیرہ۔ یا پھر ایسے نام رکھے جائیں جن میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے مبارک نام آتے ہوں۔

کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

ما اجتمع قوم قط في مشورة فيهم رجل اسمه محمد لم يدخلوه في مشورتهم إلا لم يبارك فيه۔ فيهم رجل اسمه محمد أو أحمد فشاوروه إلا خير لهم: وما كان اسم محمد في بيت إلا جعل الله في ذلک البيت بركة۔[1]

---

1 (السيرة الحلبية، باب تسمية صلى الله عليه وآله وسلم محمداً واحمداً، ج ۱، ص ۱۲۲، طبع دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان)

ترجمہ: جو لوگ کسی مشورہ کے لئے جمع ہوئے اور ان میں محمد یا احمد نام کا بھی کوئی شخص ہوا اور انہوں نے اس شخص کو بھی مشورہ میں شریک کیا تو ان کے لئے ضرور اس معاملہ میں خیر اور بھلائی ظاہر ہوگی، جس کے لئے انہوں نے مشورہ کیا ہے اور جس گھر میں بھی محمد نام (کا کوئی شخص ہوگا) اس گھر میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ برکت عطا فرماتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو اپنے مکتوب میں اس طرف توجہ دلائی ہے کہ آپ کے ایک فاضل شاعر دوست اپنے شعروں میں اپنے لئے ''کُفری'' تخلص استعمال کرتے ہیں، حالانکہ وہ ساداتِ عظام کے بزرگ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ ایسے کُفریہ القابات وانتسابات سے اس طرح دور بھاگے جس طرح پھاڑنے والے شیر سے دور بھاگنا چاہیئے اور مسلمانوں کو قرآن حکیم میں کافروں سے دشمنی رکھنے اور ان پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (النساء ۱۴۴)

ترجمہ: اے ایمان والو کافروں کو دوست نہ بناؤ مسلمانوں کے سوا۔

نیز فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبة ۷۳)

ترجمہ: اے غیب کی خبریں دینے والے (نبی) جہاد فرماؤ کافروں اور منافقوں پر اور ان پر سختی کرو۔

اس سے آگے آپ نے خانخاناں کو حکم دیاہے کہ اس فاضل شاعر کو میری طرف سے پیغام دیجیئے کہ اس قسم کے کافرانہ تخلص کو بدل کر کوئی بہتر اسلامی لقب اپنائیں، جو جامع برکات ہو اور مسلمان کے قال وحال کے موافق ہو۔ نیز کافرانہ لقب و تخلص مسلمانوں کے نزدیک موجبِ تہمت اور باعثِ شک وشبہ ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان بھی یہی ہے:

اتَّقُوا مَوَاضِعَ التُّهَمِ۔[1]

یعنی تہمت کے موقعوں سے بچو۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ (البقرۃ ۲۲۱)

ترجمہ: اور بے شک مسلمان غلام مشرک سے اچھا ہے۔

لہٰذا اسلامی القاب سے اپنے آپ کو منسوب کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے نزدیک پسندیدہ امر ہے۔ وَهُوَ الْمَطْلُوْبُ۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ بعض مشائخ کی سکریہ عبارات جو کُفر کی تعریف اور زنّار (دھاگا، رسی، جنجو وغیرہ جو مجوس ونصاریٰ اپنے مذہبی شعار کے طور پر کمر میں باندھتے ہیں اور ہندوجوگی وغیرہ گلے میں ڈالتے ہیں) کی ترغیب پر مشتمل ہیں۔ دراصل وہ غلبہ ٔسکر وحال کی وجہ سے اس قسم کی ممنوعات کے ارتکاب میں معذور سمجھے جاتے ہیں اور ان کے اس قسم کے کلام کو ظاہر سے پھیر کر کسی اچھے مفہوم پر گمان کیا جانا چاہیئے۔

---

[1] (الاسرار المرفوعہ، ص ۴۹)

جیسا کہ کلامِ شیخ منصور حلاج میں ہے:

کَفَرْتُ بِدِیْنِ اللّٰہِ وَ الکُفْرُ وَاجِبٌ لَدَیَّ وَعِنْدَ الْمُسْلِمِیْنَ قَبِیْحٌ

اور کسی دوسرے بزرگ نے غلبۂ حال میں کہا:

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

ہر رگ من تار گشتہ حاجتِ زُنار نیست

حالانکہ ان بزرگوں کے نزدیک بھی کُفر حقیقتاً نقص و عیب ہے اور اسلام حقیقتاً سراپا کمال ہے۔

اور جو لوگ اہلِ سُکر میں سے نہ ہوتے ہوئے اس قسم کے اقوال و احوال کو دلیل و سند بنائیں اور ایسے کلام کے مرتکب ہوں وہ اہلِ شریعت و اہلِ طریقت دونوں کے نزدیک ملحد اور کافر سمجھے جائیں گے۔ جبکہ منصور حلاج جیسے مغلوب الحال بزرگ کے سُکریہ اقوال پر اہلِ شریعت نے فتویٰ کفر صادر کیا ہے اور اہلِ طریقت و حقیقت کے نزدیک بھی وہ خطرۂ نقص سے خالی نہیں اور اکثر اولیائے کاملین نے اس کو کاملوں بلکہ حقیقی مسلمانوں میں بھی شمار نہیں کیا کیونکہ اہلِ شریعت و حقیقت کے نزدیک حقیقتِ کار اور غلبۂ حال ظاہر ہونے سے پہلے کُفر و اسلام میں امتیاز نہ کرنا بالاتفاق کفر اور زندقہ ہے اور حقیقتِ کار اور غلبۂ حال ظاہر ہونے کے بعد بھی کُفر و اسلام میں فرق نہ کرنا نقص صریح اور عیبِ قبیح ہے اور یہی اہلِ حق کا مؤقف ہے۔ واللہ اعلم (کما فی حاشیہ مکتوبات)

اسلام کی دو قسمیں

عرفاء کے نزدیک اسلام دو قسم کا ہے۔ اولِ اسلام صوری، دوسرا اسلام حقیقی۔ اسلامِ صوری علمائے ظواہر کا اسلام ہے، جنہوں نے مصداقاتِ قضایائے شرعیہ کو کشفی نظر سے دیکھا تو نہیں مگر

دل سے تسلیم ضرور کرتے ہیں، انہیں **اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ** کا درجہ حاصل ہے۔ اور **اسلام حقیقی صوفیائے محققین اور عرفائے کاملین کا اسلام ہے** جنہوں نے **مصداقاتِ قضایائے شرعیہ** کو کشفی نظر سے مشاہدہ بھی کیا ہے اور زبان و قلب سے تسلیم و تصدیق کے مرتبے پر بھی فائز ہیں اور **اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَأَنَّکَ تَرَاہُ**[1] کی نوید سے بھی شاد کام ہیں۔ ان کا ایمانِ استدلالی، ایمانِ شہودی سے تبدیل ہو چکا ہے اور ان کے علومِ جمالی ان کے حق میں تفصیلی ہو چکے ہیں اور وہ شنید سے دید تک اور گوش سے آغوش تک پہنچ چکے ہیں۔ **فَھٰذَا ھُوَ الْمُرَادُ**۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۲۰۹ تا ۲۱۳)

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۲)

مکتوب نمبر ۲۴

[اس اَمر کے بیان میں کہ صوفی کائن ہے اور بائن ہے۔ اور دل کا تعلق ایک سے زیادہ کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اور محبتِ ذاتی کا ظہور محبوب کی طرف سے آنے والے رنج وانعام کو برابر کر دیتا ہے۔ اور مقربین اور اَبرار کی عبادات کے فرق اور اولیاء مستہلکین اور دعوت وارشاد پر مامور اولیائے کرام کے درمیان فرق وامتیاز کے بیان میں۔۔۔۔۔۔ محمد قلیج خان کی طرف ارسال فرمایا:

بحرمۃ حضور سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہٖ الصلوٰۃ والتسلیمات ، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تمہیں سلامت رکھے اور خیر وعافیت عطا فرمائے۔

انسان اس کے ساتھ ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کی محبت ہوتی ہے۔ تو وہ شخص بہت ہی مبارک ہے جس نے اپنے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے علاوہ کسی کی محبت باقی نہیں رکھی۔ اور جس کی مراد اور مقصود وہ بلند ومقدس ذات ہو چکی ہے۔

تو ایسا شخص فی الحقیقۃ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے، اگرچہ بظاہر مخلوق کے ساتھ ہو اور صورتًا مخلوق کے ساتھ مشغول ومصروف ہو، یہی کائن وبائن صوفی کی شان ہے۔ کائن یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے والا۔ بائن یعنی حقیقۃ مخلوق سے جدا اور الگ ہونے والا۔ یا کائن سے مراد ہے صورتًا مخلوق کے ساتھ ہونے والا، اور بائن یعنی فی الحقیقۃ ان سے الگ اور جدا۔ اور قلب کی محبت ایک سے زیادہ اشیاء کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ تو جب تک اس کا تعلق حُبّی اس ایک کے ساتھ رہے گا اس کے ماسوا کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔]

تشریح

کائن سے دو باتیں مراد ہو سکتی ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ کائن دو سالک ہوتا ہے جو در حقیقت اللہ سبحانہٗ وتعالٰی کے ساتھ ہو۔ اور دوسری یہ کہ کائن اُسے کہا جاتا ہے جو بظاہر مخلوق کے ساتھ ہو۔ لیکن کائن کے ساتھ بائن ہونا ضروری ہے ورنہ صرف کائن ہونا مجہول الکیفیت ہے۔ اور بائن سے مراد ہے مخلوق سے الگ ہونے والا۔ پس کائن وبائن وہ صوفی ہوتا ہے جس کا ظاہر تو مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے لیکن باطناً وہ اللہ سبحانہٗ وتعالٰی کے ساتھ وصل رکھتا ہے، یعنی ظاہری طور پر مخلوق کے ساتھ زندگی گزارنے والا شخص جب باطنی طور پر مخلوق سے کنارہ کش ہو چکا ہو اور مخلوق سے اُس کی کنارہ کشی اللہ سبحانہٗ وتعالٰی کے ساتھ واصل ہونے کی وجہ سے ہو تو ایسا شخص کائن وبائن کہلاتا ہے۔

جب انسان معارف لدنیہ کو پالیتا ہے تو عارف کہلاتا ہے، اور جب عارف بن جاتا ہے تو نفس اور نفسانی خواہشات سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ تاہم چونکہ تصوف گوشہ نشینی کو رہبانیت کا درجہ دیتا ہے اسی لئے ایسا عارف اپنی زندگی کو سنتِ نبوی صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے مطابق گزارنے کے لئے بظاہر مخلوق سے میل جول بھی رکھتا ہے اور دنیاوی (جائز) ضروریات کی بھی تکمیل کرتا ہے، اس لئے کائن کہلاتا ہے۔ یعنی مخلوق کے ساتھ رہنے والا۔ لیکن چونکہ فی الحقیقت وہ دنیا اور نفس وشیطان سے قطع تعلق کرکے باطنی تعلق اپنے خالق کے ساتھ استوار کر لیتا ہے اس لئے اسے بائن کہا جاتا ہے۔ ایسے کائن وبائن صوفی کے دل میں دو محبتیں نہیں سماسکتیں۔ یعنی محبت ہوگی تو صرف ایک۔ اگر دل میں دُنیا کی محبت ہوگی تو وہ کائن وبائن نہیں کہلائے گا۔ اور اگر کائن وبائن ہوگا تو اس کے دل میں صرف اللہ سبحانہٗ وتعالٰی کی محبت ہوگی۔

پس وہ سالک جس کے دل سے دنیا کی محبت ختم ہو چکی ہو اور صرف خالق حقیقی کی محبت رچ بس چکی ہو اس کے لئے خوشی اور درد والم برابر ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ غم اور پریشانی میں بھی خوشی کی طرح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر عاشق ہو چکا ہے اور عاشق کو معشوق کی طرف سے جو بات بھی پہنچتی ہے وہ محبوب ہی ہوتی ہے۔

لوگ مشائخ کے پاس اس لئے جاتے ہیں کہ اُن کے مال واولاد میں اضافہ ہو اور پریشانیوں سے بچ جائیں۔ لیکن یہ سب نفس کی خواہشات ہیں۔ چاہیئے کہ علماء وصلحاء کی صحبت اختیار کرنے سے نیت یہ ہو کہ ہمیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا نصیب ہو جائے اور صبر وشکر کی دولت ہاتھ آجائے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

صوفی کائن بائن

حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ صوفی کی شان یہ ہے کہ وہ کائن بائن ہوتا ہے اور اس کے دل میں حق تعالیٰ کے سوا کسی کی محبت نہیں ہوتی اور اس کی مراد صرف رضائے حق تعالیٰ ہوتی ہے۔ کائن بائن کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ صوفی حقیقت میں کائن (حق کے ساتھ) ہوتا ہے اور بائن (خلق سے جدا) ہوتا ہے۔

دوسرا مفہوم اس طرح ہے کہ صوفی صورت میں کائن (خلق کے ساتھ) ہوتا ہے اور حقیقت میں بائن (خلق سے جُدا) ہوتا ہے۔

ان ہی نفوسِ قدسیہ کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور ۳۷)

یعنی مردانِ حق کی شان یہ ہے کہ انہیں تجارت اور خرید و فروخت جیسے دُنیاوی کام اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے۔ سالارِ طریقت حضرت خواجہ سید محمد بہاؤ الدین بخاری اویسی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ میں نے حج کے دوران منیٰ کے بازار میں ایک ایسے صاحبِ ذکر مرد جوان کو دیکھا جو تقریباً پچاس ہزار دینار کا سودا سلف خرید رہا تھا اور اس کا دل ایک لمحہ کے لئے بھی یادِ حق سے غافل نہ تھا۔ طریقتِ نقشبندیہ کی نسبتِ خاصہ بھی یہی ہے جس کو دوامِ حضور مع اللہ کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

از دروں شو آشنا و ز بروں بیگانہ وش
ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

ایک دل میں دو محبتیں جگہ نہیں پکڑ تیں

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قلبی محبت ایک سے زیادہ کے ساتھ نہیں ہوتی۔ کیونکہ محبت کا اصول یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کا محبوب ایک ہوتا ہے۔ جب تک اس محبوب کی محبت اس کے دل سے زائل نہیں ہوتی کسی دوسرے کی محبت وہاں جگہ نہیں پکڑ سکتی۔ مطلب یہ کہ جب تک انسان کے دل میں نفس کی محبت موجود رہے گی، محبتِ خداوندی اس میں ہرگز نہ سما سکے گی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ: مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ (الأحزاب ۴) کے مطابق ایک سینے میں دو دل نہیں ہوسکتے، اسی طرح ایک دل میں دو محبتیں بھی نہیں ہو سکتیں۔

بینہ نمبر ا

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کا جواب بھی آپ نے خود ارشاد فرمایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان کے دل میں متعدد چیزوں (مثلاً مال، اولاد، حُسن و جمال، عزت اور

مرتبہ) کی محبت رچی بسی رہتی ہے، پھر یہ کس طرح تسلیم کیا جائے کہ محبت ایک سے زیادہ کے ساتھ نہیں ہوتی؟ آپ نے اس سوال کا جواب یوں ارشاد فرمایا کہ متعدد اشیاء کے ساتھ محبت کے باوجود اس وقت بھی محبت صرف ایک کے ساتھ ہی ہوتی ہے اور وہ انسان کا نفس ہے، باقی تمام اشیاء کی محبت نفس کی محبت کی فرع ہے۔ یہ بات اکثر مشاہدے میں آئی ہے کہ جب ایک شخص محبتِ نفس سے فارغ ہوتا ہے تو باقی محبتوں سے بھی خلاصی پالیتا ہے اور صرف حق تعالیٰ کی محبت سے ہی شادکام رہتا ہے۔

ایں سرائے و باغِ تو زندانِ تو | خانمانِ تو بلائے جانِ تو

اسی کیفیت میں صوفی پکار اُٹھتا ہے:

جُز یاد تو، از دلِ ناشاد برفت | وز سینہ ہوائے گل و شمشاد برفت

مُستغرقِ ذکر چنانم کہ دِگر | در ذکرِ تو، ذکرِ تو از یادم برفت

ترجمہ: سوائے تیری یاد کے مِرے دِلِ ناشاد سے ہر چیز جاتی رہی۔ سینے سے گُلاب اور شمشاد کی خواہش بھی نکل گئی اور اب ترے ذکر میں اس قدر ڈوبا ہوا ہوں کہ تیرے ذکر میں تیرا ذکر بھی میری یاد سے جاتا رہا۔

پس ثابت ہوا کہ زیادہ چیزوں سے محبت رکھنے والا ان چیزوں کو اپنے نفس ہی کے لئے چاہتا ہے۔ فی نفسہٖ ان اشیاء کو نہیں چاہتا جب اس کو اپنے نفس سے محبت نہیں رہے گی تو ان چیزوں کی محبت بھی اس کے نفس کے تابع ہونے کی وجہ سے دور ہو جائے گی۔ اسی لئے صوفیاء کرام کے نزدیک بندے اور حق تعالیٰ کے درمیان حجاب بندے کا اپنا نفس ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۲۱۸ تا ۲۲۰)

[اور یہ جو انسان کی بہت مرادیں اور کثیر اشیاء مثلاً مال، اولاد، سرداری، مدح، لوگوں کے سامنے بلندئ مرتبہ کے ساتھ تعلق محبت محسوس ہوتا ہے، تو یہاں بھی فی الواقع اس کا محبوب ایک ہی

شے ہے، اور وہ اس کا نفس ہے۔ اور ان سب کے ساتھ محبت اپنے نفس کے ساتھ محبت کی فروعات ہیں۔ کیونکہ ان اشیاء کی چاہت اپنے نفس کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ بذاتِ خود ان اشیاء کے ساتھ، تو جب اس کی اپنے نفس سے محبت ختم ہوگئی تو بالتبع ان اشیاء کے ساتھ محبت بھی ختم ہوگئی۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ بندے اور رب کے درمیان انسان کا اپنا نفس ہی حجاب ہے۔ دوسری کائنات حجاب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کائنات بندے کی مراد و مطلوب نہیں تا کہ حجاب بنے۔ بلکہ بندے کی مراد اور اس کا مطلوب خود اس کا اپنا نفس ہے۔ لہٰذا فی الواقع وہی حجاب بھی ہے۔ تو جو شخص اپنے نفس کی چاہتوں سے بالکلیہ خالی نہ ہو رب تعالیٰ کو اپنا مطلوب و مراد نہیں بنا سکتا۔ اور نہ اس کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت کی گنجائش ہو سکتی ہے۔]

تشریح

سالک کی باطنی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی خواہشاتِ نفسانی ہیں۔

عرفاء نے فرمایا ہے کہ:

انت الغمامک علیٰ شمسک۔

ترجمہ: یعنی آپ خود اپنے سورج کے لئے بادل (کا درجہ رکھتے) ہیں۔

حضرت مولانا حافظ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست

توخود حجابِ خودی حافظ از میان برخیز

ترجمہ: عاشق و معشوق میں کوئی دوسری چیز رکاوٹ نہیں ہوتی (بلکہ) اے حافظ! تو اپنے محبوب کے راستہ میں خود ہی حجاب و رکاوٹ ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو (یعنی نفسانی خواہشات کو) ہٹا دے (تاکہ اپنے محبوب سے واصل ہو سکے)۔

دوسری جگہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

از سرائے طبیعت نہ می روی بیرون کجا بکوئی حقیقت گزر توانی کرد

ترجمہ: اگر تم اپنی (شیطانی) طبیعت اور نفسانی خواہشات کے کوچہ سے باہر نہ نکلے تو راہِ حقیقت کو کیسے پاسکو گے؟

جب شیخ کامل مریدین پر توجہ فرماتا ہے تو ان کے قلوب ذاکر ہو جاتے ہیں لیکن مریدین کو صرف توجہات شیخ پر ہی اکتفاء نہیں کرنا چاہیئے بلکہ چاہیئے کہ کوشش کرے نفس کی مخالفت کریں اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل و مکمل اتباع کریں کہ اتباعِ مصطفوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ہی دُنیا اور آخرت کی فلاح و کامیابی کی کُنجی ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اشیائے کائنات فی نفسہٖ انسان کا مطلوب و مقصود نہیں بلکہ بندے کا اپنا نفس اور اس کی خواہشات انسان کی مُراد ہوتے ہیں اور وہ اپنے نفس ہی کے لئے تمام اشیاء کو محبوب رکھتا ہے اور پھر نفس کی کدورتیں ہی انسان کو حق تعالیٰ سے دور رکھنے کا سبب بنتی ہیں۔

ایک عارف فرماتے ہیں:

اَنْتَ الْغَمَامَةُ عَلٰی شَمْسِکَ۔

یعنی تیری نفسانی کدورتیں ہی تیری قلبی استعداد کے اوپر بادل بن کر چھا جاتی ہیں۔

حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے:

عَادِ نَفْسَکَ فَاِنَّهَا اِنْتَصَبَتْ بِمُعَادَاتِیْ۔

یعنی اپنے نفس سے دُشمنی رکھ کیونکہ یہ میری دشمنی پر کھڑا ہے۔

اور اسی مفہوم کی تائید میں ہے:

دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالْ۔

اپنے نفس کو چھوڑ دے اور میری طرف چلا آ۔

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

یعنی اے حافظ تیرا اپنا نفس تیرے لئے حجاب ہے، تو خود درمیان سے اٹھ جا۔

نیز فرمایا:

تو از سرائے طبیعت نمیروی بیرون
کجا بکوئے حقیقت گزر توانی کرد

یعنی تو اپنی طبیعت (نفس) کی سرائے سے باہر نہیں نکلتا تو حقیقت کے کوچے میں تیرا گزر کیسے ممکن ہے۔

چنانچہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ نفس سے چھٹکارا پا جانے کی دولتِ عظمیٰ فنائے مطلق کے بغیر میسر نہیں آسکتی۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۲۰ تا ۶۲۲)

[اور یہ اعلیٰ درجہ کی دولت فناءِ مطلق کے ساتھ ہی متحقق و موجود ہو سکتی ہے۔ اور یہ فناءِ مطلق تجلی ذاتی سے وابستہ ہے۔ کیونکہ ظلمات اور تاریکیوں کا مکمل طور پر اٹھنا اسی وقت متصور ہو سکتا ہے جب سورج پورے طور پر طلوع ہو کر چمکنا شروع کر دے۔ تو جب یہ محبت جسے محبتِ ذاتی سے تعبیر کرتے ہیں، حاصل ہو جاتی ہے تو محب کے نزدیک محبوب کی طرف سے ہونے والے انعامات اور اس کی طرف سے آنے والے مصائب و آلام برابر حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور اس وقت اخلاص کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ اب وہ خدا تعالیٰ کی عبادت و بندگی صرف اس کی رضا کے لئے کرتا ہے۔ طلب انعام یا دفع آلام کے لئے نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں اس کے نزدیک برابر ہو چکی ہیں۔ یہ مقربین کا مرتبہ ہے۔ کیونکہ ابرار تو اس کی عبادت طمع اور خوف کی بنا پر کرتے ہیں۔ اور طمع اور خوف کا تعلق اور واسطہ خود ان کی اپنی ذوات سے ہوتا ہے۔ اور یہ کوتاہی اس بنا پر ہے کہ انہیں محبتِ ذاتی کی سعادت نصیب نہیں ہوتی۔]

تشریح

فنا کی تعریف اور اس کی اقسام کے پیچھے مکتوب نمبر ۶ میں صفحہ نمبر ۹۴ پر بیان ہو چکی ہیں، یہاں محبت ذاتی اور اس کی کیفیت کا بیان کرنا ضروری ہے تا کہ ہر کس و ناکس اس کا دعویٰ کر کے عوام کو دھوکہ نہ دے سکے۔

محبتِ ذاتی وہ محبت ہے جس میں سالک کے دل سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علاوہ ہر چیز کی محبت و چاہت ختم ہو جائے صرف اور صرف ایک کی محبت جا گزین ہو جائے اور یہ محبت تب نصیب ہوتی ہے جب سالک کو فنائے مطلق حاصل ہو جائے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی بلخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ:

بے فنائے مطلق وجذب قوی کے حریمِ وصل رامحرم شوی

ترجمہ: فنائے مطلق (فنائے لطائفِ عشرہ) پر فائز ہونے اور دولتِ جذبہ کے حصول کے بغیر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے وصل کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔

اور محبتِ ذاتی کی علامت یہ ہے کہ ایسا شخص غم اور پریشانی کو بھی خوشی ومسرت کی طرح برداشت کرتا ہے اور شکوہ وشکایت کو اشارۃً بھی ظاہر نہیں کرتا۔ ہم لوگ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محبت کے دعوے تو کرتے ہیں لیکن جونہی حالات کی ذراسی تنگی وپریشانی آتی ہے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے شکایت شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اے خدا! اتنی بڑی دنیا میں اس آزمائش کے لئے تجھے میں ہی نظر آیا، اور کوئی نہیں تھا؟" (العیاذ باللہ)

توکیا ایسا شخص محبتِ ذاتی کے دعوے میں سچا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسے ہی ان لوگوں کی مثال ہے جو اپنے آپ کو عاشقِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کہتے ہیں اور بڑے زور وشور سے بلند وبالا دعوے کرتے ہیں لیکن عملی زندگی میں جی بھر کر یورپ کی تقلید کرتے ہیں، حلیہ مشرکین جیسا، لباس کفار جیسا، نظریات دہریوں کی طرح، علماء وصوفیاء پر طعن وتشنیع اور سنتوں کی مخالفت۔ کیا عاشقِ حقیقی کا کردار ایسا ہی ہوتا ہے؟

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ذاتِ حق کے ساتھ محبت اور خواہشات نفس سے نجات کا یہ اعلیٰ ترین درجہ سالک کو فنائے مطلق کے بغیر میسر نہیں آسکتا اور فنائے مطلق تجلی ذاتی کے

ساتھ مربوط ہے، کیونکہ تجلی صفاتی تمام بشری کدورتوں اور مادی کثافتوں کا ازالہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی سالک کو محبت ذاتی سے مشرف کر سکتی ہے۔

جیسا کہ حضرت مولانا روم مست بادۂ قیوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

بے فنائے مطلق وجذبِ قوی کے حریمِ وصل را محرم شوی

کیونکہ جس طرح سورج کے طلوع ہوئے بغیر رات کی تاریکیاں دور نہیں ہو سکتیں، اسی طرح فنائے مطلق اور تجلیٔ ذاتی کے بغیر نفسانی آلائشوں سے چھٹکارا محال ہے۔

فنائے مطلق

سالک کے تمام لطائف کا مکمل طور پر اپنے مبدأ فیض تک پہنچ جانے کا نام فنائے مطلق ہے۔ اس مقام میں سالک فناء کی تمام قسموں سے گزر کر کامل طور پر نسیان ماسوی اللہ کی دولت سے شادکام ہو جاتا ہے۔

بینہ نمبر ۲

واضح رہے کہ ایک ہے سالک کی فنائے مطلق (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) اور ایک ہے لطیفے کی فنائے مطلق وہ صرف اسی ایک لطیفے کا ماسویٰ کو فراموش کر دینے کا نام ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۲۲۲، ۲۲۳)

[اس تحقیق سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اَبرار کی نیکیاں مُقربین کے لئے برائیوں کا حکم رکھتی ہیں۔ تو اَبرار کی حسنات ایک لحاظ سے حسنات ہیں اور ایک لحاظ سے سیئات۔ اور مقربین کی حسنات من کل الوجوہ حَسنات ہیں۔]

تشریح

صوفیاء کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مقولہ ہے کہ:

حسنات الابرار سیئات المقربین۔

ترجمہ: یعنی ابرار کی نیکیاں مُقرب لوگوں کے نزدیک گناہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

اور اس کی مثال یہ ہے کہ ابرار فرائض وواجبات کو غفلت اور کوتاہی کے ساتھ ادا کرتے ہیں لیکن نفلی عبادات بڑے ذوق وشوق کے ساتھ لوگوں کو دکھا دکھا کر کرتے ہیں۔ شب برأت اور لیلۃ القدر کی مبارک راتوں میں اگر قیام کی توفیق مل جائے تو صبح اٹھ کر گن گن کر دوستوں کو بتاتے ہیں کہ آج رات ہم نے اتنے نوافل ادا کئے ہیں۔ عید الفطر کے بعد اگر نفلی روزہ رکھ لیں تو بلاضرورت ہی اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ ہمارا تو روزہ ہے۔ جبکہ مُقربین کے نزدیک ایسی نیکیاں گناہ کے درجہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ نماز وروزہ تو صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضاوخوشنودی کے لئے ہے، لوگوں کو دکھانے اور شاباش حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ اگر وہ خالص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کے لئے ایسا کرتے تو ہرگز ہرگز لوگوں پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔ اسی لئے فقراؔ نے فرمایا ہے کہ "انسان کی نیکی اُس وقت تک نیکی شمار نہیں ہوتی جب تک وہ اپنی نیکی کو لوگوں سے گناہ کی طرح پوشیدہ نہ رکھے"۔ (ہاں فرائض کو اعلانیہ ہی ادا کرنا چاہیئے تاکہ دوسروں کو بھی رغبت ملے)۔

یا پھر یہ بات ہے کہ ابرار عبادت وبندگی تو کرتے ہیں لیکن اس سے اُن کا مقصد ومدعا یہ ہے کہ اُن کی پریشانی دور ہو جائے۔ بیماری سے صحت مل جائے یا مالی حالات درست ہو جائیں لیکن مُقربین ان خواہشات کی وجہ سے عبادت نہیں کرتے بلکہ اُن کے نزدیک غمی اور خوشی برابر ہو جاتی ہے۔ وہ صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے بندگی کرتے ہیں، انہیں نہ جنت کی

طلب ہوتی ہے نہ جہنم کا خوف۔ اگر جنت کی طلب کرتے بھی ہیں تو محض اس لئے کہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کا مقام ہے، اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں تو بھی اس وجہ سے کہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ناراضگی کی جگہ ہے۔ پس اپنے آپ کو اس کسوٹی میں تول کر ہر شخص اپنا حال معلوم کر سکتا ہے کہ وہ ابرار میں سے ہے یا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے مقربین کے زمرے میں ہے۔

[ہاں کچھ مقربین ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کی عبادت وبندگی طمع اور خوف کے تحت کرتے ہیں۔ بقاءِ اکمل اور عالمِ اسباب کی طرف نزول کرنے کے بعد۔ لیکن ان کے خوف اور طمع کا تعلق ان کی اپنی ذوات کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے طمع اور اس کی ناراضگی کے خوف سے عبادت وبندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ جنت طلب کرتے ہیں تو اپنے حظوظِ نفسانی کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام ہے، اور اگر دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں تو اپنے نفوس سے دفع عذاب والم کے لئے نہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ حق تعالیٰ کی ناراضگی کا مقام ہے۔ کیونکہ یہ اکابر اپنے نفسوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں اور خالص اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ہو چکے ہیں۔ اور مقربین میں سب سے اعلیٰ مرتبہ اور اس مرتبہ والے کو مرتبہ ٔولایتِ خاصہ کے حصول کے بعد مقامِ نبوت کے کمالات سے پورا حصہ ملتا ہے۔ اور ان مقربین میں سے جو اولیاء ارشاد ودعوت کی غرض سے عالمِ اسباب کی طرف نزول نہیں فرماتے وہ اولیاء مستہلکین میں ہیں (یعنی ذات ہی میں منہمک ومستغرق)۔ ان کو مقامِ نبوت کے کمالات سے کچھ حصہ نہیں ملتا۔ اور یہ تکمیل کے اہل بھی نہیں ہوتے، بخلاف پہلے گروہ کے کہ وہ تکمیل کی اہلیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اکابر کی محبت وعقیدت عطا کرے۔ بحرمۃ سید البشر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم۔ کیونکہ انسان اس کے ساتھ شمار ہوتا ہے جس سے محبت رکھتا ہے۔ اول وآخر سلام۔]

تشریح

عروج کے دوران سالک مخلوق اور دنیاوی ضروریات سے مستغنی ہوتا ہے اور کسی قسم کی طمع اور توقع نہیں رکھتا لیکن جب وہ دعوتِ خلق کے لئے واپس نزول کرتا ہے تو عوارضاتِ دنیاوی کے لئے اس کو دوبارہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ میں مذکور ہے کہ ان دونوں نے ایک گاؤں میں لوگوں سے کھانا طلب کیا یا جیسے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے دنیاوی ضروریات کو پورا فرمایا۔ پس تکمیل کے مراحل سے گزر کر آگے نکل جانے والا صوفی ضروریات وعلائق بشریہ کے لئے محتاج ہوتا ہے حالانکہ ایسی ہستیوں کا توکل بھی اعلیٰ ترین ہوتا ہے۔

اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "یہ اکابر اپنے نفسوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں اور خالص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات سے وابستہ ہو چکے ہیں" اس سے یہ مراد ہے کہ ان اکابر کے نفوس، امارگی سے نکل کر اطمینان پذیر ہو گئے ہیں اس لئے اب ان سے شریعت کی خلاف ورزی کا خدشہ ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کا ہر عمل صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کے لئے ہوتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہوا کہ اپنے فرزند کو ذبح کر دو یا نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہو جاؤ، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذرا بھر تردد نہ کرنے دیا بلکہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام فوراً اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا پر راضی ہو گئے، یا جیسے حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیٹے کو جو کہ کافر تھا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے پانی کے عذاب میں غرق کیا تو حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دل میں ذرہ بھر بھی بیٹے کے فراق کا صدمہ پیدا نہ ہوا بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم فرما دیا۔ وعلیٰ ھذا القیاس

جب ہم تصوف کے اس قانون کے مطابق اپنے آپ کو پرکھتے ہیں۔ جب ہم میں سے کسی پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے کوئی آزمائش آتی ہے تو ہماری زبان سے گلے شکوے نکلنے لگتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو کفریہ الفاظ نکل جاتے ہیں (نعوذ باللہ) اور ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہم تصوف کے راستے پر چل نکلے ہیں اور اس راستے میں آزمائشیں تو آتی ہیں پھر ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے عشق کے بھی دعوے دار ہیں تو اب ہمیں رضا بالقضا کے اصول پر کاربند رہنا ہو گا۔

آگے چل کر حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے ان اکابر اولیاء کرام کے درجات کی تفصیل بیان فرمائی ہے کہ یہ اکابر ابرار کے درجہ سے ترقی کر کے مقربین کے درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں اور مقربین میں سے جو سالک اعلیٰ ترین مقام کی طرف ترقی کرتا ہے تو مقامِ ولایت کے فیوض وبرکات کے ساتھ ساتھ اسے مقامِ نبوت کے کمالات میں سے بھی وافر حصہ نصیب ہوتا ہے۔ ان مقربین کے دو درجے ہیں، ایک وہ جو ہمیشہ عروج میں ہی رہتے ہیں نزول نہیں کرتے انہیں مستغرق کہا جاتا ہے، اور دوسرے وہ ہیں جو عروج کے بعد نزول فرماتے ہیں اور دعوت وارشاد کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ ان دونوں کی تفصیلی بحث مکتوب نمبر ۲۲ میں گزر چکی ہے۔

پس چاہیئے کہ ایسے شخص سے بیعت کی جائے جو عروج ونزول کی دولت سے بہرہ ور ہو اور دعوتِ خلق میں مشغول ہو۔ صرف تعویذ گنڈے اور ماہانہ وسالانہ تقاریب تک ہی محدود نہ ہو بلکہ عالم بھی ہو اور مخلوق کی ظاہری وباطنی تربیت کا فرض بطریقِ احسن ادا کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، کہ اخروی نجات ایسے ہی اولیاء کرام کے دامن سے وابستہ رہنے میں پنہاں ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

محبتِ ذاتیہ میں انعام وایلام برابر ہوتے ہیں

سالک جب محبتِ ذاتیہ کے مرتبے کو پالیتا ہے اور اس کو اخلاص کی حقیقت میسر آجاتی ہے تو اس وقت اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی نعمتیں اور زحمتیں اس کے لئے ایک جیسی ہو جاتی ہیں کیونکہ محب کو محبوب کے ہر فعل سے ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے اور عاشق ہمیشہ معشوق کے افعال کا شہود چاہتا ہے خواہ وہ انعام کے رنگ میں ہو یا ایلام کی صورت میں اس کے نزدیک جو کچھ جمیلِ مطلق کی طرف سے آتا ہے، جمیل ہوتا ہے۔

از دستِ دوست ہر چہ رسد نیک گفتہ اند

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ محب جس طرح محبوب کے انعام سے لذت پاتا ہے اسی طرح اس کے ایلام سے بھی لذت حاصل کرتا ہے۔ بلکہ ایلام میں لذت کی زیادتی پاتا ہے کیونکہ اس میں حظِ نفس کی آمیزش نہیں ہوتی۔

مُحبتِ ذاتیہ

محبت ذاتیہ عارف کا وہ مرتبہ ہے جس میں عارف کی عبادات اور اس کے اعمال میں طمع وخوف، ثواب وعذاب اور نفع ونقصان کا جذبہ ورحجان غلبہ پزیر نہیں ہوتا بلکہ محبت الٰہیہ میں فانی ہونے کی وجہ سے اس کے ہر عمل اور اس کی ہر عبادت سے رضائے الٰہی مقصود ہوتی ہے۔

غرض ز عشقِ توام چاشنی درد وغم است
ورنہ زیرِ فلک عیش وتنعم چہ کم است

مقربین اور ابرار کی عبادات میں فرق

مقربین کی عبادات میں جنت کا طمع اور دوزخ کا خوف شامل نہیں ہوتا بلکہ محض رضائے الٰہی پیش نظر رہتی ہے، جبکہ ابرار کی عبادات طمع اور خوف سے ملوث ہوتی ہیں، کیونکہ وہ محبت ذاتیہ سے بہرہ یاب نہ ہونے کی وجہ سے نفس کے تقاضوں سے پورے طور پر آزاد نہیں ہوتے لہٰذا ان کی عبادات پر طمع وخوف سے ملوث ہونے کا اطلاق ان کے نفس کی شرکت کی بناء پر کیا جاتا ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں پس لا محالہ اَبرار کی نیکیاں جہتِ عبادت کے اعتبار سے حسنات (نیکیاں) ہیں اور جہتِ نفس کے لحاظ سے سیئات (گناہوں) کے زُمرے میں آتی ہیں۔ اور مقربین کی نیکیاں حسناتِ محضہ ہیں کیونکہ وہاں نفس کی آلائش کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ" کا یہی مطلب ہے۔ مقربین کو مرتبۂ ولایتِ خاصہ کے بعد کمالاتِ نبوت سے بھی پورا حصہ ملتا ہے جبکہ ابرار، اولیائے مستہلکین (اولیائے مغلوب الحال) میں سے ہوتے ہیں اور مرتبہ کمالاتِ نبوت اور مقامِ تلقین وارشاد کے اہل نہیں ہوتے۔

بینہ نمبر ۳

واضح رہے کہ مقربین کی عبادات کا طمع اور خوف سے خالی ہونا عروج کے وقت متحقق ہوتا ہے کیونکہ یہ کیفیت عروجی مرتبوں میں پیش آتی ہے۔ نزول کے مرتبے میں مقربین بھی طمع اور خوف سے خالی نہیں ہوتے، لیکن اس مرتبے میں ان کا طمع اور خوف نفس کے تقاضوں کے تحت نہیں ہوتا وہ جنت کی طمع اپنے نفس کے آرام کے لئے نہیں رکھتے۔ بلکہ جنت کے صرف اس لئے طالب ہوتے ہیں کہ وہ رضائے الٰہی کا محل ہے اور دوزخ کا خوف اپنے نفس کی اذیت وتکلیف کے پیش نظر نہیں

رکھتے بلکہ دوزخ سے صرف اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ وہ قہر الٰہی کا محل ہے۔ وہ اپنے نفس کے لئے انعام وایلام کے تصور سے فارغ ہوتے ہیں کیونکہ وہ نفس کی غلامی سے کامل طور پر آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔

جنت کی طلب کرنا اور دوزخ سے نجات مانگنا مقربین کا مرتبہ ہے

یہ امر مستحضر رہے کہ جنت محلِ رضائے الٰہی ہے، لہٰذا جنت کی طلب دراصل رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے جنت الفردوس کا سوال کیا اور ہمیں بھی حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ سے جنت الفردوس طلب کریں۔[1] بعض کوتاہ بینوں نے جنت کی طلب کو غیر کی طلب سمجھ لیا اور جنت سے لاتعلقی اور دوزخ سے لاپرواہی ظاہر کرنے لگے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جنت کی طلب انبیاء ومقربین کا مرتبہ ہے اور انبیاء ومقربین غیر کی طلب ومحبت سے فارغ ہوتے ہیں۔ آپ نے حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا کے اس قول کہ "میں جنت کو جلانے اور دوزخ کو بجھانے چلی ہوں" کو سُکر پر محمول فرمایا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ رابعہ سُکر کے عالم میں جنت اور دوزخ کی حقیقت سے واقف نہ ہوئیں، ورنہ یہ کلمات ان کی زبان پر نہ آتے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ دوزخ محلِ غضبِ الٰہی ہے، لہٰذا مقربین کا دوزخ سے پناہ مانگنا دراصل اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگنا ہے جو کہ عند اللہ شرعًا مطلوب ہے۔ اکثر شعراء اپنے کلام میں جنت اور دوزخ کو ایک معمولی اور ساقط الاعتبار شے قرار دیتے ہیں، یہ سراسر جہل اور دین سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ھٰذِہٖ الْخرَ افَاتِ۔

---

[1] (صحیح بخاری، ج ا، ص ۳۹۱)

بینہ نمبر ۴

مقربین کا مرتبۂ نزول ان کے مرتبۂ عروج سے زیادہ بلند ہوتا ہے کیونکہ عروج کا مرتبہ رجوع الی الحق ہے اور نزول کا مرتبہ رجوع الی الخلق ہے، جو کہ دعوت وارشاد کا مرتبہ ہے اور یہی انبیاء کی وراثت کا مقام ہے۔اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَااِیَّاھَا۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۲۳ تا ۶۲۶)

اللھم اغفر لکاتبہٖ و لمن سعٰی فیہٖ و لو الدیھم و لاساتذیھم و لاھل بیتھم اجمعین آمین یارب العالمین بحرمت سید المرسلین و خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ وسلم

مکتوب نمبر ۲۵

[حضور سید المرسلین اور آپ کے خلفاء راشدین علیہ وعلیہم من الصلوٰۃ اکملہا ومن التسلیمات اتمہا کی متابعت کی ترغیب کے بیان میں۔۔۔۔۔خواجہ جہاں کو لکھا گیا:

اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو سلامتی عطا کرے۔ تمہارے سینے کو کشادہ کرے تمہارے نفس کو پاکیزگی عطا کرے اور تمہارے پوست بدن کو نرم کرے۔ یہ سب کچھ بلکہ روح، سر، خفی اور اخفیٰ کے تمام کمالات کا حصول حضور سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہٖ من الصلوٰۃ افضلہا ومن التسلیمات اکملہا کی متابعت اور پیروی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لٰہذا تم پر حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتہ ہیں کی متابعت لازم وضروری ہے کیونکہ خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہدایت کے ستارے اور ولایت کے آفتاب ہیں۔ تو جس کو ان کی پیروی کا شرف نصیب ہو گیا وہ عظیم کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔ اور جس کی سرشت میں ان کی مخالفت ڈال دی وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

بقیہ مقصود یہ ہے کہ مرحوم الشیخ سلطان کے دونوں بیٹے پریشانی اور تنگی معاشی میں مبتلا ہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ ان کی مدد واعانت فرمائیں۔ ان کی امداد آپ کے شایانِ شان ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام لوگوں کی حاجت بر آری کی توفیق بخشی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی توفیق میں مزید اضافہ کرے، اور خیر وبھلائی کو آپ کا رفیق وساتھی بنائے۔ آپ کو اور ہر متبع ہدایت کو سلام۔]

تشریح

اگر کوئی شخص مکتوبات شریف کا مطالعہ کرے اور ان کے مطابق عمل کرے اور مکتوبات شریف کے دائرے سے قدم باہر نہ نکالے تو اُس کی زندگی عین اسلامی زندگی ہوگی کیونکہ حضرت

مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے سارے مکتوبات شریعت غرأ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ترویج واشاعت کے مقصد کے تحت لکھے ہیں اور ان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جو شریعت کے خلاف ہو۔

زیرِ نظر مکتوب میں بھی آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اتباع پر زور دیا ہے اور چونکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے احکام شرع خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کماحقہ سیکھے تھے اور اپنی آنکھوں سے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی عملی زندگی کا مطالعہ کیا تھا اس لئے ضروری ہوا کہ ان اکابر کی بھی اتباع کی جائے کیونکہ ان کی اتباع عین حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اتباع ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآن عظیم الشان میں فرمایا ہے کہ:

أَطِيعُو االلّٰهَ وَأَطِيعُو االرَّسُولَ (النساء ۵۹)

ترجمہ: حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا۔

کچھ جاہل وناسمجھ لوگ (جن میں پرویزی فرقہ سرفہرست ہے) کہتے ہیں کہ ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات اور قرآن عظیم الشان کو تو مانتے ہیں لیکن احادیث پر عمل نہیں کرتے۔ ان جاہلوں کو یہ سمجھ نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اپنی مرضی سے تو کوئی بات بھی نہیں فرمائی بلکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے جو کچھ نکلا وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم سے ہی نکلا۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم ۳)

ترجمہ: اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے۔

پس ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے کبھی بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں فرمایا بلکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سب باتیں وحی نفی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے جو احکام حضرت جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام لے کر نازل ہوئے وہ وحی جلی ہے اور اسی کو قرآن عظیم الشان کہا جاتا ہے اور اسی کو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اور جو کچھ لوگ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرشتے کی وساطت کے بغیر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے کلام فرمایا اور پھر وہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی زبانِ مبارک سے جاری ہوا وہ وحی خفی ہے اور اس کو نماز میں پڑھنے سے نماز درست نہیں ہوتی۔ پس جو شخص احادیث نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے انکار کرے گا تو اس کا یہ انکار اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکام کا انکار ہو گا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ:

الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ۔

ترجمہ: خبردار میرے پاس قرآن کی وحی آئی اور اس کی مثل (احادیث) بھی میرے پاس ہیں۔

اس لئے احادیث کا انکار کفر ہے اور کفر سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ کچھ لوگ جہالت کی وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ جو حدیث قرآن عظیم الشان کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے وہ تو قابلِ عمل ہے اور جو قرآن عظیم الشان کے مطابق نہ ہو ہم اس پر عمل نہیں کرتے۔ ان نا سمجھ لوگوں سے کون پوچھے کہ اے نادانو! آپ کے پاس کون سی کسوٹی ہے جس سے تم احادیث مبارکہ کو قرآن عظیم الشان کے ساتھ مطابقت دیتے ہو؟

ایک صحابی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ حاجی حرم میں احرام کی حالت میں بھڑ کو قتل کرے تو اس پر جزا نہیں ہے۔ آپ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ نے اس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا کہ آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ یہ بات قرآن میں کہاں پر موجود ہے؟

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

من اطاعنی فقد اطاع اللہ۔

ترجمہ: جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

قرآن میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوہُ وَمَانَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوا وَاتَّقُوا اللّٰہَ (الحشر ۷)

ترجمہ: اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔

سمجھنے کے لائق بات یہ ہے کہ حضرت امامِ اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے شاگرد فقہاء کرام نے قرآن وحدیث سے پوری زندگی کے مسائل اخذ کرکے فقہ کی صورت میں ہمارے حوالے کئے تو اس سے اُن کا مقصد یہ نہیں تھا کہ عوام الناس اس عظیم علم کی کتب کو الماریوں اور لائبریریوں کی زینت بنا دیں اور قرآن وحدیث میں جھگڑنے لگیں۔ عوام کو چاہیئے کہ فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کریں اور ان کے مطابق زندگی گزاریں۔ رہے علماء تو وہ بھی قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لئے فقہ کے محتاج ہیں۔

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے ان پندرہ علوم کی ضرورت ہے:

۱۔لُغت ۲۔نحو ۳۔صَرف ۴۔اشتقاق ۵۔علمِ معانی

۶۔علمِ بیان ۷۔علمِ بدیع ۸۔علمِ قرأت ۹۔علمِ عقائد

۱۰۔اصولِ فقہ ۱۱۔اسبابِ نزول ۱۲۔ناسخ و منسوخ کا علم ۱۳۔علمِ فقہ

۱۴۔احادیث

اور ان سب کے بعد پندرہواں (۱۵) علمِ وہبی ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا عطیہ ٔخاص ہے۔اور یہ علم وہ اپنے مخصوص بندوں کو ہی عطا فرماتا ہے۔

اور اس کے بارے میں حدیث مبارکہ میں ہے کہ:

مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔

ترجمہ: جب بندہ اس چیز پر عمل کرتا ہے جس کو جانتا ہے تو حق تعالیٰ اسے ایسی چیزوں کا علم عطا فرماتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتا۔

نیز آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ:

من يَعش مِنْكُم يرى اخْتِلَافًا كَثِيرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔[1]

ترجمہ: جو لوگ میرے جانے کے بعد زندہ رہیں گے تو اختلاف بہت زیادہ ہو جائیں گے پس آپ لوگوں پر لازم ہے کہ میری سُنت اور میرے خلفاء راشدین کی سُنّتوں کو جو آپ کو بتائیں اُس پر عمل کریں اور اُسے دانتوں میں مضبوطی سے پکڑیں۔

---

[1] (مشکاۃ المصابیح، ج ۱، ص ۵۸، رواہ البخاری، مسلم، ترمذی)

پس اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اتباع کے ساتھ ساتھ خلفاءراشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی پیروی بھی ضروری ہے کیونکہ اسی میں فلاح وکامیابی ہے۔ دین سے لاعلم لوگ کہا کرتے ہیں کہ خلفاءراشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے احکامات پر عمل کرنا عبث (بے فائدہ) ہے انہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ رمضان المبارک میں بیس رکعات تراویح مقرر کریں۔ یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کون ہیں جنہوں نے حیلہ ٔ اسقاط مع القرآن کو مروج کیا اور چالیس دروں کی سزا کو بڑھا کر اَسی تک لے گئے؟

کیا ان بے دینوں کو اس حدیثِ مبارکہ کا علم نہیں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ۔ (رواہ المشکوٰۃ)

ترجمہ: آپ پر میری سُنت اور میرے خلفاءراشدین کی سُنت پر عمل کرنا لازم ہے۔

دوسری جگہ میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ:

اِقْتَدُوْا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدَ أَبِي بَكْرٍ وعُمَرُ۔ (رواہ المشکوٰۃ)

ترجمہ: اقتداء کریں اُن لوگوں کی جو میرے بعد ہیں یعنی ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

ایک دفعہ امہات المؤمنین کے دروازے پر ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے تھے جو کسی کام سے آئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اُنہیں دیکھا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات ناگوار گزری کہ امہات المؤمنین کے گھروں میں کوئی نامحرم داخل ہو۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ خیال آنا ہی تھا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے سورۃ النور کی یہ آیت نازل فرمادی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا (النور ۲۷)

ترجمہ: اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں نہ جاؤ جب تک اجازت نہ لے لو اور اُن کے ساکنوں پر سلام نہ کر لو۔

پس مذکورہ بالا حدیث سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بالخصوص خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اتباع کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس ضمن میں مستند کتب میں بے شمار دلائل موجود ہیں لیکن عاقل کے لئے اتنا بھی کافی ہے۔

اس ساری بحث کا لبِ لباب اور خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی دُنیاوی اور اُخروی نجات کے لئے قرآن عظیم الشان، احادیث نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اور اجماعِ اُمت پر عمل انتہائی ضروری ہے اور اجماعِ اُمت میں سب سے افضل اجماع وہ ہے جس میں خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا ان میں سے کوئی ایک بھی موجود ہو۔ اور چوتھے نمبر پر قیاس ہے، لیکن قیاس ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، اس کے لئے مجتہد ہونا ضروری امر ہے۔

المختصر جن کاموں کا حکم ہمیں آقا و مولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے دیا ہے ان پر عمل کرنا اور جن سے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے روکا ہے ان سے رُک جانا لازم وضروری ہے تا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا حاصل ہو اور اُخروی نجات ممکن ہو سکے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز نے ابتداءِ مکتوب میں خواجۂ جہاں کے مندرجہ ذیل چار دعاؤں سے نوازا ہے:

پہلی دعاء

اللہ تعالیٰ آپ کو قلبِ سلیم عطا فرمائے۔

کیونکہ قلبِ سلیم ہی محلّ تجلیات وانوار ہے، اسی پر شرفِ انسانیت کا اِنحصار ہے۔ آیتِ قرآنی يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ (۸۸) إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الشعراء ۸۹) کے مطابق قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قلبِ سلیم ہی نافع وموجبِ نجات ہوگا۔

قلبِ سلیم ماسویٰ اللہ کی آلودگی سے فارغ دل کا نام ہے۔ خدا کے ذکر سے غافل دل کو قلبِ سقیم کہا جاتا ہے وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا (الکھف ۲۸) سے دلِ بیدار اور دلِ بیمار کا فرق واضح ہے۔ حدیث میں اللہ تعالیٰ سے قلبِ خاشع طلب کرنے کی دعا سکھائی گئی ہے: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ۔[1] قلبِ خاشع ہی قلبِ سلیم ہوتا ہے۔

دوسری دعاء

اللہ تعالیٰ آپ کو شرحِ صدر عطا فرمائے۔

شرحِ صدر وہ عطیۂ ربانی ہے جو حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو عطا ہوا۔ أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (المنشرح ۱)

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے بھی شرح صدر کی دعاء مانگی رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (طٰہٰ ۲۵) شرح صدر بصیرتِ قلبی، فراستِ ایمانی اور قوتِ نورانی کا نام ہے۔ أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ (الزمر ۲۲) انشراحِ صدر سے بندۂ مؤمن کو عقلی شعور اور قلبی نور حاصل ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ رُشد وہدایت اور علم ومعرفت کی منزلیں طے کرتا ہے۔

تیسری دعاء

اللہ تعالیٰ آپ کے نفس کا تزکیہ فرمائے۔

---

[1] (صحیح مسلم، ج۲، ص ۳۵۰)

تزکیہ نفس ہی سالک کے لئے کامیابی کی کلید اور باریابی کی نوید ہے۔ جیسا کہ فرمایا: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى (الاعلیٰ ۱۴) محبتِ ذاتی اور تجلیٔ ذاتی کا شرف تزکیہ نفس پر موقوف ہے، اخلاصِ عمل بھی تزکیہ نفس ہی کا ثمرہ ہے۔

چوتھی دعاء

اللہ تعالیٰ آپ کے جسم کی کھال کو نرم کرے۔

تزکیہ نفس کے ذریعے جب سالک کی رُوح صفائی حاصل کر لیتی ہے اور نفس کے اثراتِ بد دور ہو جاتے ہیں تو اس کے نتیجے میں باطن کا اثر جسم کے ظاہر پر بھی نمودار ہوتا ہے اور سالک کا جسم بمنزلہ روح ہو کر نرم ولطیف اور ملائم ہو جاتا ہے اَجْسَادُنَا اَرْوَاحُنَا کا مقولہ بھی اسی حقیقت پر صادق آتا ہے۔ بلکہ بعض بزرگانِ دین کے جسم کا سایہ بھی نہیں رہتا۔ حضرت سیدنا چنن شاہ آلو مہاروی اور حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی علیہما الرحمۃ کے بارے میں ایسی روایات سُنی گئی ہیں۔ وَاللہُ اَعْلَمُ

مولانا روم نے فرمایا:

چو فنا در فقر پیرایہ شود ۔۔۔ اُو محمد وار بے سایہ شود

بینہ نمبر ۱

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ دعاؤں میں ذکر کئے گئے اور دیگر تمام کمالات روح، سِر، خفی اور اخفیٰ محض اتباعِ سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ پر موقوف ہیں اور یہ امر حقیقتِ واقعی ہے کیونکہ سلامتیٔ قلب نسیانِ ماسویٰ اللہ کے ساتھ مربوط ہے، اور شرح صدر تزکیہ نفس پر منحصر ہے۔ نیز کمالاتِ روح، تجلیٔ صفات اور کمالاتِ سِر، تجلیٔ شیونات اور کمالاتِ خفی، تجلیٔ صفاتِ سلبیہ اور کمالاتِ اخفیٰ، تجلیٔ شانِ جامع کے ساتھ مربوط و مشروط ہیں۔

سطورِ بالا میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے خلفاء راشدین (حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو ہدایت کے ستارے قرار دے کر اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ, الخ[1] حدیث کے مفہوم کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور ولایت کے آفتاب کہنے سے ان کے مراتبِ قرب و محبت کو بیان فرمایا ہے۔ آپ نے خلافتِ راشدہ اور شانِ صحابیت کے متعلق اہلِ سُنت کے عقائد کی ترجمانی فرماتے ہوئے ان کی اتباع کو فوزِ عظیم (بڑی کامیابی) اور ان کی مخالفت کو ضلالِ بعید (دور کی گمراہی) قرار دیا ہے۔

تعظیمِ صحابہ

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ السامی اپنے مکتوباتِ قُدسیہ میں جمیع صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعظیم و توقیر اور فضیلت و عظمت کا ذکر نہایت واضح اور پُرزور الفاظ میں فرماتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں اہلِ سنت و جماعت کے عقائد کی پوری طرح تائید و تقویت فرماتے ہیں ان کے مخالفین و معاندین کے طعن و تشنیع اور اعتراضات کا نہایت شدّ و مدّ سے دفاع فرماتے ہیں، ان کے درمیان لڑائی جھگڑوں کو نیک وجہ پر محمول کرنے اور ان کی آپس میں مخالفتوں کو تاویل و اجتہاد پر مبنی قرار دینے اور ہوا و تعصب سے دور سمجھنے پر زور دیتے ہیں، اور آپس کے اختلاف میں جن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو خطا پر کہا ہے ان کی خطا کو خطائے اجتہادی کی طرح قرار دیتے ہیں۔ آپ کے نزدیک خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ذکر اگرچہ خطبہ کی شرائط میں سے نہیں ہے لیکن اہل سنت شَکَرَ اللہ تعالیٰ سَعْیَھُمْ کے شعائر میں سے ہے۔ سوائے اس شخص کے جس کا دل بیمار اور باطن پلید ہو اور کوئی شخص دانستہ اور سرکشی کے طور پر اس کو ترک نہیں کرے گا۔

---

[1] (مشکوٰۃ، ص ۵۵۴)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَبَّ أَصْحَابِي لَعَنَهُ اللهُ، وَالْمَلَائِكَةُ، وَالنَّاسُ أَجْمَعُونَ۔[1]

ترجمہ: جس نے میرے صحابہ کو گالی دی، اس پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور تمام آدمیوں کی لعنت ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

إن شرار أمتي أجرؤهم على صحابتي۔[2]

میری اُمت میں سے برے وہ لوگ ہیں جو میرے اصحاب پر دلیر ہیں۔

ان لڑائی جھگڑوں کو جو ان کے درمیان واقع ہوئے ہیں نیک وجہ پر محمول کرنا چاہیئے اور ہَوا وتعصب سے دور سمجھنا چاہیئے، کیونکہ وہ مخالفتیں تاویل واجتہاد پر مبنی تھیں نہ کہ ہَوا وہوس پر۔ یہی اہلِ سنت کا مذہب ہے۔

شیخ سلطان اور ان کے بیٹوں کی سفارش

آخر میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے شیخ سلطان مرحوم کے دونوں بیٹوں کی معاشی پریشانی کا ذکر فرما کر ان کی مالی اعانت کے لئے سفارش فرمائی ہے۔ شیخ سلطان حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے خُسر تھے۔ آپ حج وزیارتِ حرمین شریفین سے مشرف تھے، علومِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ اسی استعداد کی بنیاد پر کافی عرصہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر شاہی خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد میں گاؤکُشی

---

[1] (مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۲۴)

[2] (کنز العمال، ج ۱۱، ص ۵۳۲)

کے جرم میں جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد پھر اپنے عہدہ پر بحال ہو گئے مگر ہندو لوگ تعصب کی بناء پر اکبر بادشاہ کو آپ کے خلاف مسلسل بھڑکاتے رہے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۵۹۹ء (۱۰۰۷ھ) میں حضرت شیخ سلطان علیہ الرحمۃ کو پھانسی دے دی گئی۔[1]

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۲۹ تا ۶۳۴)

الحاصل

ہمارے آقا و مولا خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم معیار حق اور مینارۂ نور ہیں۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی ایک صحابی کا انکار سارے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا انکار ہے۔ ہر راسخ العقیدہ سنی کو ہر صحابی سے پیار ہے۔ نفس صحابیت میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم برابر ہیں، مگر جزوی فضائل و درجات میں برابری نہیں ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان جو مشاجرات، مجادلات ہوئے ان پر کف لسان اختیار کرنے کا حکم ہے۔ ان کو بنیاد بنا کر کسی ایک صحابی کو بھی برا بھلا کہنا اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

حضرت سیدنا مولائے کائنات علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم اور حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان جو کچھ بھی ہوا اس پر ہمیں عامیانہ اور گستاخانہ انداز میں لب کشائی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ ہاں اکابرین اہل سنت کے ارشادات کی روشنی میں ان جنگوں میں حضرت شیر خدا کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم حق پر تھے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطا پر

---

[1] (منتخب التواریخ و رودِ کوثر)

تھے لیکن ان کی یہ خطاء اجتہادی تھی۔ نفس صحابیت میں دونوں بزرگ برابر ہیں۔ البتہ حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم میں بعض ایسی فضیلتیں ہیں جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں نہیں، یہی اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ ستم ظریفی اور ظلم کی انتہاء ہے کہ گمراہی اور بے دینی کی آندھی میں بعض لوگ سنیت کا لبادہ اوڑھ کر "حب علی میں بغض معاویہ" کا کردار ادا کر رہے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صحابیت سے ہی خارج کر دیتے ہیں۔ (العیاذ باللہ) سادہ لوح سنی ان کے دام تزویر میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب و شتم اور تبرا بازی کرنا شب و روز کا وظیفہ بنا لیتے ہیں۔ سلف صالحین اور علماء مجتہدین میں سے کسی نے بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحابیت سے انکار نہیں کیا بلکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل، مناقب، محامد اور محاسن بیان کئے ہیں۔ اس پر اکابرین امت کی تصانیف شاہد و عادل و ناطق ہیں۔

مفتاح السلوک میں لکھا ہے:

بعض علماء سوء صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تنقیص اور جرح کرتے ہیں حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جرح کرنے والے زندیق ہیں۔

امام ابو زرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم الرازی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۶۴ھ) کا یہ ارشاد بہت سے اکابر نے نقل کیا ہے:

إذا رأيت الرجل ينتقص أحدا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فاعلم أنه زنديق، لأن الرسول صلى الله عليه وسلم عندنا حق، والقرآن حق، وإنما أدى إلينا هذا القرآن

والسنن أصحاب رسول الله، وإنما يريدون أن يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب والسنة، والجرح بهم أولى، وهم زنادقة۔[1]

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی تنقیص کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ ہمارے نزدیک برحق ہیں اور قرآن کریم برحق ہے۔ جو تعلیمات آپ ﷺ لے کر آئے وہ برحق ہیں۔

اور یہ سب چیزیں ہم تک پہنچانے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوا کوئی نہیں، اور یہ لوگ ارادہ رکھتے ہیں کہ ہماری شہادتوں کو مجروح کر دیں تاکہ کتاب و سنت باطل ہو جائیں، ان کے اوپر جرح اولیٰ ہے، اور یہی زنادقہ ہیں۔

(مفتاح السلوک جلد ہفتم)

---

[1](العواصم من القواصم في تحقيق مواقف الصحابة بعد وفاة النبي صلى الله عليه وسلم، ج ۱، ص ۳۴)

مکتوب نمبر ۲۶

[اس امر کے بیان میں کہ شوق ابرار کو ہوتا ہے، مقربین کو نہیں ہوتا۔ اور اس مقام کے مناسب علوم کے بیان میں۔۔۔۔۔دانش مند مولانا حاجی محمد لاہوری کو لکھا گیا:

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں شریعتِ مصطفویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے طریقہ پر قائم وثابت رکھے۔

حدیثِ قدسی میں وارد ہوا ہے کہ اَبرار کو میری ملاقات کا شوق عرصہ دراز سے دامن گیر ہے اور میں ان کی ملاقات کا شوق ان سے بھی زیادہ رکھتا ہوں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس کلام میں ابرار کے لئے شوق ثابت کیا ہے۔ کیونکہ مُقربین واصلین کو کوئی شوق نہیں ہوتا۔ کیونکہ شوق کسی شے کے گم ہونے کا متقاضی ہے۔ اور گم ہونا مقربین کے حق میں مفقود ہے۔ دیکھتے نہیں کہ انسان اپنی ذات کا مشتاق نہیں ہوتا۔ حالانکہ اسے اپنی ذات سے انتہاء درجہ کی محبت ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کی اپنی ذات مفقود نہیں۔ تو مُقرب واصل کا حال جو حق تعالیٰ کے ساتھ باقی اور اپنے نفس سے فانی ہو چکا ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح انسان کا اپنی ذات کے ساتھ تعلق ہے، لہٰذا مشتاق صرف ابرار ہی ہیں۔ کیونکہ یہی لوگ محب فاقد گم کردگانِ مطلوب ہیں۔ اور ابرار سے مراد غیر واصل اور غیر مُقرب ہیں۔ خواہ وہ ابتدا میں ہوں یا درمیان میں اگرچہ وسط سے ایک رائی کے دانہ برابر کچھ ہی باقی ہو۔

فارسی میں کیا ہی اچھا کہا گیا ہے:

فراق دوست اگراندک است اندک نیست

درون دیدہ اگر نیم موست بسیار ست

ترجمہ: دوست کا فراق اگر تھوڑا بھی ہو تو وہ تھوڑا نہیں ہے۔ آنکھ میں آدھا بال بھی پڑ جائے تو وہ بہت ہے۔]

تشریح

بعض سالک ایسے ہوتے ہیں جنہیں وصل کا شوق ہر وقت دامن گیر رہتا ہے، اور وہ اس ذوق وشوق میں تڑپتے رہتے ہیں۔ انہیں ابرار کہا جاتا ہے اور وہ یا تو ابتدائی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں یا پھر متوسط۔ اور دوسرے سالک وہ ہیں جن کا شوق ختم ہو جاتا ہے، انہیں مقربین کہا جاتا ہے، اور یہی وہ صوفیاء ہیں جو منتہی اور واصل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔ اگر کسی شخص نے سوات یا کاغان وناران کو نہیں دیکھا ہو تا تو اُسے ہر وقت اس خوبصورت علاقے کے سرسبز پہاڑ، آبشاریں، پانی کے ٹھنڈے چشمے، خوبصورت جھیلیں اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت دیکھنے کی خواہش رہتی ہے۔ چونکہ وہ ابھی سوات یا کاغان وناران نہیں پہنچا ہوتا اس لئے اسے اس کا شوق تنگ کرتا رہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اُڑ کر سوات اور کاغان وناران پہنچ جاؤں۔ جبکہ دوسرا وہ شخص جو سفر طے کر کے سوات اور کاغان وناران جا پہنچتا ہے تو وہاں کی رنگینی دیکھ چکنے کے بعد اُس کا شوق ٹھنڈا ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ اب وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے اور منزل کو پا کر تسکین حاصل کر چکا ہے۔ یہی حال ابرار اور مقربین کا ہے۔ ابرار وہ لوگ ہیں جو سلوک کی ابتدائی منزل میں ہوتے ہیں اور ابھی اپنی منزل سے دور ہیں (اور ابھی اپنے خالق ومالک سے وصل نہیں ہوئے) اسی لئے انہیں شوقِ ملاقات نے تڑپا رکھا ہے۔ جبکہ مُقربین چونکہ وصل کا مزہ لے چکے ہیں اور سفر طے کر کے منتہی ہو چکے ہیں اس لئے شوق نے اُن کے ظاہر سے تعلق توڑ لیا ہے۔ ہاں البتہ ان کا باطن کبھی بھی سیر نہیں ہوتا۔ لیکن ظاہراً وہ مطمئن ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کفار ہمارے امام وپیشوا حضرت رسالتِ پناہ صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ظاہری حالت دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ عجیب نبی ہے جس نے شادیاں بھی کی ہوئی ہیں، کھاتا پیتا بھی ہے اور بازاروں میں بھی گھومتا پھرتا ہے۔ لیکن وہ بے دین لوگ کیا جانیں کہ منتہی واصل کے باطن میں کون سی کیفیات پنہاں ہیں۔

احادیث مبارکہ کا بغور مطالعہ کرنے اور متقدمین اولیاء کرام کی تعلیمات سے پتا چلتا ہے کہ ذاکرین تین قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے ذاکرین وہ ہیں جو لسانی ذکر میں مشغول ہوتے ہیں اور ہر نماز کے بعد اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کی حمد بیان کرتے ہیں۔ یہ ابتدائی سالک ہوتے ہیں۔ ذاکرین کی دوسری قسم وہ ہے جو ذکرِ قلبی میں مشغول رہتے ہیں اور شرکِ خفی (ریا) سے پاک ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت ذکر میں مشغول رہتے ہیں لیکن لوگوں سے ان کا ذکر پوشیدہ رہتا ہے اور یہ متوسط کہلاتے ہیں۔ تیسری قسم کے ذاکرین وہ ہیں جو ذکرِ سِر کے حامل ہیں۔ یہ ذکر روح کا ہوتا ہے۔ اس درجہ پر سب سے پہلے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مشرف ہوتے ہیں اور ان بزرگ ہستیوں کی کامل اتباع کرنے والوں کو بھی اس نعمت سے حصہ ملتا ہے۔ اس درجہ کے سالک کی ارواح عروج میں رہتی ہیں اور بدن دعوتِ خلق میں مشغول ہوتے ہیں۔

ان تین قسم کے ذاکرین میں سے پہلے دو ابرار ہیں اور تیسرے مقربین۔ ان مقربین کی ارواح اور قوتِ جذب اتنی قوی ہوتی ہیں کہ جب وہ کسی شخص کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس کے قلب کو بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل سے ذاکر کر دیتے ہیں اور اس دنیا سے اُس کا رُخ موڑ کر خالقِ دنیا کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ ایسے مُقرب دنیا میں اور خاص طور پر اس زمانے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت ہیں۔ ان کے وجود نادر ہو چکے ہیں، ایسے عجیب الخصلت صوفیاء کرام کی نظر قلبی امراض کی دوا اور ان کا کلام شفاء ہے، اور یہی دراصل کاملین اولیاء کرام ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شوق کو اَبرار کے حق میں ثابت فرمایاہے اور مقربین کو شوق سے فارغ رکھاہے کیونکہ شوق مطلوب کے نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور مقربین تو پہلے ہی مطلوب کے حصول اور وصول سے شاد کام ہوتے ہیں۔ آپ اس کی مثال یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہر شخص اپنے وجود سے محبت کے باوجود اپنے وجود کا اشتیاق نہیں رکھتا کیونکہ اس کا وجود اس کے پاس ہمیشہ حاضر و حاصل ہے۔

شوق کا مفہوم

لغت میں شوق سخت خواہش اور بڑی آرزو کا نام ہے۔ اصطلاحِ صوفیاء میں شوق مشاہدۂ محبوب کے بعد پیدا ہونے والی حالت کو کہتے ہیں جس میں لقائے محبوب کے بغیر کسی صورت تسکین نہ ملے، کیونکہ اصولی طور پر وقتی مشاہدہ سے دائمی مشاہدہ کا شوق بڑھتا ہے یا سالک کے اس حال کا نام شوق ہے جس میں اَن دیکھے محبوب کی طرف رغبت کا مظاہرہ کرے اہلِ سلوک شوق کو قُربِ الٰہی کے لئے علت غائی قرار دیتے ہیں اور یہ حالت مُحب اور محبوب دونوں پر برابر طاری رہتی ہے۔ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّونَہٗ (المائدۃ ۵۴) میں اسی حالت کا بیان ہے۔

عاشقاں ہر چند مشتاق جمال دِلبر اند
دلبراں بر عاشقاں از عاشقاں عاشق تراند

حضرت امام ابو القاسم قشیری قدس سرہٗ نے رسالہ قشیریہ میں شوق کی تائید اور اس کے ثبوت میں یہ آیت تحریر فرمائی ہے۔

مَنْ کَانَ یَرْجُو لِقَاءَ اللّٰہِ فَإِنَّ أَجَلَ اللّٰہِ لَآتٍ (العنکبوت ۵)

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی اُمید رکھتا ہے (اسے معلوم ہونا چاہیئے) کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے والا ہے۔

نیز آپ نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ایک دعائے شوق بھی نقل فرمائی ہے۔

وَأَسأَلُکَ النَّظَرَ إِلَی وَجھِکَ الْکَرِیمِ, وَشَوْقًا إِلَی لِقَائِکَ فِي غَیْرِ ضَرَّاءٍ مُضِرَّۃٍ۔[1]

رِجال اِشتیاق

بعض اہل تصوف کے نزدیک اولیاء کے ایک گروہ کا رِجالِ اشتیاق کہا جاتا ہے جو حالتِ شہود واشتیاق میں رہتے ہیں اور اشتیاق ان کو حالتِ اضطراب میں رکھتا ہے اور ان کے جگر میں حرِقت (جلن) پیدا کرتا ہے، ان کو ملوکِ طریق بھی کہا جاتا ہے۔

مُقربین

مقربین واَبرار کی اصطلاحات قرآن کریم سے ماخوذ ہیں جیسا کہ أُولَئِکَ الْمُقَرَّبُونَ (الواقعة ١١) اور إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ (المطففين ٢٢) سے ظاہر ہے۔

واضح رہے کہ جو مقربین شوق سے خالی ہوتے ہیں ان کو مقربِ واصل کہا جاتا اور مقرب واصل وہ خوش نصیب افراد ہوتے ہیں جو صفاتِ بشریہ سے فانی ہو کر صفاتِ باری تعالیٰ سے باقی ہو چکے ہوں۔

---

[1] (رسالہ القشیریة، ج٢، ص٤٩٦)

اسی لئے مقربین کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مقربِ مُبتدی ۲۔ مُقربِ متوسط ۳۔ مُقربِ واصل

مذکورۃ الصدر پہلے دونوں مقربین (مبتدی و متوسط) اہلِ شوق سے شمار کئے گئے ہیں۔

اَبرار

اَبرار سے مراد وہ اہلِ شوق ہیں جو ابھی تک فنا و بقا کی لذت اور عروج و نزول کے معارف سے مشرف نہ ہوئے ہوں لیکن ذاتِ حق کی طلب میں ہر وقت مُضطرب اور بے قرار ہوں اور مطلوب کے تصورِ جمال و وصال سے ان کے صبر و سکون کی دنیا میں زلزلے پیدا ہوتے ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اسی کیفیت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا:

عَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَى (طٰہٰ ۸۴)

یعنی اے میرے رب میں تیری طرف آنے میں مضطرب تھا تاکہ تیری رضا حاصل کر سکوں۔

حدیثِ شوق

حدیثِ شوق: طَالَ شَوْقُ الْاَبْرَارِ اِلٰی لِقَائِیْ۔[1]

---

[1] (احیاء العلوم، ج ۴، ص ۳۴۲)

تخریجِ حدیث: معرب مکتوبات حضرت علامہ محمد مراد مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس حدیث کی تخریج کے بارے میں جو کچھ فرمایا اس کا اردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ ذَكَرَهُ فِي الْاَحْيَآءِ بِلَفْظِ لَقَدْ طَالَ شَوْقُ الْاَبْرَارِ۔ یعنی احیاء میں اس حدیث کو ان الفاظ (مذکورہ) سے ذکر کیا ہے۔ عراقی نے اس کی تخریج میں کہا ہے کہ میں نے اس کی کوئی اصل نہیں پائی لیکن صاحب الفردوس نے اس کو حدیث ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ذکر کیا ہے اور ان کے بیٹے نے مسند الفردوس میں اس کی سند ذکر نہیں کی، اور شیخ اکبر قدس سرہٗ نے فتوحاتِ مکیہ میں کسی مقام پر کہا ہے کہ "حدیث میں وارد ہوا ہے" لیکن اس کی صحت کا مجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف شوق رکھنے کا ذکر فرمایا

حدیثِ قدسی ہے:

حدیثِ قدسی

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

(حَدِيثٌ قُدْسِيٌّ) وَالْفَرْقُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقُرْآنِ أَنَّ الْأَوَّلَ يَكُونُ بِإِلْهَامٍ أَوْ مَنَامٍ أَوْ بِوَاسِطَةِ مَلَكٍ بِالْمَعْنَى، فَيُعَبِّرُهُ بِلَفْظِهِ وَيَنْسِبُهُ إِلَى رَبِّهِ، وَالثَّانِي لَا يَكُونُ إِلَّا بِإِنْزَالِ جِبْرِيلَ بِاللَّفْظِ الْمُعَيَّنِ، وَهُوَ أَيْضًا مُتَوَاتِرٌ، بِخِلَافِ الْأَوَّلِ فَلَايَكُونُ حُكْمُهُ حُكْمَهُ فِي الْفُرُوعِ۔[1]

ترجمہ: حدیث قدسی اور قرآن میں فرق یہ ہے کہ حدیثِ قدسی الہام یا خواب یا فرشتے کے ذریعے بالمعنی نازل ہوتی ہے، پھر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اس کو اپنے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں اور اپنے رب تعالیٰ کی طرف اس کو منسوب فرماتے ہیں اور قرآن کریم جبریل امین علیہ السلام معین الفاظ میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر نازل کرتے ہیں اور قرآن متواتر ہوتا ہے، بخلاف حدیثِ قدسی کے پس اس کا حکم فروع میں نہیں ہوتا۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۳۷ تا ۶۴۱)

[صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ قرآن مجید پڑھتا ہے اور روتا ہے۔ تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم لوگ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ لیکن اب ہمارے دل سخت ہو چکے ہیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد مدح مشابہ ذَم کے قبیل سے

ہے، اور اپنی ذات کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ ان سے زیادہ ان کا مشتاق ہے اور مجھے نہ کشف سے اس کا کچھ علم ہو سکا اور نہ کسی صحیح روایت سے۔ لیکن یہ مذکور حدیث مشہور ہے (انتہیٰ ملخصًا) لیکن اس مذکورہ روایت کے معنی صحیح ہیں جو اس حدیث کے مطابق ہیں:

إِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا۔ (صحیح البخاری، ج ۲، ۱۱۰۱)

یعنی اگر میرا بندہ میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔

[1] (المرقاۃ، ج ۱، ص ۹۵)

ہے۔میں نے اپنے شیخ (خواجہ محمد الباقی) قدس سرہٗ سے سنا، آپ فرماتے تھے منتہی واصل بہت دفعہ اس شوق اور طلب کی آرزو کرتا ہے، جو اسے ابتدا میں حاصل تھی۔]

تشریح

سلوک کے ابتدائی مراحل میں مبتدی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی روتا ہے کبھی چیختا چلاتا ہے اور اس پر وجدانی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ ذوق وشوق کی کثرت ہوتی ہے لیکن جب وہ منتہی ہو جاتا ہے تو اس کی پہلے والی کیفیات نہیں رہتی۔ اُس وقت وہ پہلی کیفیات کی خواہش کرتا ہے کیونکہ اُن میں اسے لذت وسرور محسوس ہوتا تھا جو کہ انتہاء میں مفقود ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انتہاء میں سالک کی روح، بدنِ عنصری سے معنوی جدائی اختیار کر لیتی ہے اور جب وہ جسم کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اس میں نفس وشیطان کی شمولیت دیکھتی ہے، اس لئے اپنے آپ کو کافرِ فرنگ سے بھی بدتر خیال کرتی ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول اس بات کی تائید میں پیش فرمایا ہے کہ "شوق ابرار کو ہوتا ہے مقربین کو نہیں" قاری کا تلاوت کے دوران رونا شوق اور وَجد کی علامت ہے۔ آپ چونکہ مقربِ واصل ہو گئے تھے اس لئے شوق اور وجد وغیرہ باقی نہ رہا تھا۔ بظاہر آپ کے اس قول میں ذم (برائی) کا پہلو نکلتا ہے لیکن حقیقت میں یہ بھی آپ کی مدح کا مظہر ہے اور آپ کے مرتبہ کمال پر فائز ہونے کی خبر دیتا ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۲۴۲)

[اور اس شوق کے زائل ہو جانے کا مقام اور ہے جو اول سے اکمل اور اَتم ہے۔ اور ادراک سے عاجز اور نا امید ہونے کا مقام ہے۔ کیونکہ شوق متوقع چیز کا ہوتا ہے، جب کسی شے کی توقع اور اُمید نہ ہو تو اس کا شوق بھی نہیں ہوتا۔]

تشریح

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ مبتدی اور متوسط سالک وجد و حال اور شوق کی کثرت کی وجہ سے جب مشاہدات میں گرفتار ہوتا ہے تو اپنی روح کو ہی خدا سمجھ لیتا ہے اور اس کی پرستش کرنے لگتا ہے، لیکن جب وہ یہاں سے ترقی کرکے آگے گزرتا ہے تو اسے اپنے کشف کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ایسی ذات ہے کہ نہ وہ جوہر ہے نہ عرض، نہ اُس کی ضد ہے اور نہ جنس، نہ اس کی کوئی مثال ہے اور نہ وہ کسی مکان کا مکین ہے، اُس پر زمانے کا گزر بھی نہیں ہے، نہ اُس کے لئے کوئی سمت ہے اور نہ اُس پر کوئی کام واجب ہے۔ اُس کی ذات وصفات اور اسماء میں بھی کوئی شریک نہیں تو ثابت ہوا کہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ورأ الوریٰ ہے ثم ورأ الوریٰ۔ تو اب وہ اس کے ادراک سے عاجز آجاتا ہے اور یہی مقام یاس ونومیدی کا مقام ہے۔ اسی مقام پر شوق زائل ہو جاتا ہے اور یہ مقام خاص مقربین الٰہی کا مقام ہے۔ ہر کسی کو یہاں گزر نصیب نہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے فضلِ عظیم سے ہمیں اس مقام کے فیوض وبرکات سے مستفید فرمائے، آمین۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ رفعِ شوق (شوق کا زائل ہونا) کا سبب دو امر ہوتے ہیں۔ اول وصل، دوم عجز عَنِ الادراک۔ کیونکہ وصل کے بعد مقرب واصل کو شوق نہیں رہتا اور اسی طرح جب مطلوب کے حصول کی اُمید بھی باقی نہیں رہتی تو سالک عاجزی اور نا اُمیدی کی

حالت میں شوق بھی گم کر لیتا ہے اور سالکین کی استعداد بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ بعض وہ ہوتے ہیں جو صرف وصل پر قناعت کر لیتے ہیں اور اِدراک کے طالب نہیں ہوتے لیکن بعض اپنی استعداد کی بلندی کی وجہ سے ادراک کی طلب بھی رکھتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے سالک نزولی مراتب میں مختلف الاحوال ہوتے ہیں۔ مثلاً جو سالک وصل پر ہی قناعت کر لیتے ہیں اور اِدراک کی طلب نہیں رکھتے وہ حالتِ نزول میں (جو کہ مطلوب کے گم ہو جانے کا وقت ہے) دوبارہ صاحبِ شوق ہو جاتے ہیں اور مطلوب کو حاصل کرنے کے لئے بے تاب رہنے لگتے ہیں اور جو سالک طالبِ ادراک ہونے کے باوجود اِدراک سے عاجز اور مایوس ہو جاتے ہیں وہ حالتِ نزول میں بھی شوق سے خالی رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عروجی مراتب میں بھی ادراک ناممکن ہے۔ ایسے سالک کی استعداد بہ نسبت پہلے سالک کے زیادہ بلند ہوتی ہے۔

بینہ نمبر ۱

یاد رہے کہ حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ کے یہ معارف (جو اس مکتوب میں بیان ہوئے) آپ کو ابتدائی احوال میں پیش آئے تھے جو کہ معارفِ ولایت میں سے ہیں۔ آپ کے آخری معارف ان سے بہت بلند تر ہیں جو کہ معارفِ نبوت سے کامل مماثلت رکھتے ہیں جیسا کہ دفترِ سوم کے آخری مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اس وقت آپ وصل سے گزر کر ادراکِ بسیط اور درک الادراک سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۴۳ تا ۶۴۴)

[تو جب یہ کامل جو نہایت کمال کو پہنچ چکا ہوتا ہے اس عالم کی طرف رجوعِ قہقری کرتا ہے تو رجوع کی وجہ سے مطلوب کے مفقود ہونے کے باوجود وہ شوق عود نہیں کرتا۔ کیونکہ شوق کا زوال

مطلوب کے گم ہونے کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ اس کا زوال یاس اور ناامیدی کے حصول کی بنا پر تھا۔ اور وہ رجوع الی الخلق کے بعد بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے برعکس کامل اول کا شوق عالم کی طرف رجوع کرنے سے واپس عود کر آتا ہے۔ کیونکہ وہی مطلوب کی گمشدگی پھر اسے حاصل ہو جاتی ہے جو پہلے زائل ہو چکی تھی۔ تو جب رجوع کی باعث مطلوب کا فقدان پایا گیا تو وہ شوق پھر حاصل ہو جاتا ہے جو اس کے زوال کے باعث زائل ہو چکا تھا۔]

تشریح

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے قرب کے حصول کے لئے سالک کے لطائف کا عروج قلب سے شروع ہوتا ہے اور بالترتیب روح، سر، خفی اور اخفیٰ تک اور اس سے بھی آگے جہاں تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ چاہے۔ پھر اگے اُسے واپس نزول ملے تو وہ سالک کامل ولایت حاصل کر لیتا ہے اور وارثِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بن کر دعوتِ خلق پر مامور ہوتا ہے اور نزول نہ کرے تو مستہلک اولیاء میں شمار ہوتا ہے اور مجذوبانہ زندگی گزارتا ہے۔ پھر جہاں تک نزول کا تعلق ہے تو جیسے عروج کیا تھا ویسے ہی اُسے لطائف سے گزار کر وہاں تک لایا جاتا ہے، جہاں سے عروج شروع کیا تھا یعنی قلب سے۔ تو اگر قلب سے عروج کر کے واپس قلب میں نزول ہو تو اس نزول کو رجوعِ قہقری کہا جاتا ہے اور کامل و مکمل ولی کے لئے رجوع قہقری ضروری ہے۔ یہ رجوع اصل میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا حصہ ہے اور وراثت وتبعیت کے طور پر کامل اولیاء کرام کو بھی اس سے حصہ ملتا ہے۔ لیکن جب کسی سالک کو نزول تو ملے لیکن قلب تک نہ ہو بلکہ دوسرے لطائف میں رُک جائے تو اس کا رجوع، رجوعِ قہقری نہیں ہوتا اس لئے اس کی ولایت میں ایک گونہ نقص رہ جاتا ہے۔

[یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ وصول کے مراتب تو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ لٰہذا وصول کے بعض مراتب کی توقع اور امید تو رہتی ہی ہے۔ اس وجہ سے واصل مقرب کے لئے بھی شوق مذکور متصور ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہم اس اعتراض کے جواب میں کہتے ہیں کہ مراتب وصول کا منقطع ہونا سیر تفصیلی پر مبنی ہے جس کا تعلق اسماء، صفات، شیون اور اعتبارات سے ہے۔ اور سیر تفصیلی طے کرنے والے سالک کے لئے انتہاء متصور نہیں ہو سکتی، اور شوق مذکور کبھی بھی اس سے زائل نہیں ہو سکتا۔ اور جس واصل کامل کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس سے انتہاء کو پہنچ جانے والا وہ واصل مراد ہے جو مراتب کو بطریق اجمال طے کر چکا ہے۔ اور اس مقام تک پہنچ چکا ہے جسے نہ تو کسی عبارت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس مقام پر کسی قسم کی توقع باقی ہے۔ لٰہذا اس سے کلیۃً شوق و طلب زائل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خواص اولیاء کرام کا حال ہے۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو صفات کی تنگی سے نکل چکے ہیں اور ذات تعالیٰ و تقدس کی بارگاہ تک وصول حاصل کر چکے ہیں۔ بخلاف ان سالکین کے کہ صفات میں تفصیلاً اور شیونات میں ترتیب سے سیر کرنے والے ہیں۔ کیونکہ یہ حضرات تجلیات صفاتیہ میں ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محبوس و مقید رہتے ہیں۔ اور ان کے حق میں مراتب وصول سے مراد یہی ہے کہ وہ صفات تک ہی پہنچتے ہیں۔ اور حضرت ذات واجب تعالیٰ تک عروج صفات اور اعتبارات میں سیر اجمالی کے بغیر متصور نہیں۔ اور جس شخص کی سیر اسماء میں تفصیلی ہوتی ہے وہ صفات اور اعتبارات ہی میں محبوس رہتا ہے اور اس سے شوق و طلب زائل نہیں ہوتا۔ اور نہ وجد و تواجد ان سے جدا اور الگ ہوتا ہے۔ لٰہذا اربابِ شوق و تواجد تجلیات صفاتیہ والے ہی ہیں۔ اور جب تک یہ لوگ شوق و وجد میں رہتے ہیں انہیں تجلیات ذاتیہ سے کچھ حصہ نہیں ملتا۔]

تشریح

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے اسماء، صفاتِ فعلیہ، صفاتِ ذاتیہ، شیون اور اعتبارات کے بارے میں عقائدِ احناف کی کتب میں کافی بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب ذاتِ الٰہیہ کی طرح ازلی وابدی ہیں اور وصل کے لئے سالک کا ان کو طے کرنا ضروری ہے، طے کرنے سے مراد ہے ان میں سیر واقع ہونا۔ اور سیر دو طرح کی ہوتی ہے، ایک سیر تفصیلی اور دوسری سیر اجمالی۔

سیر تفصیلی والے سالک تجلیاتِ صفاتیہ سے آگے نہیں جاسکتے۔ اور یہاں پر رُک جانے کی وجہ سے ذوق وشوق میں گرفتار رہتے ہیں جبکہ سیر اجمالی کرنے والے سالک سے شوق اور طلب کی آرزو ختم ہو جاتی ہے اور وہ واصل ہو جاتے ہیں یہی وہ مقرب سالک ہیں جو تجلیاتِ ذاتیہ سے مستفید ہوتے ہیں۔

[اگر کوئی یہ سوال کرے کہ خدا تعالیٰ کے شائق ہونے کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی شے بھی مفقود نہیں ہو سکتی۔ تو میں اس سوال کے جواب میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے شوق کا ذکر صنعتِ مشاکلت کے طور پر ہو۔ اور اس میں شدت کا ذکر اس وجہ سے ہو کہ جو شے عزیز وجبار ذات کی طرف منسوب ہوتی ہے وہ بھی شدید وغالب ہوتی ہے۔ جس طرح عبدِ ضعیف کی طرف جو شے منسوب ہوتی ہے وہ بھی ضعیف اور مغلوب ہوتی ہے۔ یہ جواب طریقہ علماء کے مطابق ہے۔ اور اس عبدِ ضعیف کے پاس اور بھی بہت سے جوابات ہیں جو طریقہ صوفیہ سے مناسبت رکھتے ہیں۔ وہ جوابات کچھ سُکر چاہتے ہیں۔ سُکر کے بغیر وہ جوابات مستحسن نہیں۔ بلکہ جائز ہی نہیں۔ کیونکہ مست لوگ معذور ہیں۔ مگر اربابِ صحو سے باز پُرس ہو سکتی ہے، اور میرا حال اس وقت خالص صحو ہے لہٰذا

ان جوابات کا ذکر میرے حال کے لائق ومناسب نہیں۔ اسے ذہن نشین کر لو۔ الحمد للہ اولاً واٰخراً، والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہٖ دائمًا وسرمدًا۔]

تشریح

تصوف کے بعض علوم حالتِ سُکر سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض اعلیٰ درجہ کے معارف حالتِ صحو کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ اور سالک پر یہ دونوں حالتیں (سُکر و صحو) حتماً طاری ہوتی ہیں۔ لیکن دھیان رہے کہ سُکر اور اس کی کیفیات قابلِ تقلید اور لائقِ بھروسہ نہیں۔ تقلید اور صحبت کے لائق صرف حالتِ صحو ہے۔

حالتِ سُکر والا سالک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق کی تعلیم وتربیت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے جس صوفی سے دعوت وتبلیغ کا کام لینا ہوتا ہے اُسے صحو کی دولت نصیب کرتا ہے، تاکہ وہ ہوش وحواس کی حالت میں لوگوں کو دینِ حق کی طرف راغب کر سکے اور اس اہم فریضہ میں غلطی نہ کرے۔ تاہم سُکر بھی کیف وسرور اور لذت ومستی رکھنے والی کیفیت ہے اور بہت سے علوم کا افاضہ اس کا مرہونِ منت ہے، اور یہ کیفیت خود صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر ایک دن حضرت زید بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حالتِ سُکر کی علامات طاری تھیں، اس لئے عرض کی کہ اگر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اجازت عنایت فرمائیں تو قیامت تک پیش آنے والے حالات وواقعات عرض کر دوں۔ مگر حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اُنہیں اجازت عطانہ فرمائی اور خاموش رہنے کا حکم صادر

فرمایا۔ پس ثابت ہوا کہ سالکینِ طریقت پر سُکر کی کیفیت کا طاری ہونا تصوف کا حصہ ہے اور یہی وہ حالت ہے جس میں بعض علوم و معارف عنایت کئے جاتے ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

سیر اجمالی سیر تفصیلی

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ وصول کے مراتب کبھی ختم نہیں ہوتے لہٰذا شوق اور طلب ہمیشہ رہتے ہیں، قرینِ قیاس نہیں کیونکہ آپ کے نزدیک یہ معرفت دو سیروں پر مشتمل ہے:

اول: سیر تفصیلی　　　　دوم: سیر اجمالی

وصول کے مرتبوں کا کبھی ختم نہ ہونا سیر تفصیلی میں ہے جب کہ عارف تفصیل کے ساتھ تمام اسماء وصفات و تعلقاتِ صفات اور شیون واعتبارات کی سیر کرتا ہے۔ ایسا عارف ہمیشہ شوق و طلب میں رہتا ہے، کیونکہ تعلقاتِ اسماء وصفات اور تفصیلاتِ شیون واعتبارات غیر متناہی ہیں۔

لیکن آپ جس عارف کی نسبت گفتگو فرماتے ہیں اس سے مراد وہ عارف ہے جو سیر اجمالی سے مشرف ہوتا ہے اور اس کی سیر کسی لفظ اور عبارت سے تعبیر نہیں ہو سکتی اس قسم کے عارف ولایتِ خاصہ سے ممتاز اور مرتبۂ محبوبیت سے سرفراز ہوتے ہیں کیونکہ اس عظیم مرتبے تک ان کا وصول سیر اجمالی کے بغیر متصور نہیں ہے۔

پس واضح ہوا کہ جو عرفاء سیر تفصیلی میں مصروف رہتے ہیں ان کے مراتب وصول کبھی ختم نہیں ہوتے اور وہ صرف تجلیاتِ صفاتیہ تک ہی محبوس رہتے ہیں، اور جو عرفاء سیر اجمالی سے شادکام ہیں وہ تجلیاتِ ذاتیہ سے حصہ پاتے رہتے ہیں۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔

حضرت ابنِ عربی علیہ الرحمۃ کا کلمہ سُکریہ

اسی سیر تفصیلی کے مرتبے میں حضرت محی الدین ابنِ عربی قدس سرہٗ سے یہ کلمہ سکریہ صادر ہوا کہ "خاتم النبوت، خاتم الولایت سے فیض لیتا ہے"۔ انہوں نے اپنی ذات کو خاتم الولایت قرار دیا۔[1] علمائے ظواہر نے ان کے اس مقولہ کو کلمۂ کفریہ قرار دے کر ان پر کفر ثابت کیا۔[2] حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامی قدس سرہٗ السامی نے حضرت شیخِ اکبر کے قول کی یوں توجیہہ فرمائی کہ خاتم النبوت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم بادشاہ کی مثل ہیں اور خاتم الولایت وزیر خزانہ کی مثل ہے اور بادشاہ خزانے اپنے وزیر خزانہ سے ہی طلب کیا کرتے ہیں۔[3]

لیکن واضح رہے کہ حضرت جامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے علمِ ظاہری کی قوت سے یہ توجیہہ فرمائی ہے، علمِ باطن کشفی اس کا متحمل نہیں ہے، اولیائے کرام کے زُمرے میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو علومِ ظاہریہ وکشفیہ میں ایک منفرد مقام عطا فرمایا ہے۔

اسی بناء پر آپ فرماتے ہیں کہ:

"سیرِ محبوباں سیرِ اجمالی می باشد تا بمقصود برسند وبتمام تفاصیل صفات التفات نمی فرماید۔۔۔۔"۔[4]

یعنی محبوبوں کی سیر اجمالی ہوتی ہے تاکہ جلدی مقصود (ذات) تک پہنچیں اسی لئے وہ تفاصیلِ صفات کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔

---

[1] (فصوص الحکم کلمہ شیثیہ)
[2] (شرح مکتوبات قدسی آیات)
[3] (مبدأ ومعادمنھا، ص ۵۷)
[4] (دفتر مکتوب)

آپ فرماتے ہیں چونکہ پیغمبر اُمت کے تمام کمالات کا جامع ہوتا ہے اور اُمت کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے نبی کی متابعت کے واسطہ سے حاصل ہوتا ہے، لہٰذا ہر اُمتی نبی سے فیض اخذ کرتا ہے نہ کہ نبی کسی اُمتی سے۔(نعوذ باللہ منہا)

اور شیخِ اکبر کے مقولہ میں جو مطلب ثابت کیا جاتا ہے، وہ ہرگز مقصودِ اصلی نہیں کیونکہ تجلیاتِ صفاتیہ کے انعکاس میں یہ مرتبے ظلی حیثیت رکھتے ہیں اور حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے تمام مرتبے اصلی اور ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ سے بلاواسطہ مقتبس ہیں وہاں کسی واسطے کی گنجائش کا تصور بھی محال ہے، اسی حقیقت کو آپ نے ایک مثال کے ذریعے واضح فرمایا کہ اگر بادشاہ اپنے لشکر کے ذریعے کوئی شہر یا ملک فتح کرے تو یہ فتح وشوکت دراصل بادشاہ کی ہے کیونکہ لشکر کے پاس آلاتِ حرب وضرب سب کچھ بادشاہ ہی کا ہے۔ہاں البتہ لشکر کو بادشاہ کی وجہ سے ہی یہ جزوی فضیلت ملی ہے، لیکن اگر وہ یہ دعویٰ کریں کہ بادشاہ کو یہ ساری شوکت اور فضیلت ہماری طرف سے ملی ہے تو یہ ایسا دعویٰ ہوگا جس کی دلیل تام نہ ہوگی اور محض تَعَلِّیْ شمار ہوگا۔(واللہ اعلم بحقیقة الحال)

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ صوفیاء کا جو گروہ سیر تفصیلی کرتا ہے وہ تجلیاتِ صفاتیہ تک ہی محدود رہتا ہے، یہ گروہ شوق اور وجد والوں کا ہے جو مرتبۂ ابرار پر فائز ہوتے ہیں اور اربابِ قلوب میں سے ہیں۔

لیکن صوفیاء کا جو گروہ سیر اجمالی کرتا ہے وہ تجلیاتِ ذاتیہ سے بہرہ یاب ہوتا یہ گروہ مقربین، واصلین اور کاملین کا ہے جو اربابِ تمکین میں سے ہے اور وصل دائمی سے باریاب ہوکر شوق اور وجد سے بے نیاز ہوجاتا ہے کیونکہ شوق، وجد، تواجد، سماع ورقص اور اضطراب کی کیفیات ہجر وفراق کی

علامات ہیں جبکہ صبر و قرار، سکوت وثبات، حضور وسکون کی کیفیات، قرب ووصال کی علامات ہیں۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام تجلیٔ صفات کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہوگئے اور محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم تجلیٔ ذات کے باوجود ہوش میں رہے اور یہی مرتبہ تمکین و تکمیل کا ہے۔

حقیقتِ وجد

وجد کا معنی ہے "پالینا"۔ اصطلاحِ صوفیاء میں خشیتِ الٰہیہ اور سوز و گداز کی حالت میں سالک پر بے خود کر دینے والا تاثر جو خود بخود بغیر کسی تکلف کے طاری ہو جائے وجد کہلاتا ہے۔ بعض کے نزدیک مشاہدہ کے لئے بے قراری سے قلب میں جو حرارت پیدا ہوتی ہے اسے وجد کہا جاتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک وجد کی حقیقت "حالتِ محمودہ غیر اختیاریہ" کا غلبہ ہے اور یہ حالت محض عنایتِ ربانی کا نتیجہ ہوتی ہے البتہ اس عنایت کا سبب سالک کے اعمال واَوراد بھی ہوسکتے ہیں اور اس کی روحانی نسبت کا اقتضاء بھی۔

مطلق وجد کا ثبوت

مطلق وجد کے ثبوت میں درج ذیل آیاتِ قرآنیہ شاہد ہیں:

۱۔ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا (الکھف ۱۴)

ترجمہ: اور ہم نے ان کے دلوں کی ڈھارس بندھائی جب کھڑے ہوئے۔

۲۔ تَرَى أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ (المائدۃ ۸۳)

ترجمہ: تو ان کی آنکھیں دیکھو کہ آنسوؤں سے اُبل رہی ہیں اس لیے کہ وہ حق کو پہچان گئے۔

۳۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (الانفال ۲)

ترجمہ: ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ یاد کیا جائے ان کے دل ڈر جائیں۔

۴۔ثُمَّ تَلِینُ جُلُودُھُمْ وَقُلُوبُھُمْ إِلَی ذِکْرِ اللّٰہِ (الزمر ۲۳)

ترجمہ: پھر ان کی کھالیں اور دل نرم پڑتے ہیں یادِ خدا کی طرف رغبت میں۔

آیاتِ بالا سے اہلِ خشیت کی مندرجہ ذیل علامات مفہوم ہوتی ہیں۔

ربطِ قلب، معرفتِ الٰہی میں رونا، ذکر کے وقت دلوں کا ڈر جانا، بدنوں اور دلوں کا نرم ہونا وغیرہ۔ ان ہی علاماتِ خشیت کو صوفیاء کرام نے وجد کا نام دیا ہے۔ بعض روایات سے وجد کی حالت میں جسم کی حرکاتِ محمودہ غیر اختیاریہ کا ثبوت بھی ملتا ہے، لیکن اس قسم کی روایات کی صحت پر کلام ہے۔ نیز مشائخِ طریقت سے تواتر کے ساتھ وجد کی مختلف کیفیات بھی ثابت ہیں جبکہ بعض مشائخ وجد میں جسمانی حرکات کے قائل نہیں، ان کے نزدیک وجد قلبی وروحی وجد ان کے ان ہی اثرات کا نام ہے جو صراحتاً قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔

تواجد

تواجد بابِ تفاعل سے ہے جس کے معنی میں تکلف اور ذاتی اختیار کا اعتبار غالب ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے اختیار سے وجد لانے کو تواجد کہتے ہیں لیکن اس قسم کے شخص کا وجد کامل نہیں ہوتا کیونکہ اگر یہ کامل ہوتا تو واجد کہلاتا۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص محفلِ سماع یا حلقۂ ذکر میں شریک ہو یا اشعار وقصائد سنے تاکہ اس کے دل میں رقت وگداز کے جذبات پیدا ہوں اور وہ اس حد تک بڑھیں کہ اس کو بے خود ومدہوش کر دیں۔ تاثر کی اس کیفیت کو دعوت دینا یا اس کے لئے اس طرح کا اہتمام وتکلف کرنا کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں یہ سب کچھ تواجد کے ضمن میں آتا ہے۔ تواجد کے متعلق صوفیاء کی دورائے

ہیں۔ایک گروہ اس میں کوئی مضائقہ خیال نہیں کرتا کہ رقت اور گداز کی فضا بہ تکلف پیدا کی جائے۔

ان کے اس مؤقف کی بنیاد اس حدیث پر ہے:

اُبْكُوا، فَإِنْ لَمْ تَبْكُوا فَتَبَاكَوْا۔[1]

یعنی خوف خدا میں رویا کرو، اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی کوشش کیا کرو۔

صوفیاء کا دوسرا گروہ تواجد سے احتراز کی تلقین کرتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس میں تکلف اور بناوٹ کا عُنصر پایا جاتا ہے جو روحانی ارتقاء کے لئے رکاوٹ کا باعث ہے، ان کے مؤقف کی بنیاد اس حدیث پر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی محفل میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر اس قدر سکوت وجمود طاری رہتا کہ پرندے سروں پر بیٹھ کر اڑ جاتے اور انہیں احساس بھی نہ ہوتا۔

جیسا کہ حضرت براء بن عاذب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

جَلَسْنَا، كَأَنَّ عَلَى رُؤُوسِنَا الطَّيْرَ۔[2]

یعنی جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں (اگر حرکت کی تو کہیں اُڑ نہ جائیں)۔

وجود

وجود کا مرتبہ وجد کے بعد حاصل ہوتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں عارف احوال ومواجید سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور وجودِ حق کا ایسا غلبہ واستیلاء محسوس کرتا ہے کہ انفس وآفاق میں وجودِ باری تعالیٰ کے شواہد موجود پاتا ہے، مگر یہ اسی وقت ہوتا ہے جب عارف کے جسمانی ہیکل کے مادی تقاضے ختم ہو

[1] (سنن ابن ماجه، ص ٩٦)

[2] (سنن ابن ماجه، ص ١١٢)

جائیں اور سلطانِ حقیقت ظہور پزیر ہو جائے۔ نفس کی بشری کدورتیں رُخصت ہو جائیں اور عارف اپنے وجود اور احساسِ انا سے آگے بڑھ کر وجودِ حق اور احساسِ ذات کی منزل پالے۔

اسی حقیقت کو حضرت ابوالحسین نوری بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

أنامنذعشرين سنةبَيْنَ الوجدو الفقد۔[1]

میں بیس برس سے وجود اور فقدانِ وجود کی منزلوں میں ہوں۔

یعنی جب جب مجھے اپنے وجود کا احساس ہوتا جاتا ہے اس کی ذات کا احساس مفقود ہوتا جاتا ہے اور جب جب اپنی ذات کو مفقود (گم) پاتا ہوں، اس کی ذات کو موجود پاتا ہوں۔

صوفی صاحب الوجود

صوفی صاحب الوجود کی دو حالتیں ہوتی ہیں "صحو اور محو" حالتِ صحو حق کے ساتھ بقا کا نام ہے اور حالتِ محو حق کے ساتھ فنا کو کہتے ہیں۔[2]

ربطِ ثلاثہ

وجد، تواجد اور وُجود کا باہمی ربط یہ ہے کہ تواجد ابتداء کا نام ہے اور وجود انتہاء سے تعبیر ہے جبکہ وجد اس سلسلہ کی درمیانی کڑی ہے۔

[1] (الرسالةالقشيرية،ج ا،ص ١٦٣)
[2] (رسالةالقشيرية)

حضرت ابو علی دقاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

التواجد یوجب استیعاب العبد والوجد یوجب استغراق العبد والوجود یوجب استھلاک العبد۔[1]

تواجد یہ ہے کہ احساسِ عبدیت پوری طرح گھیرے میں آجائے، وجد اسی احساس کو گُم کر دینے کا نام ہے اور وُجود کلیتًا استہلاک کا تقاضا کرتا ہے۔

بینہ نمبر ۲

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی تحقیقِ انیق کے مطابق وجد وحال اور رقص وشوق متوسطین کے لئے ہے، کاملین اور منتہی سالکین کو اس کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ امور اربابِ قلوب کے حال کے مطابق ہیں، اربابِ تمکین کا حال اس سے بہت بلند ہے۔

اختلافِ صوفیاء کی حکمت

اختلاف ایک فطری حقیقت ہے لیکن اس میں توازن واعتدال ایک حسین و جمیل امتزاج کا روپ دھار لیتا ہے۔ جس طرح علماء کے مختلف مکاتیب ہیں، فقہاء کے الگ الگ شعبے ہیں، حکماء کے ہاں معالجات کے متعدد طریقے ہیں، اسی طرح باطنی اخلاق واعمال کی درستگی کے لئے صوفیاء کے اندر بھی طریقت کے کئی سلاسل ہیں، اور یہ سب جادۂ حق واعتدال پر مستقیم ہیں لیکن ان کا اختلاف رضائے الٰہی کے لئے اخلاص پر مبنی ہے، کیونکہ یہ حضرات آلائشِ نفسانیہ سے پاک ہوتے ہیں۔ تمام سلاسلِ تصوف اس امر پر متفق ہیں کہ ان کے سیر وسلوک کا اصل مقصود ومطلوب رضائے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا حصول ہے، البتہ رضائے حق کے حصول کے طریقے مختلف اور متعدد ہیں۔

---

[1] (الرسالۃ القشیریۃ، ج ۱، ص ۱۶۳)

جیسا کہ فرمایا گیا:

طُرُقُ الْوُصُوْلِ اِلَی اللّٰہِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ۔

یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے طریقے مخلوق کی سانسوں کی تعداد کے مطابق ہیں۔

اسی طرح تمام صوفیاء اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ وصول الی اللہ کی سعادت حاصل کرنا سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اتباع پر موقوف ہے۔ جیسا کہ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳۱) اس امر پر دلیل تام ہے چونکہ رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی فردیت کامل واکمل ہے اور آپ کی ذاتِ اقدس تمام انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صفات وکمالات کا مجموعہ ہے اور آپ ہی تمام انوار وتجلیات کا مؤرد اور مصدر ہیں۔ لہٰذا اولیاء کرام جب آپ کی اتباع میں وصول کے مرتبوں کی جانب گامزن ہوتے ہیں تو آپ کی فردیت کاملہ کی کوئی جہت اور حقیقت محمدیہ کی کوئی تجلی ان کے قلوب پر منعکس ہوتی ہے تو اس جہت یا تجلی سے اس ولی کو ایک خاص باطنی تعلق پیدا ہو جاتا ہے، جس کو اصطلاحِ طریقت میں نسبت کہا جاتا ہے۔ یہ خاص نسبت اس ولی سے منسوب ہونے والوں میں اتباعِ سنت وشریعت کی برکت سے ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے اور صوفیاء کے سلاسل میں نسبتوں کی یہی صورت اختلافِ صوفیاء کی بنیاد ہے۔ اصولی طور پر تمام صوفیاء متحد الاصل ہیں، البتہ مقصود کے حصول کے طرق ومعالجات میں کسی قدر فرق ہے۔ سلاسل کی نسبتوں کے متعلق حضرت سید نور الحسن عرف نور میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (جو حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے صاحبزادے حضرت احمد میاں کے خلیفہ تھے) نے نہایت اہم امور بیان فرمائے ہیں[1] جو ملخصًا ہدیۂ قارئین ہیں:

---

[1] (مجموعۂ رسائل، ص ۱۳، مطبوعہ کانپور ۱۹۱۳)

نسبتِ سلاسل

سلسلہ نقشبندیہ

بزرگان نقشبندیہ میں نسبتِ صدیقی کا ظہور ہے، یہ طریقہ اَقْرَبُ الطُّرُقِ اور سَھْلُ الْوُصُوْلُ ہے کہ معاملاتِ صدیقی شاہد اسی معنی کے ہیں اور نسبت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ابراہیمی تھی اور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ضمنیتِ کبریٰ حاصل تھی کہ مَا صَبَّ اللّٰہُ فِي صَدْرِي شَيْئًا إِلَّا صَبَبْتُهُ فِي صَدْرِ أبي بكر۔[1]

لہٰذا فیض اس نسبت کا القاءِ سینہ بہ سینہ ہے جو حضرت شاہِ نقشبند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے شائع ہوا اور نسبتِ معیت روشن ہوئی۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پیر و مُرشد حضرت خواجہ امیر کلال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تک ذکرِ خفی کو ذکرِ جہری کے ساتھ جمع کرنے کا رواج تھا لیکن جب حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت عبدالخالق غجدوانی سے بطریقِ اویسیت مستفیض ہوئے تو آپ نے دوبارہ اس سلسلے میں ذکرِ خفی کو جاری کیا۔

سلسلہ قادریہ

بزرگانِ قادریہ میں نسبتِ فاروقی کا ظہور ہے اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت موسوی تھی اسی بناء پر جلالت الٰہیہ اور تصرفات عظیمہ اس سلسلے کی مناسبت ہے، جو حضرت سیدنا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ سے ظہور پزیر ہوئی۔

---

[1] (الاسرار المرفوعۃ، ص ۳۴۲)

سلسلہ سہروردیہ

بزرگانِ سہروردیہ میں نسبتِ عثمانی کا ظہور ہے اور حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت نوحی تھی حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کو قبول کم ہوا، اور امت نے ایذاء پہنچائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شہید ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے کارواج بھی کم ہے، البتہ اس طریقے میں عبادات اور تعمیرِ اوقاف کی طرف بڑا اِلتفات ہے۔

سلسلہ چشتیہ

بزرگانِ چشتیہ میں خاص طور پر نسبتِ علوی کا ظہور ہے اور وہ فیضِ عینیت کہ عَلِيٌّ مِنِّيْ وَ اَنَا مِنْهُ۔[1] سے عبارت ہے اس طریقے میں بہت ہے اور فنا فی الشیخ کا یہی منشاء ہے اور حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت عیسوی تھی تو اس میں وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي (ص ۷۲) کی مناسبت ہے کہ چشتیہ کا درد بے سماع آرام پزیر نہیں ہوتا۔

بینات

- تصریحات بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقت کے چاروں بڑے سلسلے خلفائے اربعہ کی نسبتوں کے مظاہر ہیں اور سالکین کا سلوک ان ہی چار طریقوں پر واقع ہے جیسا کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے رسالہ مکاشفاتِ عینیہ میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قُرب الٰہی کے لئے دو راستے ہیں پہلا راستہ قربِ نبوت کا ہے، دوسرا راستہ قربِ ولایت کا ہے۔

---

[1] (سنن الترمذی، ج۲، ص ۲۱۳)

- قربِ نبوت کا فیض حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے۔
- قربِ ولایت کا فیض حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وسیلے سے ملتا ہے۔
- باقی دونوں خلفاء (حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بھی قربِ نبوت کے سلوک سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سلوک سیر انفسی سے تعلق رکھتا ہے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سلوک سیر آفاقی سے تعلق رکھتا ہے۔ گو دونوں سلوک مشکوٰۃِ انوارِ نبوت سے مقتبس ہیں لیکن دونوں حضرات کے ساتھ علیحدہ علیحدہ طور پر مخصوص ہو گئے ہیں۔
- دوسرے سلاسل قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ وغیرہا اکثر طور پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریقِ قرب ولایت کے ذریعے مقصود تک پہنچتے ہیں، جبکہ سلسلۂ نقشبندیہ دونوں طریقوں (قربِ نبوت اور قُرب ولایت) سے موصل ہے۔ لیکن قرب نبوت کی نسبت اس میں غالب ہے، تمام سلسلوں کے اکابر مشائخ ابتدائی دور میں اسی نسبت کا سلوک طے کر کے مقصود تک پہنچتے رہے، گو بعد میں جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک کا شیوع ہوا تو اکثر مشائخ نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا اس کی دو وجوہات تھیں۔

پہلی وجہ یہ کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک میں پوشیدگی و خفا کی وجہ سے مبتدی کو اس پر چلانا دشوار تھا۔

جیسا کہ عارفِ جامی نے فرمایا:

نقشبنداں عجب قافلہ سالاراند   کہ بُرند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را

اسی طرح حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مسلک میں پوشیدگی تھی ان پر چلنا بھی آسان نہ تھا، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسلک ظہور رکھتا تھا لہٰذا آسان ہونے کی وجہ سے یہی مسلکِ ظاہر زیادہ شائع ہوا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانۂ ارشاد تینوں خلفاء کرام سے پیچھے ہے، لہٰذا سلاسل کا انتساب قُربِ زمانہ کی بناء پر ان ہی کے ساتھ ہوا۔

- اس سے یہ مفہوم ہرگز اخذ نہ کیا جائے کہ تسلیک و تکمیل حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مخصوص و منحصر ہے اور خلفائے ثلاثہ غیر مکمل تھے۔(**نعوذ باللہ منہا**)

یہ بہت بڑی جسارت ہے، جن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی انہوں نے صرف حضرت سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک پر سلوک طے کیا اور خلفائے ثلاثہ کی راہوں سے بے خبر رہے اور اسی بے خبری میں دوسری راہوں کی نفی کر دی۔ رسالۂ مکاشفاتِ غیبیہ میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے وضاحت فرمائی ہے کہ حضرت سیدنا غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ اور حضرت شیخ ابو سعید خراز قدس سرہٗ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک سے سلوک طے کر کے ترقی کرتے ہوئے غیبِ ذات تک پہنچے ہیں۔

نسبتِ نقشبندیہ مجددیہ کی اِنفرادیت

ان ہی اختصاصاتِ سلاسل کی بنیاد پر صوفیاء میں مخصوص مکاتیب فکر قائم ہوئے، وہ اپنی نسبتوں اور طبائع کے میلان سے مجبور ہو کر ایک جانب عملاً مائل ہوتے ہیں اور دوسری جانب سے طبعًا گریز کرتے ہیں۔ یہ مقتضائے نسبت ہی ہے جو حضراتِ نقشبندیہ کو تواجد، ذکر بالجہر اور رقص و سماع سے دور رکھتا ہے، کیونکہ ان کی نسبت صدیقی ہے، ان کا طریقِ فیض اِلقائے سینہ بہ سینہ ہے۔ چونکہ

ان کی سیر انفسی ہے لہٰذا اس نسبت میں سکوت واخفاء اور دوامِ حضور کا غلبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ سلسلہ نعرہ ہائے اشتیاق اور رقص وسماع کی طرف التفات نہیں رکھتا اور اس سلسلے میں شرع کے جواہر نفیسہ سے کر وجد وحال کے اخروٹ ومنقّٰی نہیں خریدتے، اور نص (کتاب وسنت) کو چھوڑ کر فَص (فصوص الحکم) کی طرف نہیں جھکتے اور فتوحاتِ مدینہ (وحی) کے مقابلے میں فتوحاتِ مکیہ (کشف) کی طرف التفات نہیں کرتے۔ امامِ طریقت عارفِ بر حق حضرت سیدنا مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اسی نسبت کی تجدید واحیاء پر مامور ہوئے ہیں۔

سماع ورقص اور وجد امام ربانی کی نظر میں

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک اصحابِ وجد وحال، اربابِ قلوب میں سے ہیں۔ اربابِ تمکین کو وجد وحال اور رقص وسماع کی ہرگز ضرورت نہیں رہتی۔

چنانچہ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

سماع ووجد جماعہ را نافع است کہ بتقلب احوال متصف اند وبہ تبدل اوقات متسم وقتے حاضر اند ووقتے غائب گاہے واجدانہ وگاہے فاقد ایشانند اربابِ قلوب۔۔۔[1]

کچھ آگے فرماتے ہیں:

فَهُمْ اَبْنَاءُ الْوَقْتِ وَمَغْلُوْبُوْهُ فَمَرَّةً يَعْرُجُوْنَ وَ اُخْرٰى يَهْبِطُوْنَ اربابِ تجلیاتِ ذاتیہ کہ بتمام از مقامِ قلب برآمدہ بمقلب قلب پیوستہ اند وبہ کلیت از رقیتِ احوال محوّل احوال محرر گشتہ اند محتاج بہ سماع ووجد نیستند چہ وقت

---

[1] (دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۸۵)

ایشان دائمی است وحـال شان سرمدی لَا بَلْ لَا وَقْتَ لَهُمْ وَلَا حَالَ فَهُمْ اٰبَآءُ الْوَقْتِ وَاَرْبَابُ التَّمْكِيْنِ وَهُمُ الْوَاصِلُوْنَ الَّذِيْنَ لَا رُجُوْعَ لَهُمْ اَصْلاً وَلَا فَقْدَ لَهُمْ قَطْعًا فَمَنْ لَّا فَقْدَ لَهٗ لَا وَجْدَ لَهٗ۔

ترجمہ: سماع اور وجد اس جماعت کے لئے مفید ہے جو تقلب احوال سے (جن کے احوال بدلتے رہتے ہیں) متصف ہیں اور تبدیلیٔ اوقات کے ساتھ داغدار ہیں جو ایک وقت میں حاضر اور دوسرے وقت میں غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ واجد (اپنے مقصود کو پانے والے) ہوتے ہیں اور کبھی فاقد (گم کرنے والے) یہ لوگ اربابِ قلوب ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ابن الوقت (وقت کے بیٹے) ہیں اور وقت کے مغلوب ہیں، کبھی عروج کرتے ہیں اور کبھی ہبوط (نیچے آجاتے ہیں) لیکن ان کے بر عکس اربابِ تجلیاتِ ذاتیہ جو مقامِ قلب سے کلی طور پر باہر آکر مقلب قلب (حق تعالیٰ) کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں، اور کلیۃً احوال کی غلامی سے نکل کر محول احوال (احوال کو تبدیل کرنے والے یعنی اللہ تعالیٰ) کی بارگاہ میں پہنچ گئے ہیں وہ لوگ سماع و وجد کے محتاج نہیں ہیں، کیونکہ ان کا وقت دائمی ہے اور ان کا حال سرمدی ہے، نہیں بلکہ ان کے لئے نہ وقت ہے اور نہ حال، یہ لوگ ابو الوقت (وقت کے باپ) ہیں اور اصحابِ تمکین (اطمینان والے) ہیں اور یہ ایسے واصل ہیں جو رجوع سے قطعًا محفوظ ہیں اور نہ فقد ہے (ان سے ان کا مقصود گم نہیں ہو سکتا) لہٰذا جن کے لئے فقد نہیں ان کے لئے وجد بھی نہیں۔

اسی مکتوب میں کچھ آگے تحریر فرماتے ہیں:

آرامِ این بزرگواران بہ عبادات است وتسکین در ادائے حقوقِ بندگی وطاعات۔۔۔ ایشان را احتیاج بہ سماع ووجد نیست عباداتِ ایشان را کارِ سماع می کند ونورانیتِ اصل از عروج کفایت می بخشد جماعۂ

مقلدان از اہلِ سماع ووجد کہ بر عظیم شان این بزرگواران واقف نیستند خود را از عشاق می گیرند وایشان را از زہّاد گویئا عشق ومحبت را منحصر در رقص ووجد میدانند۔

ترجمہ: ان بزرگواروں کا آرام وچین عبادات میں ہے اور ان کی تسکین بندگی وطاعات کے حقوق کی ادائیگی میں ہے ان کو سماع ووجد کی کچھ حاجت نہیں ان کی عبادات ان کے لئے سماع کا کام کرتی ہیں اور اصل کی نورانیت عروج سے کفایت کرتی ہے اہلِ سماع ووجد کے مقلدوں کا ایک گروہ جو ان بزرگواروں کی عظیم شان سے واقف نہیں ہے وہ اپنے آپ کو عشاق میں سے سمجھتے ہیں اور ان کو زاہدوں میں سے جانتے ہیں گویا یہ لوگ عشق ومحبت کو رقص ووجد میں منحصر سمجھتے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں:

مبتدی را سماع ووجد مضر است ومنافئ عروج ہر چند بشرائط واقع شود۔۔۔وجد او معلول است حالِ او وبال است حرکتِ او طبعی است تحرّک او مشوب بہ ہوائے نفسانی وَاَعْنِیْ بِالْمُبْتَدِیِ مَنْ لَّا یَکُوْنُ مِنْ اَرْبَابِ الْقُلُوْبِ وَاَرْبَابُ الْقُلُوْبِ مُتَوَسِّطُوْنَ بَیْنَ الْمُبْتَدِئِیْنَ وَالْمُنْتَھِیْنَ۔[1]

ترجمہ: مبتدی کے لئے سماع ووجد مضر (نقصان دہ) ہے اور عروج کے منافی ہے۔ اگرچہ شرائط کے موافق ہی کیوں نہ ہو، اس (مبتدی) کا وجد علت کی وجہ سے ہے، لہٰذا اس کا حال وَبال ہے اس کی حرکت طبعی ہے، اور اس کا تحرک ہوائے نفسانی سے مخلوط ہے اور مبتدی سے میری مراد وہ شخص ہے جو اربابِ قلوب میں سے نہیں ہے اور اربابِ قلوب وہ ہیں جو مبتدی اور منتہی کے درمیانی مقام (متوسطین) میں ہوتے ہیں۔

[1] (دفتر اول مکتوب نمبر ۲۸۵)

حقیقتِ نماز سے بے خبر

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ رقم طراز ہیں:

جمِ غفیر ازیں طائفہ تسکینِ اضطراب خود را از سماع و نغمہ و وجد و تواجد جستند و مطلوبِ خود را در پردہائے نغمہ مطالعہ نمودند لاجرم رقص ور قاصی را دیدن خود گرفتند باآنکہ شنیدہ باشند مَا جعَلَ اللّٰہُ فِي الْحَرَامِ شِفَاءً بَلٰی الْغَرِيْقُ يَتَعَلَّقُ بِكُلِّ حَشِيْشٍ وَّ حُبُّ الشَّيْءِ يُعْمِیْ وَيُصِمُّ اگر شمہ از حقیقتِ کمالاتِ صلوتیہ بر ایشان منکشف شدے ہرگز دم از سماع و نغمہ نزدندے و یادِ وجد و تواجد نہ کردندے۔

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند[1]

ترجمہ: اس طائفہ کی ایک کثیر جماعت نے اپنے اضطراب وبے قراری کی تسکین کو سماع و نغمہ اور وجد و تواجد میں تلاش کیا اور اپنے مطلوب کو نغمہ کے پردوں میں مطالعہ کیا اور قص ور قاصی کو اپنا مسلک بنالیا ہے حالانکہ انہوں نے سُنا ہو گا مَا جعَلَ اللّٰہُ فِي الْحَرَامِ شِفَاءً (اللہ تعالیٰ نے حرام چیز میں شفا نہیں رکھی) ہاں الْغَرِيْقُ يَتَعَلَّقُ بِكُلِّ حَشِيْشٍ وَّ حُبُّ الشَّيْءِ يُعْمِیْ وَيُصِمُّ (ڈوبنے والا شخص ہر ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے) اگر نماز کے کمالات کی کچھ بھی حقیقت ان پر منکشف ہو جاتی تو وہ ہرگز سماع و نغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد و تواجد کو یاد نہ کرتے۔

جب حقیقت نہ ملی ڈھونڈلی افسانہ کی راہ

---

[1] (دفتر اول مکتوب نمبر ۲۶۱)

بدعت فی الطریقت

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

وجماعہ از متاخرینِ خلفائے ایشان ترک اوضاعِ این بزرگواران گرفتہ بعضے امور درین طریق احداث نمودہ اند وسماع ورقص و جہر اختیار کردہ منشاءِ آن عدمِ وصول است بہ حقیقتِ نیاتِ اکابر این خانوادۂ بزرگ خیال کردہ اند کہ بہ این محدثات ومبدعات تکمیل و تتمیم این طریقہ می نمایند ندانستہ اند کہ در تخریب واِضاعتِ آن می کوشند۔ [1]

ترجمہ: اور سلسلہ نقشبندیہ کے خلفائے متاخرین کی ایک جماعت نے ان بزرگوں کے اوضاع واطوار کو ترک کر کے بعض ایسے نئے امور مثلاً سماع ورقص اور ذکرِ جہر اختیار کر لئے ہیں اس کی وجہ عدمِ وصول ہے، یہ لوگ اس بزرگ خاندان کے اکابرین کی نیتوں کی حقیقت تک نہیں پہنچتے اور خیال کر بیٹھے ہیں کہ ان محدثات (نئی باتوں) اور مبدعات (بدعتوں) سے اس طریقہ کی تکمیل و تتمیم کر رہے ہیں حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح سے وہ طریقہ کو خراب اور ضائع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اپنی طریقت کی حفاظت اہم ترین امر ہے

آج کل اکثر نقشبندی اور مجددی حضرات حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے مسلک کے برعکس تواجد، ذکرِ جہر اور رقص وسماع کی رسموں پر عمل پیرا ہیں اور اس نسبتِ جامعہ کے باطنی فیوض وبرکات سے خالی ہیں اور دوسرے سلاسل کی طرح اس سلسلہ کے لوگوں میں بھی تعلیم وتربیت کا

---

[1] (دفتر اول مکتوب ٢٨٦)

تفاوت اور عملی طریقت کا فقدان نظر آرہاہے، افسوس کہ اس خالص نسبت کے حامل افراد بہت کم ہیں اور یہ نسبت کبریتِ احمر (سُرخ گندھک) سے بھی زیادہ نایاب ہے۔

اس کی چند وجوہات ہیں

پہلی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس نسبت کی اصل حقیقت سے بے خبری کی بناء پر محض اپنی دکانوں کو چمکانے کا کاروبار شروع کرر کھاہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مجددی تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جس ذہانت، استعداد اور اخلاص کی ضرورت تھی اس کے فقدان سے اس نسبت کے صحیح خدوخال اپنے مریدوں پر واضح اور واردنہ کرسکے اور خود بھی اس نسبت کی علمی اور عملی تشکیل سے محروم رہ گئے۔

تیسری وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی نسبت کے ساتھ ساتھ دوسری نسبتوں سے بھی اختلاط وانتساب رکھتے ہیں لامحالہ اپنے مزاج کی مجبوری اور اپنی طبع کے میلان کے سبب جس نسبت کا غلبہ پاتے ہیں اسی پر فریفتہ ہو کر وہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں (وَلِلنَّاسِ فِيْمَا يَعْشِقُوْنَ مَذَاهِبُ) حالانکہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ السبحانی نے اپنی نسبت میں دوسری نسبت کو خلط ملط کرنے پر سختی سے منع فرمایاہے۔

آپ نے ارقام فرمایا:

اِحداثے کہ در طریقت پیدا کنند نزدِ فقیر کم از بدعتے نیست۔۔۔ چون امرِ محدث در طریقت پیدا شد راہِ فیوض وبرکاتِ آن طریق مسدود گشت پسِ محافظتِ طریقت ازاہم مہام آمد۔[1]

---

[1] (دفتر اول مکتوب نمبر ۲۶۷)

ترجمہ: وہ نئی بات جو طریقت میں پیدا کرتے ہیں فقیر کے نزدیک بدعت سے کم نہیں جب کوئی نیا طریقہ سابقہ طریقت میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کے فیوض وبرکات کا راستہ بند ہو جاتا ہے، اس لئے اپنی طریقت کی حفاظت اہم ترین امر ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۴۴ تا ۶۶۳)

اللھم اغفر لکاتبہٖ و لمن سعٰی فیہٖ و لو الدیھم و لاساتذیھم و لاھل بیتھم اجمعین آمین یا رب العالمین بحرمت سید المرسلین و خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ و سلم

مکتوب نمبر ۲۷

[سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی مدح وثنا اور ان بزرگوں قدس سرہم کی نسبت کی بلندی کے بیان میں۔۔۔ خواجہ عمک کی طرف صادر فرمایا:

الحمدللہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

مرحمت نامہ گرامی جو ازروئے کرم اس مخلص کے نام لکھا تھا، یہ حقیر اس کے ورود سے مسرور اور خوش ہوا۔ آپ سلامت رہیں۔ بندہ آپ کے دردِ سر کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ صرف سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی مدح وثنا میں لکھتا ہے۔

مخدوم ومحترم! اس سلسلہ عالیہ کے اکابر قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کی عبارات میں جو واقع ہوا ہے کہ ہماری نسبت تمام نسبتوں سے فائق ہے۔ اس سے مراد حضور وآگاہی کی نسبت ہے۔ جو حضور ان کے ہاں معتبر ہے وہ حضور بے غیبت ہے۔ جس کو انہوں نے "یادداشت" سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا ان عزیزوں کی نسبت یادداشت سے عبارت ہے، اور یادداشت جو اس فقیر کے فہم قاصر میں قرار پا چکی ہے وہ اسی تفصیل پر مبنی ہے۔]

تشریح

حضرت خواجہ عمک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے پیر بھائی تھے، آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انہیں جو مکتوب شریف لکھا اس میں اس عظیم سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی مدح وتوصیف فرمائی ہے۔ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے کئی وجوہات کی بناء پر باقی سلاسلِ طریقت سے فضیلت بخشی ہے اور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے جابجا ان وجوہات کو بیان فرمایا ہے۔ عنقریب ہم ان ساری فضیلتوں کو یکجا بیان کریں گے۔ لیکن یہ

عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی مدح وتوصیف سے دوسرے سلاسل کا انکار یا توہین لازم نہیں آتی۔ دنیا کے بعض بڑے بڑے اکابر اولیاء انہیں سلاسل میں گزرے ہیں جیسے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت داتا گنج بخش، حضرت خواجہ غریب نواز اور حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم وغیرہ۔

اس مکتوب میں حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں جنہیں یادداشت اور یاد کرد کا نام دیا گیا ہے۔

اگرچہ معرفت والے صوفیاء ان کا مطلب و مفہوم جانتے ہیں۔ لیکن عوام، صوفیاء و یارانِ طریقت کی خاطر انہیں بیان کرنا ضروری ہے۔

یادداشت سے مراد نقشبندی بزرگوں کی وہ نسبت ہے جس میں انہیں اپنے مطلوبِ حقیقی کا دائمی حضور میسر آتا ہے اور تجلی ذاتی دائمی ہو جاتی ہے۔ اس عظیم نعمت کے حصول کے بعد اس حضور کا غائب ہونا محال ہو جاتا ہے، ایسے ولی اللہ سے اس کا مطلوب (اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ) کسی لمحے بھی فراموش نہیں ہوتا۔ اور وہ ہر وقت مشاہدہ جمال میں مستغرق رہتا ہے۔ یہ نسبت ہمیشہ صوفئ منتہی کو نصیب ہوتی ہے اور اس سے نچلے مقام میں متوسط اور مبتدی کے لئے "یاد کرد" کی نسبت ہے۔ "یاد کرد" ایسی نسبت ہے جس میں سالک کبھی اپنے خدا کو یاد کرتا ہے اور کبھی اس سے فراموش ہو جاتا ہے۔ اس کا آسان مطلب یہ ہے کہ ایسے سالک کے لطائف دائمی طور پر نہیں چلتے بلکہ کبھی چلتے ہیں اور کبھی رُک جاتے ہیں۔ پس چاہیئے کہ سالک زیادہ سے زیادہ شریعتِ حقہ کی پابندی کرے اور ذکر و فکر میں مشغول رہے تاکہ "یاد کرد" سے "یادداشت" میں پہنچ جائے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

نسبتِ نقشبندیہ تمام نسبتوں سے بلند ہے

اس مکتوبِ گرامی میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ السجانی نسبتِ نقشبندیہ کی بلندی وبرتری بیان فرمارہے ہیں کہ اس سلسلہ کے بزرگوں نے اپنی کتابوں میں تحریر فرمایا ہے کہ ہماری نسبت تمام نسبتوں سے بالا ہے اور یہ نسبت دَوَامُ الْحُضُوْرِ مَعَ اللّٰہِ بِلَا غَیْبُوْبَۃٍ سے عبارت ہے۔ یعنی عارف کو ذاتِ حق کے ساتھ ایسی حضوری اور آگاہی حاصل ہو جائے جو دائمی ہو اور کبھی غیبت اور پوشیدگی قبول نہ کرے۔ اسی مقام کو تجلی ذاتی دائمی سے تعبیر کرتے ہیں اور خواجۂ جہاں حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی کو یادداشت کا نام دیا ہے۔

یادداشت

بعض مشائخ کے نزدیک یادداشت حِفْظُ الْقَلْبِ عَلٰی شُھُوْدِ تَجَلِّی الذَّاتِ سے عبارت ہے اور بعض نے فرمایا حُضُوْرُ الْقَلْبِ مَعَ اللّٰہ تعالیٰ عَلَی الدَّوَامِ فِی کُلِّ حَالٍ سے کنایہ ہے۔ حضرت شاہ نقشبند اویسی بخاری قدس سرہٗ العزیز کے نزدیک یادداشت سے مُراد ذکر نہیں بلکہ دوامِ حضور وآگاہی علی سبیل الذوق ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ذاکر کو چاہیئے کہ حبسِ دم کے ساتھ ذکر نفی اثبات کرتے وقت اپنے دل کو حق کے ساتھ حاضر رکھنے کی عملی مشق کرتا رہے تا کہ مراقبہ اور رابطہ کی کیفیت پختہ ہو جائے کیونکہ یہ راز خواص ہی کی سمجھ میں آسکتا ہے۔

یادداشت اور یادکرد میں فرق

یادکرد اور یادداشت میں فرق یہ ہے کہ یادکرد میں کبھی غیبت اور کبھی حضور ہوتا ہے، بلکہ غیبت زیادہ اور حضور کم ہوتا ہے اور یادداشت میں حضورِ ذات دائمی ہوتا ہے اور اسی کو تجلی ذاتی دائمی

کہتے ہیں جبکہ یاد کرد تجلی ذاتی برقی سے عبارت ہے۔ در حقیقت تجلی برقی، تجلی ذاتی نہیں کیونکہ تجلی ذاتی جب ظہور کرتی ہے پھر کبھی غائب نہیں ہوتی اور تجلی برقی کبھی ظاہر ہوتی ہے، کبھی غائب ہو جاتی ہے۔ اکابر مشائخِ نقشبندیہ علیہم الرحمۃ کی خاص نسبت تجلی ذاتی دائمی ہے لیکن دوسرے مشائخ نے تجلی ذاتی برقی کو نہایت النہایت قرار دیا ہے۔ اسی بناء پر حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز نے نسبتِ نقشبندیہ کو تمام نسبتوں سے بالاتر قرار دیا ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ا، ص ۲٦۷، ۲٦۸)

[اور تجلی ذاتی حضرت ذات تعالیٰ وتقدس کے ظہور، نیز حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے اسماء، صفات، شیون اور اعتبارات کے ملاحظہ کے بغیر حضور ذات سے عبارت ہے۔ اور اسی تجلی کو تجلی برقی کہتے ہیں، یعنی لمحہ بھر کے لئے شیون واعتبارات اُٹھ جاتے ہیں۔ پھر شیون واعتبارات کے پردہ میں وہ ذات پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

اس تقریر وبیان کے مطابق حضور بے غیبت متصور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ لمحہ بھر کے لئے حضور نصیب ہوتا ہے، اور اغلب واکثر اوقات غیبت رہتی ہے۔ اس طرح کی وقتی نسبت ان بزرگوں کے ہاں کوئی اعتبار نہیں رکھتی۔ ہاں جب یہ حضورِ دوام اختیار کر لے اور پوشیدہ ہونے کو بالکل قبول نہ کرے اور ہمیشہ اسماء، صفات، شیون اور اعتبارات کے پردہ کے بغیر ہی ظاہر اور متجلی رہے، تو یہ حضور بے غیبت کہلائے گا۔ تو ان اکابر نقشبندیہ قدس سرہم کی نسبت کو دوسروں کی نسبتوں پر قیاس کر کے موازنہ کرنا چاہیئے۔ اور بے تکلف تمام نسبتوں سے فائق واعلیٰ جاننا چاہیئے۔

اس قسم کا حضور اگرچہ اکثر لوگوں کے نزدیک بعید اَمر ہے لیکن:

هنيئا لارباب النعيم نعيمها   وللعاشق المسكين مايتجرع

ترجمہ: یعنی اربابِ نعمت کو نعمتیں گوارا ہیں۔ عاشقِ مسکین کے لئے صرف وہی ہے جو گھونٹ پی رہا ہے۔

یہ بلند نسبت اس حد تک اور اس طور پر ندرت و قلت اختیار کر چکی ہے کہ اگر بالفرض اس بزرگ سلسلہ کے لوگوں کے سامنے بیان کی جائے تو احتمال ہے کہ اکثر اس کا انکار ہی کر جائیں، اور یقین نہ کریں۔ وہ نسبت جو آج کل اس بزرگ خانوادہ کے اصحاب میں مشہور و متعارف ہے وہ حق تعالیٰ کے اس شہود سے عبارت ہے۔ جو شاہدہ اور مشہودی کے وصف سے پاک و منزہ ہے۔ اور وہ ایک توجہ ہے جو چھ جہات متعارفہ سے خالی اور معرا ہے۔ اگرچہ جہت فوق کا وہم پڑتا ہے، اور بظاہر دائمی ہوتی ہے، اور جہت صرف مقامِ جذبہ میں پائی جاتی ہے، اور اس جہت کی فوقیت کی کوئی وجہ ظاہر ہے۔ بخلاف یادداشت کے جو بمعنی سابق ہے۔ کیونکہ اس کا حصول جہت جذبہ اور مقاماتِ سلوک کے بعد ہے اور اس کے درجے کی بلندی کسی بھی شخص پر مخفی نہیں ہے۔ اور خِفا ہے تو وہ صرف اس کے حصول میں ہے۔ حاسد اگر حسد کی وجہ سے اس کا انکار کرے اور ناقص رہنے کے باعث نہ مانے تو معذور ہے۔

قاصرے گر کند ایں طائفہ را طعن و قصور
حاش للہ کہ برآرم بزبان ایں گلہ را
ہمہ شیرانِ جہاں بستہ بایں سلسلہ اند
روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

ترجمہ: کوئی قاصر شخص اس طائفہ پر قصوروار ہونے کا عیب رکھے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ کہ میں اس گلہ کو زبان پر لاؤں۔ تمام جہاں کے شیر اس سلسلہ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ لومڑی حیلہ بہانہ کے ذریعہ اس سلسلہ کو کس طرح توڑ سکتی ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس چار سو سال پہلے گزرے ہیں۔ وہ زمانہ ایمان ویقین اور علم و عمل کا زمانہ تھا۔ اور لوگوں کی اپنے دینِ وملت کے ساتھ والہانہ وارفتگی اور دلی لگاؤ تھا۔ اس کے باوجود یادداشت کی نسبت اور اس کی کیفیات و تجلیات کی بات کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا کہ چونکہ یہ بلند نسبت نادر ہو چکی ہے اس لئے گمان غالب ہے کہ اس کے بیان سے لوگ اس کا یقین ہی نہ کریں اور اس سے انکار کر جائیں۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب چار سو سال پہلے یہ حال تھا تو چار سو سال گزرنے کے بعد آج کے دور میں کیا حال ہوگا جبکہ یہ جہالت ونادانی اور دین سے دوری کا دور ہے۔ ڈش انٹینا، کیبل نیٹ ورک، موبائل فون اور کمپیوٹر کی ایجادات نے لوگوں کو یکسر دین اور علم و عمل سے بیگانہ کر دیا ہے۔ لوگوں نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہ وسلم کی اطاعت کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور یورپ اور امریکہ کی اندھی تقلید شروع کر دی ہے۔ عوام تو عوام رہے، اپنے آپ کو دیندار کہنے والے بھی دین کا مذاق اڑانے والوں میں شامل ہو چکے ہیں۔

اندھا شخص اپنی بینائی سے محروم ہونے کی وجہ سے اگر سورج وچاند کے روشن وجود سے انکار کر بیٹھے تو اس سے سورج وچاند کی نفی نہیں ہوگی، بلکہ وہ اندھا خود ہی قصوروار ٹھہرے گا۔ یہی مثال اُن نادانوں کی ہے جو علمِ لدنی کے نورِ بصیرت سے محروم ہیں اور اپنے قصور ظاہر وباطن کی وجہ سے

تجلیاتِ دائمی وبرقی اور کیفیات روحانی سے انکار کر چکے ہیں۔ پس اُن کے انکار سے اس عظیم نسبت کا وجود جھٹلایا نہیں جا سکتا، قصور ہے تو ناقص انسان کے اعمال کا۔ ہم کیسے کیسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ زبان سے جھوٹ، چغلی، غیبت اور گالم گلوچ، کانوں سے ان غیر شرعی باتوں کا سُننا، آنکھوں سے غیر اخلاقی حرکات کا دیکھنا، دل ودماغ سے گناہوں کی منصوبہ بندی، ہاتھوں سے عملی گناہوں کا ارتکاب اور پاؤں سے گناہ کی طرف چل کر جانا توروزِروشن کی طرح عیاں ہے ہی، اب خطرناک ترین صورت حال یہ پیدا ہو چکی ہے کہ ہم نے زبان سے بھی شریعت کا استہزاء شروع کر دیا ہے۔ جس سے ہمارا ایمان ہر وقت خطرے میں ہے۔

شرح العقائد النسفیہ میں ہے کہ:

واستحلال المعصية صغيرة كانت أو كبيرة كفر إذا ثبت كونها معصية بدليل قطعيّ، وقد علم ذلك مِمَّا سبق والاستهانة بها كفر، والاستهزاء علي الشريعة كفر لأنّ ذلك من أمارات التكذيب۔[1]

ترجمہ: اور کسی گناہ کو خواہ وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ حلال سمجھنا کفر ہے، جب اس کا گناہ ہونا دلیلِ قطعی سے ثابت ہو اور یہ بات پہلے سے معلوم ہو چکی ہے اور گناہ کو معمولی سمجھنا کُفر ہے اور شریعت کا مذاق اڑانا کفر ہے، اس لئے کہ یہ تکذیب کی علامات میں سے ہیں۔

جب اپنے آپ کو علماء ومشائخ اور صوفی کہنے والے بھی حق وباطل میں تمیز نہ کر سکیں تو پھر عوام الناس کا کیا حال ہو گا اور ان کی رہنمائی کا ذمہ کون اٹھائے گا؟ پس چاہیئے کہ سب سے پہلے علماء وپیر صاحبان کی اصلاح ہو جب وہ راہِ راست پر آئیں گے تو عوام کی اصلاح آسان ہو جائے گی۔

---

[1] (شرح العقائد النسفية، ص ۱۸۵، طبع مکتبة العلم)

تصوف کے مقامات و کیفیات کے حصول اور غوث، قطب، ابدال واوتاد اور قیومِ زمان کی باتیں کرنا بہت آسان ہے لیکن ان کا حصول بہت مشکل ہے۔ بلکہ جب شریعتِ حقہ کی عملی اور قولی مخالفت کی جارہی ہو تو اِن حالات و کیفیات کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ جب کوئی ہماری مجالس میں آئے تو اُسے سبز باغ دکھانے کی بجائے اُس کو احکاماتِ الٰہی پر عمل درآمد کی نصیحت کریں اور حصولِ علمِ دین کا شوق دلائیں تاکہ مطلوب و مقصود تک رسائی کی منزل آسان ہو سکے۔

تصویر بنانا اور بنوانا دونوں منع ہیں لیکن ہم بڑے شوق اور دھڑلے سے ان میں ملوث ہیں۔ موبائل نے تو رہی سہی کسر بھی اُٹھادی ہے سارادن فوٹو اور ویڈیو فلمیں بن رہی ہیں۔ تعجب اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مدارس و مساجد کی دینی محافل بھی ویڈیوز میں محفوظ ہو رہی ہیں۔ اور علماء کی تقاریر و خطابات بھی ویڈیو کیمرے کے محتاج ہو چکے ہیں۔ ذرا سوچیں تو! کیا جس دور میں یہ الیکٹرانک میڈیا موجود نہیں تھا اس دور میں اسلام کی ترویج نہیں ہو رہی تھی؟ اگر بطریقِ احسن ہو رہی تھی اور دنیا کمالاتِ اسلام سے منور تھی اور اسلام کو غلبہ حاصل تھا تو ثابت ہوا کہ اس وقت علم کے ساتھ عمل بھی مقبولِ خدا تھا اور خلوص کی دولت بھی میسر تھی جبکہ آج کے دور میں علم میں وسعت تو آگئی لیکن عمل سکڑ کر کم ہو گیا اور اخلاص کی دولت تو بالکل ہی ناپید ہو کر رہ گئی۔

اس ساری بحث سے ہمارا مطلب و مدعا یہ ہے کہ روشن خیالی کی اس ترقی کو عین علم اور دین کی خدمت سمجھ رہے ہیں جبکہ فی الحقیقت یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔ اور اس خلاف ورزی کو دین ثابت کرنا استہزاء ہے اور استہزاء کفر ہے۔ اور جس طرح شریعت کا استہزاء کفر ہے ویسے ہی طریقت کا استہزاء بھی گناہ ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات چاہے وحی جلی (قرآن عظیم الشان) سے ثابت ہوں، چاہے وحی خفی (احادیثِ نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) سے، اُن

پر ایمان لانا اور ان کے مطابق عمل کرنا ہی فلاح وکامیابی ہے۔ لیکن عمل اُس طریقے سے ہونا چاہیئے جس طرح فقہاء متقدمین ومتاخرین نے بیان فرمایا ہے۔ اپنی رائے سے قرآن عظیم الشان واحادیث سے معنی ومفہوم اخذ کرنا اور اپنی سوچ پر عمل کرنا سراسر غلط ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں ان اکابر کی تعلیمات پر عمل کی دولت نصیب فرمائے جن پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا انعام واکرام پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور جن کے نشانِ راہ پر چل کر سالکینِ طریقت مقامِ ولایت پر مشرف ہوئے ہیں۔ (آمین)

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ نسبتِ نقشبندیہ جو دوامِ حضور مع الحق بلا غیبوبت سے تعبیر ہے اور جس کو تجلی ذاتی دائمی کے نام سے پکارا جاتا ہے اس قدر قلیل الوجود اور کمیاب ہو چکی ہے کہ اگر بالفرض اسی سلسلہ کے آج کل کے مشائخ کے سامنے اس کی حقیقت بیان کر دی جائے تو اکثر اس کا انکار کر دیں گے، کیونکہ اس عظیم نسبت کے حصول کے لئے جو استعداد و قابلیت درکار ہے وہ آج کل کے اکثر مشائخ وسالکین میں مفقود ہے۔ نیز اس نسبت کا حصول محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر موقوف ہے۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ۔

بینہ

سالک کے لئے حضورِ حق تعالیٰ میسر آنے کے دو وقت ہوتے ہیں:

اولاً جذبۂ بدایت کے دوران جبکہ شیخ کی خصوصی توجہ یا اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو تو سالک لطائف کے تصفیہ اور تزکیہ سے پہلے بھی حضورِ حق کی نسبت سے شادکام ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ بغیر سلوک طے کئے مقامِ جذبہ تک پہنچا ہے اور اس کے حصے میں صرف استہلاک واضمحلال ہے اور

مشاہدہ کی لیاقت وصلاحیت حاصل نہیں کر سکا لہٰذا اسے شاہد نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی حق تعالیٰ وتقدس اس کے لئے مشہود ہوں گے۔

ثانیاً سالک کے لئے حضورِ حق میسر آنے کا دوسرا وقت وہ ہوتا ہے جبکہ مقامِ جذبہ نہایت میں قدم رکھے اور مکمل سلوک طے کر کے لطائف کے تصفیے اور تزکیئے کے بعد مقامِ شہود میں پہنچے اور یادداشت کی منزل حاصل ہو جائے تو اس وقت سالک ترقی کر کے عارف بن جاتا ہے اور اس کو شاہد اور حق تعالیٰ کو مشہود کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس وقت عارف وصلِ عریانی سے بہرہ یاب ہو کر وجودِ موہوبِ حقانی سے بقا پا کر شہود ومشاہدہ کی لیاقت وصلاحیت حاصل کر لیتا ہے، لہٰذا اس کے حق میں شہود ومشاہدہ کا اطلاق درست ہے۔ واللہ اعلم

جہاتِ ستہ

مکتوب گرامی میں سالک کے لئے ایسی توجہ مذکور ہے جو جہاتِ ستہ (چھ طرف) سے خالی ہو اس سے مراد متعارف اور مشہور چھ طرفیں ہیں یعنی سامنے، پیچھے، اوپر، نیچے، دائیں اور بائیں۔ چونکہ ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ جہات واطراف کی قیود سے پاک ہے اور بمطابق آیتِ قرآنی أَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (البقرۃ ۱۱۵) یعنی جس طرف بھی منہ کرو گے ادھر ہی اللہ کی ذات ہے۔ صوفیاء کے نزدیک مشاہدہ کے لئے سالک کو بے جہت توجہ درکار ہوتی ہے جو ہر طرف سے خالی ہو کیونکہ ذاتِ حق کو کسی ایک جہت یا طرف میں محصور ومحدود سمجھنا موہم شرک ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ

تعریب

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز نے اس مکتوب کے آخر میں سلسلہ نقشبندیہ کے اکابر مشائخ کی مدح میں جو رباعی درج فرمائی ہے وہ سلطان العاشقین حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی نقشبندی

قدس سرہٗ العزیز کی طرف منسوب ہے۔ مُعربِ مکتوبات حضرت مُلّا مُراد مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس فارسی رباعی کا جو منظوم عربی ترجمہ کیا ہے وہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، آخر میں اس کا منظوم اُردو ترجمہ از حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ مرحوم (مترجم مکتوبات) بھی ہدیۂ قارئین ہے:

فارسی

قاصرے گر کند این طائفہ را طعنِ قصور

حاشَ للہ کہ برآرم بزبان این گلہ را

ہمہ شیرانِ جہاں بستۂ این سلسلہ اند

روبہ از حیلہ چسان بگسلد این سلسلہ را

عربی

اِنْ عَابَهُمْ قَاصِرٌ طَعْنًا بِهِمْ سَفَهًا

بَرَّأتُ سَاحَتَهُمْ مِنْ اَفْحَشِ الْكَلِم

هَلْ يَقْطَعُ الثَّعْلَبُ الْمُحْتَالُ سِلْسِلَةً

قُيِّدَتْ بِهَا اُسْدُ الدُّنْيَا بِاَسْرِهِم

اردو

ایسے لوگوں پر اگر ناقص کرے طعنہ زنی

میں کروں اپنی زباں سے کچھ گلہ؟ توبہ مِری

کُل جہاں کے شیر وابستہ ہیں اس زنجیر سے

لومڑی توڑے گی اس حلقہ کو کس تدبیر سے

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۷۰ تا ۶۷۲)

تصاویر کی حرمت اسلام میں ہجرتِ مدینہ کے بعد ہوئی

تصاویر سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو معلوم کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا مناسب ہے کہ تصاویر کی حرمت شریعتِ اسلامیہ محمدیہ کا مخصوص حکم ہے، پہلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں تصاویر ممنوع نہیں تھیں۔

جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں ان کے حکم سے جنات کا تصاویر بنانا مذکور ہے:

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (سبا ۱۳)

اس کے لئے بناتے جو وہ چاہتا اونچے اونچے محل اور تصویریں اور بڑے حوضوں کے برابر لگن اور لنگر دار دیگیں اے داؤد والو شکر کرو اور میرے بندوں میں کم ہیں شکر والے۔

اور ہجرت سے پہلے شریعتِ اسلام میں تصاویر کی حُرمت کا ثبوت نہیں ملتا، ہجرت کے بعد احکامِ حُرمت آئے ہیں۔ (کما ذکرہ فی فتح الباری و مرقاۃ شرح المشکوٰۃ) ان احکام کی تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیں۔

فوٹو گرافر کو ہر فوٹو کھینچنے پر علیحدہ عذاب

وعن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول کل مصور فی النار یجعل لہ بکل صورۃ صورھا نفسٌ فیعذبہ فی جھنم قال ابن عباس فان کنت لا بد فاعلا فاصنع الشجر و مالا روح فیہ۔ (متفق علیہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر تصویر کش دوزخ میں جائے گا۔ اس کی ہر تصویر کے بدلے ایک شخص بنایا جائے گا جس کو اس نے بنایا

اور وہ شخص اس مصور کو دوزخ میں عذاب دے گا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اگر تم نے تصویر بنانی ہی ہے تو درختوں اور غیر ذی روح (بے جان چیزوں) کی بناؤ۔ یہ بخاری و مسلم کی حدیث ہے۔[1]

تشریح: کل مصور: ہر تصویر بنانے والا۔

یجعل: مجہول کا صیغہ ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح مسلم میں اس کو فعل معلوم کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ **ای یجعل اللہ۔** معلوم صیغہ کی بناء پر "نفس" کو نصب دینا تو ظاہر ہے۔

البتہ مجہول کے صیغہ کے ساتھ المصابیح کے بعض نسخوں میں ہے جو کہ جامع صغیر کی روایت کے مطابق ہے اور "**نفس**" بالرفع تو ظاہر ہے۔

اکثر مجہول کے صیغہ کے ساتھ "نفساً" منصوب بھی ہے جو کہ جامع الاصول کی روایت کے مطابق ہے اور اکثر مصابیح کے نسخوں کے مطابق ہے، لیکن مشکل ہے۔ مگر اس کی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی اسناد جار مجرور کی طرف ہے۔

فتعذبه: یہ صیغہ تانیث کے ساتھ ہے۔ ای تعذب تلک النفس اور فعل کی اسناد اس کی طرف مجازاً ہے۔ کیونکہ یہی اس کا سبب اور اس کی تعذیب کا باعث ہے اور بعض نسخوں میں بصیغہ تذکیر ہے۔

ای فیعذبه اللہ اور ایک نسخہ میں "**فیعذب به**" مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ **ای بسبب تصویر تلک النفس۔**

---

[1](أخرجه البخاری فی صحیحه ۴/۱۶۴ الحدیث رقم ۲۲۲۵، ومسلم فی ۳/۱۶۷۰ الحدیث رقم (۹۹-۲۱۱۰)، وأحمد فی المسند ۱/۳۰۸)

فی جهنم: علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہاں تک روایت کو احمد و مسلم نے ذکر کیا ہے۔ قوله: قال ابن عباس: فان كنت لا بد فاعلا فاصنع الشجر و مالا روح فيه: خطاب اس کو ہے جس کا ذکر باب کی فصل ثالث کے آغاز میں آئے گا۔

قوله: متفق عليه: اور ممکن ہے کہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ بھی اس طرح ہوں، تو معنیٰ میں یہ حدیث "متفق عليه" کے قبیل سے ہوگی۔ لہٰذا یہ امام سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس اقتصار کے منافی نہیں جو انہوں نے اختیار کیا ہے کہ اس کو صرف بحوالہ مسلم ذکر کیا ہے۔ فتأمل۔[1]

من صوّر صورة عُذِّبَ و كُلِّفَ ان ينفخ فيها و ليس بنافخ یعنی جو کوئی تصویر بنائے گا تو اس کو عذاب دیا جائے گا اور اسے اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح ڈالے۔ وہ ڈال نہ سکے گا۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔[2]

تشریح: قوله: و من صور صورةً: یعنی ذی روح کی تصویر بنائی، یا مطلق کوئی صورت بنائی۔ اور ذی روح کی تصویر کے بارے میں اس کو تغلیظاً حکم دیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے۔ ان ينفخ: ایک روایت میں الروح کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کی نظیر "من تحلم" ہے۔

احمد رحمہ اللہ تعالیٰ شیخین رحمہ اللہ تعالیٰ اور نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح روایت کیا ہے:

من صور صورة فی الدنيا كلف ان ينفخ فيها الروح يوم القيامة و ليس بنافخ۔[3]

قال رسول الله ﷺ كل مصور فی النار يجعل الله بكل صورة صورها نفسا فتعذبه فی جهنم۔

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۲۴-۵۲۳)

[2] (أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۲/ ۴۲۷ الحديث رقم ۳۹۱۶، أبو داؤد فی السنن ۴/ ۲۸۵ الحديث رقم ۵۰۲۴، والترمذی فی السنن ۴/ ۲۰۳ الحديث رقم ۱۷۵۱)

[3] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۸ ص ۵۲۶-۵۲۵)

ہر فوٹو گرافر جہنم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر تصویر کے بدلے جو اس نے بنائی تھی ایک مخلوق پیدا کرے گا کہ وہ اسے دوزخ میں عذاب دے۔ [1]

مسلمان بھائی! ہوش کر! یہ قول حضور سرورِ کائنات ﷺ کا ہے مگر فی الحقیقت یہ قول اللہ کا ہے، یہ ذہن میں بٹھا کر سچے دل سے سن۔

فوٹو گرافر اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کر رہے ہیں

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ: انّ الذین یصنعون ھذہ الصور یعذبون یوم القیامۃ، یقال لھم: احیوا ما خلقتم۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ تصاویر بناتے ہیں قیامت کے روز ان کو عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو تم نے بنایا ہے اس کو زندہ کرو۔ [2]

دوزخ میں سب سے بڑا گناہ فوٹو گرافر کو ہو گا

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ ان من أشد الناس عذاباً یوم القیامۃ المصورون۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو دیا جائے گا۔ [3]

وعن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول اشدّ الناس عذاباً عند اللہ المصوّرون۔ (متفق علیہ)

---

[1] (بخاری مسلم)

[2] (صحیح بخاری باب عذاب المصورین ج ۲ ص ۸۸۰، قدیمی کتب خانہ)

[3] (صحیح بخاری، و صحیح مسلم، الموسوعۃ الفقھیہ ۶: ۱۳۴، فتح الباری ۱۰:۳۸۲)

حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں جن کو سب سے سخت عذاب دیا جائے گا وہ تصویر بنانے والے ہیں۔ یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔[1]

تشریح: اشد الناس عذابا عند اللہ المصوّرون: بعض نے کہا ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ اس کو تہدید پر محمول کیا جائے کیونکہ "عند اللہ" سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ اس طرح ہونے کے مستحق ہیں، اگرچہ یہ محل عفو ہے۔

علامہ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اس صورت پر محمول ہے جو عبادت کے لئے بنائی گئی ہو، کہ اس کے لئے سخت ترین عذاب ہو گا کیونکہ وہ کافر ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس شخص کے بارے میں ہے کہ جو اس کو اللہ تعالیٰ کی خلقت کی مشابہت کے ارادہ سے کرے اور اس کا اعتقاد رکھے تو وہ بھی کافر ہے اور اس کا عذاب سخت ہو گا۔ البتہ جو اس ارادے سے اس کو نہ بنائے تو وہ فاسق ہے۔ وہ کافر نہیں ہو گا، جیسا کہ دوسرے گناہ ہوتے ہیں۔

البتہ جن چیزوں میں روح نہیں ہے مثلاً درخت وغیرہ تو اس کی تصویر بنانا کوئی حرام فعل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کمائی حرام ہے۔ یہ علماء کا مذہب مختار ہے سوائے مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ کے کہ انہوں نے پھل دار درخت کی تصویر کو بھی مکروہ قرار دیا ہے اور (مجاہد نے) اس حدیث سے استدلال کیا ہے: "**ومن اظلم ممن ذهب يخلق كخلقى**" کہ اس میں آپ ﷺ نے ذرۃ کا ذکر کیا ہے جو کہ

---

[1] (أخرجه البخاری فی صحیحه ١٠/٣٨٢ الحدیث رقم ٥٩٥٠، ومسلم فی ٣/١٦٧٠ الحدیث رقم ٢١٠٩-٩٨، والنسائی فی السنن ٨/٢١٦ الحدیث رقم ٥٣٦٤)

ذی روح ہے اور حنطہ و شعیر کا بھی ذکر کیا ہے حالانکہ یہ دونوں چیزیں جمادات میں سے ہیں اور اس پر سخت وعید سنائی ہے۔ اس طور پر کہ جملہ استفہام انکاری کے طور پر ہے اور ظلم کو تفضیل کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ ان کا استدلال بالکل ظاہر و جلی ہے۔ اور فرمایا کہ جمہور علماء کرام نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے، احیوا ما خلقتم۔ میں کہتا ہوں ان کی دلیل یہ قول بھی ہے: "لیخلقوا حبة"۔ اور فرمایا خلق اللہ کے ساتھ مشابہت ہے۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ علت مشترک ہے۔ (امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ اس کی تائید حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی ہوتی ہے: "ان کنت لا بد فاعلاً فاصنع الشجر و ما لا نفس له" میں کہتا ہوں کہ اس کے باوجود کہ یہ مذہب صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں ان کی رائے ہونے کا احتمال بھی ہے۔ لہٰذا اس کو ضرورةً جواز فعل پر محمول کیا جائے گا اور اس کا ارتکاب "کراهة دون کراهة" پر محمول ہو گا کیونکہ ضروریات محظورات کو مباح کر دیتی ہیں۔ (واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالنیات)

اور اس کی نظیر حدیث مرفوع میں یہ وارد ہے: "ان کنت لا بد سائلا فاسأل الصالحین" جیسا کہ اس کو ابوداؤد و نسائی نے الفراسی سے روایت کیا ہے۔

امام خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "مصور" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو حیوانات کی شکلیں بناتا ہے اور وہ شخص جو درختوں کی شکلوں کا نقش لیتا ہو اور اس پر تداویر و خواتیم اور ان جیسے عمل کرتا ہو تو میں امید رکھتا ہوں کہ وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے۔ اگرچہ من جملہ مکروہ ہے اور یہ لغو کام میں داخل ہے، اور اشتغال بما لا یعنی ہے اور یہ جو تصویر میں اس قدر سخت عقوبت ہے سو اس لئے ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کی جاتی ہے۔

میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ جمہور نے ذی روح کی جو تخصیص کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں (یعنی ذی روح) کی خلقت کی نسبت مخلوق کی طرف جائز نہیں ہے نہ ہی حقیقۃً اور نہ ہی مجازاً۔ برخلاف باقی نباتات اور جمادات کے، کہ بسا اوقات اس کے فعل کو مجازاً لوگوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: "انبت فلان هذا الشجر، و صنع فلان هذه السفينة" اور ہر وہ چیز کہ جس کی عبادت کی جاتی ہو اگرچہ وہ جمادات میں سے ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ سورج اور چاند وغیرہ تو اس کی تصویر حرام ہونی چاہیئے۔ و الله اعلم۔

اشرف کہتا ہے کہ اس حدیث میں مشہور روایت رفع کے ساتھ ہے۔ ای "ان من اشد الناس عذاباً المصورون" اسی طرح ابن الملک رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شرح میں ذکر کی ہے اور رفع سے اعتذار کیا ہے۔ چنانچہ امام کسائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ "من" زائدہ ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں ضمیر شان مقدر ہے۔ أي انه من أشد الناس عذابا المصورون۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح مسلم میں بہت ساری روایات ذکر کی ہیں ان میں لفظ "ان" نہیں ہے۔ البتہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت میں "اشد الناس عذابا" بغیر "من" کے ہے اور جامع الصغیر میں ہے: "ان اشد الناس عذاباً يوم القيامة المصورون" امام احمد اور مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے "ان" کے ساتھ بغیر "من" کے روایت کیا ہے۔ شاید اشرف کی مراد شہرۃ سے علماء عربیت کے ہاں شہرت ہے اور شاید بعض نسخوں میں ان حضرات نے اس طرح پایا ہو۔

بعض محدثین کرام نے اس حدیث کی تاویل میں یہ معنی بیان کیا ہے کہ "ان من اشد الناس" ترکیب لفظی کی رعایت کے بغیر انہوں نے اس طرح نقل کیا ہے اور حدیث میں اندراج کر دیا ہے۔

حاصل یہ کہ غیر اہل کے ہاں اس کی شہرت اور عدم شہرت کا اعتبار نہیں کیا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ کیسے سید سند اور سعد اسعد کے درمیان اس حدیث کے معنٰی میں تنازع ہوا: "حب الهرة من الايمان"۔ یہ حدیث باتفاق حفاظ حدیث موضوع ہے اور اسی لئے شیخ سخاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "المقاصد الحسنة فی الاحادیث المشتهرة علی الالسنة" تصنیف فرمائی اور اس کا خلاصہ ان کے شاگرد ابن الدیبع نے کیا ہے۔ [1]

عن مسلم قال: كنا مع مسروق فی دار يسار بن نمير فرأى فی صفته تماثيل فقال: سمعت عبدالله قال: سمعت النبی ﷺ يقول: ان أشد الناس عذاباً يوم القيامة المصوّرون۔

مسلم سے روایت ہے کہ ہم مسروق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یسار بن نمیر کے گھر میں تھے، مسروق رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کے چبوترہ میں کچھ تصاویر دیکھیں تو فرمایا کہ میں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے روز تصویر بنانے والے ہوں گے۔ [2]

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ اس تصویر کے متعلق مسروق رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ تھی کہ یہ کسریٰ کی تصویر ہے اور مسلم کا خیال یہ تھا کہ یہ حضرت مریم علیہا السلام کی تصویر ہے، حضرت

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۲۳-۵۲۱)

[2] (بخاری مع فتح الباری کتاب اللباس ج ۱۰ ص ۳۱۴)

مسروق رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مجوسی کی بنائی ہوئی تصویر سمجھا اور مسلم نے کسی نصرانی کی (فتح الباری)۔

اس حدیث میں مصوّروں کے لئے "اشد العذاب" کا ذکر اس آیت کے منافی نہیں جس میں آلِ فرعون کو اشد العذاب میں داخل کرنے کا ذکر ہے، کیونکہ مراد عذابِ اشد میں داخل ہونا ہے، اس میں مصوّر بھی ہوسکتے ہیں آلِ فرعون بھی اور دوسرے مجرم بھی جیسا کہ حافظ نے طحاوی کی روایت سے مرفوعاً نقل کیا ہے: "أشد الناس عذاباً یوم القیامة رجل هجا رجلا فهجا القبیلة باسرها۔" مراد یہی ہے کہ ایسا کرنے والا عذابِ اشد میں آلِ فرعون وغیرہ کا شریک ہوگا۔[1]

قال علیه السلام ان اشد اهل النار عذابا یوم القیمة من قتل نبیا او قتله نبی او امام جائر وهٰؤلآء المصورون۔

یعنی قیامت میں دوزخیوں میں زیادہ سخت عذاب اس پر ہے جس نے کسی نبی کو شہید کیا یا کسی نبی نے اسے (جہاد میں) قتل کیا یا ظالم بادشاہ یا فوٹو گرافر۔[2]

تشریح: قوله: "ان اشد الناس عذابا یوم القیامة" قوله: أو قتله نبی: یہ "فی سبیل الله" کی قید کے ساتھ مقید ہے اس تقیید کی تائید ایک اور روایت سے ہوتی ہے: "یشتد غضب الله علی رجل یقتله رسول الله" امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کی قید اصل میں احتراز ہے اس سے جس کو کوئی نبی حد یا قصاص میں قتل کرے۔ کیونکہ جس کو اللہ کے واسطے نبی قتل کرے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص نبی کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا۔ اھ۔

---

[1] (فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۱۵)

[2] (بیهقی فی شعب الایمان ۶/۱۹۷ الحدیث رقم ۷۸۸۸)

البتہ اس پر غلام خضر کی وجہ سے اشکال پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ صحیح قول کے مطابق نبی تھے۔ لیکن یہ اشکال "فی سبیل اللہ" کی قید سے رفع ہو سکتا ہے کیونکہ انہوں نے اس کو ایک حکمت کی وجہ سے قتل کیا تھا جس کا ذکر اپنے موقع محل میں ہو چکا ہے۔ أو قتل أحد والديه یہاں "او" تنویع کے لئے ہے۔ والمصورون: اس کا عطف "من قتل" کے محل پر ہے اور اسی طرح "وعالم لم ينتفع بعلمه" بے عمل عالم کو عذاب اس کی اپنی بے عملی کی وجہ سے ہو گا۔[1]

سب سے بڑا ظالم فوٹو گرافر ہے

قال أبو زرعة: دخلت مع أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ في دار مروان فرأى فيها التصاوير فقال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: قال الله عزّ وجلّ: ومن أظلم ممن ذهب يخلق خلقاً كخلقي فليخلقوا ذرّة وليخلقوا حبّة أو ليخلقوا شعيرة۔

حضرت ابو زرعۃ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مروان کے گھر میں داخل ہوا، انہوں نے اس گھر میں تصاویر دیکھیں تو آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو میرے پیدا کرنے کی طرح پیدا کرتا ہے پس اس کو تو چاہیئے کہ وہ ذرہ پیدا کر کے دکھائے اور دانہ پیدا کر کے دکھائے اور جَو پیدا کر کے دکھائے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تصویریں بنانے والے کو اپنی پاک ذات سے مقابلہ کرنے والا گردانتا ہے، گویا اس کام کو اللہ تعالیٰ نے شرک کہا ہے۔

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۳۶-۵۳۵)

[2] (صحیح بخاری، باب نقض الصور، مسلم)

روایاتِ مذکورہ میں تصویر بنانے والوں کو قیامت میں سخت عذاب ہونے کا بیان ہے اور اس ضمن میں تصاویر کے استعمال کی ممانعت اور برائی کا بھی بیان ہو گیا، کیونکہ جن حالات میں یہ ارشادات آئے ہیں وہ عموماً اس کے ہیں کہ کسی کے مکان یا کپڑے وغیرہ میں تصویر دیکھی تو اس پر مصوّروں کے عذاب کا ذکر فرمایا، جس میں اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ یہ عذاب کی چیز اپنے گھروں میں اور استعمال میں رکھنا بھی درست نہیں، جیسا کہ یہ مضمون صراحۃً بھی متعدد احادیث میں آگے آرہا ہے۔

ایک تیسری چیز ان روایات میں یہ بھی ہے کہ تصویر سازی یا تصویر کے استعمال کو شریعتِ اسلام نے کیوں حرام قرار دیا؟ اس کی بہت سی وجوہ میں سے ایک وجہ کا بیان ان روایات میں یہ ہے کہ تصویر اور تخلیق اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی خاص صفات ہیں، جن میں کوئی غیر اللہ شریک نہیں ہو سکتا، حق تعالیٰ کے ننانوے اسماء حسنیٰ میں سے ایک خالق اور مصوّر بھی ہے، اور اس پر پوری اُمّت کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں اسم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر اللہ پر ان الفاظ کا اطلاق بھی جائز نہیں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (الحشر ۲۴)

اس میں خالق اور مصور ہونے کی صفت حق تعالیٰ شانہ کی مخصوص صفت قرار دی گئی ہے، جن میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شریک نہیں ہو سکتا، تو جس شخص نے کسی جاندار کی تصویر بنائی اس نے گویا اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق و تصویر میں مداخلت اور شرکت کا عملی دعویٰ کیا، اسی لئے حدیث میں اس کا عذاب یہ ذکر فرمایا کہ قیامت کے روز تصویر سازوں سے کہا جائے گا کہ تم نے ہماری صفتِ تخلیق و

تصویر کی نقّالی کر کے عملی طور پر خالق ور مصور ہونے کا دعویٰ کیا ہے، تو اب تم اس دعویٰ کو پورا کر کے دکھاؤ کہ ان میں روح بھی ڈالو، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی بے جان میں جان ڈالنا نہ دنیا میں کسی کی قدرت ہے نہ آخرت میں ہو گی، اس لئے وہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں جان نہ ڈال سکیں گے تو ان پر عذاب ہو گا۔

سب سے بڑا ظالم فوٹو گرافر!

وعن ابی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنه قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: قال اللہ تعالیٰ ومن أظلم ممن ذهب یخلق خلقاً کخلقی فلیخلقوا ذرّة ولیخلقوا حبّة أو شعیرة۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ شخص سب سے بڑا ظالم ہے جو میری تخلیق کی طرح تخلیق کرتا ہے پس اسے چاہیئے کہ وہ ایک چیونٹی یا دانہ یا جو پیدا کرے۔[1]

یعنی میں نے جس طرح صورت بنائی اسی طرح کی صورت بنائے۔ یہ در حقیقت پیدا کرنا تو نہیں جس مواد سے اللہ تعالیٰ نے بنایا۔ یہ صورت بنا کر یہ گمان کرتا ہے کہ میں نے بنایا ہے۔ اگر یہاں دعویٰ پیدا کرنے کا رکھے تو اسے چاہیئے کہ وہ ایک چیونٹی یا دانہ یا جو پیدا کرے۔

قوله: من اظلم: ای لا أحد أظلم "ذهب": (فعل شروع کے معنی میں ہے) **أی اراد وطفق وشرع۔**

"فلیخلقوا": (اس سے پہلے شرط محذوف ہے۔ **ای فان زعموا ذلک فلیخلقوا۔** یہ امر برائے تعجیز ہے۔

---

[1] (أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۸۵/۱۰ الحدیث رقم ۵۹۵۳، ومسلم فی ۱۶۷۱/۳ الحدیث رقم ۱۱۱-۲۱۰۱، وأحمد فی المسند ۲۳۲/۲)

ذرۃ: چھوٹی چیونٹی یاھوا میں غبار بنادے یاان جیسی ایسی کوئی چیز جس کو میں نے بغیر اسباب کے پیدا کیاہے کوئی اور چیز۔

اویخلقوا: یہاں پر "او" تنویع کیلئے ہے اور اس میں تردید کا بھی احتمال ہے۔

حبۃ او شعیرۃ: "حبہ" سے اشارہ عام دانہ کی طرف اور "شعیرۃ" سے خاص دانہ کی طرف اشارہ ہے۔تواس صورت میں "او" تقسیم کیلئے ہوگا۔

الجامع الصغیر میں ہے:

"قال اللہ تعالیٰ: ومن اظلم ممن ذھب یخلق خلقا کخلقی فلیخلقوا حبۃاو یخلقوا ذرۃاو لیخلقوا شعیرۃ" رواہ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ ، والشیخان رحمہ اللہ تعالیٰ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔[1]

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور سرورعالم ﷺ سفر سے تشریف فرما ہوئے تھے میں نے ایک دروازہ پر تصویر دار پردہ لٹکا دیا۔ جب حضور اقدس ﷺ واپس تشریف لائے،اس کے ملاحظہ سے چہرہ انور کا رنگ بدل گیا۔اندر تشریف نہ لائے۔ام المؤمنین فرماتی ہیں میں نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! اتوب الی اللہ والی رسولہ ما ذااذنبت۔ یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کے رسول ﷺ کی طرف توبہ کرتی ہوں، مجھ سے کیا خطاہوئی۔ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا: **ان اصحاب ھذہ الصور یعذبون یوم القیمۃ یقال لھم احیوا ما خلقتم۔** بے شک یہ فوٹو گرافروں کو قیامت کے دن عذاب ہوگا (ان سے کہا جائے گا) کہ جو تم نے بنایاہے اسے زندہ کرو۔[2]

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۲۱)

[2] (بخاری ص ۸۸۱، مسلم)

اے مسلمان بھائی! حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بے خبری کی بنا پر تصویر دار پردہ لٹکائے رکھا تھا اور وہ بھی صرف ایک بار۔ تم معلوم ہونے کے باوجود بار بار یہ گناہ کرتے ہو۔ تم خود سوچ لو کہ رحمۃ للعالمین ﷺ کا کتنا غیظ و غضب ہو گا۔ یہ تم خود اپنے دل سے پوچھو کہ تم ان کی شفاعت کے امیدوار ہو یا نہیں؟

عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت: قدم رسول اللہ ﷺ من سفر و قد سترت سهوة لی بقرام فيه تماثيل فلما راه رسول الله ﷺ هتكه و قال: أشد الناس عذاباً يوم القيامة الذين يضاهؤن بخلق الله، قالت: فقطعناه فجعلناه وسادة او وسادتين۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ سفر سے تشریف لائے، میں نے روشندان پر ایک باریک پردہ ڈال دیا تھا جس پر تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ جب حضورِ اقدس ﷺ نے اس پردے کو دیکھا تو آپ ﷺ نے اس کو پھاڑ دیا اور فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو ہو گا جو اللہ تعالیٰ کے عمل پیدائش کے ساتھ مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے وہ پردہ کاٹ دیا اور اس سے ایک یا دو تکیے بنا لئے۔[1]

عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا قال: قدم النبی ﷺ من سفر و علقت درنو کا فيه تماثيل فأمرنی ان انزعه، فنزعته۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سفر سے واپس تشریف لائے تو میں نے ایک چھوٹا کپڑا (دیوار پر) لٹکایا ہوا تھا جس میں تصاویر تھیں، آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کو ہٹا دوں، تو میں نے اسے ہٹا دیا۔[2]

---

[1] (صحیح بخاری، باب ما وطئی من التصاویر)

[2] (بخاری مع فتح الباری ۱۰:۳۱۸)

تشریح: درنوک: بضمِ دال ایسے سوتی کپڑے کو کہا جاتا ہے جو فرش کے طور پر بچھایا جاسکے اور کبھی اس کو پردے کی طرح بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں اس حدیث کے اندر تصاویر کے ذکر کے ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ تصاویر ایسے گھوڑوں کی تھیں جن کے پَر لگے ہوئے تھے۔[1]

وعنها انها كانت قد اتخذت على سهوة لها ستراً فيه تماثيل فهتكه النبی ﷺ فاتخذت منه نمرقتين فكانتا فی البيت يجلس عليها۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی خاص بیٹھنے کی جگہ پر پردہ لٹکایا جس پر تصاویر تھیں تو آپ ﷺ نے اس پردے کو پھاڑ ڈالا پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے دو تکیئے بنالئے وہ دونوں گھر میں تھے، آپ ﷺ ان پر بیٹھتے تھے۔ یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔(متفق علیہ)

تشریح: سهوة: سین مہملہ کے فتحہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ دو گھروں کے درمیان کی کھڑکی کو کہتے ہیں۔ (ذكره فی شرح السنه) اور الفائق میں ہے کہ گھر کے سامنے ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ رف یا طاق کے مشابہ ہوتا ہے جس میں چیزیں رکھی جاتی ہیں اور شاید اسی وجہ سے اسے "سهوة" کہا ہے کیونکہ یہ اپنے صغر و خفا کی وجہ سے نظروں سے غافل رہتا ہے۔ یہ لها (اس کا متعلق محذوف ہے) ای كائنة لعائشة مختصة بها فيه تماثيل: یہ "تمثال" کی جمع ہے۔ تمثال "شيئی مصور" کو کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد حیوان کی تصویر ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یعنی اس کو کاٹ دیا اور اس میں موجود تصویر کو تلف کر دیا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پھر اس حدیث اور سابق حدیث کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟ میں کہتا ہوں

---

[1] (فتح الباری)

کہ تماثیل... کو تصاویر پر محمول کیا جائے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان تصویروں کے سر کاٹ کاٹ کر ان کو نمارق (تکیوں) میں استعمال کیا۔[1]

تصویر کی وجہ سے چہرہ مبارک پر ناراضگی

وعنها (رضی اللہ عنها) انها اشترت نمرقة فيها تصاوير فلما رأها رسول الله ﷺ قام على الباب فلم يدخل فعرفت فی وجهه الكراهية قالت فقلت يا رسول الله ﷺ اتوب الى الله والىٰ رسوله ماذا اذنبت فقال رسول الله ﷺ ما بال هٰذه النمرقة قالت قلت اشتريتها لک لتقعد عليها وتوسدها فقال رسول الله ﷺ ان اصحاب هٰذه الصور يعذبون يوم القيمة ويقال لهم احيوا ما خلقتم وقال ان البيت الذی فيه الصورة لا تدخله الملائكة۔ (متفق عليه)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک تکیہ خریدا جس پر تصاویر تھیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے جب اس کو دیکھا تو آپ ﷺ دروازے پر ٹھہرے رہے گھر میں تشریف نہ لائے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ناراضگی کے آثار پائے۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرنے لگیں یا رسول اللہ ﷺ! میں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف رجوع کرتی ہوں۔ میں نے کیا غلطی کی ہے کہ آپ ﷺ گھر میں تشریف نہیں لاتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس تکیے، کا کیا معاملہ ہے اور تم اسے کہاں سے لائی ہو؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرنے لگیں کہ اس کو میں نے آپ ﷺ کے لئے خریدا ہے تاکہ آپ ﷺ اس پر بیٹھیں اور تکیہ لگائیں یعنی جس طرح پسند ہو۔ تو فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ تصویر بنانے والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا اس چیز کو زندہ کرو جس کو تم نے بنایا تھا اور ارشاد فرمایا یقیناً وہ گھر جس میں تصویر ہو

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۱۹-۵۱۸)

اس میں فرشتے نہیں داخل ہوتے (یعنی اور نہ ہی انبیاء و اولیاء اس میں داخل ہوتے ہیں) یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔[1]

تشریح: نمرقة: نون اور راء کے ضمہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں دونوں کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ القاموس میں ہے کہ "**النمرقة**"چھوٹے تکیہ **و النمرقة مثلثه** ہے، یا اس تکیہ کو کہا جاتا ہے جو کجاوے کے اوپر رکھا جاتا ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: نون اور راء دونوں پر تینوں حرکتیں درست ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ دونوں کے کسرہ کے ساتھ ہے "**وسادة**" کو کہتے ہیں ۔امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "**النمرق**"نون کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ، چھوٹے تکیہ کو کہتے ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ **مرقعة** کو کہتے ہیں۔

فیھا تصاویر: "**تصاویر**" یہ "**صور**" کے معنی میں ہے۔یعنی اس میں تصویریں تھیں۔ گویا کہ انہوں نے گھر کے سامنے والے حصہ میں ڈال رکھا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کو دیکھا تو وہیں پر ٹھہر گئے اور جلال کی وجہ سے گھر میں داخل نہ ہوئے۔

فعرفت: یہ متکلم کا صیغہ ہے اور ایک نسخہ میں **بصیغۂ تانیث** ہے۔ اس صورت میں یہ قول راوی کا ہو گا۔ یعنی انہوں نے آپ ﷺ کے چہرۂ انور کے تاثرات اور عدم دخول کی وجہ سے آپ ﷺ کی ناراضگی معلوم کرلی۔

"**الی**" کے اعادۃ میں ان دونوں کی طرف استقلال رجوع پر دلالت ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حسن ادب ہے، کہ گناہ پر مطلع ہوتے ہی توبہ کو مقدم کیا۔ جیسا کہ اللہ کا قول ہے: **عَفَا اللّٰهُ عَنۡكَ لِمَ أَذِنۡتَ**

---

[1] (أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٣٩٣ الحديث رقم ٥٩٦١، ومسلم في ٣/١٦٦٩ الحديث رقم (٢١٠٧-٩٦) وأحمد في المسند ٦/٢٤٦)

لَهُمْ (التوبۃ:۴۳) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تلطف اور رحم کی وجہ سے، اللہ تعالیٰ نے عفو کو مقدم فرمایا۔ ذنب کے ذکر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عفو سے ابتداء فرمائی۔ جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس گناہ پر کوئی اطلاع نہیں ہوئی تھی چنانچہ انہوں نے توبہ کو معرفتِ ذنب پر مقدم کیا، گویا کہ آپ کو یہ پتہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ کی ناگواری ان تصاویر کی وجہ سے ہے بلکہ انہوں نے خیال کیا ہو گا کہ شاید کراہت اس کو بچھانے اور گھر کو سجانے کی وجہ سے ہے، اس لئے انہوں نے یہ کچھ کیا۔ قولہ: ان أصحاب ھذہ الصور یعذبون: اس کا عموم تصویر ساز اور تصویر استعمال کرنے والے دونوں کو شامل ہے البتہ پہلی بات کی تائید اگلے جملہ سے ہو رہی ہے کہ ان سے کہا جائے گا کہ تم ان میں روح پھونک دو۔ ان کی مزید توہین مقصود ہے۔ کیونکہ خالق کے ساتھ مشابہت اختیار کی ہے اور ان کو "احیوا" کا حکم دراصل ان کا عجز بتلانے کے لئے ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ہے: فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ (البقرۃ:۲۳) تو اس سے معلوم ہوا کہ تصویر حرام ہے، اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ استعمال تصویر بھی ممنوع ہے کیونکہ یہ اس کا سبب و باعث ہے۔ مزید یہ کہ یہ دنیا کی زینت ہے۔ اگلا جملہ "ان البیت الذی فیہ۔۔۔" بھی اس کے امتناع اور سبب منع پر مشتمل ہے اور بظاہر اس حکم میں تمام گھروں کی تمام جگہوں کی تمام تصویریں شامل ہیں۔ قولہ: لا تدخلہ الملائکۃ: یعنی جس طرح ملائکہ داخل نہیں ہوتے اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبع بھی داخل نہیں ہوتے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ملائکہ کا دخول فی البیت سے ممتنع ہونا تصویر کی وجہ سے ہے چاہے صورۃ مباح ہو یا حرام ہو، جیسا کہ حدیث سابق میں امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: واللہ الموفق۔ اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث کے آخر حصہ کو روایت کیا ہے۔[1]

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۱۸-۵۱۷)

حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حسنِ ادب

ادھر یہ بات قابلِ نظر ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر ناراضگی کے آثار دیکھے تو پہلے عرض کیا کہ میں توبہ کرتی ہوں! بعد میں پوچھا کہ میرا گناہ کیا ہے؟ ازواج کو ایک مقام ناز کا بھی حاصل ہوتا ہے، آج تو کوئی جاں نثار خادم بھی یہ ادب نہیں جانتا، پہلے الزام ثابت کرنے کو کہتا ہے!

عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: کان قرام لعائشة سترت به جانب بیتها فقال لها النبی ﷺ: امیطی عنی فانه لاتزال تصاویره تعرض لی فی صلوٰتی۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک پردہ تھا جس سے اپنے مکان کے ایک حصہ کو ڈھکا ہوا تھا، تو نبی کریم ﷺ نے اُن سے فرمایا کہ: میرے پاس سے دور کردو کیونکہ اس کی تصاویر میری نماز میں مخل ہوتی ہیں۔[1]

مذکور الصدر احادیث سے ثابت ہوا کہ جاندار چیزوں کی تصویر کا جیسے بنانا حرام ہے، ویسے ہی ان کا اپنے گھروں میں زینت کے پردوں وغیرہ میں رکھنا بھی ناجائز ہے، اور یہ کہ جاندار چیزوں کی تصویر کے علاوہ بے جان چیزوں میں جن اشیاء کی پرستش عام طور پر کی جاتی ہو جیسے صلیب اس کا نقش اور تصویر بھی رکھنا جائز نہیں۔

اور بعض احادیث میں ایک مضمون تو وہی ہے کہ تصویر بنانے والوں کو قیامت میں سخت عذاب دیا جائے گا اور یہ کہ اس عذاب کی وجہ ان کی یہ حرکت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی مخصوص صورتِ تخلیق میں اپنا حصہ لگانے کا دعویٰ عملاً کیا۔

---

[1] (بخاری مع فتح الباری ۱۰:۳۲۱)

دوسری بات اس میں یہ بھی ثابت ہوگئی کہ صرف تصویر کے بنانے والے ہی مستحقِ عذاب نہیں بلکہ ان کا استعمال کرنا بھی گناہ میں داخل ہے۔

یہ بھی ثابت ہوا کہ جس مکان میں تصاویر نمازی کے سامنے یا دائیں بائیں ہوں اس میں نماز بھی مکروہ ہے، کما صرح بہ الفقھاء۔

احادیثِ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں اختلافِ الفاظ

پردہ میں تصویر کے متعلق حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی چار احادیث آئی ہیں، ان میں دو میں آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سفر سے واپسی کا ذکر ہے، یہ بیہقی کی روایت کے مطابق غزوۂ تبوک کا اور ابو داؤد و نسائی کی روایت کے مطابق غزوۂ تبوک یا خیبر کا سفر تھا۔

اور ان دونوں احادیث میں دیوار کے کسی حصہ میں ایک باتصویر پردہ لٹکانے کا ذکر ہے، ایک حدیث میں پردہ کو بلفظ "قرام" اور دوسری میں بلفظ "دُرنوک" بیان کیا گیا ہے۔

اوران دونوں روایتوں میں سے پہلی میں ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جب اس مصوّر پردہ کو دیکھا تو خود بدستِ مبارک اس کو چاک کر دیا، اور دوسری روایت میں بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس کے الگ کرنے کا حکم فرمایا۔ مگر مسندِ احمد میں اسی دوسری حدیث جس میں لفظ "دُرنوک" استعمال کیا گیا ہے، اس میں بھی یہ الفاظ ہیں کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کو اپنے دستِ مبارک سے پھاڑ دیا۔

اور دونوں ہی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ پھاڑنے کے بعد صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کے دو گدّے یا تکئے بنا لئے تھے، جن کو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بھی استعمال فرماتے تھے۔ قرام والی

حدیث میں تو اس کے دو تکیے بنالینا خود بخاری کے الفاظ میں بھی ہے، اور دُرنوک والی حدیث میں اس کے دو تکیے بنالینا مسندِ احمد کی روایت میں موجود ہے۔

ان دونوں روایات کا واقعہ اتنی چیزوں میں مشترک ہے جن کا اُوپر ذکر آیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں روایات ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔

البتہ جس حدیث میں حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک مصوّر نمرقہ یعنی گدّا خریدنا اور رسول اللہ ﷺ کا اس کو دیکھ کر غضبناک ہونا اور گھر میں داخل ہونے سے رکنا مذکور ہے، یہ بظاہر دوسرا مستقل واقعہ ہے، اس میں کسی سفر سے واپسی کا بھی ذکر نہیں اور اپنے ہاتھ سے چاک کر دینے کا بھی ذکر نہیں ہے، بلکہ اظہار ناراضی کے لئے گھر کے اندر تشریف لانے سے رُکنا اور اس پر صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا متنبہ ہو کر توبہ کرنا منقول ہے، مسند احمد کی روایت میں اس نمرقہ کے بھی دو ٹکڑے کر کے دو تکئے بنالینے کا ذکر ہے، مسند کے الفاظ میں نمرقہ کے بجائے نمط کا لفظ آیا ہے۔

اسی طرح حدیث بروایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس میں مصوّر پردہ کا ذکر ہے اس میں بہت نرم الفاظ آئے ہیں، اس میں یہ بھی ہے کہ اس پردہ میں تصاویر ہونا آپ ﷺ کو پہلے سے معلوم بھی تھا اور اس کے باوجود آپ ﷺ نے اس کو گھر میں باقی رکھا، اور نہ صرف باقی رکھا بلکہ نماز بھی وہیں پڑھتے تھے، ایک روز یہ فرمایا کہ اس کو میری طرف سے ہٹادو کیونکہ اس کی تصویر میری نماز میں خلل انداز ہوتی ہے، جو سابقہ تینوں روایتوں سے بالکل مختلف ہے۔ خصوصاً مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: **انها كانت لها ثوب فيه تصاوير ممدود الى سهوة وكان النبي ﷺ يصلّى اليه فقال: اخريه عنى!** یعنی "حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک

کپڑا تھا جس میں تصاویر تھیں، یہ ایک طاق یا الماری کی طرف پھیلا ہوا تھا، نبی کریم ﷺ اس کی طرف نماز پڑھتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو میری طرف سے ہٹا دو!"[1]

اسکے متعلق حافظ نے فتح الباری میں فرمایا: کہ اس روایت اور روایاتِ سابقہ میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ پہلی روایات کے واقعہ میں جانداروں کی تصاویر تھیں اور اس روایت میں تصاویر ذی روح کی نہ ہوں بلکہ درختوں، پھولوں کے نقش و نگار ہوں، اسی لئے اس پردہ کو آپ ﷺ نے قائم رکھا اور وہ فرشتوں کے داخلہ سے بھی مانع نہیں ہوا، اور نماز میں اس کی طرف رُخ کرنا بھی گوارا کیا گیا، مگر چونکہ نقش و نگار بعض اوقات انسان کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہٹا کر اپنے میں مشغول کر لیتے ہیں، اس لئے ازراہِ تقویٰ اس کو ہٹانے کا حکم فرمایا، اور یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض روایات میں دیوار پر غیر مصوّر پردہ ڈالنے سے بھی اس لئے روکا گیا کہ یہ زہد اور شانِ نبوّت کے خلاف ہے، حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازہ پر پردہ دیکھ کر آپ ﷺ کا واپس ہو جانا جو آگے حدیث میں آرہا ہے، اس کی بھی یہ توجیہ خود حدیث میں مذکور ہے کہ ہم اور ہمارے اہل بیت کو نقش و نگار سے کیا کام ہے، عمدۃ القاری میں علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی روایات کی تطبیق اسی طرح نقل کی ہے۔[2]

اور اگر اس میں ذی روح کی تصویریں ہوں تو پھر یہ حدیث تصاویر کی ممانعت سے پہلے ابتداء ہجرت کے وقت کی حدیث قرار دی جائے گی جیسا کہ بہت سے حضرات نے صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گُڑیوں کے متعلق ایسا فرمایا ہے۔

---

[1](فتح الباری ۱۰:۳۲۱)
[2](فتح الباری، ۲۲:۷۴)

فرشتوں کی برکات سے محروم رکھنے والے "کتا اور تصاویر"

عن ابی طلحة قال قال النبی ﷺ لا تدخل الملٰئکة بیتاً فیه کلبٌ و لا تصاویر۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس گھر میں کتا اور تصاویر ہوں وہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔[1]

تشریح:

لا تدخل الملائکة: یہ صیغہ تذکیر و تانیث دونوں کے ساتھ جائز ہے۔ اس سے مراد ملائکہ رحمت ہیں نہ کہ حفاظت پر مامور اور موت والے ملائکہ اس میں ان کی کراہت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ لیکن وہ ان کاموں پر مامور ہوتے ہیں اور جو ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں۔

بیتا فیه کلب: سے مراد رہائش کی جگہ ہے، اس سے شکار، کھیتی اور چوپاؤں کی حفاظت کے لئے رکھے جانے والے کتے مستثنیٰ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بھی مانع ہیں اگرچہ ان کا رکھنا حرام نہیں ہے۔ **و لا تصاویر:** یہ تمام انواع کی صورت کو شامل ہے۔ البتہ وہ چیزیں جن کو پاؤں کے ساتھ روندا جاتا ہو۔ ان میں رخصت ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن الملک رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دراصل ملائکہ اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں وہ کتے اور تصویریں ہوں جو حرام ہیں۔ البتہ جو کتے حرام نہیں ہیں، مثلاً کھیتی، شکار اور ماشیہ (جانوروں کی حفاظت) کیلئے رکھے گئے کتے اور وہ تصویریں جو حرام نہ ہوں، یعنی جو بستر اور تکیوں میں ہوں تو یہ دخول ملائکہ کیلئے مانع کی حیثیت نہیں رکھتے۔ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ زیادہ واضح بات یہ

---

[1] (أخرج البخاری فی صحیحه ۱۰/۳۸۰ الحدیث رقم ۵۹۴۹ ومسلم فی ۳/۱۶۶۵ الحدیث رقم (۲۱۰۶-۸۳)، وأبو داؤد فی السنن ۴/۳۸۴ الحدیث رقم ۴۱۵۳، والترمذی فی ۵/۱۰۶ الحدیث رقم ۲۸۰۴، والنسائی فی ۸/۲۱۲ الحدیث رقم ۵۳۴۷، وابن ماجه فی ۲/۱۲۰۳ الحدیث رقم ۳۶۴۹، وأحمد فی المسند ۴/۲۹، مشکوة شریف ص ۳۸۵ باب التصاویر)

ہے کہ یہ حکم کلب اور تصویر کے بارے میں عام ہے اور ان سب کی وجہ سے یہ ملائکہ گھر وغیرہ میں داخل نہیں ہوتے ہیں کیونکہ احادیث مطلق ہیں اور اس لئے بھی نبی علیہ السلام کے گھر میں کتا چارپائی کے نیچے تھا، اس میں تو عذر ظاہر تھا کیونکہ نبی علیہ السلام کو اس کا علم نہیں تھا مگر اس کے باوجود جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے گھر میں داخل نہیں ہوئے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا تصویر والے گھر میں داخل نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ تصویر ان چیزوں میں سے ہے جن کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ عبادت کی جاتی ہے اور جس گھر میں کتا ہو اس میں فرشتے اس لئے داخل نہیں ہوتے کہ کتا گندگی کھاتا ہے اور اس لئے بھی کہ ان میں سے بعض کو شیطان کہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، اور ملائکہ شیطان کی ضد ہیں اور اس لئے بھی کہ کتوں سے قبیح قسم کی بو آتی ہے اور جو کوئی کتا رکھے گا اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو محروم کر دیا جائے بایں طور کہ نہ ملائکہ اس کے گھر میں داخل ہوں اور نہ اس کے لئے دعائے رحمت و استغفار کریں۔ یہ فرشتے حفاظت کرنے والوں کے علاوہ ہیں، کیونکہ وہ مکلفین سے جدا نہیں ہوسکتے۔ ہمارے اصحاب اور دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ حیوان کی تصویر بنانا شدید حرام ہے اور کبائر میں سے ہے، کیونکہ اس پر یہ شدید قسم کی وعید وارد ہوئی ہے۔ چاہے کپڑے پر بنائے یا بستر پر دراہم و دینار پر بنائے یا کسی اور چیز پر۔ البتہ درختوں، کجاوہ اور پہاڑ اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔ یہ نفس تصویر کا حکم ہے۔ البتہ اگر حیوان کی تصویر بنائے، تو اگر وہ دیوار پر معلق ہے چاہے اس تصویر کا سایہ ہو یا نہ ہو، کپڑے پر بنائے اور وہ کپڑا ملبوس ہو یا عمامہ یا اس طرح کی چیز ہو تو وہ بھی حرام ہے۔ البتہ تکیہ اور اس جیسی وہ چیزیں جس کو روندا جاتا ہے تو ان پر تصویر حرام نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ بھی دخول ملائکہ کا مانع بنتا ہے یا نہیں؟ تو اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں البتہ وہ گڑیا جو بچیوں کے کھیل کے لئے کپڑوں سے بنائی جاتی ہے تو اس میں رخصت ہے۔ لیکن امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لئے اس کے خریدنے کو مکروہ لکھا ہے اور بعض نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کے ساتھ بچیوں کے کھیلنے کی اباحت ان احادیث سے منسوخ ہو چکی ہے۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

جامع صغیر میں ہے، کہ اس حدیث کو احمد، شیخین، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے ابو طلحہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں: **لا تدخل الملائکۃ بیتا فیه کلب و لا صورۃ۔** امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، ترمذی، ابن حبان، نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یوں روایت کیا ہے: **ان الملائکۃ لا تدخل بیتا فیه تماثیل او صورۃ۔** ابن ماجہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت کیا ہے: **ان الملائکۃ لا تدخل بیتا فیه کلب و لا صورۃ۔**

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "**و لا تصاویر**" کا عطف "**کلب**" پر ہے اور ظاہر کا حق یہ تھا کہ "لا" کا تکرار ہوتا اور یوں کہا جاتا: "**لا کلب و لا تصاویر**" لیکن سیاق نفی میں واقع ہونے کی وجہ سے یہ جائز ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ہے: **(ما ادری ما یفعل بی و لا بکم)** اور اس میں تاکید ہے۔ اگر اس کو ذکر نہ کرتے تو اس میں یہ احتمال ہوتا کہ ان کے درمیان جمع کی نفی ہے۔ جیسا کہ یہ قول ہے: "**ما کلمت زیداً و لا عمرواً**" اگر اس کو حذف کرتے تو جائز تھا کہ ان میں سے کسی ایک کا تکلم ہوتا۔ کیونکہ "واؤ" جمع کے لئے ہے اور "**لا**" اعادۃ فعل کی طرح ہے۔"[1]

عن أبی طلحۃ رضی اللہ تعالیٰ عنه یقول: سمعت رسول اللہ ﷺ: لا تدخل الملائکۃ بیتاً فیه کلب و لا صورۃ۔

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۱۳-۵۱۲)

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔ [1]

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما قال: وعد جبریل النبی ﷺ فراث علیه حتی اشتد علی النبی ﷺ فخرج النبی ﷺ فلقیه فشکا الیه ما وجد فقال: انا لا ندخل بیتاً فیه صورة ولا کلب۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنے میں تاخیر کر دی، حضورِ اقدس ﷺ پر یہ بات شاق گزری، آپ ﷺ گھر سے باہر نکلے وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات ہوگئی، آپ ﷺ نے انتظار کی وجہ سے جو تکلیف ہوئی اس کی شکایت فرمائی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر یا کتا ہو۔

عن أبی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول اللہ ﷺ لا تدخل الملائکة بیتاً فیه تماثیل أو تصاویر۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں مجسمے یا تصاویر ہوں۔ [2]

عن عبد اللہ بن نجیّ الحضرمی عن أبیه عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنهم فی حدیث طویل عن رسول اللہ ﷺ أنه ذکر عن جبریل علیه السلام أنه قال: انها ثلاث لن یلج ملک ما داموا فیها أبداً واحد منها کلب او جنابة او صورة روح۔ أخرجه احمد فی مسنده کما فی فتح الباری ۹ ۷ ۲:۷، وأخرجه أیضاً النسائی وابن ماجه مختصراً وسنده جید کما فی "الفتح الربانی"۔

---

[1] (صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب تحریم تصویر صورة الحیوان، الموسوعة الفقهیه ج ۶ ص ۱۳۴، فتح الباری ۱۰ ص ۳۸۰، مطبوعه السلفیة)

[2] (صحیح مسلم)

حضرت عبد اللہ بن نجی الحضرمی اپنے والد سے اور وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک طویل حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جب تک وہ کسی جگہ پر ہوں، فرشتے اس جگہ داخل نہیں ہوتے، ان میں سے ایک کتا، دوسرے ناپاکی کی حالت والا، تیسرے جاندار کی تصویر۔

انها ثلث لم یلج ملک ما دام فیها واحد منها کلب او جنابة او صورة روح۔

جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ کوئی فرشتہ رحمت وبرکت کا اس گھر میں داخل نہیں ہو گا جب تک اِن تین چیزوں میں ایک اس گھر میں ہو: کتا، جُنب، اور جاندار کی تصویر۔[1]

وعن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما عن میمونة ان رسول الله ﷺ اصبح یوما واجما وقال ان جبرئیل کان وعدنی ان یلقانی اللیلة فلم یلقنی اما والله ما اخلفنی ثم وقع فی نفسه جرو کلب تحت فسطاط له فامر به فاخرج ثم اخذ بیده ماءً فنضح مکانه فلما امسیٰ لقیه جبرئیل فقال لقد کنت وعدتنی ان تلقانی البارحة قال اجل ولکنا لا ندخل بیتا فیه کلب ولا صورة فاصبح رسول الله ﷺ یومئذ فامر بقتل الکلاب حتی انه یأمر بقتل کلب الحائط الصغیر ویترک کلب الحائط الکبیر۔[2]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ ایک صبح کو رسول اللہ ﷺ خاموش اور غمگین تھے تو آپ ﷺ نے غمگین ہونے کا سبب حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا کسی اور زوجہ محترمہ سے یا بطور تعجب اور حیرانی کے فرمایا کہ آپ ﷺ کے دل میں یہ بات آئی کہ آج رات جبرائیل علیہ السلام نے مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا

---

[1] (احمد، نسائی)

[2] (رواہ مسلم)

تھا مگر اس نے ملاقات نہیں کی اللہ کی قسم جبرائیل علیہ السلام اپنے وعدے کی خلاف ورزی مجھ سے نہیں کرتے پھر آپ ﷺ کے دل میں خیال آیا کہ کتے کا بچہ جو آپ ﷺ کے خیمہ (چارپائی) کے نیچے پڑا تھا جبرائیل علیہ السلام اس کی وجہ سے نہیں آئے آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس کتے کے بچے کو نکال دیا جائے اسے نکال دیا گیا پھر آپ ﷺ نے تھوڑا سا پانی لے کر اس کی جگہ پر چھڑکا تو پھر جب شام ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام کی آپ ﷺ سے ملاقات ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے مجھ سے گزشتہ رات ملنے کا وعدہ کیا تھا، انہوں نے کہا جی ہاں مگر ہم ان گھروں میں داخل نہیں ہوتے جہاں کُتا یا تصویر ہو، پس جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے چھوٹے باغوں کے کتوں کو بھی مارنے کا حکم دیا کیونکہ ان میں حفاظت کی ضرورت نہیں ہوتی اور بڑے باغوں کے کتوں کو چھوڑ دیا کیونکہ ان میں حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مسلم کی روایت ہے۔[1]

تشریح: عن میمونۃ "اصبح" یہ "اصباح" کے لئے ظرف ہے۔

واجماً: میم سے پہلے جیم ساکن ہے، یہ حال ہے۔ أی ساکناً حزیناً من الوجوم۔ غم اور غصہ کی وجہ سے خاموش ہونے کو کہتے ہیں اور "النہایۃ" میں ہے۔ ای مہتماً "واجم" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کو غم خاموش کرا دے اور اس پر سخت رنج غالب آ جائے۔

ان یلقانی: یاء متکلم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کو ساکن کرنا بھی جائز ہے اور وصل میں اس کا حذف بھی جائز ہے۔

[1] (أخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۶۶۴ الحدیث رقم (۱۰۵-۲۱۰۵) وأبو داؤد فی السنن ۴/۳۸۷ الحدیث رقم ۴۱۵۷)

اللیلة: یہ ''وعد''کیلئے ظرف ہے۔ **''ام''**ہمزہ کے فتحہ اور میم کے ساتھ۔ یہاں پر **''ام''**تنبیہ کے لئے ہے اور الف کو تخفیفا حذف کر دیا گیا ہے۔ **''الجرو''**جیم مکسور، راء ساکن اور پھر واؤ ہے۔ القاموس میں ہے کہ **''الجرو''**میں تینوں حرکات درست ہیں۔ کتے کے چھوٹے بچے کو کہتے ہیں۔

فسطاط: فاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ایک قسم کے خیمہ کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد چارپائی ہے۔**فأمر به:ای باخراج الجرو۔** امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ جس شخص کا وقت ضائع ہو جائے اور اس کا وظیفہ خراب ہو جائے تو اس کو اس کے سبب میں غور و فکر کرنا چاہیے جیسا کہ یہاں نبی علیہ السلام نے کیا یہاں تک کہ اس کتے کو نکال دیا اور اس کی طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ دیا: **اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (الاعراف: ۲۰۱)** ''جو لوگ پرہیزگار ہیں جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو چونک پڑتے ہیں اور (دل کی آنکھیں کھول کر) دیکھنے لگتے ہیں۔''

أمسی: أی دخل المساء زوال کے بعد یا سورج کے غروب ہونے کے بعد کا وقت مراد ہے۔ **''أجل'':** لام مخففہ کے سکون کے ساتھ بمعنی **''نعم''**۔ یہاں تک کہ آپ علیہ السلام نے چھوٹے باغ کے کتوں کے قتل کرنے کا حکم کیا۔ کیونکہ ایسے باغوں کو حراست کی ضرورت نہیں تھی۔ جب کہ بڑے باغات کے کتوں کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا کیونکہ کتوں کے بغیر اس کی پہرہ داری مکمل نہیں تھی۔

حتی انه:''انّ بکسر الہمزہ ہے'' اور ضمیر ضمیر شان ہے، یا نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہے، علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **''یامر''** حکایت حال ماضیہ ہے۔ **''یترک''** یہ معطوف ہے۔ اس تقدیر پر کہ یہ **''لم یأمر بقتل کلب الحائط الکبیر''** کے معنی میں ہے اور یہ **''حائط**

الکبیر" کے وصف سے مستفاد ہوتا ہے۔ یہ اس شخص کے لئے دلیل ہے جو مفہوم مخالف پر عمل کرتا ہے۔ جیسا کہ سائمہ غنم کی زکوٰۃ میں کہتا ہوں عمل بالقید اور عمل بالمفہوم میں فرق ہے اور حدیث مفہوم مخالف کے عدم اعتبار میں صریح ہے۔ ورنہ تو کلام میں واصل کا تکرار ہوتا اور تحصیل حاصل ہوتا۔ کیونکہ "یآمر بقتل کلب الحائط الصغیر" کا مفہوم یہ ہے لم یأمر بقتل کلب الحائط الکبیر بل یترکه۔ کہ آپ نے بڑے باغ کے کتوں کے قتل کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کو چھوڑ دیا اور اسی طرح "ویترک کلب الحائط الکبیر" کا مفہوم یہ ہے لم یترک کلب الحائط الصغیر بل یأمر بقتله کہ آپ ﷺ نے چھوٹے باغ کے کتوں کو نہیں چھوڑا بلکہ اس کے قتل کا حکم دیا۔ واللہ اعلم۔[1]

فوٹو کی ہتک کے لئے جبرئیل علیہ السلام نے کیا فرمایا

قال علیه السلام أتانی جبریل فقال لی مر برأس التماثیل یقطع فتصیر کهیئة الشجرة وامر بالستر فیقطع فیجعل وسادتین منبوذتین توطئان۔

میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور عرض کی کہ حضور آپ ﷺ حکم فرمائیں کہ فوٹو کا سر کاٹا جائے کہ پیڑ کی طرح رہ جائیں اور تصویر والے پردے کے لئے حکم فرمایئے کہ دو مسندیں بنالی جائیں کہ زمین پر ڈال کر پاؤں سے روندی جائیں۔[2]

عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ اتانی جبرئیل علیه السلام قال اتیتک البارحة فلم یمنعنی ان اکون دخلت الا انه کان علی الباب تماثیل وکان فی البیت قرامٌ سترٌ فیه تماثیل وکان فی البیت کلبٌ فمر برأس التمثال الذی علی باب البیت فیقطع فیصیر کهیئة الشّجرة ومر بالستر فلیقطع فلیجعل وسادتین منبوذتین توطان ومر بالکلب فلیخرج ففعل رسول اللہ ﷺ۔

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۱۴-۵۱۳)

[2] (ترمذی، نسائی)

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل علیہ السلام تشریف آئے اور کہنے لگے گزشتہ رات بھی آپ کے پاس آیا تھا، مجھے گھر میں داخلہ سے دروازہ کی تصاویر نے منع کر دیا اور گھر میں تصویر والا رنگین منقش پردہ تھا جس کو لٹکایا گیا تھا اور گھر میں کتا تھا۔ پس آپ ان تصاویر کے سر کاٹنے کا حکم فرمائیں جو دروازے پر لگی ہوں یعنی پردے کی تصاویر کے سر کاٹ دیئے جائیں جس سے وہ درخت کی شکل بن جائیں، ان کی ہیئت تصاویر والی باقی نہ رہے اور آپ یہ حکم دیں کہ پردے کو کاٹ کر دو تکئے بنا لئے جائیں۔ تاکہ وہ روندنے میں آئیں اور گھر سے کتا نکالنے کا حکم فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ویسا ہی کیا جو جبرائیل علیہ السلام نے کہا تھا۔ یہ ترمذی وابوداؤد کی روایت ہے۔"[1]

تشریح: قال: یہ استئناف ہے، سوال مقدر کے جواب کے لئے بیان ہے۔ **أن أکون:** (اس سے پہلے حرف جر مقدر ہے "**تاء**" کے فتح کے ساتھ "**تمثال**" بکسر الاول کی جمع ہے۔

ابن الملک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حیوانات کی تصاویر ہیں۔

و کان: ماقبل "کان" حرفِ عطف ہے۔ لہٰذا یہ بھی کلام جبرائیل علیہ السلام کا حصہ ہے۔

القرام: قاف کے کسرہ کے ساتھ منقش پردے کو کہتے ہیں۔ اور القاموس میں ہے کہ "**القرام**" (ازروئے وزن) "کتاب" کی طرح ہے۔ سرخ پردہ کو کہتے ہیں یا وہ رنگدار کپڑا جو اون سے بنا ہو جس میں نقش ونگار اور پھول بوٹے ہوں یا باریک پردے کو کہتے ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے النہایہ سے نقل کیا ہے کہ قرام باریک پردہ کو کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے مراد رنگ برنگی اون سے بنا ہوا کپڑا ہے اور اس میں اضافت ایسی ہے کہ جیسی

---

[1] (أخرجه أبو داؤد في السنن ۳۸۸/۴ الحديث رقم ۴۱۵۸، والترمذي في السنن ۲۸۰۶، وأحمد في المسند ۳۰۵/۲)

"ثوب قمیص" میں ہے اور بعض کے ہاں "قرام" سے مراد وہ باریک پردہ ہے جو موٹے پردے کے پیچھے لٹکایا جاتا ہے اور اسی لئے اس کی اضافت ہے۔

یقطع: یہ مجہول کا صیغہ ہے، تخفیف کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں تشدید کے ساتھ ہے اور مرفوع ہے اور ایک نسخہ صحیح میں نصب کے ساتھ ہے اور ضمیر "رأس التمثال" کی طرف راجع ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جامع الاصول اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں رفع کے ساتھ ہے اس طور پر کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور بعض میں نصب کے ساتھ ہے جواب امر ہونے کی وجہ سے اس لئے کہ شارع کا امر امتثال کا سبب ہوتا ہے اور پہلا (ضبط) معنٰی کے لحاظ سے زیادہ لطیف ہے۔

فیصیر: اس میں بھی دونوں صورتیں ہیں۔ ای یرجع التمثال المقطع رأسہ۔ اگر یہ کہا جائے۔ کھیئۃ الشجرۃ: کہ اس کے ذکر کا کیا فائدہ ہے؟ میں کہوں گا کہ یہ بتلانا تھا کہ قطع سے مراد اس کے سر کی جگہ کا مٹانا نہیں ہے بلکہ اس کو جدا کرنا مراد ہے کیونکہ یہ اس وقت تک شجر کی طرح نہیں ہوتا جب تک اس سے سر جدا نہ ہو۔ جب تک اس پر سر باقی رہے گا یا مٹا ہوا ہو گا تو وہ ھیئۃ شجرۃ نہیں ہو سکتا۔ (ابن الملک رحمہ اللہ تعالیٰ) اور یہ معقول و منقول کے خلاف ہے۔ پہلی صورت میں جب سر مٹا دیا جائے گا اور چہرہ کی وہ صورت کہ جس سے امتیاز ہوتا ہے وہ بھی مٹا دی جائے گی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ھیئۃ شجرہ کی طرح ہو جاتا ہے اور یہ امر مشاہد ہے اور دوسری صورت میں یہ خلاف مذہب ہے۔ چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ مکروہ ہے کہ آدمی نماز پڑھے اور اس کے سامنے یا اس کے اوپر یا دائیں طرف یا بائیں طرف کپڑوں پر تصاویر ہوں اور "بساط" کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ بچھونے پر مکروہ نہیں ہے جب تک کہ تصاویر پر سجدہ نہ کرے فرمایا اور

یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب تصویر ناظرین کو بغیر تکلف کے نظر آتی ہو۔ اگر وہ تصویر چھوٹی ہو یا اس کا سر مٹا ہوا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس میں دلیل ہے کہ جب تصویر کی حقیقت متغیر ہو جائے اس طور پر کہ اس کے سر کو کاٹ دیا جائے، یا اس کے جوڑ جدا کر دیئے جائیں کہ صرف صورت کا اثر باقی رہ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ کہ جب تصویر کی جگہ کو توڑ دیا جائے یہاں تک کہ اس کے اوصال (اعضاء و جوڑ) کٹ جائیں تو پھر اس کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

توطان: یہ صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے یعنی ان کو روندنے، ان پر بیٹھنے یا اس سے ٹیک لگانے سے اس کی اہانت کی جاتی ہو اور "**وطا**" اصل میں پاؤں کے ساتھ مارنے کو کہتے ہیں اور پردہ کو کاٹنے سے مراد یہ ہے کہ اس سے دو تکیے بنائے جائیں۔ جیسا کہ حدیث سے ظاہر ہے۔ اس سے تصویر دار چیز کے استعمال کا جواز نکلتا ہے جیسا کہ تکیہ بستر اور بساط۔

اور بعض نے کہا ہے کہ "**قطع**" سے مراد یہ ہے کہ تصویر کی کوئی جگہ باقی نہ رہے، یہ احتمال بعید ہے اور ممکن ہے کہ "**ستر**" سے مراد جنس ستر ہو و دروازہ وغیرہ پر لٹکے ہوئے پردے اور گھر میں موجود پردہ کو بھی شامل ہے اور "**قطع**" سے مراد برابر کر کے کاٹنا ہے۔ پھر اس کو سی کر دو تکیے بنا لئے جائیں۔

فیخرج: یہ مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں "**فلیخرج**" ہے۔

ففعل رسول اللہ ﷺ: یعنی جو کچھ مذکور ہوا، وہ سب کچھ کر دیا، یا فعل کو بمنزلہ لازم کے کیا ہے۔ **ای امتثل۔ واللہ اعلم۔**[1]

---

[1](بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸، ص ۵۲۹-۵۲۷)

بعض حضرات کے نزدیک تصویر والے گھر میں داخل ہونے سے باز رہنا صرف ملائکہ وحی جبرائیل واسرفیل وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے عام فرشتوں کا یہ حکم نہیں، اس قول پر یہ اعتراض تو صحیح نہیں کہ زمانۂ وحی یعنی آنحضرت ﷺ کے بعد تصویر والے مکان میں داخل ہونا اور تصویر کا استعمال کرنا وغیرہ سب جائز ہو جانا لازم آتا ہے۔ کیونکہ جب وحی بند ہوئی تو ان فرشتوں کا زمین پر آنا بھی بند ہو گیا اور یہ اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد سلسلۂ وحی بند ہو جانے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ ملائکہ وحی جبرائیل علیہ السلام وغیرہ زمین ہی پر نہ اُتریں، بلکہ بہت سی احادیثِ صریحہ سے ان کا قیامت تک ہر زمانہ میں زمین پر تشریف لانا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ اکثر مفسرین کے نزدیک (تَنَزَّلُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوْحُ) میں روح سے جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں، ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بروایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بیہقی و ابن حبان وغیرہ نے بروایت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور طبرانی نے بروایت میمونہ بنت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آنحضرت ﷺ سے بعبارات مختلفہ جبرائیل و میکائیل واسرافیل وغیرہم کا ہر زمانہ میں زمین پر تشریف لانا نقل کیا ہے اور حدیث مشکوٰۃ دربارۂ نزولِ جبرائیل علیہ السلام ”فی کبکبۃ من الملٰئکۃ“۔

اور یہ جو مشہور ہے آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جبرائیل علیہ السلام زمین پر تشریف نہ لاویں گے، اس کو شیخ جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ”الاعلام بنزول عیسیٰ علیہ السلام“ میں ردّ کر دیا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔

فوٹوگرافر کو ایک شرط پر عذاب سے تخفیف

عن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال: سمعت محمداً ﷺ یقول: من صوّر صورۃ فی الدنیا کلّف یوم القیامۃ ان ینفخ الروح و لیس بنافخ۔

یعنی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دنیا میں کوئی تصویر بنائے گا تو قیامت کے روز اس کو اس بات کا مکلف کیا جائے گا کہ وہ اس کے اندر روح ڈالے اور وہ اس کے اندر روح نہیں ڈال سکے گا۔[1]

غور کرکے دیکھو کس طرف جارہے ہو؟

عن سعید بن أبی الحسن قال کنت عند ابن عباس اذ جاءہ رجل فقال: یا ابن عباس! انی رجل انما معیشتی من صنعۃ یدی و انی اصنع ھذہ التصاویر، فقال: ابن عباس: لا أحدّثک الا ما سمعت من رسول اللہ ﷺ سمعتہ یقول: من صوّر صورۃ فانّ اللہ معذبہ حتی ینفخ فیھا الروح ولیس بنافخ فیھا ابدا۔ فربا الرجل ربوۃ شدیدۃ و اصفر وجھہ، فقال: ویحک ان أبیت الا ان تصنع فعلیک بھذا الشجر کل شیء لیس فیہ روح۔

حضرت سعید بن أبی الحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تھا، اتنے میں ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے آکر کہا کہ اے ابن عباس! میری معیشت کا مدار میرے ہاتھ کی صنعت پر ہے اور میں یہ تصاویر بناتا ہوں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے وہ بات بیان کرتا ہوں جو جناب رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنی ہے، میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے کوئی تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دینے والے ہیں یہاں تک کہ وہ اس تصویر میں روح ڈال دے اور وہ کبھی بھی اس میں روح نہیں ڈال سکے گا، یہ سن کر اس شخص نے ایک لمبی سانس لی اور اس کا چہرہ پیلا پڑگیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: تم پر بڑا افسوس ہے کہ تو تمام پیشوں

---

[1] (صحیح بخاری باب من صور صورۃ الخ)

سے انکار اور صرف مصوری کو اختیار کرنے والا ہے، اگر بنانا ہی ہے تو درختوں اور ہر اس چیز کی تصویر بنا جس میں روح نہ ہو۔[1]

تشریح: یعنی میری معاش کا ذریعہ تو صرف تصاویر ہی ہے۔ **لا احدث:** "**لا**" نافیہ ہے۔ **ای لا اخبرک فی جوابک۔** اور میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ نبی کی بات نفس میں زیادہ تاثیر رکھتی ہے۔ جس نے تصویر بنائی اور اس کو اپنا مشغلہ بنایا۔

قولہ: فان اللہ معذبه: یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور ایک نسخہ صحیحہ میں مضارع کے صیغہ کے ساتھ "**یعذبه**" ہے۔

حتی ینفخ فیه: اور ایک نسخہ میں "**فیھا**" ہے۔ **ای فی الصورۃ** اور اس کی تائید اگلے جملہ سے ہوتی ہے: **ولیس بنافخ فیھا ابدا۔** اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کا عذاب ہمیشہ ہوگا، یہ وعید شدید پر محمول ہے یا مستحل پر محمول ہے۔

قولہ: فربا الرجل ربوۃ شدیدۃ: یہ مصدریت (یعنی مفعول مطلق ہونے) کی بناء پر منصوب ہے۔ علامہ جوہری رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ "**الربو**" نفس عالی (چڑھی ہوئی سانس) کو کہتے ہیں۔ "**ربا یربو ربوا**" اور القاموس میں ہے کہ "**ربا الفرس ربوا**" اس وقت کہا جاتا ہے جب دوڑنے سے اس کا سانس چڑھ جائے، یا خوف کی وجہ سے حاصل معنی یہ ہے کہ وہ خوف زدہ ہو گیا جب حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ حدیث شریف نقل فرمائی اور لمبی سانس لینے لگا۔

ویحک: یہ کلمہ اس شخص کے لئے کہا جاتا ہے جو ایسی ہلاکت میں گر جائے، جس کا مستحق نہ ہو، تاکہ اس پر رحم کیا جائے اور اسی سے یہ خبر مرفوع بھی ہے: **ویح عمار تقتله الفئة الباغیة۔** اس

---

[1] أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۲۱۶/۴، الحدیث رقم ۲۲۲۵ واحمد فی المسند ۳۶۰/۱۔

کو ابو داؤد نے "الحلیة" میں حضرت ابو قتادۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ زیادتی پر نقل کیا: یدعوھم الی الجنة ویدعونه الی النار۔ برخلاف کلمۂ "ویل" کے چونکہ یہ مستحق ہلاکت شخص کے لئے کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَیْلَکَ آمِنْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ (الاحقاف: ۱۷) اور القاموس میں ہے: "ویح لزید ویحاً له" کلمہ رحمت ہے اور اس کا رفع ابتداء کی وجہ سے ہے، اور اضمار فعل کی وجہ سے منصوب ہے اور "ویح زید ویحه" یہ دونوں (بھی اسی وجہ سے) منصوب ہیں۔

ان ابیت: یعنی اگر تم باقی صنعتوں سے انکاری ہو، اور صرف تصاویر ہی بنانا چاہتے ہو، تو پھر تم درختوں کی تصاویر بناؤ اور ان جیسی ان اشیاء کی تصویریں بناؤ۔ جو غیر ذی روح ہیں۔ جیسا کہ اس بات کو اگلے جملہ میں بیان کیا گیا ہے: و کل شیء لیس فیه روح۔

"کل" جر کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس میں جر اس وجہ سے جائز ہے کہ یہ شجر کا بیان ہو گا کیونکہ جب ان کو تصویر سے منع کر دیا اوران کی راہنمائی "جنس شجر" کی طرف کر دی تو انہوں نے اس کو "قصد" کے لئے وافی نہیں دیکھا تو اس کی وضاحت فرمادی، یہ "بدل" کے قریب ہے اور نصب تفسیر کی بناء پر ہے۔ یعنی "اعنی" مقدر ہے اور اظہر یہ ہے کہ "جر" کے ساتھ تعمیم بعد التخصیص کے قبیل سے ہے اور ممکن ہے کہ اس کا نصب "نزع الخافض" کی بناء پر ہو اور اس پر دال کا وجود ہے۔

قیامت میں ایک خوفناک شئ فوٹو گرافر کے سر پر

وعن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ یخرج عنق من النار یوم القیمة لھا عینان تبصران و اذنان تسمعان و لسان ینطق یقول انی و کلت بثلثة بکل جبّار عنید و کل من دعا مع اللہ الٰھاً اٰخر و بالمصورین۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن دوزخ سے ایک گردن نکلے گی (یعنی آگ کا ایک ٹکڑا گردن کی صورت میں نمایاں ہوگا) جس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھے گی، دو کان ہوں گے جس سے وہ سنے گی، اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گی، وہ کہے گی مجھے تین اشخاص کے لئے متعین کیا گیا ہے (یعنی ان کو دوزخ میں داخل کروں اور لوگوں کے سامنے رسوائی کا عذاب دوں): وہ جو حق سے تکبر اور عناد کرنے والے ہیں، ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اوروں کو شریک کرے اور تیسرا تصویر کھینچنے والوں کے لئے۔[1]

تشریح: قولہ: یخرج عنق: اس سے مراد شخص قوی ہے اور بعض نے اس سے مراد ایک طائفہ لیا ہے (**ذکرہ بعض شراح**) اور القاموس میں ہے کہ "**العنق**" ضمہ کے ساتھ اور دو ضموں کے ساتھ جیسا کہ صرد بمعنی "**جیدد**" مؤنث ہے۔ لوگوں کی ایک جماعت کو کہتے ہیں اور علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی فرماتے ہیں "**یعنی طائفہ**"۔

عینان تبصران: اسی قسم کے اوصاف حجر اسود کے بارے میں وارد ہیں کہ جس نے اس کے ساتھ عہد وہ میثاق کو پورا کیا یہ قیامت کے روز اس کے لئے گواہی دے گا۔

عن أبی جحیفۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان النبی ﷺ نھیٰ عن ثمن الدم و ثمن الکلب و کسب البغی و لعن آکل الربا و موکلہ و الواشمۃ و المستوشمۃ و المصوّر۔

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے خون کی قیمت لینے سے اور کتے کی قیمت لینے سے اور بدکاری کی کمائی سے منع فرمایا ہے اور آپ ﷺ

[1] (أخرجه الترمذی فی السنن ۴/۶۰۴ الحدیث رقم ۲۵۷۴، وأحمد فی المسند ۲/۳۳۶)

نے سود کھانے والے اور سود کھلانے والے اور گودنے والی اور گدوانے والی اور تصویر بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔[1]

تخلیق الٰہی سے مشابہت کرنے والوں پر عذاب

وعن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا عن رسول اللہ ﷺ قال اشد الناس عذابا یوم القیامة الذین یضاھؤن بخلق اللہ۔ (متفق علیه)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ان پر سخت عذاب ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے مشابہت اختیار کرنے والے ہیں۔ یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔[2]

تشریح: قولہ: اشد الناس عذاباً یوم القیمة الذین یضاھؤن:

یضاھؤن: یاء کے ضمہ اور واؤ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ہاء کے کسرہ اور واؤ سے پہلے ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں لغات ہیں اور اس آیت میں یہ لفظ دونوں طرح پڑھا گیا ہے: **یُضَاھِئُونَ قَوْلَ الَّذِینَ کَفَرُوا (التوبة:٣٠)** لیکن پہلی لغت زیادہ مشہور اور اکثر ہے۔ بمعنی "**یشابھون**" یعنی تصویر بنانے کے عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے فعلِ خلق کے ساتھ مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یعنی وہ ایسے کام کرتے ہیں جو اللہ کے خلق یعنی

---

[1] (صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب من لعن المصور)

[2] (أخرجه البخاری فی صحیحه ١٠/٣٨٦ رقم ٥٩٥٤، ومسلم فی ٣/١٦٦٨ رقم ٢١٠٧-٩٢، والنسائی فی السنن ٨/٢١٤ رقم ٥٣٥٦، وأحمد فی المسند ٦/٣٦)

اس کی مخلوق کے مشابہ ہیں، یا یہ کہ وہ اعتقاد رکھا تو وہ کافر ہو جائے گا اور قباحت کفر کی زیادتی کی وجہ سے اس کے عذاب میں بھی اضافہ ہو گا۔ ورنہ یہ حدیث تہدید پر محمول ہے۔ [1]

عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: نھی رسول اللہ ﷺ عن الصورۃ فی البیت و نھی أن یصنع ذلک۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے گھر میں تصویر رکھنے سے منع فرمایا ہے اور تصویر بنانے سے منع فرمایا ہے۔

حضور ﷺ نے فوٹو مٹانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر فرمایا

عن علیّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنہ قال لأبی الھیاج الأسدی: ألا أبعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ ﷺ ان لا تدع صورۃ الا طمستھا و لا قبر أمشرفاً الا سویتہ۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو الہیاج الاسدی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کیا میں تمہیں ایسے کام کی ترغیب نہ دوں جس کی حضورِ اقدس ﷺ نے مجھے ترغیب دی، وہ یہ کہ کسی تصویر کو نہ چھوڑو مگر یہ کہ تم اس کو مٹا دو اور کوئی بلند قبر نہ چھوڑو مگر یہ کہ تم اس کو برابر کر دو۔ [2]

صرف فوٹو کی وجہ سے نبی کریم ﷺ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دعوت سے واپس لوٹ گئے: حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ میں نے حضور سید عالم ﷺ کی دعوت کی۔ حضور علیہ السلام تشریف فرما ہوئے، پردے پر کچھ تصویریں بنی دیکھیں تو آپ ﷺ واپس تشریف

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۲۰)

[2] (مسلم کتاب الجنائز، باب الامر بتسویۃ القبور، ترمذی: کتاب الجنائز حدیث ۱۰۴۹، و ابو داؤد: کتاب الجنائز، حدیث ۳۲۱۸)

لے گئے۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کس سبب سے آپ واپس ہوئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

ان فی البیت سترا فیہ تصاویر و ان الملائکۃ لا تدخل بیتا فیہ تصاویر۔

گھر میں پردے پر تصویریں تھیں، اور ملائکہ رحمت اس گھر میں نہیں جاتے جس میں تصویریں ہوں۔[1]

اے ایسے ویسے مسلمان! حضورِ اقدس ﷺ نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے ناراض ہو کر ان کی دعوت کو رد فرمادیا، تو بے شک تجھ سے تصویر رکھنے کی صورت میں سارے تعلقات توڑ دیں گے!

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تصویر کی وجہ سے ملک شام میں دعوت رد فرمائی۔[2]

تمام مشائخ کو چاہیئے کہ ایسی جگہوں میں دعوت پر نہ جائیں جہاں پر تصاویر موجود ہوں۔ بعض احمقان یہ کہتے ہیں کہ ہم یہ تبرکاً رکھتے ہیں۔ جنابِ عالی! خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی تصاویر تھیں۔ انہیں آنحضرت ﷺ کے حکم سے ختم کیا گیا۔ رہا تبرک کا تصور، تو حرام میں تبرک کہاں؟ **تدبر و لا تکن من الغٰفلین۔**

---

[1](نسائی، ابن ماجہ)

[2](کنزالعمال ج۲ ص ۲۱۹، بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ)

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جس فوٹو کو دیکھتے توڑ دیتے

عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لم یکن یترک فی بیتہ شیئا فیہ تصالیب الا نقضہ۔(رواہ البخاری)

نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم گھر میں جس چیز پر بھی تصویر ملاحظہ فرماتے اسے بغیر توڑے نہ چھوڑتے۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔[1]

تشریح: یعنی اس چیز کو زائل کر دیتے یا اس کو توڑ دیتے۔ اصل میں "نقض" عمارت کے اجزاء کے ابطال کو کہتے ہیں۔ ہمارے علماء میں سے علامہ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابن الملک رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اصل میں راوی نے "تصالیب" کو تماثیل کی جگہ ذکر کیا ہے، حالانکہ اصل میں یہ دونوں چیزیں مختلف ہیں۔ کیونکہ "تصالیب" میں اصل یہ ہے کہ یہ "تصلیب" کی جمع ہے۔ "تصلیب" صلیب تصویر بنانے کو کہتے ہیں۔ صلیب ایک مثلث نما چیز ہوتی ہے جس کی عبادت نصاریٰ کرتے ہیں۔ پھر نفس "تصلیب" پر اس کا اطلاق کیا گیا۔ اور پھر جس چیز کی شکل وصورت تھی اس کو "تصلیب" کہنے لگے۔ "تسمیہ بالمصدر" کے قبیل سے ہے۔ پھر اس کی جمع لائے۔ جیسا کہ "تصاویر" ہے اور یہاں پر "تصالیب" سے مراد صورتیں (یعنی تصاویر) ہیں۔

تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ابوداؤد میں بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

کان لا یترک فی بیتہ شیئاً فیہ تصالیب الا قضبہ۔ ای قطع موضع الصلیب منہ دون غیرہ والقضب القطع۔[2]

---

[1] (أخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۰/۳۸۵ الحدیث رقم ۵۹۵۲، وأبو داؤد فی السنن ۴/۳۸۳ الحدیث رقم ۴۱۵۱، وأحمد فی المسند ۶/۲۳۷)

[2] (الموسوعة الفقھیة، ۱۳۴: ۶)

اور "قضبه" کا معنیٰ "قطعه" ہے (یعنی اس کو کاٹ دیتے)۔ احتمال ہے کہ اختلاف لفظین بعض رواۃ کی طرف سے واقع ہوا ہو۔ ابو داؤد کی حدیث زیادہ فصیح اور زیادہ قرین قیاس ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس میں نظر ہے، کیونکہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے رواۃ اوثق اور اضبط ہیں۔ بخاری کی روایت پر اعتماد اولیٰ واحریٰ ہے اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے، کہ ابو داؤد کے الفاظ کے بارے میں شیخ کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ ابو داؤد کی روایت کے الفاظ ازروئے لغت زیادہ فصیح اور ازروئے صناعت زیادہ قرین قیاس ہیں، یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ کتاب البخاری رحمہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ہاں روایت کے اعتبار سے اصح اور درایہ کے اعتبار سے افصح ہے۔ آپ یہ نہیں دیکھتے کہ قراء سبعہ میں سے بعض قراء بعض اوقات کسی ایسے قراءت میں منفرد ہوتے ہیں جو تمام قراءت متواترہ سے افصح ہوتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ کلامِ باری تعالیٰ میں فصیح اور افصح دونوں کا وقوع جائز ہے۔ اور اسی طرح آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے کلام میں بھی ہے۔ البتہ ان دونوں میں سے ایک کا بطریق اصح ہونا، یا اکثر سے مروی ہونا ایک جدا بات ہے۔ پھر علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "اعلام السنن" میں ذکر کیا ہے، یہ بخاری کی شرح ہے۔ "وفی سائر الروایات" کے الفاظ اس بات کا پتہ دے رہے ہیں کہ یہ کتاب بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ میں ہے کیونکہ "السائر" کا معنیٰ: "بقية من الشيء"۔ اس طرح صاحب النہایۃ نے تصریح کی ہے۔ کیونکہ یہ "سور" سے ماخوذ ہے۔

یہ ایک عجیب بحث اور ایک عجیب اعتراض ہے۔ اس لئے کہ "سائر" بمعنیٰ "جميع" آتا ہے اور بمعنیٰ "الباقی" بھی آتا ہے۔ اکثر واظہر یہی ہے اور یہ معنیٰ اس مقام میں متعین ہے۔ لیکن علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مراد باقی روایات البخاری رحمہ اللہ تعالیٰ یہ محل نظر ہے۔ کیونکہ یہ خلاف ظاہر

ہونے کے ساتھ ساتھ روایات بخاری کے تتبع کا محتاج بھی ہے۔ اور یہ معنیٰ اس مبنیٰ کے وجود پر مبنی ہونا ہے، اور اگر اس کی صحت فرض کر لی جائے، تو پھر یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ روایت ابو داوٗد میں بھی اس طرح ہے اور یہ بھی ممتنع نہیں ہے کہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی بعض روایات بخاری ہی کی بعض روایات سے افصح اور اقیس ہوں، روایۃً بھی اور درایۃً بھی۔ واللہ اعلم۔[1]

فوٹو کے محب سے نبی علیہ السلام کی انتہائی بیزاری کا اظہار

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ سید عالم ﷺ ایک جنازے میں تشریف لے گئے اور فرمایا:

ایکم ینطلق الی المدینة فلا یدع بها وثنا الا کسرہ ولا قبرا الا سواہ ولا صورۃ الا لطخها۔

تم میں کون ہے کہ مدینے شریف جا کر ہر بُت کو توڑ دے اور ہر قبر کو برابر کر دے اور ہر تصویر کو مٹا دے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی میں یا رسول اللہ ﷺ۔ فرمایا تو پھر کیا دیر ہے جاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جا کر واپس آئے اور عرض کیا فرمان کی تعمیل کر لی ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

من عاد الی صنعة شیء من ھذا فقد کفر بما انزل علی محمد۔

اب جو یہ سب چیزیں بنائے گا وہ کفر و انکار کرے گا اس چیز کے ساتھ جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی۔

مسلمان بنظر ایمان دیکھے تو صحیح اور صریح احادیث میں اس پر کتنی سخت وعیدیں فرمائی گئی ہیں، حتیٰ کہ تصاویر بنانے والے کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام احادیث عام، شامل اور محیط کامل ہیں، جس

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۱۶-۵۱۵)

میں کسی بھی تصویر کے کسی بھی طریقے کی تخصیص نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتنے بھی کامل ولی کی تصویر، خواہ کسی بھی طریقے سے بنائی جائے، ناجائز ہے۔ [1]

نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حکم فرمایا کہ کعبۃ اللہ شریف میں جو بُت نصب ہیں، ان کو باہر نکال کر نامعلوم جگہوں پر دفن کریں، چھپی ہوئی تصاویر کو دھو کر صاف کریں۔ انہوں نے آکر عرض کیا کہ ہم نے حکم کی تعمیل اور تکمیل کر لی۔ آپ ﷺ نے کعبۃ اللہ شریف میں پاؤں مبارک اندر کر کے دیکھا کہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور حضرت بی بی مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تصاویر ابھی صحیح سلامت ہیں۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شاید احتراماً ان کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اولی العزم رسول ہونے کے علاوہ سردار کریم ﷺ کے جد امجد بھی تھے۔ آپ ﷺ کعبۃ اللہ شریف کے اندر نہیں گئے اور واپس لوٹ آئے اور حکم فرمایا کہ ان تصویروں کو بھی جا کر مٹایا جائے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے زم زم شریف کا پانی بھر بھر کر کپڑے کے ساتھ رگڑ رگڑ کر ان تصاویر کو مٹا دیا۔

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ کعبۃ اللہ شریف میں جو تصویریں تھیں، حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم فرمایا کہ ان کو مٹا دو۔ حضرت عمر و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل کے لئے سرگرم ہوئے۔ زم زم شریف ڈول کے ڈول بھر کر آتے اور کعبہ اندر باہر سے دھویا جاتا۔ کپڑے بھگو بھگو کر تصویریں مٹائی جاتیں یہاں تک کہ مشرکوں کے آثار سب دھو کر مٹا دیئے۔ جب سرکار مدینہ ﷺ نے خبر پائی کہ اب کوئی نشان باقی نہ رہا، اس

---

[1] (رواہ احمد)

وقت کعبہ کے اندر رونق افروز ہوئے، اتفاق سے بعض تصاویر مثل تصویر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نشان رہ گیا تھا۔ پھر نظر فرمائی تو حضرت مریم علیہا السلام کی تصویر بھی صاف نہ دھلی تھی۔ حضور سرورِ عالم ﷺ نے اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پانی منگا کر بنفس نفیس کپڑا تر کر کے ان کو مٹانے میں شرکت فرمائی اور ارشاد فرمایا: **قاتل اللہ قوما یصوّرون ما لا یخلقون۔** یعنی اللہ تعالیٰ کی مار ہو ان پر جو تصویر بناتے ہیں۔

علمائے حق، مشائخ کرام و سالکین اس پر غور کریں کہ تیرے پیر سے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام بڑے پیر تھے اور خوش اعتقادی میں تیرے نبی کریم ﷺ تجھ سے بڑھ کر تھے، اس کے باوجود بھی تو نہیں مانتا تو پھر تیرے جیسا بد قسمت اور کوئی نہیں! لہٰذا اپنے مشائخ کی تصاویر کو اپنے گھروں سے، اپنے حجروں سے، اور اپنے دکانوں اور دفاتر سے ہٹانا چاہیئے۔

میں نے اپنے شیخ محترم، جامع المعقول والمنقول جگر گوشہ قیوم الزمان حضرت علامہ محمد سعید حیدری صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی اپنے گھر پر دعوت کی۔ ہمارے گھر میں حضرت مبارک صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے والد صاحب جناب سید جمیر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصاویر ساتھ ساتھ لٹکی ہوئی تھیں۔ جب حضرت حیدری صاحب مبارک نے انہیں دیکھا تو خود بنفس نفیس انہیں پھاڑ دیا۔ اور میرے تسکینِ دل کے لئے فرمایا: "شاہ صاحب! آپ ناراض نہ ہوں، میں نے اپنے والد صاحب کی تصویر بھی پھاڑ دی۔ آپ تو عالم بھی ہیں، سید بھی ہیں، اور آپ کو خود معلوم ہے کہ تصاویر گھروں میں رکھنا حرام ہے۔

اور آپ نے یہ حدیث شریف نہیں دیکھی:

لاتدخل الملائکۃ بیتا فیہ کلب ولا صورۃ۔

اور کیا آپ نے بخاری شریف کی یہ حدیث نہیں دیکھی، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے:

لم یکن یترک فی بیتہ شیئا فیہ تصاویر۔

(حضور نبی کریم ﷺ جس چیز میں بھی تصویر ملاحظہ فرماتے اسے بغیر توڑے نہ چھوڑتے)۔"

سلام ہو ایسے مشائخِ عظام پر جو اس طرح اپنے مریدین کی تربیت کرتے ہیں۔

اس طرح تمام سیفی حضرات سے عرض ہے کہ اپنے مرشد مبارک حضرت حیدری صاحب مبارک کی سنت کو زندہ کریں اور تمام تصاویر اپنے گھروں سے نکال دیں۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں بدترین لوگ

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: لَمَّا اشْتَكَى النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرَتْ بَعْضُ نِسَائِهِ كَنِيسَةً رَأَيْنَهَا بِأَرْضِ الحَبَشَةِ يُقَالُ لَهَا: مَارِيَةُ، وَكَانَتْ أُمُّ سَلَمَةَ، وَأُمّ حَبِيبَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَتَتَا أَرْضَ الحَبَشَةِ، فَذَكَرَتَا مِنْ حُسْنِهَا وَتَصَاوِيرَ فِيهَا، فَرَفَعَ رَأْسَهُ، فَقَالَ: «أُولَئِكِ إِذَا مَاتَ مِنْهُمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، ثُمَّ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّورَةَ أُولَئِكِ شِرَارُ الخَلْقِ عِنْدَ اللهِ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ جب حضورِ اقدس ﷺ بیمار ہوئے تو بعض خواتین نے نصاریٰ کے کنیسہ کا تذکرہ کیا جس کو "ماریہ" کہا جاتا تھا، حضرت ام سلمہ اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ دونوں حبشہ سے آئی تھیں، اس لئے ان دونوں نے اس کنیسہ کے حسن اور اس کے اندر جو تصاویر ہیں ان کا ذکر کیا، حضورِ اقدس ﷺ نے اپنا سر مبارک

اٹھایا اور فرمایا یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان میں کسی نیک آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے ہیں اور پھر اس مسجد میں تصاویر بنا دیتے ہیں، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں بدترین لوگ ہیں۔[1]

مندرجہ بالا عبارات اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ تصاویر ممنوع ہیں اور اس بارے میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ تصاویر جسم والی ہوں یا وہ تصاویر کپڑوں پر یا کاغذ وغیرہ پر بنائی گئی ہوں۔

تشریح: كنيسة: یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہ کو کہا جاتا ہے۔ یہ "كنيشت" سے معرب ہے اور اس کنیسۃ کو ماریہ کہا جاتا تھا اور شاید ماریہ بھی معرب ہے "مارئی مثلها" سے۔

دونوں نے اس کو حبشہ میں دیکھا تھا اور اس پر تعجب کیا تھا دونوں نے آپ علیہ السلام کے سامنے "ماریہ" کی خوبصورت تصاویر حُسن کو بیان اور ذکر کیا تو نبی علیہ السلام نے کمال غیرت الٰہیہ کی وجہ سے سر اُٹھایا "اولئک" کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے مخاطب کوئی خاتون تھیں اور ان دونوں میں سے کسی کو خطاب فرمایا یا اپنی ازواج میں سے کسی عورت کو خطاب فرمایا۔ یا حضرت عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا اور ایک نسخہ میں "اولئک" بفتح الکاف ہے اس صورت میں یہ خطاب عام ہے یا ان خواتین کو مردوں کے قائم مقام قرار دیا۔ مطلب یہ کہ ان اہل کتاب یا یہود و نصاریٰ کی جماعت میں سے کوئی نیک آدمی نبی یا ولی مر جاتا تو یہ لوگ اس کی قبر پر سجدہ گاہ یعنی عبادت گاہ بنا لیتے جس کو "کنیسۃ" کہتے ہیں۔ پھر انہوں نے اس میں ان صلحاء کی تصویریں بنائیں۔ ان کی یادگار کے طور پر یا اس لئے کہ ان کی وجہ سے عبادت میں ترغیب ہو گی۔ پھر ان کے بعد اور لوگ آئے، پس

---

[1] (اخرجه البخاری فی صحيحه ١٨٧/٧، الحديث رقم ٣٨٧٣، ومسلم فی ٣٧٥/١ الحديث رقم ٥٢٨-١٦، وأحمد فی المسند ٥١/٦، والنسائی)

شیطان نے ان کو یہ اشکال مزین کر دکھائیں اور ان سے کہا کہ تمہارے اسلاف اس کی عبادت کیا کرتے تھے، تو وہ بُتوں کی پوجا میں جاپڑے۔[1]

مرقاۃ شرح مشکوۃ میں ہے:

الرّجل الصّالح ای من نبیّ او ولیّ تلک الصور الصّلحاء تذکیرا بھم وترغیبا فی العبادۃ لاجلھم۔

یعنی مرد صالح سے مراد نبی یا ولی ہے تلک الصور سے مراد اولیاء کرام ہیں۔ تصاویر اس لئے کھینچتے ہیں کہ ان کو یاد کرکے اور ان کی عبادت کا تصور لاکر اپنی عبادت پیدا کریں۔

فائدہ: دیکھئے بعینہٖ یہی کیفیت آج کل کے پیر پرست بھائیوں کی ہے کہ کہتے ہیں ہم اپنے مشائخ یا بڑے مولویوں کی تصویریں اس لئے رکھتے ہیں تاکہ تصور شیخ یا ان کے کردار یاد کرکے عبادت میں نفع ہو۔ اگرچہ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ ایسے لوگ صرف نام ہی کے محب ہوتے ہیں، اعمال صالحہ کی بجائے برے اعمال میں منہمک ہوتے ہیں۔

تصویر بنانے والے اور بنوانے والے دونوں پر لعنت

لعن اللہ المصوّر والمصور لہ۔

یعنی جو تصویریں بناتا ہے اور جس کی تصویر بنائی جاتی ہے، دونوں پر اللہ پاک لعنت بھیجتا ہے۔

یعنی دنیا و آخرت میں وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہوگا جہنم کا ایندھن بنے گا۔ مگر جس کے دل میں ابلیس کے کئی آشیانے ہیں اور وہ اس کے دل کی یونین کونسل کا چیئرمین بنا بیٹھا ہے وہ کہے گا کہ یہ

---

[1] (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۸ ص ۵۳۵-۵۳۴)

تو دو تین الفاظ ہیں، ان چند الفاظ سے کیا بنے گا، سب خیر ہے، اگر نہیں مانیں گے تو کون سا آسمان گر پڑے گا؟

تصاویر کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال اور ان کا تعامل

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور تابعین کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بہت سے ایسے آثار وارد ہوئے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ حضرات بھی تصویر کو مطلقاً حرام قرار دیتے ہیں۔

ان آثار میں سے چند آثار مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما أنه قال للنصاری: انا لا ندخل کنا ئسکم من أجل التماثیل التی فیها الصور۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نصاری سے فرمایا کہ ہم تمہارے عبادت خانوں میں ان مجسموں کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے جو کہ حقیقت میں تصاویر ہیں۔[1]

عبد الرزاق نے اس اثر کو اسلم مولی عمر کے طریق سے اس طرح نقل کیا ہے کہ:

لمّا قدم عمر الشام صنع له رجل من النصاری طعاماً و کان من عظمائهم و قال: أحب أن تجیئنی و تکرمنی فقال له عمر: انا لا ندخل کنائسکم من أجل الصور التی فیها یعنی التماثیل۔

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام میں تشریف لائے تو نصاریٰ کے ایک شخص نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے کھانا تیار کیا، وہ شخص نصاریٰ کے بڑے لوگوں میں سے تھا، اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے یہاں

---

[1] (ذکره البخاری تعلیقاً فی کتاب الصلاة، باب الصلاة فی البیعة)

تشریف لائیں اور مجھے عزت بخشیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے فرمایا کہ ہم تمہارے عبادت خانوں میں ان تصاویر یعنی مجسموں کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے جو اس میں موجود ہوتی ہیں۔

۳۔ عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما أنہ رأی صورۃ فی البیت فرجع۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے گھر میں تصویر دیکھی تو واپس چلے گئے۔[1]

۴۔ عن أبی مسعود الأنصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ أن رجلاً صنع لہ طعاماً فدعاہ فقال: أفی البیت صورۃ؟ قال: نعم! فأبی أن یدخل حتی کسر الصورۃ ثم دخل۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ان کے لئے کھانا تیار کیا اور پھر ان کو بلایا، انہوں نے پوچھا کہ کیا گھر میں کوئی تصویر ہے؟ داعی نے کہا ہاں! آپ نے اس کے گھر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا حتی کہ اس شخص نے وہ تصویر توڑ دی پھر آپ اس کے گھر میں داخل ہوئے۔[2]

۵۔ عن أبی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنہ رأی فرساً من رقاع فی ید جاریۃ فقال: الا تریٰ ھذا؟ قال رسول اللہ ﷺ انما یعمل ھذا من لا خلاق لہ یوم القیامۃ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بچی کے ہاتھ میں کپڑے کا بنا ہوا ایک گھوڑا دیکھا، آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس کو نہیں دیکھتی ہو؟ حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایسی چیز وہی شخص بناتا ہے جس کا قیامت کے روز کوئی حصہ نہیں ہے۔[3]

---

[1] (بخاری، کتاب النکاح، باب ھل یرجع اذا رأی منکراً)
[2] (سنن بیھقی ۷:۲۶۸، کتاب النکاح، باب المدعو یریٰ صوراً)
[3] (مسند احمد ۲:۲۸۹)

عن شعبة مولی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما ان المسور ابن مخرمة دخل علی عبد اللہ بن عباس یعوده، فرأی علیه ثوب استبرق، فقال: یا ابن عباس! ما هذا الثوب؟ قال ابن عباس: وما هو؟ قال: الاستبرق قال: انما کره ذلک لمن یتکبر فیه قال: ماهذه التصاویر فی الکانون؟ فقال: لا جرم، ألم تر کیف أحرقها بالنار؟ فلما خرج قال: انزعوا هذا الثوب عنی واقطعوا رء وس هذه التصاویر التی فی الکانون فقطعها۔

شعبہ مولی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عیادت کے لئے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ ان کے اوپر موٹا ریشمی کپڑا ہے، انہوں نے فرمایا اے ابن عباس! یہ کپڑا کیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے کہا یہ تو ریشمی کپڑا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کے لئے مکروہ ہے جو اس کو پہن کر تکبر کریں۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ انگیٹھی میں تصاویر ہیں، وہ کیسی ہیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ ان کو آگ نے کس طرح جلا دیا ہے۔ جب حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس تشریف لے گئے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اس کپڑے کو میرے اوپر سے ہٹا دو اور انگیٹھی میں جو تصاویر ہیں ان کے سروں کو کاٹ دو۔ پس ان کو کاٹ دیا گیا۔[1]

۷۔ عن قتادة أن کعباً رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: وامّا من آذی اللہ فالذین یعملون الصور فیقال لهم: أحیوا ما خلقتم۔

---

[1] (سنن بیهقی ۷:۲۷۰، مسند احمد ۱:۳۵۳)

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی، یہ وہ لوگ ہیں جو تصاویر بناتے ہیں، ان سے کہا جائے گا (قیامت کے دن) کہ جو تم نے بنالیا ہے ان کو زندہ کرو۔“[1]

٨۔عن قتادة رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: یکره من التماثیل ما فیه الروح فأمّا الشجر فلا بأس به۔

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ تماثیل مکروہ ہیں جو ذی روح ہوں، اگر درخت کی تماثیل ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔[2]

٩۔أخرج ابن سعد فی طبقاته أن سعید بن المسیب کان لا یأذن لابنته فی اللعب ببنات العاج۔

ابن سعد رحمہ اللہ تعالیٰ نے طبقات میں فرمایا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی بیٹی کو ہاتھی دانت کی گڑیا سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔[3]

فقہاء کے مذاہب

مندرجہ بالا احادیث و آثار کی وجہ سے جمہور فقہاء تصاویر بنانے اور تصاویر کو گھروں میں لگانے کی حرمت کے قائل ہیں، چاہے وہ تصاویر مجسم اور سایہ دار ہوں یا غیر مجسم ہوں اور سایہ دار نہ ہوں۔ چنانچہ حدیث نمبر ۴ جو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، مسلم شریف کی حدیث ہے۔

---

[1] (مصنف عبدالرزاق ١٠:٤٠٠، حدیث ١٩٤٩٢)
[2] (مصنف عبدالرزاق ج ١٠ ص ٤٠٠، حدیث ١٩٤٩٣)
[3] (طبقات ٥:١٣٤)

اس کے تحت علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی "شرح مسلم" میں فرماتے ہیں:

قال أصحابنا وغيرهم من العلماء تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر، لأنه متوعد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور فى الاحاديث، وسواء صنعه بما يمتهن أو بغيره فصنعته حرام بكل حال لأن فيه مضاهاة لخلق الله تعالىٰ۔۔۔ وأما اتخاذ المصور فيه صورة حيوان فان كان معلقاً على حائط أو ثوبا ملبوسا أو عمامة ونحو ذلک مما لا يعد ممتهنا فهو حرام، وان كان فى بساط يداس ومخدة ووسادة ونحوها مما يمتهن فليس بحرام، ولا فرق فى هذا كله بين ماله ظل ومالا ظل له۔ هذا تلخيص مذهبنا فى المسئلة۔ وبمعناه قال جماهير العلماء من الصحابة والتابعين ومن بعدهم وهو مذهب الثورى رحمه الله تعالىٰ ومالک رحمه الله تعالىٰ وأبى حنيفة رحمه الله تعالىٰ وغيرهم۔

یعنی ہمارے اصحاب اور دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ حیوان کی تصویر بنانا انتہائی شدید حرام ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے، اس لئے کہ اس عمل پر شدید وعید احادیث میں مذکور ہے، چاہے اس کو کسی حقیر چیز پر بنائے یا باعزت چیز پر بنائے، ہر حال میں اس کی صنعت حرام ہے، اس لئے کہ اس عمل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عمل پیدائش میں مشابہت اختیار کرنا ہے۔ جہاں تک کہ اس چیز کے رکھنے کا تعلق ہے جس پر کسی حیوان کی تصویر بنی ہوئی ہے، تو اگر وہ تصویر کسی ایسی چیز پر بنی ہوئی ہے جو کسی دیوار پر لٹکی ہوئی ہے یا وہ کپڑا ہے جو جسم پر پہنا ہوا ہے، یا عمامہ پر ہے، یا اس طرح کی کسی چیز پر ہے جس کو حقیر نہیں سمجھا جاتا ہو تو ایسی چیز رکھنا حرام ہے، اور اگر وہ تصویر ایسے بچھونے پر بنی ہوئی ہے جو روندا جاتا ہے، یا کسی چھوٹے یا بڑے ایسے تکیوں پر بنی ہوئی ہے جس کو معمولی سمجھا جاتا ہے تو ان کو رکھنا حرام نہیں۔ البتہ اس لحاظ سے حلت اور حرمت میں کوئی فرق نہیں کہ وہ تصویر سایہ دار ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں مندرجہ بالا تفصیل ہمارے مذہب کا خلاصہ ہے، جمہور صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم اور

جمہور تابعین رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے بعد کے جمہور علماء کا بھی یہی قول ہے۔ امام ثوری، امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے۔[1]

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے "عمدۃ القاری" میں اسی طرح کا قول نقل فرمایا ہے، دیکھئے جلد ۱۰، صفحہ ۳۰۹۔ اسی سے احناف اور شوافع کا مسلک بھی ظاہر ہو جاتا ہے اور حنابلہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

چنانچہ علامہ مرداوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

يحرم تصوير ما فيه روح ولا يحرم تصوير الشجر ونحوه والتمثال مما لا يشابه ما فيه روح، على الصحيح من المذهب ۔۔۔ ويحرم تعليق ما فيه صورة حيوان وستر الجدار به وتصويره على الصحيح من المذهب۔

صحیح مذہب کے مطابق ذی روح کی تصویر بنانا حرام ہے اور درخت وغیرہ کی تصویر بنانا اور ایسا مجسمہ بنانا جو کسی ذی روح کے مشابہ نہ ہو، حرام نہیں۔ اور صحیح مذہب کے مطابق ایسی چیز لٹکانا جس پر حیوان کی تصویر بنی ہوئی ہو اور اس چیز سے دیوار کا پردہ کرنا اور کسی حیوان کی تصویر بنانا حرام ہے۔[2]

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے المغنی میں ص ۷ ج ۷ کتاب الولیمہ میں بھی یہی بات ارشاد فرمائی ہے۔

چونکہ تصویر کے مسئلہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف روایات ہیں اس وجہ سے علماء مالکیہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف پیش آیا ہے۔ البتہ مذہب مالکیہ کے تمام روایات واقوال کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ مجسم تصویر جو سایہ دار ہو حرام ہے، البتہ وہ تصویر جو سایہ دار نہ ہو جیسے کاغذ یا کپڑے پر بنائی ہوئی تصویر، اس کی حرمت کے بارے میں اختلاف ہے۔

---

[1] (الارشاد الساری ج ۱۲ ص ۲۲۲)

[2] (الانصاف للمرداوی ۴۷۴:۱)

علامہ ابیّ رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

واختلف فی تصویر مالا ظل لہ فکرھہ ابن شھاب فی أیّ شیء صور من حائط او ثوب أو غیرھما وأجاز ابن القاسم تصویرہ فی الثیاب لقولہ فی الحدیث الآتی "الا رقماً فی ثوب"۔

یعنی جو تصویر سایہ دار نہ ہو اس کے بارے میں اختلاف ہے، علامہ ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں چاہے وہ دیوار پر ہو یا کپڑے پر ہو یا کسی اور چیز پر ہو، جبکہ علامہ ابن القاسم رحمۃ اللہ علیہ صرف اس تصویر کو جائز قرار دیتے ہیں جو کسی کپڑے پر بنی ہوئی ہو، اس لئے اس حدیث شریف کے الفاظ '**الا رقماً فی ثوب**' میں ایسی تصویر کی اجازت دی گئی ہے۔[1]

اسی طرح علامہ موّاق رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عرفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ تصویر کی حرمت کا حکم صرف ان تصاویر کے ساتھ ہے جو جسم دار ہوں۔[2]

علامہ دردیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

والحاصل أن تصاویر الحیوانات تحرم اجماعاً ان کانت کاملۃ لھا ظل مما یطول استمرارہ بخلاف ناقص عضو لا یعیش بہ لو کان حیوانا، وبخلاف مالا ظل لہ کنقش فی ورق أو جدار، وفیما لا یطول استمرارہ (کما لو کانت من نحو قشر بطیخ) خلاف، والصحیح حرمتہ۔

یعنی خلاصہ یہ ہے کہ اگر حیوانات کی تصاویر کامل ہوں، سایہ دار ہوں اور دیرپا ہوں تو ایسی تصاویر بالاجماع حرام ہیں۔ بخلاف اس تصویر کے جو ایسے ناقص عضو والی ہوں کہ اگر وہ حقیقی حیوان ہوتا تو اس عضو کے ناقص ہونے کی وجہ سے زندہ نہیں رہ سکتا تھا اور بخلاف ایسی تصویر کے جو سایہ دار

---

[1] (شرح مسلم للابیّ، ۵:۳۹۴)

[2] (التاج والاکلیل ۴:۴)

نہ ہو جیسے کاغذ یا دیوار پر کسی حیوان کا نقش، البتہ وہ تصویر جو دیر پا نہ ہو اس کے بارے میں اختلاف ہے، اور صحیح قول یہ ہے کہ ایسی تصویر حرام ہے۔[1]

مذہب مالکیہ کی کتابوں کی طرف مراجعت کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر فقہاء مالکیہ تصویر کی کراہت کے قائل ہیں اگرچہ وہ سایہ دار نہ ہو، الا یہ کہ وہ تصویر ذلت والی جگہ پر بنائی گئی ہو۔

چنانچہ علامہ خرشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قال في التوضيح: التمثال اذا كان لغير حيوان كالشجر جائز وان كان لحيوان فماله ظل ويقيم فهو حرام باجماع، وكذا يحرم وان لم يقم كالعجين خلافا لأصبغ وما لا ظل له ان كان غير ممتهن فهو مكروه وان كان ممتهناً فتركه أولى۔

یعنی علامہ خرشی رحمہ اللہ "توضیح" میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی غیر حیوان کا مجسمہ ہو مثلاً درخت کا تو وہ جائز ہے اور اگر حیوان کا مجسمہ ہو تو اگر وہ مجسمہ سایہ دار ہو اور پائیدار ہو تو وہ بالاجماع حرام ہے اور اگر پائیدار نہ ہو جیسے گوندا ہوا آٹا تو بھی حرام ہے خلافا لاصبغ۔ اور اگر وہ ایسا مجسمہ ہے جو سایہ دار نہیں ہے تو اس صورت میں اگر وہ کسی حقیر اور ذلیل جگہ پر نہ ہو تو مکروہ ہے اور اگر کسی ذلیل اور حقیر جگہ پر ہو تو بھی اس کا ترک اولیٰ ہے۔ علامہ دردیر رحمہ اللہ نے شرح الکبیر میں بھی اسی طرح بیان فرمایا ہے۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ جسم دار تصویر بنانا ائمہ اربعہ کے نزدیک بالاتفاق حرام ہے اگر جسم دار نہ ہو تو بھی آئمہ ثلاثہ کے نزدیک ایک قول حرام ہونے کا ہے البتہ اکثر علماء مالکیہ کے نزدیک مختار مذہب یہ ہے کہ ایسی تصویر مکروہ ہے لیکن بعض علماء مالکیہ ایسی تصویر کے جواز کے قائل ہیں۔

---

[1] (حاشیہ الصاوی علی الشرح الصغیر، ۲:۵۰۱)

[2] (دسوقی ۲:۳۳۸، الزرقانی علی مختصر خلیل ۴:۵۳)

جو حضرات فقہاء غیر مجسم تصویر کے جواز کے قائل ہیں وہ حضرت بسر بن سعید کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں:

أن بسر بن سعيد حدثه أن زيد بن خالد الجهني حدثه ومع بسر عبيد الله الخولانی، أن أبا طلحة حدثه أن رسول الله ﷺ قال: لا تدخل الملائكة بيتاً فيه صورة، قال بسر: فمرض زيد بن خالد فعدناه فاذا نحن فی بيته بستر فيه تصاوير فقلت لعبيد الله الخولانی، ألم يحدثنا فی التصاوير؟ قال أنه قال: الا رقماً فی ثوب الم تسمعه؟ قلت: لا، قال: بلیٰ قد ذكر ذلك۔

حضرت بسر بن سعید رحمہ اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زید بن خالد جہنی رحمہ اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں اور حضرت بسر کے ساتھ عبید اللہ خولانی بھی تھے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ "فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہو۔" حضرت بسر بن سعید رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن خالد الجہنی رحمہ اللہ تعالیٰ بیمار ہوگئے، ہم ان کی عیادت کے لئے گئے، ہم جس کمرے میں تھے اس میں پردہ تھا جس پر تصاویر بنی ہوئی تھیں، میں نے حضرت عبید اللہ خولانی سے کہا کہ کیا انہوں نے تصاویر کے بارے میں حدیث بیان نہیں کی تھی؟ حضرت عبید اللہ خولانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ انہوں نے یہ بھی تو فرمایا تھا "الا رقما فی ثوب" کیا تم نے یہ الفاظ نہیں سنے تھے؟ میں نے کہا نہیں، انہوں نے کہا کیوں نہیں سنا، انہوں نے یہ الفاظ بیان کئے تھے۔[1]

ترمذی شریف میں یہ حدیث ہے کہ:

عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة أنه دخل على أبی طلحة الأنصاری يعوده، قال: فوجدت عنده سهل بن حنيف، قال: فدعا أبو طلحة انساناً ينزع نمطاً تحته فقال له سهل: لم تنزعه؟

---

[1] (صحيح مسلم كتاب اللباس والزينة)

قال: لأن فيه التصاوير وقد قال فيه النبی ﷺ ما قد علمت، قال سھل: أولم یقل: الا ما کان رقمافی ثوب فقال: بلیٰ ولکنه أطیب لنفسی۔

حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ روایت فرماتے ہیں کہ وہ حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس عیادت کے لئے گئے، فرماتے ہیں کہ میں نے وہاں حضرت سہل بن حنیف کو موجود پایا، فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو بلایا تاکہ وہ ان کے نیچے سے چادر نکال لے، حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے فرمایا کہ آپ اس کو کیوں نکال رہے ہیں؟ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس میں تصاویر ہیں اور تصاویر کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ کیا حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا "الا رقما فی ثوب"؟ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ ضرور فرمایا ہے لیکن اس کا نکال دینا مجھے زیادہ پسندیدہ ہے۔[1]

غیر مجسّد تصویر کے جواز کے قائلین مندرجہ بالا احادیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ وہ تصویر جو کسی کپڑے پر بنی ہوئی ہو، وہ حرمت سے مستثنیٰ ہے لہٰذا ایسی تصویر جائز ہے۔

جمہور فقہاء ان احادیث کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "**الرقم فی الثوب**" سے مراد وہ تصویر ہے جو کسی درخت یا کسی غیر ذی روح کی تصویر ہو، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ:

دخل علیّ رسول اللہ ﷺ وقد سترت سھوۃ لی بقرام فیه تماثیل، فلمّا رآہ ھتکه وتلوّن وجھه وقال یاعائشة! أشد الناس عذابا عند اللہ یوم القیامة الذین یضاھون بخلق اللہ۔

---

[1] (ترمذی، کتاب اللباس، حدیث ۱۷۵۰)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ میرے پاس تشریف لائے، میں نے اپنے طاقچے کو ایک ایسے پردے سے ڈھانپا ہوا تھا جس پر تصاویر تھیں، جب حضور اقدس ﷺ نے وہ پردہ دیکھا تو آپ نے اس کو پھاڑ دیا اور آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور فرمایا: اے عائشہ! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس سب سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو ہو گا جو اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے عمل سے مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ تصویر جو کسی کپڑے پر بنی ہوئی ہو، جائز ہوتی تو اس پردے پر بنی ہوئی تصویر پر حضورِ اقدس ﷺ نکیر نہ فرماتے جبکہ وہ پردہ کپڑے کا تھا۔ جہاں تک اس قصہ میں روایات کا اختلاف ہے، ان تمام روایات میں ایک ہی واقعہ مذکور ہے اور اس حدیث کو متعدد واقعات پر محمول کرنا بعید ہے۔

ہمارے زمانے کے بعض متجددین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تصویر کی حرمت ابتداء اسلام میں تھی، اس لئے کہ ابتداء اسلام کا زمانہ جاہلیت اور بت پرستی کے زمانے سے قریب تھا اور لوگوں کے دلوں میں توحید کا عقیدہ راسخ نہیں ہوا تھا، لہٰذا جب توحید کا عقیدہ ان کے اندر راسخ ہو گیا تو تصویر کی حرمت اٹھالی گئی۔ متجددین کے اس دعویٰ پر قرآن وحدیث میں کوئی دلیل موجود نہیں، اگر تصویر کی حرمت کا حکم منسوخ ہو جاتا تو حضور اقدس ﷺ صراحۃً اس کا نسخ بیان فرماتے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تصاویر سے منع نہ فرماتے۔ اور آپ نے دیکھا کہ فقہاء صحابہ ایسے گھروں میں داخل ہونے سے منع فرماتے تھے جن میں تصاویر ہوتیں، یہ سب کچھ حضور اقدس ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد پیش آیا۔ یہ اس بات کی دلیل قطعی ہے کہ تصویر کی حرمت کا حکم اب بھی باقی ہے اور اس حکم کو کسی چیز نے منسوخ نہیں کیا۔ اور یہ حکم کیسے منسوخ ہو سکتا ہے جبکہ حضور اقدس

صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تصویر کی حرمت کی علّت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے عمل سے مشابہت اختیار کرنا ہے، یہ علّت ایسی ہے جو کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ ایک زمانے میں پائی جائے اور دوسرے زمانے میں نہ پائی جائے۔

علامہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ "شرح العمدة" میں فرماتے ہیں:

ولقد أبعد غاية البعد من القال: ان ذلک محمول على الكراهة وأن التشديد كان فی ذلک الزمان لقرب عهد الناس بعبادة الأوثان، وهذا الزمان حيث انتشر الاسلام وتمهدت قواعده فلا يساويه فی هذا التشديد ۔۔۔ وهذا القول عندنا باطل قطعاً لأنه قد ورد فی الأحاديث والأخبار عن أمر الآخرة بعذاب المصورين، وانهم يقال لهم: احيوا ما خلقتم، وهذه علة مخالفة لما قاله هذا القائل۔ وقد صرّح بذلک فی قوله عليه السلام: المشبهون بخلق الله، وهذه علّة عامّة مستقلة مناسبة ولا تخص زماناً دون زمان، وليس لنا أن نتصرف فی النصوص المتظاهرة المتضافرة بمعنى خياليّ۔

ترجمہ: جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے انہوں نے نہایت دور کی بات کہی ہے کہ تصویر کی حرمت کراہت پر محمول ہے اور یہ تصاویر کی حرمت کی شدّت اسی زمانے میں تھی (جب اسلام نیا نیا تھا) کیونکہ لوگوں کا وہ زمانہ بتوں کی عبادت سے قریب کا زمانہ تھا، اب اس زمانہ میں چونکہ اسلام پھیل چکا ہے اور اسلام کے قواعد آسان ہو چکے ہیں، اس لئے اس حکم میں اب وہ شدّت باقی نہیں رہی۔ ہمارے نزدیک یہ قول قطعی طور پر باطل ہے اس لئے کہ احادیث اور اخبار میں تصویر بنانے والوں کو آخرت میں عذاب دیئے جانے کی وعید وارد ہوئی ہے اور قیامت کے روز تصویر بنانے والوں سے کہا جائے گا کہ جو تم نے بنایا ہے اس کو زندہ کرو۔ لہٰذا یہ علّت ان متجددین کے قول کے بالکل مخالف ہے اور حضور اقدس صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اس قول میں اس کی صراحت موجود ہے، وہ یہ کہ "المشبهون بخلق الله" یعنی یہ تصاویر بنانے والے اللہ تعالیٰ کے بنانے سے مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ یہ علّت عام،

مستقل اور مناسب ہے، کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، لہٰذا ایک خیالی معنی کی وجہ سے ایسی نصوص میں تصرف کرنا جائز نہیں جو ظاہر ہیں اور جو ایک دوسرے کی تائید کر رہی ہیں۔[1]

علامہ احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ علامہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ کی مندرجہ بالا عبارت کے بعد فرماتے ہیں:

هذا ما قاله ابن دقيق العيد منذ أكثر من ٦٧٠ سنة، يرد على قوم تلاعبوا بهذه النصوص فى عصره أو قبل عصره، ثم يأتى هؤلاء المفتون المضلون واتباعهم المقلدون الجاهلون او الملحدون الهدّامون، يعيدونها جزعة ويلعبون بنصوص الاحاديث كما لعب اولٰئكم من قبل، ثم كان من اثر هذه الفتاوىٰ الجاهلة ان ملئت بلادنا بمظاهر الوثنية كاملةً فنصبت التماثيل وملئت بها البلاد تكريماً لذكرى من نسبت اليه وتعظيماً ـــ وكان من أثر هذه الفتاوىٰ الجاهلة ان صنعت الدولة وهى تزعم أنها دولة اسلامية فى امّة اسلامية ماسمته مدرسة الفنون الجميلة أو كلية الفنون الجميلة صنعت معهداً للفجور الكامل الواضح! ويكفى للدلالة على ذلک ان يدخله الشبّان الماجنون من الذكور والاناث اباحيين مختلطين، لا يردعهم دين ولا عفاف ولا غيرة، يصورون فيه الفواجر من الغانيات اللائى لا يستحيين ان يقفن عرايا ويجلسن عرايا ويضطجعن عرايا ـــ ثم يقولون لنا: هذا فنّ، لعنهم الله ولعن من رضى هذا منهم او سكت عليه۔[2]

ترجمہ: بعض متجددین تصویر کے جواز پر قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں نازل ہوئی ہے کہ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (سبا:۱۳) ”وہ جنّات ان کے لئے وہ چیزیں بناتے جو ان کو (منظور) ہوتا، بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیاں اور لگن (ایسے بڑے) جیسے حوض اور (بڑی بڑی)

[1] (شرح العمدۃ ۲:۱۷۲، کتاب الجنائز، حدیث ۱۱)

[2] (تعلیقات احمد شاکر علی مسند احمد ۱۲:۱۵۱، حدیث ۷۱۶۶)

دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔" متجددین اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جنات حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مورتیاں بناتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کو نعمتوں کے بیان کے سیاق میں ذکر فرمایا ہے، لہٰذا اس سے پتہ چلا کہ مورتیاں بنانا حرام نہیں۔

لیکن یہ استدلال دو وجہ سے درست نہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ لغت میں **"تمثال"** ہر اس تصویر کو کہا جاتا ہے جو کسی دوسری شیء کی صورت کے مطابق بنائی گئی ہو، جیسا کہ **"لسان العرب"** وغیرہ میں اس کی صراحت موجود ہے۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ وہ **"تماثیل"** جو جنات حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے بناتے تھے وہ غیر ذی روح کی تصاویر ہوں۔

چنانچہ علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر **"کشّاف"** میں مندرجہ بالا آیت کے تحت فرماتے ہیں:

ویجوز أن یکون غیر صور الحیوان کصور الأشجار وغیرها لانّ التمثال کل ما صور علی مثل صورة غیره من حیوان أو غیر حیوان۔

یعنی یہ ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات جو تماثیل بناتے تھے وہ غیر حیوان مثلاً درخت وغیرہ کی تماثیل ہوں، کیونکہ **"تمثال"** ہر اس تصویر کو کہا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مثل بنائی جائے، چاہے وہ حیوان کی صورت ہو یا غیر حیوان کی ہو۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ توراۃ میں بھی ذی روح کی تصویر کی حرمت وارد ہوئی ہے، حتیٰ کہ وہ محرف شدہ توراۃ جو آج ہمارے پاس ہے، اس میں بھی یہ حکم موجود ہے۔

چنانچہ "سفر الخروج" میں ہے:

لا تصنع لک تمثالاً منحوتاً ولا صورۃ ما مما فی السماء من فوق وما فی الارض من تحت ومافی الماءمن تحت الارض۔

یعنی آپ کے لئے کوئی تراشیدہ صورت نہ بنائی جائے، نہ کسی ایسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان میں ہے یا جو نیچے زمین میں ہے یا جو زمین کے نیچے پانی میں ہے۔[1]

"سفر التثنیة" میں یہ عبارت درج ہے:

لئلاتفسدوا وتعملوا الأنفسکم تمثالاً منحوتاً صورۃ مثال ماشبہ ذکر أو أنثی، شبہ بھیمة مّا ممّا علی الأرض، شبہ طیر مّا ذی جناح ممّا یطیر فی السماء شبہ دبیب مّا علی الأرض، شبہ سمک ماممافی الماءمن تحت الارض۔[2]

ترجمہ: یعنی تا کہ تم فساد نہ کرو (اس طرح کہ) تم اپنے لئے ایسی تراشیدہ تصویر بناؤ جو کسی مذکر یا مؤنث کے مشابہ ہو، یا کسی ایسے چوپائے کے مشابہ ہو جو زمین پر ہے، یا کسی ایسے پرندے کے مشابہ ہو جو پروں والا ہو جس سے وہ آسمان پر اڑتا ہو، یا زمین پر رینگنے والے کے مشابہ ہو، یا زمین کے نیچے پانی میں تیرنے والی مچھلی کے مشابہ ہو۔

یہ بات مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام توراۃ کی پیروی کرتے تھے، لہٰذا یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ ایسی تصاویر بنانے کا حکم دیں جس کو توراۃ نے حرام قرار دیا ہو۔ لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ وہ تصاویر جو جنّات حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے بنایا کرتے تھے، وہ غیر ذی روح کی تصاویر ہوتی تھیں جیسے درخت اور پھول اور کائنات کے قدرتی مناظر وغیرہ کی تصاویر۔

---

[1] (سفر الخروج، ۲۰:۴)

[2](سفر التثنیة ۱۸۶ :۴)

اس آیات سے استدلال درست نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ذی روح کی تصاویر بنانے کی اجازت دے رکھی تھی، تو بھی اصول یہ ہے کہ سابقہ شرائع کے ذریعہ ایسی چیز کے بارے میں استدلال کرنا صحیح نہیں کہ ہماری شریعت میں اس کے معارض حکم موجود ہو۔ اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ حضور اقدس صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے تصویروں کے بارے میں انتہائی تاکید سے ممانعت فرمائی ہے اور حضور اقدس صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا منع فرمانا ہمارے لئے حجت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجاً (المائدہ:۴۸)

"تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی۔"

تصویر کھنچوانے والے کی امامت

استفتاء: آپ اس مسئلے میں کیا فرماتے ہیں کہ اگر کوئی امام یا خطیب تصویر کھنچوانے جیسا حرام فعل کرتا ہو تو اس کی امامت میں نماز ادا کرنا کیسا ہے؟

الجواب: قصداً تصویر کھنچوانا گناہ ہے اور ایسے شخص کی امامت مکروہ ہے۔ہاں کوئی شخص تصویر کھینچنے کو منع کرتا اور ناجائز بتاتا ہے، پھر بھی اس کی تصویر کھینچ لی گئی تو وہ گناہ گار نہیں ہے، یا گورنمنٹ نے جن جگہوں میں تصویر لگانا ضروری قرار دیا ہے، مثلاً پاسپورٹ شناختی کارڈ وغیرہ ان چیزوں کے لئے تصویر کھچوانا گناہ نہیں ہے۔ جس صورت میں تصویر کھچوانا ناجائز ہے اس صورت میں امامت بھی ناجائز ہے[1]

[1] (وقار الفتاوی، کتاب الصلوۃ، جلد ۲ ص ۱۷۲)

بزرگانِ دین کی تصاویر بنانا اور تبرکاً لٹکانا

حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی بزرگ کی تصویر لگانے میں کسی قسم کی خیر وبرکت نہیں بلکہ معصیت ہے۔عام آدمی کی تصویر کے ساتھ برابر ہے۔حدیث میں ہے کہ جس گھر یادوکان میں عام آدمی یا کسی بزرگ کی تصویر ہو اس کے گھر میں رحمت کا فرشتہ داخل نہیں ہوتا۔لھٰذا مذکورہ بالا مقصد کے لئے کسی بزرگ کی تصویر لگانے سے اجتناب ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث:عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنھا قالت دخل علیّ رسول اللہ ﷺ وانا مشترة بقرام فیه صورة فتلون وجهه ثم تناول الستر فهتكه ثم قال ان اشد الناس عذابا یوم القیامة الذین یشبهون بخلق اللہ۔[1]

میرے مسلمان بھائی! اللہ تعالیٰ ہمیں بڑے اور سخت سے سخت تر عذاب سے پناہ میں رکھے اور ہمیں توبہ کی توفیق بخشے۔

مفتی اعظمِ پاکستان حضرت علامہ محمد وقارالدین قادری نوّر اللہ مرقدہ وجعل الجنة مثواہ فرماتے ہیں: کسی جاندار کی تصویر بنانا یا اس کا بنوانا، تصویر کی تعظیم کرنا اور کسی تصویر کو باعث خیر وبرکت سمجھنا، سب حرام ہے۔احادیث میں تصویر سازوں کے لئے سخت عذاب کی وعید آئی ہے۔

بخاری شریف کی حدیث ہے:

ان اشد الناس عذابا عند اللہ المصورون۔[2]

"یعنی بے شک اللہ کے یہاں سخت ترین عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔"

---

[1] (صحیح مسلم، ج۲ ص ۲۰۰) (بحوالہ فتاویٰ حقانیہ ج۲ ص ۴۳۰)

[2] (ج۲، کتاب اللباس، باب عذاب المصورین یوم القیامة ص ۸۸۰، قدیمی کتب خانه، کراچی)

دنیامیں شرک کی ابتداءہی تصویروں سے ہوئی۔ صحاح ستہ کی احادیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ بزرگوں سے مسلمانوں کو عقیدت ہوتی ہے اس کی بناءپر وہ بزرگوں کی تصویروں کی بھی عزت کریں گے، یہ اور زیادہ سخت گناہ ہے۔ اس لئے تمام تصویروں کے مقابلے میں بزرگوں کی تصویر بنانے کا گناہ زیادہ سخت ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ حکومت سے سخت احتجاج اور مطالبہ کریں کہ اس ناجائز کام کو بند کیا جائے۔"[1]

بعض فوٹو کھینچوانے کے شوقین حضرات کہتے ہیں کہ تصویر سے مراد وہ ہے جو مصور نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہو، اس سے فوٹو مراد نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نقش و نگار کے ذریعہ بنائی ہوئی تصاویر اور عکسی تصاویر کے درمیان جو تفریق ہے اس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ شریعت کا اصول یہ ہے کہ جو چیز اصلاً حرام اور غیر مشروع ہو، آلہ کے بدل جانے سے اس کا حکم نہیں بدلتا۔ مثلاً شراب حرام ہے، چاہے اس کو ہاتھ سے بنایا گیا ہو یا جدید مشینوں کے ذریعے تیار کیا گیا ہو۔ یا مثلاً قتل حرام ہے چاہے کوئی شخص چھری سے قتل کرے یا گولی چلا کر قتل کرے۔ یہی معاملہ تصویر کا ہے، شریعت نے تصویر بنانے اور رکھنے کو منع فرمایا ہے لہٰذا اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ تصویر مصور کے برش سے بنائی گئی ہے یا کیمرہ کے ذریعہ کھینچی گئی ہو۔ **واللہ سبحانہ اعلم۔**[2]

شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک علماء ازہر کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کہ کیمرے کی بنائی ہوئی تمام تصاویر اس لئے جائز ہیں کہ وہ ہاتھ سے نہیں بنائی جاتیں اور یہ کہ کیمرے کے ذریعہ صرف عکس کو مقید کر لیا جاتا ہے۔ دیکھئے پہلے شراب ہاتھ سے بنائی جاتی تھی، اب مشینی عمل کے ذریعہ شراب بنائی جاتی ہے تو کیا

---

[1](حوالہ وقار الفتاویٰ جلد ۲ صفحہ ۵۱۳)

[2](بحوالہ فقہی مقالات، ص ۱۳۰)

اس فرق سے اب شراب جائز ہو جائے گی؟ پہلے ہاتھوں کی تراش خراش سے مجسمے بنائے جاتے تھے، اب مشینوں کے ذریعے پلاسٹک اور دوسری اجناس کے مجسمے ڈھال لئے جاتے ہیں تو کیا اب وہ جائز ہو جائیں گے؟ فوٹو کے متعلق اسلام کا منشاء یہ ہے کہ کسی بھی جاندار کی صورت اور شبیہ کو مستقل طور پر محفوظ کر لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ ہمیشہ جانداروں کی تصویریں شرک اور فتنہ کی موجب بنتی رہی ہیں۔ اب بھی ہندوستان اور بعض دوسرے ممالک میں تصویروں اور بتوں کی پوجا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں گاندھی کی تصویر کی تعظیم اور تکریم ہوتی ہے، روس میں سٹالن کی تصویر کی تعظیم کی جاتی ہے، پاکستان کے تمام دفاتر، اسمبلیوں اور سفارت خانوں میں بڑے سائز کی قائداعظم کی تصویر تعظیما اونچی جگہ پر آویزاں کی جاتی ہے۔ اس لئے اصل فتنہ صورت کے محفوظ کرنے میں ہے، خواہ صورت کو سنگ تراشی سے محفوظ کیا جائے، قلم کاری سے یا فوٹو گرافی سے، جس طریق سے بھی تصویر کو حاصل اور محفوظ کر لیا جائے گا اس سے حاصل شدہ تصویر ناجائز اور حرام ہو گی اور بت تراشی، مصوری اور فوٹو گرافی میں جواز اور عدم جواز کا فرق کرنا صحیح نہیں ہے۔[1]

مولوی محمد یوسف لدھیانوی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''کیمرے کے اندر جو ''چغد'' بیٹھا ہوا ہے وہ مشین ہے، جو انسان کی تصویر کو محفوظ کر لیتی ہے۔ جو کام مصور کا قلم یا برش کرتا ہے وہی کام یہ مشین نہایت سہولت اور سرعت کے ساتھ کر دیتی ہے، اور اس مشین کو بھی انسان ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ منطق کم از کم میری سمجھ میں تو نہیں آتی کہ جو کام آدمی ہاتھ یا برش سے کرے تو وہ حرام ہو اور وہی کام اگر مشین سے کرنے لگے تو وہ حلال ہو جائے، اور پھر آنجناب فوٹو کے تصویر ہونے کا بھی انکار فرماتے ہیں، حالانکہ عرف عام میں بھی فوٹو کو

[1] (بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ٦ ص ٤٧٠)

تصویر ہی کہا جاتا ہے اور تصویر کا ہی ترجمہ "فوٹو" ہے۔ الغرض آپ نے ہاتھ کی بنائی ہوئی اور مشین کے ذریعہ اتاری ہوئی تصویر کے درمیان جو فرق کیا ہے، یہ صرف ذریعہ اور واسطہ کا فرق ہے۔ مآل اور نتیجہ کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں اور حدیث نبوی ﷺ: **المصورون اشدّ عذاباً یوم القیامة**۔ میں ہاتھ سے تصویر بنانے والے اگر شامل ہیں تو مشین کے ذریعہ بنانے والے بھی اس سے باہر نہیں، اور جن کو **"اشد عذاباً"** فرمایا ہو وہ گناہ کبیرہ کے مترکب ہیں یا صغیرہ کے؟ اس کا فیصلہ آپ خود ہی فرماسکتے ہیں، میرے لکھنے کی ضرورت نہیں۔"

بعض مولوی صاحبان سے یہ الفاظ بھی سنے ہیں کہ فلاں زبردست مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں۔ حالانکہ مولوی صاحبان کو یہ کہنا چاہیئے کہ اس بارے میں اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول ﷺ کا ارشاد مبارک یوں ہے۔ فقہہ شریف جو قرآن اور احادیث کے تمام مسائل کی ایک نہایت مستند مفصل فہرست اور قرآن و حدیث کا ماحصل ہے، اس فقہہ شریف میں یہ لکھا گیا ہے۔ باقی رہا زبردست عالم اور اس کا قول، تو اوّل تو وہ یوں کہے گا ہی نہیں، لیکن اگر قرآن و حدیث کے برعکس ایسی کوئی بات کہتا ہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گمراہ ہے، مشت خاک لے کر اس کے منہ پر ماریں گے۔ کیا کسی زبردست عالم کو یہ اختیار ہے کہ جس کام کو اللہ نے حرام کیا ہو وہ اسے حلال کرے۔ ایسے عالم کو گڑینگ نہیں بلکہ گڑبڑنگ کہا جائے گا۔

بعض علماء و مشائخ کہتے ہیں کہ لوگ زبردستی ہماری تصویر اُتارتے ہیں، ہم کیا کریں، ہم تو انہیں ایسا کرنے کا حکم نہیں کرتے۔ اے برادرِ عزیز! لوگ تیری زبان پر تالے تو نہیں لگاتے۔ کوئی عالم غیر شرعی کام دیکھ کر خاموش ہو جائے اور منہ پر چونے اور پتھر کا مضبوط پلستر لگادے، اور چند الفاظ بھی حق گوئی کے ادا نہ کرے۔-

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی   دہن بر چہرہ زخم بود و بہ شد

امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الساکت عن الحق شیطان اخرس۔

یعنی حق بات کہنے سے خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔[1]

تم کہو کہ قیامت کے دن دوزخ کی آگ میں تپایا ہوا لال لگام اس کے منہ میں ڈالیں گے یا نہیں؟ سوال یہ ہے کہ اگر حق بات کہنے سے تمہیں جان کا خطرہ ہے تو پھر ایسی سر تا پا گناہ و مغضوب علیہ مجلس سے اُٹھ تو سکتے ہو؟ جناب عالم صاحب، تم وہاں مضبوط ستون سے بندھے ہوئے تو نہیں بیٹھے ہو، کہ لوگ اس کا مطلب یہ نکالتے ہیں کہ تصویر سازی جائز ہے۔ کیونکہ ہم نے فلاں عالم صاحب کو اس مجلس میں خوشی کے ساتھ بیٹھے دیکھا جہاں تصویر بنائی جا رہی تھی۔ عام آدمی جب اتنے بڑے گناہ کو جائز تصور کرنے لگے تو تم ٹھنڈے دل اور ایمانداری سے فیصلہ کرکے بتاؤ کہ اس کا گناہ تمہارے سر پر ہو گا یا نہیں؟

اے برادرِ عزیز! موت قریب ہے، جونہی لپکے گی، بچنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ اللہ رب العزت کے آگے حاضر ہونا ہے۔ میرے مہربان بھائی، اس فانی دنیا کی گہما گہمی پر مست اور مگن مت ہو، کہ گویا تجھے آگے چلنا ہی نہیں۔ ذوالجلال والاکرام ربّ کے آگے پیش ہونا ہی نہیں۔ ملک الموت پہنچنے ہی والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تجھے عمرِ دراز عطا فرمائے، لیکن سو سال بھی تو آخر گزر جائیں گے۔ وقتِ مقرر آ گیا تو ڈاکٹر حضرات کی انجکشن جسم میں پیوست ہی رہیں گے، گلوکوز اور خون کی تھیلیاں دھری

---

[1](نور الانوار صفحہ ۲۱۹، باب الاجماع)

کی دھری رہ جائیں گے، سانس اس طرح اکھڑ جائے گی کہ گویا اس کا اندازہ بھی نہیں ہوسکے گا۔ اِنَّ اَجَلَ اللہِ اِذَا جَآئَ لَا یُؤَخَّرُ لَوْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی اگر مقرر وقت آیا تو ایک منٹ بھی پیچھے نہ ہو گا۔

و اذا المنیة انشبت اظفارھا   الفیت کل تمیمة لا تنفع

یہ سانپ جیسے پیچ و خم اس دنیا میں تو کارگر ہوسکتے ہیں لیکن اللہ کے سامنے کام نہ آئیں گے۔ إِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیدٌ (البروج ۱۲) اللہ کی پکڑ بڑی شدید ہے۔ اللہ آپ کو، ہمیں اور ہر مسلمان کو اپنی سخت پکڑ سے بچائے۔ ہمیں بھی تو چاہئے کہ ہم اپنے بچاؤ کے راستے نکالیں۔ اے میرے دوست و مہربان! تم نے تو اپنے بچاؤ کے راستے بند کر دیئے ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ نہیں داخل ہو گا دوزخ میں مگر مارد اور متمرد۔ یعنی وہ شوخ اور سرکش جو کچھ بھی ہو جائے، وہ باز نہ آئے۔ اپنے شیطانی ضد سے ہرگز پیچھے نہ ہٹے۔ میرے بھائی تم رؤف اور رحیم، مشفق اور مہربان نبی اکرم ﷺ جو تمہاری کوئی بھی تکلیف برداشت نہیں کرسکتے۔ بحکم: عَزِیزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ (التوبة ۱۲۸) تمہاری تکلیف محبوبِ کریم کو تکلیف دیتی ہے۔ اس رحمت للعالمین رسول ﷺ کی اتنی حدیثیں سننے کے باوجود اس کو نہیں مانتے۔ کچھ شرم کرو۔ پھر بھی باز نہیں آتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم محبوب کریم کی دامن سے ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔ پھر تم خود انصاف سے فیصلہ کرو کہ اس صورت میں تم مارد اور متمرد بن چکے ہو یا نہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (الاعراف ۱۷۹)

ہم نے خاص جہنم کے لئے پیدا کئے ہیں بہت سے جن اور انسان (ان کی نشانی یہ ہو گی کہ) ان کے دل ایسے ہوں گے جن سے کچھ نہیں سمجھیں گے اور ان کی آنکھیں ایسی ہوں گی جن سے کچھ بھی

نہیں دیکھیں گے اور ان کے کان ایسے ہوں گے جن سے وہ نہیں سنیں گے۔ وہ جانوروں کی مانند ہیں، بلکہ گمراہ ہیں اور غافل ہیں۔

جو گناہ چوری سے، شراب سے، سود سے بلکہ ناحق خون سے بھی ہزاروں گنا بھاری ہے، والدین کے قتل سے بھی بھاری، بلکہ کسی پیغمبر پاک کے قتل کے برابر، حتیٰ کہ حضور سرور کائنات ﷺ نے اس منحوس گناہ کرنے والے کو کافر فرمایا ہے، ایسے ملعون گناہ کو سن اور سمجھ کر اور دیکھ کر نہ ڈرتے ہو اور نہ کوئی خوف اور ڈر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ مندرجہ بالا آیات کے مصداق بننے سے بچائے تمہارے دل میں رب تعالیٰ فہم وادراک کوئی عقل یا نرمی، خدا ترسی، حق بینی، حق نیوشی عطا فرمائے۔ تم قیامت کے دن حضرت حبیب ہاشمی ﷺ کی امت میں سے اٹھائے جاؤ۔ تمہارا ہاتھ ان کے دامنِ رحمت سے نہ نکلے۔ تم خود بتاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت پر کھلم کھلا کمربستہ بنے بیٹھے ہو یا نہیں۔ جی ہاں! تو پھر کان کھول کر سنو: أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَنْ يُحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ذَٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ (التوبة ٦٣) کیا وہ شخص نہیں جانتا جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کی اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے۔ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، یہ بڑی ذلت ہے۔"

اے اہل سنت والجماعت کے علماء کرام و مشائخِ عظام! اگر اب بھی باز نہیں آتے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ آپ کی داڑھی مبارک جو آپ کے چہرہ اقدس پر جلوہ نمائی کر رہی ہے، وہ حضرت حبیب ﷺ کی مثال، امر اور اتباع سنت نہیں، مگر گرو گوبند سنگ کی پیروی ہے۔ تم نے محبوب کریم ﷺ سے منہ پھیر لیا ہے۔ کیا تم نے آپ ﷺ کی دامنِ رحمت سے ہاتھ نکال لیا ہے۔ کیا تمہیں یہ علم ہے کہ محشر کے میدان میں شفیع المذنبین اور رحمت للعالمین رسول ﷺ بھی تجھ سے روگردان ہوں

گے ؟ نادان! پھر تم کس کے سامنے جھولی پھیلا کر بھیک مانگو گے ؟ پھر تمہارا کون مددگار ہو گا؟ پھر تو تم ذلیل ہو کر عذاب والے مقامات کی طرف گھسیٹے جاؤ گے۔ آج یہ فلم تباہ و برباد ہو جائے آگ میں جل جائے اور پھر واپس نہ ہو۔ اس کی اور کیمرا کی اندھی چکا چوند نے تمہارے دل کو لُبھالیا ہے۔ تمہاری ان سے دل لگی ہوئی ہے۔ تمہارے دل میں ان کی لغار ہے۔ آج یہ تمہاری محبوبہ، جان نواز اور معشوقہ تند و طناز اور سراپا عشوہ، وناز ہے۔ اس کے دیکھنے کے لئے تمہاری آنکھیں ترستی ہیں۔ ان کے پلید پر تو دیکھنے کے لئے تمہارا دل حیران ہے، اور تم مرے جارہے ہو۔ حضرت حبیب ہاشمی کا یہ وسیع نہ تھمنے والا و بے شمار بیحد اور بے حساب نور جس میں سے ذرہ حاصل کر کے سورج، چاند اور ستاروں نے دنیا کو جگمگا دیا ہے، جس کے نور سے کل کائنات روشن ہو رہی ہے۔ بھٹائی بادشاہ نے شاید اسی جمال جہان آرا کا نقشہ کھینچا ہے۔ چاند کا نور آٹھویں سے لے کر چودھویں تاریخ تک پورے سات دن بہت زیادہ اور اچھا اور بے حد محبوب ہوتا ہے۔ ہر مہینے میں سات دن تو پورے سال کے بارہ مہینوں میں بارہ ستے ۸۴۔ مطلب یہ ہے کہ پورے سال میں چوراسی چاند سب سے بڑھ کر روشن ہوتے ہیں اور پورے سال میں ۳۶۴ سورج طلوع ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ پورے سال کے چوراسی چاند اور تین سو چونسٹھ سورج اگر بیک وقت طلوع ہوں تو روشنی کا اندازہ کیا ہو گا؟ مطلب یہ ہے کہ اس روشنی کی کوئی حد و انتہاء نہ ہو گی۔ مگر بھٹائی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر کہا ہے کہ محبوب کریم ﷺ کے جمال جہان آرا کی روشنی اس قدر لا متناہی، محیر العقل اور انسانی فکر کے پرواز کی حد سے زیادہ ہے، جو پورے سال کے شمس و قمر کی روشنی اس کے مقابلے میں گویا کہ اندھیرا ہے۔ جیسے روشنی ہے ہی نہیں ۔ اس بڑے نور پر تمہاری نگاہ ہی نہیں پڑ رہی۔ ناہنجار و نابکار فلم کو دیکھ کر اپنا دل لبھا بیٹھے ہو۔ مہربانی

فرما کر یہ وصیت مت کرنا کہ مرنے کے بعد فلم کو میرے ساتھ قبر کی پہلو میں ہم آغوش کر کے پھر میری میت کو دفنانا۔

میرے پیارے بھائی! اگر تمہارے اندر ذرہ برابر بھی عقل موجود ہے تو پھر یہ کہنا کہ تصویروں کی صنعت آج کل بہت ترقی کی ہے، یہ برائی بڑھ چڑھ کر کمالیت کو پہنچی ہے۔ آج اس پر اللہ کی پھٹکار اور غضب بھی پہلے سے بڑھ کر ہو رہا ہے۔ یہ برائی بہت بڑھ چکی ہے۔ اس لئے ابھی اس میں کوئی قباحت نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ یہ سوچ، یہ اندازِ فکر تم خود منصف ہو کر بتلاؤ کہ احمقانہ، سفیہانہ، جاہلانہ، وحشیانہ، ظالمانہ، بہیمانہ، غیر منصفانہ، باغیانہ، طاغیانہ، فاسقانہ، خر مغزانہ، مفسدانہ، معاندانہ، مجرمانہ، منافقانہ، مویشیانہ، آمرانہ، جابرانہ، ہٹلوانہ ہے یا نہیں۔

خدانخواستہ تمہاری یہ سوچ ہے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ تم بالکل گمراہ ہو، بالکل غلط ہو پھر تو تم زیرک، چالاک اور ذہین بالکل نہیں۔ پھر یہ کہا جائیگا کہ تم جیسا کند ذہن، تم جیسا عقل سے عاری، تم جیسا بیوقوف کہاں ملے گا؟ تو کہیں گے کہ ایک شاعر نے بھی تمہارا دیدار فرحت آثار کرنے کے بعد یہ شعر کہا ہے؟

یہ شک نہیں کہ حضرت ملا ہے خوب شخص　　　علامہ زمان و بڑا فیلسوف ہے
ذاتِ شریف ان کی ہے مجتمع الصفات　　　لیکن یہ بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہے

اے میرے پیارے اہل سنت والجماعت کے علماء کرام! میں تو ہر وقت بارگاہِ ایزدی کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ کرے تم ان علماء میں ہو جن کے لئے دریا کی مچھلیاں مغفرت کی دعا مانگتی ہیں۔ جن کی نیند بھی بفحوائے **نوم العلماء عبادة** عبادت ہو۔ جو جہاں پر قدم رکھتے ہیں، وہاں فرشتے اپنے پاک پر بچھا دیتے ہیں تا کہ تمہارے قدم ان کے پروں پر آئیں اور تمہارے قدم کی

برکتوں اور سعادتوں سے وہ بہرہ ور ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ امتی پر ہے۔" اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ، فرشتے، زمین و آسمان کی مخلوق یہاں تک کہ چیونٹی اپنے بلوں میں، مچھلی سمندروں میں ہر اس شخص پر رحمت کی دعا کرتے ہیں اور رحمت نازل فرماتا ہے جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے۔" خدا کرے تم ایسے علماء میں سے ہو جن کی شفاعت سے ستر دوزخ کے مستحقین کو بہشت کے مرصع تاج پہنائے جائیں۔ **العلماء ورثة الانبیآء۔** کا سب سے بڑھ کر اعزاز خدا کرے تمہیں نصیب ہو اور تو ایسا عالم بنے جو کہ تمہاری رگ رگ سے حضور سرورِ کائنات ﷺ کے جسدِ اطہر کے ہر موئے مبارک پر سو سو جانیں قربان ہیں کی روح پر صدائیں بلند ہو رہی ہوں۔ خدا کرے تو ایسا عالم ہو کہ تمہارے وصال کے بعد رحمن کریم رب کی طرف سے یہ محبت بھرا پیغام پہنچے کہ **یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔**

خدا کرے تو وہ عالم بنے کہ بہشت کی حوریں تمہیں دیکھ کر پھولوں کی طرح باغ و بہار بنیں اور فرطِ مسرت سے تمہارا والہانہ اور عاشقانہ استقبال کریں۔

مفتی محمد شفیع صاحب فتاویٰ دار العلوم دیوبند، **امداد المفتیین**، میں سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

سوال: تصویر کشی کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب: تصویر کشی شریعت اسلامیہ میں مطلقاً حرام ہے خواہ قلم سے ہو یا بصورت فوٹو گرافی یا بصورت طباعت و پریس بشرطیکہ کسی جاندار کی تصویر ہو۔

حدیث میں ہے:

اشد الناس عذابا یوم القیامة الذین یضاھون بخلق اللہ رواہ البخاری ومسلم عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنھا مرفوعاً۔

اور بعض روایات میں اس جگہ لفظ مصورون بھی موجود ہے۔ کمارواہ بخاری ومسلم عن عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دوسری ایک حدیث میں مروی ہے:

سمعت رسول اللہ ﷺ قال اللہ تعالیٰ من اظلم ممن ذھب یخلق کخلقی بخاری و مسلم

اور ایک اور حدیث میں ہے:

یقال لھم احیوا ما خلقتم۔

یعنی مصوروں سے عذاب کے وقت تنبیہاً کہا جائے گا کہ اپنی بنائی ہوئی صورت میں جان بھی ڈالو۔ ان روایات اور دوسری اس قسم کی احادیث سے ثابت ہوا کہ تصور کشی مطلقاً حرام ہے۔ جس میں کسی قسم کا استثناء منقول نہیں۔

ایضاً۔ سوال: فوٹو تصویر ہے یا نہیں اور فوٹو گرافی تصویر کشی میں داخل ہے یا نہیں؟

جواب: فوٹو بھی تصویر کی ایک قسم ہے جیسے پریس پر چھپی ہوئی تصویر ایک قسم ہے تصویر کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دستی اور قلمی تصویروں میں قلم دوات کے ذریعہ سے تصویر کھینچی جاتی ہے اور پریس میں سیاہی کے رول سے اور فوٹو میں عکس پر اس کے مسالہ اور آلات سے۔ آئینہ اور پانی سے عکس پر اس کو قیاس کرنا محض بے معنی اور لغو ہے کیونکہ اس عکس کو کسی مسالہ سے پائیدار اور قائم نہیں کیا جاتا اور اگر بالفرض آئینہ یا پانی میں بھی کسی مسالہ کے ذریعہ سے عکس کو قائم کر دیا جائے تو وہ

بھی تصویر کے حکم میں داخل ہو جائے گا پھر وہ عکس نہ رہے گا کیونکہ عکس اسی وقت تک عکس ہے جب تک ذی عکس کے تابع ہو اس کے وجود سے جدا نہ ہوسکے اور یہ ظاہر ہے کہ فوٹو کا عکس ذی صورت کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ اوراس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فوٹو گرافی بھی تصویر کشی کے حکم میں ہے۔

سوال: جاندار کی وہ مکمل تصویر جو محض آرائش اور زیب وزینت کے لئے رکھی جاتی ہے جائز ہے یانہیں؟

جواب: جو تصویر محض آرائش کے لئے رکھی جاتی ہے اگر وہ کسی جاندار کی تصویر ہے تو اس کا رکھنا ناجائز ہے البتہ اگر اسی کو ذلت وامتہان کی جگہ میں ڈال دیا جائے جیسے جوتوں کے فرش میں یا اور کسی ایسی جگہ تو پھر جائز ہو جاتا ہے۔

کمافی حدیث عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عند احمد فی مسندہ وعند البخاری ومسلم بعض روایات حدیث میں صراحۃً مذکور ہے:

فاما ان تقطع رؤسها او تجعل بساطاً موطا البدر العینی وبہ قال مالک رحمہ اللہ تعالیٰ وابو حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ والشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

سوال: وہ مکمل تصویر جو محض طبی معلومات یا نقشہ جات جنگ یا دوستوں سے خط ملاقات حاصل کرنے وغیرہا کے لئے ہو تو کیا حکم ہے؟

جواب: طبّی معلومات یا نقشہ جنگ وغیرہا کے لئے مکمل تصویر رکھنا جائز نہیں اول تو یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ ضرورت جس کو لوگ خواہ مخواہ ضرورت بنالیں شریعت اس کی اجازت بھی دے اور دوسرے اس جگہ تو یہ ضرورت اس طرح بھی رفع ہو سکتی ہے کہ ہر عضو کی علیحدہ علیحدہ تصویریں

رکھی جائیں بجز سر کے کہ اس کی تصویر تنہا رکھنا بھی جائز نہیں جیسا کہ آئندہ سوال میں ذکر کیا جائے گا۔

سوال: صرف چہرہ کی تصویر یا نصف اعلیٰ کی تصویر شرعاً کیا حکم رکھتی ہے؟

جواب: صرف چہرہ کی تصویر یا نصف دھڑ کی یعنی نصف اعلی کی وہ بھی مکمل تصویر کے حکم میں ہے۔

لما فی روایۃ الطحاوی عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ الصورۃ الرأس فکل شئ لیس لہ رأس فلیس بصورۃ معانی الاثار ص ۳۶۶ جلد اول

اور شرح احیاء العلوم میں حضرت عکرمہ سے مروی ہے:

کل شئ لہ رأس فھو صورۃ اتحاف السادہ صفحہ ۵۹ جلد ۷۔

اور تلقیح فھوم اھل الاثر لابن الجوزی ص ۲۰ میں ہے۔

کان لرسول اللہ ﷺ ترس فیہ تمثال رأس کبش فکرھہ رسول اللہ ﷺ فاصبح یوماً وقد اذھبہ اللہ عزوجل۔"[1]

سوال: "کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس بارے میں کہ جدید فوٹو گرافی جو تصویریں کھینچی جاتی ہیں ان میں آئینہ کی طرح عکس آتا ہے البتہ غیر مستقل اور مستقل طور پر صورت قائم ہو جانے کا فرق ہے پس ارشاد ہوا کہ بلا ضرورت شدیدہ مثلاً لازمی پاسپورٹ وغیرہ اس جدید طریقہ فوٹو گرافی سے جاندار کے پورے قد کی تصویر کھینچنا اور کھچوانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ پس اگر جائز ہے تو کیوں اور اس میں کیا مصلحت ہے؟ اور اگر ناجائز ہے تو اس طرح سے تصویر کھینچنے والے اور کھچوانے والوں کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟ آیا ایسے شخص کے پیچھے نماز میں اقتدا درست ہے اور کیا یہ

---

[1] (امداد المفتیین، ج۲ ص ۸۲۲ تا ۸۲۴)

لوگ فاسق کے حکم میں داخل ہیں؟ اور اس قسم کی تصویریں اپنے پاس رکھنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

جواب: کسی جاندار کی صورت بنانا خواہ مجسمہ کی صورت میں ہو یا نقش اور رنگ کی صورت میں اور پھر خواہ قلم سے اس کی نقاشی کی جائے یا پریس وغیرہ پر اس کو چھاپا جائے اور یا فوٹو کے ذریعے عکس کو قائم کیا جاوے یہ سب بلاشبہ تصاویر و تماثیل ہیں جن کی حرمت پر اس قدر احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں کہ اگر تواتر کا دعویٰ کیا جائے تو غالباً صحیح ہو گا۔ فوٹو کی تصویر کو یہ کہنا کہ یہ تصویر نہیں بداہت کا انکار ہے اور یہ شبہ کہ آئینہ اور پانی میں اپنا عکس دیکھنا ممنوع نہیں بالکل بے معنی اور بے اصل ہے کیونکہ فوٹو عکس نہیں بلکہ عکس کے ذریعے تصویر بنانا ہے، یعنی بجائے اس کے کہ تخمینہ اور نظر سے تصویر کھینچی جاتی، فوٹو میں عکس سے تصویر بنائی جاتی ہے مسالہ کے ذریعے عکس کو پائیدار بنانا یہی تصویر کشی ہے۔ عکس اسی وقت تک عکس ہے جب تک اس کو پائیدار نہ کیا جاوے اور جب اس کو فوٹو کے ذریعہ سے قائم کر لیا گیا تو وہ عکس کی حد سے نکل گیا اور تصویر کے مفہوم سے نکالنا نصوص شریعہ کی تحریف ہے، جو ایک مستقل دوسرا گناہ عظیم ہے۔

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ فوٹو کے ذریعے تصویر بنانا اور قلم سے تصویر کھینچنا دونوں ایک ہی حکم میں ہیں تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ جاندار کا فوٹو کھچوانا دونوں گناہ کبیرہ ہیں۔

حدیث صحیح البخاری و مسلم میں ارشاد ہے:

اشد الناس عذابا یوم القیامة الذین یصورون هذه الصور (بخاری ومسلم) بطرق متعددہ والفاظ مختلفة۔

نیز بخاری و مسلم کی طویل حدیث میں ہے:

کل مصور فی النار۔

یعنی ہر مصور جہنم میں جائے گا۔

وقال تعالیٰ: وَلَاتَعَاوَنُوا عَلَی الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔الآیۃ۔

اور فتح الباری شرح بخاری میں ہے:

قال اصحابنا وغیرھم تصویر صورۃ الحیوان حرام اشد التحریم وھو من الکبائر سواء منہ لما یمتھن او لغیرہ فحرام بکل حال لان فیہ مضاھات بخلق اللہ تعالیٰ وسواء کان فی ثوب او بساط او دینار او درھم او فلس او حائط (الی قولہ) وبہ قال جماعۃ العلماء مالک والسفیان وابو حنیفۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتھی۔وفی ردالمحتار ویکرہ الدخول الی بیت فیہ صور علی سقفہ او حیطانہ او علی الستر والازر والوسائد العظام (الی قولہ) وکذالک نفس التعلیق لتلک الصور الخ۔[1]

احادیث مذکورہ اور عبارات فقہاء سے یہ بھی ثابت ہے کہ فوٹو اور مطلقاً تصویر کھینچنا کھنچوانا اور ان کا استعمال کرنا اور ان کا اپنے پاس رکھنا گناہ کبیرہ ہے اور کرنے والا ان افعال کا فاسق ہے اور نماز اس کے پیچھے جب کہ دوسرا صالح امام مل سکتا ہو مکروہ تحریمی ہے۔

کما صرح بہ فی ردالمحتار وعامۃ کتب المذھب۔واللہ وسبحانہ وتعالیٰ۔اعلم۔[2]

مفتی اعظم پاکستان مفتی منیب الرحمن صاحب سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

سوال: ہمارے یہاں مدرسے میں سال بھر کے بعد ایک سالانہ رپورٹ چھپواتے ہیں، جس میں کچھ اساتذہ اور طلباء کی تصاویر ہوتی ہیں، ایسی تصویریں جائز ہیں یا ناجائز؟

---

[1] (شامی مکروہات الصلوۃ ومثلہ فی البدائع ۱۱۶:۱)

[2] کتبہ الاحقر محمد شفیع عفا اللہ عنہ، مدرس دار العلوم دیوبند، ۳ شعبان ۵٦ (امداد المفتیین ج ۲ ص ۸۲۵-٦)

جواب: مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کا شائع کرنا درست نہیں ہے، اس سے اجتناب بہتر ہے، کیونکہ یہ ایسی ضروریات میں سے نہیں ہے جن پر اس فقہی اصول کا اطلاق ہوتا ہے کہ: الضرورة تبیح المحظورات یعنی ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔[1]

بعض خاص قسم کی تصاویر کی رُخصت و اجازت

ابوھریرة رضی اللہ تعالیٰ عنه رفعه فی التماثیل رخص فیما کان یوطأ و کره ما کان منصوباً للاوسط بضعف۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: جو تصاویر محلِ اہانت میں پامال ہوں ان کی اجازت ہے، اور جو کھڑی ہوں وہ ناجائز ہیں۔

اور مسند احمد میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مصوّر پردے کے قصہ میں جس میں پردہ کو پھاڑ کر دو گدّے بنا دینا مذکور ہے، یہ الفاظ بھی ہیں: فکان فی البیت یجلس علیه وفیه صورة۔ یہ گدّا گھر میں رہا جس پر آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بیٹھتے تھے حالانکہ اس میں تصویر موجود تھیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کھڑی ہوئی تصویروں کو ناجائز سمجھتے تھے اور پامال میں کوئی مضائقہ نہیں جانتے تھے۔[2]

یہی مضمون فتح الباری میں بحوالہ ابن ابی شیبہ حضرت ابنِ سیرین اور سالم بن عبد اللہ اور عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی نقل کیا ہے۔

عن اللیث قال: دخلت علیٰ سالم بن عبد اللہ وھو متکی علیٰ وسادة فیھا تماثیل طیر و وحش فقلت: الیس یکرہ ھذا؟ قال: لا! انما یکرہ ما نصب نصبا۔

---

[1] (تفہیم المسائل ج۴ ص ۴۷۶)

[2] (فتح الباری بحوالہ ابن ابی شیبہ ۱۰:۳۴۶)

حضرت لیث فرماتے ہیں: میں حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر گیا تو وہ ایک تکیہ سے کمر لگائے بیٹھے تھے جس میں پرندوں اور وحشی جانوروں کی تصویریں تھیں، میں نے عرض کیا کہ کیا ان کا استعمال مکروہ وناجائز نہیں ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں! بلکہ ناجائز وہ تصویریں ہیں جو کھڑی ہیں۔[1]

طبقات ابنِ سعد جزء تابعین ص۱۳۶ میں ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بٹن میں آدمیوں کے چہرہ کی تصویریں تھیں۔

اسد الغابہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات میں ہے کہ ان کی انگوٹھی کے نگینہ پر ایک شیر غرّاں کی تصویر بنی تھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی انگوٹھی میں جو نگینہ تھا اس میں دو مکھیوں کی تصویر بنی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک انگوٹھی دستیاب ہوئی تھی جس کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ حضرت دانیال نبی علیہ السلام کی انگوٹھی ہے، اور اس کے نگینہ میں اک مرقع تھا کہ دو شیر دائیں بائیں تھے، بیچ میں ایک لڑکا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ انگوٹھی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عنایت فرمائی۔[2]

---

[1] (مسند احمد مع فتح ربانی ۱۷:۲۷۷)

[2] (منقول از معارف اعظم گڑھ)

ابو داؤد باب اللعب بالبنات میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بروایت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منقول ہے:

قالت: كنت العب بالبنات فربما دخل عليّ رسول الله ﷺ وعندی الجواری فاذا دخل خرجن واذا خرج دخلن۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی، بسا اوقات رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے اور میرے ساتھ کھیلنے والی لڑکیاں ہوتیں، جب آپ ﷺ اندر آتے تو وہ باہر چلی جاتیں، جب آپ ﷺ باہر جاتے تو وہ پھر آجاتی تھیں۔ [1]

اور اسی باب میں بروایت ابی سلمہ بن عبد الرحمن اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قالت قدم رسول الله ﷺ من غزوة تبوك او خيبر وفی سهوتها ستر فهب الريح فشكفت ناحية الستر عن بنات لعائشة لعب فقال: ما هٰذا يا عائشة! قالت: بناتی! ورأى بينهن فرساً له جناحان من رقاع، فقال: ما هٰذا الذی اری فی وسطهن؟ قالت: فرس! قال: وما هٰذ الذی عليه؟ قلت: جناحان! قال: فرس له جناحان؟ قال: اما سمعت ان لسليمان خيلا لها اجنحة! قالت: فضحك رسول الله ﷺ حتى رأيت نواجذه۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک یا خیبر سے واپس آئے تو میرے طاق پر پردہ پڑا ہوا تھا، اتفاقاً ہوا چلی، جس نے پردہ کا ایک حصہ کھول دیا جہاں سے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ گڑیاں سامنے آگئیں، آپ ﷺ نے پوچھا: عائشہ! یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی: میری گڑیاں ہیں! آپ ﷺ نے ان کے درمیان ایک گھوڑا دیکھا جس کے دو پر کاغذ کے لگے ہوئے تھے، تو فرمایا: یہ کیا ہے جو میں ان کے درمیان دیکھ رہا ہوں؟ میں نے کہا: گھوڑا ہے! پھر

---

[1] (ازبذل المجهود ۵:۲۶۴)

آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے اوپر کیا ہے؟ میں نے عرض کی کہ: دو بازو ہیں! آپ ﷺ نے تعجب سے فرمایا کہ: گھوڑے کے بازو ہوتے ہیں؟ میں نے عرض کی: کیا آپ ﷺ نے نہیں سنا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کے پر لگے تھے! فرماتی ہیں: آپ ﷺ ہنس پڑے یہاں تک کہ میں نے آپ ﷺ کے دندان مبارک دیکھے۔

اور مشکوٰۃ کتاب النکاح باب الولی فی النکاح میں صحیح مسلم کی یہ حدیث خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کی ہے:

ان النبی ﷺ تزوجها وهی بنت سبع سنین وزفّت الیه وهی بنت تسع سنین ولعبها معها ومات عنها وهی بنت ثمانی عشرة۔

نبی کریم ﷺ نے صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کیا جبکہ ان کی عمر سات سال کی تھی، اور رُخصتی ہوئی جبکہ ان کی عمر نو سال کی ہوئی، رُخصتی کے وقت ان کی گڑیاں بھی ان کے ساتھ آئیں، اور آپ ﷺ کی وفات ہوگئی جبکہ ان کی عمر کل اٹھارہ سال کی تھی۔ [1]

احادیثِ رخصت سے فقہائے امّت نے کیا سمجھا

احادیثِ حرمت میں خود جبرائیل علیہ السلام کی تلقین سے معلوم ہوا کہ جن تصاویر کا سر کاٹ دیا جائے یا کسی رنگ روغن سے لتھیڑ دیا جائے، اس کا استعمال جائز ہے۔ [2]

اسی لئے سر کٹی ہوئی تصاویر کے جواز پر پوری اُمت کا اجماع ہے اس کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے خود ہی درختوں اور غیر ذی روح چیزوں کے حکم میں کر دیا ہے۔

---

[1] (مرقاۃ جدید ۲۰۵:۶)

[2] (کمافی حدیث رواہ النسائی وحدیث رواہ احمد فی مسندہ)

دوسری رخصت وہ ہے جو احادیث میں مذکور ہے کہ تصاویر سالم ہی رہیں مگر ان کو محلِ اہانت و ذلّت میں مثلاً: پامال فرش یا گدّا وغیرہ جس کے اوپر بیٹھا جائے بنا دیا جائے، ان کے جواز پر بھی اُمّت کا اجماع ہے۔

تیسری رُخصت سے یہ ثابت ہے کہ بہت چھوٹی تصویریں جیسے بٹن یا انگوٹھی کے نگینے پر یا روپیہ پیسہ پر اس کے استعمال کی گنجائش ہے۔ اس پر بھی تقریباً تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

چوتھی رُخصت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں جن گڑیوں سے کھیلتی ہیں یہ کھلونے استعمال کرنا بھی جائز ہے، مگر اس میں حضراتِ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔

اقوال فقہاء و محدّثین

علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح بخاری میں "الا رقما فی ثوب" والی حدیث کے ذیل میں فرمایا ہے:

وقالوا اکرہ ن ما کان سترا أولم یکرہ ما یداس علیہ ویوطاء۔ بھٰذا قال سعد بن ابی وقاص وسالم وعروۃ وابن سیرین وعطاء وعکرمۃ۔ قال عکرمۃ یوطاء من الصور ھو ذلّ لھا۔ وھٰذا اوسط المذاھب وبہ قال مالک والثوری وابو حنیفۃ والشافعی۔

حضراتِ صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ نے ان تصاویر کو ناجائز قرار دیا ہے جو پردہ کی صورت میں معلّق ہوں، اور ان تصاویر کو ناجائز نہیں کیا جو پامال ہوں اور ان پر بیٹھا لیٹا جائے۔ یہی قول ہے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ کا اور حضرت عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ اور عکرمہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا۔ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو

تصاویر پاؤں میں روندی جائیں یہ ان کی ذلّت ہے، یہی مذہب ہے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور سفیانِ ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ وشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا۔[1]

مسئلہ تصویر کے بارے میں جمہور اُمّت کا اجماع اور ائمہ اربعہ کا مذہب شرحِ بخاری عمدۃ القاری میں بالفاظ ذیل منقول ہے:

وفی التوضیح قال اصحابنا وغیرھم: تصویر صورۃ الحیوان حرام اشد التحریم وھو من الکبائر وسواء صنعه لما یمتھن او لغیرہ فحرام بکل حال لان فیه مضاھات بخلق اللہ، وسواء کان فی ثوب او بساط او دینار او دراھم او فلس او اناء او حائط واما لیس فیه صورۃ حیوان کالبحر ونحوہ فلیس بحرام، وسواء کان فی ھذا کله ماله ظل وما لا ظل له، وبمعناہ قال جماعۃ العلماء مالک والسفیان وابو حنیفۃ وغیرھم انتھیٰ۔

توضیح میں ہے کہ ہمارے فقہاء وغیرہم نے فرمایا ہے کہ: جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے شدید الحرمت اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے، خواہ ایسی تصویریں ہوں جن کو عادۃً ذلیل وممتہن رکھا جاتا ہے یا ایسی نہ ہوں، پس وہ بہر حال حرام ہے، اس لئے کہ اس میں مشابہت خلق اللہ ہے، اور برابر ہے کہ وہ تصویر کپڑے میں ہو یا فرش میں، دینار، درہم اور پیسوں میں ہو یا برتنوں میں اور دیواروں میں، اور برابر ہے کہ وہ مجسّم مورت ہو جس کا سایہ پڑتا ہے یا محض نقش اور رنگ کی صورت میں ہو، یہی فرمایا ہے جماعتِ علماء امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہم نے۔

اور شیخ الاسلام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح مسلم میں لکھا ہے اور حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتح الباری میں اسی کی توثیق کی ہے۔[2]

---

[1] (عمدۃالقاری طبع قدیم ۱۳:۳ ۱۰)

[2] (فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۱۵)

قال اصحابنا وغیرھم من العلماء تصویر صورۃ الحیوان حرام شدید التحریم وھو من الکبائر لانہ متوعد علیہ بھٰذا الوعید الشدید المذکور فی الاحادیث وسواء صنعہ بما یمتھن او بغیرہ فصنعتہ حرام بکل حال لان فیہ مضاھات بخلق اللہ تعالیٰ وسواء ما کان فی ثوب او بساط او درھم او دینار او فلس او اناء او حائط او غیرھا واما تصویر صورۃ الشجر ورحال الابل وغیر ذٰلک مما لیس فیہ صورۃ الحیوان فلیس بحرام وان کان فی بساط یداس ومخدۃ ووسادۃ ونحوھا مما یمتھن فلیس بحرام، ولا فرق فی ھٰذا کلہ بین مالہ ظل وما لا ظل لہ، ھٰذا تلخیص مذھبنا فی المسئلۃ وبمعناہ قال جماھیر العلماء من الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم وھو مذھب الثوری ومالک وابی حنیفۃ وغیرھم۔[1]

ترجمہ: ہمارے حضرات اور دوسرے علماء نے فرمایا ہے کہ: جاندار کی تصویر بنانا سخت حرام ہے اور وہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اس لئے کہ اس پر ایسی وعید شدید وارد ہے جو بہت سی احادیث میں مذکور ہے، اور اس میں برابر ہے کہ ایسی چیز کی بہر حال بنانا اس کا حرام ہے، اس لئے کہ اس میں حق تعالیٰ کی صفتِ خلق کی نقل اتارنا ہے، اور یہ بھی برابر ہے کہ کپڑے میں ہو یا فرش میں، اور درہم و دینار یا پیسہ میں ہو یا برتن اور دیوار وغیرہ پر، لیکن درختوں، اُونٹ کے کجاوہ وغیرہ کی، ایسی چیزوں کی جو ذی روح نہیں تو اس کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے، یہ تو تصویر بنانے کا حکم ہے، لیکن ان چیزوں کا استعمال جن میں ذی روح کی تصویر بنی ہو تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ دیوار پر معلق یا پہنے ہوئے کپڑے یا عمامہ وغیرہ ایسی چیزوں میں ہو جو عادۃً ذلیل یا حقیر نہیں سمجھی جاتی تو ان کا استعمال حرام ہے، اور اگر پامالِ فرش یا کسی گدّے اور تکیہ وغیرہ میں ہو جو عادۃً ذلیل و پامال ہوتے ہیں تو یہ حرام نہیں ہے، اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ یہ تصویر مجسّم ہو جس کا سایہ پڑتا ہے یا مجسمہ نہ ہو بلکہ محض نقش و رنگ ہو، یہ خلاصہ ہے ہمارے مذہب کا مسئلہ تصویر میں اور یہی مذہب ہے جمہور علماء کا صحابہ و تابعین

---

[1](نووی مع مسلم ج ۲ ص ۱۹۹)

اور ان کے بعد کے علماء میں سے اور یہی مذہب ہے امام ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ وغیر ہم کا۔

کسی جاندار کی تصویر بنانا کسی طرح بھی ہو بہر حال ممنوع و ناجائز ہے۔ چاہے وہ ہاتھ سے ہو یا کیمرے سے یا جدید دور کی نئی ایجاد موبائل کے ذریعے ہو۔ خصوصاً غیر محرم خواتین کی تصاویر بنانا یا انہیں موبائل میں محفوظ رکھنا تو ایسا قبیح فعل ہے جس کی قباحت پر کوئی بھی عاقل و سمجھدار شخص تردّد نہیں کر سکتا۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ شادی بیاہ اور دیگر خوشی کے مواقع پر لوگ اپنے اہل خانہ اور رشتے دار خواتین کی تصاویر بڑے فخر و اصرار سے بنواتے ہیں اور انہیں سی ڈیز (CDs) وغیرہ اور موبائل میں محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ وبا عام لوگوں میں ہی نہیں بلکہ بڑے سنجیدہ و ظاہراً دیندار لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذالک)۔ ناجائز و ممنوع ہونے کے علاوہ اس میں یہ خطرہ بھی رہتا ہے کہ موبائل سے ایسی تصاویر کو چوری کر کے کوئی اجنبی یا دشمن ان میں ترمیم و قطع بُرید کر کے لوگوں کے سامنے لائے اور بلیک میل کرے جس سے اس خاندان کے لوگوں کی بے عزتی ہو اور انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ لہٰذا اپنی عزت کی حفاظت کرنا ضروری ہے جس کے لئے تصاویر سے پرہیز لازم ہے۔ موبائل فون کے ذریعے بھی تصویر کھینچنا اور محفوظ رکھنا حرام و ممنوع ہے۔ اس کا حکم بھی عام کیمرے کی تصویر کا حکم ہے۔

کسی نام نہاد مفتی سے اس بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ موبائل سے تصویر بنانا جائز ہے کیونکہ یہ حقیقت میں تصویر نہیں ہے بلکہ عکس ہے، جیسے کہ ہم جب آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں تو ہمارا چہرہ (یعنی عکس) نظر آتا ہے سامنے سے ہٹ جائیں تو چہرہ (عکس) نظر نہیں آتا۔ یعنی مفتی مذکور نے موبائل کو آئینہ کے قائم مقام قرار دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو عام تصویروں کا حکم ہے

وہی حکم موبائل کی تصویر کا بھی ہے۔نام نہاد مفتی کا یہ کہنا کہ موبائل کی تصویر، تصویر نہیں عکس ہے، درست نہیں اور آئینے کی مثال دے کر مفتی نے اپنی تردید بھی خود کر دی۔ عکس اور تصویر میں فرق یہی ہے کہ جو مفتی مذکور نے بتایا کہ عکس کی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہوتی وہ سائے کی مانند دوسری چیز کا پرتو ہوتا ہے جب کہ تصویر خود سے قائم اور پائیدار ہوئی ہے۔ آئینہ کا عکس اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اصل چیز قائم ہے۔ اس کے غائب ہوتے ہی عکس غائب اور معدوم ہو جاتا ہے۔ جبکہ موبائل کی تصویر محفوظ و پائیدار ہوتی ہے۔ اگر اسے خود ضائع نہ کریں تو سالوں تک محفوظ رہ سکتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ یہ تصویر نہیں بلکہ عکس ہے۔ پس موبائل فون کے ذریعہ تصویر کھینچنا اور اسے محفوظ رکھنا پھر خود دیکھتے رہنا یا دوسروں کو دکھانا شرعاً جائز نہیں ہے اور اسی طرح دوسروں کو بھیجنا بھی ممنوع ہے، خصوصاً اجنبی عورت کی تصویر جس میں فتنہ و فساد بھی زیادہ ہے۔ (نجّانا اللہ منھا)۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

انّ اشدّ النّاس عذاباً عنداللہ المصوّرون۔ (رواہ الشیخین)

یقیناً قیامت کے دن تصویر بنانے والوں کو سخت ترین عذاب دیا جائے گا۔

اسی طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جس گھر میں تصویر ہو اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے، تصاویر بنانے والوں کو قیامت کے دن آگ کا عذاب دیا جائے گا۔"

آج کل بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو خود ساختہ تقوی اپنا کر اپنی بڑائی جتاتے ہیں اور دوسروں کو حقیر اور غیر متقی تصور کرتے ہیں، بازار کی چیزوں مثلاً مرغی کا گوشت، مشروبات، اور دیگر اقسام کی مباح و جائز اشیاء جو بازار میں ملتی ہیں، اور مسلمان انہیں بیچتے ہیں، ان سے شدّت کے ساتھ پرہیز

کرتے ہیں بلکہ نفرت آمیز رویئے سے دیکھتے ہیں اور جو صاحبِ طریقت و شریعت حضرات ان مباح چیزوں کو استعمال کرتے ہیں تو ان پر یہ لوگ تنقید کرتے ہیں۔ اور اگر کسی دعوت میں چلے جائیں تو صاحبِ دعوت کو ان کے اس عمل سے شرمندگی اور پریشانی اٹھانی پڑتی ہے، حالانکہ بلاوجہ شرعی کسی مسلمان کو مشقت میں ڈالنا نہ صرف برائی ہے بلکہ حماقت بھی ہے۔ ایسے ہی خصوصاً متقی لوگوں کے پاس بھی کیمرے والا موبائل بڑی شان سے رکھا جاتا ہے جس میں تصویروں کا البم ہوتا ہے۔ حالانکہ تصویر بنانا حرام ہے تو اس حرام چیز کو اپنے پاس محفوظ رکھنا اور اسے بنانا کیا خلافِ تقویٰ نہیں؟ وہی کیمرے والا موبائل ان کے پاس ہوتا ہے جب کہ وہ نماز بھی پڑھاتے ہیں، پھر اپنے آپ کو پیر، مولانا و خلیفہ بھی کہلواتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ غلط چیز کہیں بھی ہو غلط ہی ہوتی ہے، چاہے پیر کرے، مولانا کرے، صدر کرے، وزیر اعظم کرے یا عام شخص کرے۔ جائز اور شرعاً مباح اشیاء کو استعمال کرنا خلافِ تقویٰ نہیں بلکہ حرام و مکروہ اشیاء کو ترک کرنا تقویٰ ہے۔ لہٰذا تصویر بنانا، چاہے موبائل کے ذریعے ہو، ممنوع و ناجائز ہے، اس سے بچنا تقویٰ کے زمرہ میں آئے گا۔

اسی طرح صاحب طریقت و شریعت مشائخ سے بد ظن ہونا بھی ممنوع ہے بلکہ ہلاکت کا سبب بھی ہے۔

قرآن کریم میں ہے: **"انّ بعض الظّنّ اثم"** بے شک بعض گمان بھی گناہ ہیں۔ عام تصویروں کے مقابلے میں موبائل کی تصویر زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ عام تصویریں عموماً چھپی رہتی ہیں، کبھی کبھی انہیں دیکھتے ہیں جبکہ موبائل تو ہر وقت پاس ہی ہوتا ہے۔ اور اکثر استعمال بھی ہوتا رہتا ہے تو تصاویر آسانی سے دیکھی اور بنائی جاسکتی ہیں یعنی ایک ممنوع کام جلدی اور آسانی سے ہو سکتا ہے، اس

لئے یہ فتنہ زیادہ بڑا ہے۔ بعض لوگ تصاویر کو یادگار اور تبرک کے لئے بناتے اور محفوظ رکھتے ہیں (اس گمان سے) کہ شاید کہ اس سے کچھ فائدہ ملے گا۔ مگر یہ بات بھی انتہائی غلط ہے کیونکہ اگر تصویر میں برکت ہوتی تو سید کائنات ﷺ کی، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی، تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی، تبع تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور مشائخِ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تصاویر ہوتیں اور وہ خود بنوا کر اپنے پاس رکھتے اور دوسروں کو تلقین کرتے کہ یہ تصاویر رکھا کرو کہ ان سے برکت ملتی ہے۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا، اور نہ ہے۔ اس لئے بھی کہ ایک حرام و ممنوع چیز میں تبرک کہاں سے ہو سکتا ہے؟ ہاں تبرک کا حصول آپ ﷺ اور بزرگانِ دین کے آثار، مثلاً کرتہ، قمیص، چادر، بال، ناخن، وغیرہا سے ثابت ہے اور امت کا تعامل بھی ہے۔ لہٰذا تصویر کو تبرکاً بھی بنانا یا محفوظ رکھنا خاص کر لٹکانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ بلکہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی امتوں میں بت پرستی کا ایک ذریعہ تصاویر بنیں۔ وہ اپنے گزرے ہوئے نیک لوگوں کی تصاویر بناتے اور انہیں لٹکاتے تبرک کی نیت سے پھر آہستہ آہستہ ان کی عبادت شروع کر دیتے اور ان کو خدا بنالیتے۔ گویا تصویر کشی ایسی لعنت ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی جناب میں گستاخی کا مرتکب ہو سکتا ہے اور ایمان سے محرومیت کا سبب بھی بن سکتا ہے، لہٰذا اس ناجائز کام سے اجتناب ضروری ہے۔ اور یہ تصویر بنانے والا عمل بہرحال حرام اور کفر کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔ فلہٰذا جو کام حرام و کفر کی طرف جانے کا سبب ہو وہ بھی حرام و ممنوع ہوتا ہے۔

وفی الدر المختار او کانت صغیرةً لا تتبین تفاصیل اعضائها للناظر قائما وهی علی الارض۔ ذکره الحلبی وقال الشامی وهٰذا اضبط لما فی القهستانی (ومثله فی الطحطاوی علی الدر وشرح المنیه)۔

ترجمہ: اور در مختار میں ہے کہ اس تصویر کا استعمال بھی جائز ہے جو اتنی چھوٹی ہو کہ اگر اس کو زمین پر رکھ کر آدمی کھڑا ہو کر دیکھے تو اس کے اعضاء کی تفصیل نظر نہ آئے۔

طحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور شرح منیہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

یہ مذہب حنفیہ کا نقل کیا گیا ہے، مالکیہ کا بھی یہی مذہب رسالہ "بلوغ القصد و المرام بما تنفر عنہ الملٰئکۃ الکرام" میں شیخ الاسلام ابو جعفر کتانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے، شوافع اور حنابلہ سے بھی اس کے خلاف کوئی قول نظر سے نہیں گزرا، یہ تین قسم کی تصاویر کی رخصت تقریباً سب فقہاء میں متفق علیہ ہے، البتہ چوتھی رخصت یعنی لڑکیوں کے کھیلنے کی گڑیاں، اس میں حضراتِ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ گڑیاں بھی عام تصاویر کی طرح حرام ہیں اور صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث اس زمانہ کی ہے جبکہ تصاویر کی حرمت کا حکم نہیں تھا۔ یہ قول محدث امام بیہقی، ابن جوزی، منذری، حلیمی، ابن بطّال اور محدث داوٗدی رحمہم اللہ وغیرہ کا ہے، اور ابو زید نے حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی یہ نقل کیا ہے کہ آپ لڑکیوں کے لئے گڑیاں خریدنے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث نقل کرنے کے بعد فرمایا: ثبت النھی عن اتخاذ الصور فنحمل علیٰ ان الرخصۃ لعائشۃ ذٰلک کانت قبل التحریم۔ وبہ جزم ابن الجوزی۔ [1]

---

[1](فتح الباری ج ۱۰ ص ۵۳۷)

ترجمہ: چونکہ تصاویر کے استعمال کی حرمت نصوص سے ثابت ہوچکی ہے، اس لئے حدیثِ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس پر محمول کیا جاوے گا کہ یہ حرمتِ تصاویر سے پہلے کا واقعہ تھا جو منسوخ ہوگیا۔ ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو قولِ فیصل قرار دیا ہے۔

اور مسندِ احمد کی ایک مرفوع روایت سے بھی اس کی تائید ہوئی:

عن رجل من قریش عن ابیه انه کان مع ابی هریرة فرأی ابو هریرة فرسا من رقاع فی ید جاریة فقال: الاتری هٰذا؟ قال رسول الله ﷺ: انما یعمل هٰذا من لا خلاق له۔

ترجمہ: ایک شخص حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تھے، دیکھا کہ ایک لڑکی کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا گھوڑا تھا، ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تم نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔[1]

بعض نے فرمایا ہے کہ: اس سے صرف نابالغ لڑکیوں کے معاملہ میں مساہلت کا معاملہ ہوتا ہے، نابالغ لڑکیاں جو احکام کی ابھی مکلف نہیں، ان کو گڑیوں کے کھیل سے منع نہ کیا جاوے گا، صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ واقعہ بھی ان کی بالغی کے زمانے کا ہے، بالغوں کے لئے ان کا استعمال حسبِ عموم احادیث حرام ہوگا۔

بعض علماء نے مطلقاً گڑیوں کی تصاویر کو عام حرمت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، جیسا کہ پامال تصاویر مستثنیٰ کی گئی ہیں۔

---

[1] (مسند احمد مع فتح ربانی ۲۷۸:۱۷)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کی تشریح میں لکھاہے:

المراد ھٰذا اللعب المسماۃ بالبنات التی تلعب بھا الجواری الصغار معناہ التنبیہ علیٰ صغر سنھا قال القاضی وفیہ جواز اتخاذ اللعب واباحۃ لعب الجواری بھن وقد جاء انہ علیہ الصلوۃ والسلام رأی ذٰلک لم ینکرہ، قالوا وسببہ تدریبھن لتربیۃ الاولاد واصلاح شانھن وبیوتھن۔

مراد لعب سے وہ ہیں جن کو گڑیاں کہا جاتا ہے جن سے چھوٹی لڑکیاں کھیلتی ہیں اور مطلب اس روایت کا اس پر متنبہ کرنا ہے کہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس وقت بہت صغیر سن تھیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس روایت سے جواز ثابت ہوتا ہے گڑیاں رکھنے اور چھوٹی بچیوں کے ان سے کھیلنے کا کیونکہ اس حدیث میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو دیکھا اور اس پر نکیر واعتراض نہ فرمایا۔ علماء نے فرمایا کہ سبب اس کا لڑکیوں کو خانہ داری کا انتظام اور بچوں کی پرورش سکھانا ہے۔

اور شرح مشکوۃ میں ہے:

ویحتمل ان یکون مخصوصا من احادیث النھی من اتخاذ الصور لما ذکر من المصلحۃ ویحتمل ان یکون قضیۃ عائشۃ فی اوّل الھجرۃ قبل تحریم الصورۃ۔[1]

ترجمہ: اور مرقاۃ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بھی احتمال ہے کہ گڑیوں کی حدیث عام حرمتِ تصاویر سے مستثنیٰ اور مخصوص ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ واقعہ حرمتِ تصاویر سے پہلے کا ہو، اور بعد احادیث حرمت کے وہ منسوخ ہو گیا ہو۔

[1] (مرقاۃ طبع جدید ملتان ٢٠٦:٢)

فی متفرقات البیوع من الدر المختار و فی أخر حظر المجتبی عن ابی یوسف یجوز بیع اللعبة و ان یلعب بها الصبیان انتھیٰ۔قال الشامی: و نسبته الیٰ ابی یوسف لاتدل علی ان الامام یخالفه لاحتمال ان لایکون فی المسئلة قول۔

ترجمہ: اور در مختار کی کتاب البیوع کے متفرقات میں مجتبیٰ کے حوالہ سے ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: گڑیا کی بیع جائز ہے اور بچوں کا ان سے کھیلنا بھی جائز ہے، اور علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہاں ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول کسی اختلاف کے بیان کے لئے نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں کوئی صریح قول منقول ہی نہ ہو۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکیوں کی گڑیوں کے معاملہ میں فقہاء کے چار اقوال ہیں، ایک یہ کہ وہ بھی عام تصویر کی طرح حرام ہیں، اور جواز والی روایت حرمت سے پہلے کی ہے جو بعد میں منسوخ ہو گئی۔ دوسرا قول اس کے بالمقابل قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اسی حدیث کی رو سے بچیوں کی گڑیاں حرمتِ تصویر سے مستثنیٰ کر دی گئی ہیں، وہ جائز ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نابالغ بچیوں کے لئے اجازت ہے، عام اجازت نہیں ہے، حنفیہ کا مسلک مذکورہ عبارت در مختار سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں جن گڑیوں کا ذکر ہے وہ مکمل تصویر نہیں تھیں اس لئے حرمتِ تصاویر کی روایات سے اس کا کوئی تعارض نہیں۔ لیکن پہلے اور تیسرے قول پر ابو داؤد کی روایت جو مسلم کے طریق سے منقول ہے اس میں اس واقعہ کی تاریخ غزوۂ خیبر یا غزوۂ تبوک سے واپسی بتلائی ہے جو ۷ھ یا ۹ھ میں ہیں اس وقت تک تصاویر کی حرمت کے احکام نہ ہونا یا حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نابالغ ہونا دونوں چیزیں نہایت بعید ہیں۔

---

[1](ردالمختار ۲:۲۹۷ طبع استنبول، و مثله فی مکروهات الصلوة ۱:۶۰۸)

جب اس روایت کے دوسرے طرق کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گڑیوں کے واقعہ میں غزوۂ خیبر و تبوک کا ذکر کہیں بجز اس ایک طریق ابو داؤد کے اور کسی کتاب میں نہیں، یہ واقعہ صحیحین بخاری و مسلم میں بھی آیا ہے، اور مسندِ احمد وغیرہ میں بھی، ان میں سے کسی میں سفر خیبر و تبوک کا کوئی ذکر نہیں اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابو داؤد کے اس طریق میں کسی راوی کو مغالطہ پیش آیاہے کہ دراصل سفر تبوک یا خیبر کا حوالہ اس واقعہ میں آیاہے، جو حضرت سیدنا عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ایک مصوّر پردہ (قرام یا دُرنوک) اپنے گھر میں کسی طاق یا الماری پر ڈالا تھا، ان دونوں روایتوں میں صحیحین بخاری و مسلم کی روایت میں سفر کی واپسی کا ذکر ہے اور فتح الباری میں اس سفر کو بحوالہ بیہقی سفر تبوک اور بحوالہ ابو داؤد خیبر یا تبوک لکھاہے، جس سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ابو داؤد کی روایت میں غزوۂ خیبر یا تبوک لکھاہے، جس سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ابو داؤد کی روایت میں غزوۂ خیبر یا تبوک کا تعلق صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گڑیوں کے واقعہ سے نہیں بلکہ مصور پردہ کے واقعہ سے ہے، راوی کو مغالطہ کی وجہ سے شاید یہ پیش آئی ہو کہ قرام اور دُرنوک کے واقعہ میں صحیح مسلم کے الفاظ میں یہ بھی ہے کہ اس پر ایک پروں والے گھوڑے کی تصویر تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گڑیوں میں بھی کوئی ایسی چیز تھی جس کو انہوں نے پروں والا گھوڑا اقرار دیا تھا، اس سے راوی کو یہ اشتباہ ہو جانا کچھ بعید نہیں اور خود ان دو واقعات کے الفاظ اور بیان کو دیکھئے تو وہ اس پر کھلی شہادت دیں گے کہ یہ گڑیوں کا واقعہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ابتدائی بچپن کے زمانہ کا ہے اور قرام اور دُرنوک کا واقعہ اس کے بعد کا ہے، صحیح مسلم کتاب النکاح کی حدیث میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہا کے ساتھ بلوغ سے پہلے گڑیاں ہونا اور رخصتی کے وقت ان کا ساتھ آنا مذکور ہے، یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے بالکل ابتدائی زمانہ کا ہے۔

ان سب قرائنِ قویہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گڑیوں کا واقعہ بالکل ابتداء ہجرت کے زمانے میں پیش آیا جبکہ تصاویر کی حرمت کے احکام نہ تھے، نیز حضرت صدیقہ صغیر السن لڑکی تھیں، اس لئے جن حضرات نے اس کو احادیثِ حرمت سے مستثنیٰ قرار دیا، یا جنہوں نے اس کو صرف نابالغ لڑکیوں کی خصوصیت قرار دیا، ان کے کلام کی گنجائش بلا شبہ موجود ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ائمہ فقہاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ان احادیثِ رخصت سے یہ نتائج نکالے ہیں:

تصویر کشی اور تصویر سازی کسی جاندار کی کسی حال میں جائز نہیں، صرف غیر ذی روح بے جان چیزوں کی تصاویر بنا سکتے ہیں۔

اور تصاویر کے استعمال میں مندرجہ ذیل قسم کی تصاویر کی اجازت دی ہے:

ا۔ سر کٹی ہوئی تصویر جو درخت کے مشابہ ہو جائے۔

۲۔ پامال تصاویر جو جوتے کے تلے یا فرش وغیرہ میں ہوں۔

۳۔ بہت چھوٹی تصویریں جیسے انگوٹھی اور بٹن کی تصویریں وہ بھی عام نقش و نگار کے حکم میں ہیں۔

۴۔ بچیوں کے کھیلنے کی گڑیاں اس میں فقہاء کا اختلاف ہے بعض حرام فرماتے ہیں بعض جائز اور بعض خاص شرائط کے ساتھ اجازت دیتے ہیں۔

لیکن اصل مسئلہ تصویر کی حرمت کا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے، یہ کسی نے نہیں کہا کہ ان سے احادیثِ حرمت کو منسوخ قرار دے کر اصل تصویر ہی کو جائز کر ڈالا ہو، یا جائز تصویروں کی کوئی ایسی علّت ہو جس کی وسعت میں عام تصویریں بھی حلال ہو جائیں۔

مگر آج کل کے جدید مصنفین نے ان احادیثِ رخصت کو عام تصاویر کی حلت کا حیلہ بنالیا ہے، اور ایک نیا حیلہ تو ایسا ایجاد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ تصاویر کی ساری ہی بحث ختم ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ آج کل جس طرح تمام مصنوعات جو پہلے زمانے میں دستی بنائی جاتی تھیں، اب مشینوں اور آلات کے ذریعہ بنائی جاتی ہیں، اسی طرح تصاویر سازی کے فن کو اس مشینی دور نے ترقی دے کر فوٹو گرافی اور عکّاسی کی صورت دے دی ہے، بعض علماء مصر نے پھر بعض علمائِ ہند نے بھی اس کے متعلق یہ فرمادیا کہ کیمرا کے ذریعہ جو تصویر لی جاتی ہے، وہ تصویر کے حکم میں داخل نہیں، وہ تو ایک ظل اور سایہ جیسے آئینہ اور پانی میں انسان کی شکل دیکھی جائے، اس کے حرام و ناجائز ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

اور یہ فتنہ ایسا عام ہوا کہ بہت سے علماء و صلحاء بھی کاغذی پیراہنوں میں دنیا بھر میں چلتے پھرتے نظر آنے لگے، اور اربابِ عمائم و قبا کے فوٹو دنیا میں عام ہوگئے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض علماء کو اس فوٹو کے اسٹیج پر زبردستی ان کے علم و قصد کے خلاف لایا جاتا ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے حضرات بالقصد اس میں شریک ہوتے ہیں۔

(سیف رحمانی شرح خلاصہ کیدانی)

الحاصل

تصویر بنوانا کسی صورت جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔ مبارک صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تصویر بنانے کو سخت ناپسند کیا کرتے تھے اور کسی صورت اس کی اجازت نہ دیا کرتے تھے، بلکہ تصویر بنانے والے کو سزا کے طور پر مارا کرتے اور کیمرہ بھی توڑ دیا کرتے تھے۔ مبارک صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جو تصاویر بھی موجود ہیں وہ کسی نے بغیر اجازت چھپ کر بنائیں، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت نصیب فرمائے، آمین۔

تصویر بنانے والا چونکہ حرام میں ملوث ہوتا ہے، حرام میں مبتلاء ہونے کے بارے میں جو روایات مذکور ہوئیں اور جو وعیدات آئیں ان کی روشنی میں ایسا شخص جو تصویر بنائے یا بنوائے یا کسی بھی صورت حرام میں مبتلا ہو ایسا شخص پیر بننے کا اہل بھی نہیں، اور ایسے پیر سے ایسے بھاگنا چاہیئے جیسے انسان شیر سے بھاگتا ہے۔ بعض بدبخت یہ کہتے ہیں کہ یہ تصویر نہیں اور غلط تاویلیں پیش کرتے ہیں ان کا یہ عمل بھی غلط ہے، تصویر کی کوئی بھی صورت ہو وہ حرام ہے خواہ ہاتھ سے بنائی گئی ہو، موبائل فون یا کیمرہ سے بنائی گئی ہو۔

مکتوب نمبر ۲۸

[بلندئ حال کے بیان میں مگر ایسی عبارت سے جس سے تنزل اور دوری کا وہم ہوتا ہے۔۔۔ یہ مکتوب بھی خواجہ عمک کو لکھا:

رحمت نامہ گرامی جو از روئے کرم اس مخلص کے نام لکھا تھا، بندہ اس کے ورود مسعود سے مسرور ہوا، اور اس کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔۔۔ کیا ہی عمدہ نعمت ہے کہ آزاد لوگ گرفتاروں کو یاد کریں۔ اور کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی دولت ہے کہ پہنچے ہوئے لوگ ہجر میں پڑے ہوئے لوگوں کی غمخواری کریں۔

جدائی اور ہجر میں پڑے ہوئے نے جب اپنے آپ کو وصال کے قابل نہ پایا تو گم نامی کی حالت میں ہجر کے گوشے میں جا بیٹھا اور قرب سے بھاگ کر بُعد اور دُوری کے ساتھ آرام جا پکڑا، اور اتصال کے بجائے اِنفصال کے ساتھ قرار پکڑ لیا۔ اور جب آزادی کے اختیار کرنے میں گرفتاری دیکھی تو گرفتاری کے احسان کے نیچے آ گیا۔

چوں طمع خواہد ز من سلطانِ دیں　　　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

ترجمہ: دین کا سلطان جب مجھ سے طمع کا طالب ہے تو اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک پڑے۔

غیر مربوط عبارتوں اور پراگندہ اشاروں کے ساتھ اس سے زیادہ کیا دردِ سری کرے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی متابعت پر ثابت اور قائم رکھے۔]

تشریح

وصل اور ہجر (قُرب وبُعد) دو مختلف اور متضاد حالتیں ہیں۔ ایسے ہی قید وآزادی کا حال ہے۔ عقل تو یہ کہتی ہے کہ آزادی بہتر ہے قید سے۔ لیکن تصوف میں معاملہ بر عکس ہے۔

مکتبِ عشق کا دستور نرالہ دیکھا　　　　اُس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے تصوف وسلوک میں آزادی اس شخص کی جانی جاتی ہے جو اپنے نفس وشیطان کے تابع ہو۔ اور قید کا لفظ اُس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے پیارے رسول حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا پیروکار ہو اور اُس پر شریعتِ غرأ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے احکامات کی قید لگی ہو۔ پس اپنے آپ کو نفس وشیطان کے چنگل سے آزاد کرکے حدودِ شریعت کی قید اختیار کرنی چاہیئے۔ کیونکہ جو شخص حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے احکامات سے آزادی اپنائے گا اور نفس وشیطان کی فریب کاریوں میں قید ہوگا۔ وہ اپنے لئے دُنیا وآخرت میں تباہی وبربادی کا سامان تیار کرے گا۔ پس شیطان سے ہجر اختیار کرنا چاہیئے تاکہ اپنے خالقِ حقیقی سے وصل نصیب ہوسکے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

یہ مکتوب حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے حضرت خواجہ عمک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ایک مکتوب کے جواب میں صادر فرمایا۔ ان کے گرامی نامہ پر اظہارِ تشکر فرماتے ہوئے ازراہِ عجز واخلاص تحریر فرمایا کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ آزاد اور واصل لوگ گرفتار اور مہجور لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔ بظاہر اس عبارت سے پڑھنے والے کو یہ وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اپنے مرتبے کی پستی اور تنزل کا ذکر فرمارہے ہیں لیکن در حقیقت آپ نے مرتبۂ نزول کی بلندی اور اپنے

درجات کی ترقی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ بزرگانِ دین کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ اپنے ہر کمال اور بلندی کو تہمت زدہ اور نامکمل قرار دیتے رہتے ہیں اور یہی ان کی بلندی درجات کا راز ہوتا ہے۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے جہاں اپنے مقامِ نزول کی خبر دی ہے ساتھ ہی حضرت خواجہ عمک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مرتبۂ عروج کی طرف بھی اشارہ فرمادیا ہے۔

آزاد اور گرفتار کی اصطلاح

اہلِ طریقت کے نزدیک "آزاد" کی اصطلاح اُن بزرگوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو سیر عروجی میں مشغول ہوں اور ابھی نزول کے مرتبے تک نہ پہنچے ہوں اور گرفتار و مہجور کے الفاظ ان حضرات کے لئے استعمال ہوتے ہیں جو مرجوعین یعنی سیر نزولی میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور حضرات انبیاء کرام کی نیابت کے طور پر مسندِ دعوت وارشاد پر فائز ہوتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ عروج "مراد خویش" یعنی اپنی مُراد کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور اصحابِ نزول مُرادِ حق کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور یہ شعر ان دونوں کے مناسبِ حال ہے۔

وَ شُغْلِیْ بِالْحَبِیْبِ بِکُلِّ حَالٍ　　　اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ شُغْلِیْ بِحَالِیْ

یعنی محبوب کے ساتھ مشغول ہونا مجھے ہر حال میں اپنے حال کی مشغولیت سے زیادہ محبوب ہے۔

گویا عبارت کا مفہوم یوں ہو گا کہ آزادی اختیار کرنے والے دراصل اپنی مُراد (عروج) میں گرفتار ہیں۔ جبکہ مراد حق (نزول) میں گرفتار لوگ اپنی مُراد (عروج) سے آزاد ہیں۔

مرتبۂ نزول کی بلندی

مقامِ عروج کا شرف اپنی جگہ ہے لیکن فضیلت مقامِ نزول میں ہے کیونکہ عروج مراتب ولایت سے ہے اور نزول مراتبِ نبوت سے ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ولایت کا انتہائی مقام نبوت کا ابتدائی مقام ہے۔

عبارت بالا میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اپنے متعلق مرتبۂ نزول پر فائز ہونے کی نشاندہی فرما رہے ہیں جو کہ مقامِ نیابتِ انبیاء اور مرتبۂ دعوت وارشاد ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب اس مہجور نے اپنے آپ کو وصل کے لائق نہ پایا تو مجبوراً گرفتاری اور جدائی کو قبول کر لیا یعنی مجھے مسندِ دعوت وارشاد پر بٹھا دیا گیا ہے۔ اس مرتبے میں عارف اور سالک حق سے خلق کی طرف رجوع کرتا ہے جبکہ عروج کے مرتبے میں سالک خلق سے حق کی طرف سیر کرتا ہے۔

بینہ

واضح رہے کہ فضیلت کے اعتبار سے مرتبۂ نزول بہت بلند ہے، لیکن لذت کے اعتبار سے مرتبۂ عروج محبوب سمجھا جاتا ہے، کیونکہ نزول میں مخلوق کے ساتھ (بسلسلۂ رُشد وہدایت) مشغولیت ہوتی ہے اور عروج میں مخلوق سے دوری اور خالق کے ساتھ مشغولیت ہوتی ہے۔ واللہ ورسولہٗ اعلم

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۷۶، ۶۷۷)

مکتوب نمبر ۲۹

[ادائے فرض کی ترغیب، سُنن وآداب کی رعایت، فرائض کے سامنے ادائے نوافل کی کم پرواہ کرنے اور رات کے نصفِ اخیر میں نماز عشاء ادا کرنے سے روکنے اور مستعمل پانی کے پینے کو جائز رکھنے سے منع کرنے اور مُریدوں کو سجدہ کرنے سے منع کرنے کے بیان میں۔۔۔۔۔ شیخ نظام تھانیسری کی طرف لکھا:

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں اور تمہیں طرف داری کرنے اور بے راہ روی اختیار کرنے سے بچائے اور ہمیں اور تمہیں افسوس اور غم کھانے سے نجات دے، بحرمۃ سید البشر جو نظر کی کجی سے پاک تھے۔علیہ وعلیٰ آلہٖ من الصلوٰۃ اتمہا ومن التسلیمات اکملہا۔

حق تعالیٰ کی طرف قریب کرنے والے اعمال یا فرائض ہیں یا نوافل۔ نوافل کی فرائض کے سامنے کچھ حیثیت نہیں۔ کسی وقت میں فرائض میں سے ایک فرض کو ادا کرنا ہزار نوافل ادا کرنے سے بہتر ہے۔ اگرچہ نفل عبادت نیت خالص سے ادا کی جائے۔ جو بھی نفل عبادت ہو جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ اور ذکر وفکر وغیرہ۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ ادائے فرض کے دوران ایک سُنت کی رعایت اور مستحبات میں سے ایک مستحب کی نگہداشت کا بھی یہی حکم ہے۔

منقول ہے کہ ایک روز امیر المؤمنین حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نمازِ فجر باجماعت ادا فرمائی۔ نماز سے فارغ ہو کر قوم پر نگاہ ڈالی۔ اپنے اصحاب میں سے ایک صاحب کو نہ پایا۔ دریافت فرمایا کہ فلاں شخص جماعت میں حاضر نہیں۔ حاضرین نے عرض کیا کہ وہ شخص رات کا اکثر حصہ بیدار رہتا ہے۔ شاید اس وقت سویا ہوا ہو۔ آپ نے فرمایا اگر وہ ساری رات سویا رہتا اور فجر کی نماز جماعت سے ادا کرتا تو بہتر تھا۔

لہٰذا ایک مستحب کی رعایت اور مکروہ سے بچنا، (اگرچہ تنزیہی ہی ہو، اور مکروہ تحریمی تو بطریق اولیٰ) کئی مرتبہ ذکر فکر اور مراقبہ و توجہ سے بہتر ہے۔ ہاں ہاں اگر یہ اُمور اس رعایت اور اس اجتناب کے ساتھ جمع کرے تو عظیم کامیابی حاصل کر لی۔ اس کے بغیر خار دار درخت پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہے۔

مثلاً ایک دو پیسے زکوٰۃ کے ادا کرنا بطریق نفل پہاڑوں جتنا سونا صدقہ کرنے سے کئی مرتبے بہتر ہے۔ تو نماز عشاء رات کے نصف اَخیر میں ادا کرنا اور اسے نوافل تہجد کی ادائیگی کی تاکید کا وسیلہ بنانا بہت برا ہے۔ اس لئے حنفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک نماز عشاء نصفِ اَخیر میں ادا کرنا مکروہ ہے۔ (کذا فی بحر الرائق)

ظاہراً اس سے ان کی مراد کراہتِ تحریمہ ہے۔ اس لئے کہ فقہائے حنفیہ نے نماز عشاء کو نصف رات تک ادا کرنے کو مباح رکھا ہے، اور اس سے آگے مکروہ کہا ہے۔ لہٰذا جو مکروہ مباح کے مقابلے میں آتا ہے وہ مکروہِ تحریمی ہے۔ اور فقہاءِ شافعیہ کے نزدیک تو نصفِ اَخیر میں نماز عشاء ادا کرنا جائز ہی نہیں۔ تو ادائے تہجد اور ذوق وجمعیت کے حصول کے لئے اس وقت میں اس اَمر کا مرتکب ہونا بہت پسندیدہ ہے اس غرض کے لئے وتر کی ادائیگی میں تاخیر کرنا کافی ہے۔ اور یہ تاخیر مستحب ہے۔ وتر اچھے وقت میں ادا بھی ہو جائیں گے اور سحری کے وقت بیدار ہونے اور تہجد ادا کرنے کی غرض بھی حاصل ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ کام چھوڑ دینا چاہیئے اور گزشتہ نمازوں کی قضا کرنی چاہیئے۔

امام اعظم کوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وضو کے مستحبات میں سے ایک مستحب چھوٹ جانے سے چالیس سال کی نمازیں قضا کیں۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اس مکتوب شریف میں سارے فقہی مسائل بیان فرمائے ہیں کہ سب سے پہلے فرائض وواجبات اور پھر سُنتوں پر عمل کرنا چاہیئے اس طرح نہ ہو کہ کوئی سالک اپنی ظاہری شکل وشباہت تو سنت نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے مطابق بنالے مگر نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے فرائض اور واجبات کے بالکل نزدیک ہی نہ جائے۔ پس ہر مسلمان کو سب سے پہلے فرائض، پھر واجبات، پھر سنتِ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم، پھر مستحب اور پھر نوافل کو ادا کرنا چاہیئے، مگر مستحبات ونوافل کو بھی شریعتِ غرأ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے مطابق ادا کرنا چاہیئے نہ کہ اپنی مرضی سے۔ اور نماز تراویح کے علاوہ نوافل کو باجماعت ادا نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنا کہیں بھی اسلاف سے ثابت نہیں ہے۔

عشاء کی نماز کو تہائی رات سے پہلے تک مؤخر کرنا مستحب ہے اور شرح نقایہ میں ہے کہ تہائی رات تک مؤخر کرنا مستحب ہے۔

کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

لو لا ان اشقّ علیٰ اُمتی لاخرت العشاء الیٰ ثلث اللیل۔

ترجمہ: اگر میری اُمت پر شاق نہ ہوتا تو میں عشاء (نماز) کو تہائی رات تک مؤخر کرتا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد قصہ گوئی شرعًا ممنوع ہے۔ یعنی نمازِ عشاء کے بعد بات چیت کرنا اچھا نہیں ہے۔

کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا سَمَرَ بَعْدَ الْعِشَاءِ۔

ترجمہ: عشاء (کی نماز) کے بعد قصہ گوئی نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ:

ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کان یکرہ النوم قبلھا والحدیث بعدھا۔

ترجمہ: حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم عشاء سے پہلے سونے اور عشاء کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

حاصل یہ کہ عشاء کے بعد باتیں کرنے اور قصہ گوئی سے منع کیا گیا ہے اور عشاء کی نماز کو تہائی رات تک مؤخر کرنے میں اس کو منقطع کر دینا ہے، اس لئے کہ جب تاخیر سے نماز پڑھے گا تو اس کے بعد فوراً سونے کی فکر ہو گی نہ کہ قصہ گوئی کی۔ اس لئے نمازِ عشاء کو تہائی رات تک مؤخر کرنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے۔ اور صاحبِ ھدایہ نے فرمایا ہے کہ عشاء کی نماز کو آدھی رات تک مؤخر کرنا مباح ہے۔

جس شخص کو تہجد کی نماز کی عادت ہو اور اس کو جاگنے پر بھروسہ بھی ہو تو اس کے حق میں مستحب یہ ہے کہ وتر کو تہجد کی نماز کے بعد آخر رات میں پڑھے اور اگر اس کو جاگنے پر بھروسہ نہ ہو یا رات کو تہجد کی نماز کی عادت نہ ہو تو وہ شخص سونے سے پہلے وتر پڑھ لے۔

کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

من خاف ان لا یقوم آخر اللیل فلیوتر اولہ ومن طمع ان یقوم آخر اللیل فلیوتر آخر اللیل۔

ترجمہ: جس شخص کو خوف ہو کہ نہیں اُٹھ سکے گا تو وہ اول رات میں ہی وتر پڑھ لے اور جو طمع رکھتا ہو کہ آخر رات میں قیام کرے گا تو رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھے۔

چونکہ طریقت و سلوک وہی معتبر ہے جو شریعتِ حقہ کے مطابق ہو اس لئے جو سالک شریعت کے ان احکام و تعلیمات اور سُنن نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے مطابق عمل کرتا ہے اُسے روز بروز ترقی نصیب ہوتی ہے اور جو شریعت کے خلاف عمل کرتا ہے وہ ترقی کی منازل سے محروم رہتا ہے۔

ہم لوگ نوافل و مستحبات پر عمل کرنا تو بہت ضروری خیال کرتے ہیں لیکن فرائض و واجبات کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ دوسروں کے ترکِ نوافل پر اُنگلی اُٹھاتے ہیں لیکن اپنے معاملہ میں ترک فرائض کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ فرائض و واجبات کے سامنے نوافل کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ نوافل ادا کرنا تو اُس شخص کو زیب دیتا ہے جو پہلے فرائض اور پھر واجبات و سنت کی ادائیگی سے سبکدوش ہو چکا ہو اور یہ بات تو قابلِ تسلیم ہے کہ اکثر عوام کے ذمہ ساری زندگی کی فرض نمازوں کی قضا لازم ہوتی ہے اور وہ ان کی قضا لانے کی بجائے نوافل کا اہتمام کرتا رہتا ہے، چاہیئے کہ پہلے فرائض و واجبات کی ادائیگی سے فارغ ہو اس کے بعد اگر نوافل میں مشغول ہو تو نُوْرٌ عَلیٰ نُوْرٌ۔

آج کل کے فیشن ایبل باتھ رومز میں پختہ فرش پر پیشاب کرتے وقت غور فرمائیں کہ انتہائی باریک قسم کی چھینٹیں اُڑ کر ہمارے جسم اور کپڑوں پر پڑتی رہتی ہیں، جس کی وجہ سے جسم اور کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ نجاست کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔ ہاں فیشن ضرور ہو، تاکہ معاشرے میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ جبکہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم جب پیشاب کی حاجت محسوس فرماتے تو دور تشریف لے جاتے اور نرم مٹی یا ریت والی جگہ کو منتخب فرماتے تاکہ چھینٹیں نہ اُٹھیں۔ یوں ہی حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک مستحب کے رہ جانے

پر چالیس سال کی نمازوں کی قضالوٹائی۔ مانا کہ اتنا تقویٰ ہم سے نہیں ہو سکتا تاہم فرض اور واجب کی حیثیت والے کاموں میں احتیاط تو کی جاسکتی ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

زیرِ نظر مکتوب میں حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ العزیز نے صراحت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب ادائے فرائض ونوافل پر موقوف ہے۔ واضح ہو کہ قُربِ الٰہی کے دو درجے ہیں، پہلا درجہ قُربِ فرائض کا ہے اور دوسرا درجہ قُربِ نوافل کا ہے۔ فرائض اور نوافل کا فرق یہ ہے کہ فرائض رأس المال اور بنیاد ہوتے ہیں جبکہ نوافل منافع اور فروعات ہیں جب تک قُربِ فرائض حاصل نہ ہو قُربِ نوافل حاصل نہیں ہو سکتا۔ قُربِ نوافل باطنی ترقی کا زینہ ہے لیکن فرائض کی ادائیگی کے بغیر نوافل کوئی اہمیت نہیں رکھتے کیونکہ نوافل کا نفع اور ثواب فرائض کے تابع ہے۔ دراصل ولایت قربِ الٰہی کا نام ہے، اولیائے کرام کو تمام مراتب و مدارج قُرب کی بنیاد پر ہی عطا ہوتے ہیں۔

قُربِ فرائض اور قُربِ نوافل کی اصل درج ذیل حدیث قُدسی ہے:

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ۔[1]

ترجمہ: رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا بندہ میرا قُرب حاصل کرنے کے لئے جو کچھ کرتا ہے، میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ عبادت ہے جو میں نے اس پر فرض قرار دی ہے اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعے میرا قُرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں۔

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۹۶۳، مشکوٰۃ المصابیح، ص ۱۹۷)

قُربِ فرائض اور قُربِ نوافل کا فرق

مذکورہ بالا حدیثِ قدسی سے قُرب فرائض اور قُربِ نوافل کے مراتب ثابت ہیں، قُربِ فرائض میں بندہ حق تعالیٰ کے اعضاء وجوارح (آلہ) بنتا ہے اور فاعلِ خود بندہ ہوتا ہے یعنی قُربِ فرائض یہ ہے کہ بندہ اپنی ہستئ موہوم کو مٹا کر فنا فی اللہ ہو جائے اور اس کا اپنا ارادہ باقی نہ رہے۔ صوفیاء اس کو فنائے ذات سے بھی تعبیر کرتے ہیں، كَمَا قَالَ اللهُ تعالىٰ: إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبة ۱۱۱) قربِ نوافل یہ ہے کہ بندہ قُرب کے انتہائی مراتب میں گم ہو جائے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ بمنزلہ آلہ کے ہو اور فاعل بندہ ہو، كَمَا قَالَ اللهُ تَعَالىٰ: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللهَ رَمَى (الأنفال ۱۷)

فرض نماز کی اہمیت

تمام فرائض میں نماز افضل ترین اور اہم ترین فرض ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ: وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ (البقرة ۴۳) سے اس کی فرضیت واہمیت واضح ہے قرآن پاک میں ایمان کے بعد سب سے زیادہ تاکید نماز کے بارے میں فرمائی گئی ہے۔ احادیث مبارکہ میں نماز کو اَحَبُّ الْاَعْمَالِ۔[1] اور عِمَادُ الدِّيْن۔[2] قرار دیا گیا ہے۔ نماز کی فرضیت کا حقیقی سبب تو حکمِ الٰہی ہے اور اس کی ادائیگی کا ظاہری سبب نماز کا وقت ہے، یعنی ہر مسلمان مرد اور عورت پر نماز ادا کرنا اس وقت فرض ہو گا جب اس نماز کا وقت آئے گا۔ كَمَا قَالَ اللهُ تَعَالىٰ: إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا (النساء ۱۰۳) اگر کسی نے وقت داخل ہونے سے پہلے یا وقت گزرنے کے بعد نماز پڑھی تو ہر گز ادا نہ ہو گی۔

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۷۶)

[2] (مسندِ فردوس، ج ۲، ص ۴۰۴)

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اسی امرِ شرعی کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ کسی ایک فرض نماز کا اس کے اپنے وقت میں ادا کرنا ہزار سال تک نوافل ادا کرتے رہنے سے بہتر ہے، اگرچہ وہ نوافل اخلاصِ نیت کے ساتھ ادا کئے جائیں اور خواہ وہ عباداتِ نفلیہ، بدنیہ اور مالیہ میں سے کوئی بھی نفلی عبادت ہو بلکہ اس پر مستزاد، آپ فرماتے ہیں کہ فرائض ادا کرتے وقت سنتوں میں سے کسی سُنت اور مستحبات میں سے کسی مستحب کی رعایت بھی ہزار سالہ نوافل سے بہتر ہے یعنی سُنن اور مستحبات کا درجہ بھی نفلوں سے بہت زیادہ بلند وبالا ہے۔

جماعت کی فضیلت

اس حدیث سے جماعت کی فضیلت معلوم ہوئی اس سے زیادہ فضیلت کا بیان حدیثِ مسلم میں ہے، سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ، وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ۔[1]

یعنی جس شخص نے عشاء کی نماز باجماعت پڑھی تو گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جس نے صبح کی نماز باجماعت پڑھی تو گویا اس نے تمام رات قیام کیا یعنی گویا اس نے نوافل ادا کرنے میں رات گزاری۔

دوسری روایت میں ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةِ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِينَ دَرَجَةً۔[2]

---

[1] (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۲۳۲)

[2] (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۲۳۱)

(یعنی) جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ افضل ہے۔

نماز باجماعت کی فضیلت واہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ میدانِ جہاد اور حالتِ خوف میں بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم قرآن وحدیث میں صراحتًا موجود ہے۔[1] تو حالتِ امن میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا کس قدر اہم وضروری ہوگا اسی وجہ سے احناف اور شوافع کے نزدیک یہ مسئلہ مُسلمہ ہے کہ اگر کسی بستی کے لوگ باجماعت نماز ترک کردیں تو اُن کے قتال (جہاد) کیا جائے گا۔ جیسا کہ عمدۃ القاری، جلد پنجم میں علامہ بدر الدین عینی حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اور مُغنی المحتاج، جلد اول میں شیخ محمد شربینی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صراحت فرمائی ہے۔

بینہ نمبر ا

واضح رہے کہ کسی عُذرِ شرعی کے بغیر جماعت ترک کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ سَمِعَ الْمُنَادِيَ فَلَمْ يَمْنَعْهُ مِنَ اتِّبَاعِهِ، عُذْرٌ، قَالُوا: وَمَا الْعُذْرُ؟، قَالَ: خَوْفٌ أَوْ مَرَضٌ، لَمْ تُقْبَلْ مِنْهُ الصَّلَاةُ الَّتِي صَلَّى۔[2]

(یعنی) جس شخص نے اذان سُنی اور بغیر عُذر جماعت سے نماز نہ پڑھی اس کی پڑھی ہوئی نماز قبول نہ ہوگی۔ صحابہ نے عرض کیا عُذر کیا ہے؟ فرمایا خوف یا مرض۔

---

[1] (النساء۱۰۲، صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۲۸)

[2] (سنن ابی داؤد، ج ۱، ص ۸۱)

شیخ ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہے کسی شخص کی جماعت اس کے گناہ کی وجہ سے فوت ہوتی ہے۔ سلف صالحین کا معمول تھا کہ جس شخص کی تکبیر اولیٰ فوت ہو جاتی اس شخص کی تین دن تک تعزیت کرتے اور جس کی پوری جماعت رہ جاتی اس کی سات دن تک تعزیت کرتے۔[1]

نمازِ باجماعت سُنتِ مؤکدہ ہے

امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور امام مالک بن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جماعت سنتِ مؤکدہ ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

إِنْ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَّمَنَا سُنَنَ الْهُدَى، وَإِنَّ مِنْ سُنَنَ الْهُدَى الصَّلَاةَ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِي يُؤَذَّنُ فِيهِ۔[2]

(یعنی) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ہمیں سُننِ ھُدیٰ (مؤکدہ) کی تعلیم دی ہے اور سننِ ھدیٰ میں سے یہ بھی ہے کہ جس مسجد میں اذان دی گئی ہو اسی میں نماز پڑھی جائے۔

دوسری روایت میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

وَلَوْ أَنَّكُمْ صَلَّيْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ كَمَا يُصَلِّي هَذَا الْمُتَخَلِّفُ فِي بَيْتِهِ، لَتَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ، وَلَوْ تَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ لَضَلَلْتُم۔[3]

(یعنی) اگر تم نے جماعت چھوڑنے والے اس شخص کی طرح اپنے گھروں میں نماز پڑھی تو تم اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سنت کے تارک ہو جاؤ گے اور اگر تم نے اپنے نبی کی

[1] (مغنی المحتاج، ج ۱، ص ۲۲۸)
[2] (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۲۳۲)
[3] (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۲۳۲)

سُنت ترک کر دی تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ بلکہ ایک روایت میں یوں بھی ہے **لَكَفَرْتُمْ**[1] کہ تم کافر ہو جاؤ گے۔

اِن احادیث مبارکہ سے یہ اَمر بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے جبکہ بعض فقہاء ومشائخ کے نزدیک نماز باجماعت واجب ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک فرضِ عین اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک فرض کفایہ ہے۔[2]

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز نے حضرت شیخ نظام تھانیسری کو اس مکتوب میں انتباہ فرمایا ہے کہ آپ عشاء کی نماز کو رات کے نصف اخیر میں ادا کرنے کی عادت چھوڑ دیں اور اس تاخیر کو نمازِ تہجد کی ادائیگی یقینی بنانے کا وسیلہ نہ بنائیں، کیونکہ فقہائے احناف (اللہ ان سے راضی ہو) کے نزدیک عشاء کی نماز رات کے نصف اخیر میں پڑھنا مکروہ ہے۔ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ نمازِ عشاء کا وقتِ مسنون و مستحب شفق (سُرخی کے بعد سفیدی) غائب ہونے سے لے کر ثلثِ اول (رات کا پہلا تہائی حصہ) تک ہے اور ثلثِ اول کے بعد نصفِ رات تک وقتِ مباح ہے اور نصفِ رات کے بعد طلوعِ فجر تک وقت مکروہ ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ مکروہ جو مباح کے مقابلے میں ہو مکروہ تحریمی ہوتا ہے۔

جیسا کہ بحر الرائق میں ہے:

وَأَفَادَ أَنَّ التَّأْخِيرَ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ ليس بِمُسْتَحَبٍّ وَقَالُوا إِنَّهُ مُبَاحٌ وَإِلَى مابَعْدَهُ مَكْرُوهٌ۔[3]

(یعنی) عشاء کی نماز کو آدھی رات تک مؤخر کرنا مستحب نہیں اور فقہاء نے اس کو مباح کہا ہے اور آدھی رات کے بعد مکروہ ہے۔

---

[1] (سنن ابی داؤد، ج ا، ص ۸۸)
[2] (شرح المهذب، ج۴، ص ۱۸۹)
[3] (بحر الرائق، ج ا، ص ۲۴۸)

نیز قنیہ سے (چند سطور کے بعد) منقول ہے:

تَأْخِيْرُ الْعِشَآءِ إِلٰى مَا زَادَ عَلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ۔۔۔يَكْرَهُ كَرَاهَتُهٗ تَحْرِيْمٌ۔

(یعنی) عشاء کی نماز کو آدھی رات کے بعد مؤخر کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔

عشاء کے وقت میں مذاہبِ اربعہ

آئمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک عشاء کا وقت شفق غائب ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے، اور طلوعِ فجر تک باقی رہتا ہے۔

قَوْلُهٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم وَآخِرُ وَقْتِ الْمَغْرِبِ إِذَا اسْوَدَّ الْأُفُقُ۔۔۔ الخ، وَآخِرُ وَقْتِ الْعِشَاءِ حِيْنَ يَطْلُعُ الْفَجْرُ۔[1]

البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ شفق غروبِ آفتاب کے بعد سُرخی کا نام ہے یا سفیدی کا۔ آئمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک سُرخی کا نام شفق ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک سفیدی کا نام شفق ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک عشاء کی نماز ثلثِ اول (رات کا پہلا تہائی حصہ) تک مؤخر کر کے پڑھنا مسنون و مستحب ہے۔[2]

حضرت امام مالک بن انس اور حضرت امام محمد بن ادریس رحمہم اللہ تعالیٰ کا ایک قول یہی ہے[3] اور وقتِ عشاء کے متعلق حدیثِ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں جو لفظ حَتّٰى ذَهَبَ عَامَّةُ اللَّيْلِ (رات کا

---

1 (فتح القدیر مع الهدایة، ج ۱، ص ۱۹٦)

2 (اکمال اکمال المعلم، ج ۲)

3 (شرح صحیح مسلم از نووی، ج ۱، ص ۲۲۸)

اکثر حصہ گزر چکا تھا) وارد ہے تو فقہاء نے اس کو مبالغہ پر محمول فرمایا ہے کیونکہ نصفِ شب کے بعد عشاء کی نماز میں تاخیر کرنا کسی امام کا مذہب نہیں۔[1]

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مؤقف پر وہ حدیث دلیل ہے جس کو حافظ ابن ابی شیبہ نے حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي الْعِشَاءَ حِينَ يَسْوَدُّ الْأُفُقُ۔[2]

(یعنی) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سیاہی پھیلنے کے بعد عشاء کی نماز پڑھتے تھے۔

دوسری دلیل یہ حدیث ہے جس کو امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نقل فرمایا:

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ، قَالَ: أَنَا أَعْلَمُ النَّاسِ بِوَقْتِ هَذِهِ الصَّلَاةِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيهَا لِسُقُوطِ الْقَمَرِ لِثَالِثَةٍ۔[3]

(یعنی) نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں تمام لوگوں کی بہ نسبت عشاء کے وقت کو زیادہ جانتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم عشاء کی نماز اس وقت پڑھا کرتے تھے جب تیسری رات کا چاند غروب ہو جاتا تھا۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ تیسری رات کا چاند اُفق کی سفیدی غائب ہونے کے بعد غروب ہوتا ہے۔

---

[1] (شرح صحيح مسلم از نووی، ج ۱، ص ۲۲۸)

[2] (مصنف ابن ابی شيبة، ج ۱، ص ۳۳۰)

[3] (سنن ابی داؤد، ج ۱، ص ۶۰)

اور وہ جو حدیثِ مسلم میں وارد ہے کہ وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الْأَوْسَطِ۔[1] یعنی عشاء کی نماز کا وقت آدھی رات تک ہے۔

احناف کے نزدیک یہ وقت انتہاء ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۸۲ تا ۶۹۱)

[لہٰذا وہ پانی جس سے ازالہ حدث کیا گیا ہو یا بہ نیت عبادت و ثواب وضو کے لئے استعمال کیا گیا ہو لوگوں کے لئے اس کا پینا جائز قرار دیں۔ کیونکہ یہ پانی سیدنا حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک نجاستِ غلیظ کا حکم رکھتا ہے۔ اور فقہاء نے اس پانی کے پینے سے منع کیا ہے اور اس کا پینا مکروہ قرار دیا ہے۔ ہاں وضو سے بچے ہوئے پانی کو انہوں نے شفا کہا ہے۔ اگر عقیدت کے طور پر کوئی طلب کرے تو وضو سے بچے ہوئے پانی میں سے دیں۔

فقیر کو اس دفعہ دہلی میں یہ آزمائش پیش آگئی۔ بعض دوستوں کو واقعہ میں دکھایا گیا کہ وہ فقیر کے وضو کا مستعمل پانی پئیں ورنہ ضررِ عظیم لاحق ہو گا۔ ہر چند اسے اس سے باز رہنے کی کوشش کی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ کُتبِ فقہ کی طرف رجوع کیا تو خلاصی کی ایک صورت نکل آئی کہ اگر تین بار اعضاء دھو لینے کے بعد چوتھی بار بغیر نیتِ عبادت اعضاء پر پانی پھیر دیں تو وہ مستعمل نہ ہو گا۔ اس حیلہ سے بے نیت قُربت اعضاء پر پانی چلا کر اسے پینے کے لئے دیا۔]

تشریح

احادیث میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے وضو مبارک کا مستعمل پانی صحابہ کرام نوش فرما لیتے تھے لیکن چونکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم گناہِ

---

[1] (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۲۲۳)

صغیرہ وکبیرہ سے محفوظ ومامون تھے اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ظاہری جسم مبارک بھی میل کچیل سے پاک ہوتا تھا اس لئے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا مستعمل پانی بھی نہ صرف پاک بلکہ فضائل کا حامل تھا، لیکن بعد کے لوگوں کے لئے وہ حکم باقی نہیں رہا۔ ہاں وضوسے بچ جانے والا پانی البتہ اپنے اندر شفاء رکھتا ہے اور اس کو کھڑے ہو کر پینا بھی ایسے ہی جائز ہے جیسے آبِ زمزم کو۔ علاوہ ازیں اگر دورانِ وضو اعضاء ثلاثہ کو تین دفعہ دھونے کے بعد ثواب کی نیت کے بغیر چوتھی دفعہ دھو کر اس کا مستعمل پانی محفوظ کر لیا جائے تو اُس کو بوقتِ ضرورت پیا جا سکتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے حضرت نظام تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نام اس مکتوب گرامی میں لوگوں کے اپنے وضوء کا مستعمل پانی پلانے سے منع فرمایا ہے اور منع پر تاکید کرتے ہوئے امامِ اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ایک قول کے مطابق اس پانی کو نجاستِ غلیظہ قرار دیا ہے۔ گو امامِ اعظم کا یہ قول تقویٰ، احتیاط اور کشف کے قبیل سے ہے اور فتویٰ اس کے برعکس ہے۔ تاہم مقلدین کے لئے نجاستِ غلیظہ کا قول ثابت ہونے کے بعد ماءِ مستعمل کا پینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔

ماءِ مستعمل کی تعریف واحکام

ماءِ مستعمل وہ پانی ہے جو ازالۂ حدث یا حصولِ قربت کے لئے استعمال کیا جائے۔

حضرت صدر الشہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

وَقَالَ الصَّدْرُ الشَّهِيْدُ لَا يَصِيْرُ مُسْتَعْمَلاً مَا لَمْ يَكُنْ يَسْتَقِرُّ فِيْ مَكَانٍ وَيَسْكُنُ مِنَ التَّحَرُّكِ۔[1]

[1] (فتاوی برجندی)

(یعنی) پانی اس وقت تک مستعمل نہیں کہلاتا جب تک اعضاء سے جدا ہو کر کسی مکان میں ٹھہر نہ جائے اور حرکت کرنے سے رُک نہ جائے۔

جبکہ علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:

اَلصَّحِیْحُ اَنَّہٗ کَمَا زَالَ عَنِ الْعُضْوِ صَارَ مُسْتَعْمَلاً۔[1]

(یعنی) صحیح یہ ہے کہ پانی عضو سے جدا ہوتے ہی مستعمل ہو جائے گا۔

اسی مسلک کو دیگر کتبِ فقہ میں درست کہا گیا ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ماءِ مستعمل کے حکم میں تین اقوال منقول ہیں:

پہلا قول: روایتِ حسن بن زیاد کے مطابق نجسِ مغلظ ہے۔

دوسرا قول: روایتِ امام ابو یوسف کے مطابق نجس مخفف ہے۔

تیسرا قول: روایتِ محمد بن حسن وزفر کے مطابق طاہر غیر مطہر ہے۔

اسی تیسرے قول کو محققین ماوراء النہر نے اختیار کیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔[2]

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اقوالِ ثلاثہ میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں تضاد نہیں۔ رفعِ تضاد کے لئے وہ احادیث دلیل ہیں جن میں وارد ہوا ہے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں، حتیٰ کہ آنکھ، کان، ناک، سَر، ہاتھ، پاؤں اور ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔ مثلاً:

مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ خَرَجَتْ خَطَایَاہُ مِنْ جَسَدِہِ، حَتَّی تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِہِ۔[3]

---

1 (الدایۃ اولین، ص ۳۹)

2 (عمدۃ القاری، ج ۳، ص ۷۳)

3 (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۱۲۵)

بلکہ ایک روایت میں یوں بھی ہے:

خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِهٖ كَمَا وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ۔[1]

چونکہ حضرت سیدنا امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اہلِ مشاہدہ و کشف میں سے تھے جب آپ لوگوں کے آبِ وضوء کو دیکھتے تو ان گناہوں کو پہچان لیتے جو اعضائے وضوء سے دھل کر پانی میں گرتے۔ اسی وجہ سے ماءِ مستعمل کے بارے میں آپ کے تین قول ہو گئے۔ چنانچہ سیدنا امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ماءِ مستعمل کے متعلق امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تین اقوال کی جو توجیہات بیان فرمائی ہیں ہدیۂ قارئین ہیں۔

حضرت امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

میں نے اپنے سردار حضرت علی الخواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سُنا کہ امامِ اعظم ابو حنیفہ کے مدارک اتنے لطیف ہیں کہ ان پر اکابر اولیاء اہلِ مشاہدہ ہی مطلع ہو سکتے ہیں۔[2]

وَلِلْاِمَامِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ فِی الْمَآءِ الْمُسْتَعْمَلِ ثَلَاثُ رِوَایَاتٍ اَحَدُهَا اِنَّ الْمُسْتَعْمَلَ فِی الْحَدَثِ حُكْمُهٗ حُكْمُ الْمَآءِ الْمُتَغَیِّرِ بِالنَّجَاسَةِ ثَانِیْهَا اِنَّهٗ كَبَوْلِ الْبَهَائِمِ سَوَاءٌ ثَالِثُهَا اِنَّهٗ طَاهِرٌ فِیْ نَفْسِهٖ غَیْرُ مُطَهِّرٍ لِغَیْرِهٖ۔[3]

(یعنی) ماءِ مستعمل کے متعلق امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے تین روایتیں ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ یہ پانی اس پانی کے حکم میں ہے جو کسی نجاست کے ملنے سے متغیر ہو جائے، لہٰذا وہ نجاستِ غلیظہ کے حکم میں ہو گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ پانی حلال جانوروں کے بول کے حکم میں ہے، لہٰذا

---

[1] (طبرانی کبیر، ج ۱، ص ۹۲)

[2] (المیزان الکبریٰ، ص ۷۳، ۷۴، مطبوعہ بیروت)

[3] (الیواقیت والجواہر، ج ۲، ص ۴۱۸، مطبوعہ بیروت)

اس پر نجاستِ خفیفہ کا اطلاق ہوگا اور تیسری روایت کے مطابق وہ پانی خود پاک ہے لیکن دوسری چیز کو پاک نہیں کرتا لہٰذا طاہر غیر مطہر ہوگا۔

اس کے بعد آپ نے تینوں روایات کی توجیہات بیان فرمائی ہیں کہ ماءِ مستعمل کو نجسِ مغلظ قرار دینے کی توجیہہ اخذ بالا حتیاط ہے کہ آپ نے مشاہدہ اور کشف کی نظر سے کبائر کے مُرتکب افراد کے غسالہ (دھوون) کو نجاستِ غلیظہ سے ملوّث پایا اور صغائر کے مرتکبین کے غسالہ پر حلال جانوروں کے بول کی طرح نجاستِ خفیفہ کا حکم لگایا اور حُسنِ ظن کی بنیاد پر اکثر اہلِ ایمان کا غسالہ طاہر کے درجے میں مشاہدہ فرمایا، لیکن ارتکابِ مکروہات کے ظنِ غالب کی بناء پر غیر مطہر کا حکم لگایا۔

چنانچہ آپ نے صراحت فرمائی کہ:

سَمِعْتُ سَیِّدِیْ عَلِیًّا الْخَوَّاصَ رَحْمَہُ اللّٰہُ یَقُوْلُ مِرَارًا اِنَّمَا قَالَ الْاِمَامُ اَبُوْ حَنِیْفَۃَ بِنَجَاسَۃِ غُسَالَۃِمَآءِالطَّھَارَۃِلِاَنَّہٗ کَانَ مِنْ اَھْلِ الْکَشْفِ، الخ۔[1]

یعنی میں نے کئی مرتبہ سیدی علی الخواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سُنا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ماءِ مستعمل کے نجس ہونے کا قول آپ کے کشف پر مبنی ہے۔

حضرت سیدی امام عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"ہم کو روایت پہنچی کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جامع مسجد کوفہ کے حوض پر تشریف لے گئے ایک شخص وضو کر رہا تھا، حضرت امام نے اس کے وضوء کے بہتے ہوئے پانی پر نظر ڈالی تو فرمایا اے بیٹے! ماں باپ کو ایذاء دینے سے توبہ کر، اس نے فوراًتوبہ کرلی۔ ایک دوسرے آدمی کا

---

[1] (الیواقیت والجواھر، ج۲، ص۴۱۸)

غُسالہ دیکھ کر فرمایا اے بھائی! زنا سے توبہ کر۔ ایک اور شخص کو دھوون دیکھ کر فرمایا اے بندے! شراب پینے اور مزامیر سُننے سے توبہ کر، وہ دونوں تائب ہو گئے"۔[1]

بینہ نمبر ۲

وضوء سے گناہ دھلنے کی حدیث کے تحت فقہاء و محدثین نے فرمایا کہ یہاں گناہوں سے صغائر مراد ہیں۔ مگر اہلِ کشف ومشاہدہ کی تحقیق کے مطابق کبائر بھی دھلتے ہیں۔ اگر پوری زائل نہ بھی ہوں تاہم کبائر کی تلویث آبِ وضوء میں ضرور ہوتی ہے، کیونکہ اکابرین اولیائے کرام کے مشاہدات اس ضمن میں تواتر کے ساتھ موجود ہیں اور سیدنا امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تو سرِ حلقۂ اہلِ مشاہدہ تھے۔

ماءِ مستعمل طاہر ہے

وضوء کے مستعمل پانی کے متعلق مفتٰی بہ قول یہی ہے کہ وہ طاہر غیر مطہر ہے اور اس کی طہارت پر یہ حدیث دلیل ہے:

السَّائِبَ بْنَ یَزِیدَ یَقُولُ ذَهَبَتْ بِي خَالَتِي إِلَی النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ یَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ ابْنَ أُخْتِي وَجِعٌ فَمَسَحَ رَأْسِي وَدَعَا لِي بِالْبَرَكَةِ ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنْ وَضُوئِهِ۔[2]

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میری خالہ مجھے اپنے ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی خدمتِ اقدس میں لے گئیں اور عرض کیا کہ میری بہن کے بیٹے کو درد یا تکلیف ہے (غالبًا سر میں) تو آپ نے میرے سر پر ہاتھ مبارک پھیرا اور

---

[1] (المیزان الکبریٰ، ص ۷۴)

[2] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۳۱)

میرے لئے برکت کی دعا مانگی اس کے بعد آپ نے وضوء فرمایا تو میں نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے وضوء کا دھوون پی لیا۔

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اسی حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

وَعَلَى هَذَا يَكُونُ دَلِيلًا عَلَى طَهَارَةِ الْمَاءِ الْمُسْتَعْمَلِ۔[1]

نیز ایک اور حدیث شریف میں ہے:

قَالَ أَبُو مُوسَى دَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحٍ فِيهِ مَاءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ فِيهِ وَمَجَّ فِيهِ ثُمَّ قَالَ لَهُمَا اشْرَبَا مِنْهُ وَأَفْرِغَا عَلَى وُجُوهِكُمَا وَنُحُورِكُمَا۔[2]

(یعنی) ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ایک پیالہ پانی کا منگوایا اور اپنا ہاتھ اور چہرۂ اقدس اس میں دھویا اور اسی میں کُلی فرمائی پھر بلال اور ابو موسیٰ سے فرمایا اس میں سے تم دونوں پی لو اور اپنے منہ اور سینے پر ڈالو۔

اس حدیث کے تحت علامہ کرمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لعاب مبارک مُشک وعنبر سے زیادہ خوشبودار تھا۔[3]

اور یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ بزرگانِ دین کے آثار و مستعملات کو تبرک بنانا جائز ہے۔[4]

---

[1] (مرقاۃ، ج ۲، ص ۵۳)

[2] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۳۱)

[3] (کرمانی، ج ۳، ص ۳۴)

[4] (عمدۃ القاری، ج ۳، ص ۷۵)

سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے فضلات مبارکہ طاہر ہیں

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صراحت فرمائی ہے کہ:

وَمِنْ ثَمَّ اخْتَارَ كَثِيرُونَ مِنْ أَصْحَابِنَا طَهَارَةَ فَضَلَاتِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ [1]

(یعنی) ہمارے بہت سے بزرگوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضلات مبارکہ (بول وبراز وغیرہ) کی طہارت کا مؤقف اختیار کیا ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یہ روایت نقل فرمائی ہے:

وھو یقول بطھارۃ بولہ وسائر فضلاتہ۔ [2]

(یعنی) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بول مبارک اور تمام فضلات مبارکہ کو طاہر قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح عارف ربانی حضرت سیدی عبد الوہاب شعرانی قدس سرہٗ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

كَمَا اَفْتٰى بِهٖ شَيْخُ الْاِسْلَامِ الْبَلْقِيْنِيُّ وَالسُّبْكِيُّ وَالْجَلَالُ السُّيُوْطِيُّ وَغَيْرُهُمْ حَتّٰى قَالَ شَيْخُ الْاِسْلَامِ السِّرَاجُ الْبَلْقِيْنِيُّ وَاللّٰهِ لَوْ وَجَدْتُّ شَيْئًا مِنْ بَوْلِ النَّبِيِّ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم وَغَائِطِهٖ لَاَكَلْتُهٗ وَشَرِبْتُهٗ وَفِي الْحَدِيْثِ مَايُؤَيِّدُ ذَالِكَ فَرَوَى الطِّبْرَانِيُّ وَغَيْرُهٗ نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَآءِ بُنِيَتْ اَجْسَادُنَا عَلٰى اَجْسَامِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَلِذَالِكَ كَانَ يَشُمُّوْنَ الْمِسْكَ مِنْ مَوْضِعِ بَرَازِهٖ۔ [3]

---

[1] (مرقاۃالمفاتیح، ج۲، ص ۵۳)

[2] (عمدۃالقاری، ج۳، ص ۷۹)

[3] (الیواقیت والجواھر، ج۲، ص ۱۶۴، مطبوعہ بیروت)

ترجمہ: حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے فضلاتِ مبارکہ (بول وبراز وغائط وغیرہا) کے طاہر ہونے پر شیخ الاسلام البلقینی، علامہ امام سُبکی اور امام جلال الدین سیوطی رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ متعدد آئمہ ومحدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے فتویٰ صادر فرمایا ہے یہاں تک کہ حضرت شیخ الاسلام السراج البلقینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا خدا کی قسم اگر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضلاتِ مبارکہ میں سے کچھ بھی پالیتا تو اس کو کھالیتا اور پی لیتا۔ اور اس مضمون کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو طبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور وہ یہ ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا "ہم انبیاء کا گروہ ہیں، ہمارے جسم اہلِ جنت کے جسموں پر پیدا کئے گئے ہیں" اور یہی وجہ تھی کہ آپ کے بول وبراز فرمانے کی جگہ سے کستوری کی خوشبو آتی تھی۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۹۲ تا ۶۹۸)

[نیز بعض معتمد لوگوں نے نقل کیا ہے کہ آپ کے بعض خلفاء کے مُرید خلفاء کو سجدہ کرتے ہیں اور زمین بوسی پر کفایت نہیں کرتے۔ اس فعل کی برائی اظہر من الشمس ہے۔ انہیں اس سے سختی سے منع کیجیئے اس قسم کے افعال سے سب کو پرہیز کرنا چاہیئے۔ اور ان لوگوں کو خاص کر جو مخلوق کی پیشوائی کے لئے نمایاں ہو چکے ہیں، ایسے افعال سے ان لوگوں کے لئے اجتناب کرنا اَشد ضروری ہے، کیونکہ پیروکار لوگ ان کے افعال کی اقتدا کیا کریں گے اور فتنے میں مبتلا ہوں گے۔]

تشریح

پیر ومرشد کے آگے سجدہ کرنا حرامِ قطعی ہے چاہے سجدۂ حقیقی ہو یا سجدۂ تعظیمی۔ کیونکہ سجدہ میں اعلیٰ ترین عجز وانکساری ہے اور یہ صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے آگے ہی جائز ہے کسی دوسرے کے لئے جائز وثابت نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے

کہ اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے زیرِ نظر سطور میں حضرت شیخ نظام تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ان کے بعض خلفاء کی اس غلطی پر آگاہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے لئے مریدوں سے سجدے کرواتے ہیں۔ اس لئے آپ پر لازم ہے کہ ان کو اس فعلِ شنیع سے تاکیداً منع کریں۔

سجدۂ عبادت و تحیت

سجدہ

سجدہ کا لغوی معنیٰ غَايَةُ التَذَلُّلِ (انتہائی ذِلّت وعاجزی) ہے۔ اس کا شرعی مفہوم ہے وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلَى الْاَرْضِ (پیشانی کا زمین پر رکھنا)۔

سجدہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ سجدۂ عبادت ۲۔ سجدۂ تحیت

سجدۂ عبادت حضرت حق جل جلالہٗ کے لئے خاص ہے۔ غیرِ خُدا کے لئے سجدۂ عبادت یقیناً اجماعاً شرکِ مہین اور کُفرِ مُبین ہے۔ یہ سجدہ تمام سابقہ مذاہب ومِلل میں بھی غیر خدا کے لئے کبھی جائز نہ ہوا۔ (کمافی کتب العقائد)

سجدۂ تحیت (جو صرف تعظیم واحترام کے لئے ہے) پہلی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن ہماری شریعت میں سخت حرام وگناہِ کبیرہ ہے کیونکہ اس کی ممانعت پر احادیثِ متواترہ وارد ہوئی ہیں۔ (کما فی التفسیر العزیزی)

اسی طرح علماء ومشائخ ومزاراتِ اولیاء کے لئے سجدہ کرنا قطعًا حرام وناجائز ہے، اگرچہ اس میں تعظیم و تحیّت ہی مقصود ہو۔

احادیثِ تحریم سجدۂ تحیّت

حضرت قیس بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے شہر حیرہ (کوفہ) میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے شہریار کو سجدہ کرتے ہیں میں نے واپس آکر رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے عرض کیا:

فَأَنْتَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَحَقُّ أَنْ نَسْجُدَ لَكَ. قَالَ أَرَأَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِي أَكُنْتَ تَسْجُدُ لَهُ. قَالَ قُلْتُ لاَ. قَالَ فَلاَ تَفْعَلُوا لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لأَحَدٍ لأَمَرْتُ النِّسَاءَ أَنْ يَسْجُدْنَ لأَزْوَاجِهِنَّ۔[1]

ترجمہ: اے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم آپ سجدہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ فرمایا بھلا تم اگر میری قبر سے گزرو تو کیا میری قبر کو سجدہ کروگے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا پس تم سجدہ نہ کرو اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدے کا حکم دیتا تو عورتوں کو اپنے خاوندوں کے لئے سجدے کا حکم دیتا۔

نیز حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سجدہ کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا:

لا ينبغي لمخلوق أن يسجد لأحد إلا الله تعالى۔[2]

کسی مخلوق کو زیبا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرے۔

---

[1] (سنن ابی داؤد، ج ۱، ص ۲۹۱)
[2] (تفسیر مدارک، ج ۱، ص ۴۲)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملک شام سے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو سجدہ کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا معاذ! یہ کیا ہے؟ عرض کیا میں نے ملک شام میں نصاریٰ کو دیکھا کہ وہ اپنے پادریوں اور سرداروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرے دل میں خیال آیا کہ ہم حضور کو سجدہ کریں۔

فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ: فَلاَ تَفْعَلُوا، فَإِنِّي لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِغَيْرِ اللهِ، لأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا۔[1]

(یعنی) مجھے سجدہ نہ کرو اگر میں غیرِ خدا کے لئے سجدے کا حکم دیتا تو عورت کو اپنے شوہر کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا۔

بینہ نمبر ۳

سجدۂ تحیت کو شرک قرار دینا ادعائے باطل ہے۔ فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا[2] اور بھائیوں کا حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا[3] اس امر کے ثبوت کے لئے دلیل کافی ہے کہ سجدۂ تعظیمی شرک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی مخلوق کو اپنا شریک بنانے کا حکم دینا محالِ قطعی ہے اور ملائکہ کرام وانبیائے عظام علیہم السلام کی شان کے بھی منافی ہے کہ وہ ایک آن کے لئے بھی غیر اللہ کو اس کا شریک بنائیں یا جائز ٹھہرائیں۔

البتہ سجدۂ تحیّت کے بارے میں فقہاء سے کفر کا قول منقول ہے لیکن تحقیق کے بعد اس کو کُفر صوری پر محمول کیا گیا ہے۔

---

[1] (سنن ابن ماجہ، ص ۱۳۴)

[2] (البقرۃ ۳۴)

[3] (یوسف ۴)

طریقۂ محمدیہ (قلمی) نوع سیز دہم آفتابِ قلب میں تذلل کو حرام بتا کر فرمایا:

وَمِنْهُ السُّجُوْدُ وَالرُّكُوْعُ وَالْاِنْحِنَاءُ لِلْكُبَرَاءِ عِنْدَ الْمُلَاقَاتِ وَالسَّلَامِ وَرَدِّهٖ۔

(یعنی) امراء و سلاطین کے لئے سجدہ، رکوع یا رکوع تک جھکنا بھی حرام و ممنوع ہے۔ ایسے ہی امراء و سلاطین اور مشائخِ طریقت کے لئے زمین کو بوسہ دینا بھی حرام ہے اور اس فعل کو کرنے والا اور اس سے خوش و راضی ہونے والا دونوں گناہ گار ہوں گے۔[1]

فقیہ ابو جعفر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا جو شخص بادشاہ یا امیر کے سامنے زمین کو بوسہ دے یا سجدہ کرے اگر وہ سجدہ تعظیمی ہو گا تو اس سے وہ شخص مشرک و کافر تو نہیں ہو گا لیکن گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو گا اور اگر عبادت کی نیت سے کرے گا تو مشرک و کافر ہو جائے گا اور اگر اس کی نیت کچھ بھی نہ ہو تو اکثر علماء کے نزدیک وہ کافر نہیں ہو گا۔

امام صدر شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمایا:

مَنْ قَبَّلَ الْاَرْضَ بَيْنَ يَدَيِ السُّلْطَانِ اَوْ اَمِيْرٍ اَوْ سَجَدَ لَهٗ فَاِنْ كَانَ عَلٰى وَجْهِ التَّحِيَّةِ لَا يُكْفَرُ وَلٰكِنِ ارْتَكَبَ الْكَبِيْرَةَ۔[2]

ترجمہ: جس نے بادشاہ یا کسی بڑے آدمی کے سامنے زمین کو بوسہ دیا، یا اسے سجدہ کیا اگر تعظیم کے لئے ایسا کیا تو کافر نہ ہو گا لیکن کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو گا۔

اسی طرح علماء و مشائخ کو تعظیمی سجدہ کرنا یا مزارات کی طرف سجدہ کرنا اور رکوع کی حد تک جھکنا بھی حرام قطعی ہے۔

---

[1] (الکافی)

[2] (مجمع الانہر)

حضرت امام عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص کے ادب واحترام کے لئے حدِ رکوع سے کم تک جھکنے میں کوئی حرج نہیں۔

وَلَا بَأسَ بِمَا نَقَصَ مِنْ حَدِّ الرُّكُوْعِ۔[1]

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۶۹۹ تا ۷۰۲)

[نیز اس گروہ صوفیہ کے علوم، علومِ احوال ہیں۔ اور احوال، اعمال کے نتائج و ثمرات ہیں۔ اور علوم احوال اسے عطا ہوتے ہیں، جس کے اعمال درست ہوں اور اعمال کا حق ادا کیا ہو اور اعمال کی درستی اس وقت میسر آتی ہے جبکہ اعمال کو پہچانے اور ہر عمل کی کیفیت سے واقف ہو۔ اور اعمال کو جاننا اور ان کی کیفیت سے واقف ہونا احکامِ شرعیہ کا علم ہے۔ جیسے نماز، روزہ اور باقی فرائض اور معاملات کا علم اور نکاح وطلاق اور بیع وشراء کا علم۔ اور ہر اس شے کا علم جو اللہ تعالیٰ نے بندے پر واجب کی ہے۔ اور جس کی بندے کو دعوت دی ہے۔ اور یہ علوم کسب وسعی سے حاصل ہوتے ہیں، ان کے سیکھنے کے بغیر چارہ نہیں۔]

تشریح

کامیاب اور قابل اعتبار تصوف کا یہ وہ اصول ہے جو حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے یہاں بیان فرمایا ہے کہ احکامِ شرعیہ کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ جب عبادات ومعاملات کے علم سے بنیاد مضبوط ہو گی تو اُس پر عمل کی عمارت صحیح اور درست بنے گی اور جب عمل صحیح ہو گا تو احوال بھی نصیب ہوں گے اور کیفیات بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی محافل میں آنے والے عقیدت مندوں اور مریدین کو تاکید کرتے ہیں کہ تصوف سے پہلے علمِ شریعت کا فرض ادا کیا جائے

---

[1] (الحدیقۃ الندیۃ، ص ۳۹۱)

اور پھر اُس پر عمل کیا جائے۔ جب تک یہ دو پَر نہ ہوں عالمِ قُدس کی طرف روح کی پرواز ممکن نہیں ہے۔ اور اگر علم کے بغیر ہی تصوف میں شامل ہو گیا تو چاہیئے کہ اب ساتھ ساتھ حصولِ علم کی ادائیگی بھی ہو جائے، اگر علم حاصل نہ کیا جائے تو اکثر اوقات تصوف کی کیفیات اور سُکری اقوال کی تقلید سے گمراہی کا دروازہ کھُل جاتا ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول کتبِ تصوف کی زینت ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ:

مَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ مُحقّقَ۔

ترجمہ: جس نے فقہ (کا علم) حاصل کیا اور تصوف کو نہ جانا وہ فسق و فجور میں پڑ گیا اور جو تصوف میں ڈوب گیا اور فقہ سے نابلد رہا وہ زندیق ہوا اور جس نے دونوں کو جمع کیا اس نے حق کو پالیا۔

پس پیر و مرید دونوں کے لئے حصولِ علم فرض ہے۔ اگر شیخ عالم ہو گا تو اپنے مریدین کو بھی علم کی طرف راغب کرے گا اور ان کی صحیح رہنمائی کر سکے گا اور اگر شیخ ہی جاہل ہو تو مُریدین کی کیا خاک تربیت ہو گی۔

[اور علم دو مجاہدوں کے درمیان واقع ہے۔ ایک اس کے حصول سے پہلے اس کی طلب کا مجاہدہ، دوسرا حاصل کر لینے کے بعد اس پر عمل کرنے کا مجاہدہ۔ لہٰذا یوں چاہیئے کہ جس طرح آپ کی مجلس شریف میں کُتبِ تصوف کا ذکر و مطالعہ ہوتا ہے اسی طرح کتبِ فقہ کا بھی ذکر و مطالعہ ہو۔ اور زبانِ فارسی میں فقہ کی بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ جیسے مجموعۂ خانی، عمدۃ الاسلام اور کنز فارسی۔ بلکہ اگر آپ کی مجلس شریف میں کتب تصوف کا ذکر و مطالعہ نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ تصوف کا

احوال سے تعلق ہے۔ وہ قال میں نہیں آسکتا۔ لیکن فقہ کے زیرِ مطالعہ نہ ہونے سے ضرر و نقصان کا احتمال ہے۔ بات زیادہ لمبی کیا کرے تھوڑی چیز زیادہ پر دلالت کرتی ہے۔

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم

کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ترجمہ: تیرے سامنے میں نے بہت تھوڑا غمِ دل بیان کیا ہے۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ تو دل آزردہ ہوگا، ورنہ باتیں بہت ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں اپنے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل اتباع نصیب فرمائے۔]

تشریح

لوگوں نے بھوکا پیاسا رہنے کو ہی مجاہدہ سمجھ لیا ہے اور ورود و وظائف کو ہی ریاضات شاقہ جان لیا ہے حالانکہ حصولِ علم اور اس پر عمل کرنا سب سے بہترین مجاہدہ ہے۔ اور چونکہ قرآن عظیم الشان اور حدیث میں علم شریعت کے حاصل کرنے کے بارے میں بڑی تاکید آئی ہے اس لئے حصول علم میں بڑی برکات پوشیدہ ہیں، جن سے تصوف کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

صوفیاء کرام کو چاہیئے کہ وہ حالات واحوال کی عبارات کے ساتھ ساتھ کُتبِ فقہ کے مطالعہ سے اپنی محافل کو رونق بخشیں۔

عربی وفارسی کی کتابیں چونکہ اپنی اصل عبارات کے ساتھ قائم ودائم ہیں اس لئے ان سے استفادہ کرنا زیادہ فائدہ مند ہے۔ جبکہ ان کے ترجمہ کے دوران مسلکی اختلافات کا بہت زیادہ عمل دخل ہو چکا ہے اور چونکہ عام آدمی کے پاس علم نہیں ہوتا اس لئے جب وہ ان کتابوں کا مطالعہ کرتا

ہے تو اختلافات کا شکار ہو جاتا ہے اس لئے پرانی کتابوں کا مطالعہ ہی زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ حصولِ علم کی ابتداء علم العقائد سے کرنی چاہیئے کیونکہ عمل تب ہی درست شمار ہوگا جبکہ عقیدہ درست ہو۔ اور اگر خدانخواستہ عقیدہ ہی غلط ہو تو عمل کیا فائدہ دے گا؟

مکتوب نمبر ۳۰

[شہودِ آفاقی اور اَنفسی اور تجلی صوری اور شہودِ اَنفسی کے درمیان فرق۔ اور مقامِ عبدیت کی شان کی بلندی اور اس مقام کے علوم کی علومِ شریعیہ کے ساتھ مطابقت اور دیگر اس سے مناسبت رکھنے والے اُمور کے بیان میں۔۔۔۔ ملا محمد صدیق صاحب جو اس درگاہِ مجددیہ کے قدیم خادموں میں سے ہیں وہ فرماتے تھے کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے یہ مکتوب بھی شیخ نظام تھانیسری کو لکھا:

اللہ تعالیٰ تمہیں کامل اتباعِ محمدی سے مشرف کرے اور بلند مصطفوی لباس سے مزین کرے علیہ وعلیٰ آلہٖ من الصلوٰۃ افضلھا و من التحیات اکملھا۔]

تشریح

شہود کی دو اقسام ہیں

ایک شہودِ آفاقی اور دوسری شہودِ اَنفسی۔

جب کسی سالک کو شہود کی دولت عنایت ہو تو ابتداءً اسے شہودِ آفاقی میسر ہوتا ہے، یہ شہودِ ظلی ہوتا ہے اور اس میں ظلی تجلی پڑتی ہے، شہودِ آفاقی کے بعد شہودِ اَنفسی آتا ہے، اس شہود کی کیفیت اصلی ہوتی ہے۔ شہودِ آفاقی کی کیفیات سالک پر کچھ عرصہ کے لئے آتی ہیں پھر ختم ہو جاتی ہیں جبکہ شہودِ انفسی دائمی رہتا ہے۔ شہودِ آفاقی سالک کی ترقی میں معاون ہوتا ہے تاہم شہودِ انفسی کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت واعتبار نہیں لیکن یہ بات ضرور ہے کہ شہودِ انفسی تک پہنچنے کے لئے شہودِ آفاقی سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس مکتوب میں مقامِ بندگی (عبدیت) کے بارے میں بھی معارف بیان کئے گئے ہیں۔ تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مقامِ بندگی کیا ہے؟ مقامِ بندگی وہ بلند ترین مقام ہے جو ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو عطا ہوا۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى (الإسراء ١)

ترجمہ: پاکی ہے اسے جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک۔

مقاماتِ سلوک میں یہ مقام سب سے اَرفع و اعلیٰ مقام ہے اور چونکہ اولیاء کرام (علماءِ حق) انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حقیقی وارث ہوتے ہیں، اس لئے نبوت کے دیگر کمالات و برکات کی طرح اس مقام سے بھی اُنہیں حصہ ملتا ہے اور اس مقام سے حصہ پانے والا شخص بال برابر بھی شریعت کی مخالفت نہیں کرتا۔ نہ خود کو احکامِ الٰہی سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ جبکہ نا سمجھ اور ناقِص طریقت کے پیروکار فرائض وواجبات کے نہ صرف تارک ہوتے ہیں بلکہ ان کا انکار کرکے دائرۂ کفر میں داخل ہو جاتے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ نماز وروزے جیسے فرائض جب خیر البشر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو معاف نہ ہوئے تو دوسروں کی کیا حیثیت ہے کہ وہ فرائض سے مستثنیٰ ہوں؟ پس شریعت وطریقت کے دَاعی (پیر و مرشد) کو چاہیئے کہ لوگوں کو شریعت کی طرف بلائے اور فرائض وواجبات کے معاملہ میں نرمی نہ برتے۔ سُنن ومستحبات پر عمل کرنے کے لئے اُن کو شوق دلائے اور ان کے فضائل بیان کرے۔ جیسے کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے شیخ

تھانیسری کو ان الفاظ سے یاد کیا کہ "تمہیں کامل اتباعِ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے مشرف کرے اور بلند مصطفوی لباس سے مزین فرمائے۔

مصطفوی لباس سے دراصل مقصود حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی مکمل تابعداری ہے تاہم ظاہری لباس میں بھی سُنت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کھُلا لباس، چادر اور ٹوپی کے اُوپر دستار پہننا اور سُنت کے مطابق داڑھی رکھنا۔ یہ ہی وہ حُلیہ ہے جسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے پسند فرمایا ہے جبکہ آج کے دور میں لوگوں نے اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے حُلیہ کو چھوڑ کر یورپ کی تقلید شروع کر دی ہے۔ بڑے فخر سے پینٹ، کوٹ اور ٹائی پہنتے ہیں۔ عورتوں نے ساڑھی کو ترجیح دے دی ہے بلکہ اب تو وہ بھی پینٹ، شرٹ پہننے لگی ہیں جن سے ان کا بدن ننگا ہوتا ہے اور احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ احادیث مبارکہ کے مطابق کھُلا لباس پہننا اسلام کی نشانی ہے، جبکہ تنگ لباس کفر کی علامت ہے۔

ٹائی کے بارے میں شرح عقائد النسفی میں ہے کہ:

أن احد اصدق بجميع ما جاء به النبی عليه السلام و سلمه و اقربه و عمل به و مع ذٰلک شد الزنار بالاختيار أو سجد للصنم بالاختيار نجعله كافراً (ای ظاهراً و باطناً) لما ان النبی عليه السلام جعل ذٰلک علامة التكذيب و الانكار۔[1]

ترجمہ: اگر کوئی شخص نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لائی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق کرتا ہے اور اُن کا اقرار کرتا ہے اور اُن پر عمل بھی کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اختیار سے زنّار (ٹائی) باندھتا ہے اور اپنے اختیار سے بُت کو سجدہ کرتا ہے تو ہم اس کو (ظاہراً و باطناً) کافر قرار دیں گے کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان چیزوں کو تکذیب وانکار کی علامت قرار دیا ہے۔

---

[1] (شرح العقائد النسفيه، ص ۱۵۷، طبع مكتبة العلم كانسی روڈ، کوئٹه)

[میں نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ اگر اپنے مولائے پاک کی جناب کی بات زبان پر لاؤں تو وہ میرا محض کذب وافتراء ہو گا۔ اس کی جنابِ کبریائی اس سے بلند تر ہے کہ میرے جیسے بیہودہ گو کی زبان اس کے لائق ہو۔ مثل رکھنے والی شے (ممکن) بے مثل ذات کے متعلق کیا کہہ سکتی ہے۔ اور حادث قدیم کو کیا تلاش کر سکتا ہے، اور مکانی شے لامکانی ذات تک کب تک دوڑ سکتی ہے۔ بیچارے کے پاس اپنے سے باہر کوئی شے نہیں اور اپنی بساط سے اوپر اس کا گزر نہیں ہو سکتا۔

ذرہ گر بس نیک ور بس بد بود ! گرچہ عمرے تگ زند در خود بود

ترجمہ: ذرہ کتنا ہی اچھا یا کتنا ہی بُرا ہو، ساری عمر دوڑتا رہے تو اپنی بساط کے اندر ہی رہے گا۔

یہ معنی بھی سیر اَنفسی میں جو نہایت پر جا میسر آتی ہے، میسر ہے۔ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے "اہل اللہ فنا اور بقا کے بعد جو دیکھتے ہیں اپنے اندر دیکھتے ہیں" اور جو کچھ پہچانتے ہیں اپنے اندر ہی پہچانتے ہیں۔ ان کی حیرت اپنے وجود میں ہی ہوتی ہے۔

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (الذاریات ۲۱)

ترجمہ: اور خود تم میں تو کیا تمہیں سوجھتا نہیں۔

اس سے قبل جو بھی ہے وہ سیر آفاقی میں داخل ہے کہ اس کا حاصل و نتیجہ بے حاصل ہے۔ بے حاصلی کے لفظ کا اطلاق اصل مطلوب کے حصول کی نسبت سے ہے۔ ورنہ وہ بھی شرائط معدات (آمادہ کرنے والی اشیاء) میں سے ہے۔

شہود اَنفسی سے کوئی وہم میں نہ پڑے، اور اسے شہود تجلی صوری کی مانند جو متجلی لہٗ (جس پر تجلی پڑے) کی ذات میں ہوتی ہے خیال نہ کرے۔ حاشا وکلاً تجلی صوری جس قسم کی بھی ہو سیر آفاقی میں داخل ہے۔ اور اس کا حصول علم الیقین کے مرتبہ میں ہے۔ اور حق الیقین کا مرتبہ شہود انفسی میں

داخل ہے جو مراتبِ کمال کی نہایت ہے۔ اور لفظ شہود کا اطلاق و استعمال میدانِ عبارت کی تنگی کے باعث ہے۔ ورنہ جس طرح ان کا مطلوب و مقصود بے مثل و بے نمونہ ہے۔ اس کا مطلب سے ان کی نسبت بھی بے مثل و بے نمونہ ہے۔ چوں (ممکن) کے لئے بے چون کی طرف کوئی راہ نہیں۔

اتصالے بے تکیف و بے قیاس

ہست ربّ الناس را باجان ناس

لیک گفتم ناس را نسناس نہ

ناس غیر از جانِ جاں اشناس نہ

ترجمہ: لوگوں کے رب کا لوگوں کے ساتھ بے کیف اور عقل و قیاس میں نہ آنے والا اتصال و تعلق ہے۔ لیکن میں نے "لوگوں" کے ساتھ اتصال کا ذکر کیا ہے، حیوان کے ساتھ نہیں۔ ناس یعنی کاملین و عارفین اور واصلین تو صرف جانِ جاں (محبوبِ حقیقی) کے ساتھ ہی آشنائی رکھتے ہیں۔

شہودِ صوری کے ساتھ شہودِ انفسی کے اتحاد کے وہم کا منشاہر دو مقام میں شخص کے بقا کا حصول ہے۔ کیونکہ تجلی صوری متجلیٰ لہٗ (جس پر تجلی پڑے) کو فنا نہیں کرتی۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ قیود کو اٹھا دیتی ہے، لیکن فنا کی حد تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس لئے سالک کا بقیہ وجود اس تجلی میں موجود رہتا ہے۔ اس کے برعکس سیر اَنفسی فنا اَتم اور بقائے اکمل کے بعد ہے۔ تو اس بنا پر قلت معرفت کی وجہ سے ان دو قسم کی بقا میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کو ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگر یہ جان لیں کہ بقائے ثانی جسے بقاباللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے وجود کو حق تعالیٰ کا عطا کردہ وجود کہتے ہیں۔ تو شاید اس وہم سے نجات پا جائیں۔

یہاں کوئی شخص یہ سوال نہ کرے کہ بقا باللہ تو اپنے آپ کو حق تعالیٰ و تقدس کا عین دیکھنا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ معنی اس قوم (صوفیہ) کی بعض عبارات سے سمجھے جاتے ہیں تو ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ بقا جذبہ کے مقام میں بعض کو فنا اور نیست ہونے کے بعد (جو فنائے اَتم کے مشابہ ہے) حاصل ہوتی ہے۔ اکابرِ نقشبندیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم اسے وجودِ عدم سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ فنا سے پہلے ہے، اس کا زوال متصور ہے۔ بلکہ واقع بھی ہے کبھی تو اس سے لے لیتے ہیں اور کبھی واپس دے دیتے ہیں لیکن وہ بقا جو اَتم واَکمل ہے، وہ زوال اور خلل سے محفوظ ہے۔ ان اکابر کی فنا دائمی ہے۔ عین بقا میں فانی ہیں اور عین فنا میں باقی۔ وہ فنا و بقا جو زوال پزیر ہیں احوال و تلوینات کے قبیلہ سے ہیں، اور جس میں ہم بحث کر رہے ہیں وہ اس طرح نہیں۔]

تشریح

پچھلے مکاتیب میں فنا و بقا پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ فنا و بقا صرف وقتی حالات و واقعات کا نام نہیں بلکہ ان کے ساتھ کچھ صفات و اخلاق کا پایا جانا ضروری ہے۔ فنائے صوری (جسے ابتدائی فنا کہتے ہیں) میں سالک سے بُرے اخلاق دور ہو جاتے ہیں، لیکن تجلیات کا اثر جونہی سالک سے ختم ہوتا ہے وہ پھر ان اخلاقِ رذیلہ کی طرف مُڑ جاتا ہے لیکن جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل سے سالک فنائے اَتم سے مشرف ہوتا ہے تو اُس کے نفس کا مکمل تزکیہ ہو جاتا ہے اور ردی اخلاق و کردار ہمیشہ کے لئے سالک سے معدوم ہو جاتا ہے۔ اب اس کا اخلاق عین سنتِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا نمونہ بن جاتا ہے اور اس کے اوصاف حمیدہ ہو جاتے ہیں لیکن اُس کا بدن صحیح سالم رہتا ہے۔ تصوف سے نابلد لوگ کہتے ہیں کہ ایسے سالک کا نفس مَر جاتا ہے اور اُس کا بدن ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ بات غلط ہے۔ نہ تو نفس مرتا ہے اور نہ ہی بدن معدوم ہوتا ہے۔ بلکہ نفس کی

شیطانی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں اور بدن موجود رہتا ہے۔یہی سالک بقا پر مشرف ہوتا ہے اور مرنے کے بعد قبر میں بھی صحیح سالم باقی رہتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے اس مکتوب میں من جملہ دیگر امور کے شہود انفسی وآفاقی کا فرق بیان فرمایاہے۔

شہود آفاقی وانفسی کا فرق

ابتدائی کلمات میں آپ نے فرما کر کہ "بندہ اپنے سے باہر کی کچھ خبر نہیں رکھتا" اپنے مرتبۂ شہود انفسی کی خبر دی ہے، اور یہ مرتبہ شہودِ آفاقی سے بہت بلند ہے۔ شہودِ آفاقی کو آپ نے بے حاصلی قرار دے کر اس کی وضاحت یوں فرمادی ہے کہ اگرچہ شہودِ آفاقی سلوک کا ایک مرتبہ ہے لیکن اصل مطلوب شہودِ انفسی ہے، لہٰذا اصل کی نسبت سے یہ مرتبہ بے حاصلی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ ورنہ یہ مرتبہ بھی علم الیقین کے قبیل سے ہونے کی بناء پر اصل کی شرائط اور اس کی طرف آمادہ کرنے والے امور میں سے ہے، جبکہ شہودِ انفسی حق الیقین کے مرتبہ میں ہے۔ واضح ہو کہ سیر آفاقی میں تعلقاتِ آفاقی سے انقطاع ہوتا ہے جبکہ سیر انفسی میں اصلاحِ نفس اور تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔

مطلوب آفاق اور انفس سے وراء ہے

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے شہودِ انفسی کی معرفت کو سلوک کا ایک اعلیٰ مقام قرار دے کر حضرت شاہِ نقشبند بخاری قدس سرہٗ کے اس قول سے مؤید فرمایاہے کہ "اہل اللہ فنا وبقا کے بعد جو کچھ دیکھتے اور جو کچھ پہچانتے ہیں، اپنی ذات میں ہی دیکھتے اور پہچانتے ہیں" لیکن واضح ہو کہ حضرت خواجۂ

بزرگ اور حضرت امام ربانی قدس سرہما کے یہ دونوں فرمان ان کے ابتدائی معارف میں سے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بعد ان کے دیگر اقوال اس سے بھی بلند معرفت پر مشتمل نظر آتے ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا "مطلوب ماورائے آفاق و انفس است" یعنی مطلوب آفاق اور انفس سے آگے ہے، اور نیز فرمایا: "فَهُوَ سُبْحَانَهُ وَرَاءَ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءَ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءَ الْوَرَاءِ"۔[1] اور حضرت خواجہ بزرگ نے ارشاد فرمایا "ہر چہ دیدہ شد و شنیدہ شد و دانستہ شد آن ہمہ غیر است"[2] یعنی جو کچھ دیکھا گیا اور جو کچھ سنا گیا وہ سب غیر ہے اور یہی معرفت حقیقت اور شریعت کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ شہودِ آفاق و انفس ظلال کے ساتھ مربوط ہے اور آفاق و انفس اصل کے درک و وصل کی لیاقت نہیں رکھتے۔ پس لا محالہ وہ سیر جو سالک کو آفاق و انفس کی سیر کے بعد میسر آتی ہے، اس سیر کا تعلق ظلال کی بجائے اصل کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کو سیر اقربیت کہا جاتا ہے جس کا مدلول آیتِ قرآنی وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق ١٦) ہے جہاں مطلوب لباس، وہم و خیال سے منزہ مشہود ہوتا ہے اور یہ مرتبہ وصلِ عریانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عارفِ رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

من شوم عریاں ز تن او از خیال ‏ ‏ ‏ ‏ تا خرامم در نہایات الوصال

اور اسی معرفت کو عارف کھڑی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یوں بیان فرمایا ہے:

جے محبوب پیارا اک دن وسے نال اساڈے ‏ ‏ ‏ ‏ جاناں میں ہُما پکھیر و وچھا تا جال اساڈے

[1] (دفتر دوم، مکتوب نمبر ۱)

[2] (دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۷۲)

اسی معرفت کو حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے یوں بیان فرمایا:

"ہر چہ در مرایائے آفاق و انفس ظاہر شود بداغِ ظلیت متسم است پس سزاوار نفی بود تا اثباتِ اصل نمودہ آید و چون معاملہ از آفاق و انفس گذشت از قید ظلیت رست۔۔۔۔منتہیان دائرہ ظل را تجلیٔ برقی کہ ناشی از مرتبۂ اصل است میسر است کہ یک ساعت از قیدِ آفاق و انفس وار ہاند و جمعے کہ از دائرہ آفاق و انفس در گذشتند واز ظل باصل پیوستند این تجلی برقی در حقِ ایشان دائمی است"۔[1]

ترجمہ: جو کچھ آفاق وانفس کے آئینوں میں ظاہر ہوتا ہے ظلیت کے داغ سے داغدار ہے پس لازماً نفی کے لائق ہے تاکہ اصل کا اثبات واضح ہو جائے اور جب معاملہ آفاق وانفس سے گزر کر ظلیت کی قید سے خلاصی پالیتا ہے۔۔۔۔تو منتہی سالکوں کو جو دائرۂ ظل سے نجات پاچکے ہیں تجلی برقی میسر آتی ہے جو مرتبۂ اصل سے تعلق رکھتی ہے اور ایک ساعت کے لئے سالک کو (برق کی طرح) آفاق وانفس سے رہائی دلاتی ہے اور وہ حضرات (نقشبندیہ) جو دائرۂ آفاق وانفس سے گزر کر ظل سے اصل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں یہ تجلی برقی ان کے لئے دائمی ہو جاتی ہے۔

حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"ونزد حضرت ایشاں ما قدسنا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بسرہٖ یافت مطلوب بیرون آفاق وانفس است او تعالیٰ را چنانچہ در مرایائے آفاق گنجائش نیست در مراتِ انفس نیز گنجائے نہ"۔[2]

---

[1] (دفتر دوم مکتوب نمبر ۳)

[2] (مکتوباتِ معصومیہ سوم، مکتوب نمبر ۷۴)

ترجمہ: ہمارے حضرت ایشاں (امام ربانی قدس سرہٗ) کے نزدیک مطلوب کی یافت آفاق وانفس سے باہر ہے۔ ذاتِ حق تعالیٰ کے لئے جس طرح آفاق کے آئینوں میں گنجائش نہیں اسی طرح انفس کے آئینوں میں بھی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جب سالک پر عالمِ قدس کی تجلیات وارد ہوتی ہیں تو مبتدی سالکین حقیقتِ تجلیات سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات وہم یا غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جیسا کہ بعض سالکین نے شہودِ صوری کو شہودِ انفسی سمجھ لیا اور معرفت کی کمی کے باعث مجبوراً اتحاد کی باتیں کرنے لگے حالانکہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تجلی صوری سالک کو فنائے حقیقی سے پہلے حاصل ہوتی ہے جبکہ شہودِ انفسی عارف کو فنائے حقیقی کے بعد میسر آتا ہے۔ لیکن یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ تجلی صوری اور شہودِ انفسی دونوں سالک وعارف پر بقا کے وقت میں وارد ہوتی ہیں۔ یعنی تجلی صوری کا شہود وجودِ بشری کی بقا کے وقت ہوتا ہے اور شہودِ انفسی وجودِ موہوبی کی بقا کے وقت میسر آتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بعض سالکین ان دو بقا کا فرق نہ سمجھنے کی بناء پر شہودِ صوری کو بھی شہودِ انفسی کا درجہ دینے لگتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ بقا کی دو قسمیں ہیں ایک بقا قبل الفناء اور ایک بقا بعد الفناء جو بقا قبل از فنا ہے اس بقا سے مراد سالک کے وجودِ بشری کی بقا ہے اور جو بقا بعد از فنا ہے اس بقا سے مراد عارف کے وجود موہوبی کی بقا ہے جس کو بقا باللہ اور تخلق باخلاق اللہ کا نام دیا جاتا ہے۔

بینہ نمبر ا

واضح ہو کہ عالمِ قدس کی تجلیات سالک کے وجود کو فنا کرنے والی ہوتی ہیں۔ لیکن تجلی صوری کی یہ شان نہیں اور وہ سالک کو مرتبۂ فنا تک نہیں پہنچا سکتی، البتہ بعض کدوراتِ بشریہ مثلاً حسد، طمع،

تکبر اور غیبت وغیرہا کا ازالہ ضرور کرتی ہے۔ جبکہ دیگر بعض تجلیات بلا کیف، وجودِ بشریت کو فانی کر دیتی ہیں۔

بینہ نمبر ۲

سالکین پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ اپنے مشہودِ قلبی وانفسی کو شہودِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ گمان کر بیٹھتے ہیں اور یہ توحید کا ابتدائی مرتبہ ہے حقیقی توحید اس سے بلند تر ہے لیکن اس مرتبے کی دلیل وہ حدیث قُدسی ہے جس میں اللہ رب العزت نے فرمایا:

لَمْ یَسَعْنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَسِعَنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ۔[1]

میں زمینوں اور آسمانوں میں نہیں سما سکتا، لیکن بندۂ مومن کے دل میں سما سکتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان شہودِ حق کی قابلیت وگنجائش ہرگز نہیں رکھتے۔ لیکن بندۂ مؤمن کا دل جو کہ حقیقتِ جامعہ ہے ایک قسم کی بے چون قابلیت اور بے کیف گنجائش رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ گنجائش، حالیّت، محلیّت، ظرفیّت اور مظروفیّت سے مبرا ہے۔ اس امر کو سمجھنے کے لئے آئینہ اور عینک کی مثال پیش نظر رہنی چاہیئے۔ جیسے کہ آئینے اور عینک میں بغیر حالیت وظرفیت کے صورتیں مشہود ہوئی ہیں اسی طرح قلبِ عارف کو آئینے یا عینک کی مثل سمجھ لیا جائے تو یہ مسئلہ قریب الفہم ہے۔(واللہ اعلم)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۷۰۶ تا ۷۱۱)

[حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ وجودِ عدم وجودِ بشریت کی طرف لوٹ آتا ہے، لیکن وجودِ فنا (اَتم) وجودِ بشریت کی طرف عود نہیں کرتا۔ لہٰذا ان کا وقت دائمی

---

[1] (احیاء العلوم، ج۳، ص ۱۶، اتحاف السادۃ، ج۷، ص ۲۳۴)

اور ان کا حال سرمدی (ہمیشہ) ہے۔ ان کا کوئی مخصوص وقت اور حال نہیں۔ ان کا کام تو وقت مقرر کرنے والے (حق تعالیٰ) کے ساتھ خاص ہے۔ اور جو حال اور وقت سے گزر چکا ہے وہ زوال سے محفوظ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۔ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ دوام وقت کا اطلاق واستعمال اس وقت کے اثر یعنی تعین وغیرہ کی بقا کے اعتبار سے ہے۔ یہ بات نہیں۔ بلکہ دوام عین وقت کی وجہ سے ہے۔ اور استمرارِ نفس حال کی وجہ سے ظن، حق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ بعض ظن گناہ ہیں۔]

تشریح

فنائے اتم واکمل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا عظیم فضل ہے اور جس شخص پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنا فضل فرما دے اس سے یہ فضل کوئی طاقت چھین نہیں سکتی لیکن یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ایسے شخص میں وہ صفات ہیں جو فانی وباقی سالک میں ہونی چاہئیں۔ جھوٹ، غیبت، دھوکہ بازی، حرام خوری، غرور و تکبر، شہوتِ شیطانی اور دُنیا کی لالچ یہ وہ صفات ہیں جنہیں فنا کی تلوار نیست ونابود کر دیتی ہے۔ پھر ایسا شخص نامحرم عورت کی نہ تو خواہش کرتا ہے نہ اُس کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ تو کیا ان غیر محرم عورتوں کے لئے تعویذ گنڈے کرنا اور اُن کے جسم پر تھپکی دینا یا اُن سے مصافحہ کرنا ایک فانی شخص کا کردار ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

وجودِ عدم اور وجودِ فنا

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز نے اس مضمون میں ایک سوال کا جواب ارشاد فرمایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بعض سالک حضرات کی عبارتوں میں ہے کہ بقاباللہ کے مرتبے میں سالک اپنے آپ

کو عین حق تعالیٰ معلوم کرتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ تو آپ نے اس کا جواب یوں ارشاد فرمایا ہے کہ سالک کو یہ وہم فقط مقامِ جذبہ ٔبدایت میں استہلال و اضمحلال (استغراق و نیستی) کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا سالک اس وقت یہ گمان کرلیتا ہے کہ میری ذات عین ذاتِ حق تعالیٰ ہے، لیکن یہ حالت دوام پذیر نہیں ہوتی بلکہ زوال پذیر ہوتی ہے یعنی سالک پر عالمِ وجوب کی تجلیات کبھی اس کو معدوم کا نشان دیتی ہیں اور کبھی موجود کا پتہ دیتی رہتی ہیں۔ تجلی کے وقت وہ اپنے وجودِ بشری کو معدوم پاتا ہے اور انقطاعِ تجلی کے وقت اس کا وجودِ بشری پھر عود کر آتا ہے کیونکہ وہ ابھی تک فنائے حقیقی سے مشرف نہیں ہوا۔ اکابرین نقشبندیہ علیہم الرحمۃ سالک کی اس حالت کو وجودِ عدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی سالک اپنی عدمیت کا مشاہدہ کرلیتا ہے اور یہ حالت فنائے حقیقی سے پہلے میسر آتی ہے۔ کبھی اس سے یہ حالت لے لیتے ہیں اور کبھی دے دیتے ہیں اور وہ بقا جو فنائے حقیقی کے بعد حاصل ہوتی ہے ہر قسم کے زوال اور خلل سے محفوظ ہوتی ہے، اس کو وجودِ فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وجودِ عدم کی مثال اس لوہے کی سی ہے جو آگ کی بھٹی میں جاکر آگ بن جاتا ہے لیکن سرد ہونے کے بعد پھر وہی لوہے کا لوہا ہے اور وجودِ فنا کی مثال اس تانبے کی سی ہے جو کیمیا گری کے عمل سے سونا بن جاتا ہے لیکن پھر دوبارہ تانبا نہیں بن سکتا۔ سونا ہی رہتا ہے پس ان بزرگانِ نقشبندیہ علیہم الرحمۃ کی فنا و بقا دائمی ہے۔ یہ حضرات عین بقا میں فانی اور عینِ فنا میں باقی ہوتے ہیں اور جو فنا و بقا زوال پزیر ہیں وہ احوال و تلوینات میں سے ہیں ان کی فنا و بقا دوام پزیر ہے۔ ان کے احوال سرمدی ہیں بلکہ یہ ابو الوقت ہیں ان کے لئے نہ وقت ہے نہ حال۔ ان کا معاملہ وقتوں کے پیدا کرنے والے اور احوال کے پھیرنے والے کے ساتھ ہے۔ تجلی کا زائل ہونا وقت اور حال کے ساتھ مخصوص ہے اور جو لوگ وقت و حال سے گزر چکے ہوں وہ زوال سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

جیسا کہ حضرت خواجہ نقشبند اویسی بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ:

"وجودِ عدم وجودِ بشریت کی طرف عود کرتا ہے، لیکن وجودِ فناوجودِ بشریت کی طرف عود نہیں کرتا"۔[1]

حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

"عدم جو اس سلسلہ کی عبارتوں میں آتا ہے اس سے مراد اس اسم الٰہی کی ہستی کا ورود ہے جو کہ عارف کا مبدأ تعین ہے اور کسی پردے کے پیچھے سے جذب و محبت کے راستے سے مدرکہ سالک پر وارد ہوتا ہے جس کے پہلو میں سالک کی ہستی چھپ جاتی ہے اور سالک اپنے آپ کو اور اپنے اوصاف کو گم کر دیتا ہے اور نہیں پاتا اور وجودِ عدم سے مراد اس ہستی کا ثابت ہونا ہے وہ وجود و بقا جو عدم پر مرتب ہوتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ وجودِ عدم سے مراد حالتِ عدمیہ کا متحقق ہونا ہے یعنی سالک کے اندر صفتِ عدم کا پیدا ہو جانا مراد ہے اور یہ عدم اور وجود عدم بمعنی اول جہتِ جذبہ میں فنا و بقا ہے۔ اس ظہور کو دوام نہیں پس جو فنا و بقا اس پر مرتب ہو گی وہ بھی دائمی نہیں ہو گی اور وجودِ بشریت کی طرف عود کرنے سے محفوظ نہیں ہو گی۔ جب تک وہ ظہور واقع ہے اس وقت تک سالک کی ہستی چھپی ہوئی ہے اور جب وہ ظہور پوشیدہ ہو جائے گا وجودِ بشریت عود کر آئے گا۔[2]

بینہ نمبر ۳

جذبہ بدایت میں سالک پر ایسی حالتِ عدمیہ کا طاری ہونا جو دوام پذیر نہ ہو وجودِ عدم کہلاتا ہے۔

---

1 (شرح مکتوبات قدسی آیات)

2 (ماخوذ از مکتوباتِ معصومیہ مترجم)

بینہ نمبر ۴

جذبہ نہایت میں عارف کا ایسی بقا سے مشرف ہونا جو فنائے حقیقی پر مرتب ہو اور دوسری ولادت میں وجود ہو موہوبِ حقانی کے ساتھ موجود ہو، وجودِ فنا کہلاتا ہے۔ اس فنا و بقا کو دوام لازمی ہے اور وجودِ بشریت کی طرف عود سے محفوظ ہے۔[1]

بینہ نمبر ۵

حق تعالیٰ کی ہستی کا عارف کی ذات پر اس قدر غلبہ ہو جانا کہ عارف تمام تعلقات سے خالی ہو کر وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل ۸) کا نمونہ بن جائے فنائے حقیقی کہلاتا ہے اور یہی اخلاص کا مرتبہ ہے۔[2]

[بات لمبی ہو گئی ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کی فضائے قدس میں مجال سُخن نہیں تو ہمیں اپنے مقام بندگی اور ذلت وانکسار کی بات کرنی چاہیئے۔

پیدائش انسان سے مقصود وظائف بندگی کا ادا کرنا ہے۔ اور اگر ابتداء اور درمیان راہ میں عشق ومحبت عطا کر دیا گیا ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ بندہ جناب قدس جل سلطانہٗ کے ماسوا سے ہر طرح کا تعلق قطع کر لے۔ عشق ومحبت بھی مقاصد میں سے نہیں ہیں بلکہ عبودیت کے مقام کے حصول کے لئے ہیں۔ انسان خدا تعالیٰ کا بندہ اس وقت کہلانے کا مستحق ہوتا ہے جب غرض کی بندگی وگرفتاری سے پوری طرح نجات پا جائے۔ اور عشق ومحبت کی حیثیت قطع تعلقات ماسوا سے زیادہ نہیں۔ لہٰذا مراتب ولایت کی انتہاء مقامِ عبدیت ہے۔ ولایت کے درجات میں مقامِ عبدیت سے اوپر کوئی مقام نہیں۔ بندہ اس مقام پر پہنچ کر اپنے مولیٰ تعالیٰ کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں پاتا سوائے اس

---

[1] (مکتوبات معصومیہ)

[2] (عامہ کتبِ تصوف)

کے کہ وہ اپنے آپ کو اس کا محتاج پاتا ہے۔ اور واجب تعالیٰ وتقدس کی جانب سے ذات اور صفت کے لحاظ سے مکمل استغناء ہوتا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہوتی کہ اپنی ذات کی اس سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ اور اپنی صفات کی اس ذات عز سلطانہٗ کی صفات کے ساتھ اور اپنے افعال کی اس حق سبحانہٗ کے افعال کے ساتھ کسی وجہ کی مناسبت محسوس کرتا ہے۔ ظلیت کا اطلاق بھی مناسبات میں سے ہے۔ وہ اس سے بھی منزہ ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس سبحانہٗ وتعالیٰ کو خالق اور اپنے آپ کو مخلوق جانتے ہیں، اس سے زیادہ کسی طرح کی جرأت نہیں کرتے۔]

تشریح

سالک کا مقصود و مطلوب صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ ہے عشق مقصود نہیں بلکہ یہ صرف راستے کی آسانی کے لئے ہے۔ جب تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ عشق و محبت نہ ہوگی۔ تب تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات پر عمل نہیں ہوسکے گا اور جب عمل نہیں ہوگا تو وصول نہ ہوگا۔ کیونکہ محبت ہی وہ چیز ہے جو کسی کی تقلید و پیروی پر مجبور کرتی ہے لیکن اسے مقصود قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر کسی شخص نے مکان کی چھت پر جانا ہو تو وہ وہاں تک پہنچنے کے لئے سیڑھی کو استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا مقصود چھت ہوتی ہے نہ کہ سیڑھی۔ اگر وہ سیڑھی کے ساتھ ہی چمٹ کر بیٹھ جائے تو چھت پر نہیں پہنچ سکے گا۔ پس ثابت ہوا کہ جس طرح سیڑھی، چھت پر پہنچنے کے عمل میں مُمد و معاون ہے نہ کہ مقصد یوں ہی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محبت بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ وصل ہونے میں معاون ہے نہ کہ عین مقصود۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ارشادِ خداوندی کے مطابق انسان کی تخلیق سے مقصود بندگی وعبادت کے معمولات بجالانا ہے اور صوفیاء نے جو عشق اور محبت کو بنیاد قرار دیا ہے وہ مبادی اور وسائط کے اعتبار سے ہے نہ کہ مقاصد کے اعتبار سے۔ محبت اور عشق تو صرف ماسویٰ اللہ کی گرفتاری سے آزاد ہونے کا وسیلہ ہے۔ اصل مقصود تو صرف عبادت اور معرفتِ الٰہیہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات ۵۶) لہٰذا امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک توحید وجودی عشق و محبت کے غلبے کا نتیجہ ہے جب کہ توحیدِ شہودی عبادت اور معرفت کا ثمرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توحیدِ وجودی سالک کو ابتداء میں اور درمیان میں پیش آتی ہے جبکہ توحید شہودی عارف کو آخر میں مشہود ہوتی ہے۔ جیسا کہ شبِ معراج میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم قرب کے آخری مرتبے پر فائز ہو کر بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں بِنِسْبَتِيْ اِلَيْکَ بِالْعُبُوْدِيَّةِ[1] کا ہی تقاضا کرتے رہے یعنی اے اللہ مجھے مقامِ عبدیت میں ہی قرار عطا فرما۔

مقامِ عبدیت

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ العزیز کے نزدیک ولایت کے مراتب میں آخری مرتبہ "مقامِ عبدیت" ہے اور اسی مقام کو آپ وحدت الشہود کا نام بھی دیتے ہیں۔ آپ نے نظریہ وحدت الشہود پیش کر کے نظریہ وحدت الوجود کی تغلیط یا تردید نہیں فرمائی بلکہ تصور وحدت الوجود سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں اور خالق و مخلوق کے درمیان اتحاد و حلول کے تمام شبہات کو دور فرما کر یہ سمجھا دیا کہ توحیدِ وجودی صوفیاء کا ایک حال ہے۔ لیکن یہ آخری حال نہیں اس کو مقامِ عبور سمجھنا چاہیئے نہ

---

[1] (زرقانی علی المواھب، ج۶، ص۱۰۵)

کہ مقامِ قرار۔۔۔۔ اور جن بزرگوں نے اس حال کی باتیں فرمائی ہیں وہ اسی حال میں ہمیشہ نہ رہے تھے بلکہ اکثر مشائخ اس حال سے ترقی کر کے مقامِ عبدیت سے مشرف ہوتے رہے ہیں۔ وَبِاللهِ التَّوْفِيق کیونکہ توحیدِ وجودی مقامِ وجودیت ہے اور اس سے آگے مقامِ ظلیت ہے اور پھر سب سے بڑھ کر مقامِ عبدیت ہے وَهٰذَاهُوَ الْمُرَادُ۔

مقامِ عبدیت میں سالک اور عارف اپنی ذات کو بندہ اور مخلوق سمجھتا اور دیکھتا ہے اور اپنی ذات وصفات کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں دیتا اور نہ ہی اپنے آپ کو ذاتِ خدا کا ظل (سایہ) قرار دیتا ہے اور نہ ہی اپنے افعال کو عین افعالِ باری تصور کرتا ہے۔ جبکہ مقامِ عبدیت کے علاوہ بعض دوسرے مقامات میں سالک کو اس قسم کی کئی پیچیدگیاں اور غلط فہمیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور اگلا مقام منکشف ہونے پر پچھلے مقامات سے توبہ کرتے رہتے ہیں۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۷۱۴ تا ۷۱۶)

[توحیدِ فعلی جو بعض بزرگوں کو راستے میں حاصل ہوتی ہے، حق تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی کو فاعل نہیں جانتے۔ نقشبندی سلسلہ کے بزرگ تو جانتے ہیں کہ افعال کا خالق ایک ہی ہے۔ ہاں وہ ان افعال کا کاسب ومباشر نہیں۔ کیونکہ یہ قول بھی زندقہ اور الحاد کے قریب پہنچا دیتا ہے۔

ہم اسے ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شعبدہ باز پردہ کے پیچھے بیٹھ کر پتھر کی چند صورتوں کو حرکت دے اور عجیب وغریب قسم کے افعال ان میں ایجاد کر دے۔ دور بین لوگ جان لیں گے کہ ان جمادی صورتوں کے افعال کا موجد وہ پردہ نشین شخص ہے لیکن صورتوں کے افعال کی کاسب خود وہ صورتیں ہیں، لہٰذا کہتے ہیں کہ صورت متحرک ہے، یہ نہیں کہتے کہ وہ شعبدہ باز متحرک ہے۔]

تشریح

بندے کے افعال کا خالق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہے لیکن ان کا کاسب بندہ خود ہے۔ یعنی فعل کرنا بندے کا کام ہے، اس فعل کا ذمہ دار اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ٹھہرانا مناسب نہیں۔ کیونکہ اگر یوں کہے گا کہ میرے گناہ کرنے کا ذمہ دار اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہے میں نہیں تو اس قول سے ملحد اور زندیق ہو گا۔ اس لئے ایسی جہالت سے بچنا چاہیئے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ بعض صوفیاء نے خالق اور بندہ کے درمیان جو وحدتِ فعل کا حکم کیا ہے یہ اُن کا سکریہ کلام ہے۔ حق یہ ہے کہ افعال کا خالق ایک ہے اور فاعل متعدد ہیں آپ فرماتے ہیں کہ صریح حق وہی ہے جو علمائے اہلِ سنت وجماعت کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے۔ سابقہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شریعتیں بھی اسی حکم کو ثابت کرتی ہیں۔ شریعتِ محمدیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم بھی اسی امر کی مؤید ہے اس کے علاوہ زندقہ والحاد ہے یا سُکرِ وقت اور غلبۂ حال ہے اور یہ تمام مطابقت مقامِ عبدیت میں حاصل ہوتی ہے، مقامِ عبدیت میں توحیدِ فعلی ساقط ہو جاتی ہے اور استدلالی علوم کشفی ہو جاتے ہیں۔

توحیدِ فعلی

سالک مبتدی کے لئے اثنائے راہ سلوک میں ذوق اور جذبہ بڑھانے کے لئے حق تعالیٰ عالمِ مثال کی کسی نہ کسی شان میں اپنی تجلیاتِ حسیہ ظاہر فرماتے رہتے ہیں۔ اصطلاح صوفیاء میں اس ظہور کو تانیس کا نام بھی دیا جاتا ہے اور اس قسم کی تجلیات کو تجلیاتِ افعالیہ کہا جاتا ہے ان تجلیات کا سالک پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو شراب کا شراب پینے والے پر ہوتا ہے۔ اسی تجلی میں سالک صفاتِ فعلیہ

میں سے کسی صفت کے ساتھ حق تعالیٰ کو متجلی پاتا ہے اس وقت سالک اپنا فعل، حول اور ارادہ سلب پاتا ہے اور وہ ہر چیز میں اللہ کی قدرت اور اس کے افعال کو جاری وساری پاتا ہے اور یہ سب کچھ غلبہٗ حال اور سُکرِ وقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالقِ افعال ہے اور بندہ فاعلِ افعال ہے۔ اس کو آپ ایک مثال کے ذریعے واضح فرماتے ہیں اور وہ یہ کہ مثلاً کوئی شعبدہ باز پردے کے پیچھے بیٹھ کر چند بے جان صورتوں اور مورتیوں کو حرکت دے کر ان میں عجیب وغریب حرکات اور افعال صدور میں لاتا ہے، باریک بین لوگ تو جان لیتے ہیں ان افعال کا صادر وخالق تو پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے اور ان افعال کو اختیار کرنے والی وہ صورتیں ہیں جو پردے سے باہر موجود ہیں اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ صورت متحرک ہے اور یہ نہیں کہتے کہ شعبدہ باز متحرک ہے۔ **فافھم**۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۱، ص ۷۱۶، ۷۱۷)

[فی الواقع اس حکم میں وہ سچے ہیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شریعتیں بھی یہی کہتی ہیں۔ وحدتِ فعل کا حکم لگانا سُکریات میں سے ہے۔ حق صریح یہ ہے کہ فاعل متعدد ہیں اور خالق افعال صرف ایک ذات ہے۔ اسی قسم کا کلام لوگوں نے توحید وجودی کے بیان میں بھی کیا ہے۔ اس کی بنیاد بھی سُکرِ وقت اور غلبہٗ حال ہے۔]

تشریح

وحدتِ فعل سے یہ مراد ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنا کہ میں جو کام کرتا ہوں وہی کام اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بھی کرتا ہے یعنی میں بھی نماز پڑھتا ہوں اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بھی نماز پڑھتا ہے، میں تلاوتِ قرآن کرتا ہوں اور تلاوتِ قرآن کا یہ فعل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بھی کرتا ہے۔

ایسی بات اگر کوئی سُکر والا سالک کہے تو گنجائش ہے لیکن صحو والے صوفی کا ایسا قول خلافِ شریعت وخلافِ طریقت ہے۔

[علومِ لدنیہ کی درستی وصحت کی علامت یہ ہے کہ وہ علومِ شرعیہ کے ساتھ صریح مطابقت وموافقت رکھتے ہوں۔ اس سے اگر بال برابر بھی تجاوز ہے تو وہ سُکر کی وجہ سے ہے اور حق وہی ہے جو علمائے اہلِ سنت وجماعت نے کہا ہے۔ اس کے ماسوا یا زندقہ اور الحاد ہے اور یا سُکر وقت اور غلبۂ حال ہے۔ اور یہ مطابقت پوری طرح مقامِ عبدیت میں میسر آتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہ کچھ سُکر موجود رہتا ہے۔

گر بگوئم شرح ایں بے حد شود

ترجمہ: اگر میں اس کی شرح کروں تو بے حد ہو جائے۔]

تشریح

مکتوب نمبر ۲۵ میں عرض کیا جا چکا ہے کہ انسان کے ذمہ چودہ علوم کا حصول ضروری ہے۔ ان کے بعد پندرہواں علم وہبی ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ محض اپنے فضل سے عطا فرماتے ہیں اور اس علم کو علمِ لدنی کہا جاتا ہے۔ اس کی درستگی کی نشانی یہ ہے کہ اس کے تمام معارف اور دقائق شریعتِ غراۤ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے مطابق ہوں۔ اگر کسی جگہ شریعت سے مخالفت ظاہر ہو تو صوفی کو چاہیئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ واستغفار کرے اور اس کو زبان پر نہ لائے۔ جو لوگ شریعت اور طریقت کے الگ الگ ہونے کی بات کرتے ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے کشف میں غلطی لگی اور وہ غلطی کو بھانپ نہ سکے۔ نتیجتًا وہ شریعت کو الگ سمجھ بیٹھے اور طریقت کو الگ۔ اور اندھی تقلید کرنے والے خام صوفیوں نے اُن کی اس غلطی کو نشانِ راہ بنالیا۔ آج اکثر لوگ

کہہ دیتے ہیں کہ شریعت جدا چیز ہے اور طریقت جُدا امر ہے حالانکہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ شریعت سردار و آقا ہے اور طریقت اس کی خادم ہے اس لئے جو طریقت، شریعت کے مخالف ہے وہ سراسر مَردود اور قابلِ مذمت ہے۔ ہاں جس سالک کے علومِ لدنی شریعت کے مطابق ہوں اُسے اس بات پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور غرور و تکبر سے بچنا چاہیئے لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ علومِ لدنی کا شریعت کے علوم کے مطابق ہونا صرف مقامِ عبدیت میں ممکن ہے۔ اس سے نیچے کے مقامات میں سُکر کی کچھ نہ کچھ ملاوٹ رہتی ہے اور سُکر کے علوم اکثر اوقات شریعت کے مخالف ظاہر ہوتے ہیں۔

[ایک شخص نے حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس سے سوال کیا کہ سلوک سے کیا مقصود ہے؟ آپ نے جواب دیا تاکہ اجمالی معرفت تفصیل کے درجے کو پہنچ جائے۔ اور استدلالی معرفت کشف کے درجے کو پہنچ جائے۔ آپ نے یہ نہ فرمایا تاکہ معارفِ شرعیہ سے زائد کچھ حاصل کر لے۔ اگرچہ راہ میں علومِ شرعیہ سے زائد کچھ اُمور سامنے آتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو نہایت کام تک پہنچا دیں تو وہ تمام زائد اُمور بکھرے ہوئے ذرات کی طرح ختم ہو جاتے ہیں اور وہی معارفِ شرعیہ تفصیل کے رنگ میں علم و دانش میں باقی اور محفوظ رہتے ہیں۔ اور استدلال کے تنگ مقام سے نکل کر کشف کی فراخی اور کشادہ فضا میں آ جاتے ہیں۔ یعنی جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم ان علومِ شرعیہ کو وحی سے حاصل کرتے تھے، یہ بزرگوار انہی علوم کو الہام کے طریقہ سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ سے اخذ کرتے ہیں۔ علماء نے یہ علوم بطریق اجمال شرائع انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے اخذ کئے ہیں۔ وہی علوم جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو تفصیلاً اور کشفاً ہوئے تھے ان کو بھی اسی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن اصل اور تابع ہونے کی حیثیت درمیان میں موجود

ہے۔ اس قسم کے کمال کے لئے کاملین اولیاء کرام میں سے بعض کو بڑی صدیوں اور از منۂ دراز کے بعد منتخب کرتے ہیں۔ دل میں تھا کہ ایک اجمالی استدلالی مسئلہ کو مفصل لکھوں مگر کاغذ کم تھا۔ شاید خداوند جل سلطانہٗ کی حکمت اسی میں ہو۔ والسلام]

تشریح

شریعتِ حقہ اور اس کے علوم سردار اور آقا کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ طریقت و تصوف غلام اور تابع ہیں۔ پس وہی طریقت قابلِ قبول ہے جو شریعت کے مطابق اور اس کے تابع ہو اور جو طریقت اور احوالِ شریعت کے مخالف ہو یا وہ علم اور حالات جو شریعت کی مخالفت پر اُبھارتے ہوں یا شریعت سے دور کرتے ہوں وہ رد کرنے کے قابل ہیں اور قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ یہ علومِ شرعیہ ہی ہیں جو مکتوبات شریف کی تعلیمات کے مطابق سلوک کی نہایت تک پہنچنے کے بعد بھی سالک کے علم و دانش میں محفوظ رہتے ہیں اور زائل نہیں ہوتے۔ اس لئے اگر عوام یا ظاہر بین علماء ایسے علوم پر تنقید کریں تو اُن کی باتیں رد کرنی چاہئیں لیکن کیا کیا جائے آج کے دور میں بعض صوفیاء بھی لوگوں کو شریعت اور علومِ شریعت سے دور کر رہے ہیں ایسے لوگوں کا مرض متعدی ہے اور ان کا فتنہ زہرِ قاتل ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ انہیں ہدایت نصیب کرے، آمین۔

مکتوب نمبر ۳۱

[توحیدِ وجودی کی حقیقت کے ظہور اور خدا تعالیٰ وتقدس کے قُرب اور معیت ذاتی اور اس مقام سے آگے گزر جانے اور بعض سوالات وجوابات کے بیان میں جو اس مقام کی تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیخ صوفی کو لکھا:

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہٖ وعلیہم وعلیٰ الہم من الصلوات افضلہا ومن التسلیمات اکملہا کی متابعت پر قائم وثابت رکھے۔

وہ شخص جو آپ کی مجلس میں تھا اس نے بتایا ہے کہ میاں شیخ نظام تھانیسری کے کسی درویش نے اس مجلس میں میرا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ (مجدد صاحب) وحدت وجود کا منکر ہے۔

اس ناقل نے مجھ سے التماس کیا ہے کہ اس باب میں جو حقیقت ہے شیخ صوفی کے خدام کو لکھ بھیجوں تاکہ لوگ اس نقل سے کچھ اخذ کرلیں اور بدگمانی میں نہ پڑیں۔ کیونکہ بعض ظن گناہ ہیں۔ ان کے اس مطالبے کے جواب میں آپ کی سر دَردی کرتا ہے۔]

تشریح

حضرت میاں شیخ نظام تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے خلیفہ اور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے پیر بھائی ہیں جن کو ایک شخص نے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس سے بدگمان کرنے کے لئے یہ حیلہ کیا کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کو وحدت الوجود کا منکر قرار دیا۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اسی بدگمانی کو دور کرنے کے لئے یہ مکتوب شریف حضرت شیخ تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ارسال فرمایا۔

[مخدوم ومکرم! کم عمری کے زمانہ میں فقیر کا اعتقاد بھی توحید وجودی والوں کے مشرب جیسا تھا۔ فقیر کے والد صاحب قدس سرہٗ بھی بظاہر اسی مشرب پر تھے۔ اور باطن کی پوری نگرانی کے باوجود جو بے کیفی کے مرتبہ کی طرف رکھتے تھے ہمیشہ اسی طریقہ کے مطابق مشغول رہے۔ اور فقیہ کا بیٹا بھی نصف فقیہ کے مطابق فقیر بھی اس مشرب سے از روئے علم حظِ وافر اور لذت عظیم رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے ارشاد پناہ حقائق ومعارف آگاہ پسندیدہ دین کے مؤید ہمارے شیخ ومولیٰ اور قبلہ محمد الباقی قدسنا اللہ تعالیٰ بسرہٖ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آپ نے فقیر کو طریقہ عالیہ نقشبندیہ کی تعلیم فرمائی اور اس فقیر کے حال کی طرف توجہ بلیغ مبذول فرمائی۔

اس طریقہ عالیہ میں محنت کرنے کے بعد تھوڑی مدت کے بعد ہی توحید وجودی منکشف ہو گئی اور اس کشف میں غلو پیدا ہو گیا، اور اس مقام کے علوم ومعارف کثرت سے ظاہر فرمائے گئے، اور اس مرتبے کی باریکیوں میں سے کوئی کم ہی باریکی ہو گی جو منکشف نہ کی گئی ہو۔ شیخ محی الدین ابن العربی کے معارف کے دقائق پورے طور پر واضح کئے گئے۔ اور تجلی ذاتی جسے صاحبِ فصوص نے بیان فرمایا ہے اور نہایت عروج اسی کو قرار دیا ہے اور اس تجلی کی شان میں فرماتے ہیں:

وما بعدھذاالا العدم المحض

ترجمہ: اور اس کے بعد صرف عدم محض ہے۔

مجھے اس تجلی ذاتی سے بھی مشرف فرمایا، اور اس تجلی ذاتی کے علوم ومعارف جنہیں شیخ نے خاتم الولایۃ کے ساتھ مخصوص کیا ہے، وہ تفصیل سے معلوم ہوئے۔ اور سُکر وقت اور غلبہ حال اس توحید وجودی میں اس حد تک پہنچ گیا کہ بعض خطوط میں جو حضرت خواجہ کی خدمت میں لکھے گئے، یہ دو بیت بھی جو سراسر سُکر ہیں لکھ ڈالے:

اے دریغا کیں شریعت ملت اعمائی است

ملتِ ماکافری وملتِ ترسائی است

کفر وایماں زلف وروئ آں پری زیبائی است

کفر وایماں ہر دواندر راہِ مایکتائی است

ترجمہ: افسوس! یہ شریعت نابینوں کی شریعت ہے، ہماری ملت توکُفر اور عیسائیت کی ملت ہے۔

کُفر وایمان اس زیبا شکل پری کی زلف وچہرہ ہیں، کفر اور ایمان دونوں ہماری راہ میں برابر ہیں۔]

تشریح

وحدت کے لحاظ سے کیفیات ودرجات کی دو اقسام ہیں۔ ایک کو وحدت الوجود کہتے ہیں اور دوسری کو وحدت الشہود۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے زمانۂ مبارک سے لے کر ۳۰۰ ہجری تک کے اولیاء کرام وحدت الشہود کے حامل تھے۔ اگرچہ انہیں وحدت الوجود پر بھی عبور حاصل تھا لیکن اعتقاداً وہ سب وحدت الشہودی تھے۔ ۳۰۰ ہجری کے بعد وحدت الوجود کی کیفیات غالب ہونے لگیں تاوقتیکہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کا ظہور ہوا۔ ابتداءً آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر بھی وحدت الوجود کا پَرتَو پڑا لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوا اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وحدت الوجود سے گزر کر وحدت الشہود کی کیفیات پر مشرف ہوئے اور اسی کی تعلیمات کو عام کیا۔ جس سے وحدت الوجود والے صوفیائے کرام کو یہ مغالطہ لگا کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس وحدت الوجود کے منکر ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اپنی محافل میں واضح فرمایا کہ میں علماً وحدت الوجودی تھا لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مجھے اس مقام سے ترقی نصیب فرمائی میرے شیخ حضرت

خواجہ باقی باللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی توجہاتِ عالیہ اس کا سبب بنیں۔ اور میں وحدت الشہود کا قائل ہو گیا۔ اگرچہ وحدت الوجود کی تمام باریکیاں اور معارف مجھ پر منکشف کر دیئے گئے لیکن اس کے بعد مجھے اس مقام سے نکال دیا گیا۔

اس وضاحت سے وحدت الوجود کا کسی طور بھی انکار لازم نہیں آتا۔ مثال کے طور پر جب کسی طالب علم کو سکول میں داخل کیا جاتا ہے تو وہ پہلی کلاس میں پڑھتا ہے۔ پھر اس کی تعلیمات کو پڑھ کر دوسری کلاس میں جاتا ہے تو وہ پہلی کلاس کا انکار نہیں کرتا بلکہ دوسری کلاس میں ترقی کرنا اُسی پہلی کلاس کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اگر کوئی پہلی کلاس میں ہی رہ جائے اور ترقی نہ کر سکے تو وہ دوسری کلاس کو کیا سمجھے گا؟

پس جس کی جتنی لیاقت ہوتی ہے اُسے اتنا ہی درجہ دیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ استعداد کی کمی کے باعث کچھ اولیاء کرام وحدت الوجود (جو کہ پہلی کلاس کی حیثیت رکھتی ہے) میں بند اور محبوس ہو کر رہ گئے اور آگے ترقی نہ کر سکے۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنا خاص فضل وکرم کیا اور بلند ترین استعداد دے کر وحدت الشہود کی اگلی کلاس میں ترقی عنایت فرمائی اور یہ تو عام فہم بات ہے کہ جو بچہ جس کلاس میں ہوتا ہے اُسی کلاس کی تعلیمات اور کتابیں پڑھتا ہے اور اُسی کا پرچار کرتا ہے، کالج میں داخلے کے بعد کوئی طالب علم پانچویں کلاس کے سوالات حل کرنے میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ لیکن اگلی کلاسوں کی طرف ترقی کرنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اب وہ پچھلی کلاسوں کا انکار کرنے لگا ہے اور یہی بات حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس سمجھا رہے ہیں کہ میں وحدت الشہود پر مشرف ہو کر بھی وحدت الوجود کا انکار نہیں کرتا۔ ہاں! وحدت الوجود سے آگے گزرنا بھی نہایت ضروری ہے ورنہ وحدت الوجود میں

ہی رہ جانا اکثر اوقات نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، یہ وہ تنگ کوچہ ہے جس میں سُکر کی وجہ سے بعض دفعہ خلافِ شرع باتوں کا وقوع ہو جاتا ہے اور انسان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ پس وحدت الشہود کو ترجیح دینی چاہیئے کہ وحدت الوجود کی تنگ گلی کے مقابلہ میں وحدت الشہود بہت وسیع شاہراہ ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ النورانی نے یہ مکتوب حضرت شیخ صوفی کے نام تحریر فرمایا سبب یہ ہوا کہ شیخ صوفی کی مجلس میں حاضر کسی شخص نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ قول نقل کیا کہ شیخ صوفی کی مجلس میں میاں شیخ نظام تھانیسری کے کسی درویش نے آپ کے بارے میں یہ غلط تاثر پھیلایا ہے کہ آپ (حضرت مجدد) وحدت الوجود کا انکار کرتے ہیں۔ جس پر لوگوں کو شدید تشویش ہے کہ اصل صورت حال معلوم کرنی چاہیئے۔ لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ آپ وحدت الوجود کے بارے میں اپنے مؤقف کی وضاحت فرمادیں تاکہ لوگ سوءِ ظن کے فتنے سے بچ سکیں۔ چنانچہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے اس شخص ناقل کی درخواست کو قبول فرماتے ہوئے مسئلہ وحدت الوجود اور اس کے متعلقہ مسائل کی حقیقت پر شیخ صوفی کی طرف یہ مکتوبِ گرامی صادر فرما کر اپنے مؤقف کی وضاحت فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ فقیر بچپن سے ہی توحید وجودی کا مشرب رکھتا تھا۔ لیکن فقیر کا یہ مشرب ازروئے علم تھا نہ کہ ازروئے حال یعنی فقیر کے لئے یہ توحید، توحید قالی تھی نہ کہ توحیدِ حالی۔ کیونکہ حال، سلوک طے کرنے سے تعلق رکھتا ہے اور ابھی تک سلوک طے نہ کیا تھا۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ فقیر کے والد مرحوم (حضرت شیخ عبد الاحد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) بھی بظاہر اسی مشرب (توحیدِ وجودی) پر تھے یعنی

بظاہر تو ان کا یہی مشرب تھا لیکن باطنی طور پر آپ احدیت مجردہ اور مرتبۂ تنزیہہ کی طرف متوجہ تھے۔

توحیدِ وجودی کا ظہور

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ السبحانی فرماتے ہیں کہ یہ فقیر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شیخ المشائخ عارف باللہ حضرت قبلہ خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہٗ کی بارگاہ میں پہنچا، آپ نے طریقہ عالیہ نقشبندیہ کی تعلیم فرمائی تو آپ کی توجہ سے تھوڑی ہی مدت میں اس فقیر پر توحید وجودی منکشف ہو گئی اور اس کے کشف میں بہت مبالغہ پیدا ہوا اور اس مقام (توحیدِ وجودی) کے علوم و معارف اس قدر ظاہر ہوئے کہ توحیدِ وجودی کی باریکیوں میں سے شاید ہی کوئی باریکی رہ گئی ہو جو اس فقیر پر ظاہر نہ کی گئی ہو۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز نے اس مکتوب میں اس امر کی صراحت فرمادی ہے کہ اپنے والد مرحوم کے ذوقِ توحید سے متاثر ہو کر یہ فقیر بچپن ہی سے علمی طور پر توحیدِ وجودی کا قائل تھا، لیکن حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سلسلہ نقشبندیہ کا سلوک طے کرنے کے بعد توحیدِ وجودی حالی طور پر وارد ہو گئی اور توحیدِ وجودی کے تمام کشوف و معارف کی تہ تک رسائی حاصل ہوئی اور اس مسئلے میں حضرت ابن عربی قدس سرہٗ کے تمام دقائق و حقائق سے کما حقہ آگاہی ہوئی اور تجلی ذاتی جس کو شیخ نے ولایت کا آخری مرتبہ قرار دیا ہے اور اپنے ساتھ مخصوص جانا اس سے بھی مشرف ہوا۔۔۔ حتیٰ کہ توحید وجودی کے سُکری علوم و معارف نے اس قدر غلبہ کیا کہ فقیر نے بعض ایسے اشعار بھی حضرت خواجہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجے جو سراسر سُکر سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ اشعار دیکھ کر آپ کو تحریر

فرمایا: "حاشا کہ قائل آں مقبول باشد زنہار ادب نگاہ دارید کہ کارخانہ الٰہی محل استغناء و غیرت است"۔[1]

ترجمہ: حاشا کہ ان شعروں کا کہنے والا مقبول ہو، آگاہ رہیں اور ادب کو ملحوظ رکھیں کہ بارگاہِ خداوندی بے نیازی اور غیرت کا محل ہے۔

چناچہ ایک مکتوب میں آپ نے صراحت فرمائی ہے کہ یہ فقیر ارباب توحید وجودی کے انکار اور ان پر طعن سے اپنے آپ کو بہت بچاتا ہے۔ انکار اور طعن کے لئے اس وقت گنجائش نکل سکتی ہے جب اس حال کے ظاہر کرنے میں ان کا اپنا دخل ہو۔ لہٰذا وہ مغلوب الحال اور معذور ہیں۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس معرفت (توحیدِ وجودی) سے اوپر دوسری معرفت (توحیدِ شہودی) ہے اور اس حال کے دوسرا حال ہے اور جو افراد اس مقام میں بند ہو کر رہ گئے ہیں وہ بے شمار کمالات سے محروم ہو گئے ہیں۔[2]

بینات

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ السبحانی کے نزدیک اکابر مشائخ سے اس توحید کے مرتبے میں جتنے کلماتِ سکریہ صادر ہوئے ہیں یہ ان کے عقائد نہ تھے بلکہ احوال تھے اور وہ اسی مرتبے میں بند ہو کر نہیں رہ گئے تھے بلکہ ان میں اکثر اس سے آگے بلند مرتبوں پر فائز ہوتے رہے جیسا کہ خود آپ نے اپنا تجربہ اور مشاہدہ بیان فرمایا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ ان بزرگوں کا مقام نہیں بلکہ حال ہے کیونکہ مقام کا تقاضا ثبات و قرار ہے اور حال کا تقاضا عبور وارتقاء ہے۔

---

[1] (مکتوبات خواجہ باقی باللہ، مکتوب ۵۸)

[2] (دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۱۹)

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

اَلْاَحْوَالُ کَالْبُرُوْقِ فَاِنْ بَقِیَ فَحَدِیْثٌ۔

احوال چمکنے والی بجلی کی طرح ہیں اگر باقی رہ جائیں تو احوال نہیں بلکہ حدیثِ نفس ہیں۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول اس طرح نقل فرمایا ہے:

بگفت احوالِ ما برقِ جہاں است　　　　دمے پیدا و دیگر دم نہاں است

لہٰذا تعلیماتِ مجددیہ کے مطابق ان بزرگوں پر سوءِ ظن نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان کے سکری کلمات کی تاویل کرنی چاہیئے۔ اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ توحیدِ وجودی سلسلہ چشتیہ اور قادریہ کے بزرگوں کے ساتھ مخصوص ہے اور توحید شہودی سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگوں کا خاص مشرب ہے اور توحیدِ وجودی کی حقیقت حال بیان کرنے والوں پر یہ سمجھ کر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں کہ یہ لوگ چشتی، قادری اور وجودی مشائخ کی توہین و بے ادبی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ فَعُوْذُ بِاللہِ مِنْ ھٰذِہِ الْخَرَافَاتِ۔ حاشاو کلا ایسا ہرگز نہیں یہ طعن کرنے والوں کی جہالت کا نتیجہ ہے۔

اصل صورتِ حال یہ ہے کہ توحید وجودی کسی خاص طریقت سے مخصوص نہیں، بلکہ یہ صوفیاء کے احوال و معارف ہیں جو تقریباً ہر سلسلے کے سالک کو فنائے قلب سے پہلے اور فنائے قلب کے بعد پیش آتے رہتے ہیں، کچھ بزرگ ان احوال میں زیادہ دیر تک انقباض پزیر رہتے ہیں اور کچھ جلدی گزر جاتے ہیں۔ بعض نقشبندی بزرگ توحید وجودی کا مشرب رکھتے ہیں اور بعض دوسرے سلاسل کے بزرگ توحید شہودی سے حظِ وافر رکھتے ہیں۔ تعصب کی راہ پر چلنے والے محروم رہتے ہیں اور کسی بھی بزرگ کی عداوت ایمان پر خاتمے کو مشکوک بنا دیتی ہے۔ اَعَاذَنَا اللہُ مِنْھَا وَارْزُقْنَا حُبَّ اَوْلِیَآئِہٖ۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۲۹ تا ۳۴)

[یہ حال مدت دراز تک رہا، اور مہینوں سے سالوں تک پہنچ گیا۔ اچانک حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی عنایت بے نہایت غیب کی کھڑکی سے ظہور کے میدان میں آئی اور بے چون وبے چگون کی روپوشی کے پردہ کو اٹھا دیا۔ پہلے علوم جو اتحاد اور وحدت وجود کی خبر دیتے تھے زائل ہونا شروع ہو گئے۔ اور احاطہ اور ذات حق کا قلبِ مؤمن میں سما جانا اور قُرب ومعیتِ ذاتی یہ سب کچھ جو اس مقام میں منکشف ہوئے تھے پوشیدہ ہو گئے۔ اور پورے یقین سے معلوم ہو گیا کہ صانع عالم جل شانہٗ کے لئے عالم کے ساتھ ان مذکورہ نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی ثابت نہیں۔ ذات حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا احاطہ اور قُرب ذاتی نہیں بلکہ علمی ہے، جیسا کہ اہلِ حق شکر اللہ سعیہم کے ہاں قرار پا چکا ہے۔ اور وہ سبحانہٗ وتعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں۔ اور خدا خدا ہے اور عالم عالم ہے۔ وہ سبحانہٗ وتعالیٰ بے مثل وبے مثال ہے اور عالم سارے کا سارا مثل ومثال کے داغ سے داغدار ہے۔ بے مثل وبے کیف ذات کو ذی مثل وذی کیف کا عین نہیں کہا جا سکتا۔ واجب تعالیٰ کو ممکن کا عین نہیں کہہ سکتے اور قدیم حادث کا عین ہر گز نہیں ہو سکتا۔ ممتنع العدم ذات جائز العدم کا عین نہیں ہو سکتی۔ انقلابِ حقائق عقلاً اور شرعاً محال ہے۔ ایک کا حمل دوسرے پر بالکل ممتنع ہے۔]

تشریح

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ قُرب اور معیت کی کیفیات اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا پورے عالم میں نہ سمانا اور مؤمن کے قلب میں سما جانے جیسی کیفیات وحدت الوجود کے مرحلہ میں ظاہر ہوتی ہیں اور یہ ساری سُکر کی کیفیات ہیں حالانکہ عقائدِ اہل سنت وجماعت اور اولیاء اکابرین کے نزدیک یہ نسبتیں ثابت نہیں ہیں۔ خالقِ حقیقی کی بے مثل وبے کیف ذات کے ساتھ عدمات اور مخلوق کی کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اسی لئے وحدت الوجود کو وحدت الشہود کے مقابلہ میں ادنیٰ درجہ دیا گیا ہے کہ وحدت

الشہودی حالت میں سالک بندہ کو بندہ اور خدا کو خدا حقیقی طور پر جانتا ہے اور اس ارفع واعلیٰ ذات کے ساتھ اپنی کچھ مناسبت نہیں جانتا۔ جبکہ وحدت الوجودی حالت میں تو سالک بعض دفعہ اپنے آپ کو ہی خدا سمجھ لیتا ہے۔ بھلا یہ دونوں کیفیات (وحدت الوجود، وحدت الشہود) کیسے برابر ہو سکتی ہیں، تو وحدت الوجود سے نکل کر وحدت الشہود کی طرف ترقی کرنا بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ بندے کے بس کی بات نہیں۔

قرآن عظیم الشان میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق ١٦)

ترجمہ: اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں۔

جب سالک پر اس آیت کریمہ کی کیفیت آئے تو وہ کہتا ہے کہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے نزدیک ہو گیا ہوں۔ لیکن یہ نزدیکی بلحاظ کرامت ہے نہ کہ بلحاظ معیت۔ کیونکہ اگر وہ اسے معیت کی وجہ سے سمجھے گا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ شخص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ممکنات یعنی مخلوقات میں شمار کرتا ہے کیونکہ معیت اُس کے ساتھ ہوتی ہے جو مادہ سے مرکب ہو اور مادہ مخلوق ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو مادہ سے مرکب سمجھنا یا اس کا مکان تعین کرنا کفر ہے اور یہ فرقہ مجسمیہ کا عقیدہ ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ قدیم، بے چون و چگون اور وراءالوریٰ ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

توحیدِ شہودی کا ظہور

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ یہ فقیر ابتداء میں توحیدِ وجودی کا ذوق وادراک وافر رکھتا تھا آنکہ حق تعالیٰ کی عنایت میدانِ ظہور میں آئی اور توحیدِ وجودی کے وہ علوم

ومعارف جو اتحاد ووحدت وعینیت ومعیتِ ذاتیہ کی خبر دیتے تھے یک دم زوال پزیر ہوگئے اور توحیدِ شہودی کے وہ تمام علوم ومعارف جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور جمہور علماء و محققینِ اہلِ سُنت نے بیان فرمائے ہیں ظاہر ہوگئے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں آپ نے فرمایا: "مسئلہ توحید وغیرہ میں مشائخ (وجودیہ) سے علماء (اہلسنت) اختلاف از راہِ نظر واستدلال ہے اور فقیر کا اختلاف از راہِ کشف وشہود ہے۔ علماء ان امور کے قبح کے قائل ہیں اور فقیر بشرطِ عبور ان کے حسن کا قائل ہے"۔[1]

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے اسی مکتوب میں تحریر فرمایا ہے:

اے عزیز! اگر تفصیلِ احوال و تبیینِ معارف کو قلم بند کروں تو بات طویل ہو جائے گی اور خاص کر توحیدِ وجودی کے احوال اور ظلیتِ اشیاء کے معارف بیان کئے جائیں تو وہ لوگ جنھوں نے توحیدِ وجودی میں عمریں صرف کی ہیں سمجھ لیں گے کہ انہوں نے دریائے بے نہایت میں سے پورا ایک قطرہ بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ وہی لوگ اس درویش کو اصحابِ توحیدِ وجودی سے شمار نہیں کرتے بلکہ اس کو توحیدِ وجودی کے مخالف علماء میں سے سمجھتے ہیں اور اپنی کوتاہ نظری کی بناء پر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ معارفِ توحید وجودی پر اصرار کرنا ہی کمال ہے، اور اس مقام سے ترقی کرنا نقص ہے۔ بھلا ان لوگوں کو کہاں سے معلوم ہو گیا کہ ان مشائخ کی اس مقام سے ترقی نہیں ہوئی اور وہ اس مقام میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ معارفِ توحید کے حصول میں تو ہمارا اختلاف ہی نہیں ہے کیونکہ یہ ایک امر متحقق اور ثابت ہے۔ البتہ اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا مشائخ ماتقدم کی ترقی اس مقام سے ہوئی ہے یا نہیں۔ اب اگر یہ لوگ اس شخص کو جو ترقی کا قائل ہے منکر توحید کے نام سے یاد کرتے ہیں تو یہ ان لوگوں کی خاص اصطلاح ہوئی اور اس میں کیا مناقشہ؟

[1] (دفتر دوم، مکتوب نمبر ۴۲)

بینات

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے توحیدِ وجودی کے سلسلے میں اپنے احوال اس لئے تحریر فرمائے ہیں تا کہ شیخ نظام تھانیسری اور ان کے ہم نشینوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا توحیدِ وجودی کے معارف سے انکار، توحیدِ وجودی کے حقائق سے بے خبر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ توحیدِ وجودی کے معارف سے گزر جانے اور ترقی پانے کی بناء پر ہے۔ اور آپ کا یہ اختلاف وانکار اربابِ توحیدِ وجودی کو برا جاننے کی وجہ سے بھی نہیں بلکہ آپ انہیں اولیائے کرام کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ البتہ آپ اس یقینی امر کو ثابت کرتے ہیں کہ توحیدِ وجودی کے معارف ولایت کے معارف سے ہیں اور مبتدی اور متوسط عارفین کے لئے ہیں اور توحیدِ شہودی کے معارف نبوت کے معارف سے ہیں اور وہ منتہی حضرات کے لئے ہیں۔ پس ابتدائی معارف سے گزر جانا اور توحیدِ شہودی کے معارف میں قرار پکڑنا لازمی ہے۔ تا کہ حقیقی معرفت اور حقیقی فنا میسر آجائے۔ آپ کے نزدیک توحیدِ وجودی فنائے قلب کے مقام میں حاصل ہوتی ہے، اور توحیدِ شہودی فنائے نفس کے بعد جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی انسانیت کی تکمیل کا مرتبہ ہے کیونکہ تکمیل تزکیۂ نفس پر موقوف ہے اور تزکیۂ نفس فنا اور بقاء سے مربوط ہے۔ اور یہ امر اہلِ باطن کے نزدیک ثابت ہے کہ فنائے نفس کے بغیر انسانی اعمال قبول اور عدمِ قبول کے درمیان دائر وسائر رہتے ہیں یعنی انسان کے بعض عمل رضائے نفس کے لئے ہوتے ہیں اور بعض عمل رضائے حق کے لئے ہوتے ہیں، کیونکہ نفس کی جبلت حق کی مخالفت پر استوار ہے۔

اسی لئے حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے:

عَادِ نَفْسَکَ فَاِنَّھَا انْتَصَبَتْ بِمُعَادَاتِیْ۔[1]

(یعنی) اپنے نفس کے ساتھ دشمنی کیا کرو، اس لئے کہ نفس میری دشمنی پر قائم ہے۔

اسی طرح حدیث کی رو سے جہاد بالنفس کو جہادِ اکبر کہا گیا ہے۔ واضح رہے کہ توحیدِ وجودی کے معارف میں فنائے نفس حاصل وشامل نہیں ہوتی۔ کیونکہ توحید وجودی کے ظہور کے وقت اگرچہ بعض لطائف فانی ہوتے ہیں مگر تمام لطائف فنائے حقیقی سے مشرف نہیں ہوتے۔ کیونکہ تمام لطائف کے فنا ہو جانے پر اَنَا کا دعویٰ گم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انا الحق کا مصداق بھی موجود نہیں رہتا۔

توحیدِ وجودی کے علوم ومعارف میں احاطہ، سریان اور قرب ومعیتِ ذاتیہ خاص موضوعات ہیں، ان کا مختصر تجزیہ ملاحظہ فرمائی:

احاطہ: اللہ تعالیٰ کا ہر چیز کو محیط ہونا بمطابق آیت قرآنی:

وَ اللّٰہُ مِنْ وَرَائِھِمْ مُحِیطٌ (البروج ۲۰)

أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ (حٰمٓ سجدة ۵۴)

سریان: حق تعالیٰ کا مومن کے دل میں سما جانا جیسا کہ حدیثِ قدسی ہے:

لَا یَسَعُنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَآئِیْ وَلٰکِنْ یَّسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ۔[2]

قُرب: حق تعالیٰ کا بندے کے قریب ہو جانا بمطابق آیت:

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق ۱٦)

معیّت: اللہ تعالیٰ کا بندے کے ساتھ ہونا بمطابق آیت:

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید ۴)

---

[1] (تشییدالمبانی، ص ۱٦)

[2] (احیاءالعلوم)

صوفیائے وجودیہ ان عنوانات کے تحت کائنات اور ذاتِ حق میں اتحاد و عینیت ثابت کرتے ہیں اور احاطہ کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ ذاتِ حق تعالیٰ محیطِ عالم ہے اور سریان کا معنی یہ لیتے ہیں کہ ذاتِ حق تعالیٰ کائنات میں اس طرح سمائی ہوئی ہے جس طرح نمی درخت کے پتوں میں ساری ہوتی ہے اور قرب ومعیت سے بھی ذاتی قرب ومعیت مراد لیتے ہیں اور احاطہ وسریان ومعیت علمیہ کو احاطہ وسریان ومعیتِ ذاتیہ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک علم وقدرت اور دیگر صفات عین ذات ہیں، حالانکہ علمائے اہل سنت رحمہم اللہ تعالیٰ صفات کو ذات کا عین نہیں مانتے اور کائنات کے ساتھ ذات کے احاطہ وسریان کو ذاتی نہیں بلکہ احاطہ وسریانِ علمی مانتے ہیں۔ اور علمائے اہلِ سنت کے اسی مسلک کو حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کشف وشہود سے بھی ثابت مانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کائنات کو ذات کے ساتھ وہی نسبت ہے جو مخلوق کو خالق کے ساتھ اور مصنوع کو صانع کے ساتھ ہے۔ اتصال واتحاد اور عینیت کی نسبت ہرگز ثابت نہیں ہوتی، بلکہ وہ ذاتِ حق ہر نسبت اور ہر مقام سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ اشیاءِ کائنات نہ اللہ تعالیٰ کا عین ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد اور متصل ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کی ذات اشیاء میں حلول کیئے ہوئے ہے، نہ واجب ممکن ہوا، نہ بیچون چون میں آیا، نہ تنزیہہ تنزل کرکے تشبیہ بنا۔ وہاں نہ اتحاد ہے نہ عینیت، نہ تنزل نہ تشبیہ۔ فَهُوَ سُبْحَانَهُ الْاٰنَ كَمَا كَانَ۔

صوفیائے وجودیہ چونکہ مغلوب الحال اور معذور ہیں ان کے کلام کی حُسنِ ظن کے ساتھ تاویل کی جائے گی اور ان کے کلام "ہمہ اوست" کے معنیٰ "ہمہ از وست" ہوں گے اور ان کے قول اتحاد وعینیت کی تعبیر یوں ہوگی کہ اشیائے کائنات حق تعالیٰ کے ظہورات ہیں اور اسماء وصفات کے آئینے ہیں۔ وَبِاللهِ التَّوْفِيْقُ۔

صوفیائے کرام میں سب سے پہلے حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۶۳۸ھ) نے تصوف کو باقاعدہ فلسفے کا رنگ دے کر مسئلہ توحید کو "وحدت الوجود" کے نام سے متعارف کرایا ہے اور بے شمار اصطلاحات وضع کر کے فلسفیانہ استدلال اور کشف و شہود کے ذریعے اس مسئلے کو ایک مخصوص انداز میں پیش فرمایا۔ ساتھ ہی فارسی شاعری کے دلکش اثرات نے بھی ان تخیلات کو مزید تقویت پہنچائی۔ چنانچہ حضرت شیخ اکبر نے قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے بھی اپنی تاویلات کو ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور اس امر پر پورا زور صرف فرمایا ہے کہ وحدت الوجود ہی توحید کی اصل حقیقت ہے۔ اور اپنی اس تحقیق پر سابقہ صوفیاء کے کلمات کو بطور استشہاد بھی پیش فرمایا ہے (مثلاً سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ، اَنَا الْحَقُّ اور لَیْسَ فِیْ جُبَّتِیْ اِلَّا اللہ وغیرہا)۔

حضرت شیخ اکبر ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس فلسفہ کی تردید کرنے والوں میں حضرت ابو المکارم رکن الدین، شیخ علاؤ الدولہ سمنانی (متوفی ۷۳۶ھ) حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی ۶۳۲ھ) اور مشہور محدث و مؤرخ امام ذہبی (متوفی ۸۴۸ھ) کے نام سر فہرست ہیں۔ اس امر میں کوئی کلام نہیں کہ بعض اکابر علماء و صوفیاء نے حضرت شیخ اکبر کو سخت اور بُرے الفاظ سے یاد کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بے شمار علماء و مشائخ نے آپ کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے۔

قانونِ قدرت کے مطابق تاریخ اسلام میں ایک عظیم الشان انقلابی واقعہ رونما ہوا کہ عہدِ نبوت سے تقریباً ایک ہزار سال بعد حضرت امامِ ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تشریف لائے اور انہوں نے تمام سلاسلِ تصوف میں اس بلند آہنگی سے تجدید و اصلاح کا صور پھونکا کہ اس کی صدائے بازگشت آج تک دنیائے اسلام کے در و دیوار سے آ رہی ہے اور ہمیشہ

آتی رہے گی۔ آپ نے مکتوبات شریفہ اور دیگر تالیفات کے ذریعے صرف ہی مؤقف کا تکرار اور ایک ہی دعوت کا اعادہ فرمایا کہ صوفیاء کو اپنے فکر واستدلال اور کشف وشہود کی بنیاد قرآن وسنت پر رکھنی چاہیئے اور کتاب وسنت کے خلاف صوفیاء کے تمام اقوال وافکار کو مردود سمجھنا چاہیئے اور علمائے اہلسنت کے عقائدِ صحیحہ پر مکمل اعتماد کرنا چاہیئے۔

چنانچہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

از جملۂ ضروریاتِ طریقِ سالک اعتقادِ صحیح است کہ علمائے اہل سنت آن را از کتاب وسنت وآثارِ سَلف استنباط فرمودہ اند۔۔۔ واگر بالفرض خلافِ آن معانیِ مفہومہ بکشف والہام امرے ظاہر شود آن را اعتبار نہ باید کرد واز ان استعاذہ باید نمود۔ [1]

چنانچہ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں جب امامِ ربانی قدس سرہٗ نے عالمِ اسلام کے حالات کا جائزہ لیا تو اس وقت کافی حد تک ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اصل نظریۂ وحدت الوجود کا حقیقی مفہوم ناپید ہو چکا تھا۔ ماسوائے چند محققین اصحابِ تصوف کے، متصوفین کی اکثریت توحید وجودی کو اتحاد وعینیت اور احاطہ ومعیت ذاتیہ کے غلط مفاہیم کا جامہ پہنا چکی تھی اور تصوف پر ملحدوں، باطنیوں اور نور بخشیوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ نظریۂ وحدت الوجود، یونانی توہمات، ایرانی تخلیات، ہندوانہ نظریات اور دیگر غیر اسلامی اعتقادات کا معجون مرکب بن چکا تھا۔ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کا یہ تصوف ابتدائی صدیوں کے اسلامی تصوف سے بہت کچھ منحرف ومختلف نظر آرہا تھا۔ غرضیکہ ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نظریۂ وحدت الوجود کے پردہ میں الحاد وحلول

[1] (دفتر اول مکتوب نمبر ۲۸۶)

کی تعلیم دی جانے لگی تھی۔ اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نظریۂ توحیدِ وجودی اور شہودی کا بیان اور ان کے درمیان فرق بیان کیا جائے، وَبِاللہِ التَّوْفِیْقُ۔

شیخ اکبر کا نظریۂ توحید

توحید کے بارے میں حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ وجود ایک ہے اور وہ اللہ ہے اور وہی موجود ہے، باقی ہر چیز فقط اس کا مظہر ہے۔ ان کے نزدیک ذات وصفات میں عینیت ہے، ان میں جو فرق ہے وہ جوہر اور عرض کے فرق کی طرح ہے، عالم اس کی صفات کی محض تجلی ہے۔

اس نظریہ کو ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ وجود، وجودِ مطلق ہے اور مراتبِ وحدت میں یہ مرتبہ لا تعین ہے۔ وحدت اپنے تعینات یا تنزلات میں پانچ مراتب سے گزرتی ہے، جنہیں تنزلاتِ خمسہ یا حضراتِ خمس کہتے ہیں۔

ذات وصفات

حضرت شیخ اکبر اور ان کے اتباع کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات، اس کی عین ذات ہیں اور اسماء وصفات آپس میں بھی ایک دوسرے کے عین ہیں۔ مثلاً علم اور قدرت جس طرح یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کی عین ذات ہیں، اسی طرح یہ دونوں صفتیں آپس میں بھی ایک دوسرے کی عین ہیں۔

مقام غیب الغیب میں کسی نام اور کسی طریقہ سے تعدد، تکثر، تمایز، تباین نہیں ہے۔

عالَم اور خدا

حضرت شیخ اکبر کا مسلک یہ ہے کہ عالم اور خدا میں عینیت کی نسبت ہے۔ اس عینیت کو ظاہر کرنے کے لئے وہ یا تو عالم کی نفی سے ابتداء کرتے ہیں یا خدا کے اثبات سے، وجودِ عالم کی نفی سے اُن کی مراد یہ ہے کہ عالم برائے نام، غیر حقیقی اور وہمی وجود ہے، جو خارج میں معدوم ہے۔ موجود صرف خدا ہے۔ عالم یا کثرت کا وجود صرف تجلیاتِ وحدت کی حیثیت سے ہے یا اس کے تعینات کی حیثیت سے، بذاتِ خود عالم کا کوئی وجود نہیں۔

اَلْاَعْیَانُ مَاشَمَّتْ رَائِحَةً مِنَ الْوُجُوْدِ۔ [1]

یعنی اعیانِ ثابتہ (حقائق اشیاء) نے وجودِ خارجی کی بو تک نہیں سونگھی۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا نظریۂ توحید

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے ارتقائی سلوک کے مدارج کی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ہم شیخ اکبر کے نظریہ توحید پر امام ربانی قدس سرہٗ کی تنقید اور مخالفت کے دلائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ شیخ اکبر اور امام ربانی دونوں کے بیانات و نظریات استدلالِ علمی و عقلی کے علاوہ کشف و شہود کے اصولوں پر مبنی ہیں، فرق صرف استدلال اور کشف کی صحت اور عدمِ صحت کا ہے۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قبل ازیں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ ارتقائے سلوک میں خود وحدت الوجود کے مقام سے گزر چکے تھے اور مرتبۂ وحدت الوجود ایک روحانی و کشفی ادراک کی حیثیت سے آپ کے لئے متحقق ہو چکا تھا۔ آپ اس کو وجودیت کا ابتدائی مرتبہ سمجھتے تھے، مقامِ ظلیت

---

[1] (فصوص الحکم کلمہ ادریسیہ)

میں پہنچ کر بھی آپ نے وہاں قرار نہ پکڑا اگر آپ نے تسکین پائی تو مقامِ عبدیت میں پائی۔ چنانچہ آپ پر حق الیقین کے طور پر واضح ہو گیا کہ وحدت الوجود ایک متوسط اور عبوری مقام ہے۔ تو آپ نے ایک عارفِ کامل اور صاحبِ کشف واجتہاد کی حیثیت سے شیخِ اکبر اور دوسرے صوفیائے وجودیہ کے اس نظریہ پر نقد و نظر کا آغاز فرمایا اور اس کشف و شہود کو جس پر توحید وجودی کی بنیاد رکھی گئی تھی سکریہ اقوال واحوال قرار دے کر توحید خالص کا وہ قرآنی نظریہ پیش فرمایا جو وحدت الوجود سے یکسر متضاد تھا اور جس کی تعبیر آپ نے وحدت الشہود سے فرمائی اور اسی نظریۂ توحید کو آپ نے وحیِ الٰہی کا مأخذ اور توحید کا اصلی اسلامی تصور قرار دیا۔ آپ کی اس کشفی اور استدلالی تخلیق و تحقیق نے عجمی تصوف کا رُخ اسلامی تصوف کی طرف موڑ دیا، اور عالمِ اسلام میں ایک زبردست فکری، کشفی اور روحانی انقلاب برپا کر دیا۔ آپ کا پیش کردہ نظریۂ وحدت الشہود آپ کی زندگی میں ہی عالمِ اسلام کی اکثریت نے قبول کر لیا تھا اور آپ کے بعد اہلِ تصوف میں آج تک کوئی بھی قابلِ ذکر آواز اس نظریہ کے خلاف نہیں اٹھی، گو دوسرے سلاسل کے بعض متصوفین وحدت الوجود پر قائم رہے لیکن حضرت امام ربانی کی تردید یا تغلیط کی کسی کو جرأت نہ ہو سکی۔ کیونکہ آپ کے استدلالاتِ علمی و کشفی مبنی پر کتاب و سنت ہیں اور علمائے اہلِ سنت کے اعتقاداتِ صحیحہ کے عین مطابق ہیں۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ۔

ذات و صفات

شیخ اکبر کے نزدیک ذات اور صفات میں عینیت ہے۔ امام ربانی فرماتے ہیں کہ اگر ذات وصفات عینِ یک دیگر ہیں اور اگر عالم تجلیٔ صفات ہے تو اِن دونوں قضیوں کا لازمی نتیجہ وحدت الوجود ہے۔ حالانکہ دونوں قضیے غلط ہیں۔ پہلا قضیہ اس لئے غلط ہے کہ صفات عینِ ذات نہیں بلکہ زائد علی

الذات ہیں۔ متکلمین ماتریدیہ کا یہی مذہب ہے۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ ان کے ہمنوا ہیں کیونکہ یہ صفات، کمالاتِ ذاتیہ کے علاوہ زائد بر ذات متصور ہوئی ہیں۔ پس یہ صفات اضافی ہیں اور تخلیقِ عالم کی نسبت وجود میں آئی ہیں۔ یہ امر کشفِ صحیح سے معلوم ہوا ہے اور وحی کے مطابق بھی یہی حق ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (العنکبوت ٦)

(یعنی) بے شک اللہ بے پرواہ ہے سارے جہان سے۔

پس اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں کامل ہے، اس کی ذات، صفات سے تکمیل نہیں پاتی کیونکہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے موجود، حی، قیوم، قدیر، علیم، بصیر، سمیع، کلیم اور مکوّن ہے۔ آپ کے نزدیک عالَم ظلِ صفات ہے اور صفات ظلِ ذات۔ تعینات یا تنزلات کے قول سے آپ احتراز کرتے ہیں کیونکہ اس سے عینیت کا احتمال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عقلِ صحیح کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ صفات، ذات کے علاوہ ہوں۔ (فافھم)

دوسرا قضیہ اس لئے غلط ہے کہ عالَم تجلی وصفات نہیں بلکہ ظلِ صفات ہے، کیونکہ اگر عالم تجلیٔ صفات ہوتا تو وہ عینِ صفات ہوتا حالانکہ صفات کامل ہیں اور عالم نقص سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً خدا کی صفتِ علم کی کوئی مماثلت انسان کی صفتِ علم سے نہیں کہ ایک کو دوسرے کی تجلی کہا جاسکے۔ نیز امام ربانی کے نزدیک یہ بھی کشفِ صحیح سے ثابت ہوا ہے کہ عالم تجلی وصفات نہیں بلکہ ظلِ صفات ہے۔

علاوہ ازیں وحیِ خداوندی بھی اسی کشف کی صحت کی خبر دیتی ہے۔ مثلاً:

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ (الصافات ١٨٠)

ترجمہ: پاکی ہے تمہارے رب کو عزت والے رب کو ان کی باتوں سے۔

معلوم ہوا کہ صفاتِ انسانی اور صفاتِ خداوندی میں کوئی مماثلت نہیں۔[1]

عالَم اور خدا

حضرت شیخ اکبر عالَم اور خدا میں عینیت ثابت کرتے ہیں جب کہ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک خارج مین حقیقی وجود صرف ذاتِ خدا کا ہے اور عالم کو وجودِ خارجی عطا ہوا ہے اور یہ وجود، نمودِ بے بود سے زیادہ نہیں۔ تاہم یہ نمود ایسی بھی نہیں جو ہمارے وہم و تخیل پر منحصر ہو بلکہ وہ اپنے آپ موجود ہے۔ اس کی مثال شعلۂ جوالہ کی طرح ہے۔ جیسے ایک لکڑی کے سرے کو آگ لگا دیں پھر لکڑی کے دوسرے سرے کو پکڑ کر تیزی سے گھمائیں رات کے وقت دور سے دیکھنے والے کو آگ کا ایک دائرہ نظر آئے گا۔ اب اگر اس دائرہ (نمود) کو کسی طریقے سے مستقل اور فی نفسہٖ قائم کر دیا جائے تو عالم کا وجود اس دائرہ جیسا ہو گا۔[2]

عالم اور خدا کے مابین عینیت ثابت کرنا اسی قسم کی غلطی ہے جیسے کوئی صاحبِ کمال اپنے پوشیدہ کمالات کو ظاہر کرنے کے لئے ایسے حروف اور آوازیں ایجاد کرے جو اس کے کمالات پر دلیل ہوں اس پر کوئی یہ کہنے لگے کہ یہ حروف اور یہ آوازیں اس موجد کا عین ہیں۔[3]

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ عالم اور خدا کے مابین اس کے سوا اور کوئی نسبت نہیں کہ خدا خالق ہے، اور عالم مخلوق ہے اور خالق کے پوشیدہ کمالات پر دلیل ہے۔

---

[1] (دفتر دوم، مکتوب ا، دفتر سوم مکتوب ۱۱۰)

[2] (دفتر سوم، مکتوب ۵۸)

[3] (دفتر اول، مکتوب نمبر ۳۱)

تنزیہہ و تشبیہ

شیخ اکبر تنزیہہ و تشبیہ دونوں سے توحید کا اثبات کرتے ہیں۔ تنزیہہ کا معنی ہے "پاک کرنا" علمِ کلام کی اصطلاح میں یہ لفظ اس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی ذات میں مخلوق کی صفات کا اثبات نہیں کیا جاسکتا۔ تشبیہ کا معنٰی ہے "مشابہت دینا"، علمِ کلام کی اصطلاح میں خالق کو مخلوق کی صفات سے متصف کرنا تشبیہ ہے۔ شیخِ اکبر کے نزدیک تنزیہہِ محض یا تشبیہِ مطلق سے خدا کی ذات میں تقیّد پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ شیخ اکبر کا یہ فرمانا کہ "اعیانِ خارجی نے وجود کی بو تک نہیں سونگھی" تو پھر تنزیہہ کرنے میں تحدد و تقید کیوں پیدا ہو سکتا ہے؟ خدا تو موجود ہے اور عالم موہوم، اور متخیّل محض اور نفس الامر میں غیر موجود، ایسی صورت میں اگر تحدید و تقیید کا واقع ہونا تسلیم کیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ موجود کی تحدید موہوم سے ہو سکتی ہے۔ یہ کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ خدا کا وحدہٗ لاشریک ہونا اس سے باطل ہو جاتا ہے کہ اس کے شریک کا تخیل کیا جاسکتا ہے۔[1]

دوسرے یہ کہ اگر تنزیہہ و تشبیہ کو ملایا جائے تو ماسویٰ اللہ باقی نہیں رہتا۔ ارشادِ قرآنی: قُلْ یَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (آل عمران ٦٤) سے ثابت ہوا کہ ماسویٰ اللہ وجود رکھتا ہے (اور ماسویٰ اللہ کی عبادت شرک ہے)۔

تیسرے یہ کہ جو لوگ تنزیہہ کے ساتھ تشبیہ کو ملاتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ وہ ذات ہمارے عقل وادراک سے بالاتر ہے اور جسے وہ تشبیہ خیال کرتے ہیں وہ ان کے وہم و تخیل کے تراشے ہوئے

---

[1] (دفتر سوم، مکتوب ۷۴)

بت ہیں، جنہیں ان لوگوں نے غلطی سے خدا تصور کر لیا ہے۔ وہ ذات اس سے بالاتر ہے کہ ہمارے کشف و شہود میں آسکے۔[1]

نیز حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

دعوتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات بہ تنزیہہ صِرف است وکتبِ سماوی ناطق بہ ایمانِ تنزیہی است۔۔۔ ہیچ شنیدۂ کہ پیغمبرے دعوت بایمانِ تشبیہ نمودہ است وخلق راظہورِ خالق گفتہ۔[2]

(یعنی) تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے (توحید کے بارے میں) تنزیہہِ صرف کی دعوت دی ہے اور تمام آسمانی کتابیں ایمانِ تنزیہی پر ناطق ہیں۔۔۔۔ آج تک کسی نے نہیں سُنا کہ کسی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں کو توحیدِ تشبیہی پر ایمان لانے کی دعوت دی ہو اور خلق کو خالق کا ظہور قرار دیا ہو۔

اصل اور ظل

حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے وحدت الوجود کی بنیاد اصل اور ظل کی عینیت پر رکھی ہے۔ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک ظل شئ، عینِ شئ نہیں ہو سکتا۔ ظل تو اصل کے مشابہ و مماثل ہوتا ہے۔ خدا اور عالَم کی نسبت کے باب میں اگر اصل اور ظل کی نسبت پر قیاس کیا جائے تو ظل ممکن ہے اور اصل واجب اور ممکن کی حقیقت عدم ہے اور واجب کی حقیقت وجود، پس اصل اور ظل کو عینِ یک دیگر نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً اگر کسی شخص کا سایہ دراز ہو جائے تو نہیں کہہ سکتے

---

[1] (دفتر سوم مکتوب نمبر ۹)

[2] (دفتر اول مکتوب نمبر ۲۷۲)

کہ وہ شخص دراز ہو گیا۔ اول تو عالم خدا کا ظل ہی نہیں اور اگر عالم کو خدا کا ظل مان بھی لیا جائے تو عینیت متحقق نہیں ہوتی۔[1]

اصل اور ظل کے معنی ہیں "شئ اور اس کا سایہ"۔ حضرت شیخ اکبر نے اس کو نمود کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ظل انعکاس یا پرتو کی حیثیت سے بھی متصور ہوتا ہے جو قریباً تجلی یا ظہور کا مترادف ہے۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک ابتداءً اس کے معنی سائے کے ہیں جو شئ سے مشابہت رکھتا ہے لیکن جوں جوں وہ ترقی کرتا جاتا ہے ظل کی حیثیت محض سایہ کی ہوتی جاتی ہے اور یہ لفظ کم حیثیت اور نمود بے بود کو ظاہر کرتا ہے۔ انجام کار ظل کے معنی صرف نتیجہ کے رہ جاتے ہیں۔

انسان اور خدا

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک حدیث خَلَقَ اللہُ آدَمَ عَلَی صُورَتِہٖ۔[2] کی جو تاویل شیخ اکبر نے کی ہے وہ بھی غلط ہے۔ اس کے ہر گز یہ معنیٰ نہیں کہ صفاتِ خالق مجسم ہو گئیں اور انسان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بلکہ اس کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ خدا اور روحِ انسانی دونوں لا مکانی ہیں اور اس حیثیت سے وہ ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔[3] ورنہ خدا اور انسان میں تو بڑا فرق ہے اور وہ اس طرح کا فرق ہے جیسے ایک مکڑی یں جو جالا تنے اور ایک ایسے وجود میں، جس کی ایک پھونک سے سارا نظامِ زمین و آسمان درہم برہم ہو جائے، انسان اور خدا تو عین یک دیگر ہو ہی نہیں سکتے۔[4]

---

[1] (دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۹۰، دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۶۰)

[2] (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۹۱۹)

[3] (دفتر اول مکتوب نمبر ۲۸۷)

[4] (دفتر اول مکتوب ۳۱۰)

امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک انسان روح سے عبارت ہے اور روح عالمِ امر سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اس کے وجود کی نوعیت خلق سے مختلف ہے لیکن وہ کسی دوسری ہستی سے متفرع نہیں۔ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (بنی اسرائیل ۸۵)

حضرت شیخ اکبر نے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کی تاویل میں جو اپنے نفس کی معرفت کو خدا کی معرفت قرار دیا ہے[1] اس کے معنی یہ نہیں کہ انسان اور خدا عین یک دیگر ہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو شخص اپنی فطرت کے نقائص اور عیوب کو محسوس کر لیتا ہے وہ (اس حقیقت کو) پالیتا ہے کہ فضائل اور کمالات صرف خدا کی ذات میں ہیں اور اسی کے فضل سے ہم میں پیدا ہو سکتے ہیں، وہی فضائل اور کمالات کا مستجمع اور سرچشمہ ہے۔[2]

توحیدِ وجودی میں معیت، قرب، سریان اور احاطہ کے خاص عنوانات ہیں لیکن حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ معیت، قرب، سریان اور احاطہ کی حقیقتیں ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہیں اور ذات حق تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ گو ایک مقام پر آپ کا رجحان صرف اس قدر پایا جاتا ہے کہ ان عنوانات سے مُراد قرب واحاطہ ذاتی نہیں بلکہ قرب واحاطہ علمی مراد ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اور جن لوگوں نے قرب واحاطہ ذاتی مراد لیا ہے وہ غلبۂ حال اور سُکرِ وقت پر مبنی ہے۔ وہ سالک جو مقامِ صحو سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں ان علوم سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو بھی اثنائے سلوک میں یہ سکری احوال ومعارف حاصل ہوئے تھے، لیکن آخر کار وہ ان معارف سے گزر گئے۔

---

[1] (فصوص الحکم کلمہ ابراهیمیه)

[2] (دفتر اول مکتوب نمبر ۲۳۴)

حضرت امام ربانی نے کتاب وسنت کی روشنی میں مسئلہ توحید کو اس جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اس کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الوجود صرف نظری اور فکری بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے بعد کوئی ایسا بلند پرواز صوفی اور عارف آج تک پیدا نہیں ہوا جس نے اس مسئلہ کا کشفی اور شہودی بنیادوں پر کوئی قابلِ ذکر حل پیش کیا ہو۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ کچھ صوفی اپنے تصلب کی بناء پر نظریہ توحید وجودی پر جوں کے توں قائم رہے۔ لیکن عالمِ اسلام کی اکثریت نے آپ کی ان ہی تجدیدی خدمات کے پیشِ نظر آپ کو الف ثانی کا مجدد تسلیم کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اظہارِ اختلاف کے کوئی عالم اور صوفی آپ کے دلائل علمیہ اور حقائقِ کشفیہ کا سامنا نہیں کر سکا اور بقول علامہ اقبال (مرحوم):

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے پہلا شخص جس نے اس بحث پر تقریر کی وہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں جو حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے قریباً ایک صدی بعد پیدا ہوئے، شاہ ولی اللہ ایک بڑے سرکردہ صوفی، عالم دین اور صاحبِ باطن شمار ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے قریباً ۱۱۴۲ھ میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام "فیصلہ وحدت الوجود والشہود" ہے۔ اس رسالہ میں جو مکتوب مدنی کے نام سے مشہور ہے، شاہ صاحب نے حضرت ابن عربی اور حضرت امامِ ربانی کے نظریۂ توحید میں تطبیق ثابت کی ہے۔ یعنی یہ بتایا کہ حقیقتاً ان دونوں بزرگوں کے خیالات میں کوئی فرق نہیں اور ان کا نزاع فی الواقعی نزاع لفظی ہے۔ اس تطبیق کی ابتداء شاہ صاحب نے اس دعویٰ سے کی ہے کہ مجھے تطبیق کا علم عطا کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے بیان سے متبادر ہوتا ہے کہ وہ یہ تقریر بربنائے کشف وشہود نہیں کر

رہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عربی اور حضرت امام ربانی کے بیانات کو سامنے رکھ کر ایک حَکَم کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں اور یہ میری تقریر ان دونوں بزرگوں کے بیانات کی فقط توجیہہ ہے۔ شاہ صاحب کی سعیٔ تطبیق سے بہت بڑی بحث پیدا ہو گئی جو مدت تک جاری رہی۔ بہر حال حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نظریہ توحیدِ شہودی کے اکثر قائلین نے آج تک شاہ ولی اللہ کے نظریہ تطبیق کو تسلیم نہیں کیا۔

شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا نظریۂ تطبیق

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ذوقِ صحیح سے ادراک ہوتا ہے کہ وجود ایک شئ ہے، قَائِمٌ بِنَفْسِهٖ اور مُقَوِّمٌ لِغَيْرِهٖ، وجود منبسط ہے، جو صوَرِ موجودات اختیار کر لیتا ہے، اس وجود میں تنزلات واقع ہوتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں وجود منبسط محسوس اور معقول میں مشترک ہے۔ یہی وہ مفہوم ہے جس کی بناء پر وہ معدوم کا غیر ہے۔[1] وہ وجود لا بشرط شئ ہے، وہ ہیولیٰ ہے، تمام موجودات کا دوسرے مرتبے میں وہ وجود بشرط لا ہے۔ جیسے انسان اور فرس اور تیسرے مرتبے میں وہ وجود بشرط شے ہے جیسے ارسطو، اور یہی وحدت الوجود ہے۔[2]

اور جس چیز کا نام وحدت شہود ہے وہ یہ ہے کہ اسماء و شیون منعکس ہو گئے ہیں اعدام متقابلہ میں اور اس طرح ممکن وجود میں آ گیا لیکن استعارے اور تشبیہہ سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس کے معنٰی فقط یہ نکلتے ہیں کہ واجب کامل ہے اور ممکن ناقص اور ضعیف و بے حقیقت اور یہ سمجھنا کہ

---

[1] (فیصلہ وحدت الوجود و الشہود، ص ۲۳)

[2] (فیصلہ وحدت الوجود و الشہود، ص ۷)

حقائق ممکناتِ اسماء وصفات ہیں جو مرتبۂ علم میں متمیز ہو گئے ہیں یا یہ سمجھنا کہ حقائق ممکناتِ اسماء وصفات ہیں جو اعدام متقابلہ میں منطبع ہو گئے ہیں بعینہٖ ایک ہی بات ہے ان میں اگر کچھ فرق ہے بھی تو وہ اتنا کم ہے کہ صاحبانِ تفحص اسے خاطر میں نہیں لاتے۔ پس شیخ مجدد کا یہ سمجھنا کہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں تباین ہے فقط تسامح ہے۔ ابن عربی کا مذہب بھی وہی ہے جو شیخ مجدد کا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت شہود میں محض نزاع لفظی ہے۔[1]

حضرت خواجہ میر ناصر عندلیب قدس سرہٗ

خواجہ میر ناصر عندلیب نے اپنی کتاب نالۂ عندلیب (۱۱۵۳ھ) میں فرمایا ہے کہ وحدتِ شہود قرینِ صواب ہے۔ گو کیفیت وحال کے اعتبار سے دونوں کا منشاء ایک ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک جب وحدت الوجود کا نظریہ ہی غلط ہے تو وہ تطبیق کا تصور بھی نہیں مانتے۔

حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اس تقریر کی توضیح مزید ان کے صاحبزادے حضرت خواجہ میر درد نے پہلے اپنی کتاب "وارداتِ درد" کی شرح میں لکھی۔ واضح ہو کہ ان دونوں بزرگوں کی تقریر کشف وشہود پر مبنی ہے اور خواجہ میر درد اپنی کتابوں کو لفظ بلفظ الہامی فرماتے ہیں۔ خواجہ میر درد فرماتے ہیں کہ وحدتِ وجود کے صحیح معنی فقط یہ ہیں کہ موجود بالذات صرف وہی ہے۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ واجب اور ممکن کی ماہیئت ایک ہے اور عبد اور معبود ایک دوسرے کا عین ہیں یا خدا کلی طبیعی کی طرح اپنے افراد میں موجود ہے کہ یہ سراسر زندقہ ہے۔ اور اس معنیٰ میں وحدتِ وجود کا عقیدہ اکابر صوفیاء کے ٹھیک مفہوم کو نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ مذہب میں توحید وجودی کی بایں معنیٰ کوئی اہمیت نہیں کہ وجود،

---

[1] (فیصلہ وحدت الوجود والشہود، ص ۷)

موجودات میں ساری ہے کیونکہ "کثرت میں وحدت" جو عوام کی زبان پر ہے اور ہر ہندو جوگی اس پر گفتگو کرتا ہے اس کے لئے ایمان کوئی شرط نہیں۔ وہ تو بالکل ایک متبذل مسئلہ ہے۔ ذرا سا سمجھا دینے سے سمجھ میں آجاتا ہے، ایسا عقیدہ انبیاء کی بعثت کا مقصود نہیں ہو سکتا۔[1]

دوسرا مسئلہ وحدت شہود ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ذات واجب کے بغیر موجوداتِ مُمکنہ کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اور جملہ موجودات اسی ایک ذات کے نور سے موجود ہیں۔ اکثر ناواقف جو شیخِ مجدد کے کلام کی حقیقت کو نہیں سمجھے، اپنے گمان میں انہیں ظل کا قائل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ رائے محض وسطِ سلوک میں تھی۔ اکثر صوفیائے خام وناتمام جو اپنے زعم میں اپنے آپ کو عارفِ کامل سمجھتے ہیں، شیخ مجدد کی تصانیف کو دیکھ کر جن میں اثنینیّت اور "ہمہ از وست" کا بیان ہے خیال کرتے ہیں کہ وہ حقیقت سے ناواقف تھے اور کیونکہ مسئلۂ توحید بہت مشکل ہے اور وہ ان پر پوری طرح منکشف نہیں ہوا تھا مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللهِ کے مطابق ہمہ از وست کی تصدیق وحی سے ہوتی ہے۔ اس لئے "ہمہ اوست" غلط ہے اور "ہمہ از وست" صحیح۔[2]

اگرچہ کیفیت اور حال کے اعتبار سے دونوں کا مقصود ایک ہی ہے یعنی قلب کا ماسوا کی گرفتاری سے آزاد کرنا۔ پس اگر کوئی ان دونوں کیفیات میں سے کسی ایک سے یا دونوں سے مشرف ہو جائے تو ایک ہی بات ہے۔ وحدت وجود اور وحدتِ شہود دونوں مسائل بعد میں پیدا ہوئے ہیں۔ بعض صوفیوں نے وحدت وجود کو قرآن واحادیث کی تاویلات سے ثابت کیا۔ جب کہ نظریہ وحدت شہود صریح آیات قرآنیہ اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اکثر صوفیائے وجودیہ اپنی عقل ووجدان کے تابع ہیں اور بمرتبۂ اولیٰ اپنی تحقیق پر اعتماد رکھتے ہیں اور فقط بمرتبۂ ثانی نقل کے ضمن میں رسول اللہ

[1] (علم الکتاب، ص ۴۶۵)
[2] (علم الکتاب، ص ۴۶۵)

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کمزور سی تبعیت کرتے ہیں اور آیات واحادیث کو اپنے مذاق کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ گویا حقیقت میں شریعت سے انہیں کوئی سروکار نہیں، بلکہ جو کچھ اپنی عقل ووجدان سے معلوم ہوا وہ ان کے نزدیک ثابت ہے۔ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ کا یہ اتباع بذاتِ خود ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خیال میں گمان رکھتے ہیں کہ ہم نفسِ واقعہ کا ادراک کررہے ہیں اور ہمارا مقصود اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ فی الواقعہ ممکن عینِ واجب ہے یا اس کا غیر اور مخلوق عینِ خالق ہے یا اس کا غیر اور اس کے امر کے سمجھنے میں ان کی اپنی عقل ان کا مقتداء ہے اور وہ دلائل عقلی سے اپنی راہ چلتے ہیں اور ایمان کو بہ تکلف اپنے ساتھ گھسیٹتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن صوفیائے شہودیہ بیشتر بمرتبہ اُولیٰ تابع شرع ہوتے ہیں اور اصل میں شریعت کے مطابق اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ فقط بمرتبہ ثانی شرع کے ضمن میں جس قدر اپنی عقل کو دخل دے سکتے ہیں، دیتے ہیں۔ گویا درحقیقت انہیں عقل سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ جو کچھ خدا اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرما دیا ہے وہی ان کے نزدیک متحقق ہے۔ وہ دل میں بھی یہی یقین رکھتے ہیں کہ جس چیز کی خبر خدا اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے دی ہے امر واقعہ وہی ہے اور ہمارا کام یہ نہیں کہ تحقیق کریں کہ واجب اور ممکن ایک دوسرے کے عین ہیں یا غیر۔ یہ لوگ نورِ ایمان میں اپنا راستہ طے کرتے ہیں اور عقل کو بتکلف اپنے ساتھ گھسیٹے لیے چلے جاتے ہیں۔

پس ہمیں توحیدِ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ خدا قدیم اور موجود بالذات ہے۔ وہ موجودات سے خارج میں ہے اور وجودِ کلی طبیعی کی طرح ان کے ضمن میں موجود نہیں۔ حق یہ ہے کہ وجودِ باری بنفسِ خود قائم ہے مع اپنی صفات کے جو اس

کے کمالات ہیں اور موجوداتِ ممکنہ کے پیدا ہونے سے اس کی ذات میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا نہ ان کے نابود ہونے سے کوئی کمی واقع ہوتی ہے کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَّعَهٗ شَيْءٌ اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ۔[1]

حضرت علامہ محمد یوسف بلگرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۱۱۶۲ھ میں علامہ میر محمد یوسف بلگرامی نے "اَلْفَرْعُ النِّهَايَتِ مِنْ اَصْلِ الثَّابِتِ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں مسئلہ وحدت وجود اور وحدت شہود پر گفتگو کی ہے۔ علامہ موصوف اپنی تقریر کی بناء قرآن اور حدیث پر رکھتے ہیں اور وحدت وجود کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کا شہود جس کے صوفیاء وجودیہ مدعی ہیں اسلام کی رو سے اس زندگی میں محال ہے یہ رسالہ دونوں مسلکوں کے قرآن وحدیث سے ماخوذ ہونے پر ایک سیر حاصل بحث اور تبصرہ ہے۔ بہر کیف اگرچہ رسالہ نہایت عالمانہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی اس رسالہ کا ایک ہی نسخہ موجود ہے، جو مصنف کے اپنے قلم کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری کے "سبحان اللہ" سیکشن میں محفوظ ہے۔[2]

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریۂ تطبیق کے مخالفین میں حضرت مرزا مظہر کا نام سرفہرست ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحبِ تفسیرِ مظہری آپ کے مرید خاص تھے اور آپ ہی کے نام سے اپنی تفسیر بھی منسوب کی ہے۔ مرزا مظہر تین واسطوں سے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے مرید

---

[1] (علم الکتاب، ص ۱۸۶)

[2] (علم الکتاب، ص ۴۰۹، ۴۱۰)

تھے۔ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالمِ ربانی اور صوفی شمار ہوتے تھے آپ اپنے دور میں سلوکِ مجددیہ کے سب سے بڑے داعی تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ انہیں قیّمِ طریقۂ احمدیہ لکھا کرتے تھے۔

حضرت علامہ غلام یحیٰی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مولانا غلام یحیٰی (متوفیٰ ۱۱۹۵ھ) علومِ عقلیہ ودینیہ کے فاضل تھے۔ پہلے لکھنؤ میں درس دیا کرتے تھے، فلسفی اور محقق تھے۔ فلسفہ کی کتابوں کی بہت سی شرحیں اور حاشیے مرتب فرمائے آخرکار فلسفہ سے دست بردار ہو کر راہِ سلوک اختیار کی اور مرزا مظہر جانِ جاناں دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ اور آپ ہی کے ایماء پر علامہ غلام یحیٰی نے حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریۂ تطبیق کی تردید پر قلم اٹھایا اور ۱۱۸۴ھ میں رسالہ "کلمۃ الحق" لکھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ وحدت وجود اور وحدت شہود حقیقتِ شیاء اور حادث وقدیم کے مابین ربط کو ظاہر کرتے ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے، سراسر غلط ہے۔ ان دونوں مسئلوں کے درمیان تو کوئی تطابق کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ وحدت وجود کی بناء عالم اور موجد عالم کے مابین عینیت پر ہے اور وحدت شہود کی رو سے واجب اور ممکن کے درمیان غیریتِ تامہ ہے۔

اولاً یہ کہ حقائقِ اشیاء وجودیوں کے نزدیک اعیانِ ثابتہ یعنی اسماء وصفات کے تعینات ہیں اور وحدت شہود کی رو سے جو شیخِ مجدد کا مذہب ہے حقائقِ ممکنات عکوس ہیں اسماء وصفات کے جو ان کے اعدامِ متقابلہ میں منتبع ہو گئے ہیں۔ ان دونوں مذہبوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلے کے اعتبار سے ممکنات اسماء وصفات کے عین ہیں، دوسرے کے اعتبار سے وہ اسماء وصفات کے غیر ہیں کیونکہ وہ ظل ہیں اسماء وصفات کے اور ظل اصل کا عین نہیں ہوتا۔

ثانیاً یہ کہ شاہ ولی اللہ کا کہنا کہ اس باب میں شیخ مجدد کو تسامح ہوا یہ بھی سراسر غلط ہے کیونکہ شیخ مجدد کو وواجب اور ممکن کی غیریت پر اصرارِ بلیغ ہے ان کی عینیت کو وہ الحاد وزندقہ سمجھتے ہیں اور اس اصرار سے ان کے مکتوبات بھرے پڑے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ وحدت وجود کی رو سے خدا کی ذات میں تغیر واقع ہوتا ہے اور وہی ذات بصورتِ تعینات عالَم بن جاتی ہے اور وحدتِ شہود کی رو سے عالَم کی تخلیق سے خدا کی ذات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا اور وہ بحالِ خود موجود رہتا ہے ان دونوں مذہبوں میں اتنا بڑا فرق ہے کہ نہ تو ایک کو دوسرے پر محمول کیا جاسکتا ہے اور نہ ان دونوں میں کوئی مطابقت ممکن ہے۔ علاوہ ازیں مولانا غلام یحیٰی کی تقریر سے متبادر ہوتا ہے کہ انہیں شاہ ولی اللہ پر یہ اعتراض بھی ہے کہ چونکہ وہ وحدت شہود کے متعلق بر بنائے کشف تقریر نہیں کر رہے لہٰذا انہیں حق نہیں کہ وہ وحدت شہود سے انکار کریں یا اس کی نسبت کہیں کہ وہ در حقیقت وحدتِ وجود ہی ہے۔ اس کی تائید ان کے مرشد حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے "کلمۃ الحق" کی تقریظ کے طور پر لکھا ہے۔

حضرت شاہ غلام علی دہلوی قدس سرہٗ

تیرہویں صدی کے مجدد حضرت شاہ غلام علی دہلوی جو حضرت مرزا مظہر کے جانشین تھے آپ نے فرمایا وحدت وجود اور وحدت شہود کشف کے دو جدا جدا مقام ہیں۔ جو اہل سلوک ان مقامات سے گزرے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی تطبیق محال ہے، یعنی شاہ غلام علی کے نزدیک بھی شاہ

ولی اللہ مقام وحدت وجود سے آگے نہیں بڑھے اور مقام وحدت شہود تک نہیں پہنچے۔ اس لئے ان کا نظریۂ تطبیق حقیقت کے خلاف ہے۔[1]

مختلف آراء

حضرت مولانا غلام یحییٰ کے جواب میں شاہ ولی اللہ کے چھوٹے صاحبزادے شاہ رفیع الدین دہلوی نے "دمغ الباطل" اور ان کے پوتے اسماعیل دہلوی نے "عبقات" لکھی لیکن ان دونوں کتابوں کی تقریریں کشف و شہود پر مبنی نہیں بلکہ محض حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریۂ تطبیق پر مشتمل ہیں۔

بعد میں شاہ اسماعیل دہلوی نظریۂ وحدت الوجود کے خلاف ہو گئے تھے اور سید احمد بریلوی تو نظریہ وحدت الوجود کو ملحدینِ وجودیہ کی بدعت سے تعبیر کرتے تھے۔ انہوں نے بھی نظریہ وحدت الشہود کو کشف و شہود کی بناء پر صحیح قرار دیا ہے۔[2]

علامہ فضل حق خیر آبادی جو اپنے وقت میں فلسفہ کے امام شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے وحدت الوجود کی تائید میں ایک رسالہ "روض المجود" لکھا۔ ان کے علاوہ علامہ عبدالعلی لکھنوی نے بھی وحدت الوجود کی حمایت میں ایک رسالہ "وحدت الوجود" لکھا۔ چونکہ دونوں حضرات کی تقریریں کشف و شہود سے خالی اور خاص فلسفیانہ ہیں اس لئے وہ بھی خارج از بحث ہیں۔ علامہ عبدالعلی لکھنوی کے رسالہ "وحدت الوجود" کا حاشیہ اور خاتمہ نبیرۂ امام ربانی حضرت زید ابوالحسن فاروقی دہلوی رحمۃ

---

[1] (مقاماتِ مظہری)

[2] (صراطِ مستقیم)

اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے اس میں آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریۂ تطبیق کو ناقابلِ تسلیم قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

"کجا اثبات یک وجود واجبی لا غیر و کجا اثبات دیگر وجود امکانی، کجا قول ہمہ اوست کہ مقام جمع است و کجا گفتار ہمہ از وست کہ مقامِ فراق است"۔

حضرت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت امام ربانی کے نظریہ توحید شہودی سے بے حد متاثر تھے۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے تصورِ خودی کی بنیاد حضرت امام ربانی کے تصورِ وحدت الشہود پر رکھی ہے۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اپنے انگریزی خطبات میں تصورِ وحدت الشہود کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"سترہویں صدی کا ایک گراں قدر مفکر۔۔۔ شیخ احمد سرہندی ہم عصر تصوف پر جن کی بے باکانہ تشریحی تنقید نے ایک تکنیک (نظریہ وحدت الشہود) کو جنم دیا۔ صوفیاء کے مختلف سلاسلِ طریقت جو سنٹرل ایشیاء اور عرب سے ہندوستان آئے ان میں صرف موصوف کی وہ تکنیک ہے جس نے ہندوستانی حدود و ثغور کو عبور کیا اور آج بھی پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں ایک زندہ قوت ہے"۔

ڈاکٹر قاسم السامرائی

کتاب "سیرتِ مجددالفِ ثانی" کے مؤلف پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد (کراچی) لکھتے ہیں:

حال ہی میں لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے فاضل ڈاکٹر السامرائی نے ایک تنقیدی مقالہ نظر ثانی کے لئے راقم کو ارسال فرمایا ہے۔ڈاکٹر قاسم نے تصورِ وحدت الوجود اور نظریۂ وحدت الشہود کو ایک ہی حقیقت کی دو مختلف مصطلحات قرار دینے سے اختلاف کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں نظریات اپنی علیحدہ قدر و قیمت رکھتے ہیں، ان دونوں میں صرف لفظی اختلاف نہیں بلکہ معنوی اختلاف بھی ہے۔

ہمارے ملک کے ممتاز دانشور سکالر پروفیسر برہان احمد فاروقی نے اس موضوع پر ایک رسالہ "حضرت امام ربانی کا نظریۂ توحید" کے نام سے تالیف کیا ہے جس میں وہ رقم طراز ہیں:

جن حضرات نے شیخِ مجدد کی تنقیص یا تائید کی، انہوں نے وحدتِ شہود کا ایک خاص معنیٰ یہ سمجھا کہ وہ بھی وحدت الوجود کی طرح ایک نظریہ ہے ذات باری تعالیٰ اور عالم کے مابین تعلق کا، مگر یہ صحیح نہیں۔ شیخ مجدد کے نزدیک وحدتِ شہود کا مفہوم فقط یہ ہے کہ وحدتِ وجود کا جو شہود سالک کو اپنے ارتقاءروحانی کے دوران میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر حاصل ہوتا ہے اور جسے متصوفین سمجھتے ہیں کہ وہ نفس الامر کا مشاہدہ ہے اور اس سے وحدتِ وجود ثابت ہوتی ہے وہ محض ان کا شہود ہے یعنی ان کی ایک کیفیتِ نفسی ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہے بعبارتِ اُخریٰ وجود ایک نہیں بلکہ سالک کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وجود ایک ہی ہے۔یعنی جب سالک بالارادہ اپنی نظر کو غیرِ خدا سے پھیر کر خدا پر قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک منزل پر پہنچ کر اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ سوائے خدا کے اور کچھ نہیں سب کچھ وہی ہے۔

جو نظریہ ٔوجود شیخ مجدد نے پیش کیا ہے اسے وحدتِ شہود کہنا غلطی ہے۔ اس کا کوئی نام نہیں رکھا گیا لیکن اگر کوئی نام رکھا جائے تو تشبیہ وجود یا وحدت وجوب کہنا مناسب ہو گا۔

دوسری بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ وحدتِ وجود سے شیخ مجدد کا انکار بر بنائے عقل واستدلال نہیں بلکہ بر بنائے کشف و شہود ہے، وہ کہتے ہیں کہ وحدت وجود کا شہود ایک مقام ہے جس پر سالک پہنچتا ہے لیکن اگر وہ اس مقام سے ترقی کر جائے اور اعلیٰ مقامات پر پہنچ جائے تو اس پر منکشف ہو جاتا ہے کہ وحدت وجود کا شہود محض ایک شہود تھا اور وحدتِ وجود حقیقت نہیں ہے۔ پس شیخِ مجدد کے دعوے کا جواب بر بنائے کشف و شہود ہونا چاہیئے تھا، یعنی شاہ ولی اللہ اور ان کے متبعین کو یہ بتانا چاہیئے تھا کہ شیخ مجدد کا یہ بیان غلط ہے کہ وحدت وجود کے شہود سے بالاتر بھی کچھ مقامات ہیں یا یہ کہنا چاہیئے تھا کہ ان اعلیٰ تر مقامات سے (جن پر شیخ مجدد فائز ہوئے) بالاتر اور مقامات ہیں جہاں پہنچ کر وحدت الوجود کا اذعان پھر مکمل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ مقام تعجب ہے کہ ان حضرات نے اپنی تقریر کا منبع کشف و شہود کو نہیں بنایا بلکہ عقل واستدلال پر اس کی بناء رکھی۔ لہٰذا شیخ مجدد کے مذہب کی تردید اور توحید وجودی سے اس کی تطبیق ایک بے نتیجہ چیز رہ جاتی ہے۔ نیز یہ کہ شاہ ولی اللہ اور دیگر حضرات نے جو دلائل وحدت وجود کی موافقت میں بیان کئے ہیں خود ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی کوئی دلیل قابل قبول نہیں اور یہ کہ وہ تمام دلائل اس لئے ناقص ہیں کہ ان میں وحدتِ نظری اور وحدتِ مذہبی کو مخلوط کر دیا گیا ہے۔ یہ امر گو شعورِ متصوفانہ کی خصوصیت ہے جیسا کہ مقدمہ میں بیان ہوا لیکن شعورِ مذہبی کے بالکل خلاف ہے۔

سب سے پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ وہ جملہ دلائل مابعد الطبیعات وجودی کے لئے ہیں اور ان کا منشاء یہ ثابت کرنا ہے کہ حقیقت ایک وجود ہے واحد، منفرد اور عین ذاتی۔ لیکن آج کانٹ کے

اصول کے مطابق ہم بالیقین جانتے ہیں کہ عالم کی وحدت ایک وضعی تصور ہے اور کوئی حقیقتِ ثابتہ نہیں۔ نیز یہ کہ حقیقت کا بحیثیت عین ذاتی کے ہر بیان عقلِ انسانی کی دسترس سے باہر ہے ان دلائل پر بہ تفصیل غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس دعویٰ سے ابتداء کرتے ہیں کہ وحدت وجود ذوقِ صحیح کے نزدیک مسلم ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ انسان کے شعورِ عامہ یعنی غیر سوفسطائی شعور کا یقین تو وحدتیت کے بجائے کثرتیت پر ہے۔ حتیٰ کہ اثنیّت پر پہنچنے کے لئے بھی اسے عقلِ بسیط کی سخت جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے وحدتیت مطالبہ ہے شعورِ نظری کا اور شعورِ نظری کی رسائی بھی وحدتیت تک اتنی آسان نہیں جتنی آسان وہ معلوم ہوتی ہے۔ اور جب شعور نظری وحدتیت پر فائز ہو جاتا ہے تو بھی وہ بسائط کے اخذ کرنے کے لئے شدید جدوجہد کرتا ہے اور اس پر مجبور ہوتا ہے کہ اسے اِذْعَاناً مانے عقلاً یا استدلالاً نہیں۔ خود شاہ ولی اللہ کے باب میں بھی یہ غور طلب ہے کہ وجودِ واحد کیا ہے۔

اولاً تو وہ احدیت معقولہ ہے یعنی وہ شئے جو مشترک ہے، محسوس اور معقول میں، کلی اور جزئی میں۔ اب یہ تصور کرنے کے لئے کہ دو ایسے متغائر اور متبائن حقائق کے مابین کوئی چیز مشترک بھی ہو سکتی ہے عقلِ بسیط کی سخت جدوجہد درکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وجود اور موجود خارجی کے مابین کسی عنصرِ مشترک کا پالینا ایک ناممکن سی بات ہے۔

ثانیاً یہ کہ شاہ ولی اللہ وجود کو ذاتِ بحت کہتے ہیں۔ ذاتِ بحت سے مراد ہے ایسی ذات جو ہر قسم کے تعینات سے معرا ہو۔ پھر ایسے وجود کا نہ تو ادراک ممکن ہے نہ وہ خیال میں لایا جا سکتا ہے۔ "صحت اور واقعیت" کے درمیان کسی مشترک عنصر کا پالینا قریب قریب ناممکنات سے ہے۔ اس کا تصور کرنے کے لئے بھی فکرِ تجرّد کی انتہائی شدید جدوجہد درکار ہے۔ پھر احدتیتِ معقولہ اور ذاتِ بحت

دونوں کا ادراک عقل کرتی ہے یعنی وہ تصورات میں تصوراتِ کلیہ۔ یہ کیسے ممکن ہو گا کہ اس وجود کو وحدتِ ذاتی یا وحدتِ عددی سے متصف کیا جائے۔ دراصل یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آیا اس وجود کو وحدت ذاتی سے متصف کیا بھی جا سکتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ جب تک وہ تصورات کلیہ ہیں جواب نفی میں ہو گا۔ اس وجود کو وحدت ذاتی سے متصف کرنا جب ہی ممکن ہے کہ جب اس تصور کلی کو اس ناقابلِ عبور خلاء کے اوپر سے جو کلی اور جزئی کے مابین ہے جست کرا کے ایک جزئی میں تبدیل کر دیا جائے۔

لیکن کیا کلی کا جزئی ہو جانا ممکن ہے؟ کیا ہم اتنا بھی کہنے کے حق دار ہیں کہ تصورِ کلی کی مثال صرف ایک ہی موجود واحد و منفرد ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ہم یہ حق نہیں رکھتے، کیونکہ غور سے دیکھا جائے تو ایسا کوئی ایک وجود موجود نہیں جو اس درجہ کلی کے مصداق ہو۔ گو سرسری نظر سے دیکھا جائے تو ہر وجود واقعی بالکل اس کا مصداق ہے دراصل ہوا یہ کہ وحدت نظری تو محض وحدت نوعی تھی یہ ہرگز وحدت عددی ہونے کی متقاضی نہ تھی۔ لیکن شعورِ مذہبی کے زیر اثر یہ وحدت عددی بن گئی یعنی ایک موجود واحد اور منفرد۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احدیتِ معقولہ، ذاتِ بحت، وجود منبسط جو کسی نہ کسی طرح ایک منفرد موجود حقیقی ہے یہ کیونکر مستجمع صفات کمال بن گیا۔ کیونکہ فی نفسہٖ تو وہ موجودِ محض سے زیادہ کچھ بھی نہیں، یعنی ہم یہ کیونکر ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ تمام کمالات کا حامل ہے؟ یہ تو بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کمالات بالفعل تو موجود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کمالاتِ بالقوہ یا بالاستعداد موجود ہیں اور یہ بھی وجوبِ عقلی کے طور پر نہیں بلکہ محض واقعات محسوسہ کی توجیہ کے طور پر۔ اور یہ کہ وہ بعد میں بالفعل موجود ہو جاتے ہیں۔ مگر جو کچھ بالفعل وجود میں آ جاتا ہے وہ

کمالات نہیں بلکہ نقائص ہیں۔ پس ہم انہیں نقائص کی استعداد سے متصف کر سکتے ہیں نہ کہ کمالات کی استعداد سے۔ ہوتا یہ ہے کہ مفکر نادانستہ طور پر مقتضیاتِ شعور مذہبی سے متأثر ہو کر بغیر تنقید کے ہر خیر و کمال سے اس غیر مشخص وجود کو متصف کر دیتا ہے اور اس طرح وہ وجود مستجمع صفاتِ کمال یعنی مذہب کے مشخص و ممتاز وجود الوہیت میں منقلب ہو جاتا ہے۔

اگر تنزلات پر غور کیا جائے جن کے ذریعہ سے یہ وجود کامل عالم بنتا ہے تو کوئی وجہ ہی پیش نہیں کی جا سکتی کہ اس وجود میں وہ تنزلات کیوں واقع ہوتے ہیں۔ اگر اس وجود پر بصحت تمام یعنی بحیثیت تصورِ کلی کے غور کیا جائے جیسا کہ وہ ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حرکت و تغیر سے قطعاً معرا ہے۔ لیکن اگر اس پر ایک واقعہ نفس الامری کی حیثیت سے غور کیا جائے جو محسوس اور معقول میں عنصر مشترک ہے یعنی بحیثیت موجود فی الخارج یا موجود فی الذہن ہونے کے تو بھی اس کے واسطے ایسے اصولِ حرکت کا متعین کرنا مشکل ہو گا جو اس وجود کی ہر صورت میں مشترک ہو اور اس سے اس وجود کو متصف کیا جا سکے مگر واقعہ یہ ہے کہ شعورِ نظری کا مقتضیٰ ہے کہ عالم کی توجیہ اس حیثیت سے کی جائے کہ وہ وحدتِ مفروضہ کا مظہر ہے اور لہٰذا ایک اصول حرکت کو اس سے وابستہ کر دیا جائے۔ یہ مقتضیٰ پورا کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک غایت تجویز کی جاتی ہے اور اس امر کا اثبات کیا جاتا ہے کہ وہ وجود اپنے تئیں جاننا چاہتا ہے۔ اس غایت کا مبنیٰ بھی حقیقت میں مذہب ہے مزید بر آں اس حرکت کی خصوصیت یہ ہے کہ پہلے وہ علمی ہے پھر عینی یا خارجی۔ یہ کسی طرح شعورِ نظری کا مطالبہ نہیں کہ اگر اس کے علمی اور خارجی ہونے کی کوئی غرض ہو تو وہ مذہبی ہو۔ دراصل مذہبی غرض ہی بر سرِ عمل ہے جس نے منشاء نظری کو بدل دیا ہے، کیونکہ وحدت اب خدا بن کر متصور ہو رہی ہے۔ لہٰذا پہلے تو اس میں شعور خودی ہونا چاہیئے اور پھر اسے اپنی ذات سے وجودِ خارجی کو پیدا کرنا چاہیئے۔ بہر کیف شعورِ

نظری پھر بہ شدتِ تمام بر سرِ عمل آتا ہے اور وجودِ خارجی وجود الوہیت کے مظہر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ بذاتِ خود اپنی تجلیات میں سے ایک تجلی کی صورت میں وہی وجود ہے جو تجلی کا عین ہے۔

اب شعور مذہبی اور شعورِ نظری کے مابین جو تضاد ہے وہ بالکل عیاں ہو جاتا ہے۔ شعورِ نظری واحدی ہے اور وجود اولیٰ اس کے نزدیک کائنات میں ساری ہے اور اس کا اصول انقاء جبراً ہے۔ اگر ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ ہم سخت ترین وجوب کے تحت کام کر رہے ہیں۔ تصوف کو اس سے انکار نہیں۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان میں احتیاج اور اذیت جو شعورِ مذہبی کا مبنیٰ ہے کہاں سے آئی اور فرض اور ذمہ داری کا سرچشمہ کیا ہے؟ اور اختیار جس کے بغیر کوئی بلند مذہب ایک لمحہ کے لئے باقی نہیں رہ سکتا کہاں سے آیا۔ نیز یہ نظریہ نفس انسانی میں ایسا میلان پیدا کرتا ہے جو شعورِ نظری کی خصوصیت ہے یعنی فکر اور مراقبہ کا میلان۔ ایک متصوف کا مقصود ہے عرفان۔ وہ اپنی زندگی مراقبہ اور مکاشفہ میں بسر کرتا ہے۔ اس کا منتہائے مقصود "وصل" ہے یعنی فناء یا وجودِ اولیٰ میں گم ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ یہاں بقاء بعد الموت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، گو وہ شعور مذہبی کے تحت میں اکثر اس کا ذکر کرتا رہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ جستہ جستہ وحدت مذہبی کے شعورِ متصوفانہ میں بعض اہم عناصر داخل ہو جاتے ہیں لیکن غلبہ شعورِ نظری کا رہتا ہے۔

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ تصوف اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے نو افلاطونیت سے بہت زیادہ مماثل ہے اور تاریخی حیثیت سے بھی اس سے بہت مستفید ہوا ہے۔ اس کا نظریہ وحدت وجود اور تنزلات یعنی اس کے تعینات زندگی اور اجتماعیت کی طرف اس کا رویہ رہبانیت اور انزداء اور انسان کی غایت قصویٰ کو حاصل عرفان یا ذات اولیٰ میں مدغم یا فناء ہو جانا۔ یہ سب کی سب باتیں ہر اعتبار سے وہی ہیں جو نو فلاطونیت نے کیں نیز یہ کہ تصوف شعور مذہبی کو شعورِ نظری میں تبدیل

کرنے کی اس سعی پر مبنی ہے جس پر نو فلاطونیت مبنی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی خالی از معنی نہیں کہ نو فلاطونیت کا مقصود مذہب بننے سے یہ تھا کہ اس طرح وثنیّت یعنی صنم پرستی کو عیسویت کی زد سے بچائے۔ اسی طرح تصوف بھی ایک مذہب بن کر اسلام میں داخل ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا شاہ ولی اللہ اس بات میں حق بجانب ہیں کہ شیخ مجدد کا مسلک حقیقتًا وہی ہے جو ابن عربی کا ہے یعنی وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں فرق صرف استعارہ اور تشبیہ کا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دو مختلف مسلک معلوم ہوتے ہیں اور شیخ مجدد کو یہ مغالطہ لگا کہ وہ اپنے مسلک کو وحدت الوجود کا مظہر سمجھتے ہیں۔ ان پر شیخ مجدد کا یہ حق ضرور تھا کہ وہ بہ تفصیل وضاحت فرماتے کہ یہ فرق صاف ظاہر ہے اور فی الواقعہ استعارہ بیان پر مبنی ہے۔ مگر شاہ ولی اللہ یہ نہیں کرتے اور اختلاف استعارہ و تشبیہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ مجدد اور ابن عربی کے درمیان صرف تشبیہ اور استعارہ کا اختلاف نہیں بلکہ معنیٰ اور حقیقت کا فرق ہے۔ یہ فرق اتنا ہی واقعی اور حقیقی ہے جتنا وحدت نظری اور وحدت مذہبی کا فرق۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کا یہ دعویٰ اس پر مبنی ہے کہ اس سلسلہ بحث میں لفظ "ظل" استعمال ہوا ہے۔ "ظل" یقیناً ایک استعارہ ہے، اسی طرح "عکس، تجلی اور تلبس" استعارات ہیں جو وہ خود اور ابن عربی استعمال کرتے ہیں۔ "ظل" بہر کیف "تجلی یا عکس" سے بہتر استعارہ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مفہوم اصل یا شئے کے مفہوم سے جدا ہے۔ نیز یہ کہ وہ اصل یا شئے پر مبنی ہے اور اس میں یہ بھی مضمر ہے کہ ظل کا وجود بمقابلہ اصل کے ہیچ ہے۔ بخلاف اس کے تجلی کا لفظ اس سے بالکل متضاد معنیٰ کو ظاہر کرتا ہے۔ ظل اور تجلی کے متضمنات میں یہ اختلاف بلاشبہ نہایت ہی اہم ہے اور اگر اس تحقیق میں احتیاط سے کام لیا جاتا تو بالکل واضح ہو جاتا کہ شیخ مجدد کا مقصود لفظ "ظل" سے صرف یہی ظاہر کرنا نہ تھا کہ وہ اصل یا

شئے سے جُدا ہے بلکہ یہ بھی کہ ظل محض معلول ہے اصل کا،یعنی یہ کہ فی الحقیقت وہ ایک فعل تخلیقی ہے اللہ کا۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجدد نے جن معنی میں لفظ ظل استعمال کیا ہے اس کی توضیح کی جائے کیونکہ اس اصطلاح کے غلط تصور سے ایک غلط احتمال پیدا ہو گیا ہے۔

بادیٔ النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجدد ظل کو کم و بیش "عکس یا پَرتَو" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جس سے یہ پہلو نکلتا ہے کہ گویا ظل کسی نہ کسی طرح اصل کا جز ہے۔ظلیت کے مقام پر وہ ظل کو اس معنی میں استعمال کرنے کی طرف مائل تھے۔اگرچہ وہاں بھی ان کے نزدیک ظل بمقابلہ عکس یا پرتو کے ایک ادنیٰ تر وجود کو ظاہر کرتا ہے۔[1]

بعد ازاں وہ لفظ ظل کو کثرت کے ساتھ اصل سے غیریت ظاہر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔[2] اور ان کا مقصود اس لفظ کے استعمال سے یہ ہے کہ اصل کے مقابلہ میں کثرت کی بے بضاعتی کا اظہار کیا جائے نیز یہ کہ کثرت کا وجود اصل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔[3]

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۳۶ تا ۲۶)

[تعجب ہے کہ شیخ محی الدین اور اس کے پیروکار ذات واجب تعالیٰ کو مجہول مطلق کہتے ہیں۔اور اس کے لئے کسی حکم کا ثبوت بھی نہیں کرتے۔اس کے باوجود اس کے لئے احاطہ اور قُرب اور معیت ذاتی بھی ثابت کرتے ہیں۔حالانکہ یہ بھی تو ذات واجب تعالیٰ کے لئے حکم کا ہی ثبوت ہے۔تو درست اور صواب وہی ہے جو علماء اہل سنت وجماعت نے کہا ہے کہ قُرب اور احاطہ علمی ہے۔]

---

[1] (دفتر دوم مکتوب ۱)

[2] (دفتر اول، مکتوب نمبر ۱٦۰)

[3] (دفتر دوم، مکتوب نمبر ۱۱)

تشریح

حضرت شیخ محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وحدت الوجود کے نظریہ کے بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ وہ اپنے کشف کے مطابق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو مجہول المطلق کہتے ہیں، اور دوسری جگہ اسی مجہول ذات کے ساتھ قُرب ومعیت ثابت کرتے ہیں جو کہ درست نہیں۔ مجہول الصفت ذات کے ساتھ قُرب اور معیت کیسے ممکن ہے جبکہ یہ دو باتیں ایک دوسرے کے ساتھ تضاد رکھتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ باتیں اپنی فصوص میں بیان کی ہیں جبکہ نصوص میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (۱) اللَّهُ الصَّمَدُ (۲) لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (الإخلاص ۳)

ترجمہ: تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔

پس ثابت ہوا کہ وحدت الوجود کی کیفیات ظلی ہیں اس لئے شیخِ کامل کو چاہیئے کہ اس کے جو مریدین اس حالت میں ہوں، اُن کو اس مقام سے نکالنے کے لئے ہر وقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے عاجزی وزاری کے ساتھ مشغولِ دعا رہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

سطور بالا میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ کے کلام میں تناقض وتضاد کی نشاندہی فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ ایک طرف تو فرماتے ہیں کہ ذاتِ حق تعالیٰ مجہول مطلق ہے اور غیر محکوم علیہ ہے یعنی ہمارے ادراکات ومحسوسات سے برتر وبالا ہے اور اس پر کسی قسم کا کوئی حکم ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود خود ہی اللہ تعالیٰ

کے احاطہ اور قرب ومعیت کو ذاتی بھی ثابت کرتے ہیں (جیسا کہ فصوص الحکم وغیرہ میں موجود ہے) یہ اس کی ذات پر حکم لگانا نہیں تو اور کیا ہے؟ لہٰذ آپ اس امر پر اظہار تعجب فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ کے یہ دو قول متناقض ہیں جب کہ حق وہی ہے جو اہلِ سنت وجماعت کے علماء متکلمین کا مسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عالمین کے ساتھ احاطہ اور قرب ومعیت ذاتی نہیں بلکہ علمی ہے۔ جیسا کہ آیت قرآنی بھی اس مسلک کی مؤید ہے: إِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (العنکبوت ٦) واضح رہے کہ ابن عربی کے کلام میں مزید کئی تناقض وتضاد موجود ہیں لیکن ہم ان کی جلالتِ شان کے پیش توجیہ وتاویل سے کام لیں گے۔

تناقضات کی توجیہات

یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت ابن عربی قدس سرہٗ کے کلام میں تناقضات اور اقوال میں کشفی اور نظری تسامحات کے باوجود حق تعالیٰ کے مقربین میں سے ہیں۔ طریقت میں ان کی اجتہادی غلطیاں، فقہاء کی اجتہادی غلطیوں کی طرح ہیں۔ لہٰذا ان کو مصیب ہی سمجھا جائے گا اور ان کے کلام کی توجیہات کی جائیں گی۔

اولاً: ان کے متناقض اقوال کو تعددِ اوقات واحوال پر محمول کیا جائے۔

ثانیاً: ان کے سُکریہ علوم ومعارف غلبۂ احوال اور سُکرِ وقت کا نتیجہ ہیں۔

ثالثاً: ان پر ردو طعن کی بجائے ان کے کلام کی تاویل کرنی چاہیئے۔

رابعاً: شاید ان کی تصانیف میں بعض الحاقی عبارتیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

جیسا کہ حضرت امام ربانی عبد الوہاب شعرانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

وَجَمِيْعُ مَاعَارَضَ مِنْ كَلَامِهٖ ظَاهِرَ الشَّرِيْعَةِ وَمَاعَلَيْهِ الْجَمْهُوْرُ فَهُوَ مَدْسُوْسٌ عَلَيْهِ۔ [1]

(یعنی) ان کا کلام جس قدر ظاہرِ شریعت اور طریقِ جمہور کے خلاف ہے وہ ان کے کلام میں خارج سے داخل کیا گیا ہے۔

بینہ نمبر ۱

حضرت ابن عربی قدس سرہٗ کے نظریہ ٔوحدت الوجود کے برعکس حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے جو نظریہ ٔتوحید پیش کیا ہے وہ کتاب وسنت کی روشنی میں علمائے اہلِ سُنت کے عقائد کے عین مطابق ہے۔ دونوں نظریات میں تطبیق دینا یا نزاعِ لفظی قرار دینا بعید از حقیقت ہے یہ اختلافات حقیقت پر مبنی ہیں۔

بینہ نمبر ۲

عصرِ حاضر کے بعض حضرات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت امام ربانی اور حضرت ابن عربی کے نظریات میں کوئی فرق واختلاف نہیں۔ دونوں وحدت الوجود کے قائل ہیں حاشا وکلا ان کی یہ کوشش عبث اور حد سے تجاوز کے مترادف ہے اگر مان بھی لیا جائے کہ ابنِ عربی کے کلام میں الحاقی عبارتیں شامل ہیں تو پھر بھی ان کی نشاندہی کرنا ایک ایسا مشکل امر ہے جس پر نہ کوئی تفصیلی حوالہ ملتا ہے اور نہ ہی کوئی دلیل موجود ہے۔ بصورت دیگر اگر متنازعہ عبارتیں الحاقی ہیں تو پھر ان کی تاویلات کرنے کا جواز باقی نہیں رہتا اور تردید کرنا لازم ہو جاتا ہے۔(واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۶۷ تا ۶۹)

---

[1] (الیواقیت والجواہر، فصل اول، ص ۲۳، مطبوعہ بیروت)

[اور جس وقت توحیدِ وجودی کے مشرب کے خلاف علوم و معارف حاصل ہوتے تھے۔ تو فقیر کو بڑا اضطراب اور بے چینی لاحق ہوتی تھی کیونکہ اس وقت یہ فقیر اس توحیدِ وجودی سے بلند تر کچھ نہیں جانتا تھا۔ اور بڑے عجز و زاری کے ساتھ دعا کرتا تھا کہ یہ معرفت کہیں زائل نہ ہو۔ یہاں تک کہ معاملہ کے چہرے سے تمام حجابات دور ہو گئے اور حقیقت جس طرح کہ چاہیئے تھی منکشف اور ظاہر ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ عالم اگرچہ کمالاتِ صفاتی کے آئینے اور اسماء کے ظہور کی جلوہ گاہ ہے، لیکن مظہر عین ظاہر نہیں۔ اور ظل عین اصل نہیں۔ جس طرح توحیدِ وجودی والوں کا مذہب ہے۔ یہ بحث ایک مثال سے واضح ہو جاتی ہے۔]

تشریح

کمالاتِ صفاتی سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ فعلیہ مراد ہیں۔ ساری کی ساری کائنات اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے صفاتِ فعلیہ کر پرَتو سے پیدا فرمائی ہے تو چونکہ یہ کائنات، صفاتِ فعلیہ کی مظہر ہے اس لئے یہ کائنات اور مخلوق عین (اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کی صفات) کے برابر نہیں ہو سکتیں جس طرح انسان کے سایہ کو انسان نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ توحیدِ وجودی (وحدت الوجود) والے کائنات (مظہر) کو اپنے کشف میں خدا (عین) دیکھتے ہیں جو کہ سراسر محال ہے۔

[مثلاً ایک ماہر عالم نے چاہا کہ اپنے گوناگوں کمالات کو میدانِ ظہور میں جلوہ گر کرے اور اپنے پسندیدہ مخفی اُمور کو معرض وضاحت میں لائے۔ اس نے حروف اور آوازوں کو ایجاد کیا اور حروف واصوات کے آئینوں میں ان مخفی کمالات کو ظاہر کر دیا۔ اس صورت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ حروف اور آوازیں جو ان مخفی کمالات کی جلوہ گاہ اور آئینے ہیں وہ اس کے کمالات کا عین ہیں یا بالذات اس کے کمالات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں یا بالذات اس کے قریب ہیں یا معیت ذاتی رکھتے ہیں۔ بلکہ ان

دونوں کے درمیان دالیت اور مدلولیت والی نسبت ہے۔ حروف اور آوازیں صرف ان کمالات پر دلالت کرتے ہیں۔ اور وہ کمالات خالص مطلق حالت پر موجود ہیں۔ عینیت، اتحاد اور احاطہ وغیرہ کی جو نسبتیں پیدا ہوئی ہیں وہ اوہام اور خیالات کی بنا پر ہیں فی الحقیقت ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی ثابت نہیں۔ لیکن چونکہ ان کمالات اور ان حروف واصوات کے درمیان ظاہریت اور مظہریت اور مدلولیت اور دالیت متحقق ہے۔ اسی مناسبت کے باعث بعض لوگوں کو بعض عوارض کے باعث وہ وہمی نسبتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ نفس الامر میں وہ کمالات ان تمام نسبتوں سے معرا اور مبرا ہیں۔ او جس نسبت میں ہم گفتگو کر رہے ہیں یعنی خالق اور مخلوق کے درمیان نسبت۔ تو یہاں دالیت اور مدلولیت و ظاہریت و مظہریت کے سوا اور کوئی علاقہ نہیں۔ عالم اپنے صانع تعالیٰ و تقدس کے وجود کی علامت ہے اور اس کے کمالات اسمائی اور صفاتی کے ظہور کا مظہر ہے۔ اور یہی تعلق بعض لوگوں کے لئے بعض عوارض کے واسطے بعض احکامِ وہمیہ کا باعث بن جاتا ہے۔

بعض لوگوں کو توحید سے متعلق کثرت مراقبات ان احکام کی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ کیونکہ ان مراقبات کی صورت قوتِ خیالیہ میں نقش ہو جاتی ہے۔ اور کچھ دوسرے لوگوں کو علمِ توحید اور اس کا تکرار ان احکام کا کسی قدر ذوق عطا کر دیتا ہے۔ لیکن توحید کی یہ دونوں صورتیں ضعیف ہیں اور دائرۂ علم میں داخل ہیں۔ حال سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اور بعض اور لوگوں کے لئے ان احکام کا منشاء غلبۂ محبت ہے۔ کہ محبوب کے غلبۂ محبت کی وجہ سے محب کی نظر سے غیر محبوب ہٹ جاتا ہے، اور محبوب کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ یہ بات نہیں کہ محبوب کے نفس الامر میں محبوب کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ بات حِس، عقل اور شرع کے خلاف ہے۔ اور بعض اوقات یہی محبت اور قُرب ذاتی کے حکم لگانے کا باعث بن جاتی ہے یہ توحید پہلی دونوں قسموں سے اعلیٰ ہے اور دائرۂ حال میں داخل ہے۔

اگرچہ نفس الامر اور شریعت کے مطابق وموافق نہیں۔ اور اس کی شریعت اور نفس الامر کے ساتھ مطابقت کرنا محض تکلف ہے۔ جس طرح دوسرے بہت سے بے کار فلسفی تکلفات ہیں جن کے متعلق فلاسفہ اسلام چاہتے ہیں کہ اپنے فاسد اصولوں کو قوانین شرعیہ کے مطابق کرلیں۔ "اخوان الصفا" اور اس طرح کی کتابیں اسی طرح کی ہیں۔

اس باب میں آخری بات اتنی ہے کہ خطاء کشفی خطائے اجتہادی کا حکم رکھتی ہے، کہ اس پر ملامت وعتاب نہیں ہے۔ بلکہ درجاتِ صواب میں سے ایک درجہ صواب کا ثابت ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ مجتہدین کے مقلد مجتہد کا حکم رکھتے ہیں اور خطا کی صورت میں بھی درجاتِ صواب میں ایک درجہ صواب کا پاتے ہیں۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اہلِ کشف کی تقلید کرتے ہیں۔ کہ یہ معذور قرار نہیں پاتے اور خطا کی صورت میں درجہ صواب سے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ کشف والہام دوسرے کے لئے حجت نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجتہد کا قول دوسرے کے لئے حجت اور دلیل ہے۔ لہٰذا اہلِ کشف کی تقلید احتمال خطا کی صورت میں جائز نہیں ہے اور مجتہد کی تقلید احتمال خطا کی صورت میں بھی جائز اور درست ہے، بلکہ واجب ولازم ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے ایک بہترین نکتہ بیان کرکے سالکین کو خطا سے بچالیا ہے اور وہ یہ کہ مجتہد کی تقلید لازم وضروری ہے چاہے وہ خطاءِ اجتہادی ہی ہو۔ کیونکہ خطاءِ اجتہادی والا مجتہد خود بھی صواب پر ہوتا ہے اور اس کی تقلید کرنے والے بھی۔ جبکہ خطاءِ کشفی والا (صوفی) اپنے کشف پر خود تو عمل کرسکتا ہے لیکن اُس کا کشف دوسروں کے لئے دلیل نہیں بن سکتا۔

مثال کے طور پر جب کسی کے جسم سے خون نکل کر بہہ جائے تو حضرت امامِ اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک وضوء ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تقلید کرنے والوں پر حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس فتویٰ کے مطابق عمل کرنا اور نیا وضوء کرنا واجب ہے۔ جبکہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک خون نکل کر بہہ جانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا تو اُن کے مقلدین کے لئے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تقلید کی وجہ سے نیا وضوء کرنا ضروری نہیں بلکہ اُسی وضوء سے نماز درست ہو گی اگرچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مسئلہ میں خطا کی ہے۔ لیکن چونکہ وہ عظیم مجتہد تھے اس لئے خطا کر کے بھی انہوں نے ایک درجہ ثواب حاصل کر لیا اور ان کے پیر وکاروں پر اُن کی پیروی کرنا لازم وضروری ٹھہری جبکہ دوسری طرف اگر کوئی صوفی یا شیخ اپنے کشف میں دیکھے کہ اُسے نمازِ تراویح کے معاف ہو جانے کی خوش خبری دی گئی ہے تو اُسے خطاءِ کشفی پر عمل کرنا درست نہیں نہ ہی اس کے مریدین کے لئے یہ کشف دلیل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے مجتہد کی پیروی کو واجب کہا ہے نہ کہ پیر صاحب کے کشف کو۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم مشائخ کی تقلید نہ کریں۔ مشائخ کرام کی تقلید بھی ضروری ہے لیکن اس وقت جب اُن کے کشف اور تعلیمات شریعتِ حقہ کے مطابق ہوں۔ اور جب وہ خلافِ شرع حرکات کرنے لگیں اور لوگوں کو شریعت سے دور لے جائیں تو ان سے دوری کرنا اور ان کی اطاعت نہ کرنا ضروری ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ النورانی فرماتے ہیں کہ توحید وجودی کے قائلین ذات اور کائنات کے درمیان اتحاد وعینیت، احاطہ ومعیتِ ذاتیہ کی نسبتیں ثابت کرتے ہیں۔ یہ سب وہم وخیال کی

پیدا اوار ہیں۔ حق یہ ہے کہ ذات اور کائنات کے درمیان خالقیت اور مخلوقیت، دالّیت اور مدلولیّت اور ظاہریّت ومظہریّت کے تعلق کے سوا اور کوئی تعلق یا نسبت ثابت نہیں ہے۔ یعنی مخلوق اپنے خالق کے وجود پر علامت ہے۔ کائنات ذات کے وجود پر دلالت ہے اور خلق حق تعالیٰ کے اسمائی وصفاتی کمالات کا مظہر ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حق اور خلق کے درمیان یہی نسبتیں بعض عوارض کی بناء پر بعض لوگوں کے لئے احکامِ وہمیہ کے حصول کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ ان عوارض واسباب کی تشریح فرماتے ہیں۔

وہ عوارض جو توحیدِ وجودی کے قول کا سبب ہیں

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ توحید وجودی کا قول کرنے والے سالکین کو تین قسم کے عوارض پیش آتے ہیں:

عارضِ اول

بعض سالک توحید کے مراقبوں کو اتنی کثرت سے کرتے ہیں کہ ان مراقبوں کی صورت ان کی قوتِ خیالیہ پر نقش کالحجر ہو جاتی ہے یعنی کلمۂ نفی اثبات کا تکرار کرتے وقت ذہن میں اس کا معنیٰ ملحوظ رکھتے ہیں اور یہی معنیٰ کثرتِ تکرار کی وجہ سے ان کے قلب وذہن میں راسخ ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ وحدتِ وجود کا قول کرنے پر مُصر ہو جاتے ہیں۔

عارضِ ثانی

بعض سالکوں کو توحیدِ وجودی کا ظاہری علم (جو تکرار کی وجہ سے اور فتوحات وفصوص کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے) ایک خاص قسم کا ذوق بخش دیتا ہے جس سے رہائی پانا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ علمی اور ذوقی طور پر توحیدِ وجودی کا قول کرتے ہیں۔

عارضِ ثالث

کچھ سالکین ایسے بھی ہوتے ہیں جو غلبۂ محبت کی بناء پر محبوب کے علاوہ ہر شئے کی نفی پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ محبت کی شدت غیر محبوب کے وجود کو قبول نہیں کرتی حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے اور توحید وجودی کی یہ قسم پہلی دونوں قسموں کی توحید سے اعلیٰ ہے اور حال کے دائرہ میں داخل ہے اگرچہ یہ بھی ظاہری حواس، عقل اور شریعت کے موافق نہیں لیکن توحید وجودی کی پہلی دونوں قسمیں ضعیف اور علم و قال کے دائرہ میں داخل ہیں حال سے ان کا کچھ بھی تعلق نہیں۔ لہٰذا توحید وجودی کے ان احکام وہمیہ کو شریعت و حقیقت کے ساتھ تطبیق دینا بیجا تکلف کے مترادف ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۷۰ تا ۷۲)

[اور بعض سالکوں کا شہود جو تعینات کونیہ کے آئینوں میں ہوتا ہے وہ بھی گزشتہ احکام کے قبیلہ میں سے ہے۔ اور اس شہود کو شہودِ وحدت در کثرت یا شہودِ احدیت در کثرت کا نام دیتے ہیں کیونکہ واجب تعالیٰ و تقدس جو بے مثل و بے مثال ہے، صاحب مثل اشیاء کے آئینوں میں نہیں سما سکتا اور کیفیات ممکنہ رکھنے والی اشیاء میں جلوہ گر نہیں ہو سکتا۔ لا مکانی ذات مکان میں نہیں آسکتی۔

بے چون ذات کو چون کے دائرہ سے باہر تلاش کرنا چاہیئے اور لا مکانی ذات کو مکان سے ماوراء میں طلب کرنا چاہیئے۔ آفاق و اَنفس میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ اس سبحانہٗ و تعالیٰ کے نشانات ہیں۔ دائرۂ ولایت کے قطب یعنی حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے:

"جو کچھ دیکھا یا سُنا یا جانا گیا ہے وہ خدا تعالیٰ کا غیر ہے۔ کلمہ لا کی حقیقت سے اس کی نفی کرنی چاہیئے"۔

در تنگنائے صورت معنی چگونہ گنجد

در کلبہ گدایاں سلطاں چہ کار دارد

صورت پرست غافل معنی چہ داند آخر

کو باجمال جاناں پنہاں چہ کار دارد

ترجمہ: صورت کے تنگ مقام میں معنی کیسے آسکتا ہے؟ اور گداؤں کے حجرہ میں بادشاہ کا کیا کام ہے؟ صورت پرست غافل شخص معنی کو کیا جان سکتا ہے؟ یہ معشوق کے جمالِ پوشیدہ سے کیا تعلق قائم کر سکتا ہے؟

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اکثر مشائخ طریقت کی عبارات میں چاہے وہ نقشبندی ہوں یا غیر نقشبندی صریح طور پر وحدتِ وجود اور احاطہ اور قُرب و معیت ذاتی اور شہودِ وحدت در کثرت اور احدیت در کثرت وارد اور موجود ہے۔ میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ یہ شہود و احوال راستے کے وسط میں ان کے سامنے آئے ہیں۔ اس کے بعد انہیں اس مقام سے آگے گزار لیا گیا۔ جیسا کہ فقیر نے گذشتہ صفحات میں اپنے حالات کا ذکر کیا ہے۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ کچھ حضرات کو احدیت صرف کی جانب میں پوری نگرانی کے باوجود ان کے ظاہر کو جو کثرت بین ہے، ان احکام اور اس شہود کے ساتھ مشرف کرتے ہیں، باطن میں احدیت کے نگران رہتے ہیں اور ظاہر کے لحاظ سے کثرت میں مطلوب کا مشاہدہ کرتے ہیں، جیسا کہ اس فقیر نے اس مکتوب کی ابتداء میں اپنے حال کی خبر دی ہے۔ اور اس جواب کی تحقیق تفصیل کے ساتھ اس رسالہ میں جو وحدت وجود کے مراتب میں لکھا گیا ہے لکھ دی گئی ہے۔ یہ مقام اس مذکورہ گفتگو کی گنجائش نہیں رکھتا۔

یہ نہ کہا جائے کہ ''جب نفس الامر میں متعدد وجود ہیں اور قُرب واحاطہ ذاتی نہیں ہے۔ نیز وحدت کا شہود کثرت میں مطابق واقع نہیں ہے۔ لہٰذا ان بزرگواروں کا حکم کذب پر مشتمل ہو گا''۔ کیونکہ نفس الامر اور واقع کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں نے اپنے اندازے کے مطابق حکم لگایا ہے۔ جس طرح ایک شخص یہ بات کہے کہ میں نے آئینے میں زید کی صورت دیکھی ہے۔ یہ حکم بھی واقع کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ آئینے میں اس کی صورت کو نہیں دیکھا۔ کیونکہ آئینے میں کوئی صورت اصلاً ہے ہی نہیں جسے دیکھا جاسکے۔ اس شخص کو بھی عرف میں کاذب نہیں کہتے۔ اگرچہ اس کی یہ بات نفس الامر کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ یہ حکم لگانے میں معذور ہے، جھوٹ بولنے کی ملامت کا وہ مستحق نہیں ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

جن احوال کو پوشیدہ رکھنا چاہیئے ان کے ظاہر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اگر اس فقیر نے وحدتِ وجود کو قبول کیا تھا تو وہ کشف کی بنا پر تھا، تقلید کی بنا پر نہیں تھا۔ اب اگر اس کا انکار کر رہا ہوں تو وہ بھی الہام کے باعث، اور الہام انکار کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اگرچہ دوسروں کے لئے حجت بھی نہیں ہے۔

جھوٹ کا شبہ دور کرنے کا دوسرا جواب یہ ہے کہ عالم کے افراد بعض باتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مشترک ہیں اور بعض باتوں میں ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا ہیں۔ بعض امور عرفیہ میں ممکن کا واجب تعالیٰ وتقدس کے ساتھ بھی اس قسم کا اشتراک ہے۔ اگرچہ ممکن، واجب ذات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ غلبہ محبت کی بنا پر ما بہ الامتیاز چیز نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ اور ما بہ الاشتراک نظر کے سامنے رہتی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں ایک دوسرے کے عین ہونے کا

حکم لگادیں تو یہ واقع کے مطابق ہے۔ اس میں کذب کی بالکل کوئی مجال و گنجائش نہیں۔ اور احاطہ ذاتی وغیرہ کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیئے۔ والسلام]

تشریح

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے زمانے میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جذب وسلوک کو رفتہ رفتہ طے کرنے کی ضرورت نہ پڑی تھی، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا سلوک آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی پہلی ہی مجلس میں طے ہو جاتا تھا، اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی ایک ہی نظر اُن کو مقاماتِ عالیہ پر مشرف فرما دیتی تھی لیکن تصرف کی یہ طاقت صرف حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی، اور قدرت کی وہ عطا صرف اُن پاک ہستیوں کو ہی ملی تھی۔ پھر وہ نسبت اور کیفیت پردۂ خفا میں چلی گئی اور ایک ہزار سال گزرنے پر ہزار سالہ دوسرے مجدد کے لئے پھر ظاہر ہوئی۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی مجالس میں بھی وراثت اور تبعیت کے طور پر آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مریدین پر وہ فضل ہوا اور وحدت الشہود کی کامل و مکمل کیفیات اس امت کے آخری دور میں حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجالس و محافل میں نمایاں ہوں گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا دور گزرنے کے بعد مشائخِ اُمت نے لطائفِ عشرہ (یعنی قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ، نفسی اور قالبی) کو وضع کیا اور تصوف کی اصطلاحات کو متعارف کیا۔ اور ان اکابر کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہی سالکینِ سلاسلِ اربعہ واصل باللہ ہوئے۔

یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا منبع فیض اصل سے ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اسی اصل سے فیض اخذ کیا ہے، جبکہ باقی اولیائے امت ظل سے فیض اخذ

کرتے ہیں۔ اور ظل سے فیض لینے والوں سے کرامات اور خارق العادات اُمور کا وقوع زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے جتنی کرامات اولیاء سے ظاہر ہوئیں، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اتنی ظاہر نہیں ہوئیں لیکن خوارق و کرامات کا زیادہ وقوع فضیلت کو ثابت نہیں کرتا۔

انسان کی دنیاوی واخروی نجات اس بات میں ہے کہ سب سے پہلے عقائدِ اہل سنت و جماعت کے مطابق اپنے عقائد کو درست کرے، پھر ضروریات کا علم حاصل کرے اور اُس کے مطابق عمل کرے اور عمل میں اخلاص پیدا کرنے کے لئے کسی شیخ کامل سے سلوک طے کرے۔ اگر ان تمام امور کے ساتھ احوال و مواجید حاصل ہو جائیں تو زہے نصیب ورنہ کامیابی کا دارو مدار احوال و کیفیات پر نہیں بلکہ علم و عمل پر ہے۔

سالک کو ہمیشہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیئے کہ "اے اللہ! مجھے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم واامامانِ دین کے بتائے ہوئے راستہ پر استقامت عطا فرما اور خاتمہ بالا یمان نصیب فرما" لوگ اپنے اسلاف اور فقہاء کو فراموش کر چکے ہیں، ٹی وی اور نیٹ پر جس عالم کو دیکھتے اور سُنتے ہیں اُسی کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے آیا وہ ہماری فقہ کے مطابق ہے بھی یا نہیں۔ یا اس کے عقیدے درست ہیں کہ نہیں۔ پس جو عالم، فقہ کے اصول و قوانین اور عقائدِ احناف کے مطابق فیصلہ دے اُسے قبول کر لیں اور جو اسلامی قوانین کی رُو کے خلاف قول و عمل رکھے اُس کی اتباع نہ کریں۔ فلاح و کامیابی کا یہی ایک فارمولا ہے۔

ولایت کا دوسرے مکاتیب میں بھی آیا ہے اور یہاں بھی اس کا ذکر ہے۔ اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ ایک وَلایت ہے اور دوسرا اِولایت۔ "و" کے زَبر کے ساتھ وَلایت قُرب اور دوستی کو کہا جاتا ہے جبکہ "و" کی زیر کے ساتھ وِلایت تصرف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

یہاں وَلایت کا لفظ استعمال کر کے قُرب و دوستی کا مفہوم بیان کرنا مقصود ہے۔ اصطلاحِ تصوف میں وَلایت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی دوستی کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ دوستی اور قُرب بلا کیف ہے۔ یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا مُقرب بندہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے نزدیک یوں نہیں ہوتا جیسے ہم کسی چیز سے فاصلہ کم کر کے نزدیک ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ نزدیکی ایسی دو چیزوں میں ہوتی ہے جو مادہ سے بنی ہوں اور جسم رکھتی ہوں جبکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تو مادہ اور جسم سے پاک ہے۔ پس وہ قُرب جو بندے کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے وہ قُرب ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی اطاعت اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے اور اُس کی کیفیت و تفصیل بیان سے باہر ہے۔ وہ ایسا حال ہے جو قال میں نہیں آسکتا اور جسے وہی جان سکتا ہے جو اس پر فائز ہو۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

مشائخ نقشبندیہ کی ان عبارتوں کا جواب جو توحیدِ وجودی پر دلالت کرتی ہیں

اس مکتوب میں آپ نے مشائخ نقشبندیہ اور بعض دوسرے مشائخ کی ان عبارتوں کا جواب دیا ہے جو توحیدِ وجودی پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ان مشائخ عظام کو یہ احوال و شہود درمیان میں پیش آئے ہوں گے اور اس کے بعد وہ اس مقام سے گزر گئے ہوں گے جیسا کہ آپ خود بھی ان احوال سے گزرے تھے۔ نیز ان میں سے بعض مشائخ کے ظاہر کو جو کثرت بین ہیں۔ باطن میں احدیتِ صرف کی پوری پوری نگرانی حاصل ہونے کے باوجود ان احکام و شہود سے حکمتًا مشرف

فرمایا گیا۔ جیسا کہ ابتداءِ مکتوب میں آپ نے اپنے والد ماجد حضرت شیخ عبد الاحد قدس سرہٗ کے حال کی خبر دی۔

وحدت الوجود سے انکار

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے ابتدائے سلوک میں وحدت الوجود کو قبول فرمایا تھا لیکن بعد میں اس سے انکار فرمادیا اور توحیدِ وجودی پر اصرار کرنے والے بزرگوں کے احوال واقوال کی تاویل فرماتے رہے۔ آپ کا یہ موقف ترویجِ شریعت کے لئے تجدیدی حکمتوں پر مبنی تھا۔ آپ کا کلام تضادات سے مبرا ہے لیکن احوال کی تبدیلی کے پیش نظر بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں آپ نے اس مکتوب میں صراحت کے ساتھ فرمادیا کہ:

"اگر قبولِ وحدتِ وجود بودہ است از کشف بودہ است نہ از روئے تقلید واگر انکارست ہم از الہام است"۔

(یعنی) اگر ابتداء میں اس فقیر کو وحدت الوجود قبول رہا ہے تو وہ کشف کی بناء پر تھا نہ کہ تقلید کے طور پر اور اگر اب وحدت الوجود سے انکار کر رہا ہے تو یہ بھی الہام کی وجہ سے ہے اور الہام میں انکار کی گنجائش نہیں ہے اگرچہ دوسروں کے لئے الہام حجت نہیں۔

آپ کے ارشاد سے واضح طور پر آپ کا وحدت الوجود کی صحت سے انکار ثابت ہو رہا ہے ہمارے ایک ہم عصر مصنف کیپٹن واحد بخش سیال چشتی صابری نے اپنی تصنیف "وحدت الوجود اور وحدت الشہود" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ حضرت امام ربانی بھی وحدت الوجود کے قائل تھے، ان کے اور ابن عربی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ان کی یہ تحقیق ایک مفروضے سے

زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتی اسی طرح دونوں نظریات میں تطبیق دے کر نزاعِ لفظی ثابت کرنے والے حضرات نے بھی تکلفاتِ بعیدہ کا ارتکاب فرمایا ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک وحدت الوجود غلبہ سُکر کا نتیجہ ہے اور سکر کا تعلق مقامِ ولایت سے ہے اس سے بالاتر مقام صحو وارشاد ہے جس کا تعلق مقامِ نبوت سے ہے۔ وحدت الشہود کے معارف علومِ نبوت سے مقتبس ہیں اور یہ امر واقعی ہے کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے بعد آج تک آپ جیسا صاحبِ کشف والہام عارف پیدا نہیں ہوا یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عربی کے فلسفۂ توحید پر جس طرح آپ نے تبصرہ فرمایا ہے کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ آپ کے بیان کردہ ایرادات کا شافی جواب دے سکے۔ جن حضرات نے آج تک ان حقائق کے بارے میں لب کشائی فرمائی ہے وہ علم و عقل اور فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہے ہیں۔ کشف و شہود کی بنیاد پر وہ توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی پر قلم نہ اٹھا سکے لہٰذا حضرت مجدد کے نظریۂ توحید پر ان کے اعتراضات سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہیں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۷۲ تا ۷۴)

مکتوب نمبر ۳۲

[اس کمال کے بیان میں جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اولیاء میں سے کم ہی کسی کو اس کمال سے مشرف کیا گیا ہے۔ اور حضرت امام مہدی میں اَتم طریقہ سے اس کا ظہور ہو گا۔ اور وہ کمال نسبت جذبہ و سلوک سے فائق ہے۔ اور اس بات کے بیان میں کہ پیشہ اور کار کا کمال ایک دوسرے کے افکار کے آپس میں ملنے سے ہوتا ہے۔ اور اس میں زیادتی اور اضافہ مسلسل نظر و فکر سے ہوتا ہے۔ پیر کی نسبت اگر اسی صرافت پر رہے تو موجب نقصان ہے۔ لائق مرید کو چاہیئے کہ اسے کمال تک لے جائے۔ اور اس کے مناسب اُمور کے بیان میں۔۔۔۔ مرزا حسام الدین احمد کی طرف صادر فرمایا:

آپ کا التفات نامہ گرامی وارد ہوا۔ اللہ کی حمد اور اس کا احسان کہ دور افتادہ لوگ یاد سے او جھل نہیں ہوئے اور کسی نہ کسی وقت ان کا ذکر ہو جاتا ہے۔

بارے بہیچ خاطر خود شادمی کنم

پیر دستگیر علیہ الرحمۃ کی نسبت خاصہ کے حاصل نہ ہونے کے متعلق آپ نے لکھا تھا اور اس کا سبب دریافت کیا تھا۔

مخدوم گرامی! اس قسم کی باتوں کی شرح بطور تحریر بلکہ بطور تقریر اور زبانی بیان بھی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ تاکہ کسی فہم میں کچھ اور نہ آجائے اور کچھ اور ہی مطلب نہ اخذ کر لے۔ حُسنِ ظن کے ساتھ پیر کی خدمت میں حاضری یا صحبت دراز جس طرح بھی ہو درکار ہے۔ اس کے بغیر رنج و محنت اٹھانے کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

آسودہ شبے باید و خوش مہتابے　　　　تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

ترجمہ: آرام دہ رات ہو اور خوش طبع چاند جیسا معشوق۔ تا کہ تجھ سے ہر باب کی حکایت بیان کروں۔]

تشریح

چونکہ تصوف کا راستہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے واصل کرنے کا راستہ ہے اس لئے شیطان کب یہ برداشت کر سکتا ہے کہ لوگ اُس کی تابعداری کی بجائے جذبہ وسلوک کی راہ سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے مُقرب بندے بنیں۔ لہٰذا وہ مختلف حیلے بہانوں سے مریدین کو ان کے مشائخ کرام سے متنفر کرنے میں مشغول رہتا ہے اور ناقص و بے علم سالک بھی اس کے بہکاوے میں آکر شیخ پر اعتراضات شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ تصوف وہ میدان ہے جس میں شیخ پر اعتراض زہرِ قاتل ثابت ہوتا ہے اور مُرید کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔

بعد ازاں مریدین کو طرح طرح کے وسوسے آنے شروع ہو جاتے ہیں، وہ سوچتے ہیں کہ ہمارے سارے افعال سے ہمارے شیخ صاحب آگاہ ہیں، اس لئے جب اُن کی صحبت میں جائیں گے تو وہ ہماری باز پُرس کریں گے اور یوں ہمیں شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ کبھی یہ وسوسہ آتا ہے کہ وہ فلاں مُرید سے زیادہ پیار کرتے ہیں جبکہ ہمارے حال پر تو ذرا بھی توجہ نہیں فرماتے۔ یہ سارے وسوسے اُنہیں پیر و مرشد سے دور لے جاتے ہیں۔ اور وہ ترقی کی راہ اپنے لئے خود بند کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر اس طرح کی حالت پیدا ہو جائے تو سالک کو چاہیئے کہ **ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** کا ورد کرے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے توبہ واستغفار کرے۔ ورنہ شیطان اپنے مکر و فریب میں کامیاب ہو جائے گا اور سالک کو ایک نہ ایک دن دینِ اسلام سے بھی باغی کر دے گا۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

اکابرِ نقشبندیہ کی نسبتِ خاصہ

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی بارگاہ عالیہ میں حضرت میرزا حسام الدین احمد نے ایک مکتوب ارسال کیا تھا جس میں تحریر تھا کہ ہمارے پیر دستگیر خواجہ باقی باللہ دہلوی قدس سرہٗ کی نسبتِ خاصہ کے بارے میں آپ نے جو معارف (زبان یا قلم سے) بیان فرمائے ہیں یہ معارف حضرت کے وقت میں سُننے میں نہیں آئے تھے حالانکہ ہم دونوں پیر بھائی ہیں۔ لہٰذا آپ ان معارف کی تشریح فرمائیں کہ یہ آپ پر کہاں سے منکشف ہوئے اور اس کا سبب کیا ہے؟ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ میرے مخدوم! اکابرِ نقشبندیہ کی نسبتِ خاصہ کے معارف دراصل صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے معارف ہیں جو اس فقیر پر ہزار سال کے بعد الف ثانی کے آغاز میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اس قسم کے معارف تحریر و تقریر کے ذریعے معلوم نہیں ہو سکتے ان کی دریافت حُسنِ ظن اور یقینی عقیدت کے ساتھ عرصۂ دراز تک صحبت و ملازمت اختیار کرنے پر مبنی ہے۔ اس کے بغیر خاردار درخت پر ہاتھ مارنے کے مترادف ہے۔

بینہ نمبر ۱

علوم و معارف باطنیہ کا حصول حُسنِ ظن اور دیرپا صحبت کا متقاضی ہے کیونکہ یہ علوم و معارف کشف و شہود کی راہ سے آتے ہیں، لہٰذا اپنے شیخ اور مربی کے معاملے میں قلبی طور پر حُسنِ ظن اور اعتماد لازمی ہے کیونکہ تخمین و ظن سے شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں نیز اولیاء کرام کی صحبت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

عارفِ رومی نے فرمایا:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

(یعنی) اولیاء اللہ کی تھوڑی سی صحبت بھی سو سال کی بے ریا نفلی عبادات سے بہتر ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۷۸، ۷۹)

[لیکن سوال کا جواب چاہیئے کے مطابق فقیر اتنی بات عرض کرتا ہے کہ ہر مقام کے علوم و معارف جداگانہ ہیں اور احوال و مواجید بھی الگ ہیں۔ ایک مقام کے مناسب ذکر اور توجہ ہے اور دوسرے مقام کے مطابق کتاب اللہ شریف کی تلاوت اور نماز ہے۔ ایک مقام نسبت جذبہ سے مخصوص ہے اور دوسرا سلوک سے۔ اور ایک مقام میں ان دونوں دولتوں کی آمیزش ہے۔ اور ایک وہ مقام ہے جو جہت جذبہ اور سلوک دونوں سے جدا ہے، نہ جذبے کا اس سے کوئی تعلق ہے اور نہ سلوک کا اس سے کوئی علاقہ۔ یہ مقام نہایت ہی اعلیٰ ہے۔ حضور نبی کریم علیہ و علیٰ اٰلہ و علیہم من الصلوات افضلہا و من التسلیمات اکملہا اسی مقام کے ساتھ ممتاز ہیں اور اسی دولتِ عظمیٰ سے مشرف ہیں۔ دوسرے مقامات والوں سے اس مقام والا مکمل امتیاز رکھتا ہے۔ اور اس مقام کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بہت کم مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کے خلاف دوسرے مقامات والے حضرات ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں، اگرچہ کسی وجہ کی مشابہت ہو۔ یہ نسبت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں انشاء اللہ تعالیٰ اَتم طریقہ پر ظاہر ہو گی۔]

تشریح

تصوف و سلوک اولیاء کرام کا وضع کردہ ایک ایسا راستہ ہے جس کی اساس قرآن عظیم الشان اور احادیثِ مبارکہ کی بنیادی تعلیمات ہیں، اسی لئے ہر وہ طریقہ جو قرآن عظیم الشان اور احادیثِ

مبارکہ کے مخالف ہو وہ مردود ہے۔ وہ تصوف جو اولیاء کبار نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے سیکھ کر اپنے شاگردوں تک پہنچایا اُس کے چند ضروری قوانین واصول بھی بیان فرمائے اور انہیں اصول وضوابط پر عمل کر کے سالکینِ طریقت نے وصل کی منازل طے کیں اور جن مکتوبات شریف کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں یہ بھی ان ہی تعلیمات کو بیان کرتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے اس مکتوب شریف میں تصوف کا ایک زریں اصول یہ بیان کیا ہے کہ:

ولایت کے تین درجے ہیں اور ہر درجے میں سالک کو اپنے درجے کے مطابق محنت کرنی چاہیئے۔ اور اس کی تفصیل یوں ہے کہ پہلا درجہ ولایتِ صغریٰ کہلاتا ہے اور یہ ولایت اولیاء کرام کی ہے۔ دوسرا درجہ ولایت کبریٰ کا ہے اور یہ ولایت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہے جبکہ تیسرا درجہ ولایتِ ملاء الاعلیٰ کا ہے اور یہ ولایت فرشتوں کی ہے۔

ولایتِ صغریٰ والے سالک کو چاہیئے کہ اسمِ ذات کا ذکر کثرت سے کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے شیخ ومربی کی صحبت کو اپنے اوپر لازم کر لے۔ لوگ بیعت تو کر لیتے ہیں لیکن اس کے بعد نہ تو ذکر کرتے ہیں نہ ہی شیخ کی محافل میں شریک ہوتے ہیں اور پھر یہ شکوہ کرنے لگتے ہیں کہ فلاں ہم سے زیادہ ترقی کر چکا ہے اور ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔ کبھی اپنے شیخ سے بدگمانی کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف میں لوگوں کی کثرت سے شمولیت کے باوجود نہ تو ان کی اخلاقی حالت تبدیل ہوتی ہے نہ وہ شریعت کے پابند نظر آتے ہیں اور نہ ہی اُن پر ترقی کے اثرات نظر آتے ہیں۔

جب سالک ولایتِ صغریٰ کو مکمل کر لیتا ہے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل سے ولایتِ کبریٰ میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں سالک کو دو کام کثرت سے کرنے چاہئیں یعنی قرآن عظیم الشان کی تلاوت اور

فرائض وواجبات کے علاوہ نفلی نماز کی کثرت۔ اور یہ دو وظائف ہی ولایتِ کبریٰ میں سالک کی منازلِ سلوک کو طے کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ سالک اپنی ولایت کے لوازمات پر کاربند رہ کر ہی اگلے مراتب تک پہنچتا ہے۔ اگر وہ ان لوازمات پر عمل نہ کرے اور اپنی مرضی کے ورود و وظائف میں مشغول ہو جائے تو نہ تو اُس کے لطائف پختہ ہوں گے اور نہ ہی اُس کی روحانی ترقی ہو گی۔ بلکہ اس کا قیمتی وقت ضائع ہو گا۔

تیسرا درجہ ولایتِ ملاء الاعلیٰ کا ہے۔ ولایتِ کبریٰ کے وظائف کے ساتھ اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو جائے تو سالک ولایتِ کُبریٰ سے ترقی کر کے ولایت ملاء الاعلیٰ میں داخل ہو جاتا ہے یہاں پر سالک کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے وصل کے لئے دیگر ضروری امور (جن کی تفصیل آ گے آرہی ہے) کے ساتھ صرف لمبی نماز فائدہ پہنچاتی ہے۔

ضروری ہے کہ شیخ اپنے مریدین کو تصوف کے اسی قاعدے کے مطابق چلنے کا حکم کرے اور مریدین کو چاہیئے کہ وہ بھی ان ہی طریقوں کے مطابق اپنی سمت متعین کریں۔ البتہ ان سب ضروریات کے ساتھ بلکہ ان سے پہلے وہ ضروری امور مدِ نظر رکھے جائیں جن پر عمل پیرا ہونا ہر کلمہ گو مسلمان کے لئے بالعموم اور سالک کے لئے بالخصوص ضروری ہے اور ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ سب سے پہلے اہل سنت وجماعت کے عقائد کے مطابق اپنے عقائد کو درست کرے۔

۲۔ پھر فقہ کے ضروری مسائل اور حلال و حرام کا علم حاصل کرے۔

۳۔ علم کے بعد اُس پر عمل کرے۔ فرائض وواجبات کا تارک کبھی اور کسی صورت میں کامیاب سالک نہیں بن سکتا۔ گویا سلوک کے لئے فرائض وواجبات ایسے ہی ہیں جیسے نماز کے لئے وضو۔ اور ان کے ساتھ ساتھ سنن ومستحبات پر عمل کرنا۔ حرام ومکروہات سے بچنا اور مباح امور سے

حتی الوسع دور رہنانہایت ضروری ہے۔ بلکہ آسان الفاظ میں یوں کہنازیادہ مناسب ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا مُقرب بندہ اور سالک وہ شخص ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مبارک زندگیوں کا عمل نمونہ ہو۔ اور جو شخص ان مبارک ہستیوں کی کامل اتباع نہ کر سکے لیکن حتی الوسع ضروری امور کی پابندے کرے اور جب اس سے کوئی خلاف شریعت عمل ہو جائے تو فوراً سچے دل سے استغفار کرلے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اسے بھی کامل اتباع کا درجہ عنایت کرتا ہے۔ لیکن جو شخص سُستی اور کوتاہی کرے اور خلافِ شریعت امور میں مشغول رہے اسے چاہیئے کہ کامیابی وکامرانی اور ولایت کے درجات کی لمبی امیدیں نہ لگائے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ہر مقام کے علوم ومعارف جدا اور احوال ومواجید مختلف ہوتے ہیں، مثلاً سالک کے لئے ایک مقام میں ذکر اور توجہ مناسب ہے اور دوسرے مقام میں تلاوت اور نماز، کوئی مقامِ جذبہ (سیر انفسی) کے ساتھ خاص ہوتا ہے، کوئی مقام سلوک (سیر آفاقی) کے ساتھ۔ ایک مقام جذبہ وسلوک دونوں کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے اور ایک مقام ان دونوں جہتوں (جذبہ وسلوک) سے جدا ہوتا ہے۔ اس مقام میں جذبہ کا سلوک سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور سلوک کا جذبہ کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ مقام نہایت عجیب وغریب ہے اور اس مقام کے ساتھ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ممتاز ومشرف ہیں۔ اس مقام والوں کو دوسرے مقامات والوں سے مکمل امتیاز اور انفرادی شان حاصل ہے۔ یہ نسبت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد انشاء اللہ حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذاتِ اقدس میں پوری طرح ظاہر ہوگی اور ان کو تصرفات ظاہری وباطنی بھی پورے طور پر حاصل ہوں

گے یعنی وَلایت (بفتح واوْ) کے ساتھ وِلایت (بکسر واوْ) سے بھی بہرہ یاب ہوں گے کیونکہ وَلایت (واؤ پر زبر کے ساتھ) کا معنیٰ قُربِ حق ہے اور وِلایت (واؤ کے نیچے زیر) کا معنی تصرف ہے۔ یہ مقام جذبہ اور سلوک سے بلند تر ہے کیونکہ جذبہ و سلوک کمالاتِ ظلیہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور یہ مقام کمالاتِ اصلیہ کے ساتھ ممتاز ہے اور کمالاتِ اصلیہ فقط سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی صحبت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کمالاتِ ظلیہ (جذبہ و سلوک) کے بغیر براہِ راست کمالات اصلیہ سے مشرف تھے۔ ان کے علاوہ اکابر اولیاء بھی اگر کمالاتِ اصلیہ سے مشرف ہوئے ہیں تو وہ بھی کمالاتِ ظلیہ کے حصول کے بعد ہی اس سعادت سے بہرہ مند ہوئے ہیں (اس میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا اپنی ذات کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے) یہی کمالاتِ اصلیہ مشائخ نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی نسبتِ خاصہ ہے جو حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وساطت سے تبعیت کے طور پر انہیں حاصل ہے۔ باقی سلسلوں کے مشائخ میں سے بہت کم مشائخ نے اس مقام کی خبر دی ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس مقام کے علوم و معارف کے متعلق گفتگو کی ہو۔

حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اسی نسبتِ خاصہ (نقشبندیہ) کی تکمیل فرمائیں گے

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا:

انگارم کہ حضرت مہدی موعود کہ باکملیت ولایت معہود است نیز برین نسبت خواہد بود و تتمیم و تکمیل این سلسلۂ عُلیہ خواہد فرمود۔[1]

---

[1] (دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۵۱)

(یعنی) میرا خیال ہے کہ حضرت امام مہدی موعود رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو ولایت کی اکملیت کے مقرر ہیں وہ بھی اسی نسبت کے حامل ہوں گے اور اسی سلسلہ عالیہ (نقشبندیہ) کی تتمیم و تکمیل فرمائیں گے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے فرمان کا مطلب ظاہر ہے کہ حضرت امام مہدی علیہ الرحمۃ حضرات انبیاء کرام کی نبوت کے کمالات کے کامل وارث ہوں گے اور ان کا مقام اولیائے کرام کے ادراک سے بہت بلند ہو گا۔

بینہ نمبر ۲

ہر مقام کے علوم و معارف اور احوال و مواجید کا جُدا جُدا ہونا طریقت کے بنیادی اصول و قواعد میں سے ہے۔ مثلاً ذکر اور توجہ مبتدی سالک کے لئے ہے اور ولایتِ صغریٰ میں ذکر اور توجہ ہی زیادہ مفید ہیں اور ولایتِ کبریٰ میں جو کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ولایت ہے نماز کے اندر اور باہر تلاوتِ قرآن زیادہ بہتر ہے، اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے کمالات میں جو کہ انبیاء کی ولایت کے کمالات سے زیادہ بلند ہیں عروج اور ترقی نماز کے ساتھ مربوط ہے، کیونکہ انبیاء کی ولایت کے کمالات کا تعلق صفات سے ہے اور انبیاء کی نبوت کے کمالات ذاتِ بحت سے متعلق ہیں، اور وہ مقام جو جذبے کے ساتھ مخصوص ہے طریقۂ عالیہ نقشبندیہ کی ابتداء میں درج ہے اور وہ مقام جو سلوک کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے سلاسلِ طریقت کی ابتداء سے متعلق ہے، اور وہ مقام جو جذبہ اور سلوک دونوں کے ساتھ مخلوط ہے طریقت کے چاروں سلاسل کی انتہاء سے مربوط ہے اور وہ مقام جو جذبہ اور سلوک دونوں جہتوں سے جُدا ہے انبیاء کی نبوت اور انبیاء کی ولایت کے کمالات کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیونکہ جذبہ و سلوکِ متعارفہ جو کمالاتِ ظلیہ کے ساتھ مخصوص ہے انبیاء کی نبوت اور ولایت کے

کمالات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں کیونکہ انبیاء کرام کا جذب واجتباء اور اضطفاء جذبہ وسلوک کی منازل سے بہت بلند اور وراء الوراء ہے۔

چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۷۹ تا ۸۲)

[مختلف سلاسل کے مشائخ رحمہم اللہ سبحانہٗ میں سے کسی نے کم ہی اس کی خبر دی ہے۔ تو اس مقام کے علوم ومعارف کے متعلق کیا گفتگو کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

اس باب میں انتہائی بات یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لئے یہ نادر الوجود نسبت اول قدم میں ہی ظاہر ہو گئی اور ایک مدت گزرنے پر کمال کو پہنچ گئی۔ اور دوسرے کسی کو اگر اس دولت سے مشرف کرتے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قدم کی نسبت پر تربیت کرتے ہیں تو جذبہ اور سلوک کی منزلیں قطع کرنے اور منازل کے علوم ومعارف طے کرنے کے بعد سعادت مند کرتے ہیں۔

ابتداء میں ہی اس نسبت کا ظہور صحبت خیر البشر علیہ وعلیٰ اٰلہٖ الصلوات والتحیات والبرکات والتسلیمات کی برکت سے ہے۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیروکاروں میں سے بھی کسی کو مشرف کر دیں یہاں تک کہ اس کی صحبت سے بھی ابتداء میں ہی اس بلند نسبت کا ظہور ہو جائے۔

فیض روح القدس از باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

ترجمہ: روح القدس (جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام) اگر پھر مدد کرے تو دوسرے بھی وہ کام کرسکتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کرتے تھے۔]

تشریح

پچھلے صفحات میں بھی یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ تصوف کی وہ قوت جس سے منازلِ عرفان اور علوم و معارف کی دولت پہلی ہی نظر سے کسی کو عطا کر دی جائے وہ سب سے پہلے امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو ملی اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں اس نسبت کا ظہور رہا۔ بعد ازاں وہ نسبت تقریباً تقریباً اٹھالی گئی۔ دسویں صدی ہجری میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اُسے پھر ظاہر فرمایا اور حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اس فضل سے مستفید ہوئے لیکن آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صرف اشارۃً ہی اس کا اظہار فرمایا۔ البتہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کھلے الفاظ میں یہ پیشن گوئی فرمائی ہے کہ آخری زمانے میں حضرت مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو یہ نسبت و دولت کامل و مکمل طور پر عطا کی جائے گی۔ لہٰذا اُن کی صحبت میں بیٹھنے والوں اور ان کا دست و بازو بننے والے صوفیاء کرام کی منازلِ روحانی حضرت مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پہلی توجہ سے ہی طے ہو جائیں گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آخری زمانے کے لوگوں کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ:

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام، قیامت اور نہ ہی مجھ کو دیکھا ہے اور خیر و شر کو بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف جانتے ہیں اور ان سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں مگر اُن کا اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا درجہ ایک ہے پھر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم زیادہ افضل ہیں یا وہ؟ تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ بارش کا پتہ نہیں چلتا کہ اس کا پہلا قطرہ زمین کو زیادہ فائدہ دیتا ہے یا آخری قطرہ۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

نسبتِ خاصہ (جس کا ذکر سطورِ بالا میں ہو چکا ہے) ایک ایسی نادر الوجود نسبت ہے جس کا جذب وسلوک کی منازل طے کرنے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لئے صحبتِ نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی برکت سے یہ نسبت پہلے قدم میں ظاہر ہو جاتی تھی اور کچھ مدت کے بعد درجۂ کمال تک پہنچ جاتی تھی۔ اسی نسبت کے بارے میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ طبقاتِ مشائخ میں سے بہت کم مشائخ نے اس کی خبر دی ہے۔

طبقاتِ مشائخ

طبقاتِ مشائخ کی اصطلاح کا اطلاق صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بعد مشائخِ عظام رحمہم اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، طبقاتِ مشائخ پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً محمد بن علی حکیم ترمذی کی کتاب "تاریخ مشائخ یا طبقات الصوفیہ" ابو بکر محمد بن داؤد کی کتاب "اخبار الصوفیہ والزھاد" ابو سعید احمد بن محمد غزنی کی کتاب "طبقات النساک" محمد بن احمد مشہور بہ ابو بکر مفید جرجرائی کی کتاب "اللمع" ابو اسحاق ابراہیم بن احمد بن داؤد مستملی کی کتاب "معجم الشیوخ" ابو العباس احمد بن محمد بن زکریا زاہد نسوی خراسانی کی کتاب "طبقات الصوفیہ" ابو سعید نقاش کی کتاب "طبقات الصوفیاء" سراج عمر بن علی ابن الملقن شافعی علیہم الرحمۃ والرضوان نے بھی اسی نام سے کتاب لکھی

تھی۔ سب سے زیادہ مشہور کتابیں جو طبقاتِ مشائخ پر لکھی گئی ہیں ان میں حضرت ابو عبد الرحمٰن سلمی کی کتاب "کتاب الصوفیہ سلمی" حضرت شیخ الاسلام خواجہ عبد اللہ انصاری کی کتاب "طبقات الصوفیہ ھروی" اور حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامی کی کتاب "نفحات الانس" ہیں۔

مشائخ کے مختلف طبقات ہیں:

پہلے طبقے میں ابو ہاشم صوفی، ذوالنون مصری، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، ابراہیم بن ادھم، بشر بن الحارث الحافی اور بایزید بسطامی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

دوسرے طبقے میں سہل بن عبد اللہ تستری، ابو حمزہ خراسانی، ابو سعید الخراز اور ابو الحسن نوری رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تیسرے طبقے میں ظاہر مقدسی، ابو یعقوب السوسی، خیر نساج، ابو العباس بن عطا بغدادی، ابو عمر الدمشقی اور ابو الحسین الوراق، ابو بکر الواسطی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

چوتھے طبقے میں ابو علی الرودباری، ابو بکر شبلی اور ابراہیم بن الشیبان رحمہم اللہ تعالیٰ۔

پانچویں طبقے میں ابو سعید ابن الاعرابی، عبد اللہ الرازی، ابو القاسم النصر آبادی اور ابو الحسن الحصری رحمہم اللہ تعالیٰ۔

چھٹے طبقے میں ابو الحسن السیروانی، ابو بکر المظفر الترمذی اور استاذ ابو علی دقاق رحمہم اللہ تعالیٰ زیادہ مشہور ہیں۔

(مزید تفصیلات کے لئے کتبِ مذکورہ کی طرف رجوع کیا جائے۔)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۸۲، ۸۳)

[اس وقت اس نسبت میں ابتداء کا انتہاء میں اندراج حاصل ہو جاتا ہے۔ جس طرح جذبہ کے سلوک پر مقدم ہونے کی صورت میں ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ بیان کی گنجائش نہیں۔

ومن بعدھذامایدق صفاتۂ   وما کتمۂ احظٰی لدیہ واجمل

ترجمہ: اس کے بعد وہ چیز ہے جس کا بیان نہایت دقیق اور لطیف ہے۔ اور وہ چیز ہے جس کا چھپانا نہایت ہی لذیذ ہے اور اس کا پوشیدہ رکھنا بہت ہی بہتر ہے۔]

تشریح

وہ نسبت جو باقی سلاسل میں انتہاء پر پہنچنے والے کو میسر آتی ہے، سلسلۂ نقشبندیہ میں ابتدا ٔ ہی میں عطا کر دی جاتی ہے اور یہ بات اِس سلسلہ کی دوسرے سلاسل پر فضیلت و فوقیت کا واضح ثبوت ہے۔

اس کے بعد حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب سالک مقاماتِ عالیٰ پر فائز ہو یا بلند مراتب کے احوال و کیفیات ظاہر ہوں تو اُنہیں بیان کرنے سے گریز کیا جائے۔ کیونکہ وہ خواص کے راز ہوتے ہیں جنہیں عوام سے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے۔ اگر انہیں بیان کر دیا جائے تو چونکہ عوام کی فہم و فراست ان معارف کو سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتی اس لئے ان کا فتنہ میں پڑنے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ مجھے وہ علم بھی عطا کیا گیا ہے جسے اگر ظاہر کروں تو گلا کاٹ دیا جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان احوال کو ظاہر کرنے والا رِیا و تکبر کا شکار ہو کر خود اپنا ہی نقصان کر بیٹھے۔

[اس کے بعد اگر ملاقات ہوئی اور سامعین کی طرف سے خیال سے سننے کا گمان ہوا تو اس مقام کا کچھ حصہ معرضِ ظہور میں لایا جائے گا۔ اور توفیق عنایت کرنے والا وہی اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہے۔

بعض دوستوں کے بارے میں آپ نے کچھ لکھا ہے۔ فقیر نے ان کی لغزشیں معاف کر دی ہیں اور حق سبحانہٗ و تعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔ وہ بھی معاف فرمائے گا۔ لیکن دوستوں کو نصیحت کر دیں کہ

موجودگی اور عدم موجودگی میں تکلیف دینے اور آزار پہنچانے کے مقام میں نہ رہیں اور اپنے حالات کو تبدیل نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں۔ اور جب اللہ کسی قوم کے متعلق برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کوئی دور نہیں کر سکتا۔ اور اس کے سوا کوئی ان کا کارساز نہیں ہوتا۔

میاں شیخ الہہ داد کے بارے میں آپ نے خاص طور پر لکھا تھا۔ فقیر کو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن خود اسے اپنی تبدیلی وضع پر ندامت ہونی چاہیئے۔ ندامت بھی توبہ ہے۔ شفاعت چاہنا ندامت کی فرع ہے۔ بہر حال فقیر اپنی طرف سے معاف کر چکا ہے دوسری طرف کو وہ جانیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ سرہند کو اپنی منزل تصور کریں۔ ہم پیر ہونے کا تعلق محبت ونسبت ایسا نہیں ہے کہ ایسی عارضی باتوں سے ٹوٹ جائے۔ زیادہ کیا لکھے والسلام۔

مخدوم زادے اور باقی اہل خانہ کے لئے خصوصی دعا کی جاتی ہے۔ یہ رقعہ لکھنے کے بعد دل میں آیا کہ دوستوں کی لغزشوں اور انہیں معاف کر دینے کے بارے میں زیادہ وضاحت سے لکھے۔ کیونکہ اجمال میں ابہام ہوتا ہے اور خطرہ ہوتا ہے کہ کوئی کچھ اور سمجھ لے۔

مخدوم گرامی! عفو ودرگزر اس صورت میں مطلوب و متصور ہے کہ وہ جماعت بھی اپنے حالات کو بُرا جانے اور ندامت وپشیمانی محسوس کریں، ورنہ درگزر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

آپ نے لکھا تھا کہ پیر دستگیر قدس سرہٗ نے خلافت کے مقام کو ایک جماعت کے روبرو شیخ الہہ داد کے سپرد کیا تھا۔ اس بات کی وضاحت ہونی چاہیئے۔ اگر سپرد کرنے سے یہ مراد ہے کہ فقرآ اور آنے جانے والوں کی خدمت کریں اور ان کے کھانے پینے کی خبر رکھیں، تو یہ بات تسلیم کرنے کے

قابل ہے، اور اگر اس سے یہ مراد ہے کہ طالبوں کی تربیت کریں اور مشیخیت کے مقام میں بیٹھیں تو یہ بات ماننے کے لائق نہیں۔

آخری بار کی ملاقات میں پیر دستگیر قدس سرہٗ نے فقیر کو فرمایا تھا کہ تمہیں اس اَمر کی تجویز کرنی چاہیئے کہ شیخ الہہ داد ہماری طرف سے جا کر بعض طالبوں کو مشغول و مصروف رہنے کی تلقین کرے اور بعض کے حالات ہم تک پہنچائے۔ کیونکہ ہم کو انہیں اپنے روبرو طلب کرنے اور شغل باطن کی تلقین کرنے اور ان کے حالات دریافت کرنے کی طاقت نہیں۔

فقیر اس بارے میں متوقف تھا۔ جب ضرورت محسوس ہوئی تو فقیر نے بھی اتنا اندازہ اس بات سے تجویز کر لیا۔ اس قسم کی تبلیغ سفات محض کی جنس سے ہے۔ خاص کر جب کہ ضرورت پر مبنی ہو اور ضرورت کی چیز باندازہ ضرورت اختیار کی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ سفارت بھی حضرت قبلہ پیر و مرشد قدس سرہٗ کے زمانۂ حیاتِ ظاہری کے ساتھ خاص تھی۔ آپ کی رحلت کے بعد مشغولی باطن کا سبق دینا اور طالبوں کے حالات دریافت کرنا خیانت میں داخل ہے۔

آپ نے دریافت کیا تھا کہ پیر دستگیر قدس سرہٗ کی نسبت باقی ہے۔ یعنی زیادتی اور نقصان کو قبول نہیں کرتی۔

مخدوم گرامی! علم و حرفت کی تکمیل مختلف افکار کے باہم ملنے سے ہوتی ہے۔ وہ قواعد نحو جنہیں سیبویہ نے مقرر کیا تھا، متاخرین کے افکار نے اسے کس قدر زیادہ کر دیا۔ اسی حالت میں رہنا نقص تھا۔ وہ نسبت جو حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ رکھتے تھے۔ وہ حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانی قدس سرہٗ کے زمانہ میں نہیں۔ اسی پر دوسروں کو بھی قیاس کرو۔

ہمارے خواجہ تو خاص کر اس نسبت کی تکمیل کے درپے تھے۔ اور وہ نسبت جو حاصل ہو چکی تھی اسے کامل خیال نہیں کرتے تھے۔ اور زندگی وفا کرتی تو بارادہ خداوندی جل سلطانہٗ اس نسبت کو کہاں تک لے جاتے یہ سعی و کوشش کرنا کہ اس میں زیادتی اور اضافہ نہ ہو، مناسب نہیں۔ فقیر نہیں جانتا کہ یہ نسبت کہاں تک باقی رہے گی۔ آپ خود ایک علیحدہ نسبت رکھتے ہیں۔ پیر و مرشد علیہ الرحمۃ کی نسبت سے آپ کی نسبت کا کوئی تعلق نہیں اور یہ بات بار بار آپ کے سامنے کہی گئی تھی۔

بے چارہ شیخ الہہ داد نسبت کو کیا جانے کہ کیا ہے۔ اسے صرف ایک گونہ حضور قلبی حاصل ہے۔ دوسروں کو بھی معلوم ہے کہ ان کی کیا حالت ہے۔ اس نسبت کو سنبھالنے اور قائم رکھنے والا کون ہے؟ ظاہر کریں تا کہ فقیر بھی اس کی مدد کرے۔ واقعات کا اعتبار نہ کریں، یہ محض خیالات ہیں، ان میں کچھ صداقت نہیں۔ شیطان بڑا طاقت ور دشمن ہے۔ اس کی فریب کاریوں سے بچنا مشکل ہے۔ وہی شخص بچ سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ بچائے۔

حاصل کردہ نسبتوں کے سلب ہونے کے بارے میں آپ نے لکھا تھا۔ مخدوم گرامی! وہ سلب کرنا اختیاری طور پر نہ تھا، جیسا کہ بوقت حاضری ذکر کیا تھا۔ اب تک وہ سلب اپنے حال پر ہے، زائل نہیں ہوا۔ اسے زائل تصور کرنا خیال ہے۔ وہ آواز جو آپ اپنے دل سے سُنتے ہیں، حالتِ باطن کا اس سے کوئی کام نہیں۔ اگر آگ کے انگارے کو سرد کریں اور بجھا دیں پھر اس پر پانی ڈالیں تو اس سے آواز نکلتی ہے۔ اس آواز کی بنا پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ابھی تک اس میں آگ موجود ہے۔ یاد رکھیۓ! واقعات کا کچھ اعتبار نہیں۔ یہ بات اگر پوشیدہ ہے تو انتظار میں رہیں انشاء اللہ تعالیٰ کل اس کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔

چونکہ آپ نے بطور مبالغہ لکھا تھا۔ اس بنا پر اس کے جواب میں چند باتیں لکھ دی ہیں۔ ورنہ بلا ضرورت بات کرنے کا موقع ہی نہیں۔]

تشریح

نسبت کے واپس لے لینے کو سَلب کہتے ہیں۔ مشائخ نقشبندیہ جس طرح نسبت عطا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اسے سَلب کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں لیکن سَلب کرنا مشائخ کے مناسبِ حال نہیں۔ چاہیئے کہ مریدین کی کوتاہیوں کی نشاندہی کریں اور اُن کی اصلاح کریں۔ سَلب کرنا گویا مُرید کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دور کرنا ہے اور اولیاء اللہ لوگوں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دور کرنے نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے ملانے کے پابند ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مثنوی میں کیا خوب فرمایا ہے کہ:

ما برائے وصل کردن آمدیم نے برائے فصل کردن آمدیم

ترجمہ: ہم (لوگوں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے) ملانے کے لئے آئے ہیں (انہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے) دور اور جدا کرنے کے لئے نہیں آئے۔

ہاں ایک سَلب وہ ہے جو خود بخود واقع ہوتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب کوئی سالک ارادۃً فرائض کو ترک کر دے اور منہیات میں مشغول ہو جائے تو اُس کی نسبت خود ہی سَلب ہو جاتی ہے۔ تاہم توبہ واستغفار کے دروازے ہر وقت کھُلے رہتے ہیں۔ جب وہ اپنے گناہوں پر نادم وشرمندہ ہو کر توبہ کر لے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے فضل سے اُسے دوبارہ بحال فرما دیتے ہیں۔

کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

التَّائِبِ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ۔[1]

ترجمہ: گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا (ہو جاتا) ہے جیسے اُس نے گناہ کیا ہی نہ ہو (یعنی اُس کا گناہ معاف کر دیا جاتا ہے)۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کے وصال کے بعد بعض مخلصین (مریدین) نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے بعض نادر الوجود علوم و معارف (جو حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زبانِ اقدس سے بھی نہ سُنے تھے) پر از راہِ رقابت و ناواقفیت زبانِ طعن و اعتراض دراز کی۔ جس سے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو سخت رنج و ملال ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بمطابق حدیثِ قدسی مَنْ عَادَی لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ۔[2] آپ کے معترضین کے احوال خراب اور باطن تیرہ و تار ہو گئے اور ان کی نسبت بھی سلب ہو گئی۔ کیونکہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ صاحبِ وقت اور قطب الارشاد والھدایت تھے۔ چونکہ آپ صاحبِ وقت تھے اور صاحبِ وقت سے اس وقت کے تمام اولیائے کرام اور صالحینِ امت اپنی استعداد کے مطابق فیض پاتے ہیں اور اس کے منکر و مُعترض محروم ہو جاتے ہیں۔

حضرت میرزا حسام الدین احمد (جو امام ربانی قدس سرہٗ کے پیر بھائی تھے) نے اپنے مکتوب میں ان کے لئے عذر خواہی کی درخواست پیش کی تھی۔ جس کے جواب میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ یہ فقیر ان کی نسبتیں سلب کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوا بلکہ وہ خود بخود (خدا کی طرف

[1] (مشکوٰۃ المصابیح، ج ۲، ص ۷۳۰، الناشر: المکتب الإسلامي - بیروت)

[2] (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۹۶۳)

سے) سلب ہو گئی ہیں اور یہ لوگ جو اپنے دلوں کے اندر سے ذکر کی آوازیں سنتے ہیں یہ اور چیز ہیں اور نسبتوں کا مقام کچھ اور ہے۔ وہ تاہنوز سلب ہیں یہاں تک کہ وہ اعتراض کی بے ادبی سے تائب اور نادم نہ ہوں۔ کیونکہ حدیثِ پاک کے مطابق ندامت توبہ ہی کا نام ہے۔

میاں شیخ الہ داد

یہ بھی ان ہی معترضین میں شامل تھے بلکہ حضرت خواجہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جانشینی اور اپنی مشیخیت کے دعویدار ہو گئے تھے۔ حالانکہ حضرت خواجہ دہلوی علیہ الرحمۃ نے انہیں اپنی ظاہری حیات میں صرف مہمانوں کی خدمت اور لنگر کے انتظامات سنبھالنے کا حکم دیا تھا۔

ان کے متعلق مولانا محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمایا ہے:

"جس زمانے میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ لاہور سے ماوراء النہر (ترکستان) تشریف لے جانے کی تیاری فرما رہے تھے۔ شیخ الہ داد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت ہو کر طریقۂ نقشبندیہ حاصل کیا اور سفر سے واپسی پر حضرت خواجہ نے درگاہ کی خدمت اور مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام شیخ کے سُپرد کر دیا تھا"۔[1]

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ شیخ الہ داد حضرت خواجہ کے حکم اور اس فقیر کی تجویز پر بطورِ سفارت بعض مُبتدی یاروں کو ذکر بتانے اور ان کے احوال ہم تک پہنچانے پر مامور تھے۔ ان کا مسندِ مشیخیت پر از خود براجمان ہو جانا خیانت کے زُمرے میں آتا ہے۔

---

[1] (زبدۃالمقامات)

مستشرقین کی غلط فہمی کا ازالہ

مزید آپ نے اس مکتوب میں وضاحت فرمائی ہے کہ ہر فن وصنعت کا مکمل ہونا بہت سی فکروں کے ملنے پر موقوف ہے۔ مثلاً سیبویہ (عمر بن عثمان شیرازی) کے علم نحو میں اس کے متأخرین نے دس گنا اضافہ کر دیا، حضرت خواجہ شاہ نقشبند اویسی بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خواجۂ جہاں حضرت عبدالخالق غجدوانی قدس سرہٗ کی نسبت میں اپنی طرف سے اضافے کر کے چار چاند لگا دیئے۔

اسی طرح ہمارے خواجہ علیہ الرحمۃ بھی اسی نسبت میں اضافے اور تکمیل کے درپے رہے۔ لیکن ان کی زندگی نے وفانہ کی۔ گر یہ فقیر اسی نسبت کو اللہ تعالیٰ کی تائیدِ غیبی کے ساتھ تکمیل وترقی کی طرف لے جارہا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے فضلِ خاص ہی کی دستگیری ہے اس پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟ شیخ الہ داد ان نسبتوں کی حقیقت کو کیا جانے؟ نسبتیں ایک مقام پر ٹھہری نہیں رہتیں بلکہ ان میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ (کَمَا لَا یَخْفٰی عَلٰی اَرْبَابِ الْبَصِیْرَةِ)

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۸۴ تا ۸۶)

مکتوب نمبر ۳۳

[علماءِ سوء کی مذمت کے بیان میں جو محبتِ دُنیا میں گرفتار ہیں اور علم کو حصولِ دُنیا کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اور زاہد علماء کی مدح و ثناء کے بیان میں جو دُنیا سے بے رُغبت ہو چکے ہیں۔
مُلا حاجی محمد لاہوری کی طرف لکھا:]

تشریح

علماءِ سوء اور علماءِ حق کے درمیان فرق

علماء کی دو اقسام ہیں ایک علماءِ سُوء اور دوسرے علماءِ حق۔ علماءِ سوء وہ علماء ہیں جنہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ علم کی عظیم دولت و نعمت عطا تو کر دیتا ہے لیکن وہ اس علم کے مطابق نہ تو خود عمل کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو ترغیب دیتے ہیں۔ یا دوسروں کو ترغیب تو دیتے ہیں لیکن خود عمل کرنے سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ کبھی دُنیا کی لالچ کی خاطر اور کبھی حکمرانوں کے خوف سے حق کو چھپا دیتے ہیں۔ روزمرہ مسائل کا من گھڑت حل اُن کے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے عوام الناس کو غلط راستے پر گامزن دیکھتے رہتے ہیں، لیکن اُن کی رہنمائی نہیں کرتے۔ حقوق العباد میں مُضاربت، وکالت، کفالت اور بیع و شرا ٔ کے مسائل کتنی اہمیت کے حامل ہیں، لیکن کبھی کسی عالم نے منبر پر ان مسائل کے حلال و حرام کی بات نہیں کی۔ دُنیا کمانے اور لوگوں سے واہ واہ سُننے کے شوق نے اُنہیں اس سوچ سے بے فکر کر دیا ہے کہ کون سا طریقہ استعمال کیا جائے کہ عوام اپنے دین اسلام سے واقف ہو کر عملی راستے پر گامزن ہو جائیں۔

حضرت علامہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

"پردہ شرعی شریعت میں یہی ہے کہ عورت سر سے قدم تک چادر اوڑھے رہے تو اگر کسی کے گھر کی عورتیں بغیر چادر کے پھرا کرتی ہوں لیکن ان عورتوں کی زناکاری لوگوں میں مشہور نہ ہو تو نماز میں ایسے (گھر کے سربراہ) شخص کے پیچھے اقتدٓا کرنا مکروہ ہے، اور اگر ان عورتوں کی زناکاری مشہور ہو تو اس شخص کے پیچھے اقتدٓا کرنا حرام ہے اور مردوں پر فرض ہے کہ اپنی عورتوں کو زناکاری اور بے پردگی سے باز رکھیں اور اگر وہ باز نہ آئیں تو ان کو طلاق دے دینی چاہیئے ورنہ جو لوگ اپنی عورتوں کو زناکاری اور بے پردگی سے باز نہ رکھیں گے وہ دَیُّوث ہوں گے، ایسے لوگوں کے پیچھے اقتدٓا منع ہے"۔[1]

تو علماءِ سوء میں سے کون سا ایسا عالم یا مولوی ہو گا جو کہے گا کہ میرے پیچھے نماز پڑھنا حرام یا مکروہ ہے یا کم از کم وہ مسائل ہی بیان کر دے جن میں وہ خود ملوث ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"اپنی عورتوں کو گھوڑے پر نہ بٹھاؤ"۔

اب چونکہ گھوڑوں کا زمانہ نہیں رہا اور سائیکل، موٹر سائیکل اور گاڑیوں کا دور دورہ ہے۔ بعض مولوی حضرات نے اپنی بیویاں موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھائی ہوتی ہیں اور ہوا کے جھونکوں سے اُن کے دامن اُڑ رہے ہوتے ہیں اور بے پردگی ہو رہی ہوتی ہے۔ پھر وہی صاحب مسجد میں جا کر نماز بھی پڑھا دیتے ہیں لیکن اپنی خباثت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

---

[1] (فتاویٰ عزیزی، ج ۱، ص ۹۴، طبع دار الاشاعۃ العربیۃ)

علماءِ حق وہ ہیں جنہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے علم بھی عنایت کیا ہو اور عمل کی دولت بھی عطا کی ہو۔ ایسے علماء کا ظاہر، شریعت کے ظاہر پر کاربند ہوتا ہے اور باطن شریعت حقہ کے باطنی علوم سے مستفید ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا خوف ہوتا ہے اس لئے انہیں نہ تو دُنیا کی لالچ ہوتی ہے اور نہ ہی وہ دنیا کی خاطر اپنا ایمان بیچتے ہیں اُن کی زندگیاں بھی شریعت کی ترویج کے لئے مختص ہوتی ہیں اور موت بھی دین کی سربلندی کی خاطر۔ اور یہی وہ علماء ہیں جنہیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وارث قرار دیا گیا ہے۔

ایسے علماء کرام کے حق میں تاجدارِ ختم نبوت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

من اراد ان یجلس مع الانبیاء فلیجلس مع العلماء ومن اراد ان یجلس مع اللہ فلیجلس مع الفقراء۔

ترجمہ: جو یہ چاہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی مجلس میں بیٹھے پس اس کو چاہیئے کہ وہ علماء کے پاس بیٹھے، اور جو خدا کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے وہ فقراء کے ساتھ بیٹھے۔[1]

[گروہِ علماء کے لئے دُنیا کی محبت اور اس کی طرف رغبت کرنا ان کے چہرۂ جمال پر بدنما داغ ہے۔ مخلوق کو اگرچہ ان سے فائدے پہنچتے ہیں لیکن خود ان کی ذات کے لئے ان کا علم کچھ بھی نفع مند نہیں ہے۔ اگرچہ شریعت کی تائید اور ملت کی تقویت ان پر مبنی اور مرتب ہوتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ یہ تائید و تقویت فتور و فجور والے لوگوں سے بھی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ایک فاجر شخص کی تائید کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

ان اللہ لیؤیّد ھذا الدین بالرجل الفاجر۔

[1] (لطائف اشرفی، لطیفہ ۱۲، ص ۴۸۸)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید فاجر شخص سے بھی کر لیتا ہے۔

علماءِ سُوء پارس کے پتھر کی طرح ہیں کہ لوہا اور تانبا وغیرہ جو بھی اس کے ساتھ ملتا ہے سونا بن جاتا ہے مگر وہ خود پتھر کا پتھر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح وہ آگ جو پتھر اور بانس میں پوشیدہ ہوتی ہے جہان کو اس سے منافع حاصل ہوتے ہیں، لیکن خود وہ پتھر اور بانس اپنی اندرونی آگ سے بے نصیب رہتے ہیں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ علم ان کے لئے مضر اور نقصان دہ ہے کہ ان کے علم نے ان پر حجت مکمل کر دی۔

ان اشد الناس عذابا یوم القیمة عالم لم ینفعه الله بعلمه۔

ترجمہ: سب سے زیادہ عذاب قیامت کے روز اس شخص کو ہو گا جسے اللہ نے اس کے علم سے نفع نہ دیا۔

ان کا علم ان کے لئے کیوں مضر اور نقصان دہ نہ ہو۔ حالانکہ وہ علم جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذی عزت چیز اور موجودات میں اشرف شے ہے۔ اسے انہوں نے کمینی دُنیا اور مال وجاہ اور سرداری حاصل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ بنا لیا ہے۔ حالانکہ دُنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذلیل وخوار اور ساری مخلوق سے بدترین شے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والی شے کو ذلیل کرنا اور جو چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذلیل ہے اسے عزت دینا نہایت ہی برا ہے۔ اور فی الحقیقة حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ مقابلہ ہے۔ درس وتدریس اور فتویٰ دینا اس وقت نفع مند ہے جبکہ خالص اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کے لئے ہو، اور جاہ وسرداری اور حصول مال وزر اور بلندی چاہنے کے شائبہ سے خالی ہو۔ اور اس کی علامت ونشانی یہ ہے کہ دُنیا کی چیزوں میں زہد اختیار کرے اور دُنیا ومافیہا سے بے رغبت رہے۔ وہ علماء جو اس بلا میں مبتلا ہیں اور اس کمینی دُنیا کی محبت میں گرفتار ہیں، دنیا دار علماء ہیں یہی لوگ علماءِ سوء سب

لوگوں سے برے اور دین کے چور ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اپنے آپ کو دین کا مقتدا اور سب مخلوق سے بہترین خیال کرتے ہیں۔

وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَى شَيْءٍ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ (١٨) اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللهِ أُولَئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ (المجادلة ١٩)

ترجمہ: اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کچھ کیا سنتے ہو بے شک وہی جھوٹے ہیں، ان پر شیطان غالب آگیا تو اُنہیں اللہ کی یاد بھلادی وہ شیطان کے گروہ ہیں سُنتا ہے بے شک شیطان ہی کا گروہ ہار میں ہے۔]

تشریح

حدیث مبارکہ میں ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنْ إِحْيَائِهَا۔[1]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ارشاد فرمایارات میں تھوڑی دیر علم کا درس دینا تمام رات کو زندہ رکھنے سے بہتر ہے۔(یعنی تمام رات نماز پڑھنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنے سے زیادہ بہتر ہے)

چونکہ علم ہی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی میراث ہے اس لئے اس میراث کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کی خاطر ہی لوگوں میں تقسیم کرنا چاہیئے اسے دُنیا کے حصول کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے۔

[1] (سنن الدارمی، ج ۱، ص ۲۹۸، المکتبةالفاروقية، مشکوٰة المصابیح، ج ۱، ص ۵۵، الناشر : المکتب الإسلامي - بیروت)

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

مَنْ یَّجْعَلَ عِلْمُہٗ سَبَبًا لِّلدُّنْیَا لَیْسَ عَلَی اللّٰہِ اَجْرُہٗ فِیْ یَوْمِ الْقِیمَۃِ۔ اَیْ فَاِنَّہٗ مَحْرُوْمٌ عَنْ ثَوَابِ عِلْمِہٖ۔[1]

ترجمہ: جس نے اپنے علم کو حصولِ دُنیا کا ذریعہ بنایا تو قیامت کے دن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر اُس کا کچھ اجر نہیں ہو گا یعنی وہ اپنے علم کے ثواب سے محروم ہو جائے گا۔

اس لئے عالم کا مقصد اور نیت محض اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کی خاطر لوگوں کی اصلاح اور دین کی سربلندی ہونی چاہیئے۔ ہاں اس کے صلے میں اگر لوگ اپنی مرضی سے اُس کی خدمت کریں گے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہو گا۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے اس مکتوب میں علماءِ سوء کی مذمت اور علماءِ حق کی فضیلت میں بعض آیات واحادیث نقل فرمائی ہیں اور دُنیا کی محبت ورغبت کو ان کے چہرۂ جمال کے لئے ایک بدنما داغ قرار دیتے ہوئے ان کی مثال سنگِ پارس کے ساتھ دی ہے۔ جیسا کہ پارس (پتھر) کے ساتھ لوہا اور تانبا رگڑ کھا کر سونا بن جاتا ہے لیکن خود وہ پتھر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح وہ آگ جو پتھر اور بانس میں موجود ہوتی ہے دنیا کے لوگ اس سے بہت فائدے حاصل کرتے ہیں لیکن خود پتھر اور بانس اپنے اندر کی آگ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ایسے ہی وہ علماء جو دنیا کا مال ومتاع جمع کرنے کے لئے علمِ دین کو پیشہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ان کی دینی خدمات قبولیت کے درجے کو نہیں پا سکتیں کیونکہ ان کی نیتوں میں اخلاص نہیں ہوتا۔ یہی علماءِ سوء کی پہچان ہے۔ ظاہری طور پر ان کے

---

[1] (کمافی نور الظلم، ص ۹۰)

ساتھ دینِ اسلام کی رونق اور تقویّت وابستہ نظر آتی ہے، لیکن در حقیقت وہ علماءِ دنیا ہوتے ہیں نہ کہ علمائے آخرت۔ کیونکہ انہوں نے اس علم کو کمینیٔ دُنیا یعنی مال و جاہ وریاست کے حاصل کرنے کا وسیلہ بنالیا ہے حالانکہ دُنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذلیل وخوار اور مخلوق میں سب سے بدتر ہے۔

ارشاد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ اس امر پر گواہ ہے:

لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً۔[1]

ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی قدر وقیمت ایک مچھر کے پر جتنی بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو دنیا کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔

علماءِ سوء کا حشر

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ علماءِ سوء کا علم ان کی اپنی ذات کے لئے بھی مضر ہے کیونکہ اس علم نے اُن پر حُجت تمام کر دی۔

حدیث میں ہے:

إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَالِمًا لَمْ يَنْفَعْهُ اللّٰهُ بِعِلْمِهِ۔[2]

---

[1] (سنن الترمذی، ج ۲، ص ۵۶)

[2] (تخریج حدیث: علامہ مراد مکی فرماتے ہیں کہ حدیثِ مذکور کو ابنِ عساکر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کو طبرانی نے صغیر میں اور بیہقی نے شعب میں اور ابنِ عدی وحاکم نے اپنی مستدرک میں بھی الفاظِ مختلفہ کے ساتھ روایت کیا ہے:

قَالَ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہ وسلم إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَالِماً لاَ يَنْتَفِعُ بِعِلْمِهِ۔ (سنن الدارمی، ج ۱، ص ۷۱)

نیز حدیث میں ہے:

أَلَا إِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ۔ (سنن الدارمی، ج ۱، ص ۸۷))

(یعنی) بے شک قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ عذاب اس عالم کے لئے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے علم سے کچھ نفع نہ دیا۔

قرآن وحدیث کی رو سے وہ علماء جو کمینی دُنیا کی محبت میں گرفتار ہیں علماءِ سوء ہیں، وہ دین کے چور اور شیطان کا گروہ ہیں۔ حالانکہ اپنے آپ کو دین کا پیشوا جانتے ہیں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج۲، ص ۹۱، ۹۲)

[اکابرین میں سے کسی نے دیکھا کہ ابلیس لعین فارغ بیٹھا ہے اور گمراہ کرنے اور دلوں کو بہکانے سے بے فکر ہے۔ اس بزرگ نے اس لعین سے اس کا راز دریافت کیا تو شیطان نے جواب دیا کہ عُلماءِ سوء اس وقت میرے اس کام میں میری زبردست مدد کر رہے ہیں اور انہوں نے مجھے اس مہم سے فارغ کر دیا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر سُستی اور مداہنت جو اُمورِ شرعیہ میں واقع ہو چکی ہے۔ اور ہر فتور جو دین وملت کی ترویج واشاعت میں پیدا ہو چکا ہے سب علماءِ سوء کی شومی کے باعث ہے اور ان کی نیتوں کے فساد کی وجہ سے ہے۔ ہاں وہ علماء جو دنیا سے بے رغبت اور جاہ وریاست اور مال کی محبت سے آزاد ہیں وہی علمائے آخرت اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث ہیں۔ یہی لوگ بہترین مخلوق ہیں۔ کل قیامت کے دن ان کی سیاہی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے خون کے ساتھ وزن کریں گے اور ان کی سیاہی کا پلہ بھاری ہو گا۔ اور **نوم العلماء عبادة** یعنی علماء کا سونا بھی عبادت ہے۔ ان ہی کی شان میں وارد ہے۔ یہی وہ علماء ہیں کہ آخرت کا جمال ان کی نظروں میں اچھا لگتا ہے۔ دنیا کی قباحت اور برائی کا انہیں مشاہدہ ہو چکا ہے انہوں نے آخرت کو بقا کی نظر سے دیکھا ہے، اور دنیا کو زوال اور فنا کے داغ سے داغ دار پایا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو باقی رہنے والی آخرت کے حوالے کر دیا ہے اور فانی دُنیا سے الگ ہو گئے ہیں۔ آخرت کی عظمت کا مشاہدہ

خدائے لایزال کی عظمت کے مشاہدے کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ اور دنیاومافیہا کو ذلیل وخوار جاننا آخرت کی عظمت کے مشاہدہ کے لوازمات میں سے ہے۔

لان الدنیا والاخرة ضرتان ان رضیت احداھما سخطت الاخریٰ۔

ترجمہ: کیونکہ دنیا اور آخرت دو سوکنیں ہیں۔ اگر ایک راضی ہوتی ہے تو دوسری ناراض ہو جاتی ہے۔

اگر دُنیا عزیز ہے تو آخرت خوار ہے، اور اگر دنیا خوار ہے تو آخرت عزیز ہے۔ ان دونوں کا جمع ہونا اضداد کے جمع ہونے کے قبیلہ میں سے ہے۔

مااحسن الدین والدنیا لو اجتمعا۔

ترجمہ: کیا ہی اچھا ہوتا اگر دین ودنیا دونوں جمع ہو جاتے۔

ہاں مشائخ کرام میں سے ایک گروہ نے جو اپنے آپ اور اپنے ارادہ سے پوری طرح باہر آچکے ہیں، بعض حقانی نیتوں کے باعث اہلِ دُنیا کی صورت اختیار کر رکھی ہے اور بظاہر دُنیا کی طرف راغب نظر آتے ہیں، لیکن فی الحقیقت انہیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اور سب سے فارغ اور آزاد ہیں:

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (النور ۳۷)

ترجمہ: وہ مرد جنہیں غافل نہیں کرتا کوئی سودا اور نہ خرید وفروخت اللہ کی یاد سے۔

تجارت اور بیع وشرا وغیرہ ان کے لئے ذکر حق سے مانع نہیں ہے۔ ان امورِ دنیا کے ساتھ عین تعلق کے اندر بھی بے تعلق ہیں۔ حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے کہ میں نے منیٰ کے بازار میں ایک تاجر کو دیکھا جو کم وبیش پچاس ہزار دینار کی خرید وفروخت کر رہا تھا۔ مگر اس کا دل ایک لحظہ کے لئے بھی یادِ حق سے غافل نہ تھا۔]

تشریح

وہ شخص جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حقیقی بندگی اختیار کر لے اور اُس کا مقرب بن جائے وہ کروڑوں اربوں روپوں میں کھیلنے کے باوجود اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔ شاید اس بات سے لوگ انکار ہی کر بیٹھیں لیکن اس کی وضاحت یوں ہے کہ مثال کے طور پر ایک شخص کا لاکھوں کا کاروبار ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔ اور وہ یوں کہ ہر وقت اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خرید وفروخت میں کسی طرح بھی جھوٹ، فریب اور خیانت نہ ہو کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اِن سے منع فرمایا ہے اور ملاوٹ وناپ تول میں کمی نہ ہو کہ یہ خلافِ شریعت ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے غافل نہیں ہے اسی لئے ہر لمحہ کی لین دین اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات کے مطابق کر رہا ہے ورنہ اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے غافل ہوتا تو مندرجہ بالا سارے بُرے افعال سے اپنے مال کو حرام کر لیتا۔ اسی لئے حضرت سعد شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

چیست دُنیا از خدا غافل بودن　　　　نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

ترجمہ: دنیا کیا ہے؟ خدا سے غافل ہو جانا (دُنیا ہے) مال ومتاع، سونا چاندی اور بیوی بچے (ہی) دُنیا نہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

عُلماءِ آخرت کی فضیلت

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں قیامت کے دن علماء کے قلم کی سیاہی شہیدوں کے خون سے وزنی ہو گی۔ علامہ مراد مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ کے اس قول میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرفوعًا روایت کیا ہے:

قَالَ الْحَسَنُ رَحِمَهُ اللهُ يُوْزَنُ مِدَادُ الْعُلَمَآءِ بِدَمِ الشُّهَدَآءِ فَيَرْجِعُ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ بِدَمِ الشُّهَدَآءِ۔[1]

تزکیۂ نفس اور تعلقاتِ دُنیا

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ سطور بالا میں ان مشائخِ عظام و علمائے اعلام کا ذکر فرما رہے ہیں جو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی سعادت سے مشرف ہو کر قلبی طور پر دنیا و مافیہا سے فارغ و آزاد ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ظاہری طور پر دُنیا کے ساتھ تعلقات کی بناء پر وہ اہلِ دنیا معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اہلِ آخرت ہوتے ہیں کیونکہ دنیا کے ساتھ تعلق اور عدمِ تعلق نفس کے تزکیہ اور عدمِ تزکیہ کے ساتھ مربوط ہے۔ جب تک تزکیۂ نفس نہ ہو جائے قلبی طور پر ماسوی اللہ سے قطع تعلق اور ذاتِ حق سے اصلی محبت محال ہے۔ اس حقیقت کی بنیاد یہ ہے کہ انسان دو قسم کی محبتوں سے خالی نہیں ہو سکتا یا تو محبت نفس میں گرفتار ہو گا یا محبتِ حق سے سرشار ہو گا کیونکہ یہ دونوں محبتیں ایک دوسرے کی نقیض (ضِد) واقع ہوئی ہیں۔

---

[1] (احیاء العلوم، کتاب العلم، باب اول)

جیسا کہ اسی مکتوب میں کچھ پہلے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے حدیثِ مبارکہ نقل فرمائی ہے:

مَاالدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃُ اِلَّا ضَرَّتَانِ اِنْ رَضِیَتْ اِحْدَاھُمَا سَخَطَتِ الْاُخْرٰی۔[1]

یعنی دُنیا اور آخرت دو سوکنیں ہیں اگر ان میں سے ایک راضی ہو گی تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ نفس کی خلقت اور جبلت میں اللہ تعالیٰ کی عداوت و مخالفت مرکوز و مضمر ہے۔

جیسا کہ حدیثِ قدسی ہے:

عَادِ نَفْسَکَ فَاِنَّھَا انْتَصَبَتْ بِمَعَادَاتِیْ۔[2]

یعنی اپنے نفس سے دشمنی کرو کیونکہ وہ میری دشمنی پر قائم ہوا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تزکیۂ نفس کے بغیر ماسویٰ اللہ سے تعلق اور محبت کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ تعلق ماسویٰ اللہ تعلقِ نفس کی فرع ہے۔ جب تعلقاتِ نفسی زائل ہو جائیں گے تو اس کی تبع میں ماسویٰ اللہ کے تعلقات بھی زوال پزیر ہو جائیں گے، لہٰذا وہ مردانِ حق جو فنا و بقا کی منزلوں پر فائز ہو کر تزکیۂ نفس کے مقام پر شادکام ہیں انہیں ماسویٰ اللہ کے تعلقات اور دنیاوی مشغولات سے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا اور ان کے ان ظاہری تعلقات کو دنیاوی تعلقات سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] (امام احمد نے مسند احمد، ج۴، ص ۴۱۳ اور امام غزالی نے احیاء العلوم، ج۳، ص ۲۱۶ میں اس مفہوم کی حدیث مبارک نقل فرمائی ہے)

[2] شیخ جلال الدین خجندی علیہ الرحمۃ نے شرح قصیدہ میں اسے بطور حدیثِ قدسی نقل کیا ہے اور اسی مفہوم کی ایک روایت امام غزالی نے احیاء العلوم میں اور امام سیوطی نے جامع صغیر میں نقل کی ہے۔ (تشیید المبانی، ص ۱۶)

صوفیاء کرام اور حقیقتِ دنیا

ارشاد باری تعالیٰ: وَمَاهَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ (العنکبوت ٦٤) کے مطابق دنیاوی زندگی ایک فضول کھیل اور تماشے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اسی لئے صوفیائے کرام کے نزدیک دُنیامال ودولت اور اہل وعیال کو نہیں کہاجاتا بلکہ دُنیا حق تعالیٰ سے غفلت کانام ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

چیست دُنیا از خُدا غافل بُدن　　　　نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

صوفیاء کرام کے نزدیک دنیا کی تذلیل وتحقیر سے مراد اسی قسم کی دُنیا ہوتی ہے اور اسی قسم کے دنیاداروں کے بارے میں عارفِ رومی فرماتے ہیں:

اہلِ دُنیا کافرانِ مطلق اند　　　　روز وشب در چق چق ودر بق بق اند

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اسی قسم کے دنیادار علماء کی مذمت اور تزکیۂ نفس کے حامل علماء کی فضیلت اور عظمت بیان فرمارہے ہیں اور آیت کریمہ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ (النور ٣٧) میں مؤخر الذکر علماء کی طرف اشارہ ہے۔

صوفی وہ ہوتا ہے جو پوشیدہ بھی ہو اور آشکارا بھی، یعنی ظاہر میں مخلوق کے ساتھ وابستہ ہو اور باطن میں خالق کے ساتھ پیوستہ بھی، باہمہ بھی ہو اور بے ہمہ بھی۔

حضرت خواجہ عزیزان قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

از دروں شو آشنا وز بروں بیگانہ وَش
ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

ثابت ہوا کہ اہل اللہ کا شغلِ ظاہری ان کے شغلِ باطنی کے لئے مانع نہیں ہوتا۔

حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے کرتے: إِنِّي لَأُجَهِّزُ جَيْشِي وَأَنَا فِي الصَّلَاةِ۔[1] یعنی میں نماز بھی پڑھتا رہتا ہوں اور جہاد کے لئے لشکر بھی ترتیب دیتا رہتا ہوں اور میرا یہ ظاہری شغل نماز کے اندر باطنی عروجات کے لئے حجاب نہیں بنتا اور میں کامل جمعیت سے بہرہ ور ہوتا ہوں۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔

نسبتِ دوام حضور مع اللہ

مشائخ نقشبندیہ شکر اللہ سعیھم کے نزدیک یہی نسبت دوام حضور مع اللہ کہلاتی ہے اور وہ اسی نسبت کی تعمیل و تکمیل پر مامور ہیں۔ حضرت خواجہ نقشبند اویسی بخاری قدس سرہٗ الساری فرماتے ہیں کہ میں نے منیٰ کے بازار میں ایک ایسے تاجر کو دیکھا جو کم و بیش پچاس ہزار دینار سے خرید و فروخت کر رہا تھا لیکن اس کا دل ایک لحظہ کے لئے بھی خدا تعالیٰ سے غافل نہیں تھا۔

وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ یَهْدِیْ اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ۔ اَللّٰهُمَّ آمِیْن

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۹۲ تا ۹۷)

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۶۳)

مکتوب نمبر ۳۴

[حسبِ گنجائش بسط و تفصیل کے طریقہ پر عالمِ اَمر کے جواہرِ خمسہ کے بیان میں۔۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی ملا حاجی محمد لاہوری کی طرف لکھا:

سعادتِ دارین کا ہاتھ آنا سید کونین علیہ وعلیٰ آلہ من الصوات افضلہا ومن التسلیمات اکملہا کی اتباع کے ساتھ وابستہ ہے۔ فلسفی جس کی بصیرت کی آنکھ صاحبِ شریعت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام والتحیہ کی متابعت کے سُرمہ سے محروم ہے، عالمِ امر کی حقیقت سے نابینا ہے چہ جائیکہ اسے مرتبۂ وجوب تعالیٰ وتقدس کا شعور ہو۔ اس کی کوتاہ نظر عالمِ خلق پر ہی رُکی ہوئی ہے اور اس میں بھی ناتمام ہے۔]

تشریح

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے بیشتر مکاتیب کی طرح یہ مکتوب بھی عقائد کے بارے میں بیان کیا ہے۔ فلاسفہ یونان نے صوفیت میں بھی اپنے عقائد کو درج کیا ہے، بعض فلاسفہ کا عقیدہ ہے کہ جواہرِ خمسہ (قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ) عالمِ خلق میں موجود ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس اس بات کی تردید فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جواہرِ خمسہ عالمِ اَمر میں ممکنات سے اوپر ہیں۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ انسان کے بدن میں قلب، روح، سِر، خفی اور اخفیٰ جواہرِ خمسہ ہیں اور وہ ان کے لئے مکان (جگہ) ثابت کرتے ہیں، حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس بھی فرماتے ہیں کہ یہ جواہرِ خمسہ ہیں مگر آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان کے لئے احساس کو ثابت کرتے ہیں۔

[فلاسفہ نے جو جواہرِ خمسہ ثابت کئے ہیں سب عالمِ خلق میں ہیں۔ نفس اور عقل کو جو مادہ سے مجرد شمار کرتے ہیں یہ ان کی نادانی کے باعث ہے۔ نفس ناطقہ تو یہی نفس امارہ ہے جو تزکیہ کا محتاج ہے اس کی توجہ اور ہمت بالذات کمینگی اور پستی کی طرف ہے۔ اسے عالمِ امر سے کیا نسبت، اور مادہ سے مجرد ہونے کے ساتھ اسے کیا مناسبت ہے؟

رہی عقل تو معقولات میں سے بھی صرف ان امور کا ادراک کر سکتی ہے جو محسوسات سے مناسبت رکھتے ہیں۔ بلکہ جو محسوسات کے حکم میں ہیں۔ لیکن وہ چیز جو محسوسات سے مناسبت نہیں رکھتی اور مشاہدہ میں آنے والی اشیاء میں سے جن کا کوئی شبہ اور مثال نہیں وہ عقل کے ادراک میں نہیں آسکتیں۔ اور ان کا بند عقل کی چابی سے نہیں کھل سکتا۔ لہٰذا عقل کی نظر بے مثال اشیاء کے احکام سے کوتاہ ہے۔ اور غیب کے میدان میں تو بالکل گمراہ ہے، اور یہ اس کے عالمِ خلق میں سے ہونے کی علامت ہے۔ عالمِ اَمر کا رُخ بے چونی اور اس کی توجہ بے چگونگی کی طرف ہے۔ عالمِ اَمر کی ابتداء مرتبہ قلب سے ہے۔ قلب سے اوپر روح ہے، روح سے اوپر سِر ہے اور سِر سے اوپر خفی اور خفی سے اوپر اخفٰی۔ عالمِ اَمر کے ان پانچ امور کو اگر جواہرِ خمسہ کہیں تو اس کی گنجائش ہے۔ کوتاہ نظری کے باعث چند خذف ریزوں کو اکٹھا کر کے جواہرِ خمسہ گمان کر لیا ہے۔]

تشریح

فلاسفہ نفسِ انسانی اور عقل کو بھی جواہرِ خمسہ میں شامل کرتے ہیں لیکن حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی تحقیق یہ ہے کہ نفس و عقل جواہرِ خمسہ میں سے نہیں بلکہ عالمِ خلق سے ہیں کیونکہ اِنہیں تزکیہ کی ضرورت ہے اور تزکیہ والی چیز جواہر خمسہ میں سے نہیں ہو سکتی۔ فلاسفہ

جواہرِ خمسہ (باطنی حواسِ خمسہ) کے لئے مخصوص مکان کے قائل ہیں حالانکہ ان لطائفِ خمسہ (قلب، روح، سر، خفی، اخفٰی) کا سالک کو صرف احساس ہوتا ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے رُوح کے بارے میں فرمایا کہ:

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (الإسراء ۸۵)

ترجمہ: تم فرماؤ روح میرے رب کے حکم سے ایک چیز ہے۔

اور صوفیاء کرام کی تحقیق کے مطابق بھی روح ایک طرح کی بے چونی رکھتی ہے اور جو چیز بے چون ہو اُسے کبھی مکان کا مکین قرار نہیں دیا جاسکتا، لہٰذا فلاسفہ کا قول غلط ثابت ہوا۔

دوسری اہم بات جس میں فلاسفہ کو غلطی لگی وہ یہ ہے کہ جو چیزیں عقل میں نہ آسکیں نہ انہیں ہم مَس کر سکیں، فلاسفہ اُن کا سرے سے انکار کرتے ہیں، اگر ہم فلاسفہ کی بات کو مان لیں تو پھر جنت ودوزخ، عذابِ قبر اور اعمال کا وزن ہونا وغیرہ قرآن عظیم الشان اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہیں اور ہمارے لئے قرآن وحدیث ہی اقوی دلیل ہیں نہ کہ فلاسفۂ یونان کا قول۔ اگر ہم مذکورہ امور (جنت ودوزخ وغیرہ) کا عقل سے موازنہ کریں گے تو آخرکار ان کا انکار کر بیٹھیں گے (نعوذ باللہ من ذلک)۔

اس لئے مکتوبات شریف کا پڑھنا اور صوفیاء کرام کی محافل میں بیٹھنا ضروری ہے تاکہ فلاسفہ کے باطل عقائد سے بچ سکیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے یہاں حکمائے یونان (اہل فلسفہ) کے بیان کردہ جواہر خمسہ کی تردید فرمائی ہے اور حکمائے ایمان (اہل تصوف) کے متعین فرمودہ جواہرِ خمسہ کی تائید فرمائی ہے۔

آپ نے فرمایاہے کہ جواہرِ خمسہ دراصل وہی ہیں جن کو صوفیائے کرام نے کشف و شہود کی راہ سے ثابت فرمایاہے اور وہ عرش کو اوپر ہیں اور عالمِ امر سے تعلق رکھتے ہیں۔ فلسفیوں نے جن کا نام جواہر رکھاہے وہ خَزَف ریزے (ٹھیکریاں) ہیں جو مادی الاصل ہیں اور عالمِ خلق سے تعلق رکھتے ہیں۔

اہل فلسفہ کی جہالت

اہلِ فلسفہ نے حالّ محلّ اور ان دونوں سے مرکب اور نفس و عقل (ہیولیٰ، صورت جسمیہ ہو یا نوعیہ، جسم نفس، عقل) کو جواہرِ خمسہ کا نام دیاہے اور نفس و عقل کو مجردات سے شمار کیاہے۔ یہ فلسفیوں کی جہالت اور بے خبری کی وجہ سے ہے کیونکہ نفسِ ناطقہ بھی نفسِ امارہ ہی کو کہا جاتاہے، اور وہ تزکیہ کا محتاج ہے، اس کی ذات میں پستی اور کمینگی کا غلبہ ہے، عالم امر اور تجرّدِ محض سے اس کو کوئی مناسبت نہیں ہے، اسی طرح عقل بھی معقولات میں سے سوائے اُن امور کے جو محسوسات کے ساتھ تعلق یا مناسبت رکھتے ہیں کچھ بھی ادراک نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے اس کی نظر بے چونی کے احکام معلوم کرنے سے کوتاہ ہے اور امور غیبیہ کی معرفت میں محض گمراہ ہے اور عقل کی یہی علامت اس کے عالم خلق سے ہونے کی گواہ ہے، کیونکہ عالمِ امر خود عالمِ قدس ہے۔ اس کا رُخ بے چونی کی طرف ہے، اس کی طبیعت میں نورانیت اور تجرد محض ہے، وہ جسمانیت و مکانیت سے بَری ہے اور نورانیت ولامکانیت سے آراستہ ہے لہٰذا عالمِ اَمر کے لطائف ہی جواہر کہلانے کے لائق ہیں۔

بینہ نمبر ا

واضح ہو کہ عالمِ اَمر کے حقائق پر اطلاع پانا اور ان کے مقامات طبعی کا مشاہدہ کرنا سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل اتباع کرنے والوں کا خاصہ ہے اور ان ہی کی آنکھیں متابعت کے سرمہ سے سرمگیں ہو کر عالم غیب کے رازوں سے آشنا ہو سکتی ہیں۔ فلسفی لوگ جو شرفِ متابعت

سے محروم ہیں، عالمِ امر کے متعلق کیا خبر دے سکتے ہیں؟ وہ تو ظن و تخمین کے غلام بن کر بے تمکین ہو چکے ہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود — پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اہل فلسفہ کے افکار حقائق کے انکار پر مبنی ہیں جیسا کہ ان کے خیال کے مطابق عرش کے اوپر نہ خلأ ہے نہ ملأ۔ حالانکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آسمانوں میں خرق والتیام نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر وہ واقعۂ معراج کا انکار بھی کرتے ہیں اور کسی انسان کا آسمانوں سے گزرنا محال مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود عرش سے اوپر کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ وہاں نہ خلأ ہے نہ ملأ ہے۔ خدا جانے یہ عرش کے اوپر کیسے جاتے ہیں، خواب میں یا بیداری میں۔ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا۔

آں کس کہ نداند و نداند کہ نداند — در جہلِ مرکب ابدالدھر می ماند

عالمِ اَمر کے جواہر خمسہ

صوفیائے محققین رحمہم اللہ تعالیٰ نے عالمِ اَمر کے پانچ لطائف کو جواہر خمسہ کا نام دیا ہے، اور وہ عرش کے اوپر محلاتِ نور ہیں جن کا تعلق انسان کے جسم کے ساتھ قائم کیا گیا ہے تا کہ انسان مجاہدات و ترقیات کے ذریعے لطائف کا تزکیہ حاصل کر کے دائرۂ وجوب کے فیضان اور تجلیات کا متحمل ہو سکے۔ (وَھُوَ الْمَقْصُوْدُ) اور وہ قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ ہیں۔

عالمِ خلق کے جواہرِ خمسہ

صوفیائے کرام نے عالمِ خلق کے لطائف کو عالمِ خلق کے جواہرِ خمسہ سے تعبیر فرمایا ہے اور وہ عناصرِ اربعہ ہوا، پانی، آگ، مٹی اور نفسِ ناطقہ ہیں ان کا مقام عرش کے نیچے ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۰۱ تا ۱۰۳)

[عالمِ امر کے ان جواہرِ خمسہ کا ادراک اور ان کے حقائق پر اطلاع حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی کامل اتباع کرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جس طرح عالمِ صغیر یعنی انسان میں جو ان تمام چیزوں کا نمونہ ہے جو عالمِ کبیر میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح عالمِ کبیر میں بھی ان جواہرِ خمسہ کے اصول موجود و ثابت ہیں۔ عرشِ مجید عالمِ کبیر کے جواہر کا مبدا ٔ ہے۔ جس طرح انسان کے دل کی انسان میں یہ حیثیت ہے، اور اس مناسبت کی بنا پر قلب کو عرش اللہ کہہ دیتے ہیں۔ اور جواہرِ خمسہ کے باقی مراتب عرش سے اوپر ہیں۔]

تشریح

زمین وآسمان، لوح و قلم اور جنت و جہنم وغیرہ کو عالمِ کبیر جبکہ انسان کو عالمِ صغیر کہا جاتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے عالمِ کبیر کے تمام نمونے عالمِ صغیر میں جمع فرما دیئے ہیں اور اسی جملہ سے ہے عرشِ عظیم کا وہ نمونہ جو جسمِ انسانی میں قلب (دل) کی صورت میں موجود ہے۔

جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

قلب المؤمن عرش اللّٰہ۔

ترجمہ: مؤمن کا قلب اللہ کا عرش ہے۔

جس طرح عالمِ کبیر میں عرشِ عظیم عالمِ خلق اور عالمِ امر کے درمیان پردہ ہے اسی طرح جسمِ انسانی میں قلب ہے جو عالمِ امر و عالمِ خلق میں برزخ و پردہ ہے۔ عمومی فضیلت تو عرش اللہ کا حصہ ہے لیکن جزوی فضیلت قلبِ انسانی کو ملی ہے، اس میں عشق و محبت کی دولت موجزن ہے اور اسی عشق کی بدولت قلب عالمِ امر کی سیر کرتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے ارشادِ بالا کو سمجھنے کے لئے چند امور کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہیں:

- عالمِ کبیر، عالمِ صغیر اور عالمِ اصغر کیا ہیں؟
- عالمِ مثال کس کو کہتے ہیں؟
- عقل، نفس اور خیال کیا چیزیں ہیں؟
- انسان کون سی اشیاء سے مُرکب ہے؟
- عالمِ امر اور عالمِ خلق کیا ہیں اور ان کے مقاماتِ طبیعی کیا ہیں؟

اب ترتیب وار ان کا اجمالی بیان ملاحظہ فرمائیں! وباللہ التوفیق۔

عالمِ کبیر: تمام ممکنات فوق العرش و تحت العرش کو عالمِ کبیر کہا جاتا ہے۔

عالمِ صغیر: انسان کو عالمِ صغیر کہا جاتا ہے۔

عالمِ اصغر: قلبِ انسان کو عالمِ اصغر کہا جاتا ہے۔

عالمِ مثال: عالمِ اجسام سے لطیف اور عالمِ ارواح سے کثیف ہے۔ عالمِ کبیر میں اس کا مرکز عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح کے درمیان ہے۔

عالمِ مثال ایک عالمِ موجود و موہوم نما ہے لیکن وجودِ موہومیت نما کے باوجود تمام عالمین کا آئینہ و تمثال ہے جس میں تمام اجسام وارواح و معانی کے معکوس منقش ہیں اور تمام اشیائے گذشتہ و آئندہ اس میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

عقل

نفسِ ناطقہ کے لئے ایک ایسی قوت (عاقلہ مدرکہ) کا نام ہے جس کے ذریعے حقائقِ اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اس کا محل سَر ہے اور بعض کے نزدیک اس کا محل قلب ہے۔

نفس

انسان کے جسم میں ایک ایسا جوہر ہے جو حیات، حس اور حرکتِ ارادی کا حامل ہے۔ اس کو نفسِ ناطقہ اور روح حیوانی بھی کہتے ہیں۔

خیال

انسانی دماغ کے بطن میں ایک قوتِ متخیلہ جو عالمِ مثال کا ایک نمونہ ہے اس کو خیال کہتے ہیں۔ عرفاء کا مقولہ ہے لَوْلَا الْخِيَالُ لَسَتَرَ الْحَالُ (اگر خیال نہ ہوتا تو حال مستور رہتا) بعض عارف (مُراد) جب مرتبۂ خیال سے گزر جاتے ہیں تو مرتبۂ ذات وصفات کے ادراک کی نعمت سے مشرف ہو جاتے ہیں، جیسا کہ امام ربانی قدس سرہٗ نے دفتر سوم کے آخر میں صراحت فرمائی ہے۔ (وَاللہُ اَعْلَمُ)

لطائفِ عشرہ

انسان دس اجزاء (لطائف) سے مُرکب ہے ان میں پانچ لطائف عالمِ امر کے ہیں اور پانچ لطائف عالمِ خلق کے ہیں۔ ان میں سے ہر لطیفہ مخصوص کمالات کا حامل ہے اور ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ عروجات اور تجلیات رکھتا ہے۔ جن خوش نصیب حضرات کے یہ لطائف دنیاوی اور مادی تعلقات سے آزاد ہو کر اپنی اصل تک پہنچ جائیں وہ اپنے کمالاتِ اصلیہ کی بناء پر تخلیقِ انسانی کے اصل

مقصد کو پا لیتے ہیں اور وہ اصل مقصد عبادت اور معرفت ہے۔ وَما خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ أي ليعرفون۔[1]

عالمِ اَمر اور عالمِ خلق

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الأعراف ۵۴)

سن لو اسی کے ہاتھ ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی آیت کریمہ کے تحت لکھا ہے:

قالت الصوفية المراد بالخلق والأمر عالم الخلق يعنى الجسمانية العرش وما تحته من السموات والأرض وما بينهما وأصولها العناصر الاربعة النار والهواء والماء والتراب ويتولد منها النفوس الحيوانية والنباتية والمعدنية وهى أجسام لطيفة سارية فى أجسام كثيفة وعالم الأمر يعنى المجردات من القلب والروح والسر والخفي والأخفى التي هى فوق العرش سارية فى النفوس الانسانية والملكية والشيطانية سريان الشمس فى المرآة سميت بعالم الأمر لان الله تعالى خلقها بلا مادة بامره كن قال البغوي قال سفيان بن عيينة فرق بين الخلق والأمر فمن جمع بينهما فقد كفر۔[2]

ترجمہ: صوفیاء نے فرمایا کہ خلق اور اَمر سے مراد عالمِ خلق یعنی عالمِ اجسام ہے اور وہ عرش اور جو کچھ آسمانوں اور زمینوں کے نیچے ہے اور ان دونوں کے درمیان ہے اور ان کے اصول عناصرِ اربعہ یعنی آگ، ہوا، پانی اور مٹی ہیں اور ان ہی سے نفوس حیوانیہ، نباتیہ اور معدنیہ پیدا ہوتے ہیں اور وہ

---

[1] (روح المعانی، ج ۱۴، جزء ۲۷، ص ۲۱)
[2] (تفسیر مظھری، ج ۳، ص ۳۶۰)

اجسام لطیفہ ہیں جو اجسامِ کثیفہ میں ساری ہیں اور (اَمر سے مراد) عَالمِ اَمر ہے یعنی مجردات اور وہ قلب، روح، سر، خفی اور اخفٰی ہیں جو عرش کے اوپر ہیں اور نفوسِ انسانیہ، ملکیہ اور شیطانیہ میں اس طرح ساری ہیں جیسے سورج آئینے میں، اس کا نام عالمِ امر اس لئے ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے بغیر مادہ کے اَمرِ کُن سے پیدا فرمایا ہے۔ بقول امام بغوی سفیان بن عیینہ نے کہا ہے کہ خلق اور اَمر کے درمیان فرق ہے جس نے ان دونوں کو جمع کیا اس نے کفر کیا۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۰۴ تا ۱۰۷)

[عالمِ کبیر میں عرش عالمِ خلق اور عالمِ اَمر کے درمیان برزخ وواسطہ ہے۔ جس طرح عالمِ صغیر یعنی انسان میں قلبِ انسان عالمِ خلق اور عالمِ اَمر کے درمیان برزخ وواسطہ ہے۔ قلب اور عرش اگرچہ عالمِ خلق میں سے ہیں لیکن عالمِ اَمر کی بے چونی اور بے چگونی کا حصہ بھی رکھتے ہیں۔ ان جواہرِ خمسہ کی حقیقت پر آگاہ اور مطلع ہونا ان اولیاء کرام میں سے کامل افراد کے لئے تسلیم کیا گیا ہے جو مراتبِ سلوک تفصیل سے طے کر کے نہایت کی نہایت تک پہنچ چکے ہیں۔

ہر گدائے مرد میداں کے شود　　　　پشہ آخر سلیماں کے شود

ترجمہ: ہر گدا مردِ میدان کب ہو سکتا ہے، مچھر، سلیمان علیہ السلام کی ہمنوائی کب کر سکتا ہے۔

اور اگر محض فضل خداوندی سے کسی صاحبِ دولت کی نظر بصیرت کے لئے حتی الامکان مرتبہ وجوب تفصیل کے ساتھ ظاہر کر دیں تو وہ اس مقام میں ان جواہر کے اصول کا مطالعہ کر لیتا ہے اور ان چھوٹے اور بڑے جواہر کو اس حقیقت کے جواہر کے ظل وسایہ کی مانند معلوم کرتا ہے۔

ایں کار دولت ست کنوں تا کرا دہند

ترجمہ: یہ دولتِ عظمٰی کا معاملہ ہے۔ دیکھیئے اب یہ کسے عطا کرتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

عالمِ اَمر کے حقائق کا اظہار اس بنا پر ممنوع ہے کیونکہ اس کے معانی و مطالب پوشیدہ نہایت دقیق اور باریک ہیں۔ تاکہ ہر کوتاہ نظر شخص کچھ اور ہی نہ سمجھ لے۔ علم میں راسخ لوگ جو: وَمَا أُوتِيتُم مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (الإسراء ۸۵) (ترجمہ: تمہیں تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔) کے شرف سے مشرف ہیں وہ اس ماجرا سے آگاہ ہیں۔

هنيئًا لارباب النعيم نعيمها

ترجمہ: نعمت والوں کو نعمتیں مبارک اور خوشگوار ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

ترجمہ: یہ مصلحت کے خلاف ہے کہ راز پردے سے باہر آئے، ورنہ رندوں کی محفل میں کوئی ایسی خبر نہیں جس کی انہیں خبر نہ ہو۔]

تشریح

جواہر خمسہ کو ہم قلب، روح، سر، خفی اور اخفٰی کا نام دیتے ہیں، ان کا سلوک طے کرنا ضروری ہے تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہر سالک ان جواہر کی حقیقت سے آگاہ ہو۔ یہ آگاہی کامل و مکمل اولیاء کرام کا حصہ ہے۔

عرشِ عظیم جو عالمِ کبیر میں ہے اس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف ہے اور دوسرا عالمِ خلق کی جانب ہے۔ اور عالمِ صغیر کے عرش (قلبِ انسانی) کے بھی دو رخ ہیں۔ اس کا ایک رُخ عالمِ اَمر کی طرف ہے اور اس رُخ سے یہ عالمِ بالا سے انوار و تجلیات اور فیوض وبرکات حاصل کرتا ہے اور اس کا دوسرا رُخ مخلوق کی طرف ہے اور اسی رُخ سے وہ انوار اور فیوض وبرکات کو تقسیم کرتا

ہے۔ پس شیخ کے لئے قلب کی منازل کا طے کرنا ضروری ہے۔ اگر اس کا قلب ذاکر ہوا تو وہ مریدین کو فیض دینے کی اہلیت رکھے گا ورنہ وہ اس صفت سے محروم رہے گا، یعنی مریدین کی تربیت نہیں کر سکے گا۔ جبکہ فی زمانہ جس طرح لوگ مشائخ کی صفات سے جہالت رکھتے ہیں ویسے ہی مشائخ نے بھی اپنے اصلی فرض اور ضروری کام کو بھلا دیا ہے، مشائخ صرف ماہانہ و سالانہ محافل اور تعویذات تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور جواہرِ خمسہ کو بھُلا دیا گیا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ سطورِ بالا میں اس حقیقت کو واضح فرما رہے ہیں کہ جس طرح عرش عالمِ کبیر میں عالمِ خلق اور عالمِ امر کے درمیان برزخ ہے اس طرح قلب بھی عالمِ صغیر میں عالمِ خلق اور عالمِ اَمر کے درمیان برزخ ہے۔

برزخیتِ عرش و قلب

عرش کے برزخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عرش کے اوپر عالمِ امر ہے اور اس کے نیچے عالمِ خلق ہے، لہٰذا عرش کو برزخیتِ مکانی حاصل ہے لیکن قلب کی برزخیت مکانی نہیں کیونکہ قلب عالمِ خلق اور عالمِ امر کے درمیان مکانی طور پر واقع نہیں ہے بلکہ انسان کے وجود میں عالمِ خلق اور عالمِ امر دونوں ملے جُلے ہوئے ہیں، لہٰذا قلب کے برزخ ہونے کا معنٰی یہ ہے کہ قلب وصول و ایصالِ فیوضات کا واسطہ ہے۔ اس کی ذرا سی تفصیل یوں ہے کہ:

"عالمِ قُدس کے فیوضات سب سے پہلے روح کو پہنچتے ہیں۔ چونکہ روح عالمِ امر سے ہے اور قلب بھی عالمِ امر سے ہے اسی مناسبت کی وجہ سے وہ فیوضات روح سے قلب کو پہنچتے ہیں۔ قلب کی دو قسمیں ہیں: قلبِ نوری (لطیفۂ نور) اور قلبِ صنوبری (مُضغۂ گوشت) چونکہ قلبِ صنوبری، قلبِ

نوری کا ظرف ہے، پس عالمِ قدس کا وہ فیض بواسطہ ٔظرفیت ومظروفیت کے قلبِ نوری سے قلب صنوبری کو پہنچتاہے اور چونکہ قلبِ صنوبری عالمِ خلق سے ہے اور نفس بھی عالمِ خلق سے ہے، لہٰذا اسی مناسبت کی وجہ سے وہ فیض قلبِ صنوبری سے نفس کو پہنچتا ہے اور نفس چونکہ کُل ہے اور حواس وجوارح اس کے اجزاء واعضاء ہیں اس لئے وہ فیض کل (نفس) سے اس کے اجزاء (حواس) تک پہنچتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قلب کی برزخیت ایصالِ فیض کا واسطہ ہونے کے اعتبار سے ہے، نہ کہ مکان کے اعتبار سے"۔(فافهم)

قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰهِ۔[1] (مؤمن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے) کے ارشاد میں قلب کو عرش قرار دینے کی ایک وجہ تو اس کا عالمِ خلق واَمر کے درمیان برزخ ہونا ہے جیسا کہ عرش بھی برزخ ہے اسی برزخیت کی مناسبت سے قلب کو عرش کہا جاتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآنی آیت الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰه۵) کے مطابق عرش تجلیاتِ ذات وصفات کا مظہر ہے۔ اسی طرح قلبِ عارف بھی فناوبقا کے بعد انوارِ ذات وصفات کا مظہر ہوتا ہے بلکہ صوفیاء کے نزدیک قلب کو عرش پر فضیلتِ جزوی حاصل ہے کیونکہ قلب کو عالمِ قدس کے ساتھ تعلق عشقی وحبی حاصل ہے اور عرش عشق ومحبت کی نعمت سے محروم ہے۔

اسی لئے فرمایا گیا:

عرش وغزنین ہر دو یک طبق است
بلکہ غزنین شریف تر طبق است

---

[1] (تفسیر یعقوب چرخی، ص ۲۴۹)

یعنی عرش وغزنی دونوں مرتبے میں برابر ہیں، بلکہ غزنی کا شرف عرش سے زیادہ ہے۔ کیونکہ غزنی کے اولیاء کے قلوب میں جو عشقِ الٰہی ہے عرش اس عشق سے بے خبر ہے۔

بینہ نمبر ۲

واضح رہے کہ عرش کے اوپر والی طرف بے چون وبے کیف ہے، اس لئے اس کے اوپر والا حصہ عالمِ امر سے تعلق رکھتا ہے اور نیچے والی طرف چون وچند (کیف وکم) سے متصف ہے اس لئے نچلا حصہ عالمِ خلق میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح قلب کی بھی دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت سے قلب لطیفۂ نور ہے اور دوسری حیثیت سے مضغۂ گوشت ہے۔ لطیفۂ نور کی حیثیت سے قلب کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور مضغۂ گوشت کی حیثیت سے قلب کا تعلق عالمِ خلق سے ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نزدیک عرش وقلب عالمِ اَمر کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، لہٰذا ان کو عالمِ اَمر سے ہی شمار کیا جانا چاہیئے۔ صوفیائے محققین کے نزدیک عرش کے اوپر قلبِ نوری کا مقام ہے۔ قلب نوری سے اوپر روح کا مقام ہے، روح سے آگے سر ہے اور اس سے آگے خفی اور خفی سے اوپر اخفٰی کا مقام ہے۔ ان کی حقیقت پر اولیائے کرام میں سے ان خاص اور کامل افراد کو اطلاع دی جاتی ہے جو راسخین فی العلم ہوتے ہیں اور وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (الإسراء ۸۵) کے مصداق ہیں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۰۸ تا ۱۱۰)

[آپ کو السلام علیکم اور ان سب کو جو ہدایت کی پیروی کریں اور مصطفیٰ علیہ وعلیہم من الصلوات والتسلیمات اتمہا وادومہا کی متابعت اپنے اوپر لازم کر لیں۔

دل میں آیا کہ ان بلند اور مقدس جواہر کا تھوڑا سا حال تحریر میں لایا جائے۔

جاننا چاہیئے کہ ان جواہر کی ابتداء صفات اضافیہ سے ہے جو وجوب اور امکان کے درمیان برزخ وواسطہ کی مانند ہیں، اور ان سے اوپر صفات حقیقیہ ہیں کہ روح کا ان سے حصہ ملتا ہے۔ اور قلب صفاتِ اضافیہ سے تعلق رکھتا ہے، اور ان کی تجلیات سے مشرف ہوتا ہے۔ اور باقی ماندہ بلند جواہر جو صفاتِ حقیقیہ سے بھی اوپر ہیں حضرت ذات اقدس تعالیٰ وتقدس کے دائرہ میں داخل ہیں۔ اس لئے ان تین (سر، خفی، اخفٰی) کی تجلیات کو تجلیاتِ ذاتیہ کہتے ہیں۔ بات کو اس سے آگے چلانا مصلحت نہیں ہے۔

قلم اینجا رسید و سر بشکست

[ترجمہ: قلم یہاں پہنچا اور ٹوٹ گیا۔]

تشریح

قلب پر صفاتِ اضافیہ سے فیض آتا ہے اور قلب کے ذاکر ہو جانے پر سالک کے لطیفہ روح کا نمبر آتا ہے۔ روح کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ حقیقیہ، ثبوتیہ سے فیض ملتا ہے۔ روح سے آگے سر کا لطیفہ ہے جسے شیونِ ذاتیہ سے فیوض وبرکات ملتے ہیں۔ بعد ازاں خفی ہے اور خفی کو اعتبارات سے فیض آتا ہے اور اس کے بعد اخفٰی کا مقام ہے جسے شانِ جامع سے حصہ ملتا ہے۔ ان آخری تین لطائف کی تجلیات، تجلیاتِ ذاتیہ کہلاتی ہیں۔

جن سالکین کے قلب اور روح اس فاسد دور میں ذاکر ہو جائیں اُن پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا خاص فضل ہوتا ہے، انہیں چاہیئے کہ ہر حال میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر بجالائیں اور اس کے فرائض وواجبات میں کسی قسم کی سُستی وکوتاہی نہ کریں بلکہ سنتوں اور مستحبات کا بھی ہر دم خیال رکھیں کہ سالک کے لئے سنتوں کو زندہ کرنا بہت ضروری اور نیک ومبارک ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ حرام ومکروہات سے حتی الوسع اجتناب کرنا تو سالکوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔ باقی رہے آخری تین

لطائف تو ان کا ادراک اور مشاہدہ کرنا کاملین اولیاء کا حصہ ہے جیسے یہ فضل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس پر فرمایا۔ ہر کس وناکس اس مرتبہ اور مقام کی اہلیت نہیں رکھتا۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

مراتبِ جواہرِ خمسہ

سطور بالا میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے جواہر مقدسہ علیہ (لطائف خمسہ عالمِ اَمر) کے بارے میں جو ارشاد فرمایا ہے اس کا اجمالی بیان ہدیہ ٔ قارئین ہے۔

جواہر خمسہ کی اصل اور ابتداء اللہ تعالیٰ کی صفاتِ اضافیہ ہیں اور عالمِ خلق وعالمِ امر کا وجود ان ہی صفات کا اثر ہے، اور صفاتِ اضافیہ سے مراد تخلیق (پیدا کرنا) ترزیق (رزق دینا) اماتت (مارنا) احیاء (زندہ کرنا) وغیرہا ہیں اور یہی صفات عالمِ وجوب اور عالمِ امکان کے درمیان برازخ (واسطے) ہیں ان کے اوپر صفاتِ حقیقیہ (ثمانیہ) ہیں اور وہ ارادہ، قدرت، سمع، بصر، کلام، علم، حیات اور تکوین ہیں۔

قلب صفاتِ اضافیہ کی تجلیات سے مشرف ہے اور روح کی صفات حقیقیہ کی تجلیات سے حصہ حاصل ہے اور باقی جواہر یعنی سر، خفی اور اخفٰی کا تعلق صفاتِ حقیقیہ سے اوپر کے مراتب سے ہے۔ یعنی ان کا مبدأ ٔ فیض صفاتِ حقیقیہ سے اوپر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ یہ جواہر خود صفات حقیقیہ سے بلند ہیں کیونکہ خود یہ لطائف عالمِ امکان سے ہیں اور صفاتِ حقیقیہ عالمِ وجوب سے ہیں۔ البتہ ان لطائف کے مبادیٔ فیوض (جو شیوناتِ ذاتیہ، صفاتِ سلبیہ اور شانِ جامع سے عبارت ہیں) صفاتِ حقیقیہ ثمانیہ سے اوپر ہیں۔ اسی لئے ان تینوں جواہر (لطائف) کی تجلیات کو تجلیاتِ ذاتیہ کہتے ہیں۔

تجلیاتِ ذاتیہ کے دو معنیٰ ہیں

تجلیات ذاتیہ کے دو معنیٰ ہیں: اول تجلیاتِ ذاتیہ بمعنی اَعَمْ، دوم تجلیاتِ ذاتیہ بمعنی اَخص۔

تجلیات ذاتیہ بمعنی اَعَم کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تجلیات صفاتِ زائدہ نہ ہوں اور تجلیاتِ ذاتیہ بمعنی اخص کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تجلیات فقط ذاتِ بحت تعالیٰ کی ہوں۔ اس مقام میں عارف کے سامنے شیونات واعتبارات کی تجلیات بھی ملحوظ نہیں ہوتیں۔ یہاں تجلیاتِ ذاتیہ سے تجلیاتِ شیونات واعتبارات بمعنی اَعَمْ مراد ہیں کیونکہ شیونات واعتبارات کا وجود انتزاعی ہوتا ہے۔ (وَاللهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

آخر میں آپ نے فرمایاہے کہ ان حقائق کا اظہار خلافِ مصلحت ہے اور یہ بحث معانیٔ مکنونہ اور اسرارِ غامضہ سے ہے۔ اسی لئے عالمِ اَمر اور حقیقتِ روح پر بحث و تمحیص سے روک دیا گیا ہے۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا یہ فرمانا کہ حقائق عالم اَمر کا اظہار خلافِ مصلحت ہے اس اَمر کا غمّاز ہے کہ آپ پر یہ حقائق ظاہر کر دیئے گئے تھے اور آپ اُن راسخین فی العلم میں سے ہیں جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا: وَمَا أُوتِيتُم مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (الإسراء ۸۵)

(البینات شرح مکتوبات، ج۲، ص ۱۱۱، ۱۱۲)

مکتوب نمبر ۳۵

[محبتِ ذاتی کے بیان میں جس میں انعام وتکلیف دونوں برابر ہیں۔۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی میاں حاجی لاہوری کو لکھا:

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں اور تمہیں بحرمۃ سید البشر علیہ وعلیٰ آلہٖ الصلوات والتسلیمات نظر کی کجی سے نجات عطا کرے۔

سیر وسلوک سے مقصود نفس امارہ کا تزکیہ اور تطہیر ہے، تاکہ باطل الٰہوں کی عبادت سے جو خواہشاتِ نفسانی سے وجود میں آتی ہے نجات میسر آجائے۔ اور حقیقت میں سوائے ایک معبود برحق تعالیٰ وتقدس کے اور کچھ بھی قبلہ توجہ نہ رہے۔ اور دینی ودنیاوی مقاصد میں سے کسی بھی مقصد کو اس ذات کی عبادت کے سوا اختیار نہ کرے۔]

تشریح

سلوک وتصوف اور بیعت کرنے سے مراد صرف عُرس اور قوالی کی محفلیں سجانا نہیں ہے اور نہ یہ مقصود ہے کہ اپنے شیخ کو تحفے تحائف دے کر اُن کی بڑائی بیان کی جائے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ ہو۔ مثال کے طور پر آئینہ پر جب گردوغبار پڑ جائے تو وہ گندا ہو جاتا ہے اور اس کی صاف اور منور سطح عکس دکھانے کے قابل نہیں رہتی، اس مقصد کے حصول کے لئے اُسے صاف کیا جاتا ہے تاکہ وہ دیکھنے کے قابل ہو اور اُس سے کام لیا جاسکے۔ یونہی نفسِ انسانی پر بھی عالمِ خلق کا گردوغبار پڑ جاتا ہے اور وہ اپنی اصلی صفات سے محروم ہو جاتا ہے اسی طرح قلبِ انسانی میں کفروشرک، عداوت اور کینہ وغصہ کی خطرناک صفات نے ڈیرہ لگایا ہوتا ہے، قلب ونفس کی اس گندگی کو ہٹانے کے لئے سلوک میں قدم رکھا جاتا ہے پھر اگر شیخ کامل ہو تو اُس کی توجہات اور سلسلے کی

برکات کے طفیل قلب کی صفاتِ رزیلہ اور نفس کی کدورت زائل ہونا شروع ہو جاتی ہے اور سالک ہر لمحہ کا مقرب ہوتا جاتا ہے تاوقتیکہ ولایت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن آج کل لوگ بیعت ان مذکورہ مقاصد کے حصول کے لئے نہیں کرتے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پیر صاحب اُن کے لئے دعا کریں تاکہ اُس کے مال ودولت اور جائیداد میں اضافہ ہو جائے، یا اُن کے بیٹے، بیٹیاں سکول وکالج کے امتحانات میں کامیاب ہو جائیں۔ وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے نماز شروع کر دیتے ہیں اور ڈھونڈ کر کالے بکرے کا صدقہ دیتے ہیں۔ جب اُن کی مشکلات ٹل جاتی ہیں تو نماز اُنہیں بھول جاتی ہے اور غرباء سے ہمدردی کی سوچ ختم ہو جاتی ہے۔ کیا ایسا سلوک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ہاں مقبول ہے؟ ہرگز نہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے کہ سلوک سے مراد دنیاوی امور کا حصول نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ ہو تاکہ شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

سیر وسلوک سے مُراد تزکیۂ نفس ہے

حضرت امامِ ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے سیر وسلوک سے مقصود یہ ہے کہ عبادات وریاضات اور مُراقبات کے ذریعے نفسِ امارہ کا تزکیہ اور تطہیر ہو جائے تاکہ سالک معبودانِ باطلہ کی عبادت اور خواہشاتِ نفسانی کی شرارت سے نجات حاصل کرے اور اس کی توجہ کا قبلہ سوائے معبودِ برحق کے اور کوئی نہ رہے۔

نفس عالمِ خلق سے ہے اور اپنی ذات کے اعتبار سے نجس اور خبیث ہے لہٰذا اس کی طہارت لازمی ہے۔ عالمِ امر اپنی ذات کے اعتبار سے پاکیزہ اور لطیف ہے۔ لیکن جسمِ انسانی میں ان دونوں

عالموں کے لطائف ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ جب مجاورت کی وجہ سے عالمِ خلق کی کثافتیں عالمِ امر کے لطائف کو غبار آلود کر دیتی ہیں تو عالمِ اَمر کے لطائف کا تصفیہ بھی ضروری جاتا ہے۔ اسی لئے صوفیائے کرام لطائفِ عالمِ اَمر کے لئے تصفیہ کا لفظ بولتے ہیں اور لطائف عالمِ خلق کے لئے تزکیہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۱۵، ۱۱۶)

[دینی مقاصد اگرچہ حسنات میں سے ہیں، لیکن ان کا تعلق بھی اَبرار کے کام سے ہے۔ مُقربین انہیں بھی برائیوں میں سے ہی جانتے ہیں۔ اور ایک ذات کے سوا کسی چیز کو مقصود نہیں گردانتے۔ یہ دولت حصولِ فنا سے وابستہ ہے۔ اور محبتِ ذاتی پیدا ہو جانے کے بعد ہے، جہاں انعام وتکلیف دونوں مساوی ہیں۔ تکلیف ورنج سے بھی ایسے ہی لذت گیر ہوتے ہیں جیسے نعمتوں سے۔ اگر بہشت چاہتے ہیں تو اس لئے چاہتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی رضا کا مقام و محل ہے، اور اسے طلب کرنے میں اس کی رضا اور خوشنودی ہے۔ اور اگر دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں تو اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ناراضی کا مقام ہے۔ نہ بہشت سے حظِ نفس مطلوب ہے اور نہ دوزخ سے فرار اختیار کرنا اور پناہ مانگنا رنج اور محنت کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ محبوب کی طرف سے جو چیز بھی آتی ہے وہ ان بزرگوں کو مرغوب اور پسند اور عین مطلوب ہے۔

کل مایفعله المحبوب محبوب

ترجمہ: محبوب جو کچھ بھی کرتا ہے وہ محبوب اور پسندیدہ ہی ہوتا ہے۔]

تشریح

ابرار لوگ جو کام نیک سمجھ کر کرتے ہیں وہی کام مقربین کے نزدیک بُرا ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شیخ لوگوں کو اس لئے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ اُس کے مُرید ہو جائیں۔ پس ظاہراً تو یہ عمل اچھا ہے

کیونکہ اس عمل سے لوگوں کا دین کی طرف متوجہ ہونا ممکن ہو سکتا ہے لیکن ایک مقرب شخص ہرگز لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے توجہ نہیں کرتا کیونکہ اس عمل سے اُس کے دل میں ریا اور شہرت پیدا ہونے کا بھی احتمال پایا جاتا ہے اور یہ مُقربین ہی ہیں جنہیں محبتِ ذاتی نصیب ہوتی ہے۔ ابرار کو اس دولت سے حصہ نصیب نہیں ہوتا۔

محبتِ ذاتی کے تین درجات ہیں

محبتِ ذاتی تین کیفیات میں حاصل ہوتی ہے:

پہلی قسم کا سالک وہ ہے جس کی محبت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ زائدہ کے ساتھ ہوتی ہے مگر وہ سیر وسلوک اور طریقت میں اس نیت سے داخل ہوتا ہے اور مرشد سے بیعت اس لئے کرتا ہے کہ اُس کی ساری دنیوی مشکلات حل ہو جائیں۔ یہ سالک بھی فانی ہوتا ہے مگر اُسے فناءِ ذاتی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات سے محبت نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ زائدہ سے محبت ہے۔ اس کا رزق فراخ ہوتا ہے، اس کے گھر میں بیماریاں نہیں ہوتیں الغرض اس کو کسی قسم کی دنیوی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ اس سالک کی محبت دنیا کے کاموں کے ساتھ ہے، اور دنیوی کاموں کی وابستگی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ زائدہ کے ساتھ ہے۔

دوسری قسم کا سالک وہ ہے جس کی محبت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ کے ساتھ ہوتی ہے وہ آخرت چاہتا ہے اور دوزخ سے پناہ مانگتا ہے اور جنت کی خواہش رکھتا ہے، یہ سالک صرف اور صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا خواستگار ہوتا ہے اور مکمل طور پر اپنے آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے فرمان کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔

تیسری قسم کا سالک وہ ہے جس کی محبت صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہوتی ہے اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس سالک پر انعام فرماتا یا اس کو تکلیف پہنچاتا ہے تو یہ دونوں کیفیات اس سالک پر ایک جیسی ہوتی ہیں۔ نہ تو اس کا تعلق صفاتِ زائدہ کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ ہی صفاتِ ذاتیہ کے ساتھ۔ بلکہ اس کا تعلق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

فنائے مطلق اور محبتِ ذاتی

عارف وہی ہوتا ہے جو ذاتِ حق تعالیٰ کو اپنا قبلۂ توجہ اور مقصودِ حقیقی جانے اور کوئی مقصد اس کے پیشِ نظر نہ ہو خواہ وہ مقصد دینی ہو یا دنیاوی۔ واضح رہے کہ دینی مقاصد اگرچہ حسنات میں سے ہیں لیکن یہ مقام ان لوگوں کا ہے جو اَبرار کے زُمرے میں شامل ہیں، مقربین کا مقام اَبرار کے مقام سے بلند تر ہے۔ مقولہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ کے مطابق جو مقاصد اَبرار کے نزدیک نیکیوں میں شمار ہوتے ہیں وہ مقربین کے نزدیک گناہوں میں شامل سمجھے جاتے ہیں اور یہ دولت جو مقربین کو حاصل ہے فنائے مطلق اور محبتِ ذاتی کے ساتھ مربوط ہے۔ فنائے مطلق کے بعد عارف کو محبت ذاتی کے مقام تک رسائی ہوتی ہے۔ اس مقام میں عارف کی نظر کسی نعمت یا زحمت پر نہیں ہوتی وہ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللہ کی منزل میں گم ہو جاتا ہے۔

وہ ایذاء وعذاب میں بھی وہی لذت پاتا ہے جو نعمت وراحت میں پاتا ہے، حتیٰ کہ انعام وایلام مساوی ہو جانے کی بناء پر جنت اور دوزخ سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں، یہ حضرات اگر جنت کے طالب ہوتے ہیں تو فقط اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام ہے اگر دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں تو وہ بھی اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا مقام ہے۔

غرضیکہ ان حضرات کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ جنت کی طلب، راحتِ نفس کے لئے نہیں کرتے اور دوزخ سے پناہ زحمتِ نفس کی وجہ سے نہیں مانگتے، بلکہ وہ رضائے الٰہی میں فنائے مطلق کے بعد محبت ذاتی کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں اور کُلُّ مَا یَفْعَلُهُ الْمَحْبُوْبُ مَحْبُوْبٌ (محبوب کا ہر کام محبوب ہوتا ہے) کے مطابق کلمۂ توحید اور اخلاص کی حقیقت پالینے کا یہی مقام ہے۔(وَبِاللهِ التَّوْفِيْق)

اس محبتِ ذاتی کے بغیر جو بے ملاحظۂ اسماء وصفات اور بے توسل انعام وایلام ہو مقصود کا حاصل ہونا بہت محال ہے کیونکہ شرکتِ سوزِ محبت کے بغیر فنائے مطلق بھی ہاتھ نہیں آتی۔

عشق آں شعلہ است کہ چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(مثنوی)

جبکہ روشن عشق کا شعلہ ہوا　　　ماسوا معشوق کے سب جل گیا

(البینات شرح مکتوبات، ص ۱۱۷، ۱۱۸)

[اخلاص کی حقیقت اس جگہ ہاتھ آتی ہے اور باطل الٰہوں سے نجات بھی اسی جگہ حاصل ہوتی ہے اور کلمۂ توحید بھی اس وقت ہی درست ہوتا ہے۔ اس کے سوا محض رنج وتکلیف اٹھانے کی بات ہے۔ محبتِ ذاتی کے بغیر جو اسماء اور صفات اور محبوب کے انعام وتکلیف کے ذریعہ کے بغیر ہے، رَخنے اور عیب والی بات ہے۔ فناء مطلق اس شرکت سوز محبت کے بغیر ہاتھ میں نہیں آتی۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغِ لَا در قتل غیر حق براند
در نگر زاں پس کہ بعد از لَا چہ ماند

ماندِ الّا اللّٰہ باقی جملہ رفت
شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت

ترجمہ: عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہو جاتا ہے تو معشوق کے سوا ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ غیر حق پر لا کی تلوار چلا دیتا ہے۔ یہ تلوار چلنے کے بعد پھر دیکھ کہ لَا کے بعد کیا ہے۔ صرف اللہ رہتا ہے، باقی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ اسے شرکت کو پوری طرح جلا دینے والے عشق تو شاد اور خوش رہ۔]

تشریح

قرآن عظیم الشان میں اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (البینۃ ۵)

ترجمہ: صرف اسی (اللہ) کے لئے دین کو خالص رکھیں۔

شریعت کے تین اجزاء ہیں یعنی علم، عمل، اخلاص۔ اور طریقت و حقیقت دونوں اس جزوِ اخلاص کو کمال تک پہنچانے میں شریعت کی خادم ہیں۔ ہر سالک کے لازمی ہے کہ اپنے اندر دِین کے لئے اخلاص پیدا کرے کیونکہ جب تک اس کے اندر دِین کے لئے اخلاص نہیں ہو گا اس وقت تک وہ کامل دین دار نہیں ہو سکتا۔ جب تک سالک محبتِ ذاتی میں فانی نہ ہو جائے اور انعام و آلام کو ایک جیسا نہ جانے اور اخلاص پیدا نہ ہو سالکِ صادق نہیں بن سکتا۔

مکتوب نمبر ۳٦

[اس بیان میں کہ شریعت تمام دنیوی اور اُخروی سعادتوں کی ضامن و کفیل ہے اور کوئی مطلب و مقصود ایسا نہیں جس کے حصول کے لئے شریعت کے ماسوا کسی اور چیز کی طرف انسان محتاج ہو۔ طریقت و حقیقت اسی شریعت کے خادم ہیں، اور اس کے مناسب باتوں کے بیان میں۔۔۔۔۔ یہ خط بھی ملا حاجی محمد لاہوری کو لکھا:]

تشریح

سیر و سلوک (تصوف و طریقت) شریعت غر اَ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے ساتھ وابستہ ہے، اگر کوئی شخص تصوف و طریقت کو شریعت کے بغیر چاہتا ہے تو وہ گمراہ، بدبخت اور زندیق ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر اپنی ظاہری و باطنی ترقی چاہتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ شریعت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے۔ کچھ علماءِ ظواہر کہتے ہیں کہ طریقت کا کچھ فائدہ نہیں اور بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ شریعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، سب کچھ طریقت میں ہے۔ لیکن یہ دونوں غلط راستے پر ہیں اور دینِ اسلام سے بالکل ناواقف اور گمراہ ہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ شریعت متبوع اور طریقت اس کے تابع ہے، اگر کوئی طریقت میں شامل ہونا چاہتا ہے تو اُسے شریعت پر چلنا پڑے گا اگر شریعت پر نہ چلے تو وہ گمراہ، بدبخت اور زندیق ہو جاتا ہے۔

مفتاح السلوک، جلد دوم میں ہے:

شریعت اور طریقت ایک دوسرے کا عین ہیں

شریعت کے تین اجزاء:

امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اعلم ان للشریعة ثلاثة اجزاء العلم والعمل والاخلاص۔ وما لم یتحقق کل من هذه الاجزاء الثلاثة لا تتحقق الشریعة۔ و متیٰ تحققت الشریعة فقد تحقق رضا الحق سبحانه و تعالیٰ الذی هو فوق جمیع السعادات الدنیویة و الاخرویة و رضوان من الله اکبر فکانت الشریعة متکلفة بجمیع السعادات الدنیویه و الاخرویه, ولم یبق مطلب یقع فیه الاحتیاج الی ماوراء الشریعة۔

والطریقة والحقیقة اللتان امتازت بهما الصوفیة خادمتان للشریعة فی تکمیل جزئها الثالث الذی هو الاخلاص فالمقصود من تحصیل کل منهما تکمیل الشریعة لا امر اخر وراء الشریعة۔

جان لو کہ شریعت کے تین جزء ہیں:

(۱) علم (۲) عمل (۳) اخلاص

جب تک یہ تینوں اجزاء نہ پائے جائیں شریعت متحقق نہیں پاتی اور جب شریعت متحقق ہو گئی تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا جو تمام دنیاوی و اخروی سعادتوں سے اعلیٰ ہے بھی متحقق ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی تھوڑی رضامندی بھی بہت ہے۔ اس لئے شریعت تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں کی ضامن و کفیل ہے۔ اور کوئی ایسا مطلب و مقصود نہیں جو شریعت سے الگ ہو اور انسان کو اس کی حاجت ہو۔ طریقت و حقیقت جس کے ساتھ صوفیاء کرام ممتاز ہیں دونوں شریعت کے خادم ہیں ان دونوں سے شریعت کے تیسرے جزء جو کہ اخلاص ہے کی تکمیل ہوتی ان دونوں (طریقت و حقیقت) سے مقصود بھی

شریعت کی تکمیل ہے نہ کہ کوئی اور امر جو شریعت کے علاوہ ہو۔ [1]

امام ربانی قدس سرہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

وھذا الاخلاص جزء من اجزاء الشریعة فان للشریعة ثلاثه اجزاء العلم والعمل والاخلاص فالطریقة والحقیقة خادمتان للشریعة فی تکمیل جزء الاخلاص وھذا ھو حقیقة الامر ولکن لا یدرک فھم کل احد ذالک واکثر خلق العالم قد اطمانوا بالمنام والخیال واکتفوا بالجوز والموز، فماذا یدرکون من کمالات الشریعة وانا یصلون الی حقیقة الطریقة والحقیقة فیزعمون الشریعة قشرا والحقیقة لبا ولا یدرون ما حقیقة المعاملة بل یغترون بترھات الصوفیه ویفتتنون بالاحوال والمقامات السفلیه۔

اور یہ اخلاص شریعت کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ اس لئے کہ شریعت کے تین جز ہیں:

(۱) علم (۲) عمل (۳) اخلاص

پس طریقت و حقیقت دونوں اس جزء یعنی اخلاص کو کمال تک پہنچانے میں شریعت کے خادم ہیں اور یہی حقیقت ہے لیکن ہر شخص اس چیز کا فہم و ادراک نہیں رکھتا۔ اکثر مخلوق خواب و خیال میں آرام کر رہی ہے۔ اور اکھروٹ و ناریل (معمولی چیزوں) پر کفایت کر چکی ہے۔ شریعت کے کمالات کو کیا جانے اور طریقت و حقیقت کی ماہیت کو کیا پائے۔ اکثر لوگ شریعت کو پوست اور حقیقت کو معزز خیال کرتے ہیں مگر جانتے نہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ بلکہ صوفیاء کی (بحالت سکر میں نکلی ہوئی) باتوں میں آگئے اور احوال و مقامات سے فتنہ میں آگئے ہیں۔ [2]

معلوم ہوا کہ شریعت کے علاوہ جس بھی چیز کو انسان اپنی حاجت سمجھتا ہے دراصل وہ اسکی نفسانی خواہش ہے جیسے وہ شریعت پر مقدم رکھتا ہے اور اپنے گمان باطل میں اسے عین شریعت سمجھتا

---

[1] مکتوب ج ۳۶، ص ۱۰۸، دار الکتب العلمیۃ بیروت

[2] مکتوب ۴۰ ص 116، جلد 01 دار الکتب العلمیۃ بیروت

ہے۔فتدبر و اایھا الجھلاء لعلکم تھتدو ن۔

شریعت کی مخالفت حقیقت کے عدم وصول کی علامت ہے

امام ربانی قدس سرہ، مکتوب ۸۴ میں لکھتے ہیں:

ان مخالفة الشریعة علامة عدم الوصول الی حقیقة الامر۔

بے شک شریعت کی مخالفت حقیقت کے عدم وصول کی علامت ہے۔[1]

شریعت و طریقت ایک دوسرے کا عین ہیں

امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ فرید رحمہ اللہ کی طرف خط صادر فرمایا:

فان الطریقة و الشریعة کل منھما عین الاخر لا مخالفة بینھما مقدار شعرة و انما الفرق بینھما بالاجمال و التفصیل و الاستدلال و الکشف و کلما ھو مخالف للشریعة فھو مردود و کل حقیقة ردته الشریعة فھو زندیقة و طلب الحقیقة مع الاستقامة فی الشریعة حال اھل الکمال من الرجال۔

طریقت اور شریعت ایک دوسرے کا عین ہیں، ان کے درمیان بال برابر بھی مخالفت نہیں۔ فرق صرف اجمال و تفصیل اور استدلال و کشف کا ہے۔ جو چیز بھی شریعت کے خلاف ہو وہ مردود ہے اور ہر حقیقت جسے شریعت رد کردے وہ زندقہ (باطل) ہے۔ شریعت پر استقامت کے ساتھ حقیقت کو طلب کرنا اہل کمال مردوں کا کام ہے۔[2]

مذکورہ بالا مکتوب میں آپ علیہ الرحمہ نے بالکل واضح جاہل صوفیوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ شریعت کو قائم رکھتے ہو حقیقت کو طلب کرنا مردوں کا کام ہے۔

---

[1] مکتوب ۸۴، ص 206، جلد 01، دار الکتب العلمیة بیروت

[2] مکتوب ۴۳، ص ۱۲۵، جلد 01، دار الکتب العلمیہ بیروت

سیدی افضل الدین قدس سرہ نے فرماتے ہیں:

کل حقیقۃ شریعۃ و عکسہ۔

تمام حقیقت شریعت اور اس کا عکس (تمام شریعت حقیقت) ہے۔[1]

استدراج

آپ علیہ رحمہ نے مکتوب ۷۸ میں لکھتے ہیں:

فان حصلت له الاحوال و المواجید فرضاً مع وجود مخالفة الشریعة ولو مقدار شعرة فهی داخلة فی الاستدراج

پس اگر حاصل ہو جائے احوال و مواجید شریعت کی مخالفت کے باوجود اگرچہ بال برابر ہی کیوں نہ ہو تو وہ استدراج میں داخل ہے۔[2]

امام العارفین حضرت سلطان باہو علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

اے دوست! شریعت میں محکم ہو جا کہ اس راہ میں نعوذ باللہ استدراج نہیں۔[3]

سراج السالکین مفتاح العارفین حضرت اشرف جہانگیر سمنانی نوراللہ مرقدہ نے فرماتے ہیں:

خارق عادات، معجزہ، استدراج اور سحر ایک ہی امر ہے جب کسی پیغمبر یا مدعی نبوت سے زمانہ جواز نبوت میں کوئی خلاف عادات امر ظاہر ہو تو اس کو معجزہ کہیں گے اور اگر ولی سے جو اوصاف ولایت سے متصف ہو اس کا ظہور ہو یعنی کوئی امر خلاف عادت ظہور میں آئے تو کرامت ہے اور اگر کسی مخالف شریعت سے ایسا عمل صدور میں آئے تو استدراج ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو اس سے

---

[1] المیزان الکبریٰ، ص ۵۶، دار الکتب العلمیة

[2] مکتوب ۷۸، ص ۱۹۴، جلد 01، دار الکتب العلمیة بیروت

[3] طرفة العین، ص ۱۹، شبیر برادرز

محفوظ رکھے۔ (آمین)[1]

حصول تصوف سے قبل عقائد کا درست ہونا لازمی ہے

امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ لکھتے ہیں:

و لا بد اولا من تصحیح الاعتقاد و تصدیق ما علم من الدین بالضرورۃ۔ ثم العلم و العمل بما تکفل ببیانہ علم الفقہ ایضا ضروری ثم سلوک طریق الصوفیہ ایضا مطلوب۔

اور ضروری ہے اولا عقائد کا درست ہونا اور اس امر کی تصدیق سے جو تواتر و ضرورت دین کے طور پر معلوم ہو (اس کے بغیر) چارہ نہیں پھر علم و عمل ضروری ہے جن کا متکفل علم فقہ ہے اور پھر طریقہ صوفیہ کا سلوک بھی مطلوب (ضروری) ہے۔[2]

عارف باللہ احمد عرب الشرنوی قدس سرہ لکھتے ہیں:

یجب علی المرید قبل الاشتغال بالذکر و الریاضہ ان یحصل من علم التوحید ما یصح بہ اعتقادہ علی مذہب اھل السنۃ و الجماعۃ۔

مرید پر واجب ہے کہ ذکر اور ریاضت میں مشغول ہونے سے پہلے علم التوحید حاصل کرے جس کے ذریعے اس کے عقائد درست ہوں جو کہ مذہب اہل السنۃ والجماعۃ کے موافق ہے۔[3]

طریقت و حقیقت علوم شرعیہ کے خادم ہیں

امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ لکھتے ہیں:

یقین ھذا الفقیر ان طریق الصوفیۃ خادم للعلوم الشرعیہ لانہ امر مباین لھا و قد حققت ھذا فی کتبی و رسائلی۔

---

[1] ملفوظات محبوب یزدان حضرت سید اشرف جھانگیر سخنانی نور اللہ مرقدہ حصہ اول، لطیفہ پنجم، ص ۱۷۳

[2] مکتوب ۲۱۰، ص ۲۹۳، جلد 01، دار الکتب العلمیۃ بیروت

[3] تائیۃ السلوک الی ملک الملوک ص ٦٧، دار الکتب العلمیۃ

اس فقیر کا یقین (کامل) ہے کہ صوفیہ کا طریقہ (طریقت و حقیقت) علوم شرعیہ کے خادم ہیں نہ کہ اس کے علاوہ کچھ اور امر اور فقیر نے اپنی کتابوں اور رسائل میں اس معنیٰ کی تحقیق کی ہے۔ [1]

امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ لکھتے ہیں:

الاحوال المواجید تابعة للاحکام الشرعیة و اعتقدوا ان الاذواق و المعارف خادمة للعلوم لا یعوضون الجواھر النفیسة الشرعیة بجوز الوجد و موز الحال مثل الاطفال

اور اس طرح طریقہ عُلیہ کے بزرگواروں نے احوال و مواجید کو احکام شریعہ کے تابع کیا ہے اور اذواق معارف کو علوم دینیہ کا خادم بنایا ہے۔ احکام شرعیہ کے قیمتی موتیوں کو بچوں کی طرح وجد و حال کے اخروٹ وضقہ کے عوض ہاتھ سے نہیں دیتے۔ [2]

امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ لکھتے ہیں:

الا یرون ان الفقیر قد کتب فی کتبه و رسائله ان الطریقه و الحقیقة خادمتان للشریعة۔

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ فقیر نے اپنی کتابوں اور رسالوں میں لکھا ہے کہ طریقت و حقیقت دونوں شریعت کے خادم ہیں۔ [3]

ظاہر کو ظاہر شریعت اور باطن کو باطن شریعت سے مزین کرنا:

امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ شیخ محمد یوسف کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعنی تحلیه الظاهر بظاهر الشریعة و تزیین الباطن بباطنها الذی هو عبارة عن الحقیقة فان الطریقة و الحقیقة عبارتان عن حقیقة الشریعة۔ و الطریقة هی نفس تلک الحقیقة الشریعة امر و الطریقة و الحقیقة امران آخران مغایران لها، فان اعتقاد ذالک الحاد و زندقة۔

---

[1] مکتوب ۲۱۰، ص ۳۹۲، جلد 01، دار الکتب العلمیة بیروت
[2] المکتوبات الربانیة ج ۱ مکتوب ۲۲۱، ص 421 دار الکتب العلمیة
[3] مکتوب ۲۶۱، ج ۲ ص ۱ 4، دار الکتب العلمیة

میری مراد یہ ہے کہ ظاہر کو ظاہر شریعت کے ساتھ اور باطن کو باطن شریعت کے ساتھ جو حقیقت شریعت سے عبارت ہیں۔ آراستہ اور مزین رکھیں کیونکہ طریقت و حقیقت، حقیقت شریعت سے عبارت ہیں اور یہ بات نہیں کہ شریعت اور چیز اور طریقت و حقیقت اور چیز وامر دیگر ہیں اس لئے کہ یہ تو الحاد اور زندقہ ہے۔[1]

شریعت درخت تو حقیقت اسکا پھل

سیدی ابراہیم الدسوقی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

فالشریعۃھی الشجرۃ، والحقیقۃھی الثمرۃ۔

پس شریعت درخت ہے اور حقیقت (اس کا) پھل۔[2]

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

الشریعۃ کاشجرۃ والحقیقۃ ثمرتھا، فلابدلکل واحدۃ من الاخریٰ۔

شریعت درخت کی مانند ہے اور حقیقت اس کا پھل ہے پس ضروری ہے ہر ایک کے لئے دوسرا۔یعنی شریعت وطریقت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔[3]

کشف کب صحیح ہو گا؟

سیدی عارف باللہ عبد الوهاب الشعرانی قدس سرہ لکھتے ہیں:

الکشف الصحیح لا یأتی دائمًا الا موافقا للشریعۃ۔

کشف کبھی صحیح نہیں ہوتا مگر شریعت مطہرہ کے موافق۔[4]

---

[1] مکتوب ۵۷، ص ۱۵۲ جلد 01، دار الکتب العلمیہ بیروت

[2] الطبقات الکبریٰ: ترجمہ سیدی ابراھیم الدسوقی، ص ۲۳۹، دار الکتب العلمیۃ

[3] الاجوبہ المرضیۃ ص ۱۵۶ دار البیروتی

[4] المیزان الکبریٰ للشعرانی، فصل ان قال قائل ان امراص ۱۷ دار الکتب العلمیۃ

سیدی ممدوح قدس سرہ لکھتے ہیں:

ان اللہ تعالیٰ قد اقدر ابلیس کما قال الغزالی وغیرہ علی أن یقیم ولمکاشف صورۃ المعل الذی یأخذ علمہ منہ من سماء او عرش او کرسی لو قلم او لوح، فربما ظن المکاشف أن ذالک العلم عن اللہ فأخذ بہ ضل و اضل، فمن ھنا او جبوا علی المکاشف انہ یعرض ما أخذہ من العلم من طریق کشفہ علی الکتاب و السنۃ قبل العمل بہ فان وافق فذاک و الا حرم علیہ العمل بہ۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے ابلیس مردود کو قدرت دی ہے جیسے امام غزالی وغیرہ (اکابر صوفیاء رحمہم اللہ تعالیٰ) نے فرمایا کہ صاحب کشف آسمان، عرش، کرسی، قلم، لوح، سے علوم حاصل کرتا ہے اور گمان یہ کرتا ہے کہ اسے یہ علوم اللہ کی طرف سے حاصل ہوئے ہیں۔ خود بھی گمراہ ہوا دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ اسی لیئے ائمہ اولیاء نے صاحب کشف پر یہ واجب کیا کہ جو علم بذریعہ کشف حاصل ہو اس پر عمل کرنے سے پہلے اسے کتاب و سنت پر پیش کرو اگر موافق ہو تو بہتر ورنہ اس پر عمل کرنا حرام ہے۔[1]

شریعت و طریقت و حقیقت کی مثال

الشریعۃ ان تعبدہ و الطریقۃ ان تقصدہٗ و الحقیقۃ ان تشھدۃ۔

شریعت یہ ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور طریقت یہ ہے کہ اس کا مقصد حاصل کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ کیا جائے۔[2]

---

[1] المیزان الکبریٰ، فصل ان قال قائل ان احدًا ص ۱۷، دار الکتب العلمیۃ

[2] الاجوبۃ المرضیۃ ص ۱۵۶ دار البیروتی

قیوم الزمان حضرت اخوندزادہ سیف الرحمٰن پیر ارچی مبارک شریعت و طریقت کا باہمی تعلق بیان فرماتے ہیں:

شریعت کی مثال درخت کے تنے کی طرح ہے جبکہ طریقت کی مثال شاخوں کی سی ہے۔ اگر کسی درخت کی شاخیں کاٹ دی جائیں تو اس پر پھل کیسے آئے گا۔ طریقت اور شریعت ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔

صاحب ممدوح قدس سرہ شریعت، طریقت اور حقیقت کو مثال کے ذریعے واضح فرماتے ہیں کہ:

جیسے جھوٹ بولنا منع ہے اگر کوئی شخص کوشش کرے کہ اس کی زبان پر جھوٹ جاری نہ ہو تو یہ شریعت ہے اگر دل سے جھوٹ کا خیال نکل جائے تو یہ طریقت ہے۔ اگر زبان و دل دونوں سے یہ بات نکل جائے تو یہ حقیقت ہے۔[1]

کیا حقیقت شریعت کی مخالفت کا نام ہے؟

سیدی علی خواص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

من ظن ان الحقیقۃ تخالف الشریعۃ او عکسہ فقد جھل, لانہ لیس عند المحققین شریعۃ تخالف حقیقہ ابدا حتی قالوا، شریعۃ بلا حقیقۃ عاطلۃ، و حقیقۃ بلا شریعۃ باطلۃ۔

جس نے گمان کیا کہ حقیقت شریعت کے مخالف ہے یا اس کا عکس (شریعت حقیقت کی مخالفت کا نام ہے) پس یقیناً اس نے جہالت کی (جاہلوں والی بات کی) بیشک محققین کے نزدیک ہمیشہ سے شریعت حقیقت کی مخالف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ محققین نے کہا: شریعت بغیر حقیقت کے عاطل

---

[1] مناقب امام خراسان ص، 27،26 السیف فاؤنڈیشن

ہے(عامل کا بغیر عمل کے عمل کے لئے رونا)اور حقیقت بغیر شریعت کے باطل (مردود) ہے۔[1]

امام عبد الوھاب الشعرانی قدس سرہ نے لکھتے ہیں:

من نظر الی کون الحقیقة تخالف الشریعة او عکسه فهو اعور فان الشریعة هی اساس علم الحقیقة التی یترقی السالک منها الی درج الحقیقة فلا یصح طلب الحقیقة من غیر معرفة الشریعة لانه لا یدخل الی الحقیقه الا من باب الشریعة۔

جو شخص دیکھے کہ حقیقت شریعت کے مخالف ہے یا اسکا عکس (شریعت حقیقت کے مخالف ہے) تو یہ شخص اندھا ہے اس لئے کہ شریعت علمِ حقیقت کی اساس ہے جس پر سالک حقیقت کے درجات کی طرف ترقی کرتا ہے۔ پس شریعت کی معرفت کے بغیر حقیقت کو طلب کرنا درست نہیں اس لئے کہ شریعت کے دروازے کے بغیر حقیقت میں داخل ہوا نہیں جاسکتا۔[2]

(مفتاح السلوک، جلد دوم)

[اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں شریعت مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیہ کی حقیقت سے متصف کرے، اور اللہ تعالیٰ اس بندے پر بھی رحم کرے جو آمین کہے۔

شریعت کے تین جزو ہیں: علم، عمل اور اخلاص۔ جب تک یہ تینوں جزو نہ پائے جائیں شریعت متحقق نہیں ہو پاتی۔ اور جب شریعت متحقق ہو گئی تو حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا جو تمام دنیوی واخروی سعادتوں سے فائق واعلیٰ ہے، بھی متحقق ہو گئی:

وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰہِ أَکْبَرُ (التوبة ۷۲)

ترجمہ: اور اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے۔

---

[1] الاجوبة المرضیة ص ۱۵۵ دار البیروتی

[2] الاجوبة المرضیة ص 152، دار البیروتی

اس لئے شریعت تمام دنیوی واخروی سعادتوں کی ضامن وکفیل ہے۔ اور کوئی ایسا مطلب ومقصود نہیں جو شریعت سے الگ ہو اور انسان کو اس کی محتاجی ہو۔ طریقت وحقیقت جس کے ساتھ صوفیاء کرام ممتاز ہیں، دونوں شریعت کی خادم ہیں۔ ان دونوں سے شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کی تکمیل ہوتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں سے مقصود بھی شریعت کی تکمیل ہے، نہ کوئی اور امر جو شریعت کے علاوہ ہو۔

احوال، مواجید اور علوم ومعارف جو صوفیاء کو راستے میں ہاتھ آتے ہیں وہ مقاصد نہیں ہیں بلکہ اوہام وخیالات ہیں، جن سے اطفالِ طریقت کی تربیت مطلوب ہوتی ہے۔ ان تمام سے گزر کر مقامِ رضا میں پہنچنا چاہیئے، جو جذبہ اور سلوک کے مقامات کی انتہاء ہے۔ کیونکہ طریقت وحقیقت کی منازل طے کرنے سے اخلاص کا حاصل کرنا مقصود ہے جو رضا کو مستلزم ہے۔ تینوں قسم کی تجلیات اور عارفانہ مشاہدات سے گزار کر ہزاروں میں سے کسی ایک کو اخلاص کی دولت اور رضا کے مقام تک پہنچاتے ہیں۔ کوتاہ اندیش لوگ احوال ومواجید کو مقاصد اور مشاہدات وتجلیات کو مطالب شمار کرتے ہیں۔ اس لئے وہم وخیال سے زندان خانہ میں گرفتار رہتے ہیں اور شریعت کے کمالات سے محروم رہتے ہیں۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (الشوریٰ ۱۳)

ترجمہ: مشرکوں پر بہت ہی گراں ہے وہ جس کی طرف تم انہیں بلاتے ہو۔

اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ (الشوریٰ ۱۳)

ترجمہ: اللہ اپنے قریب کے لیے چن لیتا ہے جسے چاہے اور اپنی طرف راہ دیتا ہے اُسے جو رجوع لائے۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اخلاص کا مقام حاصل کرنے اور رضا کے مرتبہ تک پہنچنے کے لئے ان احوال و مواجید کا طے کرنا ضروری ہے اور ان علوم و معارف کے ساتھ وابستہ ہے۔

پس یہ اُمور مطلوب کے اسباب و وسائل اور مقصود کے مقدمات ہیں۔

اس معنی کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے حبیب پاک علیہ و علیٰ آلہٖ الصلوات والتسلیمات کے صدقہ سے پورے دس سال بعد اس فقیر پر منکشف و واضح ہوئی ہے اور معشوق شرع پوری طرح جلوہ گر ہوا ہے۔ اگرچہ ابتداء میں بھی یہ فقیر احوال و مواجید میں گرفتار نہیں تھا۔ اور شریعت کی حقیقت کے تحقق و ثبوت کے سوا میری نظر میں کوئی اور مطلب و مقصود نہ تھا۔ لیکن اس اَمر کی حقیقت پورے دس سال بعد کامل طور پر ظاہر ہوئی ہے۔ **الحمد للہ علیٰ ذٰلک حمدًا کثیراً طیباً مبارکاً فیہ مبارکاً علیہ۔**

میاں شیخ جمال مرحوم و مغفور کی وفات تمام اہلِ اسلام کے لئے حزن و پراگندگی کا باعث ہے۔ ان کے مخدوم زادوں کو میری طرف سے صبر و تحمل کی تلقین کریں اور فاتحہ خوانی کریں۔ والسلام]

تشریح

کچھ سالکینِ طریقت کو دورانِ سلوک آزمائش کے طور پر چند ایک چیزیں عنایت کر دی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کشف و شہود، کشف القلوب یا کشف القبور وغیرہ۔ لیکن سالک کو چاہیئے کہ ان میں گرفتار نہ ہو بلکہ ان سے آگے گزرنے کی کوشش کرے کیونکہ اگر ان میں پھنس گیا تو سالک انہیں ہی اپنی منزل تصور کر بیٹھے گا اور اس کی ترقی کا راستہ بند ہو جائے گا۔ اس لئے چونکہ سلوک کا مقصد اخلاص کی دولت اور رضا کا مقام حاصل کرنا ہے اس لئے سالک کو چاہیئے کہ ہر وقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے ان نعمتوں کا سوال کرے اور نفس و شیطان کے دھوکے میں نہ آئے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے اس مکتوب میں شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصوات والتسلیمات کی جامعیت وکاملیت بیان فرمائی ہے اور دو قسم کے گروہوں کو خصوصی طور پر تنبیہہ فرمائی ہے:

اولاً ان صوفیائے خام کو متنبہ فرمایا ہے جو شریعت کو کامل نہیں سمجھتے اور طریقت و حقیقت کو مغز اور شریعت کو پوست خیال کرتے ہیں اور ان کا جو یہ گمان ہے کہ ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیادہ محبوب ہیں، اس لئے مغز ہمیں دیا ہے اور پوست علماء وغیرہم کو دیا ہے محض باطل قرار دیا ہے۔

ثانیاً ان علمائے ظواہر کو انتباہ فرمایا ہے جو طریقت اور تصوف کو خلاف شریعت سمجھتے اور بدعت قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ تصوف احسان واخلاص کا دوسرا نام ہے، اور احسان واخلاص دونوں ماموراتِ شرعیہ میں سے ہیں۔ جیسا کہ حدیثِ احسان: أَنْ تَعْبُدَ اللہَ کَأَنَّکَ تَرَاہُ۔[1] اور آیتِ اخلاص: مُخْلِصِینَ لَہُ الدِّینَ (البینۃ ۵) اس امر کی مؤید ہیں۔

علم، عمل اور اخلاص

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ شریعت کے تین جزو ہیں: اولاً علم، ثانیاً عمل اور ثالثاً اخلاص۔ نیز آپ فرماتے ہیں کہ علم و عمل علماء سے حاصل ہوتا ہے اور اخلاص صوفیائے کرام کی صحبت پر منحصر ہے۔

وہ علماء جو بغرضِ جاہ وریاست و حصولِ منفعت علم و عمل میں مشغول ہیں، گو صورتِ اخلاص کے حامل ہیں لیکن حقیقتِ اخلاص سے غافل ہیں۔ وہ طریقت اور حقیقت کو جو حقیقتِ اخلاص کے حصول کا سبب ہیں، لایعنی شمار کرتے ہیں اور تزکیۂ نفس سے محروم اور بے نصیب ہیں۔ صورتِ

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۲)

اخلاص سے بھی کبھی کبھی حصہ یاب ہوتے ہیں اور اکثر طور پر اس سے بھی خالی رہتے ہیں۔ ان ہی کو علمائے دنیا یا علمائے ظاہر کہا جاتا ہے، اور وہ علماء جو حقیقتِ اخلاص سے متحقق ہیں، علمائے دین یا علمائے آخرت کہلاتے ہیں۔

صورتِ اخلاص

صورتِ اخلاص یہ ہے کہ اپنے اعمالِ حسنہ کی تشہیر و تعریف پسند کی جائے اور عزت، شہرت اور رفعت کو مقصود سمجھا جائے، ایسے لوگوں کے اعمال کبھی رضائے نفس کے تابع اور کبھی رضائے الٰہیہ کے تابع ہوتے ہیں۔

حقیقتِ اخلاص

حقیقتِ اخلاص یہ ہے کہ سالک کو تزکیۂ نفس حاصل ہو جائے۔ عزت، شہرت اور رفعت و منصب کے ترک کا اہتمام کیا جائے اور ہر وقت اپنے تمام اعمالِ حسنہ کو رضائے الٰہی کے لئے مخصوص سمجھا جائے اور اخلاص پر استقامت نصیب ہو جائے۔

حقیقت و طریقت سے مراد شریعت کی حقیقت و طریقت ہے

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

حقیقت عبارت از حقیقتِ شریعت است نہ آنکہ حقیقت از شریعت جُدا است۔ طریقت عبارت از طریقِ رصول است بہ حقیقتِ شریعت نہ امرے مبائن از شریعت و حقیقت پس پیش از

تحقق بہ حقیقتِ شریعت حصولِ صورتِ شریعت است فقط و حصولِ حقیقتِ شریعت در مقامِ اطمینانِ نفس است و وصول بدرجۂ ولایت۔[1]

ترجمہ: حقیقت سے مراد شریعت کی حقیقت ہے نہ کہ حقیقت شریعت سے الگ کسی چیز کا نام ہے۔ طریقت سے مُراد حقیقتِ شریعت تک پہنچنے کا طریقہ ہے، شریعت حقیقت سے الگ کوئی اور چیز نہیں ہے، شریعت کی حقیقت حاصل ہونے سے پہلے صرف شریعت کی صورت کا حصول ہوتا ہے اور شریعت کی حقیقت کا حصول اطمینانِ نفس کے مقام میں ہوتا ہے جبکہ آدمی کو درجۂ ولایت میں رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔

آپ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ وہ صوفیاء جو اپنے کمالات کو شریعت کے کمالات سے اعلیٰ جانتے ہیں مغرور اور مفتون ہیں اور وہ علماء جو طریقت اور حقیقت کو شریعت سے بیگانہ سمجھتے ہیں، بے خبر اور نورِ فراست سے محروم ہیں۔

مقامِ رضا کی ترغیب

سطور بالا میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ سالک کو مقامِ رضا کی ترغیب دلا رہے ہیں اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا رہے ہیں کہ صوفیاء کو اثنائے راہ میں جو وجد وحال اور علوم و معارف حاصل ہوتے ہیں وہ مقاصد نہیں ہوتے بلکہ اوہام وخیالات ہوتے ہیں جن سے طریقت کے طالب علموں کو بہلایا جاتا ہے تاکہ ان کے شوق میں اضافہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ سالکین کو ان کھلونوں سے آگے گزر جانا چاہیئے اور مقامِ رضا تک پہنچنا چاہیئے جو کہ سلوک وجذبہ کے مقاماتِ عشرہ میں سے آخری مقام ہے، واضح ہو کہ مقاماتِ عشرہ میں پہلا مقام توبہ ہے اور آخری مقام رضا ہے۔

---

[1] (معارفِ لدنیہ معرفت، ص ۲۵)

بینہ

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے وجد وحال کے رنگین کھلونوں کو مقاصد شمار کرنے والوں کو کوتاہ اندیش اور وہم وخیال کے قیدی قرار دیا ہے۔ وہم وخیال سے مُراد ان کا یہ ناقص گمان ہے کہ ظلال کو مطالب سمجھتے ہیں اور مطالب سے غافل رہتے ہیں۔ آپ کے نزدیک ظلال (وجد وحال) کی زیادہ سے زیادہ حیثیت یہ ہے کہ وہ مُعدات (اسباب ووسائل) مطلوب ہیں نہ کہ خود مطلوب کیونکہ مطلوب وہم وخیال کے آئینوں سے ماوراء ہے۔

تجلیاتِ سہ گانہ سے مراد تجلیٔ افعال، تجلیٔ صفات اور تجلیٔ ذات ہے۔[1] حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ سالک کو ان تجلیات سے گزار کر مقامِ اخلاص ورضا تک پہنچاتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سالک جب تجلیاتِ ذاتیہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو تزکیۂ نفس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بمطابق آیتِ کریمہ: يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (٢٧) ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً (الفجر ٢٨) تزکیۂ نفس کا نام ہی مقامِ رضا ہے۔ لیکن حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ تجلیاتِ سہ گانہ کے بعد مقامِ رضا حاصل ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی یہاں تجلیات سہ گانہ سے مراد ظلالِ تجلیاتِ سہ گانہ ہیں نہ کہ اصلِ تجلیات اور یہ اَمر ظاہر ہے کہ ظلال سے گزرنے کے بعد ہی اصل تک رسائی ممکن ہے۔ لہٰذا ظلالِ تجلیات کے بعد ہی مقامِ رضا میسر ہو سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

(البینات شرح مکتوبات، ج۲، ص ۱۲۱ تا ۱۲۶)

---

[1] (تجلیاتِ سہ گانہ کی تفصیلی شرح کے لئے دفترِ سوم، مکتوب نمبر ۷۵ کا مطالعہ فرمائیں۔)

مکتوب نمبر ۳۷

[بلند سنت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی اِتباع پر اُبھارنے اور اکابر نقشبندیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کی نسبت کے حصول کی طرف راغب کرنے کے بیان میں۔۔۔۔۔ شیخ محمد چتری کو لکھا:]

تشریح

تصوف میں ترقی اور مقاماتِ عالیہ کا حصول صرف اور صرف حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی اتباع کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ لوگ جو طریقت میں شامل تو ہو جاتے ہیں لیکن شریعت کا کچھ خیال نہیں کرتے اُن پر افسوس، ہزار افسوس کیونکہ شریعت کے بغیر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا قُرب سراسر ناممکن بات ہے۔ہاں کوئی شخص طریقت میں داخل ہونے سے پہلے خلافِ شرع زندگی گزار رہا تھا پھر اُس پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فضل ہوا اور وہ صوفی بن گیا تو اب وہ کوشش کرے گا کہ اُس سے کوئی بھی کام شریعت کے مخالف واقع نہ ہو جیسے حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مثال ہے۔

سالک دو طرح کے ہوتے ہیں ایک کسبی یعنی جو کسب وکوشش سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے قُرب کو تلاش کرے، اور دوسرا فضلی یا وہبی یعنی وہ سالک جس کو کوشش کے بغیر ہی فضل سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا قُرب حاصل ہو جائے۔ اور قُرب کی دولت ہاتھ آجانے کے بعد یہ ہر دو قسم کے سالک شریعت کے احکام اور سُنّتِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا التزام کرتے ہیں اور شریعت کی خلاف ورزی سے اجتناب کرتے ہیں۔

اکابرِ نقشبندیہ کی نسبت کے حصول کے لئے خود اکابر صوفیاء نے طریقہ کار بتایا ہے اور وہ یہ کہ ابتدائی سالک اپنے شیخ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسم ذات کو بے چون اپنے قلبِ حقیقی پر گزاریں اور ارادۃً اپنے جسم کے کسی حصہ کو حرکت نہ دیں۔ کیونکہ اس طریقہ میں ذکر لطائف کے

ساتھ ہے اور خفی کیا جاتا ہے، اس لئے روزمرہ کے معمولات اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر میں رکاوٹ نہیں بنتے اور سالک ہر وقت ذکر کر سکتا ہے، بلکہ ہر وقت کرنا چاہیئے کہ قرآن عظیم الشان نے ذکرِ کثیر کا حکم دیا ہے۔

ذکر نفی اثبات کا طریقہ

لطائف کے اذکار جاری ہونے اور اچھی طرح پختہ ہونے کے بعد ذکر نفی اثبات دیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بالکل اطمینان کے ساتھ ماسویٰ اللہ کو باطن سے مٹا کر بیٹھ جائے اور رابطہ ء شیخ کے ساتھ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کا ذکر کرے، اس طرح کہ سانس بند کر کے لفظ "لَا" کو تصور کے ساتھ ناف سے اُٹھا کر سر کی آخری حد یعنی قالبی تک لے جائے اور لفظ "اِلٰهَ" کو پورے خیال کے ساتھ دائیں کندھے پر لے جائے اور تصوّر میں ماسویٰ اللہ کو نیچے پھینک دے اور لفظ "اِلَّا اللہ" کے ساتھ دل پر شدّت سے ضرب لگائے۔ یہاں تک کہ ذکر کی حرارت کا اثر تمام عالم امر کے لطائف میں ظاھر ہو۔ یعنی لفظ "لا" کے ساتھ باطن سے ماسویٰ اللہ کو اُٹھا کر اور 'الہ' کے ساتھ سیدھے کندھے کی جانب نیچے پھینک دے۔ اور لفظ "ا لّا اللہ" کے ساتھ اپنے قلب میں تصوّر اللہ کو باقی رکھے۔ جب سانس میں سالک دقت محسوس کرے تو سانس کو طاق عدد پر خالی کر دے۔ یعنی اگر وہ حبس دم میں نفی اثبات کا ذکر دس مرتبہ کر چکا ہے اور سانس میں تنگی محسوس کرنے لگا ہے تو گیارہ پر سانس کو خالی کر دے۔ یعنی طاق عدد پر سانس چھوڑ دے اور بہ زبانِ حال محمدرّسول اللہ ﷺ پڑھے اور سانس کھولنے کے بعد یہ دعا پڑھے:

اِلٰھِی اَنْتَ مَقْصُوْدِیْ وَ رِضَاکَ مَطْلُوْبِیْ اَعْطِنِی مَحَبَّۃَ ذَاتِکَ وَ مَعْرِفَۃَ صِفَاتِکَ۔

ہر بار لا الہ الاّ اللہ کے ساتھ تصور میں ہی لا معبود الاّ اللہ، لا مقصود الاّ اللہ، لا موجود الاّ اللہ، لا مطلوب الاّ اللہ، ان چاروں میں سے کسی ایک کا معنی دل میں حاضر رکھے، لیکن یاد رکھے کہ مذکورہ آٹھوں اذکار میں زبان بند رہے گی اور یہ سارے اذکار تصور سے کرنے کے ہیں۔

ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ نفی اثبات میں ان باتوں کا خیال رکھیں:

۱)سانس بند رہے۔

۲)معنی دل میں حاضر رکھ کر مذکورہ بتلائے ہوئے طریقہ سے تصور قائم رکھے۔

۳)تعداد کا خیال رکھے کہ جب سانس کھولنا ہو تو طاق عدد پر ہی کھولے۔

۴)سانس چھوڑتے وقت محمد رّسول اللہ ﷺ تصوّر سے پڑھے۔

نفی اثبات میں زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے، کہ اس سے کافی حد تک مقامات طے ہو جاتے ہیں اور افاضہ و استفادہ کی قوّت کافی حد تک نفی اثبات سے بڑھتی ہے۔یعنی آدمی میں نفی اثبات کی کثرت سے دوسرے کو فیض پہنچانے اور دوسرے سے فیض حاصل کرنے کی قوّت کافی حد تک پیدا ہوتی ہے۔

[مراسلہ شریفہ اور مکاتبہ لطیفہ جو از روئے کرم و مہربانی صادر فرمایا تھا، بندہ اس کے مطالعہ سے مسرور اور خوش ہوا۔ اس طریقہ عالیہ نقشبندیہ پر اپنی استقامت و پختگی کا آپ نے لکھا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سُبْحَانَہٗ عَلیٰ ذٰلِکَ۔ اللہ تعالیٰ اس طریقہ عالیہ کے اکابر کی برکت سے آپ کو بے انتہاء ترقیاں عطا

فرمائے۔ ان کا طریقہ کبریتِ اَحمر (سرخ گندھک یعنی اَکسیر) ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ کی اتباعِ سُنت پر مبنی ہے۔

فقیر کو اس وقت جو کچھ ہاتھ آیا ہے اس کے متعلق لکھا ہے کہ مدت دراز تک اس ناچیز پر علوم و معارف اور احوال و مقامات موسلا دھار بارش کی طرح برساتے رہے، اور جو کام کرنا چاہیئے تھا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عنایت سے کر لیا گیا۔ اب کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔ سوائے اس کے کہ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سُنتوں میں سے کسی ایک سُنت کا احیاء (زندہ کرنا) ہو جائے۔ اور احوال و مواجید اربابِ ذوق کے حوالے ہو جائیں۔

چاہیئے یہ کہ باطن خواجگان نقشبندیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کی نسبت سے معمور ہو۔ اور ظاہر کو کلی طور پر سُننِ ظاہرہ کے ساتھ مزین اور آراستہ رکھیں۔

کار این است غیر ایں ہمہ ہیچ

ترجمہ: اصل کام یہی ہے اس کے علاوہ سب ہیچ ہے۔

موسمِ سرما کی عشاء کے سوا باقی تمام نمازیں اول وقت میں ادا کریں۔ سردیوں کی عشاء میں تیسرے حصے رات تک تاخیر مستحب ہے۔ اس بارے میں فقیر بے اختیار ہے۔ نہیں چاہتا کہ بال برابر بھی ادائے نماز میں تاخیر واقع ہو، ہاں بشری عوارض مستثنیٰ ہیں۔]

تشریح

احوال و مواجید اگرچہ راستہ میں آسانی پیدا کرتے ہیں تاہم یہ بھی مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس فرماتے ہیں کہ مجھے ان کا کوئی شوق نہیں۔ شوق ہے تو اس بات کا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سنتوں کو زندہ کیا جائے

یعنی ان پر عمل کیا جائے اور آج کا دور تو چونکہ فتنہ اور دین سے دوری کا دور ہے اس لئے اس دور میں کسی ایک سنت کو زندہ کرنا بھی عظیم ثواب رکھتا ہے اور اس دور میں ایک سنت کو زندہ کرنے والے کے لئے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ۱۰۰ شہداء کے ثواب کی خوشخبری دی ہے تو اُس شخص کی عظمت کا کیا حال ہو گا جو زندگی کے ہر میدان میں سنتوں کا خیال رکھتا ہو۔ اور سنتوں کا یہی احیاءِ سلوک میں ترقی کا راز ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ فرض نمازوں کو اول وقت میں ادا کرنا بہتر ہے۔ ان میں اتنی تاخیر نہ کیا جائے کہ وقت فوت ہونے لگے صبح کی نماز سے سورج طلوع ہونے تک اور عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک کا وقت فرضِ تقدیری کہلاتا ہے۔ چاہیئے کہ اس دوران ذکر کی عادت بنالی جائے، اگر بقیہ اذکار نہ کر سکے تو تلاوتِ قرآن کرلی جائے یا پھر مسائلِ فقہیہ کی کسی کتاب کا ہی مطالعہ کرلیا جائے کہ اس سے علم کا حصول بھی ہو جاتا ہے اور ذکر کا ثواب بھی مل جاتا ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

نسبتِ نقشبندیہ سُنتِ نبوی پر مبنی ہے

اس مکتوب میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے نسبتِ نقشبندیہ کو سنت نبویہ پر مبنی قرار دیتے ہوئے اس کے حصول کی ترغیب دلائی ہے اور اس نسبت کو سُرخ گندھک کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ کیمیا گروں کے نزدیک سُرخ گندھک تانبے کو سونا بنانے والی اکسیر کا جزوِ اعظم ہے اور سُرخ گندھک نہایت نایاب ہے۔ آپ نے سالکین کو تاکید فرمائی ہے کہ باطن کو نسبتِ نقشبندیہ سے اور ظاہر کو سنتِ نبویہ علی صاحبہا الصلوات سے آراستہ رکھنے کی پوری کوشش کریں تاکہ مقصود حاصل ہو جائے۔

احیائے سُنت کا ذوق

واضح ہو کہ سلسلہ نقشبندیہ میں خلافِ سنت ریاضتوں اور مجاہدوں کی بجائے سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوات کے مطابق اعمال وعبادات کا التزام ہے۔ نقشبندی فقراً احوال و مواجید میں گرفتار نہیں ہوتے کیونکہ وجد وذوق ابرار کا طریقہ ہے اور یہ مقربین کے طریق پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہ رخصت کی بجائے عزیمت پر عمل کرتے ہیں اور حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں کے احیاء پر مامور رہتے ہیں جیسا کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ زندگی بھر سنتیں زندہ کرنے کی آرزو میں مچلتے رہے اور آپ نے حتی المقدور تمام سنتوں کو زندہ کیا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ۔

بینہ

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ بہت مدت کے بعد یہ راز معلوم ہوا کہ احوال و مواجید تو بس راستے میں رہ جانے والی چیزیں ہیں۔ مطلوبِ اصلی احوال و مواجید سے وراء الوراء ہے اور سنتوں پر عمل کے سوا مطلوب تک جانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

نماز اول وقت میں ادا کرنا افضل ہے

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے احادیث مبارکہ کی روشنی میں رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سنت کے تقاضوں کے مطابق پانچوں نمازیں اول وقت میں ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے پوچھا گیا اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ یعنی کون سا عمل افضل ہے۔ قَالَ الصَّلٰوۃُ لِاَوَّلِ وَقْتِھَا۔[1] آپ صلی اللہ تعالیٰ

---

[1] (سنن الترمذی، ج ۱، ص ۲۴، مسند احمد، ج ۶، ص ۳۷۴)

علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا اول وقت میں نماز ادا کرنا افضل ہے۔ نیز آپ نے حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائی ہے کہ سردیوں کے موسم میں عشاء کی نماز ادا کرنے میں تہائی رات تک تاخیر مستحب ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے:

لَوْ لاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي، لأَخَّرْتُ صَلاَةَ الْعِشَاءِ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ، أَوْ نِصْفِ اللَّيْلِ۔[1]

یعنی اگر مجھے اپنی امت کے مشقت میں پڑ جانے کا خیال نہ ہوتا تو عشاء کی نماز کو تہائی رات یا نصف رات تک مؤخر کرنے کا حکم دیتا (کیونکہ یہ افضل اور مستحب ہے)۔

آپ فرماتے ہیں کہ یہ فقیر اس امر میں بے اختیار ہے کہ نماز کی ادائیگی میں سر کے بال کے برابر بھی تاخیر ہو لیکن کسی بشری تقاضے کا حائل ہو جانا ایک استثنائی امر ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۳۰ تا ۱۳۲)

---

[1] (سنن ابن ماجہ، ص ۵۰)

مکتوب نمبر ۳۸

[ذاتِ بحت تعالیٰ وتقدس کی محبت میں گرفتار ہونے کے بیان میں جو اسماء، صفات اور شیون واعتبارات سے منزہ اور پاک ہے۔ اور منزل مقصود تک نہ پہنچنے والی جماعت کی مذمت میں جو چون کو بے چون تصور کرکے اسی کے گرفتار ہوگئے ہیں۔ اور اہلِ فنا کے اقدام کے فرق کے بیان میں اور اسی تفاوت پر علوم ومعارف وغیرہ مرتب ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ مکتوب بھی شیخ محمد چتری کی طرف لکھا:
آپ کا مکتوب شریف ملا۔ فرحت وخوشی کا موجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے اور ایک لحظہ کے لئے بھی غیر کے سپرد نہ کرے۔]

تشریح

متلون مزاج سالک بھی شرکِ لفظی سے حفاظت میں نہیں ہوتا۔ لیکن یہ شرک احوال ومواجید کا شرک ہے نہ کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ شرک۔ وہ منتہی سالک جو صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات مبارکہ پر عاشق ہو اور اُسی کی تمنا کرے وہ شرکِ خفی سے محفوظ ومامون ہوتا ہے۔ تو جب سالکین کا یہ حال ہے تو عوام کا کیا حال ہوگا جو دُنیا اور نفس وشیطان کو اپنا معبود ومطلوب بنائے ہوئے ہیں۔

وہ صوفی جو اپنے شیخ سے احوال وکیفیات کا مطالبہ کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ماسوا کی طلب میں گرفتار ہوتے ہیں اور یہ بھی شرک کا ایک درجہ ہے۔

فنا کے وہ درجات جو عام طور پر لوگوں میں متعارف ہیں وہ تین ہیں۔

پہلے مرحلہ میں سالک فنا فی الشیخ ہوتا ہے، صفاتِ اضافی اور صفاتِ فعلیہ کی ظلی کیفیات اسی مرحلہ میں سالک پر وارد ہوتی ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں سالک فنا فی الرسول کی کیفیت میں جا پہنچتا

ہے۔اس میں سالک پر صفاتِ ثمانیہ، ذاتیہ، ثبوتیہ، حقیقیہ کمالیہ کا فیض آتا ہے، کیونکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا عروج انہیں صفات سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس سے آگے آخری درجہ فنا فی اللہ کا ہے جب سالک اس اَتم فنا پر فائز ہوتا ہے اور اپنی سابقہ کیفیات کا بنظرِ غائر مشاہدہ کرتا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ ذاتِ بحت جو مقصود و مطلوب ہے اور لا مکان ہے جو کچھ اُس کا غیر ہے اُس سب سے تعلق قطع کر لے ایک ذاتِ مقدسہ کا اثبات ہی توحیدِ حقیقی جو صرف اور صرف شریعت والی طریقت میں ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

[جو کچھ ذات بحت سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا ہے اس کو غیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اسماء وصفات ہی ہوں۔ اور متکلمین نے جو صفات کو **لا ھو و لا غیر** کہا ہے اس کا معنی کچھ اور ہے۔ انہوں نے غیر سے غیر اصطلاحی مراد لیا ہے اور اس معنی کے مطابق نفی کی ہے۔ غیر بمعنی مطلق مراد نہیں لیا۔ اور خاص کی نفی عام کی نفی کو مستلزم نہیں ہے۔ اور اس ذات عز سلطانہٗ کو نفی کے سوا کسی طریقہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مرتبہ ذات میں جو کچھ ثابت کیا جائے گا وہ صراطِ مستقیم سے انحراف ہو گا۔ اور بہترین تعبیر اور جامع ترین عبارت یہ ہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞ (الشوریٰ ۱۱)

ترجمہ: اس کی مثل کوئی شے نہیں۔]

تشریح

صفاتِ ذاتیہ اگرچہ نہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات میں شامل ہیں نہ اُس سے جدا ہیں لیکن ان صفات پر عاشق ہونے والا سالک بھی فناءِ اَکمل نہیں پا سکتا۔

صفاتِ ذاتیہ کے دو رُخ ہوتے ہیں جیسے ایک انسان نے لباس پہنا ہوتا ہے اور لباس کا ایک رُخ تو پہننے والے کے جسم کی طرف ہوتا ہے اور دوسرا رُخ باہر مخلوق کی طرف۔ اور لباس کے جسم کے ساتھ کمال تعلق کی بناء پر اسے جسم سے الگ کر دینا محال لگتا ہے۔ یونہی صفات کا معاملہ ہے کہ اُن کا ایک رُخ تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کی طرف ہے اور دوسرا رُخ مخلوق کی طرف، اور انہیں نہ تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُس سے جُدا۔

شیونات ِذاتیہ صفاتِ ذاتیہ سے بھی بلند درجہ رکھتی ہیں اور صفاتِ سلبیہ اُن سے بھی اُوپر اور ان کا بیان قال میں نہیں آسکتا، نہ ہی تحریر میں لانا مناسب ہے۔ ہاں اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو یہ معرفت عطا کر دے تو وہ جدا اَمر ہے۔ البتہ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ نہ تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا جسم ہے، نہ وہ جوہر ہے نہ عرض، نہ کسی مکان کا مکین ہے، نہ اُس پر زمانہ گزرتا ہے اور نہ ہی چھ اطراف میں سے اُس کے لئے کوئی سمت متعین ہے۔ بلکہ انسانی عقل، سوچ، وہم و فہم میں جو کچھ اس ذات مقدسہ کے بارے میں آسکتا ہے اُس سے وہ پاک و منزہ ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ عارفین کے نزدیک ہر ماسوی اللہ کو غیر حق کہا جاتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات بھی اس کی ذات کا غیر ہیں۔ اس ارشاد سے سالک کو یہ سبق سکھانا مطلوب ہے کہ اس کا مقصود فقط ذات ہے نہ کہ صفات۔ لہٰذا سالک کو بلند ہمت ہو کر عروج کی منازل طے کرنی چاہئیں اور ظلال و صفات پر قناعت نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ گرفتارِ صفات بھی گرفتارِ غیر ہے۔

صفاتِ حق لَا هُوَ وَ لَا غَیْرُہٗ ہیں

علمائے متکلمین اہل سنت قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم نے صفاتِ حق تعالیٰ کو جو لَا هُوَ وَ لَا غَیْرُہٗ قرار دیا ہے، اس کا یہ معنی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ انہوں نے صفات کو ذات کا غیر ماننے سے انکار کیا ہے۔ انہوں نے مطلق طور پر غیر کی نفی نہیں فرمائی بلکہ اُن کی مراد اصطلاحی غیر ہے یعنی ایسا غیر جو نہ ذات کا عین ہو اور نہ ذات سے قائم ہو۔ لہٰذا لَا هُوَ میں عینیت واتحاد کی نفی کا معنی پایا جاتا ہے اور لَا غَیْرُہٗ میں ذات پر زائد نہ ہونے اور ذات کے ساتھ قائم نہ ہونے کی نفی کا مفہوم موجود ہے۔

غیریت کی دو قسمیں ہیں

غیریت دو قسم پر ہے:

۱۔ غیریتِ مطلقہ　　　　۲۔ غیریتِ مصطلحہ

غیریتِ مطلقہ

یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان مفہوم اور مصداق کے اعتبار سے مغایرت ہو۔

غیریت مصطلحہ

یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان حقیقی وذاتی طور پر مغایرت موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں اگرچہ مغایرتِ مفہومی ومصداقی موجود ہے لیکن مغایرتِ حقیقی ذاتی موجود نہیں ہے۔ کیونکہ صفات اسی ذات کے ساتھ ہی قائم ہیں، لہٰذا ذات وصفات کے درمیان غیریتِ مطلقہ ہے نہ کہ غیریتِ مصطلحہ۔ پس ثابت ہوا کہ متکلمین نے کلمہ لَا هُوَ کے ساتھ غیریتِ مطلقہ کا اثبات کیا ہے اور کلمہ لَا غَیْرُہٗ کے ساتھ غیریتِ مصطلحہ کی نفی فرمائی ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۳۵ تا ۱۳۷)

[فارسی میں اس کا ترجمہ بے چون وبے چگون ہے۔ اور علم، شہود اور معرفت کو اس ذات سبحانہٗ کی طرف راستہ نہیں مل سکتا۔ جو کچھ لوگ دیکھتے ہیں یا جانتے ہیں یا پہچانتے ہیں سب اس ذات مقدس کا غیر ہے۔ اس میں گرفتاری غیر میں گرفتاری ہے۔ لہٰذا اس کی نفی کرنا لازم ہے اور کلمہ **لا الٰہ** کے نیچے لا کر اس بے چون وبے چگون ذات کا اثبات کلمہ **الا اللہ** سے کرنا چاہیئے۔ یہ اثبات ابتدا ٔمیں تقلیداً ہوتا ہے اور آخر میں تحقیقاً۔]

تشریح

چون وچگون کا لفظ فارسی میں اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس کے لئے کوئی مثال نہ دی جا سکے اور چونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی کوئی مثل نہیں، اس لئے کہا جاتا ہے وہ (اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ) بے چون وبے چگون ہے۔

[بعضے ارباب سلوک سے جو نہایت کار تک نہ پہنچنے کے باعث چوں کو بے چوں تصور کر بیٹھے ہیں اور شہود و معرفت کا اس کی طرف راستہ نکالتے ہیں، ارباب تقلید اُن سے بدرجہا بہتر ہیں۔ کیونکہ اُن کی تقلید نورِ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات سے حاصل ہوئی ہے کہ سہو وخطا کو اس طرف راستہ نہیں مل سکتا۔ اس نہ پہنچنے والی جماعت کا مقتدا اور پیشوا غیر صحیح کشف ہے۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

ترجمہ: دیکھ لے ایک راستے کا دوسرے راستے سے کتنا فرق ہے۔]

تشریح

کشف وشہود کا ایک درجہ تو وہ ہے جس میں کشف اور شہود کے معارف عین شریعت کے مطابق ہوتے ہیں اور یہ کشف وشہود طریقت میں معتبر اور اچھا ہے لیکن دوسرا درجہ وہ ہے جس میں

کشف یا شہود میں شیطان کا حصہ ہوتا ہے اور وہ خلافِ شرع واقع ہوتا ہے، ایسا کشف کوئی اعتبار نہیں رکھتا۔ اس کشف و شہود کے مقابلے میں فقہاءِ کرام اور صوفیاءِ عظام کی تقلید کرنا بہت بہتر اور فائدہ مند ہے کیونکہ تقلید میں کوئی خطاء اور غلطی متصور نہیں ہو سکتی۔ پس اگر احوال و مواجید حاصل ہوں تو چاہیئے کہ انہیں شریعت کی کسوٹی میں تولیں۔ اگر شریعت کے مطابق ہوں تو لائقِ اعتبار ہیں ورنہ ان کی بھی نفی کرنی چاہیئے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ان سے آگے تلاش کرنا چاہیئے۔

[فی الحقیقت یہ جماعت ذات کی منکر ہے۔ اگرچہ ذات کے مشاہدے کا اثبات کرتے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہی اثبات عین انکار ہے۔ امام مسلمین امام اعظم کوفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

سبحٰنک ماعبدناک حق عبادتک ولٰکن عرفناک حق معرفتک۔

ترجمہ: تیری ذات پاک ہے، جیسا تیری عبادت کا حق ہے ہم اس طرح تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے لیکن جیسا تجھے پہچاننے کا حق ہے اس طرح ہمیں تیری معرفت حاصل ہو چکی ہے۔

عبادت کا حق ادا نہ کرنا تو ظاہر ہے۔ لیکن پوری معرفت کا حصول اس بناء پر ہے کہ اس ذات تعالیٰ شانہٗ کی نہایت معرفت صرف یہ ہے کہ اس ذات کو بے چونی اور بے چگونی کے ساتھ پہچان لیں۔ کوئی نادان یہ گمان نہ کرے کہ عام وخاص اور مبتدی و منتہی معرفت میں مساوی اور برابر ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ نادان علم و معرفت میں فرق نہیں کر سکا، مبتدی کو علم ہے اور منتہی کو معرفت۔ اور معرفت فنا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور یہ دولت فانی کے سوا کسی کو میسر نہیں آتی۔

مولوی روم مثنوی میں فرماتے ہیں:

ہیچ کس را تا نگردد او فنا نیست رہ در بارگاہِ کبریا

ترجمہ: کوئی شخص بھی جب تک فنا نہ ہو بارگاہِ کبریا تک راہ نہیں پا سکتا۔

تو یہ معرفت کے علاوہ ہے۔

جاننا چاہیئے کہ علمِ متعارف سے اوپر ایک شے ہے۔ جسے معرفت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسے ادراکِ بسیط بھی کہتے ہیں۔

فریاد حافظ ایں ہمہ آخر بہرزہ نیست

ہم قصۂ غریب و حدیثِ عجیب ہست

ترجمہ: حافظ کہ یہ سب فریاد بیہودہ نہیں، بلکہ قصہ بھی غریب اور بات بھی عجیب ہے۔

اتصالِ بے تکیف و بے قیاس

ہست رب الناس را با جانِ ناس

لیک گفتم ناس را نسناس نہ

ناس غیر از جان جان اشناس نہ

ترجمہ: رب تعالیٰ کا لوگوں کی جان کے ساتھ عقل میں نہ آنے والا اور بے کیف اتصال و تعلق ہے۔ لیکن میں نے "لوگوں" کے ساتھ اتصال کا ذکر کیا ہے، حیوان کے ساتھ نہیں۔ ناس یعنی کاملین وعارفین تو صرف جانِ جاں (محبوبِ حقیقی) کے ساتھ ہی آشنائی رکھتے ہیں۔]

تشریح

"ادراکِ بسیط" سے مراد وہ دشت و بیابان ہے جس میں سالک اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کو تلاش کرتا ہے اور سالک اس کی چون و چگون کی کیفیت کو نہیں سمجھتا یہی معرفت ہے۔

[اور چونکہ فنا میں لوگوں کے قدم متفاوت ہیں، تو صرف منتہی لوگوں کے لئے معرفت میں بھی ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے، جس کی فنا اَتم ہے اس کی معرفت بھی اکمل ہے۔ اور جو فنا میں کم درجہ ہے اس کی معرفت بھی کم درجہ کی ہے۔ اسی طرح اور مراتب بھی۔

سبحان اللہ! بات کہاں پہنچ گئی۔ مجھے تو چاہیئے تھا کہ اپنی بے حاصلی، نامرادی، بے استقامتی اور بے ثباتی کا تذکرہ کرتا اور دوستوں سے مدد و اعانت طلب کرتا مجھے اس قسم کی باتوں سے کیا مناسبت۔

آگہ از خویشتن چو نیست جنیں ۔۔۔۔۔ چہ خبر دارد از چناں و چنیں

ترجمہ: ماں کے شکم میں پڑا ہوا بچہ جب اپنی ذات سے بھی واقف نہیں تو اِدھر اُدھر کی کیا خبر رکھے گا۔

لیکن بلند پایہ ہمت اور سرمایہ والی فطرت اجازت نہیں دیتی کہ انسان ادنیٰ قسم کی چیزوں اور سفلی قسم کے سرمایہ کی طرف اتر آئے۔ بلکہ اس طرف توجہ اور التفات بھی کرے۔ بلند پایہ ہمت انسان اگر بات بھی کرتا ہے تو اسی کی بات کرتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی اس ذات حق کی شان کے سامنے کچھ نہیں ہوتی۔ اور اگر تلاش کرتا ہے تو اسی کو تلاش کرتا ہے، اگرچہ کچھ بھی نہیں پاتا۔ اگر کچھ حاصل کرتا ہے تو اسی کو حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ کچھ بھی حاصل نہیں کرتا۔ اور اگر اسے وصال نصیب ہوتا ہے تو اسی کا وصال نصیب ہوتا ہے، اگرچہ پھر بھی بے حاصل ہی رہتا ہے۔

لیکن اکابر قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم العالیہ کی بعض عبارات میں شہودِ ذاتی کا جو ذکر واقع ہوا ہے اس کے معنی اربابِ کمال کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ نارسیدہ لوگوں کے لئے اس معنی کا سمجھنا محال اور ناممکن ہے۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام! ۔۔۔۔۔ پس سخن کوتاہ باید والسلام

ترجمہ: پختہ آدمی کے حال تک خام آدمی نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا بات مختصر ہی کرنی چاہیئے، والسلام]

تشریح

کشف و شہود اگر صحیح اور درست بھی ہو تو ایک سفلی اور ظلی چیز ہے اور اس سے آگے گزرنا وصلِ عریاں کے لئے لازمی وضروری ہے۔ لیکن ناقص اور کم علم صوفی کشف و شہود کی تمنا کرتے ہیں اور مقصودِ اعلیٰ کی طرف توجہ کم رکھتے ہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حقیقتِ معرفت

بعض غیر پختہ سالکین جو سیر عروجی کے دوران عالمِ وجوب کے مشاہدات میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ لامحالہ ایسے ناقص سالکین تجلیاتِ عالمِ اَرواح یا ظلالِ اسماء وصفات (یا خود صفات) کو عینِ مقصود ومطلوب قرار دے لیتے ہیں اور اس طرح چون کو بے چون اور غیر مطلوب کو مطلوب سمجھ لیتے ہیں اور اسی کو شہود و معرفت کا نام دے کر ظلال پر قناعت کر لیتے ہیں۔ تقلید والے لوگ ان سے کئی درجے بہتر وافضل ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کشف کی بجائے مشکوٰۃ نورِ نبوت سے حاصل ہونے والے علوم کی تقلید کرتے ہیں جس میں سہو وخطا کو ہرگز دخل نہیں۔ ذاتِ بے چون ایسے تمام تصورات سے بلند وبالا ہے اور علوم و شہود و معرفت کو اس کی طرف کوئی راہ نہیں اور لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ (الشوریٰ ۱۱) اس کی شان کے لائق نہیں سے بہتر تعبیر ہے اور جو کچھ کہ دیکھا، جانا اور پہچانا جاتا ہے سب اس کا غیر ہے اور ان کے ساتھ تعلق قائم کرنا غیر کے ساتھ گرفتار ہونا ہے۔ سب کو کلمہ لَا اِلٰهَ کے نیچے لاکر ان کی نفی کرنی چاہیئے اور کلمہ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ فقط ذاتِ بے چون کا اثبات کرنا چاہیئے۔ سالک کو چاہیئے کہ ابتداء میں یہ اثبات تقلید کے طور پر کرتا رہے اور آخر میں تحقیق کے طور پر کرنا خود آسان ہو جائے گا اور اس ضمن میں اکابرین کے اس فرمان کو ملحوظ رکھنا چاہیئے سُبۡحَانَ مَنۡ لَمۡ

يَجْعَلْ لِلْخَلْقِ اِلَيْهِ سَبِيْلاً اِلَّا بِالْعِجْزِ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے نہیں بنایا مخلوق کے لئے اپنی طرف کوئی راستہ سوائے عجز کے اپنی معرفت سے۔

امام اعظم اور معرفت

امام الائمہ، امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو یہ فرمایا ہے:

سُبْحَانَکَ مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَلٰکِنْ عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ۔ [1]

یعنی اے اللہ تو پاک ہے ہم نے تیری عبادت نہیں کی جیسا کہ اس کا حق ہے لیکن ہم نے تیری معرفت کا حق ادا کر دیا ہے۔

اس عبارت میں معرفت کا حق ادا کرنے سے یہی مراد ہے کہ معرفت کی انتہاء اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم اس بے چون وبے چگون کو نہیں پہچان سکتے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ہمارے اس قول سے کوئی نادان شخص یہ گمان نہ کرے کہ اس معرفت میں تو خاص وعام سب برابر ہیں کیونکہ معرفت اور علم میں فرق ہے۔ عوام کو اس امر کا علم حاصل ہے اور خواص کو اس کی معرفت نصیب ہوتی ہے اور معرفت کا مرتبہ علم سے آگے ہے کیونکہ علم ہر خاص وعام کو حاصل ہو سکتا ہے اور معرفت فنا کے بغیر میسر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ علم سببِ ادراک ہے اور معرفت میں ادراک نہیں۔ اسی لئے اس معرفت کا نام ادراکِ بسیط ہے یعنی وہ ادراک جس میں مُدرِک، مُدرَک کی تعبیر سے عاجز ہو ادراکِ بسیط کہلاتا ہے۔

---

[1] (مکتوباتِ سعدیہ)

اقسامِ معرفت و فنا

واضح ہو کہ معرفت فنا کے بعد میسر آتی ہے چونکہ فنا کئی قسم کی ہوتی ہے اس لئے معرفت بھی کئی اقسام پر مشتمل ہو گی۔ اگر فنا کامل ہو گی تو معرفت بھی کامل ہو گی اور اگر فنا ناقص ہو گی تو معرفت بھی ناقص ہو گی۔

فنائے اول

پہلی فنا صفاتِ اضافیہ کے مرتبے میں ہوتی ہے۔ جب سالک ممکنات سے گزر کر ظلالِ صفات تک پہنچ جاتا ہے یہ فنا کی صورت ہے، حقیقت نہیں۔ کیونکہ صفاتِ اضافیہ، برزخِ وجوب وامکاں ہیں۔

فنائے دوم

یہ دوسری فنا ہے جو صفات کے مرتبے میں ہوتی ہے۔

فنائے سوم

تیسری فنا شیونات واعتبارات کے مرتبے میں ہوتی ہے۔

فنائے چہارم

چوتھی فنا مرتبۂ ذات میں ہوتی ہے جس کو فنائے ذاتی کہتے ہیں اور یہ معرفت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۳۷ تا ۱۳۹)

[آپ نے مکتوب کا عنوان هو الظاهر هو الباطن کے کلمہ سے مزین وآراستہ کیا تھا۔ مخدوم گرامی هو الظاهر هو الباطن بالکل درست ہے۔ لیکن کچھ عرصہ سے فقیر اس عبارت سے توحید کے

معنی نہیں سمجھتا۔ اور اس معنی کے سمجھنے میں علماء کے ساتھ موافق ہے۔ اور علماء کے معنی کی درستی ارباب توحید کے معنی کی درستی سے فوقیت رکھتی ہے:

کل میسر لما خلق له

ترجمہ: ہر شخص کو وہی چیز میسر ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ترجمہ: کارکنان قضاوقدر نے ہر کسی کو کسی کام کے لئے پیدا کیا ہے۔

جو چیز اس فقیر پر لازم وضروری ہے اور جس کا وہ مکلف ہے وہ اوامر کی بجا آوری اور ممنوعات سے بچنا ہے۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللّٰہَ (الحشر ۷)

ترجمہ: اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو اور اللہ سے ڈرو۔

اور چونکہ انسان کو اخلاص پیدا کرنے کا حکم ہے، اور وہ فنا اور محبتِ ذاتی کے بغیر متصور نہیں۔ اس لئے فنا کے مقدمات کا حاصل کرنا جنہیں مقاماتِ عشرہ کہتے ہیں، ضروری ہے۔ فنا اگرچہ محض خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہے، لیکن اس کے مقدمات اور مبادی کسب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ بعض کو کسب مقدمات اور ریاضات ومجاہدات کے ذریعہ مصفا کرنے کے بغیر ہی فنا کی حقیقت سے مشرف کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں اس کا حال دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو اسے معرفت کے آخری مقام پر ہی کھڑا کر دیتے ہیں۔ یا ناقص لوگوں کی تکمیل کے لئے اسے جہان کی طرف واپس کر دیتے ہیں۔ تقدیرِ اول پر اسے مقاماتِ عشرہ مذکورہ کی سیر حاصل نہیں ہوتی۔ اور اسماء اور صفات کی تجلیات کی تفصیلات سے بے خبر رہتا ہے۔ اور دوسری تقدیر پر جب اسے جہان کی طرف واپس کرتے ہیں تو اسے

مقاماتِ عشرہ مذکورہ کی سیر تفصیل سے حاصل ہوتی ہے اور بے انتہاء تجلیات سے اسے مشرف کرتے ہیں۔ صورت تو مجاہدہ کی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں کمالِ ذوق ولذت میں ہوتا ہے۔

این کار دولت است کنوں تا کرا دہند

ترجمہ: یہ دولتِ عظمیٰ کا معاملہ ہے، دیکھیئے اب یہ دولت کسے عطا کرتے ہیں۔]

تشریح

مقاماتِ عشرہ سے مراد دس لطائف ہیں، پانچ عالمِ اَمر کے اور پانچ علمِ خلق کے۔ اور ان کا حصول کسب یعنی ظاہری بیعت سے تعلق رکھتا ہے، باقی رہی فنا کی دولت تو وہ صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے اختیار میں ہے کسی اور کی قدرت میں نہیں۔ اور فنا کسب و مجاہدہ کے بغیر بھی عطا ہو سکتی ہے لیکن ہزارہا سالکینِ طریقت میں سے کسی ایک یا دو کو ہی مل سکتی ہے عمومی طور پر اس کو حاصل کرنے کے لئے شیخ کامل سے بیعت کرنا اور مقاماتِ عشرہ کا طے کرنا ضروری ہے۔

[یہ نہ کہا جائے کہ جب اخلاص ان مامورات میں ہے جن کا بجالانا واجب اور ضروری ہے اور اس کی حقیقت فنا کے بغیر میسر نہیں آسکتی تو علماءِ نکوکار اور صالحین نیک اطوار جو حقیقت فنا سے مشرف نہیں ہیں، اخلاص حاصل نہ کرنے پر عاصی اور گناہ گار متصور ہوں گے۔ کیونکہ میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ نفس اخلاص انہیں بھی حاصل ہے، اگرچہ اخلاص کے بعض افراد کے ضمن میں ہو، اور فنا کے بعد کمال اخلاص ہو جاتا ہے۔ اور اس کے تمام افراد کو شامل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ فنا کے بغیر حقیقت اخلاص کے حاصل ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ نہیں کہا کہ نفس اخلاص بھی فنا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔]

تشریح

علماء ظواہر اور عام مؤمنین کو صرف صورتِ اخلاص حاصل ہوتی ہے وہ اگر اسی اخلاص کے ساتھ نیک اعمال کرتے رہیں اور اخلاص میں کمال حاصل نہ کریں تو گناہگار نہ ہوں گے، تاہم اگر فنا کی دولت حاصل کرنا چاہیں تو اس کے لئے حقیقتِ اخلاص کا حاصل کرنا لازم وضروری ہے اور وہ سلوک وجذبہ کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

مقاماتِ عشرہ مقدمات فناہیں

چونکہ انسان شرعًا اخلاص کے حکم کے ساتھ مکلف ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (الزمر ۳)

اور

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ (البینۃ ۵)

نیز حدیث میں ہے:

أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهِ۔[1]

لہٰذا اخلاص ہی ہر عمل کی قبولیت کے لئے روحِ رواں کا درجہ رکھتا ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک اخلاص ہی کا دوسرا نام فنا ہے اور محبتِ ذاتیہ کے بغیر فنا کا تصور بھی محال ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ فنا کے ابتدائی اُمور (مقدمات ومبادی) حاصل کئے جائیں اور وہ دس مقامات ہیں جن کو اصطلاحِ

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۲۰، مشکوۃ المصابیح، ص ۴۸۹)

صوفیاء میں اصولِ عشرہ یامقاماتِ عشرہ کانام دیا گیاہے۔کیونکہ بعض صوفیاء نے انہی مقامات کو طرقِ وصول الی اللہ کے نام سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اکثر طور پر صوفیاء کے تجربہ میں آیا ہے کہ ان دس مقامات کا حصول فنائے کامل کا سبب بنتا ہے لیکن بعض اوقات مقاماتِ عشرہ کو حاصل کئے بغیر بھی محض فضل خداوندی سے فنائے کامل عطاہو جاتی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ (الشوریٰ ۱۳)

دادحق را قابلیت شرط نیست بلکہ شرطِ قابلیت داداوست

مقاماتِ عشرہ کی تفصیل

راہِ وصول کے حسبِ ذیل دس اصول یادس مقام ہیں:

توبہ،زھد،قناعت،توکل،صبر،شکر،خوف،رجا،فقراوررضا۔

توبہ

ارشادباری تعالیٰ ہے:

وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (النور ۳۱)

حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہاالصلوات ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ تُوبُوا إِلَى اللَّهِ فَإِنِّي أَتُوبُ فِي الْيَوْمِ إِلَيْهِ مِائَةَ مَرَّةٍ۔[1]

یعنی اے لوگو!اللہ کی طرف توبہ کیاکروکیونکہ میں اللہ سے ایک دن میں سوبار توبہ کرتاہوں۔

عربی لغت میں توبہ کے حقیقی معنی "رجوع کرنے" کے ہیں۔

---

[1] (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۴۶)

اَلتَّوْبَۃُ رُجُوْعٌ عَمَّا کَانَ مَذْمُوْمًا فِی الشَّرْعِ اِلٰی مَا ھُوَ مَحْمُوْدٌ فِیْہِ۔[1]

(یعنی) شریعت میں جو کچھ مذموم (برا کام) ہے اس سے لوٹ کر محمود (اچھے کام) کی طرف آجانے کا نام توبہ ہے۔

سچی توبہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ محبوب بنالیتا ہے اور انہیں مندرجہ ذیل انعامات سے نوازتا ہے:

اول: مغفرت عطا فرماتا ہے۔

دوم: آسمان سے بارشیں نازل فرماتا ہے۔

سوم: مال، اولاد، باغات وانہار جیسی مختلف نعمتوں سے سرفراز فرماتا ہے۔

جیسا کہ قرآن حکیم میں وعدہ فرمایا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا (١٠) يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا (١١) وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا (نوح ١٢)

بزرگانِ دین نے فرمایا اگر گناہ کے بعد آٹھ کام کئے جائیں تو گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے، ان میں سے چار کاموں کا تعلق دل سے ہے اور چار کا تعلق بدن سے۔

دل سے متعلق یہ ہیں:

١۔ سچی توبہ کرنا
٢۔ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم
٣۔ گناہ کی وجہ سے خوفِ عذاب کا غلبہ
٤۔ معافی کی اُمید

بدن سے متعلق یہ ہیں:

١۔ دو نفل نمازِ توبہ
٢۔ ستر یا سو بار استغفار

---

[1] (کتاب التعریفات، ص ٣٢)

۳۔سُبۡحَانَ اللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ وَ بِحَمۡدِہٖ

۴۔ایک دن کا نفلی روزہ رکھ کر صدقہ کرے اور آئندہ بُری صحبت ترک کر دے۔

واضح رہے کہ توبہ وصول الی اللہ کے لئے پہلی شرط ہے۔سالک مقامِ توبہ میں سیر کرتا ہوا خدا تک پہنچتا ہے۔فَمَنۡ لَاتَوۡبَۃَلَہٗ لَا سَیۡرَ لَہٗ۔پس جس کی توبہ نہیں اس کی سیر نہیں۔

مفتاح السلوک، جلد اول میں ہے:

توبہ

توبہ سے مراد یہ ہے کہ سالک شرعی طور پر مذموم امور سے رجوع کر کے محمود امور کو اپنا لے۔یہ سالکین کے راستہ کی ابتدا مریدین کی سعادت کی کلید اور منازلِ سلوک کے سفر کی شرط اول ہے۔اللہ تعالیٰ نے کثیر مقامات پر اس کا حکم دیا ہے اور اسے دنیا وآخرت کی فلاح کا سبب قرار دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱):وَتُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ جَمِیۡعًا اَیُّہَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (نور: ۳۱)

اور رجوع کرو اللہ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو تاکہ تم (دونوں جہانوں میں) بامراد ہو جاؤ۔

(۲):اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ (ھود:۵۲)

مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل وجان سے) رجوع کرو اس کی طرف۔

(۳):"یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا" (تحریم:۸)

اے ایمان والو اللہ کی جناب میں سچے دل سے توبہ کرو۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم گناہوں سے معصوم ہونے کے باوجود کثرت سے توبہ واستغفار کرتے۔ اس کا مقصد تعلیمِ امت ہوتا تھا۔

عن الاغر بن یسار المزنی رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم یاایھا الناس توبوا الی اللّٰہ واستغفروہ فانی اتوب الیہ فی الیوم مائۃ مرۃ۔

"حضرت اغر بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا! اے لوگو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو اور اس سے مغفرت طلب کرو، میں دن میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔"[1]

امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"التوبۃ واجبۃ من کل ذنب"۔

ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے۔

پھر اگر معصیت ایسی ہو جس کا تعلق بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو اور کسی آدمی کے حق کے متعلق نہ ہو تو اس سے توبہ کیلئے تین شرائط ہیں:

(۱) اس معصیت کو ترک کرے

(۲) یہ پختہ عزم کرے کہ دوبارہ اس غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا،

(۳) اس پر ندامت کا اظہار کرے۔

اگر تین شرطوں سے ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو اس کی توبہ صحیح نہیں ہوگی اور اگر وہ معصیت کسی آدمی کے حق کے متعلق ہے تو اس کیلئے چار شرطیں ہیں۔ تین یہی مذکورہ شرطیں ہیں اور چوتھی

---

[1] (رواہ مسلم فی صحیحہ فی کتاب الذکر)

شرط یہ ہے کہ وہ صاحبِ حق سے برأت حاصل کرے۔ اگر تو وہ مال وغیرہ ہے جس کو اس نے غصب یا چوری کیا ہے تو اسے واپس کرے اور اگر اس نے کسی پر تہمت وغیرہ لگائی ہے تو اس سے بھی معافی طلب کرے اور اگر غیبت کی ہے تو اس سے بھی معافی کا خواستگار ہو۔ الغرض تمام گناہوں سے توبہ کرنا واجب ہے۔[1]

توبہ کی یہ بھی شرط ہے کہ وہ برے اور فاسق لوگوں کی صحبت کو ترک کرے جو اس کیلئے معصیت کو مزین کرتے ہیں اور عبادت سے نفرت دلاتے ہیں۔ پھر نیک اور مخلص لوگوں کی صحبت کو اختیار کرے تا کہ یہ صحبت معافی میں معاون اور گناہوں کی طرف لوٹنے میں رکاوٹ بن جائے۔ ہمارے لئے وہ صحیح اور مشہور حدیث بڑی سبق آموز ہے جس میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے اس شخص کا قصہ بیان کیا ہے جس نے سو افراد کو قتل کر دیا تھا تو اس زمانہ کے ایک عالم ربانی نے اسے آگاہ کیا کہ اللہ توبہ قبول کرتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس بُرے ماحول کو ترک کر دو جس کی وجہ سے تم نے ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور اسے ایک اچھے ماحول اور علاقہ کی طرف جانے کا حکم دیا جس میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندے بستے تھے تا کہ وہ ان لوگوں سے محبت کرے اور ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔[2]

صوفیائے کرام رحمھم اللہ تعالیٰ کسی گناہ کے چھوٹا یا حقیر ہونے کی طرف نہیں دیکھتے بلکہ وہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی پیروی کرتے ہوئے اپنے رب کی عظمت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

---

[1] (ریاض الصالحین، ص ١٠)

[2] (رواہ مسلم فی صحیحہ کتاب التوبۃ وعن أبی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

انکم لتعلمون اعمالا ھی ادق فی اعینکم من الشعر انا کنا نعدھا علی عھد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَ اَصحَابِہٖ وَ سَلَّم من المھلکات۔

”تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہارے نزدیک بال سے بھی زیادہ باریک ہیں حالانکہ ہم رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَ اَصحَابِہٖ وَ سَلَّم کے عہد میں ان کو مہلکات میں سے شمار کرتے تھے۔“[1]

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ صرف معاصی سے توبہ پر اکتفاء نہیں کرتے کیونکہ یہ عوام کی توبہ ہے بلکہ وہ ہر اس چیز سے توبہ کرتے ہیں جو ان کو اپنے رب کی یاد سے غافل کر دے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے جب توبہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

توبۃ العوام من الذنوب و توبۃ الخواص من الغفلۃ۔

”عوام الناس گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور خواص غفلت سے۔“[2]

حضرت عبد اللہ تمیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں! توبہ کرنے والوں کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ تو گناہوں اور سیئات سے توبہ کرتے ہیں اور بعض لوگ غفلت اور لغزشات سے اور بعض لوگ تو صرف اس لئے توبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی عبادات اور نیکیوں کو زیادہ نہ سمجھنے لگیں۔

سالک کو جب عرفانِ الٰہی حاصل ہوتا ہے تو اعمال کی کثرت سے اس کی توبہ میں دقت پیدا ہو جاتی ہے اور جس کا دِل گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو جاتا ہے اور اس پر انوار و تجلیات کی بارش

---

[1] (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب الرقاق عن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

[2] (رسالہ قشیریہ، باب توبہ، ص ۴۷)

ہو جاتی ہے تو اس پر دل کی پوشیدہ بیماریاں مخفی نہیں رہتیں۔ اس لئے جب بھی اس کا دل کسی لغزش کی طرف مائل ہوتا ہے تو فوراً اپنے پروردگار سے حیاء کرتے ہوئے توبہ کر لیتا ہے۔ توبہ کے بعد سالک دن رات کثرت سے استغفار میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح اسے حقیقی عبودیت کا شعور حاصل ہوتا ہے پھر وہ اپنے مولیٰ کے حق میں اپنی تقصیر اور کوتاہی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی عبودیت کا اعتراف اور اپنے مولیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کرتا ہے۔

پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنتا ہے:

(۱): فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا (١٠) يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا (١١) وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا (نوح ١٢)

پس میں نے کہا معافی مانگ لو اپنے رب سے بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ برسائے گا آسمان سے موسلا دھار بارش اور وہ مدد فرمائے گا تمہاری اموال اور فرزندوں سے اور بنادے گا تمہارے لئے باغات اور بنادے گا تمہارے لئے نہریں۔

(۲): إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (١٥) اٰخِذِيْنَ مَا اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ (١٦) كَانُوْا قَلِيْلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (١٧) وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (ذاریات ١٨)

"البتہ اللہ سے ڈرنے والے (اس روز) باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ (بصد شکر) لے رہے ہوں گے جو ان کا رب انہیں بخشے گا، بے شک یہ لوگ اس سے پہلے بھی نیکوکار تھے یہ لوگ رات کو بہت کم سویا کرتے تھے اور سحری کے وقت (اپنی خطاؤں کی) بخشش طلب کرتے تھے۔"

جب وہ یہ آیات پڑھتا ہے تو اپنی کوتاہیوں اور احکامِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کے افسوس اور حسرت میں اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے عیوب کی طرف متوجہ ہو

کر ان کی اصلاح اور اپنی کوتاہیوں کی تلافی کرتا ہے۔ پھر تزکیۂ نفس میں مصروف ہو جاتا ہے اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کے ارشادات پر عمل کرتے ہوئے نیکیوں کی کثرت کرتا ہے۔

کیونکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ہے:

"واتبع السیئۃ الحسنۃ تمحھا" (ترمذی)

برائی کے بعد نیکی کر یہ نیکی اس برائی کو مٹا دے گی۔

شیخ احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی مدعی کے دعوی کا دار و مدار اس کے نتیجہ پر ہوتا ہے۔ اگر اس کا کوئی نتیجہ ظاہر ہو جائے تو اس کا دعویٰ صحیح ہو جاتا ہے ورنہ وہ جھوٹا ہوتا ہے۔ پس ایسی توبہ جس کے نتیجہ میں تقویٰ حاصل نہ ہو وہ باطل ہے اور ایسا تقویٰ جس سے استقامت حاصل نہ ہو وہ بناوٹی ہے۔ اسی طرح اگر استقامت سے ورع حاصل نہ ہو تو وہ نامکمل ہوتی ہے اور اگر ورع سے زہد میسر نہ آئے تو وہ بھی قاصر ہے اور وہ زہد جو توکل کا سبب نہ بنے تو وہ محض خشک زہد ہے اور وہ توکل جس سے یکسوئی حاصل نہ ہو اس کی حقیقت نہیں۔

توبہ کے صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ انسان محرمات سے اجتناب کرے اور کامل تقویٰ یہ ہے کہ وہ یہ تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کے احوال سے مطلع ہے اور استقامت کی نشانی یہ ہے کہ وہ بدعات سے بچ کر اپنے اوراد کی پابندی کرے اور ورع کی علامت یہ ہے کہ جب اس پر کوئی چیز مشتبہ ہو جائے اگر تو وہ اسے ترک کر دے تو وہ صاحبِ ورع ہے ورنہ ورع سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔[1]

(مفتاح السلوک، جلد اول)

---

[1] (قواعدِ تصوف، شیخ احمد زروق رحمہ اللہ تعالیٰ، ص ۷۴)

زُھد

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَاهَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ (العنکبوت ٦٤)

(یعنی) اور یہ دنیا کی زندگی تو نہیں مگر کھیل کود۔

حدیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوات میں ہے:

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ۔[1]

یعنی دنیامیں غریب (اجنبی) یا مسافر کی طرح رہو۔

قال الامام الجنید رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ الزھد استصغار الدنیا، ومحو آثارھا من القلب۔[2]

یعنی حضرت امام جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں دُنیا کو حقیر جاننا اور دل سے اس کے نشانات محو کرنا زُھد ہے۔

زُہد ایک مرتبۂ قلبیہ ہے اس مرتبے میں سالک کے قلب سے دُنیا کی محبت نکل جاتی ہے اور وہ قلبی طور پر دُنیا کی طرف التفات نہیں رکھتا۔ اس کے لئے فقر و غنا اور اخذ و عطا کی دونوں حالتیں برابر ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ قلبی طور پر طلبِ دُنیا اور خواہشاتِ نفس سے فارغ ہو چکا ہوتا ہے۔ زہد کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ بندہ کا ہاتھ دُنیا کے مال سے خالی ہو جائے اور کسبِ حلال چھوڑ کر محتاجی کی زندگی گزارے۔

---

1 (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۹۴۹، مشکوٰۃ، ص ۱۳۹)

2 (رسالۃ القشیریۃ، باب الزھد، ج ۱، ص ۲۴۱)

حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یوں دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ ابْسُطْ لِیَ الدُّنْیَا وَزَھِّدْنِیْ عَنْھَا۔[1]

حضرت علامہ المناوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

فليس الزهد تجنب المال بالكلية بل تساوي وجوده وعدمه وعدم تعلقه بالقلب البتة۔[2]

یعنی زہد مالِ دُنیا سے مکمل طور پر اجتناب کرنے کا نام نہیں بلکہ زُہد یہ ہے کہ دنیا کے مال کا ہونا اور نہ ہونا سالک کے لئے برابر ہو جائے اس طرح کہ اس کا مال کے ساتھ قلبی تعلق نہ رہے تاکہ آفاتِ دنیا سے محفوظ رہے۔

زہد کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لئے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا قول و عمل واضح صورت میں موجود ہے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم امام الزاہدین ہو کر بھی گوشت، حلوہ اور شہد استعمال میں لاتے اور ازواجِ مطہرات، خوشبو اور اچھے لباس کو پسند فرماتے تھے۔ بعض کم فہم لوگوں نے اسلام میں زُہد کے وجود سے انکار کیا ہے اور اس کو رہبانیت سمجھ کر بدعت قرار دیا ہے۔ درحقیقت وہ لوگ حقیقتِ اسلام سے جاہل ہیں انہوں نے صوفیاء کرام پر زبانِ طعن دراز کرکے زُہد کے بارے میں صوفیاء کرام کے اصل مؤقف سے بے خبری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اگر یہ لوگ کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے محبوب کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے زُہد کی تعلیم وترغیب دی ہے۔

أَلْھَاكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (التکاثر ۲)

---

[1] (کشف المحجوب)

[2] (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، ج ۴، ص ۷۲)

تمہیں غافل رکھامال کی زیادہ طلبی نے، یہاں تک کہ تم نے قبروں کا منہ دیکھا۔

اس کے علاوہ متعدد آیاتِ قرآنیہ اس امر پر روشن دلیل ہیں اور مختلف احادیث مقدسہ میں بھی زہد کی صراحتاًترغیب و تعمیل کا حکم موجود ہے۔

مثال کے طور پر درج ذیل حدیث پر غور کرنا چاہیئے:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ، قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ، دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا أَنَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِي اللَّهُ وَأَحَبَّنِي النَّاسُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللَّهُ، وَازْهَدْ فِيمَا فِي أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاس۔[1]

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے ایسا عمل بتایا جائے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے میرے ساتھ محبت کیا کریں۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا دنیا میں زہد اختیار کر اس سے اللہ تعالیٰ اور لوگ تیرے ساتھ محبت کریں گے۔

[1] (سنن ابن ماجه، ص ۳۱۱)

مفتاح السلوک، جلد اول میں ہے:

زہد کے بیان میں

زہد

تعریف: حضرت ابن جلاء رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زہد دنیا کو زوال کی نظر سے دیکھنے کا نام ہے تاکہ دنیا تیری نظر میں حقیر ہو جائے اور اس سے اعراض کرنا تیرے لئے آسان ہو جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ زہد دنیا سے بلا تکلف کنارہ کشی کرنے کا نام ہے۔[1]

زہد کا لفظی معنی ہے اَلْاِعْرَاضُ "کنارہ کشی کرنا" یا عَدَمُ الْمَیْل "دلچسپی نہ لینا"۔

اصطلاحاً یہ کہ انسان اعراض کرے دنیا کی چمک دمک سے، اور طبیعت دنیا کے جھوٹے حسن میں دلچسپی نہ لے، اس کو زہد کہتے ہیں۔

زُهْدٌ عَنِ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتِهَا وَ زُخْرَفِهَا وَ بَهْجَتِهَا۔

"دنیا کی خوش نمائی سے، جھوٹے حسن سے انسان کا دل کٹا ہوا ہو"۔

یہ بھی فرمایا گیا:

"اَلزُّهْدُ هُوَ عَدَمُ تَعَلُّقِ الْقَلْبِ بِالدُّنْیَا وَ شَهَوَاتِهَا وَ حُظُوْظِهَا وَ زِیْنَتِهَا وَ زُخْرُفِهَا۔

"زہد، دنیا اور اس کی خواہشات اور اس کی لذات اور اس کی زینت سے دل کے تعلق کے کٹ جانے کا نام ہے"۔

دنیا کی رعنائیوں اور اس کی فانی لذتوں سے، انسانوں کا دل ہٹا کٹا ہوا ہو۔

---

[1] (رسالہ قشیریہ، ص ٥٦)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے:

الزهد أن لا يسكن قلبك إلى موجود في الدنيا، ولا يرغب في مفقود منها۔[1]

”زہد یہ ہے کہ جو موجود ہو دل کے اندر اس کی محبت نہ ہو اور جو مفقود ہو اس کی رغبت نہ ہو“۔

بس یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، الحمد للہ ثم الحمد للہ!

زاہد کون ہے؟

اگر قرآن مجید سے اس کی تعریف ڈھونڈنی ہو کہ زاہد کون ہوتا ہے تو ایک جگہ فرمایا گیا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں:

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (الحدید ۲۳)

اس لیے کہ غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ سے جائے اور خوش نہ ہو اس پر جو تم کو دیا۔

بس انسان کا دل ایسا بن جائے کہ مال ملے بھی تو انسان شریعت کے اندر رہے اور اگر نہ ملے تو مایوسی کی باتیں نہ کرے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اللہ رب العزت نے اولیاء کی دنیا کا بھی بادشاہ بنایا، مگر دنیا میں بھی انہیں بہت مال دیا۔ وہ تجارت کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مال میں بڑی برکت دی تھی۔ جیسے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تجارت کرتے تھے اور اللہ رب العزت نے اتنی برکت دی تھی کہ سبحان اللہ! چنانچہ شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تشریف فرما تھے، ایک بندہ دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ حضرت! وہ جہاز جو آپ کے تجارتی سامان سے بھرا ہوا آرہا تھا، ابھی ابھی خبر پہنچی کہ وہ ڈوب گیا۔ حضرت نے فرمایا: الحمد للہ!۔ تو وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر گزری تو

---

[1] (الزهد الكبير للبيهقى، ج ۱، ص ۳)

ایک دوسرا آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ حضرت! جو جہاز ڈوبنے لگا تھا، ابھی اطلاع ملی کہ وہ ڈوبتے ڈوبتے بچ کر بخیریت کنارے سے لگ گیا، سامان اتر گیا۔ فرمایا: الحمد للہ!۔ اب جو لوگ پاس بیٹھے ہوئے تھے، وہ بہت حیران کہ ڈوبنے پر بھی کہا: الحمد للہ اور بچنے پر بھی کہا: الحمد للہ۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا معاملہ ہے؟۔ فرمایا کہ جب مجھے جہاز ڈوبنے کی اطلاع ملی تو میں نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تو مجھے اس پر کوئی صدمہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ میرے اللہ کو ایسے ہی منظور ہے۔ تو میں نے کہا: الحمد للہ! اور جب بچنے کی اطلاع ملی تو پھر میں نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تو کوئی انہونی خوشی نہیں تھی، میں نے کہا: الحمد للہ۔ تو بندے کی ایسی کیفیت ہو جائے تو اس کو زاہد کہتے ہیں۔

زاہد دھوکہ نہیں دے سکتا

جس شخص کی ایسی کیفیت ہو گی تو آپ ذرا سوچیں کہ وہ بندہ:

کیوں حرام مال کھائے گا؟

کیوں دوسرے کے حصے کو دبائے گا؟

کیوں کسی کا مال غصب کرے گا؟

کیوں یتیموں کا مال چھینے گا؟

کیوں کسی کے ساتھ بد دیانتی کرے گا؟

چنانچہ زہد ایک اچھی صفت ہے، جو اللہ تعالیٰ مومن کے اندر پیدا فرما دیتے ہیں۔

آج تو جس پر اعتماد کرو وہی دھوکہ دیتا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں تو وہ سرمایہ دبا جاتا ہے، اور کسی کو ملازم رکھو تو وہ پیسہ اڑا جاتا ہے۔ ایسے لگتا ہے، بس ہاتھ پڑنے کی بات ہے، جس کا

ہاتھ پڑا وہ لے گیا۔ امانت گویا دنیا سے ختم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے لوگ نظر نہیں آتے جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو، ان کو مال کا حساب کتاب دو اور وہ حساب کو صاف ستھرا رکھیں۔

جب دنیا کی محبت دل میں ہوتی ہے تو انسان نوکری کسی جگہ کر رہا ہوتا ہے، مگر وہاں سے پیسے چرا کر اپنا ذاتی کام کرنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے۔ شریعت چاہتی ہے کہ ہمارے اندر ایسی صفت ہو کہ ہم مال کے پجاری نہ بنیں، ہم اللہ تعالیٰ کے پجاری بن کر زندگی بسر کریں۔ مال کی پرستش کیا کرنی، یہ تو آنی جانی چیز ہے، یہ تو سائے کی مانند ہے۔ اللہ تعالیٰ دے بھی دیتے ہیں اور لے بھی لیتے ہیں۔ تو جس حال میں اللہ تعالیٰ رکھیں اس حال میں انسان خوش رہے۔

زہد اکابرین امت کی نظر میں

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے زہد کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

خلو الأيدي من الأموال، و القلب من التتبع۔[1]

”ہاتھ مال سے خالی ہو اور دل اس کی پیروی سے“۔

شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

”اگر انسان کو اللہ رب العزت مال عطا کریں تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اگر اس سے لے لیں تو انسان اس کے اوپر صبر کرے، اس کو زہد کہتے ہیں“۔

ابو بکر الوراق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

الزهد ثلاثة احرف۔

”زہد کا لفظ تین حروف پر مشتمل ہے“۔

---

[1] (الزهد الكبير للبيهقى، ج ۱، ص ۲۰)

أماالزاي:فترک الزينة،وأماالهاء:فترک الهوى،وأماالدال:فترک الدنيا۔[1]

"ز" سے مراد زینت کاترک کردیناہے،"ھ" سے مراد ھوی یعنی نفسانی خواہشات کو چھوڑ دینا ہے،اور"د" سے مراد دنیاکاترک کردیناہے۔

چھوڑ دے ساری دنیاکسی کے لئے

ہے مناسب یہی زندگی کے لئے

ابن رجب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

الزهدفي الشيءالإعراض عنه لاستقلاله واحتقاره۔[2]

"دنیاسے اس کی حقارت کی وجہ سے اعراض کرنے کانام زہدہے"۔

اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیاکی اتنی قدر ہوتی جتنی مچھر کے پر کے برابر ہے تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو پینے کے لیے پانی کاگھونٹ عطانہ فرماتے۔

حدیث پاک میں ہے کہ نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے جارہے تھے،ایک مردہ بکری پڑی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ مردہ جانور ہو تو اس میں سے کتنی بو آتی ہے،تو اس قدر بو تھی کہ بس کھڑاہونامشکل تھا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم گزرتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حیران ہوئے،پوچھا:اے اللہ کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم!کیوں کھڑے ہوئے؟ فرمایا:تم میں سے کوئی اس مردہ بکری کو لیناچاہے گا؟ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا:اے اللہ کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم!بدبودار اور مردہ بکری ہے،کون اس کو لے

---

[1] (الزھدالکبیر للبیھقی،ج ۱،ص ۶۲)

[2] (جامع العلوم والحکم،ص ۲۸۹)

گا؟ فرمایا: جتنی نفرت تمہارے دل میں اس بدبودار مردہ بکری کی آرہی ہے، دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ قابل نفرت چیز ہے۔

کسی نے فرمایا:

اَلزُّهْدُ تَرْكُ مَا لَا يَعْنِيهِ مِنَ الْأَشْيَاءِ كُلِّهَا۔

"ہر اس چیز کو چھوڑ دینے کا نام زہد ہے جس سے ہمیں واسطہ نہیں"۔

ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خوبصورت بات کہی، وہ فرماتے ہیں:

الزهد: ترک ما يشغل عن الله سبحانه وتعالى۔[1]

"تمہیں جو چیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے غافل کر دے اس کو ترک کر دینے کا نام زہد ہے"۔

جو چیز بھی انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل کرتی ہے، خواہ وہ کھیل ہو، کاروبار ہو، دوست کی مجلس ہو، کوئی بھی چیز ہو، فرمایا اس کو چھوڑ دو، اسی کا نام زہد ہے۔

یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا:

الزهد: يورث السخاء بالملک، والحب يورث السخاء بالروح۔[2]

زہد مال کے معاملے میں سخاوت پیدا کرتا ہے اور محبت روح کے معاملے میں سخاوت کو پیدا کرتی ہے۔

انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تو اپنی ریاضت میں اس حد تک پہنچ جائے کہ:

لو قطع الله عنک الرزق ثلاثة أيام لم تضعف في نفسک۔[3]

---

[1] (الرسالة القشيرية، ص ٥٦)

[2] (الرسالة القشيرية، ص ٥٥)

[3] (الرسالة القشيرية، ص ٥٦، احياء علوم الدين، ج ٦، ص ٢٣١)

”اگر تین دن تک لگاتار فاقہ آجائے تو تمہارے دل کے اندر کمزوری نہ آئے، اس کا نام زہد ہے“۔

آج کے دور میں تو ایک وقت کا فاقہ نہیں آتا۔ الحمد للہ! جو لوگ یہاں موجود ہیں، ان میں اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں، جو دن میں بار بار کھاتے ہیں، من مرضی کا کھانا کھاتے ہیں، پسند کا کھانا کھاتے ہیں۔ ہمیں فاقہ کا مزہ چکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

ابن خفیف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

الزهد: وجود الراحة في الخروج عن الملك۔[1]

”مال کے چلے جانے سے دل کو راحت پہنچنے کا نام زہد ہے“۔

فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

أصل الزهد الرضا عن الله عز و جل۔[2]

”زہد کی اصل اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا ہے“۔

عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

الزهد هو الثقة بالله مع حب الفقر۔[3]

”زہد کہتے ہیں فقر کی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی پر کامل یقین کو“۔

---

[1] (الرسالة القشيرية، ص ٥٥، احياء علوم الدين، ج ٦، ص ٢٣١)

[2] (احياء علوم الدين، ج ١، ص ٢٩٠)

[3] (الرسالة القشيرية، ص ٥٥)

بعض نے فرمایا:

لیس الزھادۃ في الدنیا بتحریم الحلال ولا إضاعۃ المال۔[1]

"زہد حلال کو حرام کرنے کا نام نہیں، اور مال کو ضائع کرنے کا نام بھی نہیں"۔

ولکن الزھادۃ في الدنیا أن تکون بما في ید اللہ أوثق منک بما في یدک۔[2]

"بلکہ زہد یہ ہے کہ جو تمہارے ہاتھوں میں ہے اس سے زیادہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس پر تمہیں بھروسہ ہو"۔

اپنی جیب کی بجائے اللہ تعالیٰ کے خزانوں پر بھروسہ ہو۔ اس لیے جب گھر میں آٹا نہ ہو تو پھر تو ہر کوئی رو رو کر مانگتا ہے، مزہ تو یہ ہے کہ گھر میں ہر چیز ہو پھر بھی رو رو کر مانگ رہا ہو کہ یا اللہ! آپ ہی نے یہ عطا فرمایا اور میں آپ ہی کے در کا محتاج ہوں، سائل ہوں۔ قسمت والے ہوتے ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔

ابن تیمیہ نے کہا:

الزھد المشروع ترک ما لا ینفع في الدار الآخرۃ۔[3]

"جس چیز کا آخرت میں کوئی نفع نہیں اس چیز کو چھوڑنے دینے کا نام زہد ہے"۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے:

الزھد في الدنیا قصر الأمل لیس بأکل الغلیظ ولا بلبس العباء۔[4]

---

[1] (الزھد و صفۃ الزاھدین لابن الاعرابی، ص ۲۰)

[2] (الزھد و صفۃ الزاھدین لابن الاعرابی، ص ۲۰)

[3] (مجموعۃ الرسائل و المسائل لابن تیمیۃ، ج ۱، ص ۲۲۰)

[4] (الرسالۃ القشیریۃ، ص ۵۵، جامع العلوم و الحکم، ص ۲۹۱)

”زہد دنیا کے اندر لمبی امیدوں کو توڑنے کا نام ہے، اس کا نام نہیں کہ تم عباء پہن لو اور موٹا کھانے لگ جاؤ“۔

یعنی زہد یہ ہے کہ دل میں تمنائیں نہ ہوں۔

ابو صفوان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا گیا:

أي شيء أول حدود الزهد؟[1]

”زہد کی سب سے پہلی حد کیا ہے؟“۔

فرمایا:

استصغار الدنیا۔[2]

”دنیا کی نظر میں ہیچ ہو جانا“۔

سفیان بن عینیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا گیا:

ما حد الزهد؟[3]

”زہد کی انتہا کیا ہے؟“۔

فرمایا:

أن یکون شاکرا في الرضا، صابرا في البلاء۔[4]

”جب وہ راضی ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اور جب کوئی مصیبت آ پہنچے تو صبر کرے“۔

---

[1] (الزھد الکبیر للبیھقی، ج ۱، ص ۲۳)
[2] (الزھد الکبیر للبیھقی، ج ۱، ص ۲۳)
[3] (الزھد الکبیر للبیھقی، ج ۱، ص ۱٦)
[4] (الزھد الکبیر للبیھقی، ج ۱، ص ۱٦)

ابن قیم رحمۃ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں:

الزھدفراغ القلب من الدنیا لافراغ الیدین منھا۔[1]

"زہد اس کا نام نہیں ہے کہ ہاتھ مال سے خالی ہوں، بلکہ دل میں مال کی محبت نہ ہو اس کا نام زہد ہے"۔

احمد بن ابی الحواری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

انما الزھد ان تفرغ قلبک للاٰخرۃ۔

"تو اپنے دل کو آخرت کے لیے فارغ کر دے یہ تیرے لیے آخرت کی تیاری ہے، اور اس کا نام زہد ہے"۔

بعض نے فرمایا:

تفریغ القلب من شواغل الدنیا کی تصل الی مرضاۃ ربہ جل وعلا۔

"دل کو دنیا کے مشاغل سے فارغ کرنا تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچ سکیں، یہ زہد ہے"۔

شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک اور بات بڑے مزے کی کہی، وہ فرماتے ہیں، زہد یہ ہے کہ:

تحویل القلب من الاشیاء الیٰ رب الاشیاء۔[2]

اشیاء سے دل کو پھیر کر رب اشیاء کے ساتھ دل اٹکا لینا اس کا نام زہد ہے"۔

---

[1] (عدۃالصابرین،ص ۲۲۶)

[2] (الزھدالکبیر للبیھقی،ج ۱،ص ۵۴)

زہد کی تین اقسام

ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

اَلزُّھْدُ ثَلَاثَۃُ اَصْنَافٍ۔

"زہد کی تین قسمیں ہیں"۔

شہوات سے پرہیز کرنا

اسے اَلزُّھْدُ الْفَرْضُ کہا گیا ہے۔ زہد کا فرض درجہ یہ ہے کہ حرام چیزوں سے زہد اختیار کرے، یہ عوام کا زہد ہے۔

مباحات سے پرہیز کرنا

اسے اَلزُّھْدُ السَّلَامَۃُ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ زہد جس میں سلامتی ہے، جس سے انسان بچا رہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مشتبہ چیزوں سے زہد اختیار کرے۔ یہ خواصِ امت کا زہد ہے۔

طیبات سے پرہیز کرنا

پاکیزہ چیزوں سے پرہیز کرنا اسے اَلزُّھْدُ الْفَضْلُ کہا گیا ہے، یعنی وہ زہد جس میں فضیلت ہے، اور یہ حلال سے زہد اختیار کرنا ہے۔ یہ زُھْدُ الْعَارِفِیْنَ یعنی عارفین امت کا زہد ہے۔[1]

---

[1] (حلیۃ الاولیاء، ج۱۰، ص۱۳۷، الزھدالکبیر للبیھقی، ج۱، ص۳۲)

مالداری کے باوجود زہد

چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے ایک اچھا سوال پوچھا، کہا:

مَنْ مَعَهُ مَالٌ هَلْ يَكُوْنُ زَاهِدًا؟۔

"ایسا ممکن ہے کہ انسان کے پاس مال بھی ہو اور وہ زاہد بھی ہو؟"۔

یہ ہمارے آج کے حال کے مطابق سوال ہے، اس میں ہمارے لیے رہنمائی ہے۔ پوچھنے والے نے پوچھا: حضرت! کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان کے پاس مال بھی ہو اور اس کا نام زاہدوں میں شمار بھی ہو؟۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

إن كان لا يفرح بزيادته ولا يحزن بنقصه فهو زاهد۔ [1]

"اگر تو بہت زیادہ مال ہونے سے بندے کا دل آپے سے باہر نہیں آتا اور نقصان ہونے سے اس کے اندر مایوسی نہیں آتی تو مایوسی کے باوجود وہ انسان زاہد کہلاتا ہے"۔

اس لیے امام ابو العزائم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا:

تَزَوَّجْ اَجْمَلَ النِّسَاءِ وَ افْرُشْ اَفْخَرَ الفِرَاشِ وَ كُلْ اَشْهَى الطَّعَامِ وَ اشْرَبْ اَشْهَى الشَّرَابِ هٰذَا لَا يُؤَثِّرُ فِيْ زُهْدِكَ عِنْدَاللهِ عَزَّ وَ جَلَّ۔

"تم سب سے زیادہ خوبصورت عورتوں سے نکاح کرو، تم نرم ترین بستروں پر رات کو سو، لذیذ کھانے کھاؤ اور بہت ہی ذائقے دار مشروب پیو، اللہ کے ہاں یہ تمہارے زہد میں کمی کا باعث نہیں ہوتا"۔

---

[1] (جامع العلوم الحکم، ص ۲۹۱)

سب نعمتوں کے باوجود اگر تمہارے دل میں مال کی محبت نہیں تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں تم زاہد کہلاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ یہ تو نہیں چاہتے کہ بندہ ننگا رہے، بھوکا پیاسا رہے، بے گھر رہے، گھر نہ ہو۔ شریعت ایسی ہوتی تو دنیا کے لوگ اسے ناقابل عمل قرار دے دیتے۔ مومن سادھو نہیں ہوتا۔ مومن کی یہی شان ہے کہ وہ رہتا بھی دنیا میں ہے، دنیا کی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے، مگر دنیا میں رہتے ہوئے اپنے رب سے غافل نہیں ہوتا۔

بشر بن حارث رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

لَيْسَ الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا تَرْكَ الدُّنْيَا اِنَّمَا الزُّهْدُ اَنْ يَّزْهَدَ فِيْ كُلِّ مَا سِوَى اللهِ۔

"زہد دنیا چھوڑ دینے کا نام نہیں ہے، بے شک زہد تو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے بے پرواہ ہونے کا نام ہے"۔

اور آگے انہوں نے دلیل دی:

هذا داود وسليمان عليهما السلام - قد ملكا الدنيا وكانا عند الله من الزاهدين۔[1]

"دیکھو! داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دنیا کے بادشاہ تھے، اور اللہ کے نزدیک دونوں زاہدین میں سے تھے"۔

تو دنیا کے بادشاہ بھی ہیں اور اللہ رب العزت کے نزدیک ان کا نام زاہدین میں بھی شامل ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زہد کا پیمانہ

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ دونوں فقیر تھے، غریب تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس مال آتا تھا تو خرچ کر دیتے تھے۔ ساری عمر ان کو

[1] (الزهد الكبير للبيهقي، ج ١، ص ٥٣)

زکوٰۃ دینے کا موقع ہی نہ ملا۔ بھئی! نصاب پورا سال پاس ہو گا تو زکوٰۃ ہو گی۔ سوچیئے! کہ پوری زندگی زکوٰۃ دینے کا موقع ہی نہ آیا۔ جو آتا تھا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ سیدنا زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات ظاہر میں غربت کے ہیں، مگر زاہدین میں شامل ہیں۔

سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے وقت کے امراء میں سے تھے، اور ان کا نام بھی زاہدین میں شامل ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک دفعہ ایسے وقت میں غلہ آیا، جب مدینہ طیبہ اور اس کے اطراف میں قحط پڑا ہوا تھا۔ مختلف تاجر آگئے کہ جی! آپ ایسا کریں کہ یہ غلہ ہمیں بیچ دیں، زیادہ منافع لے لیں، ہمارے ساتھ بزنس کریں۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا دو گے؟ تاجروں نے کہا کہ ہم آپ کو دوگنا منافع دیں گے، ایک روپے کے بدلے دو روپے دیں گے۔ کہنے لگے تھوڑا ہے۔ انہوں نے کہا: اچھا ایک کے بدلے تین دے دیں گے، کہا: نہیں تھوڑا ہے۔ اچھا چار گنا منافع دے دیں گے۔ فرمایا: نہیں! تھوڑا ہے۔

وہ سارے تاجر سر پکڑ کے بیٹھ گئے کہ عجیب بات ہے۔ اس وقت ہم اتنا منافع دے رہے ہیں کہ کوئی سوچ نہیں سکتا اور یہ کہتے ہیں کہ نہیں! اس سے بھی زیادہ منافع چاہیئے۔ تو ایک نے پوچھا کہ جی! آپ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ مجھے جو نفع دے رہے ہیں، وہ بہت تھوڑا ہے۔ میرے پاس ایک گاہک ہے، جو اس سے زیادہ نفع دے رہا ہے۔ تو ان لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ کہ کیا کوئی ہم سے زیادہ منافع دیتا ہے۔ تو ان لوگوں کی آنکھیں کل گئیں کہ کیا کوئی ایسا ہے جو ہم سے زیادہ منافع دے رہا ہے۔ سو کی بجائے چار سو، ہزار کے بجائے چار ہزار، اتنا پرافٹ کوئی دے رہا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں، پوچھنے لگے کہ کون؟ کہنے لگے: میرا پروردگار، ایک کے بدلے کم از کم مجھے

دس گنا دیتا ہے۔ آپ نے حکم دیا، جتنا قافلہ تھا، یعنی سو سے زیادہ غلے کے اونٹ تھے، فرمایا: سب کو مدینہ کے غرباء میں تقسیم کر دو۔ اللہ کے راستے میں صدقہ کر دیا۔ وہ اتنے مال کے باوجود زاہد تھے، سبحان اللہ!

سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی حیات مبارکہ میں ماشاء اللہ خوب نکاح کیئے ایسا لگتا ہے کہ اللہ رب العزت نبی کریم ﷺ کی نسل آگے ان سے چلوانا چاہتے تھے۔ بہت لوگ تمنا کرتے تھے کہ میری بیٹی سے نکاح کر لیں، میری بہن سے نکاح کر لیں، تاکہ جو اولاد ہو تو نبی ﷺ کی طرف نسبت ہو اور وہ سید کہلائیں۔ ایک وقت میں تو چار ہی بیویاں ہوتی تھیں، لیکن جب کسی کو فارغ کرتے تھے تو پھر دوسری بیوی کی تجویز آجایا کرتی تھی۔ تو ان کو ہر دوسرے چوتھے دن نکاح کی ضرورت پیش آجایا کرتی، مگر اس سب کے باوجود ان کا نام زاہدین میں شامل ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ انسان ہر مہینے شب زفاف بھی گزار رہا ہو، اور زاہدین میں نام بھی لکھا جا رہا ہو۔

معلوم ہوا کہ صرف مال کا ہونا، بیوی کا ہونا، گھر کا ہونا یہ چیز فیصلہ نہیں کرتی کہ یہ زاہد ہے۔ دل سے پتہ چلتا ہے کہ دل میں دنیا کی محبت ہے یا نہیں۔ اگر دل میں مال کی محبت نہیں ہو گی تو محل میں بیٹھ کر بھی یہ آدمی زاہد کہلائے گا، اور اگر دل میں محبت ہو گی تو درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ کر بھی یہ دنیادار ہی کہلائے گا۔ اسی لئے کہا گیا:

الزاهد الذي رفض الدنيا لحب الله عز و جل۔[1]

”زاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں دنیا کو ٹھکرا دے“۔

---

[1] (الزهد الكبير للبيهقي، ج ۱، ص ۷۱)

زاہد کے فضائل

ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بہت خوبصورت بات کہی:

لئن حلفتم لي على رجل أنه أزهدكم لأحلفن لكم أنه خيركم۔[1]

"اگر تم کسی بندے کے بارے میں قسم اٹھا کر کہو کہ وہ بندہ سب سے بڑا زاہد ہے، میں قسم اٹھا کر کہوں گا کہ تم میں سے سب زیادہ بہتر ہے"۔

اللہ اکبر کبیرا! جو تم میں سے سب سے بڑا زاہد ہے، وہ تم میں سے سب سے زیادہ بہتر ہے۔

اور ایک حدیث مبارکہ میں اللہ کے پیارے حبیب ﷺ نے فرمایا:

اِذَا رَأَیْتُمُ الرَّجُلَ قَدْ اُعْطِیَ زُھْدًا فِی الدُّنْیَا وَ قِلَّۃَ مَنْطِقٍ۔

"اگر تم کسی بندے کو دیکھو کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں زہد بھی دیا ہے اور اس کو کم گو بھی بنایا ہے"۔

فاقتربوا منه فإنه يلقي الحكمة۔

"اس بندے کے قریب ہو جاؤ، اس لئے کہ ایسے بندے کو حکمت کی باتوں کا الہام کیا جاتا ہے"۔[2]

"اس بندے کے قریب ہو جاؤ، اس لئے کہ ایسے بندے کو حکمت کی باتوں کا الہام کیا جاتا ہے"۔

جو زاہد ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی زبان سے علوم و معارف کو کہلوا دیتے ہیں۔

---

[1] (الزهد لابن المبارک، ص ۱۹۳)

[2] (شعب الایمان، حدیث: ۱۰۰۵۲)

نبی کریم ﷺ نے زاہد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

أفضل الناس مؤمن مُزهد۔[1]

"لوگوں میں سب سے بہتر زاہد مُزہد ہے"۔

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زاہد اور مزہد میں فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اَلزَّاهِدُ قَلِيْلُ الرُّغْبَةِ فِي الدُّنْيَا وَالْمُزْهِدُ قَلِيْلُ الْمَالِ۔

"زاہد وہ ہے جس کو دنیا سے رغبت کم ہوتی ہے اور مزہد وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال کم ہوتا ہے"۔

چنانچہ یحییٰ بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

الزاهد حقا من يخلو قلبه عن المرادات كما تخلو يده من الأسباب۔[2]

"جس طرح انسان اسباب سے ہاتھ کو خالی کرلیتا ہے، زاہد وہ ہوتا ہے جو مرادات سے اپنے دل کو خالی کرلیتا ہے"۔

یعنی لمبی تمنائیں نہ ہوں۔ ہاں اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان محنت نہ کرے، کوشش نہ کرے، کاروبار نہ کرے۔

اس لئے کہ حدیث پاک میں آتا ہے:

طلب الحلال فريضة بعد الفريضة۔[3]

وہ تو ہمارے اوپر ایک فریضہ ہے کہ ہم نے رزق حلال کے لیے کوشش کرنی ہے۔ تو کام ہم نے کرنا ہے، لیکن جو مال و دولت اللہ تعالیٰ دیں بس اس پر صبر و شکر کرنا چاہیے۔ اب سوچیے کہ اگر کسی

---

[1] (جامع الأحاديث للسيوطي حديث: ۴۰۷۵)

[2] (الزهد الكبير للبيهقي، ج ۱، ص ۲۶)

[3] (المعجم الكبير للطبراني، حديث: ۹۹۹۳)

کے دل کی کیفیت ایسی ہو گی تو وہ تو کسی کی ایک پائی کا اپنے اوپر حق نہیں رکھے گا۔ آج تو بھائی، بھائی کو دھوکہ دے دیتا ہے، اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل میں دنیا کی محبت بھری ہوئی ہوتی ہے۔

چنانچہ ابو سلیمان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

اَلزَّاهِدُ حَقًّا لَا يَذُمُّ الدُّنْيَا وَ لَا يَمْدَحُهَا وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهَا۔

"حقیقی زاہد نہ تو دنیا کو برا بھلا کہتا ہے اور نہ ہی اس کی تعریف کرتا ہے اور نہ ہی اس پر نظر رکھتا ہے"۔

ولا يفرح بها إذا أقبلت، ولا يحزن عليها إذا أدبرت۔ [1]

"اور نہ تو خوش ہوتا ہے جب وہ اس کی طرف آئے اور نہ غمگین ہوتا ہے جب وہ اس سے پھر جائے"۔

حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فضیلت کی وجہ

ایک اعرابی نے بصرہ کے لوگوں سے پوچھا:

مَنْ سَيِّدُ اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ؟

"بھئی اس بستی والوں کا سردار کون ہے؟"۔

قَالُوْا: اَلْحَسَنُ۔

"انہوں نے کہا: ہمارے سردار حسن بصری ہیں"۔

قَالَ: بِمَ سَادَهُمْ؟

"پوچھا: بھئی! وہ سردار کیوں بنے؟"۔

---

[1] (الزهد الكبير للبيهقي، ج ۱، ص ۵، حلية الاولياء، ج ۹، ص ۲۶۶)

قَالُوْ: اِحْتَاجَ النَّاسُ اِلٰی عِلْمِهٖ وَاسْتَغْنٰی هُوَ عَنْ دُنْيَاهُمْ۔[1]

”کہا گیا کہ لوگوں کو ان کے علم کی ضرورت ہے، اور وہ لوگوں کی دنیا سے مستغنی ہیں“۔

اس وجہ سے وہ سب کے سردار بن گئے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

أدركت أقواما وصحبت طوائف ما كانوا يفرحون بشيء من الدنيا أقبل ولا يأسفون على شيء منها أدبر ولهي كانت في أعينهم أهون من التراب۔[2]

”میں نے ایسے لوگوں کو پایا، ان کو دولت ملتی تھی تو وہ آپے سے باہر نہیں ہوتے تھے، اونچے بول نہیں بولتے تھے، فخریہ بات نہیں کرتے تھے، متکبر نہیں ہوتے تھے، اور اگر دنیا نہیں ملتی تھی تو وہ مایوس نہیں ہوتے تھے، اور ان کی نظر میں دنیا کی حقیقت اس مٹی سے بھی کم تھی جس کے اوپر وہ چلتے تھے“۔

مال و دولت کی اہمیت مٹی سے بھی تھوڑی تھی۔

زاہد اور عارف میں فرق

الحارث المحاسبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

ترك الدنيا مع ذكرها صفة الزاهدين، وتركها مع نسيانها صفة العارفين۔[3]

”دنیا کو چھوڑ دینا مگر اس کا تذکرہ کرتے رہنا زاہدین کی صفت ہے، اور اس کو ترک کرکے اس کو بھول جانا عارفین کی صفت ہے“۔

---

[1] (جامع العلوم والحکم، ص ۳۰۱)

[2] (احیاء علوم الدین، ج ۶، ص ۱۹۷)

[3] (الزھد الکبیر للبیھقی، ج ۱، ص ۳۲۷)

وہ اس کو چھوڑتے ہیں تو اس کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ ایک بندے نے رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا کے سامنے دنیا کی بڑی مذمت کی کہ یہ بہت بری ہے اور بہت گندی ہے۔ جب کچھ دیر کرتے رہے تو حضرت رابعہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا نے فرمایا: یہاں سے چلے جاؤ، لگتا ہے تمہیں دنیا سے بہت محبت ہے جو تم اتنی دیر سے دنیا کا تذکرہ کر رہے ہو۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصر میں لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

ما أبعد هديكم من هدى نبيكم صلى الله عليه وسلم أما هو فكان أزهد الناس في الدنيا وأما أنتم أرغب الناس فيها۔[1]

"کس قدر دوری ہے تمہارے اور تمہارے نبی ﷺ کے طرز میں! جہاں تک ان کا تعلق تھا تو وہ دنیا سے تم سب سے زیادہ بے پرواہ تھے، اور تم اس سے سب سے زیادہ رغبت رکھنے والے لوگوں میں سے ہو"۔

زاہدین کی پانچ خصلتیں:

حضرت سری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

خَمْسٌ مِنْ اَخْلَاقِ الزُّهَّادِ۔

"زاہدین کی پانچ خصلتیں ہوتی ہیں"۔

اَلشُّكْرُ عَلَى الْحَلَالِ۔

"وہ رزق حلال پر شکر ادا کرتے ہیں"۔

وَالصَّبْرُ عَنِ الْحَرَامِ۔

"اور حرام مال سے خود کو روکتے ہیں"۔

---

[1] (مسند احمد، ج ۲۹، ص ۳۵۲)

وَلَایُبَالِیْ مَتٰی مَاتَ۔

''اوران کواس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ موت کب آئے گی''۔

وَلَایُبَالِیْ مَنْ اَکَلَ الدُّنْیَا۔

''اوران کواس بات کی بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ کون دنیاکے مزے لوٹ رہاہے''۔

وَیَکُوْنَ الْفَقْرُ وَ الْفَقْرُ وَ الْغِنٰی عِنْدَہٗ سَوَاءٌ۔

''اور فقراءاور غناءان کے لئے برابر ہوتے ہیں''۔[1]

حضرت ذالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

الزاھد من لم یطلب المفقود حتی یفقد الموجود۔[2]

''زاہد وہ ہے جو اس وقت تک گمشدہ چیز کو طلب نہیں کرتا جب تک موجود چیز کھو نہیں جاتی''۔

زاہد سب سے عقلمند

زاہد اللہ رب العزت کے ہاں بہت سمجھدار انسان ہوتا ہے۔فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بندہ وصیت کر جائے کہ میرے بعد میری وراثت ان لوگوں میں تقسیم کریں جو متوکلین ہوں،تو اس کے مال کو کاشتکاروں میں تقسیم کریں گے۔چونکہ کاشتکار متوکل ہوتے ہیں۔وہ دانہ زمین میں ڈال دیتے ہیں،پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔

مالی دا کم پانی دینا تے بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھَل پھُل لانا،لاوے یا نہ لاوے

---

[1] (الزھدالکبیر للبیھقی،ج ا،ص ٦٦)

[2] (الزھدالکبیر للبیھقی،ج ا،ص ٦٦)

بندہ تو پانی ہی دے سکتا ہے، اب اس کو پھل لگانا نہ لگانا یہ مالک کی مرضی ہوتی ہے۔ تو کاشتکار متوکل ہوتے ہیں۔

اور اگر اس نے یہ وصیت کی کہ میری وراثت ان لوگوں میں تقسیم کرو جو سب سے زیادہ سمجھدار ہوں، تو فرمایا کہ پھر زاہدین میں تقسیم کریں گے، کیونکہ زاہدین سب سے زیادہ عقلمند لوگ ہوا کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

طُوْبیٰ لِلزَّاھِدِیْنَ فِی الدُّنْیَا وَ الرَّاغِبِیْنَ فِی الْآخِرَۃِ۔

"خوشخبری ہے دنیا سے زہد کرنے والوں اور آخرت کی طرف رغبت رکھنے والوں کے لیے"۔

اُولٰئِکَ قَوْمٌ اِتَّخَذُوْا اَرْضَ اللّٰہِ بِسَاطًا وَ تُرَابَھَا فِرَاشًا وَ مَاءَھَا طِیْبًا۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زمین کو بستر بنایا اور اس کی مٹی کو بچھونا بنایا اور اس کے پانی کو خوشبو بنایا"۔

وَ الْکِتَابَ شِعَارًا وَ الدُّعَآءَ دِثَارًا وَ رَفَضُوْا الدُّنْیَا رَفْضًا عَلٰی مِنْھَاجِ الْمَسِیْحِ ابْنِ مَرْیَمَ۔[1]

"اور اللہ کی کتاب کو اپنا دستور عمل بنایا اور دعا کو اپنے لیے ڈھال بنایا اور دنیا سے خود کو اس طرح جدا کر دیا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا"۔

مقصد یہ کہ جو ملا اسی پر قناعت کی، صبر کیا، اور اللہ رب العزت کی عبادت میں اپنے آپ کو مشغول رکھا۔ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ان کے زہد کی وجہ سے اجر بھی زیادہ ملتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کو قرب بھی زیادہ حاصل تھا۔

---

[1] (شعب الایمان، ج۱۳، ص ۱۷۹)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی تو کہا تھا کہ لوگو!

اَنْتُمْ اَطْوَلُ صَلاۃً وَ اَکْثَرُ جِهَادًا مِنْ اَصحاب رسول اللہ وَ هُمْ کَانُوْ اَ اَعْظَمَ اَجْرًا مِنْکُمْ۔

"تم نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ سے زیادہ لمبی نمازیں پڑھنے والے اور زیادہ جہاد کرنے والے ہو، حالانکہ وہ تم سے زیادہ اجر پانے والے ہیں"۔

قَالُوْا: لِمَ یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ؟

"لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیوں ؟""۔

قال: إنهم كانوا أزهد في الدنيا وأرغب في الآخرة۔[1]

"فرمایا کہ وہ تمہارے مقابلے میں دنیا سے زیادہ بے پرواہ تھے اور آخرت سے زیادہ رغبت رکھنے والے تھے"۔

دنیا سے ان کا دل کٹ گیا تھا آخرت سے ان کا دل جڑ گیا تھا، اس لئے وہ تھوڑے عمل کرتے تھے، ثواب تم لوگوں سے زیادہ پا لیتے تھے۔

دنیا کی محبت جہنم میں جانے کا سبب

دنیا کی محبت کے ساتھ انسان جتنا مرضی نیک عمل کر لے، اس کے بخشے جانے کی امید نہیں ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی محبت اللہ رب العزت کو ناپسند ہے۔ اور جب ناپسندیدہ چیز انسان کے اندر ہو وہ اللہ تعالیٰ کا مقبول کس طرح بن سکتا ہے؟۔

زہد کے ساتھ تھوڑی سی عبادت انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتی ہے۔

---

[1] (الزھد لابی داؤد، ج ۱، ص ۱۳۵)

لو رأت أعين الزاهدين ثواب ما أعد الله لأهل الإعراض عن الدنيا لذابت أنفسهم شوقا واشتياقا إلى الموت لينالوا من ذلک ما أملوا من فضله تبارک وتعالی۔[1]

”اگر زاہدین کی آنکھیں وہ اجر دیکھ لیتیں جو اللہ تعالیٰ نے دنیا سے اعراض کرنے والوں کے لئے تیار کرر کھا ہے، تو وہ مرنے کے شوق میں اپنے آپ کو گھلا بیٹھتے، تا کہ ان مقامات کو جلدی حاصل کر لیں“۔

زہد کے حصول میں معاون اسباب

علماء نے بعض ایسے اسباب کی نشاندہی کی ہے جو زہد کے حصول میں معاون ہوتے ہیں:

النظر فی الدنیا و سرعة زوالها و فنائها۔

”اس بات پر غور کرنا کہ دنیا کتنی تیزی سے گھٹتی اور فنا ہوتی ہے“۔

النظر فی الآخرة و دوامها و بقائها۔

”اس بات پر غور کرنا کہ آخرت کی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے“۔

الاکثار من ذکر موتها۔

”کثرت سے موت کا ذکر کرنا“۔

جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

أكثروا ذکر هاذم اللذات يعني الموت۔[2]

”لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز کو یاد کرو، جو کہ موت ہے“۔

تَشْيِيعُ الْجَنَائِزِ۔

”جنازوں میں حصہ لینا“۔

---

[1] (ذم الدنیا لابن ابی الدنیا، ص ۴۳)

[2] (ترمذی، حدیث: ۲۳۰۷)

اِعْمَارُ الْاَوْقَاتِ بِالذِّکْرِ۔

"ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہنا"۔

اِیْثَارُ الْمَصَالِحِ الدِّیْنِیَّۃِ عَلَی الْمَصَالِحِ الدُّنْیَوِیَّۃِ۔

"دین کے فائدے کو دنیا کے فائدے پر ترجیح دینا"۔

اَلْاِنْفَاقُ وَ کَثْرَۃُ الصَّدَقَاتِ۔

"اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور کثرت سے صدقہ خیرات کرنا"۔

تَرْکُ مَجَالِسِ اَھْلِ الدُّنْیَا وَ الْاِشْتِغَالُ بِمَجَالِسِ الْاٰخِرَۃِ۔

"دنیا داروں کی محفلوں کو چھوڑنا اور ایسی مجالس میں خود کو مصروف کرنا جو آخرت کی یاد دلائیں"۔

اَلْاِقْلَالُ مِنَ الطَّعَامِ وَ النَّوْمِ وَ الضِّحْکِ وَ الْمِزَاحِ۔

"کھانا، سونا اور ہنسی مذاق کم کرنا"۔

مُطَالِعَۃُ سِیْرَۃِ النَّبِیِّ ﷺ وَ اَصْحَابِہٖ وَ اَخْبَارِ الزَّاھِدِیْنَ۔

"نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ماضی کے زاہدین کے حالات زندگی پڑھنا"۔

زاہدین کی صفات

یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا گیا کہ زاہد کی صفات کیا ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا:

اَلزَّاھِدُ۔

قُوْتُہٗ مَا وَجَدَ۔

"زاہد کا توشہ وہی ہوتا ہے جو اس کو مل جائے"۔

وَمَسْكَنُهٗ حَيْثُ اَدْرَکَ۔

"اور اس کا ٹھکانہ وہی جگہ ہوتی ہے جہاں وہ پہنچ جائے"۔

وَلِبَاسُهٗ مَاسَتَرَ عَوْرَتَهٗ۔

"اور اس کا لباس وہ ہوتا ہے جو اس کے ستر کو ڈھانپ لے"۔

وَالدُّنْيَا سِجْنُهٗ۔

"اور دنیا اس کے لئے قید خانہ ہوتی ہے"۔

وَالْفَقْرُ ضَجِيْعُهٗ۔

"اور فقر اس کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے"۔

وَالْخَلْوَةُ مَجْلِسُهٗ۔

"اور اکیلا پن ہی اس کی مجلس ہوتی ہے"۔

اَلشَّيطَانُ عَدُوُّهٗ۔

"شیطان اس کا دشمن ہوتا ہے"۔

وَالْقُرْآنُ اُنْسُهٗ۔

"اور قرآن سے اس کو محبت ہوتی ہے"۔

وَاللّٰهُ هَمُّهٗ۔

"اور اللہ اس کا غم ہوتا ہے"۔

وَالذِّكْرُ رَفِيْقُهٗ۔

"اور ذکر اس کا دوست ہوتا ہے"۔

وَالزُّهْدُ قَرِيْنُهٗ۔

"اور زہد اس کا ساتھی ہوتا ہے"۔

وَالْحِكْمَةُ سِلاَحُهٗ۔

"اور حکمت اس کا ہتھیار ہوتا ہے"۔

وَالصَّمْتُ كَلاَمُهٗ۔

"اور خاموشی اس کا کلام ہوتی ہے"۔

وَالْعِلْمُ قَائِدُهٗ۔

"اور علم اس کا رہنما ہوتا ہے"۔

وَالصَّبْرُ وِسَادَتُهٗ۔

"اور صبر اس کا بچھونا ہوتا ہے"۔

وَالتَّوْبَةُ فِرَاشُهٗ۔

"اور توبہ اس کا بستر ہوتا ہے"۔

وَالْيَقِيْنُ صَاحِبُهٗ۔

"اور یقین اس کا ساتھی ہوتا ہے"۔

وَالصِّدِّيْقُوْنَ اِخْوَانُهٗ۔

"اور صدیق اس کے بھائی ہوتے ہیں"۔

وَالعَقْلُ دَلِيْلُهٗ۔

"اور عقل اس کی دلیل ہوتی ہے"۔

وَالتَّوَكُّلُ كَسْبُهٗ۔

"اور توکل اس کی کمائی ہوتی ہے"۔

وَالْعَمَلُ شُغْلُهٗ۔

"اور نیک اعمال اس کی مشغولیت ہوتے ہیں"۔

وَالْعِبَادَةُ حِرْفَتُهٗ۔

"اور عبادت اس کا پیشہ ہوتی ہے"۔

وَالتَّقْوٰی زَادُہٗ۔

"اور تقویٰ اس کے لئے زادِ راہ ہوتا ہے"۔

وَالبِرُّ مَطِیَّتُهٗ۔

"اور نیکی اس کی سواری ہوتی ہے"۔

وَالْمَعْرِفَةُ وَزِیْرُہٗ۔

"اور معرفت اس کی نائب ہوتی ہے"۔

وَالْجَنَّةُ مَنْزِلُهٗ۔

"اور جنت اس کی منزل ہوتی ہے"۔

وَاللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مُعْتَمَدُہٗ۔

اور اللہ رب العزت کی ذات اس کا بھروسہ ہوا کرتی ہے"۔[1]

جس شخص میں یہ تمام نشانیاں ہوں وہی حقیقی زاہد ہوتا ہے۔

(مقامات سلوک، ص ۱۰۱ تا ۱۳۳)

زہد سے محبت ملتی ہے

جو دنیا سے اعراض کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا بھی مقبول بن جاتا ہے۔ اور مخلوق کا بھی مقبول بن جاتا ہے۔

[1] (الزھد الکبیر للبیھقی، ج ۱، ص ۸۸)

حدیث مبارکہ ہے:

ازهدفي الدنيايحبک الله وازهدفيمافي أيدي الناس يحبک الناس۔[1]

ترجمہ: تم دنیا سے بے پرواہ ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے اور تم بھی بے پرواہ ہو جاؤ اس سے جو لوگوں کے پاس ہے، تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔

معلوم ہوا کہ زاہد کو خالق اور مخلوق دونوں کی محبت نصیب ہوتی ہے۔

(مقامات سلوک، ص ۱۴۰)

امام جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"الزهداستصغار الدنياومحو آثارهامن القلب۔"

زہد دنیا کو حقیر جاننے اور دل سے اس کے اثرات کو مٹانے کا نام ہے۔[2]

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زہد دل کو دنیا کی محبت سے خالی کرنے کا نام ہے نہ کہ صرف ہاتھوں کو خالی کرنے کا نام ہے اور یہ عارفین کا زہد ہے اور اس سے اعلیٰ مرتبہ مقربین کے زہد کا ہے کیونکہ یہ لوگ ماسوی اللہ ہر چیز حتیٰ کہ جنت وغیرہ سے بھی زہد اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ صرف اللہ تعالیٰ کے قرب اور وصال کے متمنی ہوتے ہیں۔[3]

پس زہد دل کو دنیا کی محبت سے خالی کرنے اور اسے اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت سے بھر دینے کا نام ہے۔ دل دنیا کے مشاغل اور اس کی زیب وآرائش سے جتنا خالی ہو گا اتنی ہی دل میں اس کی محبت اور معرفت زیادہ ہو گی اسی وجہ سے عارفین نے زہد کو قرب ووصال کا وسیلہ اور اس کی محبت ورضاء کے حصول کی شرط قرار دیا ہے۔ زہد وسیلہ اور شرط تو ہے لیکن وہ بالذات غایت مقصودہ نہیں۔

---

[1] (معجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۵۹۷۲)

[2] (رسالہ قشیریہ ص ۵۶)

[3] (الفتوحات الوهبية بشرح الأربعين حديث النووية للشيخ إبراهيم الشبرخيتي)

زہد کا شرعی ثبوت:

بعض لوگوں نے اسلام میں زہد کے وجود کی قطعًا نفی کر دی ہے اور انہوں نے زہد کو بدعت اور دین میں اجنبی چیز قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ دین میں نصرانی رہبانیت اور عجمی لوگوں کی پوجا پاٹ کے ذریعے سے داخل ہوا ہے۔ اس میں قطعًا شک نہیں کہ ان کا نقطۂ نظر حقیقتِ اسلام سے جہالت کی بنا پر ہے کیونکہ اگر یہ منکرین احادیثِ رسول صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کی طرف رجوع کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے صراحتًا زہد کی دعوت دی ہے اور اسے محبتِ الٰہی کے حصول کیلئے وسیلہ قرار دیا ہے۔ حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

یا رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم! دلنی علی عمل اذا عملتہ احبنی اللہ و احبنی الناس قال لہ ازھد فی الدنیا یحبک اللہ و ازھد فیما فی ایدی الناس یحبوک۔

یعنی یا رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے کہ جب میں اسے کروں تو اللہ تعالیٰ اور لوگ مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ارشاد فرمایا:

"دنیا سے زہد اختیار کر، تو اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت کرے گا اور جو کچھ لوگوں کے ہاتھ میں ہے اس سے زہد اختیار کرے گا تو لوگ تجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔"[1]

اس کے علاوہ جب مؤمن قرآن پاک کی آیات میں غور و فکر کرتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کون کونسی آیات ہیں جو دنیا کی شان کی حقارت کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں اور اس کے جلد

---

[1] (رواہ ابن ماجہ فی کتاب الزھد)

زوال پذیر ہونے اور اس کی نعمتوں کے عارضی ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ یہ دنیادار غرور اور غافلین کیلیئے فتنہ ہے۔

دنیا کی یہ تمام صفات بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ لوگ دلوں سے اس کی محبت کو نکال دیں تاکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی معرفت اور دینی احکام کو سرانجام دینے میں حائل نہ ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱):"یَا أَیُّهَا النَّاس إنَّ وَعْدَاللہ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَکُمُ الْحَیوۃُ الدُّنْیَاوَ لَا یَغُرَّنَکُمْ بِاللہ الْغَرُوْر (فاطر:۵)

"اے لوگو! یقینا اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس دھوکہ میں نہ ڈال دے تمہیں یہ دنیوی زندگی اور نہ فریب میں مبتلا کردے تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا فریبی۔"

(۲): وَمَا هٰذِهِ الْحَیوۃُ الدُّنْیَا إلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَإنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (عنکبوت ۶۴)

"اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر لہو ولعب اور دارِ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے (جسے موت نہیں) کاش! وہ اس حقیقت کو جانتے۔"

(۳):اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیوۃِ الدُّنْیَا وَالْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ خَیْرٌ عِنْدَرَبِّکَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا (کھف:۴۶)

"مال اور فرزند (توصرف) دنیوی زندگی کی زیب وزینت ہیں اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے۔"

اور اسی طرح دیگر کثیر آیات اسی معنی ومفہوم کو بیان کرتی ہیں کہ جب ہم رسول اللہ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم کی سیرت طیبہ میں غور وفکر کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ صَلَّی اللہ

تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دنیا سے کنارہ کشی اور اس کی زیب وآرائش سے منہ موڑنے کی نصیحت فرماتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم دنیا کی شان کی حقارت اور اس کی فتنہ انگیزیوں کو واضح کرتے ہیں اور اس سے آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کا مقصود یہی ہے کہ دنیا انہیں ان کے مقصودِ حقیقی جس کیلئے ان کی تخلیق ہوئی ہے سے غافل نہ کر دے اور ان کو اس عظیم مقدس پیغام سے دور نہ کر دے جس کی نشر واشاعت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر پڑنے والی ہے۔ اس لئے آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم ان پر واضح کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ہمارے لئے امتحان اور آزمائش بنایا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم اس کی رضا کے حصول کیلئے اعمال سر انجام دیتے ہیں یا اس کے بر خلاف۔

رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم ارشاد فرماتے ہیں:

عن أبي سعيد الخدری رضی اللہ تعالی عنه إنَّ الدُّنیا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وإنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيها، فَيَنْظُرُ كيفَ تَعْمَلُونَ، فاتَّقُوا الدُّنْيا واتَّقُوا النِّساءَ۔

"بے شک دنیا میٹھی اور سر سبز وشاداب ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں نائب بنایا ہے تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو پس دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو۔"[1]

کبھی آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ تنبیہ فرماتے ہیں کہ یہ دنیا ڈھلتی چھاؤں اور عارضی ٹھکانہ ہے تاکہ وہ اس دنیا کی طرف مائل نہ ہو جائیں اور وہ انہیں اللہ تعالیٰ کے راستہ سے دور کر دے۔

---

[1] (أخرجه مسلم فی کتاب الذکر والدعاء)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے اپنے دستِ اقدس کو میرے کندھے پر رکھا اور ارشاد فرمایا:

وكُنْ في الدُّنيا كأنَّكَ غَريبٌ، أو عابِرُ سَبيلٍ۔[1]

"دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم پردیسی ہو یا مسافر"۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کی وضاحت میں فرمایا کرتے تھے کہ جب تو شام کرے تو صبح کا انتظار نہ کر اور جب صبح کرے تو شام کا انتظار نہ کر، اپنی صحت کی حالت میں حالتِ مرض کیلئے اور زندگی میں موت کیلئے کچھ عمل کر لے۔[2]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ایک چٹائی پر استراحت فرمائی، جب آپ بیدار ہوئے تو آپ کے پہلو مبارک پر چٹائی کے نشان واضح تھے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم! اگر آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم اجازت دیں تو آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کیلئے نرم بچھونا تیار کر لیں تو آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ارشاد فرمایا:

مالي وللدُّنيا ما أنا في الدُّنيا إلّا كراكبٍ استظلَّ تحتَ شجرةٍ ثمَّ راحَ وترَكَها۔

میرا اس دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ میں دنیا میں اس مسافر کی طرح ہوں جو کسی درخت کے سائے کے نیچے آرام کرتا ہے اور پھر کوچ کر جاتا ہے اور اس کو وہیں چھوڑ جاتا ہے۔[3]

---

1 شعيب الأرنؤوط (ت ١٤٣٨)، تخريج المسند ٦١٥٦ •إسناده صحيح على شرط الشيخين •أخرجه البخاري (٦٤١٦)، والترمذي (٢٣٣٣)، وابن ماجه (٤١١٤) مطولاً، وأحمد (٦١٥٦) واللفظ له

2 (أخرجه البخارى فى كتاب الرقاق)

3 (أخرجه الترمذى فى كتاب الزهد وقال حديث صحيح)

اور کبھی رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی حقارت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

عن سھل بن سعد الساعدي رضی اللہ تعالیٰ عنه قال النبی صَلی اللہ تعالیٰ علیه وَاٰله وَسلَّم لو کانتِ الدنیاتعدلُ عنداللہِ جناحَ بعوضۃٍ ماسقی کافرًا منھاشربۃَماءٍ۔[1]

اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی عطانہ کرتا۔

یہ وہ بہترین راہ ہے جس پر رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کے خلفاء اور صحابہؓ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم گامزن رہے۔ اس کی وجہ سے ان کے دل دنیا سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اس دنیا میں زہد کو اختیار کیا۔ ان کی زندگی میں فقر وفاقہ اور مصائب وآزمائش کے مراحل بھی آئے لیکن حکمِ الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے صبر ورضا کے پیکر بن گئے۔ پھر دنیا ذلیل ہو کر ان کی بارگاہ میں آگئی اور اپنے خزانوں اور ان کی چابیوں کو ان کے سامنے ڈال دیا لیکن انہوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا کا وسیلہ اور آخرت کا ذریعہ بنا دیا۔ دنیا نے ان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مشغول نہیں کیا اور ان کو تکبر غرور اور عیاشی یا بخل اور کنجوسی میں مبتلا نہیں کیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا تمام مال پیش کر دیا۔ اور جب رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے پوچھا:

” وجاءَ أبو بَکْرٍ بمالٍ کثیرٍ، فقالَ رسولُ اللہِ صَلی اللہ تعالیٰ علیه وَاٰله وَسلَّم ماترَکْتَ لأَھْلِکَ؟ قالَ:ترَکْتُ لَھُمُ اللہَ وَرسولَهُ“۔

---

[1] (ترمذی فی کتاب الزھد عن سھل بن سعد الساعدی وقال: حدیث حسن صحیح)

اپنے گھر والوں کیلیئے کیا چھوڑ آئے ہو؟ عرض کی ان کیلیئے اللہ اور اس کے رسول صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کو چھوڑ آیا ہوں۔[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو اس میدان میں خاص مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے اور زہد میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام بطور ضرب المثل لیا جاتا ہے۔

اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ ذات ہیں جنھوں نے جیشِ عسرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کیلیئے اپنے اموال کی پرواہ کئے بغیر اس کی راہ میں مال خرچ کیا۔

آپ کی اس قربانی ایثار اور دنیاوی مال سے بے رغبتی دیکھ کر رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے آپ کے بارے میں فرمایا:

ماضَرَّ عثمانَ ماعَمِلَ بعدَالیومِ مرتین۔

"آج کے بعد کوئی عمل بھی عثمان کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔"[2]

سیرت کی کتب رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم اور آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زہد کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ صرف چند واقعات ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نبی کریم صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے تین کپڑے نہ اپنے گھر میں استعمال کئے اور نہ گھر سے باہر اور یہی حال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا اور جب وہ

---

[1] (أبو داؤد فی کتاب الزکاۃ و الترمذی فی کتاب المناقب، ابن کثیر (ت ۷۷٤)، مسند الفاروق ۱/۲٦٤)

2 (ترمذی، کتاب المناقب رقم الحدیث ۳۷۰۱)

احرام باندھتے تو ان کے پاس ایک تہبند اور ایک چادر ہوتی اور شاید ان کی قیمت تمہاری ایک قمیص کے برابر ہو۔ میں نے نبی کریم صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کو دیکھا کہ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے اپنے دستِ مبارک سے کپڑوں کو پیوند لگائے اور میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنی عبا کو کانٹوں سے سیا ہوا تھا اور میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے جبہ کو چمڑے کا پیوند لگاتے تھے حالانکہ وہ اس وقت امیر المؤمنین تھے لیکن آج کل یہ دور ہے کہ میں تم میں سے بہت سے اشخاص کو جانتا ہوں کہ وہ سو درہم انعام میں دے دیتے ہیں اور اگر میں ہزار کہوں تو یہ بھی مبالغہ نہ ہو گا۔[1]

حضرت حفصہ بنت خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی اے امیر المؤمنین !کاش آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اس کپڑے سے نرم کپڑا پہنتے اور کاش اپنے اس کھانے سے عمدہ کھانا کھاتے اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رزق میں وسعت دی ہے اور بہت مال عطا فرمایا ہے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تم خود ہی فیصلہ کرو کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کتنی سخت زندگی گزارا کرتے تھے۔ آپ انہیں وہ حالات یاد کراتے رہے، حتیٰ کہ انہیں رلا دیا۔ پھر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں فرمایا، قسم بخدا! اگر میں نے رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی سخت زندگی گزاری تو پھر شاید ان کی خوش حال زندگی کو پا سکوں گا۔[2]

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن خطبۂ جمعہ کیلئے دیر سے تشریف لائے تو پھر اپنی تاخیر کی معذرت کی۔ فرمایا میں اپنے ان کپڑوں کو

---

[1] (سیرت عمر ابن الخطاب، ص ۱۰۲)

[2] (سیرت عمر ابن الخطاب، ص ۱۰۴)

دھونے میں مشغول ہو گیا جس کی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہی کپڑے دھو کر پہن لیا کرتے تھے کیونکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس دوسرے کپڑے نہ تھے۔ [1]

رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حیات طیبہ وہ کامل عملی نمونہ ہے جس پر اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ عمل پیرا ہوئے۔ اسی وجہ سے وہ زہد، عفت، پاکیزگی اور استقامت میں اپنی مثال آپ تھے۔

زہد کا صحیح مفہوم:

زہد کی سابقہ تعریفات اور اس کے شرعی جواز سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زہد ایک قلبی مرتبہ ہے کیونکہ اس سے مراد دل سے دنیا کی محبت کو نکالنا ہے۔ اس حیثیت سے کہ زاہد اپنے دل کے ساتھ دنیا کی طرف متوجہ نہ ہو اور نہ ہی اس مقصد سے دور ہو جس کی خاطر اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ زہد کا یہ معنی نہیں ہے کہ مؤمن دنیا کو خیر باد کہہ کر مال سے اپنے ہاتھ کو خالی کر لے اور کسبِ حلال کو ترک کر کے دوسروں پر بوجھ بن جائے۔

رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے زہد کے مقصودِ حقیقی کو واضح کیا ہے۔ جیسا کہ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں زہد حلال کو حرام کرنے اور مال کو ضائع کرنے میں نہیں ہے بلکہ زہد یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس پر تیرا اور زیادہ یقین اور اعتماد ہو اس چیز سے جو تیرے ہاتھ میں ہے اور تو مصیبت کے ثواب میں زیادہ رغبت رکھنے والا ہو۔ [2]

---

[1] (سیرۃ عمر بن خطاب، ص ۱۰۲)

[2] (أخرجه الترمذی فی کتاب الزھد عن أبی ذر رضی اللہ تعالیٰ عنه)

علامہ مناوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ مال سے مکمل اجتناب کرنا زہد نہیں کہلاتا بلکہ زہد یہ ہے کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا تیرے نزدیک دونوں برابر ہوں اور تیرا دل مال کی طرف مائل نہ ہو۔ رسول اللہ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم زاہدوں کے سردار ہونے کے باوجود گوشت، حلوہ اور شہد تناول فرماتے تھے۔ عورتیں، خوشبو اور اچھے کپڑے سے محبت فرماتے تھے۔ اس لئے اے سالک! اس پاکیزہ رزق کو بغیر اسراف اور تکبر کے استعمال کر اور راہبوں کے زہد سے بچ۔[1]

اسی طرح صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے زہد کے بارے میں یہی رائے ہے کہ قلبی مرتبہ ہے۔

حضرت عمرو بن عثمان مالکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زہد کی بنیاد اور اساس دل میں ہے اور اس سے مراد دنیا کو حقیر جاننا اور قلب کی نظر کے ساتھ اسے دیکھنا ہے اور یہی زہد کی حقیقت اور اصل ہے۔[2]

غوث الثقلین شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زہد کے مفہوم کو بڑے جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"اخرج الدنیا من قلبک دعھا فی یدک او فی جیبک فانھا لا تضرک"

"یعنی دنیا کو اپنے دل سے نکال دو اور اس کو اپنے ہاتھ یا جیب میں رکھ لو تو یہ تمہیں نقصان نہیں دے گی۔"[3]

---

[1] (فیض القدیر شرح جامع الصغیر للمناوی ج۴ ص ۷۲)

[2] (طبقات الصوفیۃ للسلمی ص ۲۰۳)

[3] (الفتح الرّبّانی)

کسی عارف نے اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے۔ زہد یہ نہیں کہ تو دنیا کو اپنے ہاتھ سے تو ترک کر دے لیکن وہ تیرے دل میں موجود رہے بلکہ زہد یہ ہے کہ تو دنیا کو اپنے دل سے نکال دے۔ خواہ وہ تیرے ہاتھ میں موجود رہے۔

اسی وجہ سے ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے زہد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"ھو خلو القلب من التعلق بغیر الرب"۔

یعنی زہد رب کے علاوہ ہر تعلق سے دل کو خالی کرنے کا نام ہے۔[1]

امام زہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ زہد کا معنی بیان فرماتے ہیں کہ زہد حقیقی یہ ہے کہ تو رزق حلال پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور طلب حرام سے اپنے نفس کو روکے اس رزق پر قناعت کرتے ہوئے جو رب نے تیرے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ جب آپ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسَلَّم سے مؤمن کے زہد کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اس کا زہد یہ ہے کہ رزق حلال اس کے شکر پر غالب نہ ہو اور نہ ہی حرام اس کے صبر پر۔[2]

علمائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ آیاتِ کریمہ اور احادیث شریفہ میں جو دنیا کی مذمت کی گئی ہے اس سے مقصود اس کی ذاتی مذمت نہیں ہے بلکہ یہ تو دل کو دنیا کے ساتھ لگا لینے سے بچانے کیلئے تنبیہ و تحذیر کی گئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مؤمن اس کو اپنا مقصودِ اصلی بنا لے اور اپنے مقصودِ حقیقی یعنی رضائے الٰہی کو بھول جائے۔ وہ دنیا بہت اچھی ہے جو مؤمن کیلئے قربِ الٰہی کے حصول کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ وہ دنیا کتنی بری ہے جس کی عبادت کی جائے۔ اسی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ مناوی فرماتے ہیں کہ دنیا کی مذمت اس کی ذات کی وجہ سے نہیں کی جاتی کیونکہ یہ

---

[1] (معراج التشوف ص ۷)

[2] (النہایۃ فی غریب الحدیث)

آخرت کی کھیتی ہے۔ جس نے شرعی قوانین کا لحاظ کرتے ہوئے دنیا سے کچھ اخذ کیا، تو یہ اس کی آخرت کیلئے معاون ہو گی۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ دنیا کی طرف مائل نہ ہو کیونکہ اسے کسی پر ترس نہیں آتا اور نہ ہی اس کو بالکل چھوڑ دو کیونکہ آخرت کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں۔[1]

زہد تک رسائی کا طریقہ:

چونکہ زہد ایک عظیم الشان قلبی مقام ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر مقام کو خالی کیا جاتا ہے، اس لئے اس تک رسائی حاصل کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کیلئے بڑی محنت اور وسائل کی ضرورت ہے اور ان میں سب سے اہم مرشد کامل کی صحبت ہے جو سالک کو اس کے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے اور اس کیلئے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے اور بڑی حکمت و دانائی سے اس کو ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے اور اس کے پاؤں کو پھسلنے سے بچاتا رہتا ہے۔

بعض لوگ اس سلسلہ میں خطا کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے زہد کو اپنا مقصود اور غایت بنالیا۔ پیوند شدہ کپڑے پہنے ناقص غذا استعمال کی کسبِ حلال کو ترک کر دیا اور مالداروں پر حسد کرنے لگے حالانکہ ان کے اپنے دل دنیا کی محبت سے لبریز تھے اور انہوں نے گمان کیا کہ وہ ایسا کرنے سے زاہد بن گئے اور اس خطا میں واقع ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بغیر مرشدِ کامل کی صحبت کے اس راہ پر نکلے تھے۔ اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں امام مناوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زہد، دل کو دنیاوی محبت سے خالی کر دینے کا نام ہے کہ نہ صرف ہاتھ خالی کرنے کا نام ہے۔ بعض جاہل لوگوں نے کسبِ حلال سے اجتناب کو زہد سمجھ لیا اور لوگوں سے کنارہ کشی کر کے ان کے حقوق کو ضائع کیا اور قطع رحمی کے مرتکب ہوئے اور اغنیاء سے نفرت کی حالانکہ خود ان کے دل غنا کی خواہش سے لبریز تھے اور ان

---

[1] (فیض القدیر ج۳ ص ۵۴۵)

جاہلوں نے یہ نہ جانا کہ زہد کا تعلق دل سے ہے اور اصل زہد دلی خواہشات کو مارنا ہے لیکن جب انہوں نے ظاہری اعضاء کے ساتھ دنیا سے کنارہ کشی کرلی تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ کامل زاہد بن گئے ہیں اور اپنے اس خشک زہد کی وجہ سے بہت سے ائمہ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے خلاف زبان طعن دراز کی۔ [1]

اور اس کے مقابلہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو دنیا اور اس کی لذات میں مستغرق ہیں۔ ان کے دل اس کی محبت سے معمور ہیں اور اپنا تمام وقت دنیاوی مال جمع کرنے میں صرف کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی گمان کرتے ہیں کہ ان کو قلبی زہد حاصل ہے اور صرف وہی زہد کے حقیقی معنیٰ کو سمجھتے ہیں۔ کاش کہ ان لوگوں کو کسی مرشدِ کامل کی صحبت میسر آتی تو وہ انہیں زہد کی حقیقت سے آگاہ کرتا اور حقیقت زہد تک رسائی کا راستہ بتاتا۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بعض شیوخ اپنے مریدین کے دلوں سے دنیاوی محبت نکالنے کیلئے بعض خاص مجاہدات کا حکم دیتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد مریدین کی بعض روحانی بیماریوں کا علاج کرنا ہوتا ہے۔ وہ انہیں کم کھانے اور سادہ کپڑے پہننے کا حکم دیتے ہیں۔ تاکہ دنیا کی محبت ان کے دل سے نکل جائے اور اس کے ساتھ ساتھ جود وسخا کا بھی حکم دیتے ہیں تاکہ بخل اور دنیاوی مال کی محبت ان کے دل سے نکل جائے۔ یہ بعض ضروری روحانی علاج ہیں جو شیخِ کامل کی راہنمائی میں فائدہ مند ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں ذاتی طور پر مقصود نہیں ہوتیں بلکہ حقیقی قلبی زہد تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔

رسول اللہ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسَلَّم کا سادہ غذا استعمال کرنا اور بھوک کی وجہ سے پیٹ مبارک پر پتھر باندھنا صرف ان اعمال کے جواز کو بیان کرنے کیلئے تھا۔ حالانکہ جبریل علیہ السلام نے

---

[1] (فیض القدیر ص ۴۳/۷)

آپ صَلّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کی خدمت میں عرض کی تھی کہ اگر آپ صَلّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم حکم فرمائیں تو یہ پہاڑ سونا بن جائیں۔

شیخ الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایسی ہستی ہیں جن کے زیرِ سایہ بڑے بڑے علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے تربیت حاصل کی۔ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ اس مفہوم کو بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے تصوف **قیل و قال** سے حاصل نہیں کیا، بلکہ بھوک، دنیا سے قطع تعلقی، پسندیدہ اور محبوب چیزوں کو ترک کرنے سے حاصل کیا ہے کیونکہ تصوف اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو جوڑنے کا نام ہے اور اس کی بنیاد دنیا سے کنارہ کشی پر ہے۔ جس طرح کہ حضرت حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا، میرا دل، دنیا سے دور ہو گیا ہے۔ رات جاگ کر گزارتا ہوں اور دن میں روزہ رکھتا ہوں۔[1]

سیدی شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے مریدوں کو ابتدائے سلوک میں مجاہدہ کا حکم فرماتے تھے اور ان کو صبر اور سخت زندگی گزارنے کی تلقین فرماتے۔ اس کے بعد ان کو آہستہ آہستہ قلبی زہد کے مراتب کی طرف لے جاتے حتیٰ کہ ان کے نزدیک اخذ و عطا اور فقر و غنا برابر ہو جاتا، اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے ان کا دل خالی ہو جاتا۔

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان امور کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جو مقامِ زہد تک پہنچنے کیلئے معاون و مددگار ہیں۔

(۱): اس بات کا یقین کر لینا کہ دنیا ڈھلتی چھاؤں اور عارضی خیال کی طرح ہے اور یقیناً ایک دن اس سے دار البقاء کی طرف کوچ کرنا ہے۔ وہاں انسان اپنے اعمال کا نتیجہ پالے گا۔ اگر اس کے اعمال

---

[1] (طبقات الصوفیة للسلمی ص ۱۵۸)

اچھے ہوں گے تو جنت کی دائمی نعمتوں میں مقیم ہو جائے گا اور اگر برے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا نارِ جہنم ہو گا۔

حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم "الھٰکم التکاثر" پڑھ رہے تھے۔ آپ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم نے فرمایا ابن آدم کہتا ہے میرا مال میرا مال۔ اے ابن آدم! تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے کھایا اور فنا کر دیا یا پہنا اور بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کیا اور اس کو آگے بھیج دیا۔[1]

حضرت ابو المواہب شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی محبت کے ساتھ مرید کی عبادت دل کو مشغول کرنے اور جسم کو تھکانے کے سوا کچھ نہیں یہ عبادت اگرچہ کثیر ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک قلیل ہوتی ہے۔

(۲): یہ یقین کر لینا کہ اس دنیا کے علاوہ بھی ایک جہاں (دار آخرت) ہے جو اس سے زیادہ قدر و عظمت والا ہے اسے دار البقا کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَّ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى۔ (نساء:۷۷)

ترجمہ: "اے (ترجمانِ حقیقت!انہیں) کہو دنیا کا سامان بڑا قلیل ہے اور آخرت زیادہ بہتر ہے اس کیلئے جو تقویٰ اختیار کئے ہوئے ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام رحمھم اللہ تعالیٰ اپنے مریدین کو دنیا سے اعراض کرنے اخروی زندگی یعنی جنت اور اس کی نعمتوں کی طرف توجہ دینے اور ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف رغبت دینے کی

---

1 (مسلم، کتاب الزھد)

تلقین فرماتے ہیں۔ اس طرح وہ ایثار، قربانی، مجاہدۂ نفس اور خواہشاتِ نفسانیہ پر غلبہ حاصل کرنے میں صحابۂ کرام اور سلف صالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سیرت طیبہ پر عمل پیرا ہوئے تو اس عارضی زندگی کی رنگارنگی ان کو اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔ دنیا کی رونق اور دلکشی دیکھ کر وہ نعرہ مستانہ لگاتے تھے۔

لاتنظرن الی القصور العامرة — واذکر عظامک حین تمسی ناخرة

واذا ذکرت زخارف الدنیا فقل — لبیک ان العیش عیش الآخرة

(۱): آباد محلات کی طرف نہ دیکھ۔ اپنی ہڈیوں کی طرف دیکھ جب یہ بوسیدہ ہو جائیں گی۔

(۲): اور جب تجھے دنیا کی زیب وزینت یاد آئے تو کہہ، لبیک، یقیناً حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

(۳): یہ یقین کر لینا کہ دنیا میں مؤمن کا زہد اس سے وہ چیز نہیں روک سکتا جو اس کے مقدر میں لکھی جاچکی ہے اور دنیا پر حریص ہونا ان کو وہ عطا نہیں کر سکتا جو اس کے مقدر میں نہیں لکھا گیا۔ پس جو چیز اس کی مقدر میں لکھی جاچکی ہے وہ اس کو مل کر رہے گی اور جو چیز اس کے مقدر میں نہیں ہے وہ اس کو نہیں مل سکتی۔

خلاصہ کلام:

یہ ہے کہ زہد کا مقام ارفع واعلیٰ ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے کتاب وسنت نے اس کی دعوت، اور ائمہ کرام نے اس کی تعریف کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

فرماتے ہیں ”زہد کو لازم پکڑو، کیونکہ زہد، زاہد کیلئے خوبصورت عورت پر زیور سے بھی زیادہ حسین ہے۔“[1]

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے مقامِ زہد تک رسائی حاصل کرکے اس کے مختلف مدارج کو طے کیا ہے۔ شیخ ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے زہد کے تین مدارج کو بیان فرمایا ہے۔

(۱): عوام الناس کا زہد۔ (۲): خواص کا زہد۔ (۳): خاص الخواص کا زہد۔

(۱): عوام الناس کا زہد۔ یہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد چیز کو ترک کردیں۔

(۲): خواص کا زہد۔ یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کو ترک کردیں جو انہیں قربِ الٰہی سے دور کرنے والی ہو۔

(۳): خاص الخواص کا زہد۔ یہ ہے کہ وہ اپنے تمام اوقات میں ماسوی اللہ سے اعراض کرتے ہیں۔

آپ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زہد، راہِ سلوک پر گامزن ہونے اور وصالِ الٰہی کا سبب ہے اور دل کو یہ منزل اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی، جب تک اس کا تعلق محبوب کے سوا کسی اور چیز سے ہوتا ہے۔[2]

امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صوفیائے کرام اور صالحین کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان للہ عبادا فطنا — طلقوا الدنیا و خافوا الفتنا

نظروا فیھا فلما علموا — انھا لیست لحی سکنا

جعلوھا لجۃ و اتخذوا — صالح الاعمال فیھا سفنا

---

[1] (فیض القدیر ج۴ ص ۷۳)

[2] (معراج التشوف ص ۸-۷)

(۱): اللہ تعالیٰ کے کچھ ہوشیار بندے ہیں جنہوں نے دنیا کو طلاق دے دی اور اس کے فتنہ سے ڈر گئے۔

(۲): انہوں نے اس میں غور و فکر کیا اور جب انہوں نے جان لیا کہ یہ کسی زندہ کی جائے سکونت نہیں ہے۔

(۳): تو انہوں نے اس کو ایک سمندر گمان کیا اور اپنے نیک اعمال کو اس میں کشتی بنالیا۔

امام عبد الوہاب شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب تنبیہ المغترین میں لکھا ہے

دنیا سے زہد اور طلب دنیا کی مذمت

ان صوفیاء کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کے اخلاق میں سے ایک بات یہ ہے کہ وہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کرتے ہیں اور ہر طالبِ دنیا کی مذمت کرتے ہیں اور اس سلسلے میں مبالغہ کرتے ہیں حتی کہ علماء بنی اسرائیل کی طرح وہ حکمت بھری گفتگو کرتے ہیں۔

اور زہد کے سلسلے میں ان کے قائد سرکار دو عالم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم ہیں رسول اکرم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کے خانہ اقدس میں چالیس چالیس راتیں آگ اور چراغ نہیں جلتا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ لوگ زندگی کیسے گزارتے تھے انہوں نے فرمایا دو سیاہ چیزوں یعنی کھجور اور پانی کے ساتھ۔

اور رسول اکرم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے پیوند لگی چادر اور ایسی ازار میں وفات پائی جو عرنی گاڑھی تھی (عرنی، عرنیہ کی طرف منسوب ہے)

نبی اکرم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم فرماتے تھے:

"انما مثلی و مثل الدنیا کمثل رجل استظل تحت شجرۃ ثم راح و ترکھا"

ترجمہ: بے شک میری اور دنیا کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو ایک درخت کے سائے میں بیٹھتا ہے پھر اسے چھوڑ کر چل پڑتا ہے۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے زہد کے تین حرف ہیں۔ زاء کا معنی دنیوی زینت کو چھوڑنا۔ ہاء کا معنی نفسانی ھویٰ (خواہش) کو ترک کرنا اور دال کا معنی دنیا کو (اس کی محبت کو) مکمل طور پر چھوڑنا ہے پس جب تم ایسا کروگے تو تم زاہد ہوگے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے زہد کی تین اقسام ہیں:

(۱) فرض: یہ زہد حرام کاموں کو چھوڑنے کی صورت میں ہے۔

(۲) واجب: یہ زہد شبہات سے بچنے میں ہے۔

(۳) سنت: یہ زہد حلال (مباح) چیزوں سے بچنے میں ہے (لیکن ان کو حرام نہ سمجھے)

اسی لئے حکومت حاصل کرنے سے زہد سونے اور چاندی سے بچنے کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے کیونکہ تم حکومتی منصب حاصل کرنے کے لئے ان دونوں چیزوں کو خرچ کرتے ہو۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو دنیا میں زہد پر مجبور کرے ہاں اس پر لازم ہے کہ ان کو اس بات کی دعوت دے اگر وہ اسے قبول کرلیں تو ٹھیک ہے ورنہ خود زہد اختیار کرے اور ان کی بھلائی کی چیزیں ان کو دے۔

وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ جو چیز تمہیں تمہارے رب سے غافل کرے وہ اہل ہوں، مال ہو یا کوئی دوسری چیز وہ تمہارے لئے نحوست کا باعث ہے۔

میں (مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کہتا ہوں یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات کو پیدا کیا کہ وہ بندے کو اس کے رب کی یاد دلائیں اس صورت میں یہ مبارک ہے بخلاف اس کے جب

موجودات اس کے اور اس کے رب کے درمیان حجاب بن جائیں۔یہی وجہ ہے کہ اولاد اور مال بندے کے لئے بہت بڑا فتنہ ہے کیونکہ جب اس کا میلان ان کی طرف ہو گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے گا۔

حضرت وکیع رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے طبہیج کھایا(غالباً ایسا کھانا جو عیاشی شمار ہوتا ہو) تو انہوں نے اس بات کو اچھا نہ سمجھا اور فرمایا(اس طرح)لوگ اپنی خواہشات کے مطابق کھانے میں آپ کی اقتدا کریں گے۔

حضرت بلال بن سعد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا میں زہد عطا فرمایا تو اس کے بعد ہماری دنیا کی طرف رغبت کا گناہ ہی کافی ہے۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے ہم نے زہد کے بارے میں بہت سی باتیں سنی ہیں لیکن اس سلسلے سے اچھی بات جو ہم نے دیکھی یہ ہے کہ زہد ہر اس چیز میں ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے پھیر دے حتیٰ کہ علم اور عمل بھی۔(جس چیز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے دوری ہو اسے چھوڑنا زہد ہے)

میں (مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کہتا ہوں یعنی اگر علم اور عمل میں ریاکاری خود پسندی یا لوگوں کی طرف سے تعریف کی چاہت وغیرہ آجائے ورنہ جو شخص علم و عمل میں مخلص ہو اس کے لئے اس میں زہد ٹھیک نہیں کیونکہ ان دونوں باتوں میں اخلاص بندے کے دل کو اپنے رب کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کہا مجھے کسی زاہد عالم کے بارے میں بتایئے جس کے پاس میں بیٹھوں انہوں نے فرمایا اے فلاں! یہ چیز گم ہو چکی ہے اب نہیں پائی جاتی۔

اور حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے زہد پورے کا پورا نفس کو تھکانے کا نام ہے جب کوئی زاہد دنیا میں راحت کی طرف مائل ہوا، اس وقت اس نے زہد سے رجوع کر لیا۔

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے کہ لوگوں نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دنیا کا (عہدہ حاصل کرنے کا) مطالبہ کیا تو آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس سے بھاگ گئے اور ہم نے دنیا طلب کی تو وہ ہم سے بھاگ گئی تو دیکھو دونوں قسم کے لوگوں کے درمیان کتنا فرق ہے۔

حضرت یوسف بن اسباط رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے میں نے اللہ تعالیٰ سے تین باتیں طلب کیں ایک یہ کہ جب مجھے موت آئے تو میری ملک میں کوئی درہم نہ ہو اور نہ میرے ذمہ ہو اور نہ میری ہڈیوں پر گوشت ہو پس آپ کا انتقال اسی طرح ہوا۔

ایک مرتبہ خلیفہ نے فقہاء کی طرف عطیات بھیجے تو انہوں نے قبول کر لئے اور حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف دس ہزار درہم بھیجے لیکن آپ رحمہ اللہ تعالیٰ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ان کی اولاد نے ان سے کہا کہ فقہاء نے تحائف قبول کر لئے حالانکہ وہ لوگوں کے پیشوا ہیں آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کیوں قبول نہیں کرتے؟

(یہ سن کر) آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ روئے اور فرمایا میری اور تمہاری مثال اس قوم جیسی ہے جن کے پاس گائے ہو اور وہ اس کے ذریعے کھیتی باڑی کرتے ہوں جب وہ بوڑھی ہو جائے تو ان میں

سے بعض کہیں اس کو ذبح کر دو اس سے پہلے کہ تم اس کی کھال اور گوشت سے فائدہ نہ اٹھا سکو، اسی طرح تم بھی مجھے بڑھاپے میں ذبح کرنا چاہتے ہو پس بھوک پر صبر کرو یہ تمہارے لئے مجھے ذبح کرنے سے بہتر ہے۔

انہوں نے کہا آج ہمارے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں تو انہوں نے چھری لی اور اپنے نیچے بچھے ہوئے پرانے بچھونے سے ایک ٹکڑا کاٹ کر فرمایا اس کی قیمت سے کھانے کے لئے کچھ خرید لو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام زاہدین کے سردار تھے آپ علیہ السلام بالوں والا لباس پہنتے اور درختوں کے پتے کھاتے تھے۔ آپ علیہ السلام کے ہاں اولاد نہ تھی جسے موت آتی، گھر نہیں تھا جو خراب ہو جاتا اور نہ کل کے لئے رزق تھا، جہاں رات آجاتی وہاں سو جاتے۔

ایک مرتبہ آپ علیہ السلام سے عرض کیا گیا اے روح اللہ! کیا آپ علیہ السلام اپنی سواری کے لئے دراز گوش (گدھا) خرید نہیں لیتے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں میری عزت اس سے زیادہ ہے کہ میں گدھے کی خدمت میں مشغول ہو جاؤں اور آپ علیہ السلام اپنے حواریوں (ساتھیوں) سے فرماتے تھے میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جَو کا چھان بورا کھانا جو راکھ میں ملا ہوا ہو اور کتوں کے ساتھ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سو جانا اور سخت ٹاٹ پہن لینا اس شخص کے لئے بہت زیادہ ہے جس نے (آخر کار) مر جانا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے بچھونا، تکیہ اور پیالہ تک نہیں رکھا اور ایک مرتبہ اپنے سر کے نیچے اینٹ رکھ دی حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا اے عیسیٰ علیہ السلام! آپ علیہ السلام دنیا سے زہد اختیار کرنے کے بعد اس کی طرف مائل ہو گئے اور آپ علیہ السلام نے اپنے سر کے نیچے

اینٹ کا تکیہ رکھ لیا؟ اس کے بعد سے آپ علیہ السلام بیٹھے بیٹھے سوتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اٹھالیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے فرماتے تھے تم پر خالص پانی خشکی کی سبزی اور جَو کا چھان اختیار کرنا لازمی ہے گندم کی روٹی سے بچو تم جو کے چھان بُورے کا شکر بھی ادا نہ کر سکو گے۔

امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے تین درہم کی قمیص خریدی اس وقت آپ کرم اللہ وجہہ الکریم خلیفہ تھے آپ کرم اللہ وجہہ الکریم نے کلائیوں سے اس کی آستین کاٹ کر پہن لی اور فرمایا اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ اس کے عمدہ مال میں سے ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جب قمیص پہنتے تو جب تک پرانی نہ ہو جاتی اسے نہ اتارتے ایک مرتبہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے عرض کیا گیا کہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی قمیص کو دھوتے نہیں؟ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا معاملہ (موت) اس سے زیادہ جلدی میں ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے اگر پوری دنیا میرے قبضے میں ہوتی تو میں اس پر خوش نہ ہوتا اور اگر کوئی شخص میرے ہاتھ سے پوری دنیا لے لے تو میں اس کا پیچھا نہیں کروں گا اور نہ ہی اس پر غمگین ہوں گا۔

آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکہ مکرمہ میں پانی کے ذریعے روزی کماتے تھے آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس ایک اونٹ تھا اس پر پانی لاکر فروخت کرتے اور اس سے آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے گھر والے رزق حاصل کرتے۔

حضرت عبد الواحد بن زید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے جس نے اپنے پیٹ کو کنٹرول کر لیا اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور تمہارے باپ آدم علیہ السلام کی آزمائش ایک لقمہ سے ہوئی تھی اور قیامت تک تمہاری آزمائش بھی اسی کے ساتھ ہو گی پس اس بات کو جان لو۔

میں (مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کہتا ہوں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا انسانوں کو آزمانا ہے کہ کیا یہ لوگ خواہشات کو چھوڑنے پر صبر کر سکتے ہیں یا خواہشات کا شکار ہوتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام کی آزمائش محض صورتاً تھی (حقیقتاً نہ تھی) اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اس میں ڈالا تا کہ آپ علیہ السلام کو اس بات کی پہچان حاصل ہو جائے کہ جب آپ علیہ السلام کی اولاد ہو گی تو وہ اس طرح آزمائش میں پڑے گی۔ یہ رسولوں کو غیب کی باتوں پر مطلع کرنے کے باب سے ہے۔

اور تا کہ آپ علیہ السلام کو اس بات کی پہچان بھی حاصل ہو جائے کہ جب آپ علیہ السلام کی اولاد اس میں مبتلا ہو گی تو وہ کس طرح توبہ کرے گی پس خطاب آپ علیہ السلام کو اور حکم دوسروں کو تھا۔ جس طرح ہم نے (مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے) اپنی کتاب **"الاجوبۃ عن الاکابر"** (اکابر کی طرف سے جواب) میں اس کی وضاحت کی ہے۔

حکمت بھری باتیں

اور ان صوفیاء کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کی حکمت بھری باتوں میں سے یہ باتیں ہیں مطلب یہ کہ جب وہ دنیا سے بے رغبتی میں مضبوط ہو گئے (تو ان کی باتیں حکمت پر مبنی ہوتی ہیں) تو اس سلسلے میں حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا جو شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ عقلمند نہیں۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہے جو شخص تیرے بارے میں اچھائی کی بات کرے جو (اچھائی) تجھ میں نہیں پائی جاتی تو وہ تیرے بارے میں ایسی برائی کا ذکر بھی کرے گا جو تجھ میں نہیں اور جو شخص اپنے آپ کو تہمت کے مقام پر لے جائے وہ اپنے بارے میں بدگمانی کرنے والے کو ملامت نہ کرے اور ان کا یہ قول بھی ہے کہ جس بات کا عذر پیش کرنا پڑے اس سے بچو۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے میں نے کسی یقین کو اس یقین کے مقابلے میں جھوٹ کے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا جو لوگوں کو موت کے بارے میں ہے لیکن اس کے باوجود غفلت میں ہیں (عینی یقین بھی رکھتے ہیں اور عملاً جھوٹ بھی سمجھتے ہیں)

حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے خضاب سے جوانی اور دوائی سے صحت واپس نہیں آتی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے تو خود زمانہ ہے اگر تو ٹھیک رہا تو وہ (زمانہ) بھی ٹھیک رہے گا اور اگر تو خراب ہو گیا تو وہ بھی خراب رہے گا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ سبا (ملک) کے ایک شخص سے فرمایا تمہاری قوم کس قدر جاہل ہے کہ انہوں نے ایک عورت کو اپنا حکمران بنالیا (ملکہ بلقیس کی طرف اشارہ ہے)۔ اس نے جواب دیا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قوم زیادہ جاہل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کو رسول بنا کر بھیجا تو ان لوگوں نے کہا:

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (پ ۹: الانفال ۳۲)

ترجمہ: یا اللہ! اگر یہ تیری طرف سے حق پر ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہمیں دردناک عذاب دے۔

انہوں نے یہ کیوں نہیں کہا یا اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق پر ہیں تو ان کی طرف ہماری رہنمائی فرما۔

(یہ سن کر) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔

حدیث شریف میں ہے:

"لو کانت الدنیاتزن عنداللہ جناح بعوضۃماسقی کافرامنہاشربۃماء"[1]

ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی وزن رکھتی تو اللہ تعالیٰ اس سے کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔ ایک اور حدیث میں ہے:

"الدنیادارمن لادارلہ ومال من لامال لہ ولہایجمع من لاعقل لہ وعلیہایعادی من لاعلم لہ وعلیہایحسد من لافقہ لہ وعلیہایسعی من لایقین لہ"[2]

ترجمہ: دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں اور اس (دنیا) کے لئے وہ شخص (مال) جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہیں اس کے لئے وہ دشمنی کرتا ہے جس کے پاس علم نہیں اور اس پر وہ حسد کرتا ہے جس کے پاس سمجھ نہیں اور اس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے جس کو (آخرت کا) یقین نہیں۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر برائی کو ایک گھر میں رکھا اور اس کی چابی دنیا کی محبت کو بنایا اور تمام بھلائیوں کو ایک گھر میں رکھا اور اس کی چابی دنیا سے بے رغبتی کو بنایا۔

---

1 (سنن ابن ماجہ۔ کتاب الزہد حدیث ۴۱۱۰ جلد ۲ صفحہ ۱۳۷۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

2 (الجامع الصغیر حدیث ۴۲۶۷ جلد ۲۶۰ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے دنیا کی محبت دل سے ایمان کی مٹھاس کو نکال دیتی ہے۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے جو شخص دنیا کا مالک ہوا وہ تھک گیا جس نے اس سے محبت کی وہ اس کا غلام ہو گیا یہ تھوڑی سی کافی ہوتی ہے اور زیادہ ہو تو بے نیاز نہیں کرتی۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے طالبِ دنیا کی کوئی منزل نہیں جس کے پاس ٹھہر جائے جیسا کہ صاحبِ آخرت کی کوئی انتہا نہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے ایک دل میں دنیا وآخرت دونوں کی محبت قائم نہیں ہو سکتی جس طرح ایک ہی برتن میں پانی اور آگ جمع نہیں ہو سکتے۔

حضرت ابو حازم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے کمائے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق خرچ کرے اس نے اپنے رب سبحانہ وتعالیٰ کو راضی کر لیا۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے دنیا شیطان کی دکان ہے پس تو شیطان کی دکان سے کوئی چیز چوری نہ کر وہ تیرے پیچھے آ کر تجھے پکڑ لے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی وفات ہونے لگی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا اے نبیوں میں سے سب سے زیادہ عمر والے نبی علیک السلام! آپ علیہ السلام نے دنیا کو کیسا پایا انہوں نے فرمایا ایک ایسی حویلی کی طرح جس کے دو دروازے ہوں میں ایک میں سے داخل ہوا اور دوسرے میں سے باہر نکل گیا۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے دنیا ایک دلہن ہے اور اس سے محبت کرنے والا اس کو کنگھی کرنے والا ہے اور جو اس سے بے رغبت ہے وہ اس کے بالوں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے اس کے چہرے کو سیاہ کرتا ہے اس کے کپڑے کاٹتا اور اس کا زیور توڑ دیتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے بندے کی اپنے رب سے محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اس چیز سے نفرت کرے جس سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے پس جو شخص دعویٰ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور وہ دنیا سے بھی محبت کرے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دنیا سے نفرت کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے اے اللہ! جس نے آسمان کو اپنے حکم کے بغیر زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے ابراہیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بھی دنیا سے روک لے۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے ہم اولاد آدم علیہ السلام جنتی باشندے ہیں شیطان نے ہمیں اس سے دور کیا اور ہمیں وہاں سے فنا اور ہلاکت کے گھر کی طرف نکال دیا گیا پس کسی عقلمند کے لئے مناسب نہیں کہ وہ خوش اور مطمئن ہو جب تک وہ اس گھر کی طرف لوٹا یا نہ جائے جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔

ایک جماعت حضرت رابعہ عدویہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا کے پاس حاضر ہوئی اور انہوں نے ان کے پاس دنیا کی بہت زیادہ مذمت کی انہوں نے ان لوگوں سے فرمایا اس کے ذکر سے رک جاؤ وہ تمہارے دل میں نہ ہوتی تو تم اس کا ذکر زیادہ نہ کرتے۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے جب جسم کی بیماری مکمل ہو جائے تو اس کو کھانا اور پانی فائدہ نہیں دیتے اسی طرح جب دل میں دنیا کی محبت پیدا ہو جائے تو وعظ و نصیحت سے کامیابی نہیں ہوتی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے جو شخص تیرے دین کے سلسلے میں تجھ پر فخر کا اظہار کرے تو بھی اس سے فخر کا اظہار کر اور جو شخص تیری دنیا کے بارے میں تجھ پر فخر کرے تو تو اسے اس کے سینے میں ڈال دے (مطلب یہ کہ دین میں مقابلہ درست ہے دنیا کے بارے میں نہیں)

حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ فرماتے تھے ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک سوئے ہوئے شخص کے پاس سے گزرے اور اس سے فرمایا اے فلاں! کیا تو اٹھ کر اللہ کی عبادت نہیں کرتا؟ اس شخص نے کہا میں نے اس سے افضل عبادت کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا میں نے دنیا کو دنیاداروں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم نے سچ کہا سو جا تو نے عبادت گزاروں پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے دنیا مردار ہے پس جو شخص اس میں سے کچھ لینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کتوں کے ساتھ میل جول پر صبر کرنا چاہئے۔

حضرت مسلم النحات رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے اللہ کی قسم! مینگنیوں کی ایک تھیلی جس کے ساتھ تنور جلایا جائے میرے نزدیک سونے کی تھیلی سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

تو اے بھائی! اس بات کو جان لے اور اس پر عمل کر اگر تو نجات چاہتا ہے حدیث شریف میں ہے:

”ان بین یدیکم عقبۃ کنودا لا ینجو منھا الا المخفون“[1]

ترجمہ: بیشک تمہارے آگے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے اس سے وہی لوگ نجات حاصل کریں گے جن کا بوجھ ہلکا ہو گا۔

ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم میں زیادہ بوجھ والوں میں سے ہوں یا کم بوجھ والوں میں سے؟ نبی اکرم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم نے فرمایا کیا تیرے پاس ایک دن کا رزق ہے؟ اس نے کہا یارسول اللہ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم جی ہاں بلکہ کل کے لئے بھی ہے نبی اکرم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم نے فرمایا:

”لو کان عندک قوت بعد غد کنت من المثقلین“[2]

ترجمہ: اگر تیرے پاس پرسوں کا رزق بھی ہو گا تو تو زیادہ بوجھ والوں میں سے ہو گا۔

تو یہ شریعت کا ترازو ہے اور تو اپنے نفس کو زیادہ جانتا ہے اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

(مفتاح السلوک، جلد اول)

قناعت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً (النحل ۹۷)

صاحبِ رسالۂ قشیریہ نے تحریر فرمایا ہے کہ بہت سے اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ اس آیت میں حیاتِ طیبہ سے مُراد دنیا میں قناعت ہے۔

---

[1] (اتحاف السادۃ المتقین جلد ۱۰ صفحہ ۴۰۷ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

[2] (الترغیب والترھیب۔ جلد ۴ صفحہ ۱۳۱ مطبوعہ المصطفیٰ البابی حلبی مصر)

دوسری آیت میں فرمایا گیا:

لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا (الحج ۵۸)

اس آیت کی تفسیر میں بھی بعض نے فرمایا ہے کہ رزقِ حسن سے مراد قناعت ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا: هَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ (ص ۳۵) کی تفسیر میں بعض نے لکھا ہے کہ ملک سے مراد قناعت کا مقام ہے۔

حدیث میں ہے:

الْقَنَاعَةُ مَالٌ لَا يَنْفَدُ، وَ كَنْزٌ لَا يَفْنٰى۔[1]

یعنی قناعت نہ ختم ہونے والا مال اور خزانہ ہے۔

حضرت ابو عبد اللہ خفیف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مفقود چیز کی اُمید ترک کرنے اور موجود چیز کے ساتھ استغناء کا نام قناعت ہے۔

حضرت محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں جو رزق کسی انسان کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے اس پر راضی رہنے کا نام قناعت ہے۔

توکل

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (المائدة ۲۳)

نیز فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (المائدة ۱۱)

---

[1] (المقاصد الحسنة، ص ۳۱۵)

ان آیات میں توکل کو ایمان کے ساتھ مربوط و مشروط فرمایا گیا ہے لہٰذا توکل ایمان کے نتائج و ثمرات سے ہے۔

حدیث میں ہے:

لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُونَ عَلَى اللهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرُزِقْتُمْ كَمَا يُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُو خِمَاصًا وَتَرُوحُ بِطَانًا۔[1]

اس حدیث میں توکل کی اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ توکل اسباب سے متعارض نہیں، کیونکہ پرندہ بھی صبح سے شام تک رزق کی تلاش میں کوشش و محنت کرتا رہتا ہے اور اپنے رزق دینے والے پر اعتماد اور توکل کی برکت سے بھوکا پرندہ شام کو سیر ہو کر واپس لوٹتا ہے۔

ایک حدیث میں اُمت مسلمہ کو توکل کی یوں ترغیب دی گئی ہے:

إِذَا خَرَجَ الرَّجُلُ مِنْ بَيْتِهِ فَقَالَ بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ لاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ. قَالَ يُقَالُ حِينَئِذٍ هُدِيتَ وَكُفِيتَ وَوُقِيتَ فَتَتَنَحَّى لَهُ الشَّيَاطِينُ فَيَقُولُ لَهُ شَيْطَانٌ آخَرُ كَيْفَ لَكَ بِرَجُلٍ قَدْ هُدِىَ وَكُفِىَ وَوُقِىَ۔[2]

اس حدیث میں مذکورہ دعا کو گھر سے نکلتے وقت پڑھنے والا اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجاتا ہے اور شیطان اس سے دور بھاگ جاتا ہے، اس کی وجہ توکل علی اللہ ہے۔

توکل کی تعریف کچھ یوں ہے:

اَلتَّوَكُّلُ هُوَ الثِّقَةُ بِمَا عِنْدَ اللهِ وَالْبأسُ عَمَّا فِيْ اَيْدِى النَّاسِ۔[3]

---

[1] (جامع ترمذی، ج ۲، ص ۵۷)
[2] (سنن ابی داؤد، ج ۲، ص ۳۳۹)
[3] (التعریفات، ص ۳۱)

یعنی توکل یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس پر اعتماد ہو اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے مایوسی ہو۔

توکل ایک مرتبۂ قلبیہ ہے جس میں متوکل بندہ اپنے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور تمام احوال میں اسی پر اعتماد کرتا ہے اور اپنی کوشش اور محنت کے بعد نتیجہ مسبب الاسباب پر چھوڑ دیتا ہے۔ لہٰذا توکل اور اسباب کے درمیان کسی قسم کا تعارض نہیں کیونکہ توکل کا محل قلب ہے اور اسباب کا محل بدن ہے۔

بعض جہلاء کے نزدیک توکل ترکِ اسباب، ترکِ علاج اور ترکِ جُہد کا نام ہے (معاذ اللہ) توکل کا یہ مفہوم خلافِ کتاب و سنت ہے۔

توکل علی اللہ سے دلوں میں سکون واطمینان پیدا ہوتا ہے۔ خاص کر مصائب اور مشکلات کے وقت توکل علی اللہ بندے کے لئے آخری سہارا ثابت ہوتا ہے۔

اہلِ توکل کا وظیفہ حَسْبُنَا اللہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ میں پھینکے گئے تو آپ نے یہی وظیفہ پڑھا تھا[1] اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم بھی کثرت کے ساتھ یہی وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔

---

[1] (صحیح بخاری، ج۲، ص ۶۵۵)

مفتاح السلوک، جلد اول میں ہے:

توکل کے بیان میں

توکل

تعریف: سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: **التوکل هو الثقة بما عند الله والیأس عما فی ایدی الناس۔** یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس پر اعتماد کرنے اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے مایوسی کا نام توکل ہے۔[1]

عارف باللہ ابن عجیبہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

التوکل ثقة القلب بالله حتی لا یعتمد علی شیٔ سواہ۔

"اللہ تعالیٰ پر دل سے اعتماد کرنے اور اس کے سوا کسی چیز پر اعتماد نہ کرنے کا نام توکل ہے"[2]

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑنے اور ہر شئے میں اس کے ساتھ تعلق جوڑنے کا نام توکل ہے۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ وہ ہر شئے کو جاننے والا ہے اور تمہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ تیرے ہاتھ میں پائی جانے والی چیز سے زیادہ بہتر ہے۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ غیر سے دل کے تعلق کو توڑ کر اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد اور تمام امور میں اسی کی طرف رجوع کرنے کا نام توکل ہے۔[3]

---

[1](تعریفات السید ص ۴۸)
[2](معراج التشوف ص ۸)
[3](دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین ۲:۲)

حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: توکل، اللہ تعالیٰ کی تصدیق، اس پر اعتماد، اسی کی ذات کے ساتھ اپنے سکون واطمینان کو وابستہ کرنے اور اپنے دل سے امورِ دنیا، رزق وغیرہ کا خیال نکالنے کو کہتے ہیں۔[1]

توکل اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے اور تمام احوال میں اسی کی طرف رجوع کرنے اور اپنی قوت وطاقت سے دستبردار ہونے کا نام ہے۔

سابقہ تعریفات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ توکل قلبی مقام ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے اور وسائل واسباب کو بروئے کار لا کر کام کو سرانجام دینے میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ توکل کا محل دل ہے اور اسباب ووسائل کا محل بدن ہے۔ ایک کامل مؤمن عمل کو کیسے ترک کر سکتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کثیر آیات کریمہ میں اور رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے احادیث طیبہ میں اس کا حکم فرمایا ہے۔

ایک آدمی رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی، یارسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اپنی اونٹنی کو کھلا نہ چھوڑ دوں؟ تو آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ارشاد فرمایا:

"اعقلھا وتوکل"۔

(اس کے پاؤں کو باندھ دو اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرو)۔[2]

اسی لئے علمائے کرام رحمھم اللہ تعالیٰ نے اسباب وذرائع کو ترک کرنے اور طلبِ رزقِ حلال میں کوشش نہ کرنے کو سستی اور کاہلی شمار کیا ہے۔ جس کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسی طرح

---

[1] (الطریق الی اللہ لأبی سعید الخراز ص ۵۲)

[2] (رواہ الترمذی فی کتاب صفۃ القیامہ)

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے غلط افکار کی تصحیح اور شبہات کو دور کرنے کیلئے واضح طور پر فرمایا ہے کہ تصوف، اسلام کو حقیقی طور پر سمجھنے کا نام ہے۔

امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کا محل دِل ہے، اور ظاہری حرکت توکل کے منافی نہیں، خصوصًا جب بندہ اس بات پر یقین کرلیتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے۔ اگر کسی چیز کا حصول مشکل ہو تو یہ بھی اسی کے حکم سے ہے اور اگر کوئی چیز آسانی سے حاصل ہو جائے تو یہ بھی اسی کے فضل واحسان سے ہے۔[1]

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: بعض جہلاء یہ گمان کرتے ہیں کہ کسبِ حلال کو ترک کرنا، بیماری کا علاج نہ کرنا اور اپنے آپ کو ہلاکت کے سپرد کرنا توکل کی شرائط میں سے ہے لیکن یہ محض خطا ہے کیونکہ یہ چیز شرعًا حرام ہے۔ شرع نے توکل کی تعریف کی ہے اور اس کو اپنانے کی دعوت دی ہے تو یہ چیز حرام کے ارتکاب سے کیونکر حاصل ہو گی۔[2]

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی اس انتہائی دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ تمام اعمال میں اسباب ووسائل کو بروئے کار لائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دِلی طور پر اس پر کامل اعتماد نہ کرے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ محققین صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی ضروریات کے حصول کیلئے کوشش کرنا واجب ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں لیکن کلی طور پر اسباب پر اعتماد اور دل کا ان کی طرف متوجہ ہونا توکل کے منافی ہے کیونکہ اسباب کو بروئے کار

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۷۶)

[2] (لأربعین فی أصول الدین للغزالی رحمہ اللہ تعالیٰ ص ۲۴۶)

لانا اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کی حکمت ہے اور مؤمن کو کامل یقین ہونا چاہئے کہ یہ اسباب نفع ونقصان کا باعث نہیں ہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔[1]

توکل کی فضیلت اور اس کے آثار

توکل ایمانِ کامل کا نتیجہ اور معرفتِ الٰہی کا ثمر ہے اور جس قدر بندے کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی معرفت حاصل ہوگی اسی قدر اس کا توکل مضبوط ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر حقیقی توکل اسے ہی حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو فاعل نہ سمجھے۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا اسی کی وجہ سے سربلند ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا، اسے اپنے مولیٰ پر کامل اعتماد ہوتا ہے، اسی لئے اس کے علاوہ کسی اور سے سوال نہیں کرتا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ مرید کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ بندوں کے سامنے دامنِ طلب دراز کرے حالانکہ اس کی ہر ضرورت اس کا مولیٰ پوری کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے توکل کو ایمان کے ساتھ ملایا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱): "وَعَلَى اللهِ فَتَوَكَّلُوْا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" (مائدہ:۲۳)

اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایماندار ہو۔

(۲): "وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْن" (ابراھیم: ۱۱)

اور مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

---

[1] (دلیل الفالحین ج۲ ص۳)

جو بندہ اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل اور صدق دل سے اس کی بارگاہ میں رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی محبت سے نوازتا ہے اور اس کے تمام مصائب و تکالیف کو دور کرکے اس کے دل کو غنا اور یقین سے بھر دیتاہے اور اس کے ظاہر کو عفت اور جود و کرم سے آراستہ کر دیتاہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَ اللّٰہ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْن" (آل عمران: ۱۵۹)

بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتاہے توکل کرنے والوں سے۔

"وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ" (طلاق: ۳)

اور جو (خوش نصیب) اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتاہے تو اس کیلئے وہ کافی ہے۔

توکل دل میں سکون و اطمینان پیدا کرتاہے خصوصًا مصائب و آلام کے وقت صاحبِ توکل کا دِل انتہائی پر سکون اور مطمئن رہتاہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو آپ علیہ السلام نے یہ وظیفہ "حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیلُ (آل عمران ۱۷۳)" (اللہ ہم کو بس ہے اور کیا اچھا کارساز) پڑھا اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم نے بھی یہی وظیفہ پڑھا جب لوگوں نے کہا:

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَاناً وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (آل عمران ۱۷۳)

"بلا شبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لئے (بڑا سامان اور لشکر) سو ڈرو ان سے تو (اس دھمکی نے) بڑھا دیا ان کے جوشِ ایمان کو اور انہوں نے کہا: کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ اور وہ بہترین کار ساز ہے۔"[1]

---

[1] (اخرجہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ آل عمران)

اللہ تعالیٰ پر حقیقی توکل کرنے والا اس کی قضاء پر راضی ہوتا ہے اور اس کے حکم کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اسے اطمینان قلب کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

حضرت بشر حافی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب تم میں سے کوئی کہتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا تو وہ اکثر اوقات اپنے اس قول میں جھوٹا ہوتا ہے کیونکہ وہ اگر اللہ تعالیٰ پر حقیقی توکل کرتا تو اللہ تعالیٰ کے ہر فعل پر راضی رہتا۔[1]

رسول اللہ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم نے توکل کی تعریف فرمائی ہے اور مؤمن کی زندگی میں اس کی اہمیت اور قدر وقیمت کو بیان فرمایا ہے۔ توکل ہی مؤمن کے دل میں اطمینان وسکون پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

آپ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

"لو توکلتم علی اللّٰہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا وتروح بطانا۔"

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ پر حقیقی توکل کرتے تو وہ تمہیں رزق دیتا جس طرح پرندوں کو رزق دیتا ہے کہ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر لوٹتے ہیں۔[2]

اس حدیث پاک میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توکل اسباب کے منافی نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ پرندے توکل کر کے گھونسلوں میں بیٹھے رہتے ہیں بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ پرندے اپنے رب پر توکل واعتماد کر کے رزق کی تلاش میں نکل جاتے ہیں یعنی وہ تلاش رزق میں سستی نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے وہ غم وحزن سے مامون رہتے ہیں۔

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۷٦)

[2] (رواہ الترمذی فی کتاب الزھد، وأخرجہ الحاکم فی المستدرک ج ۴ ص ۳۱۸)

رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے امتِ اسلامیہ کو ہر حال میں توکل کرنے پر رغبت دلائی ہے خصوصاً جب انسان اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ارشاد فرمایا: جب انسان اپنے گھر سے نکلتے ہوئے "بسم اللہ توکلت علی اللہ و لا حول و لا قوۃ الا باللہ" پڑھتا ہے تو اسے ندا دی جاتی ہے کہ تو ہدایت یافتہ ہو گیا اور تجھے ہر غم سے نجات مل گئی اور تجھے ہر قسم کے شر سے محفوظ کر لیا گیا اور شیطان اس سے دور بھاگ جاتا ہے اور دوسرے شیطان سے کہتا ہے کہ تو اس شخص پر کیسے غلبہ حاصل کر سکتا ہے جو ہدایت یافتہ ہو اور جسے ہر غم سے نجات اور ہر شر سے اس کی حفاظت کر دی گئی ہو۔[1]

مراتب توکل

توکل میں لوگوں کے مختلف مراتب ہیں کیونکہ توکل بھی دوسرے مقاماتِ سلوک کی طرح ہے۔ مؤمن اپنی معرفت کے مطابق اس کے مراتب میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جیسے عارفین نے توکل کے تین مراتب بیان کئے ہیں۔

۱) اس کا سب سے ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تیرا تعلق اس طرح ہو جس طرح کہ موکل اپنے شفیق اور مہربان وکیل کے ساتھ۔

۲) اس کا درمیانی مرتبہ یہ ہے کہ تیرا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح ہو کہ جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ کہ وہ اپنے تمام امور میں اپنی ماں کی طرف رجوع کرتا ہے۔

۳) اس کا سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ تیرا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح ہو کہ جس طرح مریض کا ڈاکٹر کے ساتھ ہوتا ہے۔

---

[1] (أبو داؤد نسائی ترمذی فی کتاب الدعوات)

ان تینوں مراتب میں فرق یہ ہے کہ پہلے مرتبہ میں تہمت کا خطرہ ہوتا ہے۔ دوسرے مرتبہ میں تہمت کا خطرہ نہیں ہوتا لیکن وہ ضرورت کے وقت اپنی ماں کی طرف رجوع کرتا ہے جبکہ تیسرے مرتبہ میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں کیونکہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہر لحظہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔[1]

خلاصہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ توکل، ایمان و معرفت کے عظیم ثمرات اور اطمینان وسکون کے اہم اسباب میں سے ہے۔ صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ہی اس کے صحیح مفہوم کو سمجھا ہے اور لوگوں کو آگاہ کیا ہے کہ توکل اسباب ووسائل کو ترک کرنے کا نام نہیں، بلکہ توکل اپنی امید کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کرنے، اس کی تدبیر و حکمت پر مکمل اعتماد کرنے اور دل کو اسباب سے لا تعلق کرنے کا نام ہے کیونکہ صرف اسباب اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔

صوفیائے کرام رحمہ اللہ تعالیٰ توکل کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتے ہیں، ان کے دل اللہ تعالیٰ پر مطمئن اور اس پر اطمینان اور مکمل اعتماد کرتے ہیں، اور اسی کی بارگاہ میں متوجہ ہو کر اس سے مدد طلب کرتے ہیں کیونکہ انہیں کامل یقین ہوتا ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فاعلِ حقیقی نہیں۔

یہ تو ان کے قلوب کی کیفیت ہے مگر ان کے ابدان اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی کریم صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اتباع و پیروی میں اسباب ووسائل کو بروئے کار لانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ (مفتاح السلوک، جلد اول)

---

[1] (معراج التشوف ص ۸)

صبر

اللہ رب العزت جل جلالہ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر ١٠)

اس آیت میں صبر والوں کے لئے بغیر حساب کے اجر وجزا ملنے کی خبر دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر صبر کی اہمیت اور صابرین کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

الْمُسْلِمُ إِذَا كَانَ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الْمُسْلِمِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ۔[1]

اس حدیث میں لوگوں کی اذیتوں پر صبر کرنے والے کو صبر نہ کرنے والوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

صاحبِ کتاب التعریفات لکھتے ہیں:

اَلصَّبْرُ هُوَ تَرْكُ الشِّكْوىٰ مِنْ اَلَمِ الْبَلْوىٰ لِغَيْرِ اللهِ۔[2]

یعنی ابتلاء کے وقت لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکوہ نہ کرنے کا نام صبر ہے۔

علماء نے صبر کی بہت سی اقسام بیان فرمائی ہیں، ان تمام اقسام کا خلاصہ تین اقسام پر مشتمل ہے:

١۔ اَلصَّبْرُ عَلَى الطَّاعَاتِ۔ (عبادات پر صبر)

٢۔ اَلصَّبْرُ عَلَى الْمَصَائِبِ۔ (مصائب پر صبر)

٣۔ اَلصَّبْرُ عَنِ الْمَعَاصِيْ۔ (گناہوں سے صبر)

---

[1] (سنن الترمذی، ج ٢، ص ٧٣)

[2] (کتاب التعریفات، ص ٥٧)

غرضیکہ صبر انبیاء کی صفت ہے، اولیاء کی زینت ہے، فقراء کی خلعت ہے، حسنات کی کلید ہے، خیرات کی نوید ہے اور صابروں کی عید ہے۔

مفتاح السلوک میں ہے:

صبر کی اقسام

علمائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے صبر کی مختلف اقسام بیان کی ہیں لیکن ان تمام تعریفوں کا مرجع درج ذیل تین تعریفات ہیں۔

(۱): "الصبر علی الطاعۃ" (یعنی طاعت پر صبر کرنا)

اور اس سے مراد شریعت پر استقامت، مالی، بدنی اور قلبی عبادات پر دائمی پابندی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر دوام اختیار کرنا ہے اور اس ضمن میں پیش آنے والے مصائب ومشکلات پر صبر کرنا ہے کیونکہ جو شخص بھی رسول اللہ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہِ وَاٰلہ وَسَلَّم کا نائب ہونے کی حیثیت سے دین کی تبلیغ اور جہاد کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس کیلئے اس قسم کے مصائب ومشکلات کا پیش آنا ضروری ہے۔ حضرت لقمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یَا بُنَیَّ أَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا أَصَابَکَ" (لقمان:۱۷)

اے بیٹے نماز قائم کرو نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں قسم اٹھائی ہے کہ چار صفات کے حاملین ہی نجات پانے والے ہیں۔(۱): ایمان۔(۲): عمل صالح۔(۳): امت کو نصیحت کرنا۔(۴): صبر کرنا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۲) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" (العصر ۳)

قسم ہے زمانہ کی، یقیناً انسان خسارہ میں ہے بجز ان خوش نصیبوں کے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے نیز ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کرتے رہے۔

(۲): "الصبر عن المعاصی" (گناہوں سے صبر کرنا)

اس سے مراد نفس کی خواہشات سے مجاہدہ اور اس کی بے راہ روی کا مقابلہ اور اس کی کجی کی اصلاح اور شر اور فساد کے ان اسباب کا قلع قمع کرنا ہے جن کو شیطان مشتعل کرتا ہے۔ جب انسان اپنے نفس کا مجاہدہ کر کے اس کو پاک کر دیتا ہے اور اس کو اس کی گمراہیوں سے روک دیتا ہے تو وہ ہدایتِ کاملہ تک پہنچ جاتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔" (عنکبوت: ۶۹)

"اور جو مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کیلئے ہم ضرور دکھا دیں گے انہیں اپنے راستے۔"

اور پھر اس کا شمار مفلحین (کامیاب لوگوں) میں ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۱۴) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ ۱۵)

"بے شک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی۔"

ارشاد ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى(٤٠) فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى (نازعات: ٤١)

ترجمہ: "اور جو ڈرتا ہو گا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے اور اپنے نفس کو روکتا رہا ہو گا ہر بری خواہش سے، یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہو گا۔"

(۳): "الصبر علی المصائب" (مصیبتوں پر صبر کرنا)۔

کیونکہ یہ دنیا امتحان اور آزمائش کی جگہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مختلف قسم کے مصائب کے ذریعہ آزماتا ہے اور خصوصاً مؤمنوں کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے تاکہ مؤمن، منافق اور طیب اور خبیث کے درمیان فرق واضح ہو جائے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الٓمّٓ (١) أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (عنکبوت ٢)

"کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔"

برابر ہے کہ یہ مصائب نماز میں ہوں یا بدن میں یا اہل وعیال میں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ۔ (آل عمران ١٨٦)

"یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔"

ارشاد فرمایا:

"وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ: ١٥٦ تا ١٥٧)

اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے تمہارے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں اور خوشخبری سنایئے ان صبر کرنے والوں کو جب پہنچتی ہے انہیں مصیبت تو کہتے ہیں بے شک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، یہی وہ خوش نصیب ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔)

بے شک مؤمنِ صادق ان مصائب کو صبر وتسلیم بلکہ رضاوخوشی کے ساتھ برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ جانتاہے کہ اس کے خالق کی طرف سے نازل کردہ مصائب اس کے گناہوں کا کفارہ اور اس کی سیئات کو مٹانے کا سبب ہیں۔

جیسا کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کا ارشاد ہے کہ مؤمن کو جو تھکاوٹ، مرض، غم وحزن اور تکلیف حتیٰ کہ جو کانٹا بھی اسے چبھتاہے اللہ تعالیٰ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنادیتاہے۔ [1]

اسی طرح اسے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ مصائب ومشکلات اللہ کے نزدیک صبر کرنے والے مؤمنوں کے درجات ومنازل کو بلند کرتے ہیں، جب کہ وہ ان مصائب کو برضاوتسلیم قبول کرے۔

جیسا کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کا ارشاد ہے کہ بندہ جب کسی منزل کو اپنے عمل کے ساتھ نہیں پاسکتا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جان، مال اور اہل کی آزمائش میں مبتلا کردیتاہے اور پھر اس کو صبر کی توفیق عطا کردیتاہے حتیٰ کہ وہ اس منزل کو حاصل کرلیتاہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں لکھی ہوتی ہے۔ [2]

---

[1] (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب المرض، ومسلم عن أبی سعید وابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

[2] (رواہ أبو داؤد فی سننہ فی کتاب الجنائز باب الأمراض المکفرۃ للذنوب رقم ۳۰۷۴ عن محمد بن خالد السلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

صبر کی فضیلت اور اہمیت

صبر نصف ایمان ہے، انسان کی سعادت کا راز، آزمائش سے عافیت کا مصدر و منبع، مصائب ومشکلات سے بچنے کا ذریعہ اور مجاہدہ نفس کیلئے بہترین ہتھیار ہے۔ یہ نفس کو شرعی احکام پر استقامت اختیار کرنے پر ابھارتا ہے اور اس کو گمراہی اور فساد کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے سے بچاتا ہے اسی اہمیت اور بلند مرتبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ستر مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے، کبھی تو اللہ تعالیٰ صبر کرنے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا۔ (اعراف:۱۲۸)

"اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو۔"

اور کہیں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالصَّابِرِيْنَ فِيْ الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُوْلٰئِکَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَأُوْلٰئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ٥"(بقرہ:۱۷۷)

صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیز گار ہیں۔

اور کہیں خبر فرماتا ہے کہ وہ صابرین سے محبت کرتا ہے:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ۔ (آل عمران:۱۴۶)

"اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اور کہیں صابرین کیلئے اپنی معیت کو اختیار کرتا ہے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔ "اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اور ایک مقام پر فرماتا ہے کہ صبر کرنے والوں کو بغیر حساب کے اجر دے گا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حَسَابٍ۔(زمر:۱۰)

"صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔"

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ ہدایت دینے والے مرشدین نے یہ مقام صبر کی ہی بدولت حاصل کیا ہے: وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ أَئِمَّةً یَّھْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔(سجدہ:۲۴)

ترجمہ: اور ہم نے بنا دیا ان میں سے بعض کو پیشوا، وہ راہبری کرتے رہے ہمارے حکم سے جب تک وہ صابر رہے۔

صبر پر ایک جامع قرآنی آیت

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آل عمران ۲۰۰)

اے ایمان والو صبر کرو اور صبر میں دشمنوں سے آگے رہو اور سرحد پر اسلامی ملک کی نگہبانی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اس امید پر کہ کامیاب ہو۔

قرآن کریم کی جو آیت تلاوت کی گئی ہے اس میں ایمان والوں کو صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ کے بارے میں مشائخ صوفیہ کی تفاسیر میں آیا ہے۔

تفسیر لطائف الاشارات

چنانچہ تفسیر "لطیف الاشارات" امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تفسیر ہے، اس میں وہ تین لفظوں "اِصبروا"، صابروا اور رابطوا کی تفسیر بیان کرتے ہیں:

فرماتے ہیں:

اصبروا علی الطاعات وعن المخالفات۔

"نیکیوں کے کرنے پر (جو مشقت پیش آئے) صبر کرو اور نافرمانیوں سے بچ کر صبر کرو"۔

وصابروا فی ترک الھویٰ والشھوات وقطع المنیٰ والعلاقات۔

"اور خواہشات کے چھوڑنے میں نفس کے مقابلے میں صبر کرو اور تمناؤں اور تعلقات کو ختم کرنے میں صبر کرو۔"

ورابطوا بالاستقامۃ فی الصحبۃ فی عموم الاوقات والحالات۔

"اور عام اوقات و حالات میں صحبت (صالحین) میں استقامت پر اپنے آپ کو جمائے رکھو"۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے:

اصبروا بنفوسکم۔

"اپنے نفس کے بارے میں صبر کرو"۔

وصابروا بقلوبکم۔

"اور اپنے دلوں کے تعلق سے صبر سے مقابلہ کرو"۔

ورابطوا باسرارکم۔

"اور اپنے رازوں کے ساتھ اپنے آپ کو جمائے رکھو"۔

انہوں نے ان الفاظ میں بھی تفسیر کی:

اصبروا علی ملاحظۃ الثواب۔

"ثواب کو سامنے رکھ کر (خلاف نفس) پر صبر کرو"۔

وصابروا علی ابتغاء القربۃ۔

"اور قربت و نزدیکی کی تلاش میں صبر پر جمے رہو"۔

ورابطوا فی محل الدنو والزلفۃ وعلیٰ شھود الجمال والعزۃ۔

"اور مستعدی دکھاؤ قربت اور نزدیکی کے مقام میں اور جمال و عزت کے (حقائق) کے ملاحظہ کرنے میں"۔

تفسیر عرائس البیان

البقلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تفسیر ''عرائس البیان فی حقائق القرآن'' میں مختلف تفاسیر نقل کی ہیں۔

فرماتے ہیں:

اصبروا بمشاھدتی وصابروا بوصلتی۔

''میرے مشاہدے کے سلسلے میں صبر سے کام لو اور میرے وصال کے بارے میں صبر سے مقابلہ کرو (ہوائے نفسانی کے خلاف)''۔

یہ بھی فرمایا:

اصبروا باسرارکم وصابروا باسراری ولاتکشفوھا عندالاغیار۔

''اپنے رازوں کے ساتھ تو صبر کرو اور میرے رازوں کے ساتھ صبر پر جماؤ دکھاؤ اور انہیں غیروں کے سامنے مت کھولو''۔

ورابطوا قلوبکم بکتمانھا۔

''اور اپنے دلوں کو باندھے رکھو ان اسرار کے چھپانے کے ذریعہ''۔

انہوں نے ایک تفسیر یہ بھی لکھی ہے:

اصبروا تحت حکمی۔

''میرے احکام کی (تابعداری) میں صبر کرو''۔

وصابروا فی الحلاوۃ مع اعدائی۔

''اور میرے دشمنوں سے مقابلے میں مٹھاس محسوس کرنے میں صبر کرو''۔

ورابطوا قلوبکم بموافقتی ورضائی۔

''اور اپنے دلوں کو جمائے رکھو میری موافقت اور میری رضا پر''۔

جعفر رحمۃاللہ تعالیٰ علیہ کا قول نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا:

اصبروا عن المعاصی۔

”گناہوں سے صبر کرو“۔

وصابروا علی الطاعات۔

”اور نیکیوں کے بارے میں صبر سے کام لو“۔

ورابطوا الارواح بالمشاھدۃ۔

”اور ارواح کو باندھے رکھو مشاہدۂ حق کے سلسلے میں“۔

ایک اور قول نقل کیا کہ:

اصبروا بجوارحکم علی الطاعات۔

”اور اپنے اعضاء سے اطاعت کرنے میں صبر کرو“۔

وصابروا بقلوبکم مع اللہ۔

”اور اپنے دلوں کو صبر پر جمائے رکھو اللہ کے ساتھ“۔

ورابطوا باسرارکم بحقائق المحبۃ۔

”اور اپنے رازوں کو محبت کے حقائق کے متعلق باندھے رکھو“۔

ایک اور تفسیر یہ لکھی:

اصبروا باللہ وصابروا مع اللہ۔

”اللہ کے بارے میں صبر کو اپناؤ اور اللہ کے ساتھ صبر پر جمے رہو“۔

ورابطوا اسرارکم بالحقائق۔

”اور اپنے رازوں کو حقائق کے ساتھ باندھے رکھو“۔

لعلکم تجردون عن ھمومکم و خطراتکم۔

”تاکہ تم اپنے تفکرات اور خطروں سے خالی ہو جاؤ“۔

یہ بھی فرمایا:

الصبر للہ والمصابرة باللہ والمرابطة مع اللہ۔

”صبر کرنا اللہ کے لئے اور صبر پر جمے رہنا اللہ کے بارے میں اور تعلق بنائے رکھنا اللہ کے ساتھ“۔

تفسیر البحر المدید

تفسیر البحر المدید میں ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

اصبروا علی حفظ مراسم الشریعة۔

”مراسم شریعت کی نگہداشت پر صبر کرو“۔

وصابروا علی تحصیل انوار الطریقة۔

”اور طریقت کے انوار کے حصول پر صبر سے کام لو“۔

ورابطوا قلوبکم علی شھود اسرار الحقیقة۔

”اور حقیقت کے اسرار و رموز کے پانے کے وقت اپنے دلوں کو تھامے رکھو“۔

یہ بھی فرماتے ہیں:

اصبروا علی اداء العبادة۔

”عبادت کرتے وقت صبر کرو“۔

وصابروا علی تحقیق العبودیة۔

”اور بندگی کے ثبوت کے وقت صبر پر جمے رہو“۔

ورابطوا علی تحصیل العبودیة ای: الحریة۔

”اور عبودیت کے منصب، یعنی (نفس کی غلامی سے) آزادی کے حصول کے اوپر جمے رہو“۔

ایک عجیب تفسیر فرمائی:

اصبروا علی تحقیق مقام الاسلام۔

"اسلام کے مقام و مرتبہ کی تحقیق پر صبر کرو"۔

وصابروا علی دوام الایمان۔

"اور ایمان کے دوام و بقاء پر صبر سے جمے رہو"۔

ورابطوا علی العکوف فی مقام الاحسان۔

"اور احسان کے مقام میں ٹھہرنے میں استقامت سے کام لو"۔

ایک جگہ فرمایا:

اصبروا علی تخلیص الطاعات۔

"نیکیوں کو خالص کرنے پر صبر کرو"۔

وصابروا علی رفض الحظوظ والشھوات۔

"اور خواہشات نفسانی کو چھوڑنے میں صبر سے مقابلہ کرو"۔

ورابطوا اسرارکم علی انوار المشاھدۃ۔

"اور مشاہدے کے انوار کے سلسلے میں اپنے رازوں پر استقامت سے جمے رہو"۔

احادیثِ طیبہ میں بھی صبر کی فضیلت کو بڑے حسین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان میں یہ واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ زندگی کی مشکلات اور حوادث پر صبر کرنا مؤمن کی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑتا ہے، بلکہ نبی کریم صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسَلَّم کی تمام زندگی صبر، جہاد اور قربانی کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسَلَّم نے مصائب و مشکلات میں صبر کر کے ہمارے لئے بہترین اسوۂ حسنہ چھوڑا ہے۔

صبر احادیث کی روشنی میں

صبر جمیل کے متعلق نبی کریم صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم سے روایت ہے:

(۱) هُوَ الَّذِي لَا شَكْوَى مَعَه۔[1]

"یہ وہ صبر ہے جس کے ساتھ کوئی شکوہ نہ ہو"۔

چنانچہ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

فالصبر حبس النفس عن الجزع واللسان عن التشكي والجوارح عن لطم الخدود وشق الثياب۔[2]

"پس اپنے نفس کو مصیبت پڑنے کے وقت جزع فزع کرنے سے روکنا اور اپنی زبان کو شکوہ کرنے سے روکنا اور مصیبت کے وقت میں اپنے منہ پر طمانچے مارنے اور کپڑے پھاڑنے سے خود کو روکنا صبر کہلاتا ہے"

وہ ان تین چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ایک تو انسان آہ وبکا نہ کرے کہ زبان سے بے صبری کے الفاظ نکالے۔ دوسرا شکایت نہ کرے اور تیسرا کہ عورتیں جیسے کسی مصیبت کے وقت میں اپنے منہ پہ ہاتھ مارلیتی ہیں یا کوئی اپنے کپڑے پھاڑلیتا ہے۔ ان تمام چیزوں سے بچنے کا نام صبر ہے۔

اور اللہ رب العزت کے پیارے حبیب صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے فرمایا:

(۲) اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَا یَمْحُو اللّٰہُ بِہِ الْخَطَایَا وَیَرْفَعُ بِہِ الدَّرَجَاتِ۔

---

[1] (تفسیر القرطبی، ج۹، ص ۱۲۹)

[2] (عدۃ الصابرین، ص۷)

”کیامیں تم کو نہ بتاؤں اس چیز کے بارے میں کہ جس کے ذریعے اللہ رب العزت گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں، انہیں دھوڈالتے ہیں، اور تمہارے درجات کو بلند فرماتے ہیں؟“

قَالُوْا: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم!

”صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے حبیب صَلی اللہ تعالیٰ علیہٖ وَاٰلہٖ وَسلَّم! ضرور بتائیے۔

قَالَ: اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَی الْمَکَارِہِ۔

”فرمایا کہ سردی کے وقت میں وضو کرنا جب یہ مشکل ہوتا ہے“

ایسی تنگی کے وقت میں صبر کرنا، یہ بھی انسان کے گناہوں کو معاف کرتا ہے، درجات کو بڑھاتا ہے۔

وَکَثْرَۃُ الْخُطٰی اِلَی الْمَسَاجِدِ۔

”اور نماز باجماعت پڑھنے کے لیے مسجد کی طرف چل کر جانا“

یہ بھی انسان کے گناہوں کو مٹاتا ہے، درجات کو بڑھاتا ہے۔

وَانْتِظَارُ الصَّلَاۃِ بَعْدَ الصَّلَاۃِ۔

”اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہنا“

یہ بھی انسان کے گناہوں کو مٹاتا ہے، درجات کو بڑھاتا ہے۔

فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ۔[1]

”پس یہی چیزیں (مذکورہ اعمال کا بجالانا) اصل معنوں میں دین کی حفاظت کرنا ہے“۔

---

[1] (ترمذی، حدیث: ۵۱، ۵۲)

ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے:

(۳)اِذَا جَمَعَ اللہُ الْخَلَائِقَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ نَادٰی مُنَادٍ: اَیْنَ اَھْلُ الْفَضْلِ؟

"قیامت کا دن ہو گا، ایک آواز دینے والا اعلان کرے گا: فضل والے کہاں ہیں؟"

فَیَقُوْمُ نَاسٌ وَھُمْ یَسِیْرٌ فَیَنْطَلِقُوْنَ اِلَی الْجَنَّۃِ سِرَاعًا۔

"کچھ لوگ کھڑے ہوں گے، وہ تعداد کے اعتبار سے بہت کم ہوں گے اور تیزی سے جنت کی طرف جارہے ہوں گے"

فَتَلْقَاھُمُ الْمَلَائِکَۃُ فَیَقُوْلُوْنَ: اِنَّا رَأَیْنَا کُمْ سِرَاعًا اِلَی الْجَنَّۃِ فَمَنْ اَنْتُمْ؟

"فرشتے ان کو ملیں گے اور کہیں گے: ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم بہت تیزی سے جنت کی طرف جارہے ہو، تم کون ہو؟

فَیَقُوْلُوْنَ: نَحْنُ اَھْلُ الْفَضْلِ۔

"وہ کہیں گے: ہم فضل والے ہیں"

فَیَقُوْلُوْنَ: وَمَا فَضْلُکُمْ؟

"فرشتے پوچھیں گے: تمہاری فضیلت کی وجہ کیا ہے؟"

فَیَقُوْلُوْنَ، کُنَّا اِذَا ظُلِمْنَا صَبَرْنَا، وَإِذَا أُسِیْءَ إِلَیْنَا عَفَوْنَا وَاِذَا جُھِلَ عَلَیْنَا حَلُمْنَا، فَیُقَالُ لَھُمْ: ادْخُلُوْا الْجَنَّۃَ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِیْنَ۔

"وہ کہیں گے: جب ہم پر ظلم کیا جاتا تھا تو ہم نے صبر کیا۔ اور جب ہم سے برا کیا گیا تو ہم نے درگزر کیا۔ اور جب ہمیں جاہل کیا گیا تو ہم نے برداشت کیا۔ ان لوگوں سے کہا جائے گا: جنت میں داخل ہو جاؤ، پس بہت ہی اچھا ہے اجر عمل کرنے والوں کا"۔

ثُمَّ یُنَادِی مُنَادٍ: أَیْنَ أَهْلُ الصَّبْرِ؟

"پھر پکارنے والا پکارے گا، کہاں ہیں صبر والے؟"

فَیَتَقَدَّمُ نَاسٌ وَهُمْ یَسِیْرٌ، فَیَنْطَلِقُوْنَ إِلَی الْجَنَّةِ سِرَاعًا۔

"کچھ لوگ آگے بڑھیں گے، پس جلدی سے جنت کی طرف دوڑیں گے"

فَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِکَةُ، فَیَقُوْلُوْنَ: إِنَّا نَرَاکُمْ سِرَاعًا إِلَ الْجَنَّةِ، فَمَنْ أَنْتُمْ۔

"ان سے فرشتے ملیں گے اور کہیں گے، ہم نے تمہیں جلدی سے جنت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا، تم کون ہو؟

فَیَقُوْلُوْنَ: نَحْنُ أَهْلُ الصَّبْرِ۔

"وہ کہیں گے، ہم صبر والے ہیں"

فَیَقُوْلُوْنَ: وَمَا صَبْرُکُمْ؟

"وہ کہیں گے: تمہارا صبر کس چیز پر تھا؟"

فَیَقُوْلُوْنَ: کُنَّا نَصْبِرُ عَلٰی طَاعَةِ اللهِ وَکُنَّا نَصْبِرُ عَنْ مَعَاصِی اللهِ۔

"وہ کہیں گے: ہم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے پر صبر کرتے تھے اور ہم گناہوں سے بچنے میں بھی صبر کرتے تھے"

یعنی نفس کو گناہ سے روکنا اور نیکی پر مجبور کرنا، یہ دونوں صبر والے کام ہیں۔ تہجد میں اٹھنا کون سا آسان کام ہے، اپنے آپ کو مجبور کرنا پڑتا ہے، اس وقت اٹھنے میں مشقت ہوتی ہے۔ تو فرمایا کہ ہم یہ دونوں طرح کا صبر کرتے تھے، طاعات کی ادائیگی میں صبر اور گناہوں سے بچنے میں صبر۔

فَيُقَالُ لَهُمْ: ادْخُلُوا الْجَنَّةَ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ۔[1]

"پس ان کو یوں کہا جائے گا: جنت میں داخل ہو جاؤ، عمل کرنے والوں کے لیے کتنا اچھا اجر ہے"

صبر کی تین قسمیں

اَلصَّبْرُ بِاعْتِبَارِ الْمُتَعَلِّقِ ثَلاثَةُ اَقْسَامٍ۔

"متعلق کے اعتبار سے صبر کی تین قسمیں ہیں"۔

(۱) صَبْرٌ عَلَى الْاَوَامِرِ وَ الطَّاعَاتِ حَتّٰى يُؤَدِّيَهَا۔

"اللہ کے حکموں پر اور اس کی اطاعت میں ثابت قدم رہنا یہاں تک کہ حکموں کو پورا کر دے"

(۲) وَصَبْرٌ عَنِ الْمَنَاهِيْ وَ الْمُخَالَفَاتِ حَتّٰى لَا يَقَعَ فِيْهَا۔

"جن چیزوں سے منع فرمادیا ان سے رکے رہنے میں صبر کرنا یہاں تک کہ ان میں پڑنے سے بچا رہے"

(۳) صَبْرٌ عَلَى الْاَقْدَارِ وَ الْاَقْضِيَةِ حَتّٰى لَا يَتَسَخَّطَهَا۔

"قضاوقدر کے فیصلوں پر صبر کرنا حتی کہ دل خفا نہ ہو"

صبر کے چار شعبے

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے:

اَلصَّبْرُ اَرْبَعُ شُعَبٍ: اَلشَّوْقُ وَ الشَّفْقَةُ وَ لزَّهَادَةُ وَ التَّرَقُّبُ۔

---

[1] (المطالب العالیۃ لابن حجر، ج۱۸، ص۲۱۷، اتحاف الخیرۃ المهرۃ للبوصیری، ج۸، ص۲۰۳)

”صبر کے چار شعبے ہیں: شوق، خوف، زہد اور مراقبہ“۔

فَمَنِ اشْتَاقَ اِلَی الْجَنَّۃِ سَلاعَنِ الشَّھَوَاتِ۔

”جس بندے کو جنت کا شوق ہو تو وہ بندہ جنت حاصل کرنے کی خاطر شہوات کو چھوڑ دیتا ہے“۔

چونکہ اس کو جنت مطلوب ہوتی ہے، وہ شہوات سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

وَمَنْ اَشْفَقَ مِنَ النَّارِ رَجَعَ عَنِ الْمُحَرَّمَاتِ۔

”اور جس بندے کو آگ میں جانے سے ڈر لگتا ہے وہ گناہوں میں پڑنے سے اپنے آپ کو روک لیتا ہے“

وَمَنْ زَھَدَ فِی الدُّنْیَا تَھَاوَنَ بِالْمُصِیْبَاتِ۔

”جو بندہ زہد اختیار کر لیتا ہے تو دنیا کی مصیبتیں اس پر آسان ہو جاتی ہیں“

وَمَنِ ارْتَقَبَ الْمَوْتَ سَارَعَ فِی الْخَیْرَاتِ۔[1]

”اور جو بندہ موت کا مراقبہ کرتا ہے تو وہ بندہ پھر نیکی کے کام میں جلدی کرتا ہے“

وہ دوڑ دوڑ کر نیکی کرتا ہے، بھاگ بھاگ کر نیکی کرتا ہے، تاکہ اپنی زندگی میں کچھ اعمال کرلے۔ وہ نیکی کر کے کے تھکتا ہے اور تھک تھک کے پھر نیکی کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو پتہ ہوتا ہے کہ موت آنے والی ہے اور اسے اس سے پہلے کچھ کرنا ہے۔

(۴) عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبی صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلّم قال: وَما أُعْطِيَ أَحَدٌ مِن عَطاءٍ خَیْرٌ وَأَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ۔

---

[1] (جامع الاحادیث للسیوطی، ج ۱۳، ص ۳۹۸)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے فرمایا! کہ صبر سے بہتر اور وسیع عطیہ کسی کو نہیں دیا گیا۔[1]

(۵) عن صهيب بن سنان الرومي: عَجَبًا لأَمْرِ المُؤْمِنِ، إنّ أمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وليسَ ذاكَ لأَحَدٍ إلّا لِلْمُؤْمِنِ، إنْ أصابَتْهُ سَرّاءُ شَكَرَ، فَكانَ خَيْرًا له، وإنْ أصابَتْهُ ضَرّاءُ، صَبَرَ فَكانَ خَيْرًا له۔

حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے فرمایا! کہ مؤمن کا معاملہ بھی قابلِ تعجب ہے۔ اس کا ہر معاملہ بھلائی پر مبنی ہے اور یہ سعادت صرف مؤمن کو ہی حاصل ہے۔ اگر اسے خوشحالی کی نعمت نصیب ہو تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہے اور یہ اس کیلئے خیر ہے۔ اور اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کیلئے خیر ہے۔[2]

(۶) "عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما المؤْمِنُ الَّذي يُخالِطُ النّاسَ، ويَصبِرُ على أذاهُم، أَعظَمُ أجرًا مِنَ الَّذي لا يُخالِطُهُم، ولا يَصبِرُ على أذاهُم"۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ارشاد فرمایا: جو شخص لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اوران کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے تو اس کے لئے زیادہ اجر ہے اس سے جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہتا اور ان کی اذیتوں پر صبر نہیں کرتا۔[3]

(۷) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ایک نبی کا واقعہ بیان کیا کہ ان کی قوم نے انہیں مار مار کر لہولہان کر دیا وہ اپنے منہ سے

---

1 (بخاری، مسلم رقم ۱۰۵۳، ابو داؤد، ترمذی)

[2] (رواہ مسلم فی کتاب الزهد والرقاق رقم ۲۹۹۹)

[3] (ترمذی، کتاب صفة القیامة)

خون صاف کرتے اور فرماتے ! "اللّٰھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون" یعنی اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما دے یہ مجھے نہیں جانتے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب بھی نبی کریم صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کو یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔[1]

(۸) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اذیت پر صبر کرنے والا کوئی نہیں، کیونکہ اس کے ساتھ غیر کو شریک ٹھہرایا جاتا ہے اور اس کیلئے بیٹا بنا دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی انہیں معاف فرما دیتا ہے اور انہیں رزق دیتا ہے۔[2]

(مفتاح السلوک، جلد اول)

شُکر

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَاشْکُرُوا لِي وَلَاتَکْفُرُونِ (البقرة ۱۵۲)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور ناشکری کرنے سے روکا ہے۔

نیز فرمایا:

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَأَزِیدَنَّکُمْ (ابراھیم ۷)

اس آیت میں وعدہ فرمایا گیا ہے کہ شکر کرنے والوں کے لئے نعمتوں میں اضافہ کیا جائے گا۔

---

[1] (بخاری فی صحیح، کتاب أحادیث الأنبیاء، ومسلم فی کتاب الجهاد والسیرة)

[2] (صحیح بخاری، کتاب التوحید، وصحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین وأحکامهم)

حدیث میں ارشاد فرمایا:

الطَّاعِمُ الشَّاکِرُ مِثْلُ الصَّائِمِ الصَّابِرِ۔[1]

یعنی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق کھا کر شکر کرنے والا صبر کرنے والے روزے دار کی طرح ہے۔

سرورِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وصیت فرمائی تھی کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کریں:

اللّٰھُمَّ أَعِنِّی عَلَی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ۔[2]

حضرت علامہ ابن علان الصدیقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شکر کی تعریف میں فرمایا:

الشکر: الاعتراف بالنعمة و القيام بالخدمة، فمن كثر منه سمي شكوراً، ومن ثم قال سبحانه: وقليل من عبادي الشكور (سبأ ۱۳)۔[3]

یعنی نعمت کے اعتراف اور خدمت کے ساتھ قیام کا نام شکر ہے اگر کوئی شخص اس میں اضافہ کی توفیق پائے تو اس کو شکور کہا جاتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے شکور (شکر گزار) بندے تھوڑے ہیں۔

صاحبِ کتاب التعریفات فرماتے ہیں:

اَلشُّکْرُ الْعُرْفِیُّ ھُوَ صَرْفُ الْعَبْدِ جَمِیْعَ مَا اَنْعَمَهُ اللّٰهُ بِهٖ عَلَیْهِ مِنَ السَّمْعِ وَالْبَصَرِ وَغَیْرِھِمَا اِلٰی مَا خُلِقَ لِاَجَلِهٖ۔[4]

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۸۲۰)

[2] (سنن ابی داؤد، ج ۱، ص ۲۱۳)

[3] (دلیل الفالحین بطرق ریاض الصالحین، ج ۱، ص ۳۸۲)

[4] (کتاب التعرفیات، ص ۵۶)

یعنی اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو اسی مقصد کے لئے صرف کرنا جس کے لئے وہ نعمتیں پیدا کی گئی ہیں شکر کہلاتا ہے۔

شکر کی اجمالی طور پر تین اقسام ہیں:

۱۔شُکر اللسان (زبان سے شکر ادا کرنا)

۲۔شُکر الارکان (اعمال کے لئے شکر کرنا)

۳۔شکر الجنان (دل سے شکر کرنا کہ یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے)

شُکر اللسان

تحدیث نعمت کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ فرمایا:

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ ۱۱)

شُکر الارکان

عملِ خالص کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ فرمایا:

اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُکْرًا (سبا ۱۳)

شُکر الجنان

شہادتِ قلبی کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ فرمایا:

وَمَا بِکُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (النحل ۵۳)

(کمافی حقائق عن التصوف للشیخ عبدالقادر عیسیٰ)

مفتاح السلوک، جلد اول میں ہے:

شکر کے بیان میں

تعریف: علماء نے شکر کی کثیر تعریفات کی ہیں، ان میں سے بعض اہم کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

"الشکر ھو عکوف القلب علی محبة المنعم و الجوارح علی طاعته و جریان اللسان بذکرہ و الثناء علیه"۔

یعنی شکر یہ ہے کہ دل محسن کی محبت کی طرف متوجہ ہو اعضاء اس کی طاعت و فرمانبرداری میں مصروف ہوں اور زبان اس کے ذکر اور حمد و ثنا میں مشغول ہو۔[1]

ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"ھو فرح القلب بحصول النعمة مع صرف الجوارح فی طاعة المنعم و الاعتراف بنعمة المنعم علی وجه الخضوع"۔

یعنی محسن کی اطاعت میں اعضاء و جوارح کو مصروف کرنے کے ساتھ ساتھ حصولِ نعمت پر دل کے خوش ہونے اور عاجزی و انکساری کے طور پر محسن کی نعمت کے اعتراف کرنے کو شکر کہتے ہیں۔[2]

سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سمع و بصر وغیرہ تمام نعمتوں کا رب کی منشا کے مطابق صرف کرنے کا نام شکر ہے۔[3]

---

[1] (مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۳۶)

[2] (معراج التشوف ص ۷)

[3] (تعریفات السید ص ۷۶)

علامہ ابن علان صدیقی رحمہ اللہ تعالیٰفرماتے ہیں کہ شکر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اعتراف کرنے اور اس کی خدمت کے سر انجام دینے کو کہتے ہیں اور جس میں یہ وصف کثرت سے پائی جائے اسے شکور کہتے ہیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (سبا:١٣)

اور بہت کم ہیں میرے بندوں سے جو شکر گزار ہیں۔"[1]

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ان گنت اور بے شمار ہونا کسی پر مخفی نہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لَا تُحْصُوهَا" (ابراهيم:٣٤)

اور اگر تم گننا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔

ان نعمتوں کو تین اہم اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(١): دنیاوی نعمتیں: جیسے صحت وعافیت اور مالِ حلال وغیرہ۔

(٢): دینی نعمتیں: جیسے علم و عمل، تقویٰ اور معرفتِ الٰہی وغیرہ۔

(٣): اخروی نعمتیں: جیسے عملِ قلیل پر عطائے کثیر۔

دینی نعمتوں میں سب سے عظیم ترین نعمت جس پر شکر کرنا ضروری ہے وہ ایمان واسلام اور معرفتِ الٰہی کی نعمت ہے اور اس کا شکر یہ ہے کہ مؤمن کو چاہیئے کہ یہ عقیدہ رکھے کہ یہ تمام نعمتیں بغیر کسی واسطہ کے اللہ تعالیٰ کا خاص فضل واحسان ہے۔

---

[1] (دليل الفالحين لطرق رياض الصالحين ج ٢ ص ٥٧)

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱):"وَلٰکِنَّ اللہَ حَبَّبَ إِلَیْکُمُ الْإِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ" (حجرات:۷)

لیکن اللہ تعالیٰ نے محبوب بنا دیا ہے تمہارے نزدیک ایمان کو اور آراستہ کر دیا ہے اسے تمہارے دلوں میں۔

(۲):وَلَوْ لَا فَضْلُ اللہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنْکُمْ مِّنْ أَحَدٍ۔ (نور:۲۱)

اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تو نہ بچ سکتا تم میں سے کوئی بھی ہر گز۔

مؤمن جب اس عظیم کائنات اور اس میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں غور و فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں سے مطلع ہوتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ سے محبت کا سبب بنتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ ہم پر اپنے نیک بندوں کے واسطے سے کرتا ہے۔ جس طرح کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے ذریعے ہم پر اپنا فضل واحسان کیا ہے اور اسی طرح ہمارے والدین اور ہمارے شیوخ و مربین کے ذریعے احسان فرماتا ہے۔ پس مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ وہی منعم حقیقی ہے جس نے ہمارے لئے لوگوں کے ذریعے نیکی کے راستوں کو آسان کیا۔ یہ لوگ صرف واسطہ ہیں اور منعم حقیقی وہی ذات ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"مَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ فَمِنَ اللہِ" (نحل:۵۳)

اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔

اسی طرح مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے نعمت کا سبب بنایا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ہے:

"مَنۡ لَایَشۡکُرُ النَّاسَ لَایَشۡکُرُ اللّٰہ"

یعنی جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں کر سکتا۔ [1]

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ ساتھ والدین کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے جن کو ہماری پیدائش کا ذریعہ اور بہت سی نعمتوں کا واسطہ بنایا۔ ارشاد فرمایا:

أَنِ اشۡکُرۡ لِي وَلِوَالِدَیۡکَ إِلَيَّ الۡمَصِیرُ (لقمان:۱۴)

کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا (آخر کار) میری طرف ہی لوٹنا ہے۔

مخلوق کا شکریہ ادا کرنا آسان ہے اور جو مخلوق کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر رہا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے زیادہ قاصر رہے گا۔

شکر کی اقسام:

سابقہ تعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ شکر کی تین قسمیں ہیں۔

(۱): زبان کا شکر (۲): ارکان کا شکر (۳): دل کا شکر۔

(۱) زبان کا شکر: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا چرچا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول وَأَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ (الضحیٰ ۱۱) کی اتباع کرتے ہوئے اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

[1] (أخرجه أبو داؤد في سننه في باب شكر المعروف عن أبي هريرة رضى الله تعالىٰ عنه)

وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کے اس قول "**التحدث بنعمة اللہ شکر**" (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا چرچا کرنا شکر ہے) کی اتباع کرتے ہوئے۔[1]

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے نعمت کو چھپایا اس نے اس کی ناشکری کی اور جس نے اظہارِ نعمت کیا اور اس کو عام کیا تو اس نے اس کا شکریہ ادا کر لیا۔

اسی لئے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کی شخصیت شکر اور حمد و ثنا میں مثالی شخصیت تھی۔

اسی وجہ سے آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

"**عرض علی ربی لیجعل لی بطحاء مکة ذھبا قلت: لا یا رب ولٰکن اشبع یوما واجوع یوما وقال ثلاثا او نحو ھٰذا فاذا فعلت تضرعت الیک وذکرتک واذا شبعت شکرتک وحمدتک**"۔

یعنی: اللہ تعالیٰ نے مجھے پیشکش کی کہ وہ میرے لئے بطحاء مکہ کو سونا بنا دے گا۔ میں نے عرض کی، نہیں، اے میرے پروردگار! لیکن میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا۔ آپ صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے تین دفعہ فرمایا اور فرمایا، جب میں بھوکا ہوں گا تو تیری بارگاہ میں عجز و انکساری کروں گا اور تیرا ذکر کروں گا اور جب میں سیر ہوں گا تو تیرا شکر اور حمد و ثنا بجالاؤں گا۔[2]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی رغبت دلائی گئی ہے جس طرح حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ایک بندہ نے کہا، اے پروردگار! تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں جیسے تیرے مرتبہ و جلال اور عظیم

---

[1] (رواہ امام احمد فی مسندہ عن انعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ج ۴ ص ۳۷۵)

[2] (رواہ الترمذی فی کتاب الزھد عن أبی امامة رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

قدرت کے لائق ہے۔ ان کلمات نے فرشتوں کو مشکل میں ڈال دیا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ انہیں کیسے لکھیں۔ وہ آسمان کی طرف پرواز کر گئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی، اے پروردگار تیرے ایک بندہ نے کچھ کلمات کہے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم انہیں کیسے لکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بندہ نے کیا کہا ہے؟ حالانکہ وہ بہتر جاننے والا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ بندہ نے کہا ہے: "یا رب، لک الحمد کما ینبغی لجلال وجھک ولعظیم سلطانک" تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا، ان کلمات کو اسی طرح لکھ دو، جس طرح میرے بندہ نے کہا ہے حتیٰ کہ جب وہ مجھ سے ملے گا تو میں خود اسے ان کلمات کا اجر و ثواب عطا فرماؤں گا۔[1]

(۲): ارکان کا شکر: اس سے مراد یہ ہے کہ بندے کا عمل خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد "اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا" (سبا:۱۳) میں ارشاد فرمایا ہے کہ شکر ہی عمل ہے اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے عملی طور پر اس کی وضاحت فرما دی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم نے فرمایا:

"کان النبی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم یقوم من اللیل حتی تنفطر قدماہ فقلت لہ لم تصنع ھٰذا یا رسول اللہ! وقد غفر لک ما تقدم من ذنبک وما تاخر۔ قال، افلا اکون عبدا شکورا"۔

یعنی نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم قیام اللیل فرمایا کرتے تھے حتیٰ کہ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم کے پاؤں مبارک متورم ہو گئے میں نے عرض کی، یا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم! آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ

[1] (رواہ ابن ماجہ فی کتاب الأدب)

تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کی امت کے اگلے اور پچھلوں کے بھی گناہ معاف فرمادیئے گئے ہیں۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا، کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟[1]

(۳): دل کا شکر: اس سے مراد یہ ہے کہ تجھے یقین ہو کہ تجھ پر اور مخلوق خدا پر تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"مَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ" (نحل: ۵۳)

اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ تو اللہ کی دی ہوئی ہیں۔

یہ نعمتیں کہیں تجھے محسن و منعم سے دور نہ کر دیں۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے اس سے بچنے کا یہ طریقہ تلقین فرمایا ہے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے صبح کے وقت یہ کلمات کہے، اس نے پورے دن کا شکر ادا کر دیا:

اللھم ما اصبح لی من نعمۃ او باحد من خلقک فمنک وحدک لا شریک لک فلک الحمد و لک الشکر۔

اور جس نے یہی کلمات شام کے وقت کہے اس نے اپنی رات کا شکر ادا کر دیا۔[2]

مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی، اے اللہ! تو نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا پھر اس میں تو نے اپنی خاص روح پھونکی اور اپنے فرشتوں سے سجدہ کرایا اور اسے تمام اشیاء کا علم عطا فرمایا اور بہت سی نعمتوں سے نوازا تو اس نے

---

[1] (بخاری، کتاب الرقاق، مسلم کتاب صفات المنافقین، ترمذی ابواب الصلاۃ)

[2] (ابو داؤد فی سننہ فی باب مایقول اذا أصبح، و نسائی اللفظ لہ)

تیرا شکریہ کیسے ادا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، اس نے جان لیا کہ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو اس کا یہ جان لینا بھی شکر کرنے کے مترادف ہے۔[1]

مؤمن کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر اور اس کی حمد وثنا کی توفیق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ جس طرح کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی: اے پروردگار! میں تیرا شکریہ کیسے ادا کر سکتا ہوں حالانکہ میرا شکر ادا کرنا بھی تو تیری ایک نعمت ہے جس پر شکریہ واجب ہے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، اے داؤد! اب تو نے میرا شکریہ ادا کیا ہے۔[2]

شکر کرنے والوں کے مراتب

شکر کرنے والوں کے مراتب درج ذیل ہیں:

(۱): **عوام کا شکر:** عوام فقط نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

(۲): **خواص کا شکر:** خواص نعمتوں اور آزمائشوں وابتلاء میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنے تمام احوال میں اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے اس شخص کی تعریف کی ہے جس پر جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ اس کا سامنا اپنی زبان سے حمد وثنا اور دل سے رضا کے ساتھ کرتا ہے اور شیطان کو موقع نہیں دیتا کہ وہ دل میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کو ڈال دے۔

---

[1](مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۳۷)

[2](مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۳۷)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

"اذا مات ولد العبد قال اللہ لملائکتہ قبضتم ولد عبدی، فیقولون نعم۔ فیقول فماذا قال عبدی؟فیقولون: حمدک واسترجع، فیقول اللہ تعالی ابنوا العبدی بیتا فی الجنۃ وسموہ بیت الحمد"۔[1]

جب کسی بندے کا بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو فرماتا ہے کیا تم نے میرے بندہ کے بچے کی روح کو قبض کر لیا، فرشتے عرض کرتے ہیں، ہاں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ میرے بندے نے کیا کہا۔ وہ عرض کرتے ہیں، اس نے تیری حمد وثنا بیان کی اور کہا، إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (البقرۃ ۱۵۶) تو اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ میرے بندے کیلئے جنت میں ایک گھر تعمیر کر دو۔ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا، سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے کیلئے ان لوگوں کو بلایا جائے گا جو تنگی اور خوشحالی دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں۔[2]

(۳): خاص الخواص کا شکر: یہ لوگ منعم اور محسن کی ذات میں اس طرح فنا ہوتے ہیں کہ انہیں نعمت اور آزمائش کا خیال ہی نہیں رہتا۔ اسی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شبلی رحمۃ اللہ

[1](ترمذی، کتاب الجنائز)
[2](المستدرک ج ۱ ص ۵۰۲)

تعالیٰ علیہ نے فرمایا:"الشکر رویۃ المنعم لا رویۃ النعمۃ"یعنی شکر، منعم کا خیال کرنا ہے نہ کہ نعمت کا۔[1]

شکر کی فضیلت

شکر تمام مقامات سے اعلیٰ وارفع مقام ہے کیونکہ یہ دل، زبان اور اعضاء وجوارح کو شامل ہوتا ہے اور اسی طرح صبر، رضا، حمد اور ان کے علاوہ بہت سی بدنی اور قلبی عبادات اس میں داخل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شکر کا حکم دیا ہے اور اس کی ضد یعنی کفروناشکری سے منع کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَاشْكُرُوْالِيْ وَلَاتَكْفُرُوْنِ" (بقرہ ۱۵۲)

اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔

شکر رسل کرام علیہم السلام کی عظیم صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کو اس صفت سے متصف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيْفًا ط وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ (نحل ۱۲۰)

ترجمہ: "بلاشبہ ابراہیم (علیہ السلام) ایک مرد کامل تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے۔ یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے وہ (ہر لمحہ) شکر گزار تھے اللہ کی نعمتوں کیلئے۔"

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ۸۱)

نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو فرمایا:

إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (اسراء ۳)

ترجمہ: "بے شک وہ (نوح علیہ السلام) ایک شکر گزر بندے تھے۔"

محبوبِ خدا ہمارے آقا و مولا رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّم عبادت اور قیام اللیل میں انتہائی کوشش کرتے اور مشقت برداشت فرماتے اور بڑے خشوع و خضوع سے اور تمام دنیا سے کٹ کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور جب آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے جواب دیا، کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ سائل نے یہ گمان کیا تھا کہ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم کی عبادت طلبِ مغفرت کیلئے تھی لیکن رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّم کے جواب نے سائل کی توجہ مقامِ شکر کی طرف دلائی جو مقاماتِ عبدیت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ جس طرح رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّم خود شکر کے مقام رفیع پر فائز تھے۔ اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر مؤمنین کو اس مقام تک رسائی حاصل کرنے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے انہیں حکم فرمایا کہ ہر نماز کے بعد دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ذکر و شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا:

اوصیک یامعاذ لاتدعن فی دبر کل صلوۃ تقول: اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک۔

اے معاذ! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد اس دعا کو ترک نہ کرنا۔ اے اللہ! اپنے ذکر، شکر اور حسنِ عبادت پر میری اعانت فرما۔[1]

[1](ابوداؤد، نسائی، مستدرک: ج: ا: ص: ۴۹۹)

مقامِ شکر اعلیٰ وارفع مقام ہے اس کا حصول انتہائی مشکل اور کٹھن ہے۔ اس کے حصول کیلئے مجاہدات اور مراقبات کے ساتھ ساتھ صدق، صبر اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاکرین کی تعداد انتہائی قلیل ہے کیونکہ کریم لوگ قلیل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں شاکرین کی قلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ارشاد فرمایا:

"وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّكُوۡر" (سبا:۱۳)

ترجمہ: "بہت کم ہیں میرے بندوں سے جو شکر گزار ہیں۔"

اور اسی طرح فرمایا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان اور انعام واکرام کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِنَّ رَبَّکَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكۡثَرَهُمۡ لَا يَشۡكُرُوۡنَ ○ (نمل:۷۳)

ترجمہ: "اور بے شک آپ کا رب بہت فضل وکرم فرمانے والا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اپنی عظیم نعمتوں اور احسانات کا ذکر فرماتا ہے، اور ہمیں کائنات میں غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے، تاکہ ہم ان عظیم نعمتوں کا ادراک کر سکیں جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہیں اور جن کو شمار کرنے اور احاطہ کرنے سے انسان عاجز ہے۔ اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں جس طرح کہ اس کا شکر کرنے کا حق ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اللهُ أَخۡرَجَكُمۡ مِّنۡ م بُطُوۡنِ أُمَّهَاتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَيۡئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡأَبۡصَارَ وَالۡأَفۡئِدَةَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ (نحل:۷۸)

ترجمہ: ”اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں نکالا ہے تمہاری ماؤں کے شکموں سے اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل تاکہ تم شکر ادا کرو۔“

چالیس سال کی عمر میں انسان کا شعور پختہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب انسان اس عمر کو پہنچتا ہے اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی نعمتوں میں غور و فکر کرتا ہے اور اس کے فضل و احسان کا مشاہدہ کرتا ہے تو اپنا دامن طلب دراز کر کے اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے کہ مولا! مجھے ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”حَتّٰی إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۔ قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ“ (احقاف: ۱۵)

ترجمہ: ”حتیٰ کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے عرض کی اے میرے رب! مجھے والہانہ توفیق عطا فرما کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی ہے اور میں ایسے نیک کام کروں جن کو تو پسند فرمائے۔“

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو کر اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے والے کو عبادات کی مشقت پر صبر کرنے والے کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم نے ارشاد فرمایا:

”الطاعم الشاکر بمنزلۃ الصائم الصابر“[1]

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کھا کر شکر ادا کرنے والا صابر روزہ دار کے قائم مقام ہے۔

شکر نعمتوں کی بقاء اور دوام کا بہترین وسیلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شکر نعمتوں کو اس طرح قابو کر لیتا ہے جس طرح رسی اونٹ کے پاؤں کو۔

---

[1] (ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ)

حضرت ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

من لم یشکر النعم فقد تعرض لزوالھا ومن شکرھا فقد قیدبعقالھا۔

یعنی جس نے نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا وہ ان کے زوال سے دوچار ہوا اور جس نے ان کا شکر ادا کیا اس نے ان کو رسی کے ساتھ مقید کر لیا۔[1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنا اور نعمتوں کے مقابلے میں ناشکری اور نافرمانی کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب وعقاب کو دعوت دینا ہے۔ وہ ذات جس نے نعمتیں عطا کی ہیں وہ ان کو سلب کرنے کی بھی قدرت رکھتی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (نحل:۱۱۲)

ترجمہ: اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ ہے کہ ایک بستی تھی جو امن اور چین سے آباد تھی۔ آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق بکثرت ہر طرف سے، پس اس (کے باشندوں) نے ناشکری کی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی۔ پس چکھایا انہیں اللہ تعالیٰ نے (یہ عذاب کہ پہنا دیا انہیں) بھوک اور خوف کا لباس، ان کارستانیوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا ہے کہ اگر وہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے وہ انہیں مزید عطا فرمائے گا۔

[1] (ایقاظ الھمم فی شرح الحکم لابن عجیبہ ج ۱ ص ۱۰۰)

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ"

اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کردوں گا۔ [1]

در حقیقت شاکر کا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا اس کی اپنی ذات کیلئے فائدہ مند ہوتا ہے کیونکہ شکر کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں اور اس کے فضل واحسان، اس کی عظیم محبت، عمدہ تعریف وتوصیف کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ (نمل: ۴۰)

ترجمہ: "اور جس نے شکر کیا تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کیلئے اور جو ناشکری کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے اور کریم بھی۔"

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ مقامِ شکر پر فائز ہو کر جب اس مقام کی عظمت وشان اور فضیلت کو جانتے ہیں تو دوسرے لوگوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں اور جس کو بھی اللہ تعالیٰ کسی دنیاوی یا اخروی نعمت سے نوازتا ہے تو اس کی راہنمائی کرتے ہیں کہ وہ اس نعمت میں ہی مشغول نہ ہو جائے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ شکر کا طریقہ اختیار کرے تاکہ وہ مزید نعمتوں اور دائمی توفیق کا سبب بنے۔ حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ بھلائی کے راستوں میں سے کوئی راستہ تیرے لئے کھول دے تو اس کو لازم پکڑ لو۔ اس راستہ کی طرف دیکھنے اور اس پر فخر کرنے سے بچو بلکہ اس ذات کے شکر میں مشغول ہو جاؤ جس نے تجھے یہ توفیق عطا فرمائی ہے کیونکہ تمہارا اس راستہ کی

---

[1] (ابراھیم:۷) (طبقات الصوفیۃ للسلمی ص ۲۹۸)

طرف دیکھنا تمہیں اپنے مقام سے گرادے گا لیکن اس کے شکر میں مشغول ہونا تمہارے لئے مزید انعامات کا سبب ہو گا۔

اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا۔

اسی وجہ سے صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام احوال میں درِ شکر کو لازم پکڑا اور اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مشغول رہے اور اسی کو ہی فاعلِ مطلق، منعم حقیقی اور شکور و کریم تصور کرتے ہوئے عاجزی وانکساری سے اس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو گئے اور اس کی جناب میں دعا گو ہوئے کہ وہ ان کے دلوں کو معرفت کے نور سے منور کر دے اور ان کی زبانوں کو اپنی حمد و ثنا میں مشغول کر دے اور ان کے اعمال کو شریعت کے احکام کے تابع کر دے۔ اس میں انہوں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم اور آپ کے صحابہؓ کرام، تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے طریقہ کی پیروی کی۔

تنبیہ: شکر کی بحث کے ساتھ ہی کتاب کا تیسرا باب مکمل ہو گیا۔ جس میں وصول الی اللہ کے راہ کی نشاندہی کرنا مقصود تھی لیکن یہاں ایک بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہم نے جو مقامات اس کتاب میں ذکر کئے ہیں وہ تمام کے تمام مقامات نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی مقامات ہیں جن کی تفصیل شیخ محمد ہاشمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیان فرمائی ہے۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ یہ سو مقامات ہیں شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبد اللہ بن محمد انصاری ہروی فقیہ حنبلی مفسر قرآن صوفی باصفا متوفی (۴۸۱ھ) نے ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے جس میں آپ رحمہ اللہ تعالیٰ نے سو منازل کو ذکر کیا ہے اور آپ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بڑی عمدہ تقسیم اور وضاحت

فرمائی ہے اور راہِ حق کی خواہش رکھنے والوں کیلئے بہت مفید بتایا ہے اور اس کا نام "**منازل السائرین الی الحق عز شانه**" رکھا ہے۔[1]

(مفتاح السلوک، جلداول)

خوف

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى (۴۰) فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى (النازعات ۴۱)

اس آیت میں خوفِ خدا رکھنے والے اور نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنے والے کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے۔

نیز فرمایا:

وَ خَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران ۱۷۵)

اس آیت میں خوف کو ایمان کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللهِ۔[2]

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والے کے لئے عذابِ دوزخ سے رہائی کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قَدْ يَكُوْنُ الْخَوْفُ مِنَ اللهِ تَعَالىٰ بِمَعْرِفَةِ صِفَاتِهٖ۔

---

[1] (شرح شطرنج العارفین ص ۱۲)

[2] (جامع ترمذی، ج ۱، ص ۱۹۶)

یعنی بندے کو کبھی اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت خوف کے درجے پر پہنچا دیتی ہے۔

اسی مرتبے والوں کے حق میں فرمایا گیا:

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر ۲۸)

یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے علماء (معرفت والے) ہی اللہ تعالیٰ سے خوف رکھتے ہیں۔

ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ دل کے لئے مناسب یہی ہے کہ خوفِ خدا کے سوا کوئی اور چیز اس پر غالب نہ ہو۔

نیز فرمایا صوفیاء کو خوف ہی کی بدولت بلند مرتبے ملے ہیں۔ اگر اسے کھو دیتے ہیں تو نیچے اُتر آتے ہیں۔[1]

حضرت واسطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ خوف اور رجاء نفسوں کے لئے دو لگاموں کا کام دیتے ہیں تا کہ نفوس رعونت و تکبر اختیار نہ کریں۔

حضرت امام عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں حضرت رابعہ عدویہ (بصریہ) رحمہا اللہ تعالیٰ زیادہ رونے اور غم کرنے والی تھیں۔ جب عذابِ دوزخ کا ذکر سنتی تھیں تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو جاتی تھیں، آپ کے سجدوں کی جگہ آنسوؤں کی کثرت سے چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے تھے گویا آپ یہ سمجھتی تھیں کہ آگ صرف میرے لئے بنائی گئی ہے۔[2]

---

[1] (رسالہ قشیریہ)

[2] (حقائق عن التصوف للشیخ عبد القادر عیسیٰ)

مفتاح السلوک، جلد اول میں ہے:

خوف

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مستقبل میں کسی ناپسندیدہ چیز کی توقع کی وجہ سے دل میں جو الم وحزن اور جلن پیدا ہوتی ہے اسے "خوف" کہتے ہیں اور یہ خوف کبھی تو گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی معرفت سے جو خوف کا سبب بنتی ہیں۔خوف کی یہ قسم اکمل واتم ہے کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے تو یقیناً اس میں خوف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (فاطر:۲۸)

"اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ صرف اسی سے ڈریں۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ (بقرہ:۴۰)

"اور صرف مجھی سے ڈرا کرو۔"

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی مدح فرمائی ہے اور انہیں خوف کے ساتھ متصف فرمایا ہے۔ارشاد فرمایا:

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ۔ (نحل:۵۰) ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے۔

---

[1] (الأربعین فی أصول الدین ص ۱۹۶)

وَخَافُوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْن۔ (آل عمران: ۱۷۵) مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم مؤمن ہو۔

اور اس شخص کو دو جنتیں عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے یعنی دنیا میں علوم و معارف اور آخرت میں ابدی نعمتوں کی جنت۔

ارشاد فرمایا:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَان۔ (رحمان: ۴۶)

اور جو ڈرتا ہے اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے تو اس کو دو باغ ملیں گے۔

اور اسی طرح اس کیلئے جنت الماویٰ کا وعدہ بھی فرمایا جیسا کہ یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى (نازعات: ۴۰)

"اور جو ڈرتا ہو گا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے اور (اپنے) نفس کو روکتا رہا ہو گا (ہر بری) خواہش سے یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہو گا۔"

شیخ احمد زروق فرماتے ہیں کہ خشیتِ الٰہی کا وجود عمل پر برانگیختہ کرتا ہے اور خشیتِ الٰہی سے مراد دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و وقار کا پیدا ہونا ہے اور خدا کے انتقام سے دل کے سہم جانے کو خوف کہتے ہیں۔[1]

خوف اس شخص میں پیدا ہوتا ہے جو آئندہ پیش آنے والے خطرات کو بھانپ لیتا ہے۔ پھر احکامِ الٰہیہ کی پابندی کرتا ہے اور کسی حالت میں بھی فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کرتا بلکہ اس کیلئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اس وقت خوف ظاہری جسم سے روح کی طرف منتقل ہو

---

[1] (قواعد التصوف ص ۴۷)

جاتا ہے۔ اس حالت میں عارف پر آہ وبکا کی جو کیفیت ہوتی ہے۔ اس کا ادراک اہلِ صفا ہی کر سکتے ہیں۔

شیخ عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا کو یہ مقام حاصل تھا کیونکہ ان پر اکثر آہ وبکا اور حزن کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا جب بھی نارِ جہنم کا ذکر سنتیں تو پہروں آپ پر غشی طاری رہتی۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا کی سجدہ گاہ آنسوؤں کی کثرت کی وجہ سے چھوٹے سے حوض کی شکل اختیار کر گئی تھی اور ایسے معلوم ہوتا تھا کہ نارِ جہنم کی تخلیق صرف آپ کیلئے ہے، در حقیقت آپ پر یہ کیفیت خشیتِ الٰہی کی وجہ سے طاری رہتی اور آپ کو یہ پختہ یقین تھا کہ نارِ جہنم کے علاوہ ہر چیز آسان ہے اور اللہ تعالیٰ سے بُعد اور دوری کے علاوہ ہر مصیبت سہل ہے۔

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محب کو جامِ محبت اسی وقت پلایا جاتا ہے۔ جب اس کا دِل خوف کی بھٹی سے گزر کر پختہ ہو جائے اور جس کو یہ کیفیت حاصل نہ ہو وہ آہ وبکا کی قدر وقیمت نہیں جان سکتا۔ جس نے جمال یوسف علیہ السلام کا مشاہدہ نہ کیا ہو، وہ یعقوب علیہ السلام کے غم وحزن کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

بزرگ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خائف وہ نہیں جو رونے کے بعد اپنے آنسوؤں کو صاف کر لے بلکہ حقیقت میں خائف وہ ہے جو ہر اس چیز کو ترک کر دے جس سے عذاب کا خوف ہو۔

حضرت ابو سلیمان درانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

ما فارق الخوف قلبا الا خرب۔

خوف جونہی دل سے جدا ہو تو وہ برباد ہو جاتا ہے۔[1]

تمام خائفین کا ایک ہی مرتبہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خوف کے مختلف مراتب پر فائز ہوتے ہیں۔ ابن عجیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے تین مراتب بیان فرماتے ہیں:

(۱) عوام کا خوف: جو عقاب و عذاب اور ثواب سے محرومی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

(۲) خواص کا خوف: یہ عتابِ الٰہی اور قرب کی سعادت سے محروم ہونے سے ڈرتے ہیں۔

(۳): خاص لاخواص کا خوف: یہ صرف اس لئے ڈرتے ہیں کہ سوءِ ادب کی وجہ سے دیدار کی لذتوں سے محروم نہ ہو جائیں۔[2]

(مفتاح السلوک، جلد اول)

رجاء

قرآن حکیم میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أُولَئِکَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللهِ (البقرة ۲۱۸)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں اور اپنی راہ میں ہجرت اور جہاد کرنے والوں کو اپنی رحمت کا اُمیدوار قرار دیا ہے۔

نیز فرمایا:

لَاتَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللهِ (الزمر ۵۳)

یعنی میری رحمت سے نااُمید مت بنو۔

---

[1] (رسالہ قشیریہ ص ٦٠)

[2] (معراج التشوف إلی حقائق التصوف ص ٦)

حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوا لَذَهَبَ اللهُ بِكُمْ، وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذْنِبُونَ، فَيَسْتَغْفِرُونَ اللهَ فَيَغْفِرُ لَهُمْ۔ [1]

اس حدیث میں گناہ گاروں کو توبہ کرنے کی برکت سے مغفرت کی اُمید دلائی گئی ہے۔

رجاء کے بارے میں صوفیاء کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے کہا اللہ تعالیٰ سے اس کے کرم کی اُمید کا نام رجاء ہے۔ بعض نے کہا اللہ تعالیٰ کے جلال کو جمال کی آنکھوں سے دیکھنے کا نام رجاء ہے۔ بعض نے کہا اللہ تعالیٰ کی مہربانی پر خوشی کا اظہار کرنا رجاء ہے، بعض نے کہا جس نے اپنے نفس کو صرف رجاء پر رکھا اس نے عمل چھوڑ دیا اور جس نے اپنے نفس کو صرف خوف خدا پر رکھا وہ مایوس ہو گیا۔ لہٰذا انسان کو خوف ورجاء دونوں رکھنے چاہئیں کیونکہ ایمان خوف اور اُمید کی درمیانی (ملی جلی) کیفیت کا نام ہے۔

مفتاح السلوک، جلد اول میں ہے:

رجاء

شیخ احمد ذروق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان پر اعتماد کرنے سے دل میں جو سکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسے رجاء کہتے ہیں لیکن رجاء کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضروری ہے کیونکہ عمل کے بغیر رجاء خود فریبی ہے۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے ہمیں رجاء کی ترغیب دی ہے اور مایوسی سے روکا ہے۔

---

[1] (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۵۵)

[2] قواعدِ تصوف ص ۴۷۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ يَاعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْم (زمر:۵۳)

"آپ فرمایئے اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے یقیناً اللہ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو بلا شبہ وہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے"۔

اور اپنی وسعت رحمت کی بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْئٍ۔ (اعراف:١٥٦)

میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر۔

اور اس کی بارگاہ سے رحمت کی امید رکھنے والوں کے بارے میں فرمایا:

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ أُوْلٰئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللهِ (بقره٢١٨)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں تو یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی۔

احادیث طیبہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت کا بیان ہوا ہے:

(١) **عن ابی ہریرة رضی اللہ تعالی عنه قال: قال رسول الله صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَاَصحَابِهٖ وَسَلَّم والذی نفسی بیده لو لم تذنبوا لذهب الله بکم وجاء بقوم یذنبون فیستغفرون الله تعالی فیغفر لهم۔**[1]

---

[1] (أخرجه مسلم فی کتاب التوبة)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہوں کا ارتکاب نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کرکے ایک نئی قوم لے آئے جو گناہ کریں اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں اور اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمادے۔“

(۲) عن ابی موسی الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنه عن النبی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم قال یجیئنی یوم القیامة ناس من المسلمین بذنوب امثال الجبال یغفرھا اللہ لھم ویضعھاعلی الیھودوالنصاری۔ [1]

ترجمہ: ”حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن بعض مسلمان پہاڑوں کی مثل گناہ لے کر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کردے گا اور ان گناہوں کو یہود و نصاری پر رکھ دے گا۔“

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندہ کو اپنے انتہائی قریب کرے گا اور اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا، اسے کہے گا: ”تم اپنے فلاں فلاں گناہ کو جانتے ہو؟“ بندہ کہے گا: ”ہاں، یارب!“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”میں نے دنیا میں تیرے گناہوں کی پردہ پوشی کی اور آج تیرے ان گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔“ پھر اس کو نیکیوں کا نامۂ اعمال عطا کر دیا جائے گا۔ [2]

---

[1] (أخرجه مسلم فی کتاب التوبة)

[2] (أخرجه مسلم فی کتاب التوبة، والبخاری فی صحیحه فی کتاب الرقاق۔ کنفه: ستره ورحمته)

رجاء اور تمنا میں بہت فرق ہے کیونکہ راجی رضائے الٰہی کا خواہشمند ہونے کے ساتھ ساتھ عبادات اور طاعات کو ترک نہیں کرتا جبکہ تمنا کرنے والا عبادات اور مجاہدات کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا منتظر ہوتا ہے۔

اسی کے بارے میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ جس نے اپنے نفس کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ سے تمنا اور آرزو پر اکتفا کیا وہ عاجز ہے۔[1]

کیونکہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے رجاء کا طالب ہو اسے چاہئے کہ اخلاص کے ساتھ محنت اور کوشش کرے یہاں تک کہ وہ اپنے مقصود کو پالے۔

اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا ہے:

فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّهٖۤ أَحَدًا(کھف ۱۱۰)

ترجمہ: "پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔"

جب بندہ عروج شباب میں گناہوں میں مستغرق، نفسانی خواہشات میں گھرا ہوا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ جانب خوف کو رجاء پر غالب رکھے لیکن بڑھاپے میں جانب رجاء ہی غالب ہونے چاہئے کیونکہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں بندہ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہوں جیسا کہ وہ میرے متعلق گمان رکھتا ہے۔[2]

---

[1] (رواہ الترمذی فی کتاب صفة القیامة وقال: حدیث حسن، وابن ماجه فی کتاب الزھد۔ کلاھما عن شداد بن أوس رضی اللہ تعالیٰ عنه)

[2] (بخاری کتاب التوحید)

اس طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم سے روایت کرتے ہیں:

لَا یَمُوتَنَّ أَحَدُکُمْ إِلَّا وَھُوَ یُحْسِنُ بِاللہِ الظَّنَّ۔[1]

ترجمہ: ”آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہو۔“

سالک جب قربِ الٰہی کے حصول کیلئے راہِ سلوک کی منازل طے کر رہا ہو۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ خوف ورجاء دونوں کو مدِ نظر رکھے نہ خوف، رجاء پر غالب ہو کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائے اور نہ ہی رجاء، خوف پر غالب ہو کہ وہ معاصی اور گناہوں میں مستغرق ہو جائے بلکہ اسے چاہئے کہ ان دونوں کے درمیان محوِ پرواز رہے، حتیٰ کہ قربِ الٰہی کی سعادتوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ اسی کیفیت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا ہے:

تَتَجَافٰی جُنُوبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُونَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا۔ (السجدہ: ١٦)

ترجمہ: ”دور رہتے ہیں ان کے پہلو (اپنے) بستروں سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے“۔

یعنی وہ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں جہنم کے خوف سے اور جنت کے طمع میں اس سے دوری کے خوف سے اور اس کے قرب کی خواہش میں اس کی بے رخی کے خوف سے اور اس کی رجا کی خواہش میں۔

[1] (صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، باب الأمر بحسن الظن باللہ تعالیٰ)

اہلِ رجاء کے مختلف مراتب ہیں جس طرح کہ ابن عجیبہ رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں: عوام کی رجاء یہ ہے کہ وہ حصولِ ثواب کے ساتھ حسنِ خاتمہ کے امیدوار ہوتے ہیں اور خواص، رضاءِ الٰہی اور اس کے قرب کے طالب ہوتے ہیں اور خاص الخواص مشاہدہ حق میں تمکین اور اسرارِ خداوندی میں ترقی کے طلبگار ہوتے ہیں۔[1]

(مفتاح السلوک، جلد اول)

فقر

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (البقرة ٢٧٣)

اس آیت میں فقراء کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ فقیر وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں رُکے ہوئے ہیں۔

حدیث پاک میں فرمایا گیا:

الْفَقْرُ فخري وَالْفَقْرُ مِنّيِ۔[2]

یعنی فقر میرا فخر ہے اور فقر مجھ سے ہے۔

نیز فرمایا فقراء مال داروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔[3]

بشر بن حارث رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں سب سے افضل مقام یہ ہے کہ انسان قبر تک فقر پر صبر کرنے کا عزم بالجزم کرلے۔

---

[1] (معراج التشوف ص ٦)

[2] (الاسرار المرفوعه، ص ١٦٦، المقاصد الحسنه، ص ٣٠٧)

[3] (جامع ترمذی، ج ٢، ص ٥٨)

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بندے پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی علامت یہ ہے کہ بندہ فقر سے ڈرتا ہو۔

عبد اللہ بن خفیف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک نہ سمجھنا اور کسی بھی صفت کو اپنی طرف منسوب نہ کرنا فقر ہے۔

ابو بکر مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا فقیر وہ ہے جو نہ کسی کا مالک ہو اور نہ مالک ہونے کی خواہش کرے۔[1]

غرضیکہ صوفیاء کرام کے نزدیک اپنے وجودِ اضافی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے فنا کر کے مخلوق سے بے نیاز ہو جانے کا نام فقر ہے۔

اسی وجہ سے فرمایا گیا ہے:

اَلْفَقْرُ سَوَادُالْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ۔[2]

یعنی دونوں عالم میں سواد الوجہ (روسیاہ) ہو جانا فقر ہے۔

سواد الوجہ سے مراد دونوں عالم کے علائق سے پاک ہو کر ذاتِ احدیتِ صرفہ میں محو اور فنا ہو جانا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول اَلْفَقِیْرُ لَا یَفْتَقِرُ اِلیٰ نَفْسِہٖ وَ لَا اِلیٰ غَیْرِہٖ۔ (فقیر نہ اپنا محتاج ہوتا ہے نہ غیر کا) میں اسی طرف اشارہ ہے۔

فقر سے مراد وہ فقر ہے جس کو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے اپنا فخر قرار دیا ہے نہ کہ فقرِ مُکِبّ (ذلیل کرنے والا) جس سے پناہ مانگی گئی ہے۔

---

[1] (رسالہ قشیریہ)

[2] (مکتوباتِ سعیدیہ)

رضا

قرآن عظیم میں ہے:

وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ (التوبة ۷۲)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کو تمام نعمتوں سے بڑی نعمت قرار دیا ہے۔

نیز فرمایا:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (التوبة ۱۰۰)

اس آیت میں رضا کو متبادل قرار دیا گیا ہے کیونکہ حقیقی رضا کا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے راضی ہو جائے اور بندہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جائے تاکہ دونوں رضائیں متلازم اور مترابط ہو جائیں اور بندہ اللہ سے کبھی راضی نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اس سے راضی نہ ہو۔

حدیث میں ہے:

ذَاقَ طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولًا۔[1]

اس حدیث میں اہلِ رضا کے لئے ایمان کی حلاوت (مٹھاس) ثابت کی گئی ہے۔ کیونکہ جو شخص لذتِ ایمان سے محروم رہ جاتا ہے اس کے لئے دُنیا و آخرت میں قلق و اضطراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مرتبۂ رضا حاصل کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے اور درج ذیل دعا کے تکرار کا حکم فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۴۷)

چنانچہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَالَ إِذَا أَصْبَحَ وَإِذَا أَمْسَى رَضِينَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِالإِسْلاَمِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولاً إِلاَّ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰہِ أَنْ يُرْضِيَهُ۔[1]

یہ دعا پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ کی رضا کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا: ”سلام وصلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ بھلائی ہمہ تن رضا میں ہے، اگر تم اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی رہ سکو تو بہتر ہے ورنہ صبر اختیار کرو“۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: بندے کے اپنے اختیار کا اُٹھ جانا رضا ہے۔ حضرت ابو تراب نخشی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں دُنیا کی قدر و منزلت ہو وہ رضا کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔

حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بندہ اس وقت تک راضی برضا کہلانے کا حق دار نہیں ہو سکتا جب تک وہ مصیبت میں اسی طرح خوش نہ ہو جس طرح آرام میں خوش تھا۔[2]

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۴۰ تا ۱۵۴)

مفتاح السلوک، جلد دوم میں ہے:

رضا کے بیان میں

تعریف: علمائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے رضا کی متعدد تعریفات کی ہیں۔ ہر ایک نے اپنے مشرب اور مقام کے مطابق تعریف کی ہے۔ ان میں سب سے اہم تعریف سید میر جرجانی رحمۃ اللہ

---

[1] (سنن ابی داؤد، ج ۲، ص ۳۳۶)

[2] (رسالہ قشیریہ)

تعالیٰ علیہ کی ہے۔ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "الرضا سرور القلب بمر القضاء" یعنی قضاء کی تلخی میں دل کا سرور رضا کہلاتا ہے۔[1]

ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مسکراتے ہوئے مصائب کا استقبال کرنا رضا ہے۔ یا نزول قضا کے وقت دل کے سرور کو رضا کہتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی قضاو قدر میں ترکِ اختیار کو رضا کا نام دیا جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہونے والے امور پر انکار نہ کرنے اور ان پر شرح صدر کا مظاہرہ کرنے کو رضا کہتے ہیں۔[2]

علامہ برکوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے ملنے یا نہ ملنے دونوں حالتوں میں دل کے خوش رہنے کو رضا کہتے ہیں۔[3]

حضرت ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ دل کا ان اختیارات کی طرف دیکھنا جو اللہ تعالیٰ نے بندہ کو عطا فرمائے ہیں یعنی کسی امر پر ناراضگی کا اظہار نہ کرنا رضا ہے۔ شیخ محاسبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ احکامِ الٰہیہ کے اجراء کے وقت سکون قلب کا نام رضا ہے۔[4]

رضا ایک قلبی مقام ہے جب مؤمن اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو مصائب اور حادثات کا استقبال ایمان راسخ، سکونِ قلب اور اطمینانِ نفس کے ساتھ کرتا ہے بلکہ کبھی تو اس سے بھی ارفع و اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے یعنی وہ قضا کی تلخی میں فرحت و سرور محسوس کرتا ہے۔ در حقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس سے سچی محبت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

---

[1] (تعریفات السید، ص۵۷)

[2] (معراج التشوف، ص۸)

[3] (شرح الطریقة المحمدیة ج۲ ص۱۰۵)

[4] (رسالہ قشیریہ ص۸۹)

رضا کی فضیلت

رضا، صبر سے اعلیٰ مقام اور ارفع مرتبہ ہے کیونکہ رضا روحانی طور پر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کا نام ہے۔ اس سے عارف اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ کائنات میں ہر اس چیز سے محبت کرنے لگتا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہو حتیٰ کہ مصائب وآلام کو بھی رحمت اور خیر شمار کرتا ہے۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان سمجھ کر رضا کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نزع کے عالم میں فرماتے تھے:

”وافرحتاہ! غدا القی الاحبہ محمدا وصحبہ!“۔

یعنی کتنی خوشی کا موقع ہے کل محبوبوں یعنی محمد صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم اور آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ملاقات ہوگی![1]

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونے والا تمام لوگوں سے غنی ہوتا ہے کیونکہ اسے لوگوں سے زیادہ سرور اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح غم وحزن اور پریشانی سے بھی بہت دور ہوتا ہے کیونکہ غنا صرف کثرتِ مال سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایمان ورضا کے ساتھ دل کے غنی ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

ارشادِ نبوی صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم ہے:

اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ، وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ، وَأَحْسِنْ إِلَى جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا، وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا، وَلَا تُكْثِرِ الضَّحِكَ، فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحِكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ۔

---

[1] (السیرۃ النبویۃ لأحمد زینی دحلان ص ۲۴۲)

محرمات سے بچو، تمام لوگوں سے زیادہ عابد ہو جاؤ گے، اللہ کی تقسیم پر راضی رہو، تمام لوگوں سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو، تو حقیقی مؤمن بن جاؤ گے، لوگوں کیلئے وہ چیز پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو، تم حقیقی مسلمان بن جاؤ گے، زیادہ ہنسنے سے بچو، کیونکہ یہ دل کو مردہ کر دیتا ہے۔[1]

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے بڑے خوبصورت انداز میں واضح فرمایا کہ رضا مؤمن کی دنیوی واخروی سعادت کا بہترین سبب ہے، جیسے عدمِ رضا دنیا وآخرت میں بد بختی کا سبب ہے۔ آپ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ابن آدم کی سعادت اسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی رہے اور اس کی بد بختی کی علامت یہ ہے کہ وہ اس چیز کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے پسند کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضا پر ناراضگی کا اظہار کرے۔[2]

رضا کی نعمت کی برکت سے ہی عارفین کے دل مطمئن اور پر سکون ہوتے ہیں اور رضا ہی اس مایوسی اور قنوط کی کیفیت کو ختم کرنے کا سبب ہے دنیاوی زندگی کی لذات کے عدمِ حصول میں غور وفکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے جو کہ انسان کیلئے اضطراب وپریشانی کا باعث بنتی ہے۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دلوں میں رضا کی اہمیت کو اجاگر کیا کرتے تھے۔ آپ صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا! جس نے صبح شام یہ کہا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور اسلام کو اپنا دین اور محمد صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کو اپنا رسول تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر واجب ہے کہ وہ اس کو راضی کر دے۔[3]

---

[1] (ترمذی، کتاب الزھد رقم الحدیث ۲۳۰۵)

[2] (ترمذی، کتاب القدر)

[3] (ابو داؤد، باب مایقول اذا أصبح، ترمذی کتاب الدعوات)

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس ورد کو پڑھنے پر بڑے حریص تھے اس طرح وہ اپنے دل میں پوشیدہ تسلیم ورضا کے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

آج کل بہت سے لوگ اپنی زبان سے اس کلمہ کا ورد تو کرتے ہیں لیکن ان کے دل مطمئن نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کے گرانقدر معانی اور اس کے ارفع واعلیٰ مقاصد کو سمجھتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ مصائب ومشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان پر غم وحزن کے گہرے بادل سایہ فگن ہو جاتے ہیں لیکن صرف زبان کے ساتھ ورد ان کو فائدہ نہیں دیتا، جب تک اس کی صدا دل کی گہرائیوں سے نہ نکلے، کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب تسلیم کر لیتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی مخلوق سے متعلقہ تمام امور پر راضی ہو جائے۔ یعنی اسے ہر حال میں راضی ہونا چاہئے خواہ اللہ تعالیٰ اسے عطا کرے یا محروم۔ اسے بلند کرے یا پست۔ اسے نفع دے یا نقصان۔ اسے وصال اور قربت سے نوازے یا اپنے در سے دور کر دے۔ اسی طرح اسلام کو اپنا دین تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات لازم ہے کہ وہ اس کے اوامر کو بجا لائے اور نواہی سے اجتناب کرے اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے، اگرچہ اسے اپنے نفس کی خواہش اور اپنی خاص مصلحت کی مخالفت کرنا پڑے اور جو شخص محمد صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کو اپنا نبی اور رسول تسلیم کر لیتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم کی شخصیت کو اپنے لئے بہترین نمونہ قرار دے۔ آپ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کے آثار کی پیروی کرے اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم کی سنت سے اپنے آپ کو آراستہ کرے اور اپنی نفسانی خواہش سے مجاہدہ کرے تاکہ وہ اسلامی احکام کے تابع ہو جائے اور اسے چاہئے کہ اس کے نزدیک رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کی ذات، والد، بیٹے، اپنی جان اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو۔

جیسا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

”لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین“۔

تم میں سے کوئی بھی کامل مؤمن نہیں سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، بیٹے اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہو جاؤں۔[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالٰی عنہ نے جب یہ ارشاد سنا تو نبی کریم صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کی بارگاہ میں عرض کی، ”لانت یا رسول اللہ احب الی من کل شئ الا من نفسی“ (یا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم آپ میرے نزدیک میرے ذات کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں) تو آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: نہیں اے عمر، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے حتیٰ کہ میں تیرے نزدیک تیری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے عرض کی، ہاں۔ اب مجھے یہ کیفیت حاصل ہو گئی ہے۔ قسم بخدا! آپ صَلی اللہ تعالٰی علیہ وَاٰلہ وَسلَّم میرے نزدیک میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا، اے عمر! اب ٹھیک ہے۔[2]

جس نے اللہ تعالٰی کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور حضرت محمد صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم کو اپنا نبی اور رسول تسلیم کر لیا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا اور یقین کی حلاوت پالی اور ابدی سعادت سے سرفراز ہوا۔

---

[1] (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب الایمان باب حب الرسول من الایمان)

[2] (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب الایمان والنذور باب کیف کانت یمین النبی صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم ج۸ ص ۱۶۰، ورواہ أحمد فی المسند ج۴ ص ۲۳۳)

آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

ذَاقَ طَعْمَ الإِيمانِ مَنْ رَضِيَ بِاللهِ رَبًّا، وبِالإِسلامِ دِينًا وبِمحمَّدٍ رَسُولاً۔

اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اسلام کو اپنا دین اور محمد صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّم کو اپنا رسول ماننے پر راضی ہوا۔[1]

مگر وہ شخص جو ایمان کی لذت اور رضا کی نعمت سے محروم ہو، وہ ہمیشہ اضطراب وپریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ خصوصًا جب وہ کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو دنیا اس کیلئے تاریک اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود اس پر تنگ ہو جاتی ہے۔ شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ خودکشی کے علاوہ ان غموں سے چھٹکارے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اسی وجہ سے خودکشی کے حادثات واقع ہوتے ہیں اور دن بدن ان کی نسبت بڑھتی جارہی ہے، خصوصاً غیر مسلم ممالک اور بے دین معاشرے میں جہاں اسلام کی روشنی نہیں پہنچ سکی، خودکشی کی شرح بہت زیادہ ہے۔

اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى (طٰہٰ: ۱۲۴)

ترجمہ: "اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کیلئے زندگی (کے جامہ) کو تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے۔"

رضا کے بارے میں کچھ شبہات اور ان کے جوابات

بعض جہلاء نے مقامِ رضا کے بارے میں کچھ شبہات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب ان کی جہالت اور اس ارفع مقام تک ان کی عدم رسائی ہے۔ اور انسان ہمیشہ سے ہی اس چیز کا دشمن ہوتا ہے

---

[1] (رواہ مسلم والترمذی فی کتاب الایمان)

جس کو نہیں جانتا۔ یاان شبہات کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے کچھ جھوٹے دعویدار دیکھے اور ان کے غلط طریقہ کار کو تصوف سمجھ لیا۔ بجائے اس کے کہ وہ ان جھوٹے دعویداروں اور حقیقی صوفیائے کرام کے درمیان جو ایمان واسلام کے ساتھ ساتھ احسان کے مرتبہ پر فائز تھے، فرق کرتے۔

(ا): بعض لوگوں نے تو سرے سے ہی رضا کا انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خواہشاتِ نفس کے مخالف رضا کو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس چیز کو صبر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ انسان مصائب وآلام کو محسوس نہ کرے۔

جواب: مقامِ رضا پر فائز فطری طور پر مصائب وآلام کو ضرور محسوس کرتا ہے لیکن اپنے ایمان کامل اور عقلِ سلیم کی وجہ سے قضا پر راضی رہتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس پر عظیم اجر وثواب کا امیدوار رہتا ہے۔ اس لئے وہ نہ تو کوئی اعتراض کرتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی اکتاہٹ کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت ابو علی دقاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لیس الرضا ان لا تحس بالبلاء انما الرضا لا تعترض علی الحکم و القضا۔

رضا یہ نہیں ہے کہ تو مصیبت کو محسوس نہ کرے بلکہ رضا یہ ہے کہ تو حکمِ الٰہی اور اس کی قضا پر اعتراض نہ کرے۔[1]

---

[1](رسالہ قشیریہ ص ۸۹)

اس کو آپ اس مثال کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں کہ مریض انجکشن لگوانے کی تکلیف کو تو محسوس کرتا ہے لیکن حصولِ شفا کیلیۓ وہ اس تکلیف پر راضی رہتا ہے بلکہ اس شخص پر بہت خوش ہوتا ہے جو اسے دوائی دیتا ہے اگرچہ وہ دوائی بہت کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بھی میں کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہوں اس میں مجھ پر چار نوازشات ہوتی ہیں:

(۱): کہ یہ آزمائش میرے دین کے متعلق نہ تھی۔

(۲): میں اس میں رضا سے محروم نہ رہا۔

(۳): یہ آزمائش اتنی بڑی نہ تھی۔

(۴): میں اس پر اجر و ثواب کا امیدوار ہوں۔[1]

دوسری وجہ یہ ہے کہ مقامِ رضا پر فائز فطری طور پر مصائب وآلام کو محسوس تو کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لطف واحسان اور اس کی حکمتوں پر کامل یقین ہونے کی وجہ سے ان پر راضی رہتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فعل کے پسِ پردہ کوئی نہ کوئی حکمت مضمر ہوتی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"فَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡـًٔا وَّیَجۡعَلَ اللّٰهُ فِیۡهِ خَیۡرًا کَثِیۡرًا" (نساء:۱۹)

تو قریب ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھے۔

---

[1] (شرح الطریقة المحمدیة ج۲ ص۱۰۵)

اس وجہ سے اس کا غم مضمحل اور تعجب زائل ہو جاتا ہے اور وہ جان لیتا ہے کہ اس کا تعجب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعجب کی مثل ہے جب انہوں نے یتیموں کی کشتی کو عیب دار کرنے، بچے کو قتل کرنے اور دیوار تعمیر کرنے پر حضرت خضر علیہ السلام پر تعجب کا اظہار فرمایا پھر جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان حکمتوں سے آگاہ فرمادیا تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تعجب زائل ہو گیا کیونکہ ان کا تعجب صرف اس بناء پر تھا کہ یہ حکمتیں ان پر مخفی تھیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے افعال کی حکمتیں بھی ہم پر مخفی ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مؤمن کا دل جب اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور ہوتا ہے اور وہ اس کی محبت میں دنیاومافیہا سے بے خبر ہوتا ہے تو وہ نہ تو مصیبت کے واقع ہونے کو محسوس کرتا ہے اور نہ ہی اس پر دردوآلام اور یہ حقیقت ہے کہ محبت کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے کبھی محبت کا ذائقہ چکھا ہو۔

لا یعرف الوجد الا من یکابدہ و لا الصبابۃ الا من یعانیھا

(غم اسی کو محسوس ہوتا ہے جو اسے برداشت کر سکے اور عشق وہی محسوس کرتا ہے جو اس میں مبتلا ہو)

اسی وجہ سے اس کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جن کی رسائی اس تک نہیں ہو سکتی۔

قال عامر بن قیس! احببت اللہ حبا ھون علی کل مصیبۃ و رضانی بکل بلیۃ فلا ابالی مع حبی ایاہ علیٰ ما اصبحت و علیٰ ما امسیت۔

"عامر بن قیس نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے ایسی محبت کی ہے جس نے مجھ پر ہر مصیبت آسان کر دی اور ہر آزمائش پر مجھے راضی کر دیا۔ محبت کی وجہ سے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں نے کس حالت میں صبح کی اور کس حالت میں شام کی۔"

(۲): اعتراض: بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ مؤمن رضا کی وجہ سے فاسقین کے اعمال اور برے لوگوں کے احوال کو اچھا گمان کرنے لگتا ہے اور یہ چیز امر بالمعروف اور نهي عن المنكر کے ترک کا سبب ہے۔

جواب: یہ اعتراض ان کی واضح جہالت کا ثبوت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مؤمن اپنے رب کے احکام میں سے ایک اہم حکم اور دینِ اسلام کے اہم ستون یعنی امر بالمعروف اور نهي عن المنكر کو گرادے حالانکہ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اسی وقت راضی ہو گا جب وہ دینی احکام کو بجا لائے گا اور اس کی شریعت کی اتباع کرے گا۔ مؤمن کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کافر کے افعال پر راضی ہو جائے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی نہیں؟

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ۔" (زمر:۷)

اور وہ پسند نہیں کرتا اپنے بندوں سے ناشکری کو۔

حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر راضی ہونے اور برے کام کو ناپسند کرنے میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ مؤمن اللہ تعالیٰ کے افعال پر اس حیثیت سے راضی ہوتا ہے کہ ان کا صدور اس ذات سے ہوا ہے جو بڑی علیم و حکیم ہے اور ان کا تعلق اس کی قضا اور مشیت سے ہے، اور وہ برے لوگوں کے افعال سے اس حیثیت سے راضی نہیں ہوتا کہ ان میں ان کی صفت کسب کا دخل ہے اور ان کے یہ افعال اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں، لہٰذا مؤمن بھی ان کے بد اعمال ناپسند کرتا ہے۔

(۳): اعتراض: بعض لوگوں نے یہ غلط تصور قائم کیا ہے کہ رضا کی وجہ سے انسان دعا اور عاجزی کو ترک کر دیتا ہے اور اسی طرح خیر کے حصول اور مصیبت کو دور کرنے کے اسباب کو بھی ترک کر دیتا ہے اور بیماری کے وقت دوا سے دور بھاگتا ہے۔

جواب: ان کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کیونکہ در حقیقت یہ چیز بھی رضا میں شامل ہے کہ مؤمن ایسے اعمال کو سر انجام دے جو اس کے محبوبِ حقیقی کی رضا کا ذریعہ ہوں اور ہر اس کام کو ترک کر دے جو اس کے حکم اور رضا کے مخالف ہو۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرنا بھی اس کی رضا کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کو دُعا کا حکم دیا ہے کہ گویا اس حکم کی پیروی کرنا بھی رضا میں شامل ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"أُدْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ" (مؤمن:۶۰)

مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

مشکوۃ المصابیح صفحہ ۱۹۴ رقم ۲۲۳۱ پر ہے: الدُّعاءُ مُخّ العِبادةِ۔ (دعا مغز عبادت کا ہے)

یہ دل میں صفائی، خشوع اور رقت پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کو اخذ کرنے کے قابل بنا دیتی ہے پھر اسباب کو ترک کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مخالف اور اس کی رضا کے منافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کو عمل کا حکم دیا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (توبہ:۱۰۵)

"اور فرمائیے عمل کرتے رہو پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو اور (دیکھے گا) اس کا رسول اور مؤمن۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رزق حلال کی تلاش کا حکم دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ۔ (الملک:۱۵)

ترجمہ: ”وہی تو ہے جس نے نرم کر دیا ہے تمہارے لئے زمین کو پس (اطمینان سے) چلو اس کے راستوں پر اور کھاؤ اس کے (دیئے ہوئے) رزق سے۔“

یہ رضا نہیں ہے کہ پیاسا پانی کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے یہ گمان کرتے ہوئے کہ وہ پیاس پر راضی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی قضا ہے۔ یہ محض اس کا گمان اور جہالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور حکم یہ ہے کہ پیاس کو پانی سے دور کیا جائے۔

جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طاعون سے بچنے کیلئے مسلمانوں کے لشکر کو ملک شام میں داخل ہونے سے منع کیا تو حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں کہا کہ تم اللہ تعالیٰ کی قضاو قدر سے بھاگتے ہو تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں جواب دیا: اے ابو عبیدہ! کاش کہ یہ جملہ تمہارے علاوہ کوئی اور کہتا، ہاں، ہم اللہ تعالیٰ کی قضاو قدر سے اسی کی قضاو قدر کی طرف فرار اختیار کر رہے ہیں۔[1]

رضا بالقضاء شرعی حدود سے خارج ہونے کو مستلزم نہیں بلکہ رضا بالقضاء کا مفہوم یہ ہے کہ انسان ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ پر اعتراض کو ترک کر دے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا و محبت کے حصول کیلئے اپنی پوری کوشش صرف کرے یعنی اس کے اوامر کو بجالائے اور نواہی سے اجتناب کرے۔

---

[1] (بخاری، کتاب الطب، باب مایذکر فی الطاعون)

اختتامیہ

رسول اللہ صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّم ، آپ کے خلفاء اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے علاوہ تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حیات طیبہ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں جو دلالت کرتے ہیں کہ یہ رضا کے اعلیٰ درجات پر فائز تھے۔ ان تمام واقعات کو ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

طائف میں رسول اللہ صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّم پر پتھروں کی بارش کی گئی حتیٰ کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وسلّم کے پاؤں مبارک خون آلود ہو گئے لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وسلّم نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی۔ اے پروردگار! اگر تو مجھ پر ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مکہ میں طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتیں۔ لیکن وہ یہ تمام تکلیفیں اس طرح برداشت کرتے کہ ان کے دل راضی ہوتے، چہروں پر مسکراہٹ ہوتی اور زبانیں ذکر میں مصروف رہتیں۔

مروی ہے کہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ٹانگ کاٹ دی گئی اور اسی رات ان کا عزیز ترین بیٹا انتقال کر گیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھی افسوس کیلئے حاضر ہوئے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ ملک الحمد کان او لادی سبعة فاخذت و احدا و ابقیت ستة و کان لی اطراف اربعة فاخذت و احدا و ابقیت ثلاثة فلان کنت قد اخذت فلقد اعطیت و لان کنت قد ابتلیت فقد عافیت۔

یعنی "اے اللہ! ساری تعریفیں تیرے لئے ہیں۔ میرے سات بچے تھے تو نے ان میں سے ایک لے لیا اور چھ کو باقی رکھا۔ میرے چار اطراف تھے ان میں سے تو نے ایک لے لی اور تین کو باقی رکھا۔

اگر تونے آج مجھ سے کچھ لیا ہے تو یہ سب کچھ تونے ہی تو عطا کیا تھا۔ اگر تونے مجھے آج آزمائش میں مبتلا کیا ہے تو تونے مجھے عافیت بھی بخشی تھی۔"

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا! میرے لئے خوشی کا کوئی موقع نہیں سوائے قدر کے واقع ہونے کے وقت۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی گئی کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا چیز پسند کرتے ہیں تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی قضا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ سے اسی وقت راضی ہوتا ہے جب بندہ اپنے تمام اقوال وافعال میں اپنے رب سے راضی ہو جائے پھر اس وقت طرفین سے رضا کا تبادلہ ہوتا ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ۔" (بینہ:۸)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی۔"

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے رضا کی ان دونوں قسموں میں باہمی ربط اور تعلق کے راز کو پا لیا تھا۔ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن رابعہ عرویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف فرماتھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، اے اللہ! تو مجھ سے راضی ہو جا تو انہوں نے فرمایا! اے ابو سفیان! تجھے اللہ سے حیا نہیں آتی کہ تم اس سے رضا کا سوال کرتے ہو، حالانکہ تم اس سے راضی نہیں ہو تو حضرت سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے لگے، استغفر اللہ۔ [1]

---

[1] (احیاء العلوم ۲ ۳۳ :۴)

بندے سے اللہ تعالیٰ کی رضا یہ بڑا ہی بلند اور ارفع واعلیٰ مرتبہ اور بڑا عظیم عطیہ ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ أَكْبَر" (توبہ: ۷۲)

نیز (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ مکانات کا سدابہار باغوں میں اور رضائے خداوندی ان سب نعمتوں سے بڑی ہے۔

یقیناً جنت کے رب کی رضا جنت سے اعلیٰ ہے بلکہ یہی تو اہلِ جنت کا مطلوب و مقصود ہے! جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو ارشاد فرمائے گا: اے اہلِ جنت! اور وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم حاضر ہیں۔ وہ ارشاد فرمائے گا: کیا تم مجھ سے راضی ہو؟ اہلِ جنت عرض کریں گے: یارب! ہم تجھ سے کیوں نہ راضی ہوں تو نے ہمیں ان انعامات سے نوازا ہے جو تو نے اپنی مخلوق میں کسی پر نہیں فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میں تمہیں اس سے بھی افضل انعام عطا فرمانے والا ہوں۔ عرض کریں گے: اے پروردگار! اس سے افضل کون سا انعام ہے؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میں تم پر اپنی رضا کو حلال کرتا ہوں اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔[1]

(مفتاح السلوک، جلد دوم)

[1] (بخاری، کتاب الرقاق باب صفۃ الجنۃ)

مکتوب نمبر ۳۹

[اس بیان میں کہ کام کا دارو مدار قلب پر ہے۔ صرف اعمال کی صورتوں اور رَسمی عبادتوں سے کچھ نہیں ہوتا، اور اسی طرح کی اور باتوں میں۔۔۔یہ مکتوب بھی شیخ محمد چتری کو لکھا:]

تشریح

شریعت اور طریقت کا قلبِ انسانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ شریعت کا تو اس طرح کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ "تمام اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے" اور نیت نام ہے ارادۂ قلب کا۔ پس اگر قلب صحیح ہوا تو نیت بھی صحیح ہو گی اور اگر قلب ہی خراب ہوا تو نیت بھی خراب اور اَبتر ہو گی پس جب نیت خراب ہو گی تو اعمال کیسے صحیح ہوں گے؟ اور طریقت میں سارے کام کا دار و مدار قلب پر ایسے ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ و سلم إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ۔[1]

ترجمہ: حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک بنی آدم کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا (دل) ہے جب وہ (ٹکڑا) صالح ہو جائے تو سارا بدن صالح ہو جاتا ہے اور جب وہ (ٹکڑا) فاسد (طالح) ہو جائے تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے۔

اسی لئے مشائخِ طریقت نے سلوک کی ابتدا ً قلب سے کی ہے، لہٰذا باقی لطائف سے پہلے قلب کی درستگی ضروری ہے۔ اگر قلب ذاکر ہو جائے تو باقی لطائف کا راستہ آسان ہو جاتا ہے اور قلب کی درستگی سے ہی اعمال کی درستگی ممکن ہے ورنہ قلب کی کدورت اعمال پر اثر انداز ہو کر انہیں بھی ضائع

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۹۰، المکتبۃ الفاروقیۃ)

کر دیتی ہے اور ایسی ہی عبادت رَسمی عبادت کہلاتی ہے۔ رسمی عبادتوں سے عام مسلمان تو ثواب کا حقدار ہو جاتا ہے لیکن سالک ان سے ترقی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کے اعمال کے لئے بھی اور طریقت کی ریاضات کے لئے بھی قلب کا درست ہونا ایسے ہی ضروری ہے جیسے کسی عالی شان عمارت کے لئے بنیاد بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اور قلب کی درستگی کے لئے پہلے علم کا ہونا ضروری ہے پھر اس علم کے مطابق عمل کرنا اور عمل میں اخلاص پیدا کرنے کے لئے سلوک کا طے کرنا علماء و مشائخ اور اولیاء کا مسلمہ اصول ہے۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے اس مکتوب میں ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے جو عبادات کو ظاہر شریعت میں منحصر سمجھتے ہیں اور حضورِ قلبی و اخلاصِ عمل کو عبادت میں شمار نہیں کرتے اور اسی طرح ملحد اور بے دین لوگ جو ظاہرِ شریعت (اعمالِ بدنیہ) کے بغیر سلامتیٔ قلب کا دعویٰ کرتے ہیں اور عبادات کی ادائیگی کو ضروری نہیں جانتے، آپ نے ان کی بھی مذمت فرمائی ہے۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۵۸)

[حق سبحانہٗ و تعالیٰ حضور سید البشر علیہ و علیٰ آلہٖ الصلوات والتسلیمات کی حرمت کے طفیل جو نظر کی کجی سے آزاد تھے، اپنے ماسوا سے روگردانی اور جناب قدس کی طرف توجہ نصیب فرمائے۔

کام کا دارومدار دل پر ہے۔ اگر دل حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے غیر کے ساتھ گرفتار ہے تو خراب اور اَبتر ہے۔ صرف ظاہری اعمال اور رسمی عبادتوں سے کام مکمل نہیں بن سکتا۔ دل کو غیر حق تعالیٰ کی طرف توجہ سے سالم و محفوظ رکھنا اور اعمالِ صالحہ جو بدن سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے ادا کرنے کا شرعاً حکم ہے، دونوں درکار ہیں۔ اعمالِ صالحہ بدنیہ کی بجا آوری کے بغیر دل کی سلامتی کا دعویٰ باطل

ہے جس طرح اس جہان میں بدن کے بغیر روح غیر متصور ہے، قلبی احوال کا حصول بھی بدنی اعمالِ صالحہ کے بغیر محال ہے۔

اس وقت کے بہت سے ملحد اور بے دین اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ کے صدقے ان کے اعتقادات سے نجات دے۔]

تشریح

ذاتِ بحت خداوندی کے علاوہ ہر چیز ماسوا کہلاتی ہے۔ اس لئے جب کوئی شخص نیک اعمال کرے تو صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کی خاطر کرے، بظاہر فرائض وواجبات ادا کرنے والے شخص کی پسِ پردہ نیت اگر یہ ہو کہ لوگ مجھے نمازی اور روزہ دار کہیں یا وقت گزاری اور محض آباؤاجداد کا طریقہ سمجھ کر ادا کرے گا تو وہ "ماسوا" کا بندہ ہو گا نہ کہ جنابِ قدس کی طرف رُخ کرنے والا۔ اور ماسوا سے تعلق کو توڑنے اور اپنے رب تعالیٰ سے تعلق استوار کرنے ہی کی خاطر مشائخِ طریقت نے اپنی زندگیاں صَرف کر ڈالی ہیں۔

بے دین قسم کے لوگ اور ناقص صوفی اکثر کہا کرتے ہیں کہ "دل صاف ہونا چاہیئے اوپر نیچے ہونے سے کچھ نہیں ہوتا" ان بے علموں کو معلوم نہیں کہ شریعت کے ظاہری اعمال کے بغیر دل کا صاف ہونا ناممکن ہے۔ اگر صرف دل کا صاف ہونا ہی کافی ہوتا تو جب سارے کے سارے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور چھوٹے بڑے مشائخ کے دلوں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے کمالِ مہربانی سے صاف فرما دیا تھا اس کے باوجود اُنہوں نے اعمالِ صالحہ سے رُخ نہیں موڑا اور جب وہ پاک ہستیاں عبادت سے فارغ نہ ہو سکیں تو باقی لوگوں کا کیا حال ہو گا؟ بلکہ دل کا صاف ہونا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا اتنا بڑا انعام ہے کہ اس

کا شکر ادا کرنے سے چارہ نہیں اور شکر ادا کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکام پر تہہ دل سے عمل کیا جائے۔ کیونکہ اعمالِ صالحہ کے بغیر کیفیاتِ قلبی کا بھی کچھ اعتبار نہیں۔

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

اعمال واحوال کا دارومدار قلب پر ہے

حقیقت الامر یہ ہے کہ قرآن وسنت سے اعمالِ ظاہری اور احوالِ باطنی (دونوں امور) کا تلازم ثابت ہوتا ہے۔

سلامتیٔ قلب کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ (۸۸) إِلَّا مَنْ أَتَى اللهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الشعراء ۸۹)

(یعنی) جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے، مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر۔

اور اعمالِ ظاہری کے متعلق فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا (الکھف ۱۰۷)

(یعنی) بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے فردوس کے باغ ان کی مہمانی ہے۔

بلکہ اگر اعمالِ ظاہری میں ریا کا عُنصر شامل ہو جائے تو عند الشرع بھی وہ عمل باطل وفاسد ہو جاتا ہے جس طرح کفر وشرک تمام اعمالِ صالحہ کو برباد کر دیتا ہے، اسی طرح ریا بھی (جو کہ شرکِ خفی ہے) اعمالِ صالحہ کے فساد کو مستلزم ہے۔

معلوم ہوا کہ ظاہری اعمال کی قبولیت بھی حضورِ قلب پر منحصر ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے:

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ۔[1]

یعنی حضور قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

اور

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔[2] کے مطابق نماز مؤمن کی معراج اسی صورت میں ہے جب نماز حضور قلب سے ادا کی جائے اور حضورِ قلب ان لوگوں کا حصہ ہے جو سلیم القلب ہیں اور قلب کی سلامتی ماسوی اللہ کی گرفتاری سے آزادی کا نام ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ یُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَإِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (الحج ۳۲)

یعنی شعائر اللہ کی تعظیم دل کا تقویٰ ہے۔

معلوم ہوا کہ دل کا تقویٰ عند الشرع مطلوب ہے اور اعمال واحوال کی صحت کا نام ہی تقویٰ ہے۔

---

[1] صاحب تشیید المبانی رقم طراز ہیں:

قَالَ الْمُخَرِّجُ لَمْ اَجِدْہُ بِھٰذَا اللَّفْظِ اِنْتَھٰی قُلْتُ ھٰذَا حَدِیْثٌ مَشْھُوْرٌ فِیْ کُتُبِ الصُّوْفِیَّۃِ۔ (تشیید المبانی، ص ۷۴)

اس حدیث کا مفہوم درج ذیل حدیث کے مطابق ہے:

لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلٰی صَلٰوۃٍ لَا یُحْضِرُ الرَّجُلُ فِیْھَا قَلْبَہٗ مَعَ بَدَنِہٖ۔ (احیاء العلوم، ج ۱، ص ۱۱۰)

[2] صاحب تشیید المبانی تحریر فرماتے ہیں:

قَالَ الْمُخَرِّجُ لَمْ اَجِدْلَہٗ اَصْلاً اِنْتَھٰی قُلْتُ الْحَدِیْثُ مَشْھُوْرٌ فِیْ کُتُبِ الصُّوْفِیَّۃِ۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔ (تشیید المبانی، ص ۵۴)

حدیث میں ارشاد ہے:

أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔[1]

یعنی خبر دار جسم کے اندر ایک گوشت کا لو تھڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، خبر دار اور وہ قلب ہے۔

معلوم ہوا کہ قلب کی اصلاح سے سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جسم عبادات وطاعات پر مستقیم اور راغب ہو جاتا ہے۔

نیز ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ۔[2]

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا لیکن تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔

مزید ارشاد فرمایا:

اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا۔[3]

تقویٰ یہاں ہے (تین مرتبہ دل کی طرف اشارہ فرمایا)۔

معلوم ہوا کہ دل اور عمل دونوں متلازم ہیں جس سے احوال واعمال کا تلازم ثابت ہوتا ہے۔

(وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ)

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۳)

[2] (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۱۷)

[3] (صحیح بخاری)

اسی طرح إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔ [1] سے بھی اعمال کا دار و مدار دل پر ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ نیت کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔

اقسامِ قلب

قرآن کی رو سے قلب کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ قلبِ مُنیب ۲۔ قلبِ شہید ۳۔ قلبِ سلیم

قلبِ مُنیب

قلبِ مُنیب وہ ہے جس سے خطراتِ روحی اور نیک کام ظاہر ہوں مثلاً تقویٰ، مجاہدہ، عبادت اور ریاضت وغیرہ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ (ق ۳۳)

قلبِ شہید

قلبِ شہید وہ ہے جس کو عرش اللہ کہا گیا ہے۔

قلبِ شہید کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ (ق ۳۷)

قلبِ سلیم

قلبِ سلیم وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی محبت سما جائے اور ماسویٰ اللہ سے فارغ ہو جائے۔

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۲)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ (٨٨) إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الشعراء ٨٩)

اَمراضِ قلب

صوفیائے کرام کے نزدیک قلب کی بیماریاں بھی تین ہی ہیں جن سے سالک کو بچنا چاہیئے۔

قلبِ مریض کو قلبِ سقیم بھی کہتے ہیں۔

حدیثِ نفس

اپنے ارادہ واختیار سے دل میں باتیں کرتے رہنا۔

خطرہ

بغیر ارادہ واختیار کے دل میں باتوں کا گزرتے رہنا۔

نظر بہ غیر

اشیائے متکثرہ کو دیکھنے سے مختلف چیزوں کے علوم وخیالات حاصل ہوتے رہنا۔

خطراتِ قلب

انسان کے دل پر مختلف قسم کے خطابات وارد ہوتے رہتے ہیں جن سے سالک کو آگاہ رہنا چاہیئے

وہ چار قسم کے ہیں:

خطرۂ نفسانی

اگر خطاب نفس کی طرف سے وارد ہو تو اس کو خطرۂ نفسانی کہتے ہیں۔ اس کو ہوا جس بھی کہا جاتا

ہے۔

خطرۂ شیطانی

اگر خطاب شیطان کی جانب سے ہو تو خطرۂ شیطانی کہتے ہیں، اس کو وسواس بھی کہتے ہیں۔

خطرۂ ملکی

اگر فرشتے کی جانب سے ہو تو خطرۂ ملکی یا الہام کہتے ہیں۔

خطرۂ رحمانی

اگر حق تعالیٰ کی جانب سے ہو تو خطرۂ رحمانی کہا جاتا ہے۔

بینہ

خطرۂ نفسانی میں شہوت ولذتِ نفس کا شوق ابھرتا ہے اور یہ دیرپا ہوتا ہے۔ خطرۂ شیطانی میں دل کے اندر معصیت کی خواہش چٹکیاں لیتی ہے، یہ جلدی چلا بھی جاتا ہے۔ خطرۂ ملکی میں اذکار وعبادت کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن یہ خطرہ بھی عارضی ہوتا ہے، سالک کو چاہیئے کہ اس کی طرف فوراً عملی رجوع کرے تاکہ غائب نہ ہو جائے۔ خطرۂ رحمانی میں محبت الٰہی اور مشاہدۂ حق کا شوق پیدا ہوتا ہے، یہ خطرہ مبارکہ سالک کے دل میں مستقل قیام کرلیتا ہے اور جانے کا نام نہیں لیتا اور دل کو غیر کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۵۸ تا ۱۶۲)

مفتاح السلوک، جلد اول میں ہے:

انسان سے متعلقہ وہ احکامِ شرعیہ جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ان کی دو اقسام ہیں:

(۱) وہ احکام جن کا تعلق ظاہری احوال سے ہے۔

(۲) وہ احکام جن کا تعلق باطنی احوال سے ہے۔

بالفاظ دیگر ان دونوں اقسام کو اس طرح بھی تعبیر کرسکتے ہیں کہ ظاہری احوال سے مراد وہ احکام ہیں جن کا تعلق بدن اور جسم سے ہے، جبکہ باطنی احوال سے مراد وہ احکام ہیں جن کا تعلق روح اور قلب کے ساتھ ہے۔

جسمانی اعمال کی دو قسمیں ہیں:

(۱)اوامر (۲)نواہی

اوامر الہیہ یہ ہیں

نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ، اور نواہی سے مراد قتل، زنا، سرقہ اور شراب خوری وغیرہ ہے۔

اور اسی طرح قلبی اعمال بھی اوامر و نواہی پر مشتمل ہیں۔ اوامر سے مراد اللہ تعالیٰ، ملائکہ، اس کی کتب اور رسل پر ایمان لانا ہے۔ اور اخلاص، رضا، صدق، خشوع اور توکل پر ایمان لانا ہے۔ جبکہ نواہی سے مراد کفر، نفاق، تکبر، خود پسندی، ریاء، غرور، کینہ اور حسد ہے۔

یہ دوسری قسم جس کا تعلق دل کے ساتھ ہے، اس کو شارع علیہ السلام کے نزدیک پہلی قسم سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ باطن، ظاہر کی بنیاد اور اصل ہے اور باطنی اعمال، ظاہری اعمال کی اصل ہیں۔ باطنی اعمال میں خرابی کی وجہ سے ظاہری اعمال کی حیثیت متاثر ہوتی ہے۔

اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَمَنْ يَرْجُوْ الِقَاىَٔ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَداً (الکھف ۱۱۰)

ترجمہ: ’’پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے، اور شریک نہ کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔‘‘

اسی وجہ سے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَسَلَّم ، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قلوب کی اصلاح کیلئے خصوصی اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَسَلَّم انہیں ارشاد فرماتے کہ انسان کے درستگی اور اصلاح اس کے دل کی اصلاح اور پوشیدہ امراض و علل کی شفاء پر موقوف ہے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَسَلَّم ارشاد فرماتے ہیں:

الا وان فی الجسد مضغه اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله، ألا وھی قلب۔

یعنی: ”خبر دار! بے شک انسانی جسم میں ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ جب وہ صحیح ہو تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے اور جب اس میں خرابی پیدا ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ خبر دار رہو! اور یہ دل ہے!“۔[1]

تشریح

(الاوان فی الجسد) میں جو واؤ ہے وہ جملہ مقدر پر عطف ہے جو یہ ہے: **(وھی ان حقیقة الامر)**

(مضغة) قلب کو مضغہ سے اس لئے تعبیر فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جسم کے مقابلہ میں قلب بہت چھوٹا ہے لیکن قالب کی اصلاح و فساد قلب کے تابع ہے۔

لان القلب سلطان البدن لما صلح السلطان صلحت الرعیة۔

اس لئے کہ قلب جسم کا بادشاہ ہے، جب بادشاہ صحیح ہو گا تو رعیت بھی صحیح ہو گی۔[2]

---

[1](رواہ البخاری فی کتاب الایمان۔ و مسلم فی کتاب المساقاۃ عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما)

[2](عمدۃ القاری، ج ۱، ص ۳۰۲)

تشریح از مرقاۃ

(إذا صلحت) ای تنورت بالإیمان و العرفان و الإیقان۔

یعنی جب قلب منور ہو جائے نورِ ایمان، نورِ عرفان اور نورِ ایقان سے۔

صلح الجسد أي أعضاؤه كله بالأعمال و الأخلاق و الأحوال۔

یعنی جسم کے اعضاء سے اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حمیدہ اور احوالِ جمیلہ ظاہر ہوں گے۔

و إذا فسدت أي إذا تلفت و أظلمت بالجحود و الشک و الکفر ا۔

یعنی جب قلب برباد ہو جائے ظلمتوں سے بسبب جحود اور شک اور کفر کے۔

فسد الجسد كله أي بالفجور و العصيان فعلى المكلف أن يقبل عليها ويمنعها عن الإنهماک في الشهوات و لا يستعمل جوارحه باقتراف المحرمات۔

یعنی جسم فاسد ہو گا نافرمانی سے اور گناہوں سے۔ پس مکلف پر یعنی ہر شخص پر واجب ہے کہ قلب کی نگرانی رکھے اور اس کو روک کر رکھے خواہشاتِ نفسانیہ میں منہمک ہونے سے اور اس کے جوارح نہ استعمال ہوں ارتکابِ محرمات میں۔

(الا وهی القلب) لان القلب فهو كالملک و الأعضاء كالرعية۔

اس لئے کہ قلب مثل بادشاہ کے ہے اور اعضاء اس کی رعایا ہیں۔

اصلاحِ باطن کی اہمیت

قال القاری فی المرقاۃ فأهم الأمور مراعاته۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ نہایت اہم امور میں سے ہے قلب کی اصلاح اور نگرانی۔

قلب کا مفہوم

کما قال الشاعر

قد سمی القلب قلباً من تقلبہٖ   فاحذر علی القلب من قلب و تحویل

جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے، قلب کا نام قلب اس لئے ہے کہ وہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ پس سخت اہتمام رکھو کہ قلب حق سے باطل کی طرف نہ پھر جائے۔

عن ام سلمة قالت کان اکثر دعائہٖ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَ اَصحَابِہٖ وَ سَلَّم یکثر یا مقلب القلوب ثبت قلبي علی دینک۔ (رواہ البخاری)

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلَّم اس دعا کو کثرت سے پڑھتے تھے۔ اے دلوں کے بدلنے والے میرے دل کو دین پر قائم رکھیے۔

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (بفتح القاف و بضم خطا باشد۔ قسطلہ ایک مقام ہے جس کی طرف نسبت ہے۔ غیاث الغیاث) نے قلب کو امیر البدن اور قالب کو اس کی رعیت فرمایا اور رعیت کی صلاح و فساد موقوف ہے امیر کی صلاح و فساد پر، فرماتے ہیں:

وأشرف ما في الإنسان قلبه فإنه العالم بالله تعالی و الجوارح خدم له۔[1]

اس حدیث سے اصلاح قلب پر استدلال

سمی القلب قلبا لتقلبه فی الامور و خص القلب بذلک لأنه أمیر البدن و بصلاح الأمیر تصلح الرعیة و بفساده تفسد و فیه تنبیه علی تعظیم قدر القلب و الحث علی صلاحه۔[2]

---

[1] (ارشاد الساری فی شرح البخاری، جواہر البخاری، ص ۵۵)

[2] (فتح الباری، ج ۱، ص ۱۲۸)

قلب کا نام قلب اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ **متقلب فی الامور** ہوتا ہے اور اس نام کے ساتھ قلب کو خاص کیا گیا کیونکہ قلب امیر البدن ہے۔ امیر کی اِصلاح سے رعایا کی اِصلاح ہوتی ہے اور اس کے فساد سے رعایا کا فساد ہوتا ہے۔

اور ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اِصلاحِ قلب کا عظیم الشان ثبوت ہے جیسا کہ صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کا معمول ہے۔ اگر قالب سے گناہ سرزد ہوتے ہیں (مثلاً داڑھی منڈانا، ٹخنے سے نیچے پاجامہ لٹکانا، بدنگاہی کرنا وغیرہ) تو یہ سب قلب کے فساد کی علامت ہے۔ اصلاحِ قالب کے لئے اصلاحِ قلب لازمی ہے اور فسادِ قالب کے لئے فسادِ قلب لازمی ہے۔

كماقال الخواجه الهندى المجذوب رحمة الله تعالىٰ عليه:

جس کا نہ کچھ ظہور ہو عشق وہ عشق ہی نہیں۔

قلب سلیم کی تفسیر

جب قلب صالح ہو جاتا ہے اس کو قلبِ سلیم کہتے ہیں۔ قلبِ سلیم کی پانچ تفسیریں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کی ہیں اس آیت کے ذیل میں:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ (٨٨) إِلَّا مَنْ أَتَى اللهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الشعراء ٨٩)

ترجمہ: جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے، مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر۔

(١) الذي ينفق ماله في سبيل البر۔

قلبِ سلیم وہ ہے کہ جو مال خرچ کرے نیک راستہ میں۔

(٢) ألذى يرشد بنيه إلى الحق۔

قلبِ سلیم وہ ہے جو اپنی اولاد کو نیک راستے پر لانے کی کوشش کرے۔

یہ دو تفاسیر یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ (الشعراء۸۸) کے پیش نظر اس کے ربط کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی گئیں۔

(۳) الذی یکون خالیاً من العقائد الباطلۃ ای من الکفر و الشرک و البدعۃ۔

قلبِ سلیم وہ ہے جو عقائدِ باطلہ یعنی کفر و شرک اور بدعت سے خالی ہو۔

(۴) الذی یکون خالیاً من الشھوات التی تؤدی الی النار۔

قلبِ سلیم وہ ہے جو ان تقاضائے شہوانیہ کے غلبہ سے نجات پا جائے جو جہنم کی طرف لے جانے والے ہیں۔

(۵) قال سفیان۔۔۔۔۔الذی لیس فیہ غیر اللہ۔

اور سفیان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں قلب سلیم وہ ہے جس میں ماسویٰ اللہ کے اور کوئی نہ ہو۔[1]

کما قال الخواجہ الھندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ:

دل میرا ہو جائے اک میدان ہو   تو ہی تو ہو تو ہی تو ہو تو ہی تو
اور میرے تن میں بجائے آب و گل   دردِ دل ہو دردِ دل ہو دردِ دل
غیر سے بالکل ہی اٹھ جائے نظر   تو ہی تو آئے نظر دیکھوں جدھر
ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی   اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

کما قال الامام الغزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: الاسم الاعظم ھو اللہ بشرط ان تقول اللہ و لیس فی قلبک سوی اللہ۔

---

[1](روح المعانی، ج۱۹، ص۱۰۱)

ترجمہ: امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہے بشرطیکہ اللہ زبان سے نکلے تو قلب غیر اللہ سے خالی ہو۔

گزرتا ہے کبھی دل پر وہ غم جس کی کرامت سے

مجھے تو یہ جہاں بے آسماں معلوم ہوتا ہے۔۔۔!(اختر)

علامہ محی الدین ابو زکریا نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلیل ہے اصلاحِ باطن پر جس کا صوفیاء رحمہم اللہ تعالیٰ اہتمام کرتے ہیں۔

هذا الحديث التاكيد على السعى فى اصلاح القلب۔

یہ حدیث دلالت کرتی ہے اصلاحِ قلب کے حاصل کرنے پر۔[1]

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

(بضم القاف والطاء ہے۔ قرطبہ اندلس کا ایک شہر ہے اور اندلس کو اب اسپین کہتے ہیں) اعمال کی صحت و فساد کا مدار قلب کے اصلاح و فساد پر ہے۔

دینِ اسلام میں اس حدیث کی حیثیت

حدیث: الاوان فى الجسد مضغة, الخ کو محدثین نے عماد الدین فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ارقام فرماتے ہیں:

قال النووي رحمه الله اتفق العلماء على عظم موقع هذا الحديث و كثرة فوائده فإنه أحد الأحاديث التي عليها مدار الإسلام قيل هي ثلاث حديث الأعمال بالنيات و حديث من حس إسلام المرء تركه ما لا يعنيه و هذا الحديث۔[2]

---

[1](شرح مسلم شریف، ج ٢، ص ٢٨ : مطبوعہ دھلی)

[2](مرقاۃ المفاتیح، ج ٦، ص ٣٥)

عبارت شرح مسلم للنووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

أجمع العلماء على عظم وقع هذا الحديث و كثرة فوائده و أنه أحد الأحاديث التي عليها مدار الإسلام قال جماعة هو ثلث الإسلام و أن الإسلام يدور عليه و على حديث الأعمال بالنية و حديث من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه۔ [1]

ترجمہ: علماء کا اجماع ہے کہ یہ حدیث عظیم الشان ہے اور کثیر الفوائد ہے اور یہ حدیث ان تین احادیث میں سے ایک ہے جن پر اسلام کا دارو مدار ہے۔ ایک جماعت نے کہا کہ یہ حدیث ثلثِ اسلام ہے (یعنی اس میں تہائی اسلام ہے) وہ تین احادیث جن پر مدار اسلام ہے یہ ہیں:

(۱) الا و ان فی الجسد مضغۃ، الخ۔

ترجمہ ہو چکا۔

(۲) انما الاعمال بالنیات، الخ۔

اعمال کی قبولیت کا مدار اخلاص نیت پر ہے۔

(۳) مِنْ حُسْنِ إسلامِ المرءِ تَرْکُهُ ما لا یَعْنِیهِ۔

آدمی کا حسنِ اسلام لایعنی اور فضول باتوں کے ترک کر دینے سے ہے۔ [2]

(مفتاح السلوک، جلد اول)

---

[1] (شرح مسلم للنووی علیہ الرحمہ، ج ۲، ص ۲۸)

[2] (کشکول معرفت، ص ۱۳۶ تا ۱۴۲)

مکتوب نمبر ۴۰

[مقامِ اخلاص کے حاصل کرنے کے بیان میں جو شریعت کے تین اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ اور اس جزو کے کامل کرنے میں طریقت اور حقیقت دونوں شریعتِ حقہ کی خادم ہیں، اور اسی طرح کے دوسرے مسائل میں۔۔۔۔ شیخ محمد چتری کی طرف لکھا:

مخدوم گرامی! منازل سلوک اور مقاماتِ جذبہ کے طے کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس سیر وسلوک سے مقصود مقامِ اخلاص کا حاصل کرنا ہے۔ جو بیرونی اور اندرونی خداؤں کے فنا ہونے سے وابستہ ہے۔ اور یہ اخلاصِ شریعت کے اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ کیونکہ شریعتِ حقہ کے تین جزو ہیں: علم، عمل اور اخلاص۔]

تشریح

پچھلے مکاتیب میں ہم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ شریعت وطریقت کے لئے سب سے پہلے علم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور علم کے حصول کی ابتدا عقائد سے کرنی چاہیئے۔ اہل سنت وجماعت (فقہ حنفی) کے مطابق عقائد کو درست کرنا سب سے لازمی اَمر ہے۔ اس کے بعد فقہ کے ضروری اور بنیادی مسائل کو سیکھنا اور اُن پر عمل کرنا فرض ہے۔ لیکن ہم نے نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو چھوڑ کر نظامِ کفر کو اختیار کر لیا ہے۔ پہلے لوگ دین کو سیکھنا ضروری خیال کرتے تھے لیکن اب دین کی بات کرنا جرم بنا دیا گیا ہے۔ بچوں کو قرآن عظیم الشان پڑھانے اور مدرسوں کا راستہ دکھانے کی بجائے انگلش میڈیم سکولوں کا گرویدہ بنا دیا جاتا ہے جہاں پر ۳۰ منٹ کا ایک پیریڈ اسلامیات کے لئے اور ۵ گھنٹے دنیاوی علوم کے لئے مختص ہوتے ہیں۔ اور اُن دنیاوی علوم کی ضرورت پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ طالب علم دین کا نام ہی بھول جاتا ہے اور پھر وہ ایک نئی ذہنیت لے کر کالجوں

اور یونیورسٹیوں سے ہوتا ہوا یورپ کا مقلد بن کر سامنے آتا ہے۔ اگر یہ چند سطور غلط نظر آئیں تو اپنے ارد گرد کے ماحول و معاشرہ پر نظر گھما کر دیکھ لیں۔

چلیں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ دنیاوی زندگی کا پہیہ رواں دواں رکھنے کے لئے دنیاوی علوم کی ضرورت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ چکی ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے دین کو ہی بھلا دیں اور دین پر دنیا کو غالب کر دیں؟ نہیں نہیں، ہر گز نہیں۔ مسلمان پر دین کا علم سیکھنا اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا نہ صرف اُخروی فلاح کے لئے ضروری ہے بلکہ دُنیاوی ترقی کا راز بھی اسلامی اصولوں پر عمل کرنے میں ہی پوشیدہ ہے۔

[تو طریقت اور حقیقت دونوں اس جزوِ اخلاص کو کمال تک پہنچانے میں شریعت کے خادم ہیں۔ اصل بات یہی ہے لیکن ہر شخص کا فہم وادراک یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اکثر مخلوق خواب و خیال میں آرام کر رہی ہے، اور اخروٹ وناریل (معمولی چیزوں) پر کفایت کر چکی ہے۔ شریعت کے کمالات کو کیا جانے۔ طریقت و حقیقت کی ماہیت کو کیا پائے؟ اکثر لوگ شریعت کو پوست اور حقیقت کو مغز خیال کرتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ صوفیوں کی سُکر و مستی میں نکلی ہوئی باتوں کے دھوکے میں آچکے ہیں، اور احوال و مقامات سے فتنہ میں پڑ چکے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ انہیں راہِ راست پر چلنے کی ہدایت دے، ہم پر اور تمام صالحین پر سلامتی کا نزول ہو۔]

تشریح

اکثر لوگوں کے پاس علم نہیں ہوتا اور نہ ہی عمل کرتے ہیں لیکن طرح طرح کے خواب دیکھتے ہیں اور ان کی تعبیروں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بزرگی خوابوں میں پوشیدہ ہے اور

ان ہی پر نازاں ہو کر نماز وروزہ کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ کیا کوئی ایسا بھی قابلِ اعتبار تصوف ہے جس میں فرائض وواجبات تو معاف ہوں لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا وصل بڑی آسانی سے میسر آجائے؟

پس حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے ان گذشتہ مکتوبات کا لب لباب اور خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں شریعت کی اتباع ضروری ہے اور ساتھ ہی کسی واصل باللہ فقیر کے ساتھ بیعت کا تعلق استوار کرنا بھی لوازمات میں سے ہے تاکہ نفس وشیطان کے حملوں سے نجات ملے اور اَبدی فلاح ممکن ہو سکے۔ احوال ومواجید، کشف وشہود اور بے بنیاد خوابوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔

بات لمبی ہو گئی۔ ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ شریعت تین اجزأ سے مکمل ہوتی ہے علم، عمل اور اخلاص۔ علم کی ضرورت پر تو بات ہو چکی، اب اس پر عمل کی باری آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے علم حاصل کیا اور اس کو سکھایا۔ آسمان کی بادشاہی میں اُسے ''عظیم'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی عالم اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو جاہل لوگ اس سے علم سیکھنا پسند نہیں کرتے، کیونکہ عالم جب عمل نہیں کرے گا تو اُس کا علم نہ اس کو نفع دیتا ہے نہ کسی اور کو، اگرچہ اُس نے علم کے بوجھ لاد رکھے ہوں۔ حضرت امام اوزاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے علم پر عمل کرتے ہیں انہیں ایسے علم کی توفیق ملتی ہے جو اُن کے پاس نہیں ہوتے۔

پس علم کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے کہ قیامت کے دن عمل کی بابت پوچھا جائے گا۔ اور عمل اُس وقت تک قبول نہیں ہوتا جب تک اُس میں اخلاص نہ ہو۔ اور اخلاص کی حقیقت کو حاصل کرنے کے لئے سلوک طے کرنا یعنی کسی کامل شیخ سے بیعت کرنا ضروری ہے تاکہ جذب بھی حاصل ہو

اور فنا کا بھی حصول ہو کہ بغیر فنا وبقا کے اخلاص میں کمال پیدا نہیں ہو تا۔ اور سلوک سے مقصود ہی دولتِ اخلاص کا حاصل کرنا ہے، کیونکہ جہاں اور بہت سے باطنی (باطل) معبود انسان کو گمراہی کی طرف لے کر جاتے ہیں وہاں ایک ریا بھی ہے اور ریا کا قلبِ انسانی سے ختم ہونا ہی اخلاص کہلاتا ہے۔ لہٰذا کوئی عبادت اور نیک کام اس وقت تک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دربار میں مقبول نہیں ہوتا جب تک اُس میں ریا کا ایک ذرہ بھی شامل ہو اور اخلاص پیدا نہ ہو جائے۔ حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ "تمام لوگ مردہ ہیں سوائے اہل علم کے۔ اور علماء مدہوش ہیں سوائے عمل کرنے والوں کے اور عمل کرنے والے فریب خوردہ ہیں سوائے مُخلص لوگوں کے اور مخلص لوگ بھی خطرے میں ہیں" تو جب اخلاص والوں کو بھی خطرات لاحق ہیں تو باقی لوگوں کا کیا حال ہو گا؟ حضرت شقیق بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ تین چیزیں اعمال کا قلعہ ہیں ایک یہ اعتقاد رکھنا کہ جو عمل بھی ہوا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے ہوا تاکہ عُجب پیدا نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ عمل سے مقصود اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کو بنائے تاکہ اپنی خواہش مغلوب ہو۔ تیسرے یہ کہ عمل کے ثواب کی تمنا صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے رکھے تاکہ کوئی طمع یا ریا مقصود نہ ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں تمام شرکاء کے مقابلہ میں سب سے بڑھ کر شرک سے بے نیاز ہوں۔ جس عمل میں میرے غیر کے لئے حصہ ہو میں اُس سے بے نیاز ہوں۔ سو جو شخص ایسا عمل کرے جس میں میرے غیر کو بھی شریک کر لے تو میں اُس سے بَری ہوں یعنی اس عمل سے یا عمل کرنے والے سے۔ (رواہ مسلم وابن ماجہ)

البینات شرح مکتوبات میں شارح ابو البیان محمد سعید احمد مجددی فرماتے ہیں:

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ منازل سلوک طے کرنے اور مقاماتِ جذبہ حاصل کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ سیر و سلوک سے مقصود مقامِ اخلاص کا حصول ہے جو کہ آفاقی (بیرونی) اور انفسی (اندرونی) خداؤں کی نفی کے ساتھ مربوط ہے اور مقامِ اخلاص، اجزاء شریعت میں سے تیسرا جزو ہے۔ جیسا کہ آپ نے ایک دوسرے مکتوب میں فرمایا کہ شریعت کے تین اجزاء ہیں: علم، عمل اور اخلاص۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ (البینۃ ۵)

اور اسی طرح ایک دوسری جگہ ہے:

أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (الزمر ۳)

نیز حدیث مبارکہ میں ہے:

أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهِ۔[1]

وہ علماء جو اخلاص کے مقام سے غافل ہیں اور فنا و بقا سے مشرف نہیں ہوئے اخلاص کو شریعت سے الگ سمجھتے ہیں اور امرِ زائد خیال کرتے ہیں، دراصل وہ علمائے ظواہر ہیں اور اُمور شرعیہ سے جاہل و بے خبر ہیں۔ اسی طرح وہ علماء جو علمی طور پر لفظ فنا و بقا سے واقف ہیں لیکن حالی طور پر حقیقتِ فنا و بقا سے مشرف نہیں ہیں اور شریعت کو پوست خیال کرتے ہیں اور طریقت و حقیقت کو مغز سمجھتے ہیں وہ مغرور اور مفتون ہیں۔ اگر فنا و بقا کی حقیقت سے فیض یاب ہوتے تو اس قسم کی باتیں نہ کرتے

---

[1] (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۲۰)

اور اس راز کو پالیتے کہ حقیقت در حقیقت شریعت کی حقیقت کا نام ہے اور طریقت و حقیقت دونوں شریعت کے خادم ہیں۔

علم کی اقسام

حدیث کی رو سے علم کی دو قسمیں ہیں:

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَدْیَانِ وَ عِلْمُ الْاَبْدَانِ۔

صوفیاء کرام کے نزدیک بھی علم دو طرح کا ہے۔ ایک علم وہ ہے جس سے مقصود عمل ہے جس کا متکفل علمِ فقہ ہے۔ دوسرا علم وہ ہے جس سے مقصود صرف اعتقاد اور دل کا یقین حاصل ہونا ہے یعنی علمِ کلام (عقائد کا علم)۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ النورانی علم کی مندرجہ ذیل دو قسمیں بیان کرتے ہیں:

۱۔ علمِ حصولی ۲۔ علمِ حضوری

علمِ حصولی

شے کی صورتوں میں سے کسی صورت کا علم ہونا در حقیقت یہ نفسِ شے کا علم نہیں ہوتا بلکہ اس میں نفسِ شے کی نسبت جہل ثابت ہوتا ہے۔

علمِ حضوری

وہ علم جہاں نفسِ شے مُدرِکہ کے نزدیک موجود ہو اور کوئی ظل و صورت اس کے درمیان حائل نہ ہو۔ لہٰذا اس علم میں معلوم، نفسِ شے ہوئی۔ علمِ حصولی آفاق سے متعلق ہے اور علمِ حضوری انفس سے متعلق ہے۔

بینہ

یہاں جس علم کو شریعت کا جزو قرار دیا گیا ہے وہ علمِ حصولی ہے۔ شریعت کا دوسرا جزو اس علم پر عمل کرنا ہے اور شریعت کا تیسرا جزو یہ ہے کہ اس علم اور عمل میں اخلاص کا جذبہ کار فرما ہو جائے۔

حضور امام ربانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ علم اور عمل یہ دونوں چیزیں علماء کی صُحبت سے ملتی ہیں، جبکہ اخلاص صوفیاء کی صحبت و خدمت سے میسر آتا ہے۔

اخلاص احادیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی روشنی میں

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ سَأَلْتُ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلامُ عَنِ الإِخْلاصِ مَا هُوَ قَالَ: سَأَلْتُ رَبَّ الْعِزَّةِ عَنِ الإِخْلاصِ مَا هُوَ؟ قَالَ: سِرٌّ مِنْ سِرِّي اسْتَوْدَعْتُهُ قَلْبَ مَنْ أَحْبَبْتُهُ مِنْ عِبَادِي۔[1]

یعنی رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا کہ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اخلاص کی حقیقت کے بارے میں دریافت فرمایا تو جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے رب العزت سبحانہٗ وتعالیٰ سے اخلاص کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اخلاص میرا راز ہے جسے میں اپنے محبوب بندوں کے قلب میں ودیعت فرماتا ہوں۔

حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَخلِصْ فِیْ دِیْنِکَ یَکْفِیْکَ قَلِیْلاً مِنَ الْعَمَلِ۔[2] یعنی دین میں اخلاص پیدا کرلو تو تمہارا تھوڑا عمل بھی کفایت کر جائے گا۔

---

[1] (الرسالۃ القشیریۃ، ج۲، ص۳۶۰)

[2] (رسالہ قشیریہ)

حضرت جنید بغدادی اور اخلاص

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

الإخلاص سر بَيْنَ اللّٰہ وبين العبد لا يعلمه ملک فيكتبه ولا شَيْطَان فيفسده ولا هوى فيميله۔[1]

(یعنی) اخلاص اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان راز ہے جس کا نہ کسی فرشتے کو علم ہے کہ وہ اسے لکھے، نہ شیطان کو کچھ خبر ہے کہ وہ اسے فاسد کر سکے اور نہ ہی خواہش (نفس) کو کوئی اطلاع ہے کہ مخلص بندہ اس کی طرف مائل ہو سکے۔

صورتِ اخلاص

صورتِ اخلاص یہ ہے کہ اپنے اعمالِ حسنہ کی تشہیر و تعریف پسند کی جائے اور عزت، شہرت اور رفعت کو مقصود سمجھا جائے ایسے لوگوں کے اعمال کبھی رضائے نفس کے تابع اور کبھی رضائے الٰہیہ کے تابع ہوتے ہیں۔

[1] (الرسالة القشيرية، ج۲، ص ۳۶۱)

حقیقتِ اخلاص

حقیقتِ اخلاص یہ ہے کہ سالک کو تزکیۂ نفس حاصل ہو جائے۔ عزت، شہرت اور رفعت ومنصب کے ترک کا اہتمام کیا جائے اور ہر وقت اپنے تمام اعمالِ حسنہ کو رضائے الٰہی کے لئے مخصوص سمجھا جائے اور اخلاص پر استقامت نصیب ہو جائے۔ اخلاص ہی کا دوسرا نام فنا ہے اور فنا محبتِ ذاتیہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور یہی اصل کام ہے۔وَھُوَ الْمُرَادُ۔

(البینات شرح مکتوبات، ج ۲، ص ۱۶۵ تا ۱۶۹)

حررہ:

العبد الفقیر السید احمد علی الشاہ الترمذی الحنفی السیفی

حال فقیر کالونی اورنگی ٹاؤن

جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ